1

موت سے آنکھ مچولی کھیلنے والے ایک جیالے کی داستان

# مٹی کا کھیل



رزاق شاہد کوہل





# پیش لفظ

محترم قارئین! زیرنگاہ ناول ''مٹی کا کھیل'' عرصہ اڑھائی برس تک ماہنامہ ''حکایت'' جیسے مؤقر جریدے میں شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ بات میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے کہ دوران اشاعت یہ ناول ماہنامہ ''حکایت'' کا مقبول ترین سلسلہ رہا ہے اور قارئین کی ایک بڑی تعداد نئی قسط کی منتظر رہا کرتی تھی۔ ابھی اس ناول کی ابتدائی چند قسطیں ہی شائع ہوئی تھیں کہ اس دوران مجھے ایسے قارئین کے فون آنے لگے جو اس ناول کو کتابی صورت میں پڑھنے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر یہ اس وقت ناممکن تھا۔ اختتامیہ قسط کی اشاعت کے بعد ہی اسے کتابی صورت میں شائع کیا جاسکتا تھا۔

لیجئے، انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ''مٹی کا کھیل'' کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اس کی تعریف میں کچھ کہہ کر اپنے منہ میاں مٹھو بننا نہیں چاہتا، تاہم اتنا کہنا اپنا حق سمجھتا ہوں کہ اس ناول کو لکھتے وقت میں نے اپنی زندگی کے کئی بہترین لمحات رائیٹنگ ٹیبل پر گزارے ہیں۔ میں سوتے جاگتے ناول کے مرکزی کردار ''جہانداد'' کے ساتھ رہا ہوں، اس کی خوشی میں اس کے ساتھ قہقہے لگائے ہیں تو اس کے دکھ میں اس کے ساتھ دل گرفتہ ہوا ہوں۔ میں نے اس کی بے بسی محسوس کی ہے، اس کے غصے جھنجھلاہٹ میں اس کے ساتھ شریک رہا ہوں۔

میں جناب محمد علی قریشی صاحب کا بھی تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں ان کی محبت و شفقت کے باعث یہ خوب صورت و دلچسپ ناول آپ جیسے قدردانوں تک بروقت پہنچنا ممکن ہوسکا۔

آخر میں ایک گزارش ہے کہ ناول پڑھ کر اپنی بہترین آراء سے نوازنا مت بھولیے گا کہ قاری اور قلمکار کے بیچ ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔

والسلام

آپ کا:...... رزاق شاہد کوہلر

جون 1974ء کے اوائل کے دن تھے۔ سر کے اوپر چمکتا ہوا سورج آگ برسا رہا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان نظر نہیں آ رہا تھا شاید گرمی کی شدت نے انسانوں کی طرح چرند پرند کو بھی سایہ دار جگہوں میں چھپنے پر مجبور کر دیا تھا تارکول کی سیاہ سڑک لہراتی بل کھاتی حدِ نگاہ تک سنسان نظر آ رہی تھی۔ شمال کی جانب تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ گاؤں سڑک کے مغربی جانب واقع تھا۔

یکا یک جنوب کی طرف سے سڑک پر ایک پرانی بیڈفورڈ بس نمودار ہوئی اور خاموش فضا میں انجن کی آواز ارتعاش پیدا کرنے لگی۔ بس مخصوص رفتار سے چلتی ہوئی گاؤں کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن پھر اس کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوئی اور وہ ایک سنگِ میل کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔

بس سے اترنے والا مسافر ایک جواں سال شخص تھا۔ سنگِ میل کے قریب پہنچ کر اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور اس کے چہرے کی افسردگی ایک زخمی سی مسکراہٹ میں بدل گئی۔ اس کی سیاہ چمکدار آنکھوں میں خود اعتمادی نظر آ رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ دیہاتی لگ رہا تھا لیکن کندھے پر لٹکتا سفری بیگ اور پانی کی چھاگل اسے ایک مسافر ظاہر کر رہے تھے۔

چند لمحے وہ شش و پنج کے عالم میں سنگِ میل کے نزدیک کھڑا رہا۔ اس کی نگاہیں شمال کی جانب موجود گاؤں پر ٹکی ہوئی تھیں شاید وہ اس طرف جانا چاہتا تھا مگر کوئی سوچ اسے گاؤں کی طرف جانے سے روک رہی تھی۔ معاً وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''مجھے اپنے گاؤں جانا چاہئے شاید میں وقت ضائع کر رہا ہوں''۔ دوسرے ہی لمحے وہ آگے بڑھا اور سڑک سے اتر کر ایک کچے راستے پر مغرب کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ پگڈنڈی نما راستہ سیدھا مغرب کی جانب جا رہا تھا۔

راستے پر ڈھور ڈنگروں کے کھروں کے نشان بھی دکھائی دے رہے تھے مگر دوپہر کے اس وقت راستہ دور تک ویران نظر آ رہا تھا۔ اس راستے سے گزرنے والے کسان اور چرواہے صبح سویرے ہی

کھیت کھلیانوں میں پہنچ جاتے تھے۔

اس کے سر پر سورج آگ کے گولے کی طرح دہک رہا تھا۔ اردگرد کے صاف چٹیل میدان دھوپ میں پانی کی طرح چمک رہے تھے مگر وہ ان سرابوں کی حقیقت سے آگاہ تھا۔ انجان مسافر بار ہا ان میدانوں کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے لیکن وہ انجان نہیں تھا، پانچ برس قبل وہ متعدد بار یہاں سے گزر چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی ببول یا بیری کے درخت کے نیچے رک کر چند لمحوں کے لیے اپنے وطن کے پرندوں کی چہکار سنتا اور اس کے ملول چہرے پر ایک مسکراہٹ سی پھیل جاتی لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر چل پڑتا۔ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا تھا جو وہاں سے تقریباً آٹھ دس کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔

چلتے چلتے وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا اس امید پر کہ شاید کوئی بیل گاڑی یا سائیکل سوار آ رہا ہو اور اسے یہ دیہاتی لفٹ میسر آ جائے۔

وہ پچیس سالہ شخص اپنے میلے کچیلے لباس اور پریشان حال صورت کے باوجود ان گنے چنے لوگوں میں سے تھا جو اپنے خدوخال اور قدوقامت کی وجہ سے ہزاروں کے ہجوم میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا چہرہ ان آلام ومصائب سے آشنا معلوم ہو رہا تھا جو گزشتہ جنگ میں وہ دیکھ چکا تھا۔ 1971ء کی جنگ کا یہ قیدی پانچ برس کے بعد اپنے گاؤں جا رہا تھا۔

اس نے 1969ء میں آرمی جوائن کی تھی۔ اس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے دو سال بعد ہی 71ء کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے محاذ پر اس نے کھل کر اپنے سپاہیانہ جوہر دکھائے تھے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ ان 90 ہزار قیدیوں میں سے ایک تھا جو 16 دسمبر 1971ء کو دشمن کی قید میں چلے گئے تھے۔ اس کا تعلق رہا ہونے والے قیدیوں کی آخری کھیپ سے تھا۔

رہائی کے بعد اس کا دل سروس جاری رکھنے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اپنی یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کے زور دینے کے باوجود وہ مزید سروس جاری رکھنے کے لیے تیار نہ ہوا تو مجبوراً اسے سروس سے ڈسچارج کر دیا گیا اور اب پانچ برس کے بعد وہ ایک بار پھر انہی راستوں پر گامزن تھا جن پر چلتے ہوئے اس کا بچپن اور لڑکپن بیتا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان راستوں کی خاک کو آنکھوں سے لگا کر بوسے دے۔ اس خاک پر اس کے پیاروں کے قدموں کے نشان ثبت تھے۔ اسی خاک سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔ اپنی مٹی سے پیار کا جذبہ بھی کیا خوب ہوتا ہے، اس کی قدر وہی لوگ جانتے ہیں جو دشمن کی سرزمین پر زندگی کے کڑے لمحات گزار چکے ہوں۔

ایک قیدی کی حیثیت سے وہ بھارت کے فوجی کیمپوں میں ایسے سخت مراحل سے گزر چکا تھا جن کے متعلق ایک عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا تبھی اپنے وطن کے ببول اور جھڑبیریاں اسے جنت



کے نظاروں سے بھی حسین لگ رہے تھے۔

مسلسل چلتے چلتے اس کا لباس پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ کندھے پر لٹکی ہوئی چھاگل سے اس نے دو تین گھونٹ پانی کے پیے اور پسینہ صاف کرتے ہوئے دائیں ہاتھ ذرا فاصلے پر موجود ببول کے ایک درخت کی طرف بڑھ گیا۔ گھنی چھاؤں میں اسے ذرا فرحت محسوس ہوئی تو وہ پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔ بیگ سے بسکٹ نکال کر کھانے کے بعد اس نے دوبارہ پانی پیا اور بیگ کو سر کے نیچے ٹکا کر آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔

پیٹ کی آگ بجھتے ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ سر جھٹکنے کے باوجود اس کی پلکیں جڑی جا رہی تھیں، چند لمحے نیند سے لڑنے کے بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ سورج اپنا دن بھر کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ طے کر رہا تھا اور درختوں کے سائے آہستہ آہستہ مشرق کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔

نیند کی حالت میں ایک بار پھر وہ مشرقی پاکستان کے محاذ پر پہنچ گیا۔ چاروں طرف گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور چیخ و پکار تھی۔ وہ اپنی پلٹن کے چند جوانوں کے ساتھ دشمن کے نرغے میں گھرا ہوا تھا۔ دشمن نے ان کے فرار کی راہیں مسدود کر رکھی تھیں اور ایک انڈین فوجی بارعب آواز میں انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دے رہا تھا مگر وہ ہتھیار ڈالنے کی بجائے فرار کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ پھر ایک دم خواب کا منظر بدل گیا۔ اب وہ اپنے ایک زخمی ساتھی کو اٹھا کر کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں دوڑتا پھر رہا تھا لیکن جلد ہی خواب کا یہ منظر بھی بدل گیا۔ اب وہ ایک کھلے میدان میں کھڑا تھا۔ سامنے ہی درختوں کا ایک جھنڈ موجود تھا۔ اچانک اس جھنڈ سے ایک دوشیزہ بال بکھرائے چیختی چلاتی ہوئی نکلی اور اس کی جانب دوڑ پڑی اس کے تعاقب میں جھنڈ سے چند انڈین فوجی نکلے اور قہقہے لگاتے ہوئے اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر اس سے پہلے کہ لڑکی اس تک پہنچ پاتی، انڈین فوجی بھوکے گدھوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ لڑکی چلا چلا کر ان سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی مگر اس کی آہ و بکا ان وحشی فوجیوں کے قہقہوں میں دب کر رہ گئی۔ پھر لڑکی کی چیخ کے ساتھ ہی اس کا خواب ٹوٹ گیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ جاگتے میں بھی لڑکی کی آخری چیخ اور فوجیوں کے قہقہے اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔

''شاید میں ابھی تک خواب کے اثر میں ہوں''۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے سوچا مگر لڑکی کی مدد کے لیے پکارتی ہوئی آواز اور مردانہ قہقہے اسے اب بھی سنائی دے رہے تھے۔ متوحش ہو کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چاروں طرف پریشانی کے عالم میں دیکھنے لگا لیکن اسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ چاروں طرف ویرانی کا عالم تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ تیز ہو گئی تھی۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن اس ویرانے میں ایک لڑکی کے رونے کی آوازیں اور مردانہ قہقہے اسے وحشت زدہ ضرور کر رہے تھے۔

اچانک ایک نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی اور بے اختیار اس کی نگاہیں ذرا فاصلے پر موجود جھڑبیریوں کے ایک جھنڈ کی طرف اٹھ گئیں۔ لڑکی کی دوسری چیخ بلند ہونے سے قبل ہی وہ دوڑتا ہوا جھنڈ کے نزدیک پہنچ گیا، جھنڈ عبور کرنے کے بعد جو نظارا اس کی آنکھوں نے دیکھا اس نے اس کے تن بدن میں آگ لگادی، وہ سرتاپا سلگ اٹھا مشرقی پاکستان کے المناک واقعات اس کی آنکھوں میں گھومنے لگے۔

اس کے سامنے ایک جواں سال لڑکی کو ایک ہٹا کٹا نوجوان چرواہا دبوچے ہوئے تھا۔ لڑکی کے ایک کندھے سے قمیص پھٹ چکی تھی اور چرواہا کسی آکٹوپس کی طرح اس سے چمٹا ہوا تھا۔ لڑکی جنونی انداز میں ہاتھ، پاؤں چلا کر اپنی عزت بچانے کی کوشش کر رہی تھی مگر نوجوان مرد کی گرفت سے نکلنا اس کے بس سے باہر تھا۔ لڑکی کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکل رہی تھیں۔

اپنی آبائی سرزمین پر یہ وحشت ناک نظارا دیکھ کر اس کے ذہن میں خواب کا منظر تازہ ہو گیا۔ اسے خود پر اختیار نہ رہا اور دوسرے ہی لمحے وہ زخمی شیر کی طرح چرواہے پر جھپٹ پڑا۔ اس نے چرواہے کی پشت پر پاؤں کی ایک زبردست ٹھوکر لگائی اور اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر پوری قوت کے ساتھ کھینچ لیا۔

چرواہا ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے جبڑے پر ایک طاقتور گھونسا پڑا اور اس کی نگاہوں کے سامنے تارے سے ناچ اٹھے۔ دوسرے ہی لمحے چرواہا اچھل کر پشت کے بل گر پڑا۔

لڑکی نے یہ موقع غنیمت جانا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر حواس باختہ سی ایک طرف بھاگ اٹھی، اس کی اوڑھنی گلے میں جھول رہی تھی اور بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اندھا دھند دوڑنے کی وجہ سے اچانک اس نے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔

اجنبی کی توجہ ایک لمحے کے لیے بٹ کر رہ گئی۔ اس کی اس لمحاتی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چرواہے نے بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح اس کے پیٹ میں ایک ٹکر ماری اور وہ کراہ کر پشت کے بل زمین پر گر پڑا۔ چرواہے نے اسے ایک گندی سی گالی دی اور پھر جست لگا کر اس کے پیٹ پر سوار ہو گیا۔ اب اس کی گردن چرواہے کے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

چرواہا پوری طاقت کے ساتھ اس کا گلا دبانے میں مصروف تھا لیکن یہ چرواہے کی بدقسمتی تھی کہ اس کا مدمقابل ایک تربیت یافتہ فوجی تھا۔ بظاہر چرواہے کو اپنی جیت یقینی نظر آرہی تھی کیونکہ اپنے تئیں وہ اسے زیر کر چکا تھا مگر اس ''زیر'' کو ''زبر'' بننے کے بیسیوں گر آتے تھے۔



اس نے اپنے گلے سے چرواہے کے ہاتھ ہٹانے کی بجائے اس کی آنکھ کو نشانہ بناتے ہوئے اپنی انگلی اس کی آنکھ میں گھسیڑ دی۔ چرواہے کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکلی اور اس نے اجنبی کا گلا چھوڑ کر اپنا ہاتھ مضروب آنکھ پر رکھ لیا۔

اجنبی کے سنبھلنے کے لیے یہ موقع کافی تھا اس نے لیٹے لیٹے چرواہے کی گردن پر ایک مخصوص وار کیا اور چرواہا اس کے پہلو میں لڑھک گیا۔ اس نے چرواہے کے بے ہوش وجود کو پرے دھکیلا اور دوسرے ہی لمحے اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

چرواہے کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے لڑکی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں مگر وہ اسے کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی شاید ڈر کر بھاگ گئی تھی یا پھر کہیں چھپی ہوئی تھی۔

اس نے اونچی آواز میں پکارا۔ ''اے لڑکی، اگر تم کہیں آس پاس چھپی ہوئی ہو تو بلا خوف و خطر سامنے آجاؤ اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے''۔

اپنی پکار کا ردعمل دیکھنے کے لیے اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا مگر جب لڑکی سامنے نہ آئی تو وہ دوبارہ بلند آواز سے بولا۔ ''سنو! تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ میں ایک فوجی ہوں اور فوجی عزتوں کے رکھوالے ہوتے ہیں''۔

معاً لڑکی سامنے آگئی۔ چند قدم دور وہ ایک قدرتی گڑھے میں چھپی ہوئی تھی۔

''ادھر آجاؤ میرے پاس''۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

لڑکی خوفزدہ انداز میں چلتی ہوئی اس کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور اپنے عریاں کندھے کو اس نے اوڑھنی میں چھپا رکھا تھا۔

''کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟'' اس نے لڑکی سے سوال کیا۔

''م...... میرا نام زینب ہے جی''۔ لڑکی نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''فتح پور کی جی''۔ لڑکی کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

''میں بھی وہیں کا رہنے والا ہوں''۔ اس نے پہلی بار غور سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہیں نہیں جانتا۔ کیا تم مجھے اپنے باپ کا نام بتانا پسند کرو گی؟''

لڑکی نے جھکی ہوئی پلکیں اٹھا کر ایک ثانیے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور ذرا ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو جی! آپ میرے محسن ہیں۔ آپ نے میری عزت بچائی ہے۔ میں آپ کی احسان مند ہوں لیکن آپ مجھے فتح پور کے نہیں لگتے۔ فتح پور کوئی بہت بڑا گاؤں نہیں ہے وہاں کے سب لوگوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں مگر آپ کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا''۔

وہ لڑکی کو اس دوران بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے خد و خال اسے جانے پہچانے لگ رہے تھے تاہم اپنا شک دور کرنے کے لیے لڑکی سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''کہیں...... کہیں تم حاکم چچا کی بیٹی زینو تو نہیں ہو؟'' سوال کرتے وقت دل اس کے پہلو میں پارے کی طرح اچھل رہا تھا۔

اس کے لہجے کی اپنائیت محسوس کرتے ہی زینب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دماغ پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر بے سود، کوشش کے باوجود وہ اسے پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔ آخر کار تھک کر بولی۔

''میں کوشش کے باوجود آپ کو نہیں پہچان سکی جبکہ آپ میرے بابا جان تک کو جانتے ہیں۔ مجھے اپنا نام بتائیں ہوسکتا ہے آپ کا نام جان کر میں آپ کو پہچان لوں''۔

''تم سدا کی بھلکڑ ہو''۔ وہ پُرسوز انداز میں بولا۔ ''میں پورے پانچ برس کے بعد گاؤں لوٹ رہا ہوں۔ تمہارے گھر کے آنگن میں ایک بیری ہوا کرتی تھی۔ یاد کرو اس بیری کے جھولے کو، اس وقت تم بمشکل دس گیارہ برس کی تھیں اور جھولے پر بیٹھ کر ایک گیت گایا کرتی تھیں''۔

''تم...... تم جہانداد ہو ناں؟'' زینو نے پُرجوش انداز میں کہا۔ فرطِ مسرت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''مجھے...... مجھے وہ گیت آج بھی یاد ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو''۔

بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا چکی تھی اور آنکھوں میں نمکین پانی تیرنے لگا تھا۔ جہانداد وارفتگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قید و بند کی ساری تکلیفیں وہ بھول چکا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم چکی ہو۔ وہ زینب سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اماں کے متعلق، بابا اور اپنی چھوٹی بہن سکینہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر یہاں نہیں کیونکہ کسی بھی وقت اس کمینے چرواہے کو ہوش آسکتا تھا اور پھر بات بڑھ جاتی اس لیے وہاں سے نکلنا بہت ضروری تھا۔

''ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے''۔ اس نے کہا۔ ''تم یہاں ٹھہرو میں اپنا بیگ لے کر آتا ہوں''۔

زینب نے جواب دینے کی بجائے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

✣ ===✣=== ✣

جہانداد کا باپ قاسم علی عصر کے وقت تھکا ہارا بیلوں کو ہانکتا ہوا ڈیوڑھی سے اندر داخل ہوا اور قدرے اونچی آواز میں بولا۔ ''سکینہ! ارے او سکینہ پتر کہاں ہو تم؟''

''آرہی ہوں بابا جان!'' سکینہ نے باورچی خانے کے اندر سے جواب دیا اور پھر اپنے سر پر اوڑھنی درست کرتے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکلی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باپ کے قریب پہنچ گئی۔



''السلام علیکم بابا جان''۔ قریب پہنچتے ہی اس نے خوشگوار انداز میں کہا اور پھر بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھونٹیوں کی طرف لے گئی۔ بیلوں کو باندھ کر جب وہ واپس آئی تو اس وقت تک قاسم علی ستانے کے انداز میں ایک چارپائی پر لیٹ چکا تھا۔

''آج میں بہت تھک گیا ہوں''۔ قاسم علی نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کاش میں نے جہانداد کو فوج میں نہ جانے دیا ہوتا تو آج مزے سے گھر میں آرام کر رہا ہوتا''۔

سکینہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھی مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔

''آپ ملک مراد سے بات کیوں نہیں کرتے؟'' وہ پلٹ کر باپ سے کہنے لگی۔

''سنا ہے فوج کا ایک بڑا افسر اس کا دوست ہے۔ اسے یقیناً جہانداد بھائی کے بارے میں معلوم ہوگا''۔

''تم تو پگلی ہو سکینہ''۔ قاسم علی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی فوجی افسر ملک مراد کا دوست نہیں ہے۔ بس گاؤں والوں پر رعب ڈالنے کے لیے وہ ایسی باتیں پھیلاتا رہتا ہے''۔

''نہیں بابا جان! ملک مراد اتنا بڑا جھوٹ نہیں بولے گا''۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ضرور کسی فوجی افسر سے اس کا تعلق ہوگا''۔

''ٹھیک ہے پتر! ملک سے بھی بات کر کے دیکھ لوں گا مگر جہانداد زندہ......''

''خدا کے لیے بابا جان! ایسا مت سوچا کریں''۔ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ ہے میرا بھائی ضرور واپس آئے گا''۔

''بھائی کے متعلق الٹے سیدھے خواب کون دیکھتا ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ ''میں یا تم؟''

''بابا جان! خواب انسان کے اختیار میں تھوڑی ہوتے ہیں اور پھر ہم جیسے گناہ گاروں کے خواب بھلا سچے کب ہوتے ہیں؟''

''اچھا پتر! تُو جلدی سے چائے بنا دے''۔ قاسم علی اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اس دوران میں وضو کر لیتا ہوں یہ نہ ہو کہ عصر کی نماز کا وقت نکل جائے''۔

سکینہ نے جلدی سے پانی کا ایک لوٹا بھر کر باپ کے ہاتھ میں تھمایا اور پھر چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں داخل ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد قاسم علی عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ سکینہ نے باورچی خانے سے نکل کر چائے کی کیتلی اور ایک خالی کپ چارپائی پر رکھ دیا تھا۔

''جیتی رہو پُتر''۔ قاسم علی نے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا اور پھر ایک لمحہ توقف کے بعد پوچھا۔ ''تمہاری ماں نظر نہیں آ رہی؟''

''اماں حاکم چچا کے گھر گئی ہوئی ہے''۔

''تمہاری اماں کو شاید گھر میں آرام نہیں ملتا اس لیے ہر وقت گھر سے باہر رہتی ہے''۔ قاسم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بابا جان! انہیں چچی نے بلوایا ہے''۔

''کیوں، کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''وہ دراصل زینب ابھی تک گھر نہیں پہنچی اس لیے چچی ذرا پریشان تھی اور پھر اسی پریشانی کے عالم میں اس نے اماں کو اپنے ہاں بلوا لیا''۔

''یہ فاطمہ بھابی بھی بڑی عجیب سی عورت ہے''۔ قاسم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بھئی زینب کوئی پہلی بار تو گھر سے نہیں نکلی ہے۔ انسان کو دیر سویر ہو جاتی ہے''۔

اس دوران خدیجہ ڈیوڑھی کی طرف سے نمودار ہوئی اور سکینہ اسے دیکھ کر بولی۔ ''اماں آ رہی ہے''۔

جونہی وہ ان کے نزدیک پہنچی سکینہ نے بے تابی سے سوال کیا۔ ''اماں! کیا زینب گھر پہنچ گئی ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں پہنچی''۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''خدا خیر کرے جوان جہان لڑکی ہے، کہیں کچھ ہو گیا تو ہم کسی کو شکل دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے''۔

''یہ کیا تم نے احمقانہ باتیں شروع کر دی ہیں''۔ قاسم علی نے قدرے درشت انداز میں کہا۔ ''فاطمہ کی طرح شاید تمہارا بھی دماغ چل گیا ہے''۔

''میرا دماغ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے''۔ وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا بھائی ابھی تک شہر کی منڈی سے واپس نہیں لوٹا، اوپر سے شام پڑنے والی ہے اور جوان لڑکی گھر سے باہر ہے ایسی صورت میں میرے منہ سے خیر کے کلمات کیسے نکل سکتے ہیں؟''

''خدا سے نیک گمان رکھنا چاہیے''۔ قاسم علی نے جواب دیا۔ ''تم برا سوچو گی تو اچھا پیش کیسے آئے گا؟''

''میرے سوچنے سے اگر کچھ ہوتا تو شاید اب تک زینب گھر آ چکی ہوتی''۔

''مجھے یقین ہے وہ خیر خیریت سے آئے گی''۔ قاسم علی نے پُر امید انداز میں کہا۔ ''بس تم خدا پر بھروسہ رکھو، وہ بڑا کارساز ہے''۔

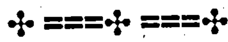
''خدا پر ہی تو بھروسہ ہے ورنہ''...... وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''ورنہ تُو آسمان سر پر اٹھا لیتی''۔ قاسم علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''یا پھر خود ہی کمر کس کر زینب کو تلاش کرنے نکل پڑتی''۔

خدیجہ نے منہ پھلا کر کہا۔ ''آپ کو تو بس باتیں بنانا ہی آتا ہے۔ اتنا نہیں ہوتا کہ جا کر بچی کو تلاش کر لیں، فاطمہ کا رو رو کر برا حال ہو گیا ہے''۔

''اچھا اچھا جاتا ہوں''۔ قاسم علی اٹھتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ منہ بسورنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں زینب کو ساتھ لے کر آؤں گا''۔

''اے خدایا! میری بچی کو سلامت رکھنا''۔ خدیجہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔



وہ دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے فتح پور کی طرف روانہ تھے۔ زینب کے سر پر خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا تھا گو کہ گٹھا کافی وزنی تھا مگر اس دیہاتی دوشیزہ کے لیے یہ وزن معمول کی بات تھی۔

''یہ چرواہا کون ہے؟'' جہانداد نے چلتے چلتے سوال کیا۔

''ملکوں کا بھانجا ہے حرام خور''۔ زینب نے حقارت سے کہا۔ ''گاؤں کی ہر لڑکی کو موقع بے موقع تنگ کرنا اس کا مشغلہ ہے۔ اصل میں ساری غلطی میری تھی۔ مجھے لکڑیاں چننے کے لئے اتنی دور نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرتی''۔

''بڑا ملک اس کو کچھ نہیں کہتا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''جہانداد، پانچ برس کا عرصہ بہت زیادہ ہوتا ہے''۔ وہ اداس انداز میں بولی۔ ''بڑے ملک کو گزرے تین برس ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ گاؤں کی بہو بیٹیوں پر بری نظر ڈال سکے مگر اب پورے گاؤں میں جنگل کا قانون چلتا ہے...... تم نے ملکوں کے بھانجے پر ہاتھ اٹھا کر دشمنی کی ابتدا کر دی ہے''۔

''میں ایک سپاہی ہوں زینو اور سپاہی پورے دیس کا محافظ ہوتا ہے۔ زندگی اور موت سپاہیانہ کھیل کا ایک حصہ ہیں۔ وہ سپاہی ہی کیا جو اپنے گھر کی حفاظت نہ کر سکے۔ ملکوں کی ایسی کی تیسی، اس ڈر کو اپنے دل سے نکال دو، اگر مجھے پہلے علم ہوتا تو شاید میں اسے جان سے مار ڈالتا''۔

جہانداد کے آخری جملے نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا تاہم وہ انجان بن کر بولی۔

''کیا تم صرف میری وجہ سے ملکوں سے دشمنی مول لو گے؟''

''ظلم کے خلاف لڑنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ تمہاری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تب بھی میں اس کا یہی حشر کرتا''۔

جہانداد کے اس غیر متوقع جواب نے ایک لمحے کے لیے تو اس کی ساری خوش فہمی دور کر دی اور اس کے چہرے پر خوشی کے جھلملاتے ستارے ماند پڑتے چلے گئے لیکن ایک لمحے کے توقف کے بعد جب وہ دوبارہ بولا تو زینب خود کو خوشی کے ساتویں آسمان پر اُڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”زینو! میں گاؤں کی ہر لڑکی کی عزت کی حفاظت کروں گا مگر تمہاری عزت کی خاطر تو شاید میں سولی پر چڑھنا بھی گوارا کر لوں گا۔ تم میرے سگے چچا کی بیٹی ہو“۔

”بس صرف چچا کی بیٹی ہوں؟“ اس نے ذومعنی انداز میں پوچھا اور جہانداد ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا اسے ایک اَن پڑھ دیہاتی دوشیزہ سے اس قدر بے باکی کی توقع نہیں تھی۔ تاہم وہ سنبھل کر بولا۔

”کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ تم میرے چچا کی بیٹی ہو، بعض باتیں اَن کہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے ...... خیر چھوڑو ان باتوں کو تم مجھے بابا، اماں اور سکینہ کے متعلق بتاؤ وہ لوگ کیسے ہیں، مجھے یاد کرتے ہیں یا نہیں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے“۔ اس نے کہا۔ ”وہ سب رات دن صرف تمہیں ہی تو یاد کرتے رہتے ہیں اور سکینہ تو ہر گھڑی تمہاری رہائی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہے۔ کل رات اس نے تمہارے متعلق ایک ڈراؤنا خواب بھی دیکھا تھا۔ صبح جب میں اس سے مل کر آ رہی تھی تو وہ بہت پریشان تھی“۔

”کیا دیکھا تھا سکینہ نے خواب میں؟“ اس نے بے تابی سے سوال کیا۔

”خواب میں اس نے یہ دیکھا تھا کہ تم ایک ویران جنگل میں دو بھیڑیوں کے نرغے میں پھنس جاتے ہو اور بھیڑیے تمہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر تم پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ بھیڑیوں سے لڑتے لڑتے تم بہت زیادہ گھائل ہو جاتے ہو اور پھر بھیڑیے تمہیں گرا کر تمہارا گوشت نوچنا شروع کر دیتے ہیں مگر تم بے حس و حرکت پڑے رہتے ہو۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد دہشت کے مارے سکینہ کی آنکھ کھل گئی اور پھر بقیہ رات اس نے جاگ کر گزار دی“۔

”پگلی ہے سکینہ“۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ”یا پھر اس کا معدہ خراب ہے جو اس طرح کے الٹے سیدھے خواب دیکھتی ہے“۔

”کچھ بھی ہو لیکن وہ بہت پریشان ہے“۔ زینب نے جواب دیا۔

یونہی باتیں کرتے کرتے وہ اس قدرتی نالے تک پہنچ گئے جس کے دوسری جانب کچھ فاصلے پر فتح پور گاؤں آباد تھا۔ سورج بس کچھ دیر کا مہمان تھا۔ اس کی ڈوبتی کرنوں میں بہت ساری دھوئیں کی لکیریں آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ دھوئیں کی یہ لکیریں اور سورج کی کرنیں فضا



میں ایک عجیب اور دلکش منظر پیش کر رہی تھیں ایک ایسا منظر جسے الفاظ کا جامہ پہنانا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا۔

یہ منظر دیکھ کر جہانداد اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ پانچ برس میں ایسے مناظر اس کے لیے ماضی کا ایک سہانا خواب بن کر رہ گئے تھے۔ ایک قیدی کی حیثیت سے اس نے دشمن کی سرزمین پر جو کٹھن لمحات گزارے تھے انہوں نے اس کی حسِ لطافت کو بے حسی اور اکتاہٹ کی ایک دبیز چادر تلے چھپا دیا تھا مگر اب ایک بار پھر خوشیاں باہیں کھولے اسے زبانِ حال سے خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

نالہ تقریباً خشک پڑا ہوا تھا البتہ کہیں کہیں گڑھوں میں ٹکڑیوں کی صورت میں پانی موجود تھا جو گاؤں کے لوگوں اور مویشیوں کی ضرورت کے لیے ناکافی تھا مگر گاؤں کے لوگ ایسے حالات کے عادی تھے۔ ان کے لیے یہ مسئلہ کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا کیونکہ برسات کے موسم میں نالہ نہر کا روپ دھار لیا کرتا تھا اور لوگ زمینوں کو سیراب کرنے کے ساتھ ساتھ ضروریاتِ زندگی کے لیے بھی پانی کے مسئلے سے آزاد ہو جاتے تھے تاہم کبھی کبھار جب نالہ بالکل خشک ہو جایا کرتا تھا تو گاؤں کے لوگ اونٹوں اور گدھوں پر مشکیزے لاد کر دور دراز کے علاقوں سے پانی بھر لاتے تھے لیکن ایسی صورتِ حال سالوں بعد کبھی کبھی پیش آیا کرتی تھی۔

وہ دونوں جب نالہ عبور کر کے دوسری طرف پہنچے تو سورج تقریباً مغربی پہاڑیوں میں روپوش ہونے والا تھا۔ زینب کو اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا کر جہانداد واپس پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی کچی حویلی تک پہنچ گیا۔ ڈیوڑھی کا بلند قامت لکڑی کا بنا ہوا دروازہ نیم وا تھا۔

لحہ بھر کے لیے وہ ڈیوڑھی کی دہلیز پر رکا اور پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

•|• ===•|• ===•|•

قاسم علی جو زینب کو ڈھونڈنے کی غرض سے ڈیوڑھی کی طرف آ رہا تھا ایک دم جہانداد کو اپنے سامنے پا کر متحیر انداز میں رک گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ اس کے ہونٹ بولنے کے انداز میں لرزے۔ ”جہاں...... داد“ بمشکل اس کے منہ سے یہ دو لفظ نکلے اور پھر وہ والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر جہانداد کے ساتھ لپٹ گیا۔

وہ وارفتگی سے اپنے نوجوان بیٹے کو چومتا جا رہا تھا اور جہانداد کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جھلستے ہوئے صحرا سے نکل کر اچانک ایک ایسے نخلستان میں پہنچ گیا ہو جہاں سایہ دار درختوں کے نیچے ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے بہہ رہے ہوں۔

جب جذبات کا طوفان تھم گیا تو قاسم علی جہانداد کو چھوڑ کر اونچی آواز میں بولا۔ ”ارے خدیجہ،

ارے او سکینہ پتر! دیکھو تو یہ کون آیا ہے؟''

خدیجہ اور سکینہ دونوں نے باہر نکل کر جب جہانداد کو دیکھا تو ان پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ پانچ برس کے طویل عرصے کے بعد اپنے اکلوتے بیٹے کو پاکر خدیجہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور روتے ہوئے جہانداد سے لپٹ گئی۔ عالم وارفتگی میں وہ بیٹے کو چومنے کے ساتھ ساتھ اسے بے تحاشا دعائیں بھی دیے جا رہی تھی۔

ماں سے ملنے کے بعد جہانداد نے آگے بڑھ کر سکینہ کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا تو وہ بھی شدتِ جذبات سے رو پڑی۔

''ارے تجھے کیا ہوا ہے جو یوں آنسو بہا رہی ہو؟'' اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا اور سکینہ جلدی سے اپنی پلکیں صاف کرنے لگی۔

''آپ...... آپ پریشان نہ ہوں لالہ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں''۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئی بولی۔''اس لیے میں انہیں بہنے سے نہ روک سکی''۔

''پگلی! وہ خوشی ہی کیا جو آنکھوں کو نم کر دے''۔ جہانداد نے مسکرا کر کہا۔''اب میں کہیں نہیں جانے والا اس لیے یہ رونا دھونا بند''۔

اچانک اتنی زیادہ خوشی ملنے کے بعد قاسم علی نے زینب کی تلاش میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا تاہم جب باتوں کے دوران جہانداد نے انہیں زینب کے متعلق بتایا تو قاسم علی خاموش نہ رہ سکا۔

''کیا زینب گھر پہنچ چکی ہے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں وہ مجھے راستے میں مل گئی تھی''۔ جہانداد نے جواب دیا۔''میں اسے گھر پہنچا کر آ رہا ہوں''۔

''لیکن تم نے اسے پہچان کس طرح لیا؟'' قاسم علی نے حیرانی سے سوال کیا اور جہانداد پریشانی کے عالم میں اس کی صورت تکنے لگا۔

''ارے پہچان لیا ہوگا''۔ خدیجہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔''کیوں اسے خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو''۔

''بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا''۔ قاسم علی نے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہا اور پھر موضوع بدل کر بولا۔''ارے جہانداد کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو۔ باورچی خانہ تم ماں بیٹی کی راہ دیکھ رہا ہے''۔

جہانداد جو ایک لمحہ پہلے دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا اب اطمینان بھری سانسیں لے رہا تھا۔ ماں اگر اچانک مداخلت نہ کرتی تو شاید اس کا پول کھل سکتا تھا۔



رات کے وقت کھانے کے بعد جہانداد قید و بند کے قصے سنانے بیٹھ گیا۔ وہ تینوں نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کی روداد سن رہے تھے مگر جہانداد کی اکثر باتیں ان کی سمجھ سے باہر تھیں۔ ملٹری اور جنگ سے متعلق اس کی یہ گفتگو جہاں ان سب کے لیے دلچسپ اور حیرت انگیز تھی وہاں تھوڑی بہت مشکل بھی تھی تاہم جو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جہانداد بڑے سادہ پیرائے میں اس کی وضاحت کر دیتا تھا۔

دوسرے دن پورے فتح پور گاؤں میں جہانداد کی واپسی کا واقعہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکا تھا۔ گاؤں کے سادہ دل لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے اور ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ گاؤں کے ایک بزرگ نے اسی دن جہانداد کو جہانداد غازی کا خطاب دے دیا تھا۔

ملاقات کے لیے آنے والے لوگوں سے جہانداد کو یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ کل کسی اجنبی شخص نے ملک مراد کے بھانجے افضل کی آنکھ پھوڑ دی اور اب ملک مراد کے آدمی اس اجنبی کو شکاری کتوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں لیکن تاحال وہ اجنبی مجرم نہیں مل سکا۔

ملاقاتیوں کی بھیڑ چھٹتے ہی جہانداد نے اپنے اندرونی اضطراب پر قابو پاتے ہوئے اپنے ایک نوجوان پڑوسی اکبر سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''یہ ملک مراد کا بھانجا کیا کرتا ہے؟ اور اس کی آنکھ کس نے پھوڑی ہے، کیا کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے؟''

''ملک مراد کے مویشی چراتا ہے''۔ اکبر نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔''سنا ہے کل کسی نامعلوم شخص نے اس سے مویشی چھیننے کی کوشش کی ہے لیکن اس نے مزاحمت کر کے مویشی چوری کی یہ کوشش ناکام بنا دی ہے، تاہم ہاتھا پائی کے دوران نامعلوم شخص اس کی ایک آنکھ پھوڑنے کے بعد فرار ہو گیا ہے اور اب ملک کے آدمی اس نامعلوم شخص کو بڑی سرگرمی کے ساتھ آس پاس کے علاقے میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں''۔

''یہ سنی سنائی ہے یا تم خود افضل سے مل چکے ہو؟'' جہانداد نے دلچسپی لیتے ہوئے دوبارہ سوال کیا۔

''میں خود تو اس سے نہیں ملا لیکن مزاج پرسی کے لیے جانے والے ہر شخص کو اس نے یہی کہانی سنائی ہے''۔

''تمہارے خیال میں یہ کس کی کارروائی ہو سکتی ہے، کیا واقعی اس نامعلوم شخص کا مقصد مویشی چھیننا ہی تھا؟''

''میرا دل تو نہیں مانتا''۔ اکبر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔''کیونکہ جو کچھ افضل لوگوں کو بتا رہا

ہے وہ ناقابل یقین لگتا ہے۔ ایک آنکھ پھوڑنے والا اس کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ سکتا تھا اور پھر باآسانی مویشی لے جاسکتا تھا۔ یہ کوئی اور چکر لگتا ہے“۔

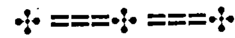
”چکر...... میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ جہانداد نے متحیرانداز میں پوچھا۔

”افضل کی ایک عادت بہت بری ہے“۔ اکبر دھیمے لہجے میں بولا۔”وہ عورتوں کا شکاری ہے اور آتی جاتی عورتوں اور لڑکیوں کو بری نظروں سے دیکھتا ہے۔تقریباً ایک ماہ قبل اس نے جانو موچی کی نوجوان لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔جانو موچی جب اس کی شکایت لے کر ملک مراد کے پاس پہنچا تو وہ افضل کو برا بھلا کہنے کی بجائے الٹا جانو پر ہی چڑھ دوڑا۔آخر کار جانو رو دھو کر خاموش ہو گیا۔اب بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ لگتا ہے۔عادت سے مجبور ہو کر افضل نے کسی غیرت مند کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہو گی اور نتیجے میں اسے اپنی آنکھ سے ہاتھ دھونا پڑ گئے ہوں گے۔کاش وہ نامعلوم شخص افضل جیسے کمینے کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالتا“۔

اکبر کا جواب سن کر بے اختیار جہانداد کا دل دھڑک اٹھا۔انجانے میں وہ سچی بات کہہ گیا تھا۔ اس لیے جہانداد نے اسے مزید کریدنے سے گریز کیا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے سوالات یا تاثرات سے کسی کو شک میں مبتلا کر دے۔

اسی روز سہ پہر کے وقت جہانداد نے موقع ملتے ہی زینب کو بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ کل والے واقعے کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ یہ جہانداد کی خوش قسمتی تھی کہ زینب نے اور تو اور ابھی تک اپنے والدین کے سامنے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔حالانکہ ماں نے اس سے پھٹی ہوئی قمیص کے متعلق استفسار بھی کیا تھا مگر اس نے جھاڑیوں سے الجھنے کا بہانہ بنا کر ماں کو ٹال دیا تھا۔

تاہم زینب کو سمجھانے کے باوجود جہانداد کے دل میں انجانے وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔کسی بھی وقت اس کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔غور سے نہ سہی لیکن افضل نے اسے دیکھا تو تھا۔ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے افضل سے اس کا واسطہ پڑ سکتا تھا۔اس طرح کے خیالات اسے پریشان کر رہے تھے اور وہ خود کو تسلیاں دے رہا تھا۔



افضل کی آنکھ بالکل ناکارہ ہو چکی تھی۔ جہانداد کی لگائی ہوئی ضرب نے اسے ایک آنکھ سے محروم کر دیا تھا۔ انتقام کی آگ اسے سرتاپا جھلسا رہی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ لڑائی کے دوران اپنے مدِمقابل کی شکل غور سے نہیں دیکھ پایا تھا۔کوشش کے باوجود وہ اپنے ماموں ملک مراد کو اپنے دشمن کا حلیہ نہیں بتا سکا تھا۔

زینب کے ساتھ دست درازی کرنے کا قصہ وہ جان بوجھ کر گول کر گیا تھا البتہ دل ہی دل میں



وہ زینب سے نمٹنے کا تہیہ کر چکا تھا۔اسی کی وجہ سے تو وہ ایک آنکھ سے محروم ہو گیا تھا۔

ایک ہفتہ ہونے کو آ رہا تھا مگر ملک مراد کے آدمی اس نامعلوم شخص کو نہیں ڈھونڈ سکے تھے۔آخر کار تھک ہار کر انہوں نے تلاش ختم کر دی تھی اور ملک مراد ایک بار پوچھ گاچھ کے لیے افضل کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”افضل پتر!“ ملک مراد نے سوالات کی ابتداء کرتے ہوئے پوچھا۔”تم نے غور سے نہ سہی مگر اس شخص کو دیکھا تو ہے ناں! اس لیے اس کا حلیہ وغیرہ ہی بتا دو تا کہ میں اسے تلاش کر سکوں“۔

”ماموں جان! آپ بار بار ایک ہی سوال کیوں پوچھتے ہیں؟“ افضل نے جھنجھلا کر کہا۔”میں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ اس حرام زادے نے اچانک ہی مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کی شکل وغیرہ دیکھتا۔اگر میں اس وقت اس کے خدوخال اور قدوقامت دیکھنا شروع کر دیتا تو آج یہاں نہیں بلکہ قبرستان میں پڑا ہوتا“۔

ملک مراد نے غور سے اس کی اکلوتی آنکھ میں جھانکتے ہوئے کہا۔”تم اس نامعلوم دشمن کے ذکر پر اس قدر سیخ پا کیوں ہو جاتے ہو؟ مجھے لگتا ہے تم کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہے ہو، اگر ایسی کوئی بات ہے تو بلا جھجک بتا دو“۔

ایک لمحے کے لیے افضل کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا مگر پھر وہ سنبھل کر بولا۔”ماموں جان! میں بھلا کیوں آپ سے کوئی بات چھپاؤں گا۔آپ میرے دشمن تو نہیں ہیں کہ میں آپ سے جھوٹ بولوں گا۔آپ بلاوجہ مشکوک ہو رہے ہیں“۔

ملک مراد اس کے رنگ بدلتے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔اسے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے مگر غصہ کرنے سے کام بگڑ سکتا تھا اس لیے وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

”بیٹے! سمجھنے کی کوشش کرو، یہ ہماری غیرت کا معاملہ ہے،ہم نے اگر اس نامعلوم شخص سے بدلہ نہ لیا تو گاؤں کے لوگ ہم پر تھوکیں گے۔ ہماری عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے گی۔ آج آنکھ پھوڑنے والا کل تمہاری گردن بھی توڑ سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری آنکھ کے بدلے اس دشمن کا سر کاٹ کر گاؤں کے چوراہے پر لٹکا دیا جائے تا کہ آئندہ کوئی شخص ہمارے خاندان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے“۔

”مجھے کچھ معلوم بھی ہو تو بتاؤں ناں؟“ اس نے بے بسی سے جواب دیا۔”گزشتہ ایک ہفتے سے میری جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے“۔

”اس وقت تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں“۔ ملک مراد نے کہا۔”میں شام کے وقت دوبارہ آؤں گا۔تمہارے پاس سوچنے کے لیے کافی وقت ہے، مجھے معلوم ہے کہ تم اصل بات چھپا رہے ہو

لیکن اتنا یاد رکھنا کہ شام کے وقت میں تمہاری زبان سے صرف سچ سننا چاہوں گا۔ اگر تم نے سچ......''

عین اسی وقت افضل کی ماں چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی اور ملک مراد کی بات ادھوری رہ گئی۔

''اماں! ماموں کو سمجھایئے یہ میری بات کا یقین نہیں کرتے''۔ افضل نے ماں کو دیکھتے ہی رونی صورت بنا کر کہا۔ ''گزشتہ ایک ہفتے سے بار بار ایک ہی سوال پوچھے جا رہے ہیں لگتا ہے یہ مجھے پاگل بنا کر چھوڑیں گے''۔

بڑی بہن کو دیکھ کر ملک مراد دوبارہ اسی مونڈھے پر بیٹھ گیا جس پر چند لمحے قبل بیٹھا ہوا تھا۔

افضل کی ماں نے اسے چائے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''مرادے! کیوں میرے چاند کو پریشان کرتا ہے۔ اگر اسے کچھ معلوم ہوتا تو تمہیں بتا نہ دیتا''۔

ملک مراد نے گرما گرم چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپا! اس چاند کو اپنی زبان میں سمجھایئے، مجھے یہ اصل بات نہیں بتا رہا۔ معاملہ کچھ اور ہے جسے یہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ نامعلوم شخص اگر واقعی مویشی چور ہوتا تو کوئی گائے، بیل ضرور ساتھ لے جاتا۔ کیا وہ اس کی آنکھ پھوڑنے کے لیے آیا تھا؟ بخدا! اگر اس کی جگہ میرا جلال یا کمال ہوتا تو اس سے سچ اگلوانے کے لیے میں اب تک اسے الٹا لٹکا چکا ہوتا''۔

''مرادے!'' وہ درشت انداز میں بولی۔ ''تمہاری یہ عجلت پسندی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ صبر کرنا تو تم نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ خدا بخشے بڑے بھیا بھی تمہاری اسی عادت کی وجہ سے اکثر پریشان رہا کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں گاؤں کے لوگ دل سے ہماری عزت کرتے تھے لیکن آج محض تمہارے شر کی وجہ سے وہ دکھاوے کے لیے ہمارے خاندان کی عزت کرتے ہیں۔ تم نے اپنی حرکتوں سے لوگوں کو متنفر کر دیا ہے۔ لگتا ہے میرے بیٹے کی آنکھ بھی تمہاری دشمنی کی نذر ہو گئی ہے''۔

''آپا!'' وہ چلایا۔ ''آپ حد سے بڑھتی جا رہی ہیں۔ آپ کے اس لاڈلے کی آنکھ میری دشمنی کی نہیں بلکہ اس کے اپنے کرتوتوں کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ آپ شاید جانو موچی کی بیٹی والا واقعہ بھول گئی ہیں۔ اس وقت اگر میں جانو موچی کو ڈرا دھمکا کر اور کچھ دے دلا کر باز نہ رکھتا تو بات تھانے کچہری تک پہنچ سکتی تھی اور اسے جیل میں بھی ہو سکتی تھی۔ شکر ادا کرو کہ ملک مراد کی بہن ہو اور یہ احمق بھانجا۔ مجھے نصیحت کرنے کی بجائے اسے سمجھاؤ کہ جوانی کے جوش کو ہوش کے پانی سے بجھا کر رکھے۔ ہر نوجوان لڑکی کو دیکھ کر رال مت ٹپکایا کرے ورنہ کسی دن کوئی سرپھرا اسے ٹپکا ڈالے گا''۔

''تو تم نے اسے بچا کر کون سا احسان کیا ہے مجھ پر؟'' بہن کو غصہ آ گیا۔ ''اس کمی کمین کو چند ہزار روپے ہی تو دیے ہیں تم نے، کس بات پر اتنا اترا رہے ہو؟ کیا ابا جی کی وراثت میں میرا کوئی حصہ



نہیں ہے؟ تمہارے دونوں بیٹے شہر میں پڑھ رہے ہیں، کل کلاں کو وہ بابو بن جائیں گے اور یہ......'' وہ افضل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا کامابن کر رہ گیا ہے۔ اس بن باپ کے بچے پر تمہیں کوئی رحم نہیں آتا۔ ہم ماں بیٹے اگر تم پر بوجھ ہیں تو ہمیں ہمارا حصہ دے کر الگ کر دو۔ ہم تمہارے سہارے کے بغیر بھی جینا جانتے ہیں''۔

بہن کی زبان سے جائیداد کے بٹوارے کی بات سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور اس نے فوراً گرگٹ کی طرح رنگ تبدیل کر لیا۔ بڑی بہن کے جذبات سے کھیلنا اسے بخوبی آتا تھا۔

''صغرا آپا! آپ بھی کمال کرتی ہیں''۔ وہ خوشامدی انداز میں بولا۔ ''بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں آپ لوگوں کو بوجھ سمجھتا ہوں۔ بخدا! جلال اور کمال کی طرح میں افضل کو بھی اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔ میں اگر بار بار افضل کے پاس اس نامعلوم شخص کا پتا معلوم کرنے آتا ہوں تو محض اس لیے کہ اس سے افضل کا بدلہ لے سکوں مجھے تو صرف اپنی آپا کی خوشی مقدم ہے''۔

''تمہیں اگر واقعی میری خوشی مقدم ہے تو آئندہ کبھی بھول کر بھی افضل سے اس نامعلوم شخص کے متعلق سوال نہ کرنا۔ میں خود کوشش کر کے معلوم کر لوں گی، اگر کسی لڑکی وغیرہ کا چکر ہوا تو میں افضل کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ ڈالوں گی''۔ صغرا نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''آپا! آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں ناں؟'' اس نے ندامت سے پوچھا۔

''نہیں، مگر اتنا یاد رکھنا کہ آئندہ اگر تم نے مجھ سے اس لہجے میں بات کی تو میں اپنے حصے کی جائیداد الگ کر لوں گی''۔

''ٹھیک ہے آپا''۔ وہ اجازت طلب انداز میں بولا۔ ''آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی''۔

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور صغرا بیٹے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''کیا تمہارا ماموں ٹھیک کہتا ہے''۔ اس نے افضل سے سختی کے ساتھ پوچھا۔ ''اگر تم کچھ چھپا رہے ہو تو مجھے بتا دو میں وعدہ کرتی ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی''۔

اس نے ماں کی طرف دیکھا اور پھر شکایتی انداز میں بولا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ میری دوسری آنکھ پھوڑنے کی بات کر رہی تھیں۔ میں آپ پر کیسے بھروسہ کر لوں؟''

''ماں اور ماموں میں فرق ہوتا ہے''۔ صغرا نے کہا۔ ''تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ تمہارے ماموں کو ٹالنے کے لیے مجھے جھوٹ بولنا پڑ گیا تھا ورنہ کبھی ماں بھی بیٹے کی آنکھ پھوڑ سکتی ہے؟''

"ماں اگر ملک مراد جیسے شخص کی بہن ہو تو اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ رہ گئی فرق کی بات تو دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اور......"

"افضل!" اس نے گرج کے قطع کلامی کی۔ "تم حد سے زیادہ بدتمیز ہوتے جا رہے ہو، بڑوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے؟"

"اماں!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تمیز درس گاہوں میں سکھائی جاتی ہے اور میں ٹھہرا ملک مراد کا چرواہا، مجھ سے تمیز کی توقع رکھنا خام خیال ہے۔ البتہ آپ کے دونوں بھتیجے یقیناً باتمیز ہوں گے۔ شہر میں پڑھ رہے ہیں ناں، میری طرح ڈھور ڈنگر تھوڑی چرا رہے ہیں"۔

اس نے ایک لمحے کے لیے ترحم آمیز نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر نادم انداز میں بولی۔ "میں مانتی ہوں بیٹے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن کیا کروں میں بھی تو مجبور ہوں ناں! مجھے تمہارے ماموں کے شر سے ڈر لگتا ہے۔ خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ تمہیں کیا معلوم کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے؟"

"جس طرح مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہے بالکل اسی طرح آپ کو بھی نہیں پتا کہ بیٹے کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ آپ بیٹے کی بجائے ہمیشہ بھائی کا ساتھ دیتی ہیں۔ میرا سچ بھی آپ کی نگاہوں میں مشکوک ہے جبکہ ماموں کا شک بھی آپ کو سچ لگتا ہے۔ اس سے بڑی محرومی میرے لیے اور کیا ہو سکتی ہے؟" افضل نے عالمِ یاسیت میں جواب دیا اور ماں لاجواب ہو کر رہ گئی۔

=== ===

صغرا بیٹے کی اس دہری شخصیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ افضل کا احساس محرومی جب کبھی بھی شدت اختیار کرتا تھا وہ کوئی نہ کوئی جرم کر بیٹھتا تھا۔ بارہ سال کی عمر سے وہ اس نفسیاتی مرض کا شکار چلا آ رہا تھا۔ جب بھی اس کی شخصیت کی نفی ہوتی تھی وہ بپھر جاتا تھا اور مخالف پر نتیجے کی پرواہ کیے بغیر ٹوٹ پڑتا تھا۔

جانو موچی کی بیٹی بھی اس کی اسی دیوانگی کا شکار ہوئی تھی۔ انجانے میں ایک بار اس نے افضل کی سانولی رنگت کا مذاق اڑایا تھا اور نتیجے میں اپنی عصمت سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

گاؤں کے اَن پڑھ اور سادہ دل لوگ جو عام بیماریوں کے متعلق بھی کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے وہ بھلا افضل کے اس دوہری شخصیت والے مرض سے کیسے آگاہ ہو سکتے تھے۔ وہ تو افضل کی اس بیماری کو اس کی اکھڑ مزاجی اور نخوت پر محمول کرتے تھے۔ تاہم ملک مراد اس کی اس دوہری شخصیت سے خوب واقف تھا۔

جب سے افضل نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا، تب سے وہ اپنے ماموں ملک مراد کی



نگاہوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ کیونکہ کسی بھی وقت وہ اپنی ماں کے حصے کی جائیداد کا مطالبہ کر کے ملک مراد کے لیے پریشانیاں کھڑی کر سکتا تھا۔

ملک مراد کو جائیداد کا بٹوارہ کسی بھی صورت منظور نہیں تھا، اس لیے وہ افضل کو راستے سے ہٹانے کے لیے اکثر محفوظ طریقے سوچتا رہتا تھا۔ حالیہ واقعے کے بعد بھی بظاہر وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ افضل کی آنکھ پھوڑنے والے نامعلوم شخص کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا مگر دل ہی دل میں وہ اس نامعلوم شخص کو داد دے رہا تھا کیونکہ ایک طرح سے اس نے ملک مراد کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کاش کہ وہ شخص افضل کا قصہ ہی تمام کر دیتا تو ملک مراد کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتی۔ ملک مراد کئی بار ایسا سوچ چکا تھا۔

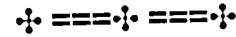
جائیداد کے بٹوارے کے پیش نظر اس نے افضل کو تعلیم نہیں دلوائی تھی، اسے معلوم تھا کہ تعلیم انسان کو شعور وآگہی عطا کرتی ہے، انسانی سوچ کے بند دروازے کھول دیتی ہے اور انسان اپنے حقوق کی خاطر آواز بلند کر دیتا ہے جبکہ اس کے برعکس ایک اَن پڑھ انسان کی سوچ محدود ہوتی ہے، وہ اپنا بھلا سوچ سکتا ہے اور نہ ہی برا بلکہ روزانہ کی ایک نپی تلی روٹین کے تحت ساری زندگی ایک مخصوص دائرے کے اندر بسر کر دیتا ہے۔ سو افضل کی زندگی بھی اسی دائرے کے اندر گزر رہی تھی جو اس کے ماموں ملک مراد نے اس کے اردگرد کھینچ رکھا تھا۔

گزشتہ دو برس سے وہ افضل کی نفسیاتی بیماری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تاحال کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ جانو موچی تو اس کی توقع سے بھی زیادہ بزدل نکلا تھا۔ اس نے جانو موچی کے ہاتھوں افضل کو ٹھکانے لگوانے کے لیے بہتیری چالیں چلی تھیں، اپنے کئی کارندوں کے ذریعے اس کے جذبات کو بھڑکانے کی کوششیں کی تھیں مگر جانو کسی طرح بھی افضل کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے راضی نہیں ہوا تھا۔

تاہم افضل کے ساتھ پیش آنے والے اس نئے واقعہ نے ملک مراد کی سوچوں کو ایک نئی راہ دکھا دی تھی۔ افضل کی آنکھ پھوڑنے والا شخص یقیناً اس کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا، اس لیے وہ اسے بڑی سرگرمی کے ساتھ تلاش کر رہا تھا۔

ملک مراد افضل کی اندرونی کیفیت سے لاعلم تھا اور افضل اندر ہی اندر ایک نادیدہ آگ میں جل رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر زینب پر طیش آ رہا تھا مگر واقعہ ابھی تازہ تھا۔ اسے کچھ عرصہ خود پر جبر کر کے صبر کا مظاہرہ کرنا تھا اور واقعہ کے پرانا ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ اب کی بار وہ زینب پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا بلکہ مکمل تیاری اور منصوبے کے ساتھ اسے گھیرنا چاہتا تھا، بالکل اس باز کی طرح جو کبھی کمزور چڑیا کو پھڑ پھڑانے کی مہلت نہیں دیتا۔ اسے معلوم تھا کہ زینب دوبارہ جنگل کی طرف لکڑیاں چننے کے لیے

جائے گی۔ وہ نہ صرف اس کی عزت پامال کرنے کی قسم کھا چکا تھا بلکہ اسے جان سے مارنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ ایک ہفتہ آرام کرنے کے بعد وہ دوبارہ مویشی چرانے کے لیے جانے لگا تھا۔ ہتھیار کے طور پر اب وہ کلہاڑی کی بجائے رائفل ساتھ رکھنے لگا تھا کیونکہ ملک مراد نے اسے دوٹوک الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ اگر کہیں بھی وہ نامعلوم شخص نظر آجائے تو بلا جھجک اسے گولی مار دینا۔



جہانداد پورے گاؤں میں غازی کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ چھوٹے بڑے سب اسے جہانداد غازی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہفتہ دس دن آرام کرنے کے بعد اس نے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ قاسم علی کو جہانداد کی واپسی نے پھر سے جوان کر دیا تھا۔ باپ بیٹے نے اب مل کر کھیتی باڑی کا کام سنبھال لیا تھا۔ دونوں صبح کے نکلتے دن ڈھلے گھر پہنچتے تھے۔

جہانداد کے لیے اب زندگی کا مفہوم ہی بدل چکا تھا۔ قید و بند کی ساری صعوبتیں اس کے لیے ماضی کا ایک قصہ بن کر رہ گئی تھیں۔ دشمن کی قید سے زندہ لوٹ آنا جہاں اس کے لیے خوش نصیبی کی بات تھی وہاں اس کے اہل خانہ کے لیے بھی ایک پُرمسرت زندگی کا پیام تھا۔

ان کی آبائی زمین ملک مراد کی وسیع و عریض جاگیر کے ساتھ لگتی تھی، اس لیے یہ اراضی اس کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی تھی۔ جہانداد کی واپسی سے قبل ملک مراد متعدد بار قاسم علی کی اراضی خریدنے کی کوششیں کر چکا تھا مگر قاسم علی کسی بھی قیمت پر اپنے پُرکھوں کی چھوڑی ہوئی زمین بیچنے کے لیے تیار نہ ہوا تو ملک مراد نے اسے تنگ کرنے کے لیے اپنے مخصوص حربے شروع کر دیے تھے۔

قاسم علی کئی بار ملک مراد کے مزارعوں سے جھگڑ چکا تھا، کیونکہ وہ بوائی کے موسم میں جان بوجھ کر اس کی اراضی پر چند گام چڑھ آتے تھے۔ اس زمانے میں ٹریکٹرز اتنے عام نہیں ہوئے تھے۔ صرف شہروں تک محدود تھے۔ دیہاتوں میں کاشت کاری کے لیے بدستور بیلوں سے کام لیا جاتا تھا۔ قاسم علی کے پاس بیلوں کی دو جوڑیاں موجود تھیں جن سے کاشت کا کام لیا جاتا تھا۔

بظاہر جہانداد کی زندگی بڑی پُرسکون گزر رہی تھی تاہم کبھی کبھار افضل والے معاملے کے متعلق سوچتے ہوئے وہ پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے انہیں کبھی نہ کبھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا ہی تھا۔

دوسری طرف ملک مراد کے لیے اب ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ افضل کا وجود ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ افضل نے اسے اب تک سچ نہیں بتایا تھا اور یہ بات ملک کی اَنا کو ٹھیس پہنچانے کے لیے کافی تھی۔



ایک دن سہ پہر کے وقت ملک مراد نے اپنے ان دو خاص کارندوں کو بلوا لیا جو اس کا ہر جائز ناجائز حکم بلا چوں و چراں مان لیتے تھے۔ ملک مراد کئی بار ان دونوں سے غیر قانونی کام کروا چکا تھا۔ وہ دونوں صرف اپنے کام سے کام رکھتے تھے اچھے برے کے جھنجھٹ میں کبھی نہیں پڑتے تھے۔ ایک کا نام دلاور تھا جبکہ دوسرے کا شیر محمد عرف شیرا تھا۔

ان دونوں کے حاضر ہوتے ہی ملک مراد نے بلاتمہید کہا۔ ”تم دونوں کو کچھ معلوم ہے کہ میں گزشتہ ایک ماہ سے کیوں پریشان ہوں؟“

”ملک صاحب! ہم کوئی نجومی تو نہیں ہیں“۔ دلاور نے جواب دیا۔ ”آپ کچھ بتائیں گے تو معلوم ہوگا ناں؟“

دلاور کا جواب سن کر ایک لمحے کے لیے ملک مراد کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہو کر معدوم ہو گئے۔ اگر دلاور اس کا خاص آدمی نہ ہوتا تو شاید وہ اسے خوب برا بھلا کہتا مگر یہ موقع اسے جھڑکنے کا نہیں تھا۔

”دلاور!“ ملک مراد نے غصے کو دبا کر نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے افضل اور قاسم علی سے ایک ساتھ نمٹنے کا منصوبہ ترتیب دے دیا ہے مگر یہ منصوبہ تم دونوں کے تعاون کے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا“۔

”آپ حکم کریں ملک صاحب!“ دلاور نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ”کیا ان دونوں کو ٹھکانے لگانا ہے؟“

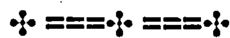
”ارے نہیں“۔ ملک مراد نے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”فی الحال انہیں ٹھکانے لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے البتہ ایک چوری کرنی ہے مگر ذرا ہوشیاری سے“۔

”کس کے گھر میں ملک صاحب؟“ دلاور نے استفسار کیا۔

”قاسم علی کے گھر میں لیکن ذرا بچ بچا کے، سنا ہے اس کا فوجی بیٹا بڑا ہوشیار آدمی ہے“۔

”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!“ ان دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ”کرنا کیا ہے صرف یہ بتائیں؟“

”بھئی تم دونوں کی یہی دلیری تو مجھے پسند ہے“۔ اتنا کہہ کر ملک مراد نے ان دونوں کو اپنے قریب بلا کر سرگوشیوں میں کچھ بتانا شروع کر دیا۔



اُس وقت تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ فتح پور گاؤں کی فضا پر ایک سکوت طاری تھا تاہم کبھی کبھی کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز آتی اور یہ سکوت لمحہ بھر کے لیے مجروح ہو کر رہ جاتا تھا۔ گاؤں

کی گلیاں کوچے سنسان پڑے ہوئے تھے۔ چاند کی ابتدائی تاریخیں ہونے کی وجہ سے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ البتہ اِکا دُکا مکانوں سے مریل سی روشنی پھوٹتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ یہ روشنی لالٹین اور مٹی کے چراغوں کی تھی کیونکہ بجلی کی سہولت ابھی تک فتح پور گاؤں تک نہیں پہنچی تھی۔

دلاور اور شیرا کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر ملک مراد کی حویلی سے نکلے اور تیز تیز قدموں سے چ ہوئے ایک طرف روانہ ہو گئے۔ مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ قاسم کے گھر کی ڈیوڑھی کے سامنے پہنچ گئے۔ چند لمحے وہاں ٹھہر کر وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ پھر ڈیوڑھی کو چھوڑ کر حویلی کی دیوار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سات آٹھ فٹ اونچی یہ دیوار مٹی کی بنی ہو تھی۔ ذرا دیر وہ دونوں دیوار کا جائزہ لیتے رہے اور پھر دیوار پھاند کر حویلی کے اندر دروازے تک پہ گئے۔ کنڈی کھول کر انہوں نے دروازے کو معمولی سا دھکیلا اور پھر حویلی کے اس کونے کی طرف بڑھ گئے جہاں مویشی بندھے ہوئے تھے۔

گرمیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے قاسم اور اس کے اہلِ خانہ صحن میں سوئے ہوئے تھے مگر ان کی چارپائیاں مویشیوں کی کھرلیوں سے کافی فاصلے پر بچھی ہوئی تھیں۔

''اگر کوئی جاگ گیا تو پھر کیا ہوگا؟'' شیرا نے دلاور سے سرگوشی میں پوچھا۔

''ہونا کیا ہے؟'' دلاور نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''دخل اندازی کرنے والے کو سیدھا اوپر پہنچا دیں گے۔ کیا تمہیں ملک صاحب کا حکم یاد نہیں رہا؟''

''نہیں ایسی بات تو نہیں ہے، لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''لیکن کیا؟'' دلاور نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''بلاوجہ کی خون ریزی مجھے ناپسند ہے، اس لیے میں بھاگنے کو ترجیح دوں گا''۔

''ملک مراد تمہیں اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے گا، اس لیے الٹی سیدھی حرکت کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے ٹھیک''۔ شیرا نے اکتا کر جواب دیا۔ ''اب بیل کھولو اور چلنے کی تیاری کرو خوامخواہ باتوں میں وقت ضائع مت کرو، ایسا نہ ہو کہ کوئی جاگ جائے''۔

''اچھا بس اب چپ رہو'' اتنا کہہ کر دلاور ایک بیل کی کھونٹی کی طرف بڑھ گیا۔

بیل کھول کر اس نے رسی شیرا کو تھمائی اور دوسری کھونٹی کی طرف بڑھ گیا۔ ان کی بدقسمتی کہ دوسرا بیل کسی بھی اجنبی شخص کو اپنے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ دلاور نے جونہی اس کی کھونٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا، بیل نے اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے نتھنوں سے پھنکار کی آواز نکالی اور پھر جھکے ہوئے دلاور کی پشت پر ایک بھرپور ٹکر رسید کر دی۔ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ دلاور کے منہ سے ایک دردناک آہ نکلی



اور وہ سیدھا سر کے بل کھرلی میں جا گرا۔ صورتِ حال کو بگڑتے دیکھ کر شیرا نے آگے بڑھ کر بیل کو پچکارنے کی کوشش کی مگر بیل اسے دیکھ کر اور بھی غصے سے پھنکارنے لگا اور اگلے کھر زور زور سے زمین پر مارنے لگا۔ اسی دوران دلاور کو کھرلی سے اٹھنے کا موقع مل گیا مگر اس کی چال میں لنگڑاہٹ تھی۔

''تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟'' شیرا نے بے خیالی سے اونچی آواز میں پوچھا لیکن دلاور کو جواب دینے کا موقع نہ مل سکا، کیونکہ قاسم علی اور جہانداد کی آنکھ ایک ساتھ کھل گئی تھی۔ وہ دلاور شیرے اور بیل کی آوازیں سن کر جاگ گئے تھے۔

''شاید کچھ گڑبڑ ہے''۔ قاسم علی نے اونچی آواز میں کہا اور پھر چارپائی چھوڑ کر ننگے پیر بندھے ہوئے مویشیوں کی طرف بھاگا۔

''بھاگو......کوئی آ رہا ہے''۔ شیرا بیل کی رسی چھوڑ کر ڈیوڑھی کی طرف بھاگتے ہوئے بولا۔

دلاور کو چاروناچار اس کی پیروی کرنا پڑی کیونکہ بیل کی ٹکر نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ اس کی کلہاڑی بھی وہیں کھرلی میں رہ گئی تھی۔ ایسی نازک صورتِ حال میں وہ ملک مراد کا حکم بھول کر اندھا دھند ڈیوڑھی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسے اپنے عقب میں قاسم علی اور جہانداد کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس لیے لنگڑانے کے باوجود اس کی رفتار غیر معمولی تھی۔

ملک مراد کی حویلی تک پہنچتے پہنچتے ان دونوں کی حالت بری ہو چکی تھی۔ دونوں تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہے تھے۔ دلاور، شیرا کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا مگر وہ خاموش تھا۔

''بزدل کی اولاد! اگر تم ذرا ہمت سے کام لیتے تو کم از کم ہم ایک بیل لے آنے میں ضرور کامیاب ہو سکتے تھے''۔ دلاور نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے غصے سے کہا۔ ''اب ہم ملک صاحب کو کیا جواب دیں گے؟''

''ملک صاحب کو جواب تو کسی نہ کسی طرح دے ہی دیں گے لیکن تمہاری کلہاڑی کہاں ہے؟'' شیرا نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

''کلہاڑی کو چھوڑ، وہ وہیں کھرلی میں رہ گئی ہے''۔ دلاور نے جواب دیا۔ ''اب صرف ملک صاحب کو جواب دینے کے بارے میں سوچ''۔

''ارے احمق''۔ شیرا نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''کلہاڑی کے پھل پر تمہارا نام کندہ ہے جو تم نے بڑے شوق سے کرایا تھا اور بقول ملک صاحب کے جہانداد ایک خطرناک شخص ہے۔ کیا وہ تمہیں چھوڑ دے گا؟''

''چھوڑ یار! ایک کلہاڑی کے ذریعے وہ مجھے چور ثابت نہیں کر سکتا۔ بس میں صرف ملک صاحب سے ڈر رہا ہوں۔ وہ ہماری یہ غلطی باآسانی معاف نہیں کریں گے''۔

"پہلے تو شاید ملک صاحب معاف کر دیتے مگر تمہاری کلہاڑی کے متعلق سن کر مجھے یقین معاف کرنے کی بجائے ہماری کھال اتارنے کے لیے تیار ہو جائیں گے"۔ شیرا نے جواب دلاور تاؤ کھا کر رہ گیا۔

٭ === ٭ === ٭

قاسم علی کے لیے یہ معمول کی بات تھی، کیونکہ وہاں اس قسم کی چوریاں اکثر ہوتی رہتی تھ البتہ جہانداد کے لیے چوروں کا یہ اقدام ناقابلِ برداشت تھا۔ گزشتہ رات سے وہ سخت غصے میں اس وقت بھی اس نے بھاگ کر چوروں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کے ہاتھ نہیں لگے کھرلی سے انہیں کلہاڑی مل گئی تھی، جو جہانداد نے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لی تھی۔ گوکہ یہ کوئی ا سراغ نہیں تھا مگر جہانداد پھر بھی مطمئن تھا کیونکہ سندھی ساخت کی وہ کلہاڑی اس علاقے میں استع ہونے والی عام کلہاڑیوں سے بہت مختلف تھی۔ ایسی کلہاڑی ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی تھی۔ ملکوں کارندے، شوقین لوگ یا پھر بدمعاش ٹائپ لوگ رکھتے تھے۔

رات کے وقت تو جہانداد نے کلہاڑی سرسری نگاہوں سے دیکھ کر رکھ دی تھی۔ مگر جب صبح نے کلہاڑی کو غور سے دیکھا تو دلاور کا نام اس سے چھپا نہ رہ سکا۔ یہ اس کے لیے ایک اہم انکشا تھا۔ ایک دلاور کو تو وہ بڑی اچھی طرح جانتا تھا، وہ ملک مراد کا ایک اہم کارندہ تھا۔ جہانداد اس متعلق گاؤں کے لوگوں سے بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس سلسلے میں جب اس نے اپنے باپ سے با تو وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔

"جہانداد! میں جانتا ہوں کہ تمہیں اس بات کا سخت قلق ہے کہ چور تمہارے ہاتھوں بچ نک بیٹا یہ بھی تو سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کتنی مہربانی کی ہے۔ اگر چور کامیاب ہو جاتے تو کی ہوتا؟ میری مانو تو اس واقعے کو بھول جاؤ کیونکہ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔ تم دلاور سے ٹکر لے سکتے وہ ملک مراد کا خاص آدمی ہے۔ ملک مراد اس کے متعلق کوئی بات نہیں سنے گا"۔

"نہیں ابا جی"۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے گھر میں گھسنے والے کسی بھی شخ معاف نہیں کر سکتا۔ دلاور کی جگہ اگر ملک مراد بھی ہوتا تو میں اسے بھی نہ چھوڑتا۔ میں دلاور سے باز پرس کی کروں گا۔ وہ اگر ملک مراد کا آدمی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اسے بلا اجا لوگوں کے گھروں میں گھسنے اور چوری کرنے کا حق حاصل ہے"۔

"سمجھنے کی کوشش کرو جہانداد! ملک مراد کو دشمنی کرنے کے لیے صرف ایک بہانے کی ضرو ہے اور تم میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہو۔ میں تمہیں دشمنی کی آگ میں نہیں جھونک سکتا"۔

"ہم پنچایت بھی تو بٹھا سکتے ہیں ناں!" جہانداد نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "دلاور کی کلہ



اس کے خلاف ایک ناقابل تردید ثبوت بن جائے گی اور پھر اسے اس جرم کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ ہم اگر چپ رہے تو کل کلاں کو وہ پھر ایسا کر سکتے ہیں"۔

"میں جس دشمنی کی آگ سے اب تک اپنا دامن بچاتا آیا ہوں، تم اس آگ میں اندھا دھند کیوں کودنا چاہتے ہو؟ تم شاید اچھی طرح ملک مراد کو نہیں جانتے۔ وہ ایک زہریلا ناگ ہے۔ اس لیے اس سے بچ کر رہو"۔ قاسم علی نے قدرے غصے سے کہا۔

"میں بزدل نہیں ہوں ابا جی"۔ اس نے نڈر انداز میں کہا۔ "میں اس واقع کی چھان بین ضرور کروں گا اور یہ میرا حق ہے"۔

اس کے بعد قاسم علی کافی دیر تک جہانداد کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ تھک ہار کر قاسم علی نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

٭ === ٭ === ٭

ادھر دلاور اور شیرا، ملک مراد کے سامنے پیش ہو چکے تھے۔ پہلے تو ملک مراد نے انہیں ناکام لوٹنے پر خوب لعنت ملامت کی دونوں چپ چاپ اور سر جھکا کر ملک مراد کی ملامت سنتے رہے، لیکن جب شیرا نے ہمت کر کے ملک مراد کو کلہاڑی کھو جانے کے متعلق بتایا تو وہ ایکدم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"سؤر کی اولاد!" وہ دلاور کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے دھاڑا۔ "تمہیں معلوم ہے کلہاڑی کے پھل پر تمہارا نام کندہ تھا اور قاسم علی کا بیٹا نہ صرف پڑھا لکھا ہے بلکہ ایک فوجی جوان بھی ہے۔ وہ اگر وطن کی خاطر لڑ سکتا ہے تو کیا اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خاموش رہ سکے گا۔ بزدل انسان! تمہیں وہاں کلہاڑی چھوڑتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ بولو، جواب دو؟"

"ملک صاحب!" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ "خدا کی قسم، میں نے جان بوجھ کر وہاں کلہاڑی نہیں چھوڑی ہے۔ دراصل حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ مجھے کلہاڑی کا خیال ہی نہ رہا"۔

اتنا کہہ کر اس نے پورا واقعہ بیان کر دیا مگر ملک مراد کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو سکا۔ وہ بدستور غصے سے بول رہا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی کوئی جواز سننا چاہتا ہوں۔ اگر جہانداد یا اس کا باپ تمہاری تلاش میں میرے پاس آئے تو میں انہیں صاف صاف بتا دوں گا کہ میرا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے تم جانو اور دلاور"۔

"لل...... لیکن ملک صاحب! اس میں میرا کیا قصور ہے"۔ وہ منت کے انداز میں بولا۔ "میں نے تو جی آپ کا حکم مان کر ان کے گھر میں چوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر بدقسمتی سے میں ناکام ہو

گیا ہوں تو آپ مجھے بے آسرا چھوڑنے لگے ہیں۔ یہ انصاف تو نہ ہوا ناں جی''۔

''دیکھو''۔ ملک مراد نے جواب دیا۔''تم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ تمہاری کلہاڑی تمہارے خلاف ایک اہم ثبوت ہے۔ اگر انہوں نے پنچایت طلب کر لی تو میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکوں گا''۔

''جب ان کے ہاں چوری ہوئی ہی نہیں ہے، تو وہ کیسے پنچایت بٹھا سکتے ہیں؟''

''تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے''۔ ملک مراد نے کہا۔''بہتر ہوگا کہ تم چند دنوں کے لیے کہیں غائب ہو جاؤ۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو میں تمہیں بلوا لوں گا''۔

اتنا کہہ وہ شیرا کی طرف متوجہ ہو گیا۔''اور تم بھی اس کے ساتھ جاؤ گے۔ میں تم دونوں کی غیر موجودگی میں معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا''۔

''ٹھیک ہے ملک صاحب''۔ دلاور نے فوراً جواب دیا اور شیرا نے اس کی تائید کی۔

اس کے بعد دلاور اور شیرا اسی دن ملک مراد کے ایما پر فتح پور چھوڑ کر چلے گئے۔ اپنے منصوبے کی ناکامی نے وقتی طور پر ملک مراد کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے چلا تھا مگر قسمت کی نامہربانی سے معاملہ الٹ ہو گیا تھا۔ جہانداد سے ابھی تک اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے بارے میں وہ بہت کچھ سن چکا تھا، اس لیے اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر دلاور اور شیرا کو گاؤں سے باہر بھیج دیا تھا۔

اسی روز ظہر کے بعد جہانداد اپنے چچا حاکم علی کے ساتھ ملک کے مراد کی حویلی میں پہنچ گیا۔ دلاور کی کلہاڑی بھی جہانداد کے ہاتھ میں تھی۔ ایک ملازم کے ذریعے انہوں نے ملک مراد کو پیغام بھیج دیا اور پھر اس کا انتظار کرنے لگے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ملک مراد دو مسلح محافظوں کے ساتھ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا اور وہ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ملک مراد انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گیا۔ دونوں باڈی گارڈز چوکنے انداز میں ملک مراد کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

''ہاں بھئی حاکم علی! کیسے آنا ہوا؟'' ملک مراد نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

''ملک صاحب!'' حاکم علی مؤدب انداز میں بولا۔''ہم آپ کے پاس ایک شکایت لے کر آئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری بات نہ صرف غور سے سنیں گے بلکہ ہماری مدد بھی کریں گے''۔

''ضرور کریں گے حاکم علی! بلا جھجک بتاؤ کس نے زیادتی کی ہے تم لوگوں کے ساتھ؟''



''ملک صاحب! زیادتی تو آپ کے خاص آدمی دلاور نے کی ہے''۔ حاکم علی کی بجائے جہانداد بولا۔''اس نے ہماری حویلی میں داخل ہو کر چوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر بروقت میرے باپ کی اور میری آنکھوں نہ کھلتی تو دلاور اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکا تھا''۔

''برخوردار! تم کسی ثبوت کے بغیر میرے ایک قابلِ اعتماد ملازم پر الزام لگا رہے ہو، حالانکہ وہ بے چارا گزشتہ تین دنوں سے گاؤں میں موجود ہی نہیں ہے''۔

''ثبوت بھی ہے ملک صاحب!'' جہانداد نے پُرجوش انداز میں کہا۔''یہ کلہاڑی آپ کے اسی قابلِ اعتماد ملازم کی ہے۔ اس کے پھل پر آپ اس کا نام ملاحظہ کر سکتے ہیں''۔

''ادھر لاؤ کلہاڑی''۔ ملک مراد نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''کہاں لکھا ہے دلاور کا نام''۔

جہانداد نے آگے بڑھ کر کلہاڑی ملک مراد کے حوالے کر دی۔

ملک مراد نے چند لمحوں کے لیے غور سے کلہاڑی کے پھل کو دیکھا اور پھر اس کے لبوں پر ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ جہانداد اور حاکم علی غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ ملک مراد کی استہزائیہ مسکراہٹ کو سمجھنے میں ناکام ہو رہے تھے۔

''ارے واقعی اس کے پھل پر تو دلاور کا نام موجود ہے''۔ ملک مراد مکارانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔''میں تمہارا شکر گزار ہوں نوجوان! دراصل یہ کلہاڑی ایک ہفتہ قبل دلاور سے کہیں کھو گئی تھی''۔

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب''۔ حاکم علی پریشانی کے عالم میں بولا۔''ہم تو آپ کے پاس شکایت لے کر آئے تھے۔ آپ ہماری مدد کرنے کی بجائے ایک چور کو بچانا چاہ رہے ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے؟''

''کچھ چوری ہوا ہے تم لوگوں کا؟'' ملک مراد نے عیاری سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ بہت غلط کر رہے ہیں''۔ جہانداد نے جواب دیا۔''میں دلاور کو چھوڑوں گا نہیں''۔

''کیا کر لو گے تم؟'' ملک مراد نے حقارت سے جہانداد کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔''اب تو تمہارے پاس ثبوت بھی نہیں رہا''۔

اتنا کہہ کر اس نے کلہاڑی ایک باڈی گارڈ کے حوالے کر دی اور دوبارہ جہانداد کو تمسخرانہ انداز میں دیکھنے لگا۔''تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم اس واقعہ کو بھول جاؤ۔ ابھی تم نوجوان ہو اس لیے زندگی سے پیار کرو''۔

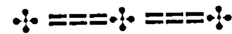
ملک مراد اسے واضح الفاظ میں دھمکی دے رہا تھا۔ وہ سرتا پا غصے کی آگ میں جل رہا تھا مگر مسلح باڈی گارڈز کی موجودگی میں وہ کوئی بھی اشتعال انگیز قدم اٹھانے سے باز رہا۔ موجودہ صورتِ حال میں اسے ملک مراد کا پلہ واضح طور پر بھاری دکھائی دے رہا تھا۔ اگر جوش میں آکر وہ کلہاڑی چھیننے کی کوشش کرتا تو یقیناً نقصان اٹھاتا، اس لیے اپنے اندر اٹھنے والے ابال کو وہ تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرنے لگا۔ ملک مراد کے دونوں باڈی گارڈز اسے کینہ توز نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

لمحہ بھر وہ ملک مراد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ ملک مراد کی آنکھیں اسے زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ میں حاکم ہوں اس گاؤں کا اور تم رعایا میں سے ہو تم چاہتے ہوئے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور میں سب کچھ کر سکتا ہوں، مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ تمہارے دل ودماغ میں اگر کوئی الٹا سیدھا خیال اٹھ رہا ہے تو اسے نظر انداز کر دو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے کیونکہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔

''آج بازی تمہارے ہاتھ میں ہے ملک مراد!'' وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میں بزدل نہیں ہوں''۔

اتنا کہہ کر وہ حاکم علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''چلیے چچا جان! جب ملزم اور منصف ایک ہو جائیں تو پھر اسی طرح انصاف ہوا کرتا ہے''۔

ملک مراد کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے حویلی سے باہر نکل گئے۔



ملک مراد ایک کایاں شخص تھا۔ وہ دشمن کی پیٹھ پر وار کرتا تھا۔ آج تک سامنے آکر اس نے کسی کو بھی للکارنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر تھوڑی دیر پہلے اپنے ایک کارندے کو بچانے کی خاطر وہ جہانداد کو واشگاف الفاظ میں دھمکی دے چکا تھا۔ جواب میں جہانداد نے بھی جاتے جاتے اسے باور کرا دیا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ اپنے حق کی خاطر ہتھیار اٹھا سکتا ہے۔ ملک مراد کو وہ فتح پور کے عام آدمیوں سے بہت مختلف لگا تھا۔ وہ ٹھنڈے دل ودماغ کا نظر آرہا تھا اور یہی بات اسے ایک خطرناک شخص ثابت کرتی تھی۔ ایسا شخص موقع ملنے پر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس لیے ملک مراد اس کی طرف سے بہت محتاط ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہانداد زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھے گا۔

ایک ہفتے کے بعد دلاور اور شیرا جب واپس فتح پور پہنچے تو ملک مراد نے فوراً انہیں بلوا لیا۔ دلاور کو ساری بات بتانے کے بعد ملک مراد نے اسے سخت تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کچھ عرصہ جہانداد کی طرف سے محتاط رہنا ہوگا۔ موقع ملنے پر وہ ضرور تم پر وار کرنے کی کوشش کرے گا''۔



''ملک صاحب!'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''آپ بلاوجہ اسے اتنی اہمیت دے رہے ہیں حالانکہ وہ کل کا لونڈا مجھ سے ٹکرانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ بفرضِ محال اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش کی تو میں اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر رکھ دوں گا''۔

''تمہاری یہی حماقت کی حد تک بڑھی ہوئی خود اعتمادی کسی دن تمہارے گلے کے لیے پھندا بن جائے گی''۔ ملک مراد نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ جہانداد عام آدمی نہیں ہے۔ وہ ایک تربیت یافتہ فوجی ہے، تم پر اس وقت وار کرے گا جب تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا محتاط رہنے میں ہی تمہاری بھلائی ہے''۔

''یہ تو ٹھیک ہے ملک صاحب، لیکن میں کب تک اس سے چھپتا پھروں گا؟''

''تب تک جب تک میں اس کا کوئی مناسب بندوبست نہیں کر لیتا۔ دراصل میرے ذہن میں اس کے خلاف ایک منصوبہ ہے اور اب اس منصوبے پر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے''۔

''کون سا منصوبہ ملک صاحب؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔ ''کچھ مجھے بھی تو پتا چلے؟''

ملک مراد نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ ''دراصل میں جہانداد اور افضل کو آپس میں ٹکرانا چاہتا ہوں۔ ان دونوں میں سے ایک مارا جائے گا اور دوسرا پھانسی کے تختے تک پہنچ جائے گا۔ دونوں صورتوں میں فائدہ میرا ہونا ہے مگر شاید افضل آسانی سے میری بات نہیں سنے گا''۔

''میں افضل سے کہوں گا''۔ دلاور جھٹ سے بولا۔ ''آپ بتائیں تو سہی اس سے کہنا کیا ہے؟ مجھے یقین ہے وہ میری بات ضرور مانے گا''۔

ملک مراد نے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے کچھ عرصہ پہلے ایک نامعلوم شخص نے افضل کی آنکھ پھوڑ ڈالی تھی اور کوشش کے باوجود ہم اس شخص کا سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے؟''

دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو ملک مراد دوبارہ بولا۔ ''اب یوں سمجھو کہ وہ نامعلوم شخص جہانداد تھا۔ بس افضل کو یہ یقین دلانے کی دیر ہے، اس کے بعد کیا ہوگا یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ افضل بھوکے عقاب کی طرح جہانداد پر جھپٹ پڑے گا، پھر یا تو جہانداد کو مار ڈالے گا یا خود اس کے ہاتھوں جہنم رسید ہو جائے گا۔ ہر دو صورتوں میں ہمارا راستہ صاف ہو جائے گا''۔

''میں سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ خوشی سے باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی یہ ترکیب ضرور کارگر ہوگی۔ افضل ایک لمحے کے لیے بھی ابھی تک اس نامعلوم شخص کو نہیں بھلا سکا۔ میں آج ہی اس سے بات کرتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے لیکن ذرا ہوشیاری سے بات کرنا۔ افضل کی ماں کو اس معاملے کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ اگر تم نے پھر کوئی حماقت دکھائی تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گا''۔

''آپ......آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب! میں کوئی احمق تھوڑی ہوں''۔ اس نے پُرعزم انداز میں جواب دیا۔''افضل کی ماں کیا، کسی کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ میں افضل کو ایسی پٹی پڑھاؤں گا کہ وہ جہانداد کو گولی مارنے کے لیے تیار ہو جائے گا''۔

''اگر ایسا ہو گیا تو سمجھو میرا راستہ صاف ہے''۔ ملک مراد نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔''میں تمہیں توقع سے بڑھ کر انعام سے نوازوں گا''۔

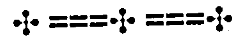
''ایسا ضرور ہوگا ملک صاحب! یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ آپ چند دنوں کے اندر سن لیں گے کہ ان میں سے کوئی ایک، دوسرے کے ہاتھوں مارا گیا ہے یا زخمی ہو گیا ہے''۔

''میں اس خوش خبری کا شدت سے منتظر رہوں گا''۔ ملک مراد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔''تم آج سے افضل کے کان بھرنا شروع کر دو مگر یہ خیال رہے کہ اس کے سامنے میرا ذکر بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ وہ تمہاری بات کا یقین بالکل نہیں کرے گا''۔

''میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ملک صاحب''۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''میں افضل کے سامنے آپ کا ذکر بھول کر بھی نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بیوقوف آپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے حالانکہ آپ......''

''بس''۔ ملک مراد نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔''تم سے جو کہا گیا ہے وہ کرو، میری تعریف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

اتنا کہہ ملک مراد نے ان دونوں کو رخصت کر دیا۔



ملک مراد کی حویلی سے ناکام لوٹنے کے بعد جہانداد مسلسل انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کی اس قدر سبکی ہوئی تھی۔ وہ تو ملک مراد، سے انصاف مانگنے کے لیے گیا تھا۔ مگر اس ظالم شخص نے اس کی بات سننے کی بجائے اسے بے عزت کر کے حویلی سے باہر نکال دیا تھا۔ عالمِ طیش میں چند دن تو وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ دلاور کو تلاش کرتا رہا لیکن جب دلاور اسے گاؤں میں کہیں بھی نظر نہ آیا تو وہ تھک ہار کر دوبارہ باپ کے ساتھ اپنی زرعی اراضی کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔

قاسم علی بھی اپنی جگہ خوش تھا کہ جہانداد چوری والے واقعہ کو فراموش کر چکا ہے۔ تاہم وہ اب بھی جہانداد کو سمجھاتا رہتا تھا کہ ملک مراد اور دلاور جیسے لوگوں کی دشمنی بہت خطرناک ثابت ہوگی، اس لیے ان کے منہ لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زینب بھی موقع ملنے پر اسے سمجھاتی رہتی تھی۔ جہانداد وقتی طور پر زینب اور باپ کی ناصحانہ باتیں سن کر متاثر ہو جاتا تھا مگر جب تنہائی میں اسے اپنی بے عزتی کا خیال آتا تو اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ ملک مراد اگر اس سے اچھے طریقے سے بات کر لیتا تو شاید



اس نے اسی وقت دلاور کو معاف کر دیا ہوتا لیکن ملک مراد نے تو اسے اہمیت دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ الٹا اس نے بات کو بڑھا دیا تھا۔

اب وہ دلاور کو معاف کرنے کے لیے قطعی راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ہر صورت میں دلاور کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ خاندان میں سے صرف اس کے چچا حاکم علی نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ جہانداد کی طرح وہ بھی ایک نڈر اور اصول پسند شخص تھا۔ جہانداد نہ صرف یہ کہ اس کا بھتیجا تھا بلکہ ہونے والا داماد بھی تھا اور اپنے داماد کی خاطر وہ ملک مراد تو کیا زمانے بھر کی دشمنی مول لینے کے لیے تیار تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت حاکم علی بھائی کے گھر میں داخل ہوا اور سب کی نگاہیں بچا کر جہانداد کو ایک مخصوص اشارہ کرنے کے بعد باہر نکل گیا۔ چچا کے جانے کے تھوڑی دیر بعد جہانداد بھی ایک ضروری کام کا بتا کر گھر سے باہر نکلا اور سیدھا اس مخصوص ٹھکانے پر پہنچ گیا جہاں حاکم علی شدت سے اس کا منتظر تھا۔

''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے''۔ حاکم علی اسے دیکھتے ہی پُرمسرت انداز میں بولا۔''میں نے آج دلاور کو دیکھا ہے۔ وہ یہیں گاؤں میں موجود ہے''۔

''کب؟ کس وقت؟'' جہانداد نے بے تابی سے استفسار کیا۔ دلاور کا نام سنتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

''آج دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ، میں نے اسے افضل کے ساتھ دیکھا ہے۔ افضل کو تو جانتے ہو ناں! ملک مراد کا بھانجا ہے''۔

''وہی افضل ناں جس کی کچھ عرصہ پہلے کسی نے آنکھ پھوڑ ڈالی تھی''۔ جہانداد نے پوچھا اور حاکم علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چچا، میں دلاور کو سبق ضرور سکھاؤں گا''۔ جہانداد نے جوش سے کہا۔''اس نے ہمارے گھر میں گھس کر بہت برا کیا ہے۔ شاید وہ ملک مراد کی پشت پناہی کی وجہ سے خود کو بہت اونچی چیز سمجھتا ہے لیکن جب اونٹ پہاڑ تلے آئے گا تب اس کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی''۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ اسے سبق سکھانا ہی پڑے گا''۔ حاکم علی نے جواب دیا۔''بس موقع ملنے کی دیر ہے پھر دونوں مل کر اس کا وہ حشر کریں گے کہ وہ عمر بھر یاد رکھے گا''۔

''موقع ہمیں ڈھونڈنا پڑے گا۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو موقع کہاں سے ملے گا؟ میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں آج ہی اس پر ہاتھ ڈال دینا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ وہ دوبارہ کہیں غائب ہو جائے''۔

"نہیں"۔ وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جلد بازی ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو ہے۔ ہم نے اسے اکیلے میں گھیرنا ہے تاکہ ہمارے خلاف کوئی گواہی نہ دے سکے۔ وہ اکثر گاؤں باہر جاتا رہتا ہے۔ ہمیں جلدی ہی موقع مل جائے گا"۔

جہانداد نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا۔ "بس ایک بار موقع جائے میں اس کمینے کی ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا۔ اسے وہ سبق سکھاؤں گا کہ آئندہ کبھی بھول کر بھی کے گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرے گا"۔

"ہمیں اس کے ہاتھ پاؤں توڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اس کی پٹائی خوب کر گے تاکہ وہ آئندہ ایسے کاموں سے باز رہے"۔ اس نے جہانداد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اسے زخمی کر دیا یا اس کا ہاتھ پاؤں توڑ دیا تو معاملہ تھانے کچہری تک پہنچ جائے گا اور پھر بھائی صاحب خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گے"۔

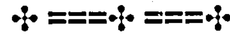
"شاید آپ اباجی سے ڈرتے ہیں؟" جہانداد نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں ڈرتا کسی سے نہیں ہوں صرف تمہارے اباجی کی عزت کرتا ہو کیونکہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں"۔

"میں مذاق کر رہا تھا چچا"۔ جہانداد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آ اباجی کی بہت عزت کرتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ"۔ حاکم علی نے کہا۔ "لیکن فی الحال بھائی صاحب کو اس معاملے کی بھی نہ لگنے دینا ورنہ وہ میری جان کو آجائیں گے"۔

"میں سمجھتا ہوں، آپ بےفکر رہیں۔ اباجی کو میں بھنک بھی نہیں پڑنے دوں گا"۔



یہ چند دن بعد کا ذکر ہے۔ جہانداد محلے کی مسجد میں عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد باہر نکلا گھر جانے کی بجائے کھیتوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو دن پہلے ہونے والی بارش نے فضا کو کافی حد خوشگوار بنا دیا تھا۔ ساون کی وہ پہلی برسات تھی اس لیے درخت اور پودے کھلے کھلے نظر آرہے تھے دور شمالی پہاڑوں کے اوپر اس وقت بھورے بھورے بادل نظر آرہے تھے۔ جہانداد کو بچپن سے منظر بہت بھلا لگتا تھا۔

بچپن میں وہ اکثر گرمی کی دوپہریں نالے کے کنارے اُگے ہوئے گھنے درختوں کے سا تلے گزارا کرتا تھا اور برسات کے موسم میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ مل کر نالے کے پانی میں نہایا کرتا تھا۔ نالے کے کنارے وہ گھنے درخت اب بھی موجود تھے مگر اس کا بچپن موجود نہیں تھا۔



"وقت بھی کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے"۔ نالے میں بہتے پانی کو دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر تھوڑی دیر کے لیے وہیں نالے کے کنارے بیٹھ گیا۔ بہتا ہوا پانی اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ ایسا منظر دیکھ رہا تھا اس لیے اس کا دل کھنچا جا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور نالے کے کنارے کنارے مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں سے تقریباً دو کلومیٹر کی مسافت پر ان کے آبائی کھیت تھے۔ ان کھیتوں میں ہر سال اتنی فصل ہو جاتی تھی جو ان کی گزر اوقات کے لیے سال بھر کافی رہتی۔ اس کے علاوہ وہ مویشی وغیرہ بھی پالتے رہتے تھے۔ ان کی زندگی شاندار نہ سہی لیکن پُرسکون ضرور تھی۔

جہانداد اپنے آپ میں مگن کھیتوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ اس بات سے قطعی بےخبر تھا کہ اس کی پُرسکون زندگی میں ایک بھونچال آنے والا ہے۔ افضل کب سے اس کے تعاقب میں تھا لیکن وہ لاعلم تھا۔

افضل کو دلاور نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے یقین دلا ہی دیا تھا کہ اس کی آنکھ پھوڑنے والا نامعلوم دشمن جہانداد ہی ہے۔ اس لیے وہ گزشتہ دو روز سے جہانداد کی تاک میں تھا مگر اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج وہ گاؤں سے نکلنے کے بعد ہی جہانداد کے پیچھے لگ گیا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ یونہی بےخبری کی حالت میں جہانداد کو گولی مار دے گا لیکن پھر اس نے سوچا کہ یوں مزا نہیں آئے گا، دشمن کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہیے تاکہ دشمن گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگے۔ روئے دھوئے پیروں میں گرے۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر موت کا خوف نظر آئے۔ تب ہی تو انتقام لینے کا لطف آئے گا۔

سورج بس چند لمحوں کا مہمان تھا جب اچانک افضل رائفل تانے جہانداد کے سامنے نمودار ہوا۔ افضل کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کر ایک لمحے کے لیے تو جہانداد کا رنگ متغیر ہو گیا مگر پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے، کون ہو تم؟"

"میں تمہاری موت ہوں"۔ افضل نے قہر آلود انداز میں کہا۔ "تم نے کیا سمجھا تھا کہ میری آنکھ پھوڑ کر بچ جاؤ گے؟"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے"۔ جہانداد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ شاید کسی نے تمہیں میرے خلاف بہکایا ہے"۔

"موت کو سامنے دیکھ کر باتیں بنانے کی کوشش مت کرو"۔ افضل اسے اکلوتی آنکھ سے گھورتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کون ہو"۔

"دیکھو میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن بلاوجہ کی دشمنی مجھے ناپسند ہے اس لیے میرا راستہ چھوڑ دو،

یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا''۔

''ارے فوجی تو بہت بہادر ہوتے ہیں''۔ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہیں لیکن تم تو ایک لمحے میں بھیگی بلی بن چکے ہو۔ شاباش، سینے پر گولی کھا کر مردانگی کا ثبوت دو''۔

جہانداد بری طرح پھنس چکا تھا۔ اسے اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی مگر موت سے گھبرا کر ہمت ہار دینا اس کی تربیت میں شامل نہیں تھا۔ 71ء کی جنگ میں کئی بار موت اسے چھو کر گزر گئی تھی۔ اس لیے گھبرانے کی بجائے اس نے تیزی سے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ افضل کے ہاتھ میں سنگل بلٹ رائفل ہے، اگر وہ کسی طرح پہلی گولی سے بچ جاتا تو پھر افضل کو دوسری گولی ڈالنے کی مہلت کسی صورت نہ دیتا۔

افضل اس سے کم از کم پندرہ قدموں کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے کسی بھی طرح افضل کو مزید قریب لانا تھا۔ اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ جبکہ افضل رائفل تانے بدستور اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ افضل کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ موت جہانداد سے معمولی سے فاصلے پر تھی۔ افضل کی انگلی کی ذرا سی جنبش اسے قبر کے اندھیروں میں پہنچا سکتی تھی لیکن ہر ذی روح کی طرح اسے بھی زندگی بہت پیاری تھی اس لیے اس نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔

''تم میرے سینے پر گولی چلانا چاہتے ہو ناں؟'' وہ نڈر انداز میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''لو چلاؤ گولی''۔

اتنا کہہ کر انجام کی پرواہ کیے بغیر اس نے افضل پر چھلانگ لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک دھماکا ہوا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے بائیں بازو پر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ گولی اس کے بازو کے گوشت کو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔

وہ سیدھا افضل کے قدموں میں جا کر گرا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ افضل دوبارہ رائفل لوڈ کرتا۔ اس نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر پشت کے بل گرا دیا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ زخمی ہونے کے باوجود جہانداد غیر معمولی جوش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے افضل سے رائفل چھین لی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ افضل کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ رائفل کے بٹ مار مار کر اس نے افضل کو لمحوں میں ہوش وخرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔

افضل کے بے ہوش ہونے کے بعد وہ اپنے زخمی بازو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جس سے رسنے والے خون نے اس کی پوری آستین بھگو ڈالی تھی۔ جیب سے رومال نکال کر اس نے دائیں ہاتھ اور دانتوں کی مدد سے جیسے تیسے کر کے زخمی بازو پر پٹی باندھی اور پھر بے ہوش پڑے ہوئے افضل کی جیب



سے گولیاں نکال کر رائفل لوڈ کر لی۔

تھوڑی دیر ستانے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر افضل کی پسلیوں میں پاؤں کی ایک بھرپور ٹھوکر لگائی تو اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔

''اٹھو اب تمہاری باری ہے۔ بہادروں کی طرح سینے پر گولی کھاؤ''۔ وہ استہزائیہ انداز میں افضل سے مخاطب ہوا۔ ''میری بہادری تو تم دیکھ ہی چکے ہو''۔

''نن...... نہیں...... تم مجھے نہیں مار سکتے''۔ وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ''مم...... میرا ماموں تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تم...... شاید ملک مراد کو نہیں جانتے ہو؟''

''اٹھو''۔ جہانداد سرد لہجے میں بولا۔ ''ورنہ ایک سیکنڈ میں کھوپڑی اُڑا دوں گا۔ میں تمہارے ماموں کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کتنا بڑا سُور رہا ہے''۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ افضل کو رائفل کے نشانے پر رکھے واپس گاؤں کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

+ === + === +

مغرب کی نماز کے بعد دلاور، ملک مراد کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے اپنی کامیابی کی خبر سنا رہا تھا اور ملک مراد ہنستے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

''ملک صاحب! ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو ایک خوش خبری مل جائے گی''۔ دلاور خوشامدی انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''افضل یقیناً اب تک جہانداد کا قصہ تمام کر چکا ہوگا۔ عصر کی نماز کے بعد میں نے خود اسے جہانداد کے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔ جہانداد غالباً گاؤں سے باہر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا''۔

''اگر ایسا ہو گیا تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا''۔ ملک مراد نے جواب دیا۔ ''جہانداد کی موت کی خبر سے بڑھ کر میرے لیے اور کون سی خوش خبری ہو سکتی ہے''۔

''انعام تو میں منہ مانگا ہی لوں گا ملک صاحب لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''لیکن کیا؟''

''وہ ملک صاحب! دراصل مجھے حاکم علی کی بیٹی زینب بہت اچھی لگتی ہے لیکن فی الحال وہ جہانداد کی منگیتر ہے۔ اگر افضل کامیاب لوٹا تو پھر میں آپ سے انعام کی صورت میں زینب مانگوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ حاکم علی آپ کو انکار نہیں کر سکے گا''۔

''ارے غریبوں کی بیٹیاں ہوتی کس لیے ہیں؟'' ملک مراد نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس جہانداد کا قصہ تمام ہونے دو، پھر وہ لونڈیا تمہاری آغوش میں ہوگی''۔

"مگر ملک صاحب! آپ کا بھانجا افضل بھی زینب کا طلب گار ہے"۔ وہ ایک نیا انکشاف کرتے ہوئے بولا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ میں حاکم علی کی بیٹی کو کسی دن زبردستی اٹھالوں گا"۔

"کیا...... کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" ملک مراد نے متحیر انداز میں پوچھا۔

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں ملک صاحب! مجھے افضل نے اور بھی بہت کچھ بتایا ہے۔ اس کی آنکھ زینب کے چکر میں ہی ضائع ہوئی ہے"۔

اتنا کہہ کر دلاور نے اسے افضل اور زینب والا واقعہ تفصیل کے ساتھ سنا دیا۔ اس کا جواب سن کر ملک مراد نے غصے سے کہا۔ "احمق انسان! یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"ملک صاحب! یہ بات مجھے دو دن پہلے ہی افضل نے بتائی تھی"۔ اس نے جواباً کہا۔ "ورنہ میں نے اس سے قبل آپ سے کبھی کوئی بات پوشیدہ رکھی ہے؟"

دلاور ٹھیک کہہ رہا تھا، اس لیے ملک مراد نے اسے مزید جھڑکنے کا ارادہ ملتوی کر دیا مگر دلاور کے انکشاف نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ معاً ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ میں لپکا اور وہ دلاور سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست تھا۔ افضل کی آنکھ پھوڑنے والا نامعلوم شخص جہانداد ہی تھا"۔

"ہو سکتا ہے ملک صاحب! وہ جہانداد ہی ہو"۔

"ارے احمق! وہ جہانداد ہی تھا"۔ ملک مراد نے یقین سے کہا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جس دن افضل کی آنکھ پھوڑی گئی تھی اسی دن پانچ برس کے بعد جہانداد واپس گھر لوٹا تھا۔ کاش یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی تو شاید آج میں افضل سے نجات حاصل کر چکا ہوتا"۔

"لو ملک صاحب! یہ بھی بھلا کوئی پریشان ہونے والی بات ہے"۔ دلاور دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "ایسے کاموں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ پہلے نہ سہی اب سہی"۔

"اچھا جاؤ افضل کا پتا کرو"۔ ملک مراد موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ "اب تو اندھیرا چھا چکا ہے۔ افضل یقیناً واپس آ چکا ہوگا"۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب! میں ابھی جاتا ہوں"۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "لیکن وہ زینب والی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی ہے"۔

"تم جاؤ اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ تاہم تم......"

اسی دوران جہانداد افضل کو نشانے پر رکھے ہوئے اوطاق میں داخل ہوا اور ملک مراد کی بات ادھوری رہ گئی۔ دلاور بھی متحیر انداز میں افضل اور جہانداد کی طرف دیکھ رہا تھا مگر ملک مراد تو انہیں دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا تھا۔ وہ تو جہانداد کی موت کی خبر سننے کے لیے بے چین تھا۔ اس لیے زندہ



جہانداد کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

"ملک صاحب! سنبھال اپنے اس لاڈلے کو"۔ جہانداد افضل کو دھکا دیتے ہوئے بولا۔

"آج تو یہ میرے ہاتھ سے بچ گیا ہے مگر آئندہ اس نے ایسی کوئی حرکت کی تو پھر جان سے جائے گا۔ اسے اپنی زبان میں سمجھائیے کہ آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے ورنہ کسی دن جل کر راکھ ہو جائے گا"۔

"ملک صاحب کے سامنے تمہیں اونچی آواز میں بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" دلاور کلہاڑی لہراتے ہوئے آگے بڑھا۔ "آج میں تمہیں وہ سبق سکھاؤں......"

"تم چپ رہو"۔ جہانداد نے گرج کر کہا۔ "ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا"۔ اتنا کہہ کر اس نے دلاور پر رائفل تان لی۔

جہانداد کے تیور دیکھ کر دلاور کی ساری بہادری ایک پل میں ہوا ہو گئی اور وہ بے چارگی کے عالم میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ملک مراد معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "نوجوان! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ دراصل میرے بھانجے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ اکثر یہ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ امید ہے تم اس قصے کو بڑھانے کی کوشش نہیں کرو گے"۔

"ملک صاحب! اپنی طرف سے اس نے مجھے ہلاک کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ گولی سینے کی بجائے میرے بازو میں لگی ہے ورنہ اس وقت میں تمہارے سامنے نہ کھڑا ہوتا"۔

"مجھے تمہارا زخمی بازو نظر آ رہا ہے"۔ ملک مراد نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "بہرکیف یہ اس کی پہلی غلطی ہے۔ آئندہ کبھی یہ ایسی حرکت کرے تو بے شک اسے گولی مار دینا۔ میں تم سے کوئی باز پُرس نہیں کروں گا"۔

"ٹھیک ہے"۔ جہانداد نے جواب دیا۔ "لیکن اس کی رائفل چند دن میں اپنے پاس رکھوں گا"۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ ملک مراد بلا تردد بولا۔ "تم جتنے روز چاہو یہ رائفل رکھ سکتے ہو۔ اس دوران اگر یہ کوئی گڑبڑ کرے تو اسے اسی رائفل سے گولی مار دینا"۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب! میں جا رہا ہوں مگر جاتے جاتے ایک مشورہ ضرور دوں گا"۔ وہ ملک مراد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "کچھ لوگ غلامی کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور میرا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ امید ہے تم بارود کے انبار کو چنگاری دکھانے کی غلطی کبھی نہیں کرو گے"۔

اتنا کہہ کر جہانداد انہیں پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر حویلی کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور ملک مراد دانت پیس کر رہ گیا۔

جہانداد کے جانے کے بعد ملک مراد افضل پر پھٹ پڑا۔ ”بیوقوف آدمی! وہ تم سے بچ کیسے گیا؟ کیا آنکھیں بند کر کے تم نے نشانہ لیا تھا۔ جاؤ ڈوب مرو کسی کنویں میں اگر تم میں کچھ شرم باقی ہے تو؟“

”اس کی قسمت اچھی تھی“۔ افضل نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے تو اس کے سینے پر گولی چلائی تھی۔ بہر کیف یہ میری پہلی غلطی تھی اب کی بار وہ مجھ سے نہیں بچ سکے گا“۔

”یہ پہلی نہیں دوسری غلطی تھی“۔ ملک مراد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”پہلی بار اس نے تمہاری آنکھ پھوڑی تھی“۔

وہ ندامت سے سر جھکا کر بولا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر یہ بات مجھے دلاور نہ بتاتا تو شاید میں ہمیشہ بے خبر ہی رہتا“۔

”اگر تم نے اصل بات چھپانے کی حماقت نہ کی ہوتی تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ ہم حاکم علی کی بیٹی سے سب کچھ معلوم کر سکتے تھے“۔

”حاکم علی کی بیٹی سے تو میں اب نمٹوں گا“۔ وہ طیش میں آ کر بولا۔ ”اُسی کی وجہ سے تو میں بار بار بے عزت ہو رہا ہوں۔ ایک بار وہ میرے ہاتھ لگ جائے میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ پورے گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی“۔

”جہانداد کی زندگی میں یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن ہے“۔ ملک مراد نے جواب دیا۔ ”پہلے تمہیں اس سے نجات حاصل کرنا پڑے گی۔ تاہم فی الحال تو تمہیں گرم دودھ، شہد اور ٹکور کی اشد ضرورت ہے۔ لگتا ہے اس نے جی بھر کر تمہاری دھلائی کی ہے“۔

”کوئی بات نہیں ہے“۔ وہ کھسیانے انداز میں بولا۔ ”موقع ملنے پر اس کے سب قرض چکا دوں گا سود سمیت“۔

”جاؤ دلاور اسے گھر چھوڑ آؤ“۔ ملک مراد دلاور سے مخاطب ہوا۔ ”صغرا آپا پریشان ہو رہی ہوں گی۔ وہ اگر کوئی باز پُرس کرے تو اصل بات بتانے کی بجائے کوئی بہانہ بنا دینا“۔

”آپ بے فکر رہیں ملک صاحب“۔ دلاور نے آگے بڑھ کر افضل کا بازو تھامتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں افضل کی ماں کو مطمئن کر لوں گا“۔

”ٹھیک ہے جاؤ، میں تمہاری واپسی کا منتظر رہوں گا“۔

·:· === ·:· === ·:·

جہانداد کے زخمی ہونے پر قاسم علی نے پہلے دن تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ دراصل وہ اس



معاملے میں قانون کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا مگر جب جہانداد نے انہیں اس دشمنی کی اصل وجہ بتائی تو قاسم علی کے ساتھ ساتھ دیگر گھر والوں کی زبان پر بھی تالے لگ گئے۔ ”اب بتایئے ابا جی“۔ پوری بات بتانے کے بعد جہانداد نے پوچھا۔ ”کیا یہ معاملہ تھانے کچہری تک لے جانا مناسب ہو گا؟ زینب ہمارے گھر کی عزت ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس ملک کی عدالتوں میں کیا ہوتا ہے۔ عورتوں سے وکیل کیسے کیسے ننگے سوال پوچھتے ہیں۔ زینب جو آج تک گاؤں سے باہر نہیں نکلی، کیا وہ ایسے وکیلوں کا سامنا کر پائے گی؟“

”تم نے پہلے یہ بات ہم لوگوں سے کس لیے چھپائی تھی؟“ قاسم علی نے پوچھا۔ ”میں خود ملک مراد سے افضل کی شکایت کرتا“۔

”ہونہہ...... شکایت“۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”ابا جی! کیا آپ ملک مراد کو نہیں جانتے کہ وہ کیسا شخص ہے۔ شکایت کرنے والوں کو وہ بزدل سمجھتا ہے۔ میں اس سے دو بار مل چکا ہوں اور میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے“۔

”تم کچھ بھی کہو مگر میں ملک مراد سے دشمنی پالنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں کسی بھی قیمت پر اس سے صلح کرنے کی کوشش کروں گا“۔

”ابا جی! ملک مراد کے بھانجے نے ہماری عزت پر بری نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور ہم کوئی کمی کمین نہیں ہیں۔ ہم انہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ صلح کی کوشش کر کے ہم اپنا ہی نقصان کریں گے“۔

وہ مایوس لہجے میں بولا۔ ”کاش آج ملک شہباز زندہ ہوتا تو مراد اور افضل ایسی گری ہوئی حرکت بھول کر بھی نہ کرتے۔ ان کی زندگی میں یہ گاؤں جنت کا نمونہ ہوا کرتا تھا۔ نہ جانے خدا تعالیٰ اچھے لوگوں کو اتنی جلدی کیوں اپنے پاس بلا لیتا ہے؟“

”ابا جی! آپ خواہ مخواہ ملک مراد کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں“۔ جہانداد نے بیزار ہو کر کہا۔ ”میں اسے اچھی طرح جان گیا ہوں، وہ ایک بزدل انسان ہے اس لیے اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“۔

”سیانے کہتے ہیں کہ بزدل دشمن سے ڈرتے رہنا چاہئے کیونکہ وہ چھپ کر وار کرتا ہے“۔ قاسم علی ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”اور چھپ کر وار کرنے والا دشمن بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے“۔

”ہوتا ہو گا خطرناک“۔ جہانداد نے کہا۔ ”مگر میں نے دشمن سے ڈرنا نہیں لڑنا سیکھا ہے“۔

”حاکم علی! اسے سمجھاؤ“۔ وہ زچ ہو کر چھوٹے بھائی سے مخاطب ہوا۔ ”یہ خواہ مخواہ کی دشمنیاں

مول لیتا کیوں پھر رہا ہے؟ اسے بتاؤ کہ ملک مراد کون ہے اور وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کر
ہے۔ یہ بیوقوف......"

اسی دوران سکینہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"بابا جان! افضل کی ماں آپ سے اور جہانداد سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ امی کے ساتھ دوسر
کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے"۔ سکینہ نے بلاتردد کہا۔ "وہ بہت پریشان لگتی ہے"۔

قاسم علی بولا۔ "پریشان تو ہم ہیں۔ اسے کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے ہمیں دھمکانے آئی ہو"۔ جہانداد نے قیاس آرائی کی۔ "آخر ملک مراد کی بہ
ہے اپنی امارت کا رعب تو ضرور جمائے گی"۔

"ماں سے کہو اسے یہیں لے آئے"۔ وہ جہانداد کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا اور سکی
اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد افضل کی ماں ان کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ رسمی کلمات ادا کرنے کے بع
جب قاسم علی نے اس سے اس کی آمد کا مقصد پوچھا تو وہ بلاتردد بولی۔ "میں افضل کی طرف معذرت
کرنے کے لیے آئی ہوں۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں اسے دشمنی کی آگ میں نہیں جھونک سکتی۔ مجھے
اس دشمنی کے پیچھے کسی سازش کی بو آتی ہے"۔

قاسم علی بولا۔ "آپ بڑے اچھے وقت پر تشریف لائی ہیں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں یہ
بات جہانداد کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر جوان خون ہم بوڑھوں کی سنتا کب ہے؟ شاید ماں باپ
دکھ پہنچا کر انہیں تسکین ملتی ہے"۔

"میں آپ لوگوں سے سخت شرمندہ ہوں"۔ افضل کی ماں نے کہا۔ "میرے بیٹے نے جہاندا
کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے مگر آئندہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ میں نے اسے اچھی طرح
سمجھا دیا ہے"۔

"کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا تو یقیناً محفوظ رہے گا"۔ جہانداد نے جواب دیا۔ "میں بلاوجہ
دشمنی کو سخت ناپسند کرتا ہوں لیکن اگر مجھ پر دشمنی مسلط کی گئی تو پھر میں کسی قسم کی رعایت نہیں کروں گا
آپ اسے اچھی طرح سمجھا دیں"۔

وہ بولی۔ "افضل اتنا برا نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے اسے کوئی بہکانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کاش م
اس نامعلوم شخص کو جان سکتی"۔

"وہ نامعلوم شخص آپ کا بھائی بھی ہو سکتا ہے"۔ جہانداد نے جواب دیا۔ "کیا آپ نے افضل
کو کریدنے کی کوشش کی ہے؟"



"کئی بار پوچھ چکی ہوں مگر وہ کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔ رہ گئی میرے بھائی کی بات تو وہ لاکھ برا
سہی لیکن اس قدر گری ہوئی حرکت نہیں کرے گا۔ افضل کو مروا کر اس کے ہاتھ کیا آئے گا؟"

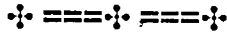
"آپ شکل سے کافی سیانی لگتی ہیں"۔ جہانداد نے کہا۔ "پھر یہ معمولی سی بات آپ کی سمجھ میں
کیوں نہیں آتی؟ افضل کبھی بھی ملک مراد سے جائیداد کے بٹوارے کی بات چھیڑ سکتا ہے جبکہ ملک مراد
کبھی بھی ایسا نہیں چاہے گا۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ اس سے جائیداد کے بٹوارے کی بات کر
کے دیکھ لیں۔ ایک پل میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا"۔

جہانداد کے جواب نے چند لمحوں کے لیے تو اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا مگر غیروں کے
سامنے اسے اپنے بھائی کی برائی کرنا نامناسب لگا اس لیے وہ بات بدلتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں
تمہاری بات سے متفق نہیں ہوں۔ میرا بھائی اس قدر ظالم نہیں ہو سکتا۔ افضل کو بہکانے والا شخص کوئی
اور ہوگا"۔

"آپ کی مرضی میں کیا کہہ سکتا ہوں"۔ جہانداد بولا۔ "تاہم آپ مطمئن رہیں اور افضل کو
سمجھانے کی کوشش کریں۔ اپنی طرف سے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پہل میری طرف سے نہیں ہو
گی۔ اس سے زیادہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا"۔

"میں تمہاری شکر گزار ہوں"۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "اور تمہیں یقین دلاتی کہ تمہاری آئندہ
ملاقات افضل سے خوشگوار ماحول میں ہوگی"۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو"۔ قاسم علی نے اسے رخصت کرتے ہوئے جواب دیا۔



افضل کی ماں نے جہانداد کے سامنے تو اپنے بھائی ملک مراد کی صفائی دے دی تھی مگر حقیقتاً وہ
جہانداد کی سچی باتیں سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دنیا میں زن کے بعد زر اور
زمین ہی فساد کی جڑ ہیں۔ وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ جائیداد میں ایک تہائی کی حصہ دار تھی۔ کیونکہ ان
کا بڑا بھائی ملک شہباز لاولد ہی فوت ہوا تھا۔ ملک شہباز کی وفات کے بعد اس کی بیوہ حویلی میں بمشکل
دو تین ماہ ہی گزار سکی تھی اور اب اپنے میکے میں بیٹھی بیوگی کے دن کاٹ رہی تھی۔

وہ بے چاری حویلی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی مگر دیور اور دیورانی نے جب اس کا جینا دوبھر کر دیا تو
پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے حویلی چھوڑنا پڑ گئی تھی۔ صغرا کو اپنی بڑی بھابی سے بے حد لگاؤ تھا اس لیے
اس کے حویلی چھوڑ جانے کا اسے بہت دکھ ہوا تھا لیکن وہ بے بس تھی ملک مراد اور اس کی نک چڑھی
بیوی سے کوشش کے باوجود وہ بڑی بھابی کی سفارش نہیں کر سکی تھی۔

صغرا تو خود اپنے بیٹے افضل سمیت ملک مراد کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ فصل اٹھانے کے بعد ہر

سال جتنا کچھ اسے دے دیتے تھے وہ بلاتردد لے لیا کرتی تھی۔ ملک مراد ایک شاندار پختہ حویلی میں رہتا تھا۔ حویلی میں بے شمار نوکر چاکر تھے جبکہ صغرا ایک نیم پختہ پرانے سے مکان میں رہائش پذیر تھی۔

ملک مراد کی ان تمام زیادتیوں کے باوجود اس کی زبان پر کبھی شکوہ نہیں آیا تھا لیکن اب حالات نے جو صورت اختیار کر لی تھی اس نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ افضل اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ جائیداد کے لیے اسے قربان نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی واضح الفاظ میں ملک مراد سے اس بارے میں کوئی استفسار کر سکتی تھی۔ بہرکیف اب وہ ملک مراد کی طرف سے چوکنا ہو چکی تھی اور اس نے افضل کے معمولات پر کڑی نظر رکھنا شروع کر دی تھی۔

خصوصاً ملک مراد کا کارندۂ خاص دلاور صغرا کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا اور وہ افضل کو اکثر دلاور کے ساتھ گھومنے پھرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتی رہتی تھی مگر افضل اس کی کسی بات کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتا تھا۔

ایک دن صبح کے تقریباً نو بجے ملک مراد صغرا کے گھر میں داخل ہوا اور بلا تامل اس سے کہنے لگا۔ ''افضل بتا رہا تھا کہ آپ قاسم علی کے گھر اس کے بیٹے کی عیادت کرنے کے لیے گئی تھیں۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں گئی تھی''۔ اس نے ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ ''کیا کسی کی عیادت کرنا جرم ہے؟''

''جہانداد آپ کے بیٹے کا دشمن ہے اور بیٹے کے دشمن سے ہمدردی رکھنا جرم نہیں تو اور کیا ہے؟''

''کون کہتا ہے کہ وہ میرے بیٹے کا دشمن ہے؟'' وہ بدستور ناگوار انداز میں بول رہی تھی۔ ''تم تمہارا وہ کارندۂ خاص دلاور جس نے آج تک کوئی بھلائی کا کام نہیں کیا''۔

''لگتا ہے قاسم علی اور جہانداد نے خوب آپ کے کان بھرے ہیں''۔ ملک مراد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ورنہ اس سے پہلے آپ نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی''۔

''وہ کیا میرے کان بھریں گے۔ کیا میں خود اندھی ہوں۔ دیکھ نہیں سکتی کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ سازشوں کے کیسے کیسے جال بنے جا رہے ہیں؟''

''آپا! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کون آپ کے خلاف سازشیں کر رہا ہے؟ مجھے بتائیے میں اسے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا''۔

''وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی''۔

''کیا دلاور سے شکایت ہے آپ کو؟'' اس نے استفسار کیا۔ ''اگر کوئی ایسی بات ہے تو بلاتردد مجھے بتا دیجئے۔ میں آپ کا بھائی ہوں۔ کچھ بھی کر سکتا ہوں آپ کے لیے دلاور جیسے ہزاروں نوکر آپ



کے لیے قربان کر سکتا ہوں''۔

اس کا مکارانہ انداز دیکھ کر وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی لیکن صاف الفاظ میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ ملک مراد بدستور اس کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر وہ مہر بہ لب بیٹھی رہی۔

''آپا! میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں؟'' اس نے دوبارہ استفسار کیا۔ ''کہیں مجھ سے کوئی شکایت تو نہیں ہے۔ انسان سے بھول چوک ہو جاتی ہے اگر ایسی کوئی بات ہے تو خدارا! مجھے بتا دیجئے ورنہ میں بے چین رہوں گا''۔

''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے''۔ وہ ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے بولی۔ ''البتہ میری تم سے ایک درخواست ہے، دلاور کو میرے بیٹے سے دور رکھو۔ میں بلاوجہ کی دشمنی نہیں چاہتی اگر میرے بیٹے کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی''۔

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''آپا! آپ بلاوجہ ڈرتی رہتی ہیں حالانکہ دلاور کو میں نے آپ کے بیٹے کا محافظ بنایا ہوا ہے۔ وہ افضل کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہے۔ آپ شاید نہیں جانتیں کہ قاسم علی کا بیٹا کتنا خطرناک شخص ہے؟''

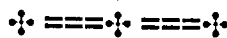
''قاسم علی کے بیٹے سے میں خود نمٹ لوں گی، تم بس دلاور کو منع کر دو کہ آئندہ وہ افضل کو ملنے کی کوشش نہ کرے''۔

''وہ تو میں کہہ دوں گا لیکن اگر افضل نے خود دلاور سے ملنا چاہا تو پھر کیا ہو گا؟ آپ جانتی ہیں کہ افضل میرا کہنا نہیں مانتا اور نہ میں اس پر سختی کر سکتا ہوں''۔

''تم بس دلاور کو روکنے کی ذمہ داری قبول کر لو، باقی میں سنبھال لوں گی۔ آج میں افضل سے دو ٹوک بات کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرا کہنا مان لے گا''۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی''۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں دلاور کو منع کر دوں گا لیکن اس کے بعد افضل کو کچھ ہو گیا تو آپ مجھ سے کوئی شکایت نہیں کریں گی''۔

اتنا کہہ کر ملک مراد اس کا جواب سنے بغیر چلا گیا تاہم وہ اپنی جگہ پر لرز کر رہ گئی تھی۔ شاید ملک مراد کھل کر سامنے آ گیا تھا۔



جہانداد کا چچا حاکم علی نوجوانی میں کشتی لڑا کرتا تھا۔ اس وقت وہ فتح پور اور آس پاس کے علاقوں میں ایک نامی گرامی پہلوان مانا جاتا تھا اور کشتی کے متعدد مقابلے جیت چکا تھا۔ فتح پور کے لوگ اب بھی اسے حاکم پہلوان کہہ کر پکارتے تھے حالانکہ اب اس میں وہ دم خم نہیں رہا تھا مگر پھر بھی اپنے ہم

عصروں سے وہ کہیں زیادہ صحت منداور طاقتور دکھائی دیتا تھا۔

پہلوانی چھوڑنے کے بعد اس نے مویشیوں کی خرید وفروخت کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ وہ فتح پور اور آس پاس کے علاقوں سے مویشی خریدتا تھا اور پھر انہیں شہر کی منڈی میں لے جا کر بیچ دیتا تھا۔ یہ کاروبار اس کے لیے بہت نفع بخش ثابت ہوا تھا اور اب اس کا شمار فتح پور گاؤں کی مقتدر ہستیوں میں ہوتا تھا۔

وہ مہینے میں دو بار شہر کی منڈی کا چکر لگایا کرتا تھا۔ جس دن اسے منڈی جانا ہوتا تھا اس دن وہ منہ اندھیرے ہی اٹھ جایا کرتا تھا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ مویشی کھولتا اور پھر پیدل ہی پختہ سڑک کا رخ کرتا تھا۔ جو فتح پور گاؤں سے لگ بھگ بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔

پختہ سڑک سے اسے کوئی نہ کوئی ٹرک یا ٹریکٹر ٹرالہ باآسانی مل جایا کرتا تھا جو مناسب کرائے پر اسے شہر کی منڈی تک لے جاتا تھا۔ گزشتہ پانچ برس سے یہی اس کا معمول چلا آ رہا تھا۔ شہر سے واپسی پر اس کے پاس کافی بھاری رقم ہوتی تھی مگر یہ خدا تعالیٰ کا شکر تھا کہ آج تک اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا حالانکہ اکثر اوقات اس کی واپسی رات کو ہوا کرتی تھی۔ بڑے بھائی قاسم علی نے اسے کئی بار منع کیا تھا کہ زمانہ خراب ہے اور وہ اتنی بڑی رقم کے ساتھ رات کے وقت سفر نہ کیا کرے لیکن وہ بھائی کی ایسی نصیحتوں کو ہنسی میں اُڑا دیا کرتا تھا۔

اس دن شہر کی منڈی میں اس کے تمام مویشی بہت جلدی اور اچھی قیمت پر بک گئے تو اس نے سوچا کہ کیوں ناں آج شہر کے بازار سے بیوی اور بیٹیوں کے لیے کچھ خریداری وغیرہ کر لی جائے۔ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے فوراً بازار کا رخ کیا اور پھر وقت کی پرواہ کیے بغیر خریداری میں مشغول ہو گیا۔

خریداری کے دوران اسے وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو گئی۔ جونہی شام ہوئی وہ بازار سے بس اسٹاپ کی طرف بھاگا اور پھر بڑی مشکل سے آخری بس میں سوار ہو گیا۔

عشاء کی اذان کے وقت بس نے اسے اس کے اسٹاپ پر اتارا اور پھر گھر گھر کرتی ہوئی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

بس سے اترنے کے بعد تھوڑی دیر تو اسے اندھیرے میں کچھ دکھائی ہی نہ دیا۔ چند لمحوں کے بعد جب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو وہ اللہ کا نام لے کر پختہ سڑک سے اترا اور تیز تیز چلتا ہوا اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ قمری مہینے کی ابتدائی تاریخیں ہونے کی وجہ سے چاند جلد ہی غروب ہو گیا تھا اس لیے چاروں طرف تاریکی کا راج تھا لیکن وہ ایسے حالات کا برسوں سے عادی تھا اس لیے گھبرائے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔



آدھی رات سے تھوڑی دیر قبل جب وہ قدرے ناہموار راستے سے گزر رہا تھا کہ اچانک بائیں ہاتھ موجود جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ابھی وہ متوحش انداز میں جھاڑیوں کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ یکایک وہاں سے تین مسلح نقاب پوش نکلے اور اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

نقاب پوشوں کی رائفلوں کا رخ حاکم علی کے سینے کی طرف تھا۔ وہ ان کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھا مگر ان کا ارادہ اس پر واضح ہو چکا تھا۔ یقیناً وہ اسے لوٹنا چاہتے تھے۔ حاکم علی کو اب بڑے بھائی کی نصیحت شدت کے ساتھ یاد آ رہی تھی۔

''کاش کہ میں نے ان کا کہا مان لیا ہوتا تو آج شاید یہ صورتِ حال پیش نہ آتی''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر نقاب پوشوں سے سہمے ہوئے انداز میں مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیا چاہتے ہو کیوں میرا راستہ روک رکھا ہے؟''

''اگر زندگی پیاری ہے تو جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے فوراً ہمارے حوالے کر دو''۔ ان میں سے ایک نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''ورنہ مال کے ساتھ ساتھ جان سے بھی جاؤ گے''۔

حاکم علی نے آواز سے اسے پہچاننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ یا تو وہ آواز بدل کر بول رہا تھا یا پھر واقعی فتح پور گاؤں کا رہنے والا نہیں تھا۔

''میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے''۔

''لگتا ہے تمہیں زندگی سے پیار نہیں ہے؟'' دوبارہ اسی نقاب پوش نے درشت انداز میں کہا۔ ''یا پھر تمہیں ہم سے رحم کی توقع ہے''۔

''کیا تمہارے دونوں ساتھی گونگے ہیں؟'' حاکم علی نے کہا۔ ''یہ دونوں کیوں نہیں بولتے؟''

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ میرے ساتھی گولیوں کی زبان میں بات کرنا جانتے ہیں، اگر تم ٹال مٹول کرو گے تو شاید ان کی رائفلیں بولنا شروع کر دیں''۔

''مجھے معلوم ہے یہ کیوں نہیں بول رہے؟ انہیں پہچان لیے جانے کا خوف ہے''۔

''ہمیں مجبور مت کرو ورنہ ہم تمہارے خون سے ہاتھ رنگنے پر مجبور ہو جائیں گے''۔

حاکم علی کی کوشش کے باوجود دوسرے دونوں نقاب پوش زبان نہیں کھول رہے تھے۔ یہی بات اسے کھٹک رہی تھی مگر وہ انہیں بولنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا البتہ وہ تینوں اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ طیش میں آ کر اسے جان سے بھی مار سکتے تھے۔ زدوکوب کر کے اس کے ہاتھ پاؤں بھی توڑ سکتے تھے۔ وہ مکمل طور پر ان کے رحم وکرم پر تھا مگر اپنی ضد سے باز نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں میرے خون سے تم ہاتھ رنگ سکتے ہو لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ میرا خون رائیگاں جائے گا؟''

تینوں نقاب پوشوں کی قوتِ برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ زندگی میں شاید پہلی بار ان کا واسطہ حاکم علی جیسے شخص سے پڑ رہا تھا۔ اسے قتل کرنا اگر ان کے پروگرام میں شامل ہوتا تو اب تک وہ اسے ٹھکانے لگا چکے ہوتے لیکن بلاوجہ کی خون ریزی انہیں ناپسند تھی۔ وہ صرف اسے لوٹنا چاہتے تھے۔

''ہو سکتا ہے تمہارا خون انقلاب لے آئے''۔ نقاب پوش نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔ ''مگر تمہیں اس کا کیا فائدہ پہنچے گا؟ تب تک تو تمہارا جسم کیڑوں کی خوراک بن چکا ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم بلا چوں چرا ہماری بات مان کر زندگی جیسی انمول شے بچا لو''۔

''تمہارے ساتھیوں کا دیدار کیے بغیر میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا، بھلے تم مجھے جان سے مار دو یا کچھ بھی کر لو''۔ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ ''میں موت سے نہیں ڈرتا''۔

''پکڑ لو اس بدبخت کو''۔ نقاب پوش اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہوئے بولا۔ ''سب کچھ چھین لو''۔

نقاب پوش کا حکم سن کر اس کے دونوں ساتھی جارحانہ انداز میں آگے بڑھے اور پھر حاکم علی کو مضبوطی سے جکڑ کر اس کی جیبیں خالی کرنے لگے۔ اس نے مدافعتی انداز اختیار کیا تو انہوں نے اسے لاتوں اور مکوں پر رکھ لیا، تب اس نے مجبور ہو کر مدافعت کا کام زبان سے لینا شروع کر دیا۔ انہیں براہِ راست گالیاں دینے کی بجائے وہ ان کے شجرے میں ناقابلِ برداشت ردوبدل کر رہا تھا لیکن نقاب پوش اس سے زیادہ اپنے شجرے کے بارے میں جانتے تھے اس لیے شرمسار ہونے کی بجائے قہقہے لگا رہے تھے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر حاکم علی نے دل ہی دل میں ان تینوں پر لعنت بھیجی اور پھر مدافعت ترک کر کے ساری رقم ان کے حوالے کر دی۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس سے وہ کپڑے اور چوڑیاں بھی چھین لیں جو اس نے بڑی چاہ کے ساتھ اپنی بیٹیوں کے لیے خریدی تھیں۔

حاکم علی کو ان تینوں پر بے حد غصہ آ رہا تھا لیکن غصے کا اظہار کرنے سے وہ قاصر تھا۔ رقم لٹانے کے بعد وہ جان گنوانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے ان تینوں کو جاتے ہوئے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

ان ظالموں نے اس کی اچھی خاصی پٹائی کی تھی تاہم وہ زخمی ہونے سے محفوظ رہا تھا۔ ان کے غائب ہوتے ہی خود کلامی کے انداز میں اس نے انہیں چند گالیاں دیں اور پھر کپڑے جھاڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ پانچ برسوں میں پہلی بار اس کے ساتھ یہ سانحہ ہوا تھا، اس لیے وہ سنجیدگی کے ساتھ ان تینوں لٹیروں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو لٹیرا اس سے مخاطب رہا تھا وہ بالکل اس کے لیے



اجنبی تھا اور دوسرے دو نے بولنے سے مکمل احتراز کیا تھا سوائے اس کے کہ انہوں نے چند بھونڈے سے قہقہے ضرور لگائے تھے۔

بدقسمتی سے مار کھاتے ہوئے اس نے ان کے قہقہوں پر غور ہی نہیں کیا تھا اور اب کوشش کے باوجود وہ ان کے قہقہوں کو اپنے تصور میں نہیں لا پا رہا تھا البتہ بولنے والے نقاب پوش کی آواز اب بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی لیکن وہ آواز اس نے زندگی میں اس سے قبل نہیں سنی تھی۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے آخر کار وہ سحر کے وقت گاؤں پہنچ گیا۔

•:• ===•:• ===•:•

حاکم علی کو لوٹنے والے تینوں نقاب پوش وہاں سے سیدھے اپنے مخصوص ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ ان کا چوتھا ساتھی وہاں ان کا منتظر تھا۔ ان تینوں نے اسے کامیابی کا مژدہ سنایا۔ اس کے بعد وہاں بندھے ہوئے اپنے گھوڑے کھولے اور پھر فتح پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ چاروں ملک مراد کی اوطاق میں موجود تھے۔ ان چاروں میں ایک افضل تھا، دوسرا دلاور، تیسرا شیرا اور چوتھا شخص مشہور ڈکیت سانول تھا جو متعدد ڈکیتیوں میں پولیس کو مطلوب تھا مگر ملک مراد جیسے لوگوں کی پشت پناہی کی وجہ سے وہ آج تک قانون سے بچتا آ رہا تھا۔

حاکم علی کو ملک مراد کے ایما پر لوٹا گیا تھا۔ سانول سے ملک مراد کے دیرینہ مراسم تھے اور ان مراسم کے متعلق ملک مراد کے مخصوص کارندے ہی جانتے تھے۔ آج تک سانول کبھی دن کے وقت فتح پور میں داخل نہیں ہوا تھا۔ ملک مراد ہمیشہ اسے رات کی تاریکی میں طلب کیا کرتا تھا اور کام کروانے کے بعد تاریکی میں ہی اسے واپس بھیج دیا کرتا تھا۔

ان کو وہاں بیٹھے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ ملک مراد مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا پہنچ گیا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد سانول نے ڈکیتی کی تمام کارروائی ملک مراد کے سامنے بیان کرنے کے بعد کہا۔

''ملک صاحب! اگر آپ نے منع نہ کیا ہوتا تو میں نے حاکم علی کو یقیناً اگلے جہان پہنچا دیا ہوتا۔ اپنی زندگی میں، میں نے اس جیسا باتونی اور ڈھیٹ شخص آج تک نہیں دیکھا۔ وہ بدبخت دلاور اور افضل کے نقاب اتروانا چاہتا تھا''۔

''اچھا کیا ہے تم نے''۔ ملک مراد نے جواب دیا۔ ''خواہ مخواہ اسے قتل کر کے تمہیں کیا مل جاتا؟''

''بس یہی سوچ کر تو میں نے اسے چھوڑ دیا ہے''۔ سانول نے جواب دیا۔

''مجھے تو اس پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا''۔ افضل بولا۔ ''بدبخت پیسے کی خاطر اپنی جان دینے پر

تل گیا تھا۔ میں تو اس کے سینے میں گولی اتارتے اتارتے رہ گیا تھا‘‘۔

’’یہ غصہ جہانداد کے لیے بچا کر رکھو‘‘۔ ملک مراد نے جواب دیا۔’’وہ تمہارا سب سے بڑا د ہے۔ دوبار تمہیں زک پہنچا چکا ہے اور آئندہ بھی پہنچا سکتا ہے‘‘۔

’’میں اماں کی وجہ سے خاموش ہوں‘‘۔ افضل نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔’’ورنہ جہا جیسوں کی کیا اوقات ہے میرے سامنے؟‘‘

’’مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟‘‘ ملک مراد نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔’’جہانداد کی اوقات تمہیں اچھ طرح معلوم ہے۔ تمہاری رائفل ابھی تک اس کے پاس موجود ہے‘‘۔

ملک مراد کی بات سن کر افضل کٹ کر رہ گیا اور اس کے ساتھی اس پر ہنسنے لگے۔

’’دانت مت نکالو‘‘۔ وہ چلا کر بولا۔’’میں جہانداد سے بہت جلد بدلہ لوں گا‘‘۔

’’مشکل ہے‘‘۔ ملک مراد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔’’جہانداد تمہارے بس کا روگ نہ ہے۔ وہ بہت چالاک شخص ہے۔ اگر تم نے دوبارہ اسے چھیڑا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے‘‘۔

’’ماموں جان! آپ میری توہین کر رہے ہیں‘‘۔ وہ شکایتی انداز میں بولا۔’’حالانکہ م جہانداد سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوں۔ وہ فوجی بھگوڑا بھلا میرا کیا مقابلہ کرے گا؟ دیکھ لینا کسی د میرے ہاتھوں سے مارا جائے گا‘‘۔

’’وہ دن شاید میرے مرنے کے بعد ہی آئے گا‘‘۔

ملک مراد تمسخرانہ باتیں کر کے اسے طیش دلانے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی نفسیات سے جا بوجھ کر کھیل رہا تھا تاکہ وہ غصے میں اندھا ہو کر انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے۔ وہ احمق یہ نہیں جا تھا کہ وہ ملک مراد کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا ہے۔

’’وہ دن بہت جلد آئے گا‘‘۔ ملک مراد کی مرضی کے عین مطابق وہ طیش میں آ کر بولا۔’’م آپ کو یہ کام کر کے دکھا دوں گا‘‘۔

’’کب تک؟‘‘ ملک مراد نے استفسار کیا۔’’مجھے تو نہیں لگتا کہ تم کچھ کر پاؤ گے؟‘‘

’’ایک ماہ کے اندر ہی جہانداد کو ٹھکانے لگا دوں گا‘‘۔

’’میں انتظار کروں گا‘‘۔

اتنا کہہ کر ملک مراد سانول کی طرف متوجہ ہو گیا۔’’ہاں بھئی سانول، حاکم علی سے کتنی رقم ہاتھ ہے؟‘‘

’’گنی نہیں میں نے‘‘۔ سانول نے جیب سے رقم نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہو کہا۔’’آپ گن لیں اور طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کے حصے کر دیں‘‘۔



ملک مراد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رقم اٹھائی اور گننا شروع کر دی۔

پورے تیس ہزار ہیں‘‘۔ ایک لمحے کے بعد وہ سر اٹھا کر بولا۔’’طے شدہ پروگرام کے مطابق اس رقم کا تیسرا حصہ دس ہزار روپیہ بنتا ہے جو کہ سانول کا ہو گا اور باقی بیس ہزار روپیہ تم تینوں میں تقسیم ہو گا‘‘۔

’’ملک صاحب! آپ نے اپنا حصہ کیوں نہیں نکالا؟‘‘ سانول نے پوچھا۔

ملک مراد قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔’’ارے بھئی! مجھے رقم کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ میں تو حاکم علی کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا‘‘۔

’’بہت خوب ملک صاحب‘‘۔ سانول نے پُرمسرت انداز میں کہا۔’’ایسے کاموں میں جب بھی میری ضرورت پڑے بس حکم کر دیا کرنا۔ مجھے آپ کا کام کر کر خوشی ہو گی‘‘۔

’’بے فکر رہو ضرور کہوں گا‘‘۔ ملک مراد اٹھتے ہوئے بولا۔’’اب تم آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے‘‘۔

’’ہمارے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟‘‘ دلاور نے پوچھا۔

’’رقم تقسیم کر لو اور پھر اپنے اپنے گھر کی راہ لو۔ تم لوگوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ سانول کو میں صبح منہ اندھیرے ہی رخصت کر دوں گا‘‘۔ اتنا کہہ کر ملک مراد کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ رقم تقسیم کرنے میں مصروف ہو گئے۔

✣ === ✣ === ✣

لٹا پٹا حاکم علی گھر میں داخل ہوا اور تمام واقعہ بیوی کے گوش گزار کر دیا۔ حاکم علی کی زبانی تمام واقعہ سننے کے بعد وہ بولی۔’’یہ سب تمہارا اپنا قصور ہے۔ بھائی صاحب تمہیں کب سے سمجھا رہے ہیں کہ خالی ہاتھ مت جایا کرو لیکن تم نے کبھی ان کی نصیحت پر کان نہیں دھرے‘‘۔

’’ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟‘‘ اس نے درشت انداز میں کہا۔’’میرے پاس ہتھیار ہوتا بھی تو میں کیا کر لیتا۔ وہ تین تھے اور تینوں مسلح تھے‘‘۔

’’تمہارے پاس ہتھیار ہوتا تو وہ تمہیں لوٹنے کی کوشش ہی نہ کرتے۔ خواہ مخواہ تقدیر کو موردِ الزام نہ ٹھہراؤ غلطی تمہاری اپنی ہے‘‘۔

’’احمقانہ باتیں مت کرو فاطمہ! میں بہت پریشان ہوں‘‘۔ وہ زچ ہو کر بولا۔’’سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کیسے اپنے لٹنے کی داستان سناؤں؟ نہ جانے کون تھے وہ بدبخت، میں تو کسی ایک کو بھی نہ پہچان سکا‘‘۔

’’جہانداد اور بھائی صاحب سے بات کیجئے‘‘۔ اس نے مشورہ دیا۔’’شاید وہ کچھ کر سکیں؟‘‘

"ٹھیک ہے ناشتہ کرنے کے بعد میں ان کے ہاں جاؤں گا۔ فی الحال تو صبح کی نماز کا وقت ہوا جارہا ہے"۔

"میں ناشتہ تیار کرتی ہوں"۔ وہ باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "تب تک تم نماز پڑھ لو"۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ناشتہ کیا اور پھر عجلت میں بھائی کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ تیس ہزار روپے کی رقم گنوانے کے بعد اسے کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔ رہ رہ کر اسے لٹیروں پر غصہ آرہا تھا۔ جنہوں نے ایک پل میں اس کی محنت کی کمائی پر ہاتھ صاف کر لیے تھے۔

انہی سوچوں میں غلطاں وہ بھائی کے گھر پہنچ گیا۔

"حاکم! خیر تو ہے؟ اس وقت کیسے آنا ہوا؟" قاسم علی نے اس کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"خیریت کہاں ہے بھائی جان"۔ وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ "گزشتہ شب میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے سن کر شاید آپ کو یقین نہ آئے"۔

اتنا کہہ کر اس نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔

"آخر وہی ہوا ناں جس کا مجھے ڈر تھا"۔ پوری کہانی سننے کے بعد قاسم علی نے تاسف سے کہا۔ "کاش تم میری نصیحت پر عمل کرتے تو شاید آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا"۔

"چچا جان! آپ نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ آپ مجھے ساتھ لے جاتے"۔ جہانداد نے کہا۔

"مجھے کب معلوم تھا کہ لٹیرے میری تاک میں ہوں گے"۔ وہ مغموم لہجے میں بولا۔ "شاید وہ پہلے ہی سے میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے بس میں ہی ان سے بے خبر رہا ورنہ وہ مجھے لوٹنے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے"۔

"ایک بات تو طے ہے حاکم! اصل لیٹروں کا تعلق فتح پور ہی سے ہے"۔ قاسم علی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "البتہ ان کا سرغنہ یقیناً کوئی باہر کا شخص ہوگا"۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں بھائی جان کہ مجھے لوٹنے کا منصوبہ یہیں سے بنایا گیا ہے لیکن وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ یہ اندازہ لگانے سے میں قاصر ہوں"۔

"چچا جان! تھانے چلتے ہیں"۔ جہانداد مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ "رپورٹ درج کرانا بہت ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے پولیس ان نامعلوم لٹیروں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے"۔

"پولیس کیا کرے گی؟" قاسم علی نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ "رپورٹ درج کرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم اپنی پولیس کو اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کتنی ایماندار اور فرض شناس ہے۔ الٹا



تمہیں ہی لٹیروں کا ساتھی ثابت کرنے پر تل جائے گی"۔

"تو کیا کریں ابا جی! کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے"۔ قاسم علی نے جواب دیا۔ "کہ تم لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو۔ تم خود لٹیروں کا سراغ لگانے کی کوشش کرو، اِدھر اُدھر سے سن گن لو، کوشش کرنے سے کیا نہیں ہو سکتا؟"

"بھائی جان! جہانداد بالکل ٹھیک کہتا ہے"۔ حاکم علی نے بھتیجے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اس معاملے میں پولیس کی مدد لینا ہی پڑے گی کیونکہ پولیس کے پاس چوروں اور ڈکیتوں کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ وہ یقیناً کوئی نہ کوئی سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے"۔

"پولیس تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی حاکم علی! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو"۔ وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔ "اکثر چوریاں اور ڈاکے پولیس کی ملی بھگت سے ہوتے ہیں۔ تھانے جا کر تم کسی مشکل میں بھی پڑ سکتے ہو۔ پولیس والوں کے سامنے کس کا نام لو گے؟ جبکہ لٹیروں کے متعلق تم بالکل لاعلم ہو"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ابا جی! مگر تھانے جانا بہت ضروری ہے۔ ہم نامعلوم ڈاکوؤں کے خلاف رپورٹ درج کرائیں گے"۔ جہانداد نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "پولیس کے علم میں یہ بات لانے کے بعد ہم اپنے طور پر بھی ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے"۔

"میں تم سے بحث میں نہیں جیت سکتا"۔ قاسم علی شکست خوردہ انداز میں بولا۔ "تاہم میں تم لوگوں کو پولیس کے پاس جانے کا مشورہ کبھی نہیں دوں گا۔ تم خود جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا"۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ ہمارا ساتھ نہیں دینا چاہتے؟" حاکم نے شکایتی انداز میں پوچھا۔ "میں تو آپ کے پاس بڑی امید لے کر آیا تھا مگر آپ نے مجھے ناامید کر دیا ہے"۔

"تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو حاکم"۔ اس نے چھوٹے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ہمیشہ سے تمہارے ساتھ تھا اور مرتے دم تک رہوں گا۔ اگر تمہیں پولیس کے پاس جانے میں کوئی بہتری نظر آتی ہے تو پھر مجھے اعتراض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ تم جہانداد کو ساتھ لے جا سکتے ہو"۔

"چلیے چچا جان"۔ باپ کی اجازت ملتے ہی جہانداد نے جلدی سے کہا۔ "اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے"۔

"چلو"۔ حاکم علی اٹھتے ہوئے بولا۔ "تھانے تک پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے"۔

ٹھیک دو گھنٹوں کے بعد وہ دونوں تھانے کے احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ تھانہ فتح

پورگاؤں سے شمال کی جانب واقع ایک قصبے میں تھا۔ تھانے کا انچارج صادق حسین نامی ایک انسپکٹر جو حال ہی میں اس تھانے میں بطور ایس ایچ او تعینات کیا گیا تھا۔ وہ بارعب شخصیت کا مالک ایک چٹا شخص تھا۔ خاص کر اس کی گھنی مونچھوں نے اس کے رعب داب میں اضافہ کر رکھا تھا۔ پہلی نظر میں وہ آدمی کو جلاد ہی نظر آتا تھا تاہم اس سے گفتگو کرتے وقت ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوتا تھا۔ جتنا کڑک اور بارعب نظر آتا تھا گفتار میں اتنا ہی خوش کلام واقع ہوا تھا۔ بہت دھیمے اور نرم لہجے میں بات کرتا تھا۔

اس سے گفتگو کرتے وقت یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک تھانیدار ہے۔ حاکم علی کی تمام روداد غور وخوض سے سننے کے بعد اس نے چند ایک سوال کیے جن کے جوابات حاکم علی نے سوچ سمجھ کر دیے تھے۔

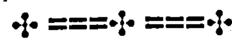
ان دونوں کی بات چیت کے دوران جہانداد بالکل خاموش رہا تھا تاہم ان کے چپ ہوتے ہی وہ ایس ایچ او صادق سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''جناب! مجھے یقین ہے کہ آپ ہمارا ساتھ دیں گے اور ان نامعلوم ڈاکوؤں کو تلاش کرنے کی حتیٰ المقدور کوشش کریں گے''۔

''ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کی رپورٹ درج کر دیتا ہوں''۔ ایس ایچ او نے جواباً کہا۔ ''مگر بہتر یہ ہوگا کہ آپ تھوڑی دیر غور کر لیں ہو سکتا ہے کسی ایسے شخص کا نام آپ لوگوں کے ذہن میں آجائے جو مشکوک ہو کیونکہ پولیس کی کارروائی شک سے شروع ہو کر یقین تک پہنچتی ہے''۔

''جناب! شک کا اظہار کرنا تو بہت آسان ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے کوئی بے گناہ پھنس جائے''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''آپ بس تین نامعلوم ڈاکوؤں کے خلاف پرچہ کاٹ دیں''۔

''جیسے آپ لوگوں کی مرضی''۔

اتنا کہہ کر ایس ایچ او صادق حسین نے ایف آئی آر درج کرنا شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ایس ایچ او سے رخصت ہو کر واپس فتح پور کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ دل ہی دل میں حاکم علی کسی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔ انسپکٹر صادق حسین کے رویے نے اس کو ایک امید سی دلا دی تھی کہ شاید اسے لوٹنے والے ڈاکو پکڑے جائیں اور اس کی محنت سے کمائی ہوئی رقم اسے واپس مل جائے۔



ملک مراد کی لگائی ہوئی آگ نے ایک بار پھر افضل کے پورے وجود کو جھلسا کر رکھ دیا تھا اور ماں کی نصیحتوں کو بھلا کر انتقام کے طریقوں پر غور کرنے لگا تھا۔ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے کبھی



کبھار اس کا سامنا جہانداد سے ہوتا رہتا تھا مگر جس موقع کی تلاش اسے تھی وہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ جہانداد کو کسی ویران مقام پر گھیرنا چاہتا تھا اور وہ بھی اس وقت جب جہانداد نہ صرف خالی ہاتھ ہو بلکہ بے خبر بھی ہو۔

دوسری طرف وہ ابھی تک زینب کو بھی فراموش نہیں کر پایا تھا لیکن زینب نے اب گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا البتہ کبھی کبھار وہ صرف چچا کے گھر تک چلی جاتی تھی۔ ان کے گھر کے بیرونی کام اب جہانداد کے ذمے تھے۔ افضل کو زینب پر ہاتھ ڈالنے کا موقع کسی طرح بھی نہیں مل رہا تھا۔

آخر کار ایک روز مجبور ہو کر اس نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا مگر یہ کام اس اکیلے کے بس کا نہیں تھا، اسے کسی قابلِ اعتماد ساتھی کو ساتھ ملا کر یہ کام سرانجام دینا تھا۔ پہلے تو اس نے دلاور اور شیرا کو ساتھ ملانے کے بارے میں سوچا لیکن پھر اپنے اس خیال کو اس نے خود ہی مسترد کر دیا کیونکہ دلاور اور شیرا اس کے ماموں ملک مراد کے خاص کارندے تھے۔ وہ اس کا راز مخفی نہیں رکھ سکتے تھے جبکہ وہ اپنا ہر معاملہ پوشیدہ رکھنے کا عادی تھا۔

بہت دیر سوچتے رہنے کے بعد معاً اس کے ذہن میں سانول ڈکیت کا نام گونجا اور بے اختیار اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

''ہاں سانول ٹھیک رہے گا اس کام کے لیے''۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا اور پھر سانول کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ماں سے بہانے بنانے کا وہ ماہر تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ویسے بھی صغرا اس کی ہر جائز و ناجائز بات مان لیا کرتی تھی۔ اس روز بھی جب اس نے صغرا سے بات کی تو وہ ذرا پریشان ہو کر بولی۔ ''بیٹے! صبح چلے جانا، اس وقت جانا ٹھیک نہیں ہے''۔

''میں کوئی بچہ نہیں ہوں آپ خواہ مخواہ ڈرتی رہتی ہیں''۔ وہ منہ بنا کر بولا۔ ''صبح تک تو میں واپس آجاؤں گا''۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم وہاں رات گزارنا چاہتے ہو؟''

''ہاں''۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہ اچھی بات نہیں ہے''۔ وہ شکایتی انداز میں بولی۔ ''تم رات گھر سے باہر گزارو گے تو مجھے ساری رات دھڑکا لگا رہے گا۔ نیند نہیں آئے گی۔ میں تمہارے دوستوں کو قابلِ بھروسا نہیں سمجھتی۔ ان کے ساتھ مل کر تم......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہوں گا تو ناکارہ ہو جاؤں گا، مجھے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر زندگی بسر کرنی ہے''۔

"میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ تم لوگوں سے ملنا چھوڑ دو تاہم میری خواہش ہے کہ تم ا
دوستوں سے دور رہو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" اس نے ناصحانہ انداز میں جواب دیا۔

"میں جس دوست کے پاس جا رہا ہوں وہ بہت شریف انسان ہے۔ موقع ملا تو آپ کو کبھی
سے ملواؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

بیٹے کی ضد اور منت سماجت کے سامنے بالآخر اسے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ اکلوتے بیٹے
کسی طرح بھی ناراض نہیں کر سکتی تھی۔

وہ سانول کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ماں کو بیوقوف بنا کر وہ بہت خوش نظر آ رہا تھ

شام کے وقت وہ سانول کے ڈیرے پر موجود تھا۔ ملک مراد کا بھانجا ہونے کے وجہ
سانول نے اس کی کافی خاطر مدارات کی تھی۔ سانول کا ڈیرا اس کے گاؤں سے دور ایک محفوظ مقا
واقع تھا۔ ڈاکو ہونے کی وجہ سے وہ گاؤں میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ پولیس
اس کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ کئی بار اس کے ڈیرے پر بھی چھاپے مار چکی تھی مگر وہ آج تک پولیس
ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس کی وجہ ایک ہی تھی محکمۂ پولیس کی کالی بھیڑیں اسے بروقت مطلع کر دیتی تھیں ا
جان بچانے کے لیے وقتی طور پر روپوش ہو جاتا تھا۔

رات کے پُرتکلف کھانے کے بعد جب سانول نے افضل سے اس اچانک آمد کا مقصد پوچھ
وہ بلاتردد بولا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" سانول نے استفسار کیا۔

"میں جہانداد سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔" اس نے اکلوتی آنکھ سے سانول کی طرف دیکھ
ہوئے کہا۔ "پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں اسے موقع پا کر قتل کر دوں گا لیکن اب میں اسے اس سے بھی ب
سزا دینا چاہتا ہوں، ایسی سزا کہ وہ گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کی لائق نہ رہے۔ اس مقصد کے
میں نے اس کی منگیتر زینب کا انتخاب کیا ہے۔ میں اسے گھر سے اٹھانا چاہتا ہوں۔"

"میں نے آج تک کسی کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔" سانول نفی میں سر ہلاتے ہوئے بو
"اور نہ آئندہ ایسا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس کے علاوہ کوئی خدمت ہے تو میں حاضر ہوں۔"

"میں نے تمہیں ساتھ دینے کے لیے کہا ہے۔" افضل نے کہا۔ "لڑکی پر ہاتھ میں خود ڈا
گا۔ تم اپنا کام کرنا، لڑکی کا باپ ایک موٹی آسامی ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے کافی روپیہ جمع کر رکھ
گا۔ ایک ہی رات میں تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اس کام میں، میں کسی اور کو بھی
ساتھ شامل کر سکتا تھا مگر میں نے تمہاری جی داری دیکھ کر تمہیں منتخب کیا ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن معاملہ ایک لڑکی کا ہے۔" وہ الجھن آمیز انداز میں بولا۔



میں......"

"تم شاید کسی کش مکش کا شکار ہو۔" افضل نے قطع کلامی کی۔ "بہتر ہو گا کہ میں دلاور اور شیرا کو اپنے ساتھ شامل کرلوں۔ حاکم علی کی دولت کے متعلق سن کر وہ دونوں ضرور میرا ساتھ دیں گے۔"

سانول کو شش و پنج کے عالم میں دیکھتے ہی افضل نے بیزاری کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا غالباً دلاور اور شیرا کا نام لے کر وہ اسے اکسانا چاہتا تھا۔ وہ نہایت چالاکی کے ساتھ اس کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بہت جلد سانول اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ ایک ڈاکو کی خصلت سے وہ اچھی طرح واقف تھا، دولت کے لیے سانول جیسے ڈاکو کچھ بھی کرنے کے لیے راضی ہو جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ پھر اس کی توقع کے عین مطابق چند لمحوں کے بعد سانول نے کہا۔

"میں نے تمہیں انکار تو نہیں کیا تاہم میں سوچنا چاہتا تھا کہ یہ کام ہمارے لیے کتنا مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔"

"بالکل مشکل ثابت نہیں ہو گا۔ گھر میں ایک ہی مرد ہو گا جسے ہم باآسانی قابو کر لیں گے۔ اس کے بعد تمہارا اپنا کام اور میرا اپنا کام، میں صرف لڑکی سے سروکار رکھوں گا لوٹ کا مال سب تمہارا ہو گا۔" افضل اسے رضامند ہوتے دیکھ کر خوشی سے بولا۔ "تمہیں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بس چلنے کی تیاری کرو، میں زیادہ عرصہ انتظار نہیں کر سکتا۔ میں جب آئینہ دیکھتا ہوں تو غصے سے میرا رواں رواں سلگنے لگتا ہے۔"

"اتنی جلدی؟" سانول نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے پہلے موقع محل دیکھنا پڑے گا اس کے بعد منصوبہ ترتیب دیں گے پھر کہیں جا کر عملی قدم اٹھائیں گے۔ جلد بازی ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

"میں مزید آتشِ انتقام میں نہیں جل سکتا۔" اس نے جواباً کہا۔ "تمہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے جلدی کرو ورنہ میں کوئی اور انتظام کرنے کے لیے مجبور ہو جاؤں گا۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو افضل۔" سانول نے قدرے غصے سے کہا۔ "میں ضرور تمہارا ساتھ دوں گا مگر اس سے پہلے وہ گھر دیکھنا چاہوں گا۔ بغیر منصوبہ بنائے میں کوئی واردات نہیں کرتا اور تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ صبر سے کام لو اور کوئی ایسا موقع تلاش کرو جب گھر میں صرف عورتیں ہوں اس طرح ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ نیم رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "میں بہت جلد موقع تلاش کرلوں گا تم تیار رہنا یہ نہ ہو کہ اس وقت تم پھر سے ٹال مٹول شروع کر دو۔"

"بے فکر رہو، میں تمہیں ہر وقت تیار ملوں گا"۔

اتنا کہہ کر سانول نے موضوع تبدیل کر دیا۔ اب وہ اس سے ملک مراد کے متعلق گفتگو تھا۔

✣ === ✣ === ✣

نامعلوم ڈاکوؤں کے خلاف پرچہ کٹوانے کے بعد جہانداد اور حاکم علی خاصی حد تک مطمئن چکے تھے مگر جہانداد پھر بھی اپنے طور پر اِدھر اُدھر سے سن گن لیتا پھر رہا تھا۔ کیونکہ معاملہ تیس ہزار رو کی رقم کا تھا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت تیس ہزار روپے کی رقم بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ دور میں بڑا گوشت ایک روپے کا ایک کلو ملا کرتا تھا، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تیس ہزار روپے کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔

جہانداد کی انتہائی کوشش کے باوجود اسے کہیں سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی تاہم ناامید نہیں تھا اور نہ ہی اس نے حوصلہ ہارنا سیکھا تھا۔ اس کی کوشش بدستور جاری تھی۔ پھر اتفاقاً دنوں جہانداد اور حاکم علی کے ہاتھ ملک مراد کا کارندۂ خاص دلاور آ گیا۔ جہانداد ابھی تک بیل چوری اس واردات کو نہیں بھولا تھا جس کا ایک اہم کردار دلاور بھی تھا۔

شام کے وقت انہوں نے دلاور کو گن پوائنٹ پر ایک ویران مقام سے اغوا کیا اور پھر بلا اسے اپنے اس مخصوص ٹھکانے پر لے گئے جس کے متعلق فتح پور گاؤں کا کوئی شخص نہیں جانتا تھا۔ پہنچتے ہی جہانداد نے پہلے تو بڑی شرافت اور نرمی کے ساتھ اس سے چوری کے متعلق استفسار کیا جب وہ کسی طرح بھی نہ مانا تو جہانداد اس پر تشدد کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ چند لمحے تو دلاور اس تشدد کو نہ صرف برداشت کرتا رہا بلکہ اس کا مذاق بھی اڑاتا رہا لیکن جب جہانداد نے تشدد کے انوکھے اور مافوق العقل انداز اپنائے تو دلاور کے ہوش اُڑ گئے۔

زندگی میں پہلی بار اس کا واسطہ جہانداد جیسے شخص سے پڑا تھا جو نہ صرف ایک پڑھا لکھا شخص بلکہ تربیت یافتہ فوجی بھی تھا۔ اسے مجرموں سے سچ اگلوانے کے بہت سے ایسے مخصوص طریقے آ تھے جو ضرر رساں تو نہیں تھے تاہم ان کی دہشت سے حواس باختہ ہو کر مجرم فر فر سچ بولنا شروع کر تھے۔

دلاور پر بھی اس نے یہی مخصوص طریقے آزمائے تھے کیونکہ مار پیٹ اس نے با برداشت کر لی تھی مگر جب جہانداد نے پانی کے ایک گلاس میں زندہ چیونٹیاں ڈال کر اسے پلا کوشش کی تو وہ ایک دم حواس باختہ ہو کر چلا اٹھا۔

"خدا...... کے لیے...... ایسا...... مم...... مت کرو"۔



"زبان نہیں کھولو گے تو اس کے بعد میں تجھے چھپکلیوں کے بچے اور سنڈیاں زبردستی کھلاؤں گا"۔ جہانداد نے گلاس آگے بڑھاتے ہوئے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "تاہم اگر تم ہمیں ساری بات سچ سچ بتا دو گے تو پھر ہم تمہیں فوراً آزاد کر دیں گے"۔

"مم...... میں چوری کے بارے میں...... میں کچھ نہیں جانتا"۔ اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔ "مجھے...... جانے دو"۔

"تم ایسے نہیں مانو گے"۔ جہانداد نے گلاس اس کے لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "لو پیو"۔

"نہیں"۔ اس نے فوراً ہونٹ بھینچ کر بہ مشکل سر ہلایا۔ لکڑی کے ایک مضبوط تختے کے ساتھ وہ مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ اس لیے سوائے سر کے جسم کے کسی حصے کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔

"مجھ...... پر رحم کرو...... مم...... میں تمہیں کچھ...... نہیں بتا سکتا، ملک مراد مجھے زندہ...... نہیں چھوڑے گا"۔

"ہمارے بارے میں کیا خیال ہے؟" جہانداد نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا ہم تمہیں سچ سنے بغیر یہاں سے زندہ جانے دیں گے؟"

"جہانداد!" اچانک حاکم علی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ زبان نہیں کھولتا تو اسے گولی مار دو"۔

نہیں چچا جان!" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ یہ گلاس پکڑیں اور میں اس کا منہ کھولتا ہوں۔ یہ پانی پینے کے بعد یہ بہت دردناک موت مرے گا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ یہ جنگلی چیونٹیاں کتنی زہریلی اور خطرناک ہوتی ہیں۔ قید کے دوران میں نے بھارتی کیمپوں میں ایسے مناظر متعدد بار دیکھے تھے۔ قیدیوں سے تفتیش کرنے کے لیے بھارتی ایسے ہی طریقے اختیار کرتے تھے۔ ایسی تفتیش کے دوران اکثر قیدی خون تھوک تھوک کر مر جاتے تھے۔ بظاہر یہ معمولی نظر آنے والے حشرات الارض اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ انسانی معدے میں جاتے ہی ان کا زہر بہت تیزی سے پھیلتا ہے اور متاثرہ شخص چند دنوں کے اندر ہی اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے"۔

اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور دلاور کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے دوبارہ بولا۔ "دلاور بھی یہ پانی پی کر کچھ روز بڑی اذیت میں زندہ رہے گا پھر عدم کے سفر پر روانہ ہو جائے گا اور مزے کی بات یہ ہے کہ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا۔ اس پسماندہ گاؤں میں کسی کو کیا پتا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی ہے؟ سب اسے قدرتی موت سمجھ کر چپ چاپ دفنا دیں گے"۔

"نن...... نہیں...... میں سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں"۔ جہانداد کے نفسیاتی حربے نے اسے یکدم خوفزدہ کر دیا تھا اور اس کا رنگ موت کے خوف سے زرد پڑتا جا رہا تھا۔

"تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے"۔ جہانداد مطمئن انداز میں بولا۔ "سچ بول کر تم با آسانی جان بچالو گے"۔

"ٹھیک ہے...... میں سچ بتاؤں گا...... لیکن......؟" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" جہانداد نے استفسار کیا۔

"سچ سننے کے بعد تم مجھے چھوڑ دو گے"۔ وہ شرط عائد کرتے ہوئے بولا۔ "اور نہ کسی کے سا میرا نام لو گے"۔

"مجھے منظور ہے"۔ جہانداد نے بلاتردد جواب دیا۔ "لیکن تم نے جھوٹ بولا تو پھر میں تمہارا حشر کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے"۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا"۔

اتنا کہہ کر اس نے بلاتردد سارا واقعہ سنا دیا۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ اس معاملے میں ملک مراد کا ہی ہاتھ ہوگا"۔ سارا واقعہ سننے کے ب جہانداد نے کہا۔ "لیکن مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ ملک مراد چوری کی یہ واردات اپنے بھا پر کیوں ڈالنا چاہتا تھا؟"

"وہ تم دونوں کو آپس میں لڑوانا چاہتا ہے"۔ دلاور نے جواب دیا۔ "تاکہ ایک تیر سے دو ش کر سکے"۔

"میں سمجھ گیا"۔ جہانداد بولا۔ "ملک مراد جائیداد کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن میں اس ک خواہش پوری نہیں ہونے دوں گا"۔

"تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو شوق سے کرو لیکن وعدے کے مطابق مجھے آزاد کر دو، میں تمہیں بات سچ سچ بتا چکا ہوں"۔

"رہا کیوں نہیں کریں گے؟" حاکم علی مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم وعدہ کر کے مکر والے لوگ نہیں ہیں لیکن ابھی ایک الجھن باقی ہے اگر وہ تم نے سلجھا دی تو ہم تمہیں ابھی چھوڑ د گے"۔

"کیسی الجھن؟" دلاور نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"کچھ عرصہ قبل تین نامعلوم ڈاکوؤں نے رات کے وقت مجھ سے تیس ہزار روپے چھین تھے۔ کیا تم ان کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"مم...... میرا...... ڈاکوؤں سے کیا تعلق"۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں تو ایک ادنیٰ سا کاما ہوں"۔



"میں نے یہ کب کہا ہے کہ تمہارا ڈاکوؤں سے تعلق ہے؟" حاکم علی نے غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو ڈاکوؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں"۔

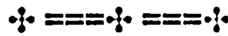
"مم...... میں کچھ نہیں جانتا...... مجھے چھوڑ دو"۔ وہ خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ "تت...... تم لوگ وعدہ خلافی کر رہے ہو"۔

جہانداد نے کہا۔ "تمہاری بوکھلاہٹ دیکھ کر لگتا ہے کہ تم ڈاکوؤں کے بارے میں جانتے ہو۔ اس لیے بہتر ہوگا بتا دو، زندگی سے کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی"۔

جہانداد کے تیور دیکھ کر چاروناچار دلاور نے ڈکیتی کی اس واردات کا تمام حال سنا دیا۔ اس نے خود کو بھی پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"وعدے کے مطابق میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں"۔ ڈکیتی کی تفصیلات سننے کے بعد جہانداد بولا۔ "لیکن پولیس کے حوالے ضرور کروں گا کیونکہ پرچہ کٹ چکا ہے"۔

جہانداد کی بات سن کر دلاور نے منت سماجت شروع کر دی مگر وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس کے بعد جہانداد نے حاکم علی کو دلاور کی نگرانی پر مامور کیا اور خود اسی وقت تھانے میں اطلاع دینے کے لیے روانہ ہو گیا۔



رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے جہانداد تھانے پہنچ گیا۔ ایک کانسٹیبل نے اس کی با
اور پھر ایس ایچ او صاحب کو اطلاع دینے کے لیے باہر نکل گیا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ایس ایچ او صادق حسین کو اپنی آمد کے متعلق بتا رہا تھا۔ تفصیل سننے کے بعد ایس ایچ او بولا۔ ''ٹھیک ہے میں دلاور کو گرفتار کر لیتا ہوں لیکن اس وقت تھا میں نفری موجود نہیں ہے، تمہیں صبح تک انتظار کرنا پڑے گا''۔

''وہ ملک مراد کا آدمی ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''مجھے خدشہ ہے کہ صبح تک معاملہ بگڑ جا گا۔ ملک مراد بہت با اختیار شخص ہے''۔

''قانون کے سامنے کوئی با اختیار نہیں ہوتا''۔ ایس ایچ او نے جواب دیا۔ ''تم بے فکر جاؤ، صبح پولیس پہنچ جائے گی''۔

''جناب! آپ اگر اسے ابھی گرفتار کر لیتے تو بہتر ہوتا''۔ اس نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''م مراد کی مکاری سے کچھ بھی بعید نہیں ہے، صبح ہونے سے پہلے وہ دلاور تک پہنچ جائے گا اور پھر بات خون خرابے تک پہنچ جائے''۔

''نہیں''۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کچھ بھی ہو جائے تم قانون کو ہاتھ میں لے غلطی کبھی نہ کرنا''۔

''یہ کیسے ممکن ہے جناب! ملک مراد خون خرابا کرے گا تو میں کیسے خاموش رہ سکوں گا؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا''۔ وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''تم وہم مت کرو، ایک ہی رات بات ہے۔ صبح نہ صرف دلاور قانون کی گرفت میں ہوگا بلکہ اس کے تینوں ساتھی بھی پکڑے جا گے''۔

''ٹھیک ہے جناب''۔ وہ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ پر بھروسا کر میں واپس جا رہا ہوں۔ خدا کرے میرا اندیشہ بے بنیاد نکلے اور ملک مراد، دلاور کے اغوا سے ہی رہے''۔



''ایسا ہی ہوگا''۔ ایس ایچ او صادق حسین نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جہانداد تھانے سے نکل کر واپس روانہ ہوگیا۔ مطمئن ہونے کے باوجود اس کے دماغ میں انجانے اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ اس وقت تو اس نے حاکم علی کو تنہا چھوڑ دیا تھا مگر اب پشیمان نظر آ رہا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ملک مراد کے پالتو گرگے نہ صرف دلاور کو رہا کرا سکتے تھے بلکہ حاکم علی کو نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ جس وطن کی خاطر اس نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں، دشمنوں سے دوبدو جنگ لڑی تھی اس وطن کے باسی قدم قدم پر اسے تکلیفیں پہنچا رہے تھے۔ اس کے حقوق کا استحصال کر رہے تھے۔

خیالات کی اسی یلغار نے آخر کار اسے دوبارہ مشرقی پاکستان پہنچا دیا اور جنگی واقعات کی ایک فلم سی اس کے دماغ میں چلنے لگی۔ اسے حوالدار شہادت علی یاد آ رہا تھا جو اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے اس کے سامنے ہی شہادت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوگیا تھا۔ اسے شہادت علی کی شہادت سے پہلے کے واقعات یاد آنے لگے۔

شہادت علی اس کے ساتھ ہی پیدل دستوں میں شامل تھا۔ وہ ایک خوش مزاج اور ہر دل عزیز شخص تھا۔ اکثر ساتھی اسے چھیڑتے رہتے تھے لیکن اس نے کبھی کسی کی بات کا برا نہیں منایا تھا۔ غصہ تو کبھی اسے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ ویسے تو شہادت علی ہر کسی کے ساتھ انکساری سے پیش آتا تھا مگر جہانداد کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ اسے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتا تھا۔

شہادت علی جس قدر نرم دل تھا جہانداد اسی قدر غصیلی طبیعت کا مالک تھی۔ وہ اکثر جہانداد کو سمجھاتا رہتا تھا کہ غصہ کرنے سے کوئی بھی معاملہ سلجھنے کی بجائے مزید بگڑ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جو انسان کو اپنے پرائے سے دور کر دیتا ہے۔ اس لیے خود کو بدلو ورنہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاؤ گے۔

وقتی طور پر جہانداد اس کا کہا مان لیا کرتا تھا مگر چند دن گزرنے کے بعد وہ دوبارہ پرانی روش اپنا لیتا تھا۔

وہ دونوں نہ صرف ایک ہی کمپنی کے تھے بلکہ ان کی پلاٹون بھی ایک ہی تھی، دونوں کا تعلق انفنٹری کی ایک بٹالین سے تھا جو مشرقی محاذ پر تعینات تھی۔ وہاں شب و روز گولیاں برستی رہتی تھیں اس لیے زندگی بہت ارزاں تھی۔ وہ دونوں ہر روز بارڈر پر موت کا سامنا کیا کرتے تھے۔ اکثر موت انہیں چھو کر گزر جاتی تھی۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھ کر بھی وہ گھبرانے کی بجائے قہقہے لگایا کرتے تھے، خاص کر حوالدار شہادت علی تو بارڈر پر بہت ہی خوش و خرم تھا۔

جہانداد اور وہ ایک ہی خیمے میں رہتے تھے۔ جنگ کی حالت میں وہ زندگی کی بیشتر سہولیات سے محروم تھے، نہانے کا تو انہیں کئی کئی روز موقع ہی نہیں ملتا تھا مگر اس روز اذانِ سحر کے وقت شہادت

علی نہ جانے کہاں سے پانی کی ایک بالٹی ڈھونڈ لایا تھا۔ جہانداد کو نماز کے لیے جگانے کے بعد عجیب سے انداز میں بولا تھا۔ ''اٹھو دوست! نماز ادا کرلو ورنہ وقت نکل جائے گا''۔

جہانداد نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہاں وقت ٹھہر سا گیا ہے۔ گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا''۔

''زیادہ دانش ور بننے کی ضرورت نہیں ہے فوراً وضو کرلو میں ذرا نہانے جا رہا ہوں''۔ اس نے شوخ انداز میں جواب دیا اور جہانداد مسکرا کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ صبح کی نماز ادا کر رہے تھے۔ شہادت علی نے اس روز دھلی دھلائی وردی زیب تن کر رکھی تھی جو اس کے جسم پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس روز نہ جانے کیوں جہانداد کو اس کا چہرہ معمول سے کچھ زیادہ پُرنور نظر آ رہا تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ دونوں اپنے مورچے میں موجود تھے۔ ایل ایم جی (لائیٹ مشین گن) پر گولیوں کا ایک طویل بیلٹ چڑھا ہوا تھا۔ انڈین فورسز کی موومنٹ روکنے کے لیے ان کی پوری کمپنی سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ کمپنی کمانڈر کیپٹن رحیم صاحب ایک ایک مورچے کا جائزہ لے رہے تھے، ساتھ ساتھ وہ جوانوں کو مورال بلند رکھنے کی نصیحت بھی کر رہے تھے۔

اس روز جب انڈیا کی ایک پوری رجمنٹ نے ان کی کمپنی پر حملہ کیا تو شہادت علی کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ وہ ایل ایم جی کو میکانکی انداز میں دائیں، بائیں اور سامنے گھما رہا تھا۔ ایک بیلٹ خالی ہونے سے پہلے ہی جہانداد اسپیئر بیلٹ میں گولیاں لوڈ کر دیتا تھا۔ دوپہر تک ان کی کمپنی نے دشمنوں کو چند فٹ بھی آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ انہوں نے دشمن کے بیسیوں فوجی جہنم واصل کر دیے تھے۔

کمپنی کمانڈر کیپٹن رحیم صاحب ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک طوفانی انداز میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ وہ مورچہ بند جوانوں کو مناسب ہدایات بھی دے رہا تھا۔ جوان اپنے کمانڈر کا جوش وخروش دیکھ کر پُرجوش انداز میں نعرۂ تکبیر بلند کرتے اور پھر دشمن پر بارش کی طرح گولیاں برسانا شروع کر دیتے تھے۔ ان کا مقابلہ اپنے سے تین گنا طاقتور دشمن سے تھا، اس لیے جان کی پرواہ کیے بغیر وہ جنونی انداز میں لڑ رہے تھے۔

دوپہر کے بعد دشمن میں پسپائی کے آثار نمودار ہونے لگے تو ان کا جوش وخروش بھی ماند پڑ گیا اور انہیں ذرا ستانے کا ٹائم مل گیا۔ تھوڑی سی خشک خوراک کھانے اور پانی پینے کے بعد جہانداد نے شہادت کی جگہ لے لی اور یوں شہادت علی کو بھی کچھ کھانے پینے کا موقع مل گیا۔



تقریباً ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد دشمن نے تازہ دم ہو کر دوبارہ حملہ کر دیا۔ اب کی بار حملے میں بڑی شدت تھی۔ فتح کی امید میں دشمن کے فوجی دیوانہ وار آگے بڑھتے اور انجام کار خاک وخون میں لوٹنے لگتے تھے۔

جہانداد بڑی سُرعت کے ساتھ خالی بیلٹ میں گولیاں لوڈ کر رہا تھا، اس لیے وہ شہادت علی کی طرف سے غافل تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور اس کا سر بیلٹ پر جھکا ہوا تھا۔ بیلٹ میں آخری گولی لوڈ کرنے کے بعد وہ تیزی سے اٹھا اور شہادت علی کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ ''سنبھالو بیلٹ تیار ہے''۔

لیکن جب شہادت علی کی طرف سے اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے متحیر ہو کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ شہادت علی کا سر ایل ایم جی کے بٹ پر جھکا ہوا تھا اور وہ بالکل بے حس وحرکت تھا۔

جہانداد نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھ کر اسے ہلایا تو وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح مورچے میں گر پڑا۔ اس کی اجلی وردی کا سامنے والا حصہ خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں سے احساس فتح مندی اور ابدی سکون جھلک رہا تھا۔ فانی دنیا سے سرمدی جہان کی طرف وہ یوں چپکے سے رخصت ہوا تھا کہ جہانداد کو خبر ہی نہ ہو سکی۔ وقت کا مقابلہ کرنے والا وہ شیر دل مجاہد ایک پل میں وقت سے آگے نکل گیا تھا۔

زندگی اور موت کے درمیان میدانِ جنگ میں ایسی ہی قرابت داری ہوتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مورچے میں موجود دو جوانوں میں سے کوئی ایک قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے اچانک چونک پڑتا ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہی ہنس رہا ہے اور اس کا ساتھی زندگی کی حدود سے آگے نکل چکا ہے۔

شہادت علی کی شہادت کے ساتھ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ موجودہ حالات کے متعلق سوچنے لگا۔

-:- ===-:- ===-:-

رات کے تقریباً دو بجے وہ اپنے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔ جونہی وہ اس اکلوتے کمرے میں داخل ہوا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کمرا سنسان پڑا ہوا تھا۔ وہاں نہ حاکم علی موجود تھا اور نہ ہی دلاور تاہم مٹی کا چراغ بدستور جل رہا تھا۔ لکڑی کے جس تختے کے ساتھ دلاور بندھا ہوا تھا اس کے اردگرد رسی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے جنہیں کسی تیز دھار آلے سے کاٹ کر دلاور کو رہا کیا گیا تھا۔

کمرے کے کچے فرش پر اسے خون کے دھبے بھی نظر آ رہے تھے۔ جو نہ جانے کس کا تھا؟ قیدی کا یا محافظ کا؟ اس بارے میں وہ لاعلم تھا۔

''یقیناً یہ ملک مراد کا ہی کام ہوگا''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر انتہائی اشتعال کے عالم

میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا اور ملک مراد کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اچانک ہی اس کے سر پر خون سوار ہو گیا تھا۔ وہ ملک مراد کو ٹھکانے لگانے کا تہیہ کر کے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں شاید شدتِ طیش نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔

ایک تربیت یافتہ فوجی ہونے کے باوجود بظاہر وہ حماقت سے کام لے رہا تھا۔ محض ایک رائفل کے سہارے وہ اکیلا ہی آگ کے دریا میں کودنے جا رہا تھا۔ اسے تربیت کے دوران خطروں سے کھیلنا سکھایا گیا تھا مگر ہوش وحواس کو قائم رکھنے کا سبق بھی دیا گیا تھا لیکن اس وقت اپنی ساری تربیت کو فراموش کر کے وہ جنونی انداز میں دشمن کی قیام گاہ کی طرف روانہ تھا۔

جلد ہی وہ ملک مراد کی پُرشکوہ حویلی تک پہنچ گیا۔ ماحول پر مکمل سناٹے کا راج تھا۔ چند لمحے اس نے حویلی کا جائزہ لیا اور پھر فوجی تربیت کے دوران سکھایا جانے والا طریقہ استعمال کرتے ہوئے دیوار پھاندنے میں کامیاب ہو گیا (دورانِ ٹریننگ عام طور پر فوجیوں کو نو فٹ اونچی دیوار پھاندنے کی مشقیں کرائی جاتی ہیں اس لیے ہر تربیت یافتہ جوان با آسانی نو فٹ اونچی دیوار پھاند سکتا ہے)۔

دیوار سے دوسری طرف کودتے ہوئے ہلکی سی ''دھپ'' کی آواز پیدا ہوئی تھی مگر اس نے کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ رائفل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے وہ تیزی سے رہائشی کمروں کی طرف بڑھا مگر پھر اچانک ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے دو جسیم کتے غراتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔ صورتِ حال ایکدم اس کے لیے خطرناک ہو گئی تھی۔ کتوں پر گولی چلانے کا رسک وہ بالکل نہیں لے سکتا تھا۔

ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل کر ڈالا۔ رائفل کو اس نے بیرل کی طرف سے پکڑا اور پوری قوت کے ساتھ آگے والے کتے کے جبڑے کو نشانہ بناتے ہوئے وار کر دیا۔ رائفل کا مضبوط بٹ کتے کے جبڑے سے ٹکرایا اور کتا اس افتاد کی تاب نہ لاتے ہوئے ''چیاؤں چیاؤں'' کرتا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرے کتے کے سر کو نشانہ بناتے ہوئے اس نے دوبارہ رائفل کو سر سے بلند کیا لیکن وہ اس کے قریب آتے آتے یکدم پیچھے ہٹ گیا۔

وہ جنونی انداز میں رائفل لہراتے ہوئے کتے کی طرف بڑھا تو وہ زور وشور سے بھونکتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ صورتِ حال کو بگڑتے دیکھ کر اس نے رائفل کو سیدھا کیا اور پھر بلاتردد کتے پر گولی چلا دی۔ دھماکا ہوا اور کتا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ کتے سے نجات حاصل کرتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا مگر اس دوران فائر کی اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن کر حویلی کے مکین جاگ چکے تھے۔



پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی کارروائی کرتا ملک مراد کے چھ سات مسلح محافظ اسے نرغے میں لے چکے تھے۔

''ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو''۔ ایک محافظ نے بارعب آواز میں اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ ہم تجھے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے''۔

''نہیں''۔ اس نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے نڈر انداز میں جواب دیا۔ ''میں تم سب کو جہنم رسید کر کے مروں گا''۔

''شاید تمہیں اپنے چچا کی زندگی سے کوئی پیار نہیں ہے''۔ اچانک اس کی سماعتوں سے ملک مراد کی آواز ٹکرائی اور وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

''میرے چچا کو اگر خراش بھی پہنچی تو میں تمہارا سارا خاندان مار ڈالوں گا''۔ اس نے ملک مراد کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے حق میں یہی بہتر ہے اسے میرے حوالے کر دو''۔

''جب تک تم ہتھیار نہیں پھینکو گے میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا''۔ ملک مراد نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

''لیکن میں ہتھیار پھینکنے کی بجائے لڑنا پسند کروں گا''۔ وہ ملک مراد کی پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ہتھیار اٹھانا سکھایا گیا ہے پھینکنا نہیں''۔

''تمہاری لڑائی تمہارے چچا کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گی''۔ ملک مراد کے انداز میں دھمکی تھی۔ ''تم شاید بھول رہے ہو کہ وہ میرے رحم وکرم پر ہے۔ میں اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں''۔

ملک مراد کی دھمکی سے مرعوب ہونے کی بجائے وہ چچا کی سلامتی کے بارے میں سوچ کر ہتھیار ڈالنے کے لیے مجبور ہو گیا۔

جونہی اس نے رائفل پھینکی ملک مراد کے محافظوں نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک تہہ خانے کے ٹھنڈے فرش پر پڑا ہوا اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اس کے اشتعال نے اب بے بسی کی صورت اختیار کر لی تھیں۔

-:- ===-:- ===-:-

دوسرے دن وعدے کے مطابق انسپکٹر صادق حسین چند سپاہیوں کی معیت میں فتح پور گاؤں پہنچ گیا۔ جہانداد نے اسے اپنے خفیہ ٹھکانے کا پتا بتا دیا تھا اس لیے کسی مشکل کا سامنا کیے بغیر اس نے وہ جگہ ڈھونڈ لی تھی۔ وہ جگہ کسی ہندو کا چھوڑا ہوا مکان تھی اور قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک غیر آباد چلی آ رہی تھی۔ گاؤں کے توہم پرستوں لوگوں نے اسے آسیب زدہ مشہور کر رکھا تھا۔ اس لیے کوئی شخص اس کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔ اسی توہم پرستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جہانداد نے

اس مکان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

انسپکٹر صادق حسین تیزی سے چلتا ہوا مکان کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہو گیا ماتحت سپاہی بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ انسپکٹر صادق حسین نے مکان کی اندرونی حالت پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر اس واحد کچے کمرے کی طرف بڑھ گیا جس کے متعلق اس جہانداد نے بتایا تھا۔

کمرا اندر سے بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ یہ صورتِ حال چونکا دینے والی تھی مگر اس کمرے کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ کمرے کی اشیاء میں بان کی ایک چارپائی، مٹی کا ایک گھڑا جس سلور کا ایک گلاس بھی اوندھا رکھا ہوا تھا، ایک چراغ اور لکڑی کا وہ تختہ تھا جس کے ساتھ دلاور کو باندھا گیا تھا۔ تختے کے ساتھ کٹی ہوئی رسیاں بدستور موجود تھیں۔

تاہم اسے چونکانے کے لیے کمرے کے کچے فرش پر موجود خون کے دھبے کافی تھے۔ چند لمحے جھک کر وہ کمرے کے کچے فرش کو غور سے دیکھتا رہا، خون کے علاوہ وہاں قدموں کے بھی آڑے ترچھے نشانات موجود تھے جنہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہاں کچھ لوگوں کے درمیان ہاتھا پائی ہوئی ہے۔

آدھا گھنٹہ وہاں موجود رہنے کے بعد جب اسے کوئی اہم سراغ نہ مل سکا تو وہ ایک سپاہی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''جہانداد کا خدشہ ٹھیک تھا یہاں کوئی اہم واقعہ ہو چکا ہے جہانداد کی عدم موجودگی سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ہمیں ملک مراد کو ٹٹولنا ہوگا۔ دلاور اس کا ایک اہم کارندہ ہے''۔

''سر! کیوں ناں...... پہلے جہانداد کا پتا کر لیا جائے؟'' ایک کانسٹیبل نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو علن''۔ انسپکٹر صادق اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ''جہانداد کو گھر میں نہیں یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ مجھے لگتا ہے اس کے ساتھ کوئی انہونی ہو چکی ہے''۔

کانسٹیبل علن ڈانٹ کھا کر ٹھوڑی کھجانے لگ گیا۔ اس بے چارے کا پورا نام علی نواز تھا۔ مگر پورے تھانے میں وہ علن کے نام سے مشہور تھا۔ کند ذہن ہونے کی وجہ سے اکثر اسے ڈانٹ پڑتی رہتی تھی۔ حتی المقدور وہ خود کو بولنے سے باز رکھتا تھا کیونکہ اپنی چھ سالہ ملازمت کے دوران اس نے آج تک کوئی بھی عقل کی بات نہیں کی تھی۔ ہمیشہ الٹی سیدھی ہی ہانکتا رہتا تھا۔

انسپکٹر صادق اس مکان سے نکلا اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ ملک مراد کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ پولیس والوں کو متحیر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ وہاں پولیس برسوں میں کبھی کبھار ہی نظر آیا کرتی تھی اور وہ بھی چوری، قتل یا ڈکیتی جیسا کوئی اہم وقوعہ ظہور پذیر ہونے کے بعد۔ گاؤں کے لوگ اس تازہ واقعے سے بے خبر تھے اس لیے ان کا حیران ہونا کوئی اچنبھے کی بات



نہیں تھی۔

پولیس کو دیکھ کر ملک مراد کا ماتھا ٹھنکا مگر وہ ایک عیار شخص تھا، جلدی ہی اس نے اپنے اضطراب پر قابو پا لیا اور پھر خوشامدی انداز میں پولیس والوں کا استقبال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد اس نے اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں انہیں بٹھایا اور ایک ملازم سے چائے اور دیگر لوازمات لانے کو کہا۔

''ملک صاحب!'' ملازم کے جانے کے بعد انسپکٹر صادق حسین گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم ناشتہ کر چکے ہیں اس لیے تکلف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم اپنی ڈیوٹی انجام دینے آئے ہیں''۔

''فرمائیے جناب''۔ ملک مراد نے چہرے پر مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''دلاور کہاں ہے ملک صاحب؟'' انسپکٹر نے بلاتمہید استفسار کیا۔ ''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں''۔

''کیا اس نے کوئی جرم کیا ہے؟'' اس نے الٹا سوال کر دیا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہے تو بتائیں میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا''۔

''ملک صاحب! کھال ادھیڑنے کے لیے قانون موجود ہے۔ آپ بس اسے میرے سامنے پیش کر دیں۔ میں جانوں اور میرا کام''۔

''وہ اگر یہاں ہوتا تو ضرور پیش کر دیتا''۔ ملک مراد نے جواب دیا۔ ''اسے شہر گئے ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ تاہم آپ بے فکر رہیں جونہی وہ واپس آئے گا میں اسے خود تھانے لے کر پہنچ جاؤں گا۔ بس آپ اتنا بتا دیں کہ اس نے کیا کیا ہے؟''

''ملک صاحب! قانون کو چکر دینے کی کوشش نہ کریں''۔ انسپکٹر صادق غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ بہتر ہوگا آپ قانون سے تعاون کریں''۔

''انسپکٹر صاحب! میں ایک ذمہ دار شہری ہوں''۔ اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے آپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ بلاوجہ مشکوک ہو رہے ہیں حالانکہ میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ دلاور اگر یہاں ہوتا تو ابھی آپ کے سامنے پیش کر دیتا مگر افسوس کہ وہ یہاں نہیں ہے''۔

اسی دوران ملازم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لے کر پہنچ گیا اور وقتی طور پر ان کی گفتگو کا

سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ملازم نے ان کے سامنے میز پر بسکٹ، کیک اور مٹھائی کی پلیٹیں سجانے کے بعد پیالیوں میں چائے ڈالی اور پھر ملک مراد کی اجازت پا کر رخصت ہو گیا

''بسم اللہ کیجئے''۔ ملازم کے جانے کے بعد ملک مراد بولا۔ ''باتیں تو چلتی ہی رہیں گی مگر پیٹ پوجا بھی ضروری ہے''۔

''ملک صاحب! معاملہ بہت گمبھیر ہے''۔ انسپکٹر صادق گرما گرم چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ آپ اس فوجی نوجوان کے کسی معاملے میں ٹانگ نہ اڑائیں''۔

''کیا آپ قاسم علی کے بیٹے جہانداد کی بات کر رہے ہیں؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ہاں''۔ انسپکٹر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس نے تین آدمیوں کے خلاف پرچہ درج کروایا ہے۔ جن میں سے ایک آپ کا بھانجہ افضل ہے اور دوسرا دلاور''۔

''اور تیسرا آدمی کون ہے؟'' اس نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

''مشہور ڈاکو سانول''۔ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''اور مزید یہ کہ انہوں نے یہ سب کچھ آپ کے ایما پر کیا ہے''۔

''اور آپ اس احمق فوجی کی باتوں میں آ گئے''۔ ملک مراد نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''کیا میں آپ کو مجرم نظر آتا ہوں؟ کیا میرا تعلق ڈاکوؤں سے ہو سکتا ہے؟''

''جب تک دلاور نہیں مل جاتا، میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کی گواہی پر میں افضل اور سانول کو گرفتار کروں گا''۔

''انسپکٹر صاحب! جہانداد نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ وہ اپنی صفائی دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ اس مکار شخص کی باتوں میں نہ آئیں۔ آپ اس سے قانونی طریقے کے ساتھ پیش آئیں اور اسے سمجھانے کی کوشش کریں کہ وہ عزت دار لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے کی کوشش نہ کرے''۔

''دلاور کی طرح وہ بھی غائب ہے''۔ انسپکٹر نے جواب دیا۔

''کیوں، وہ اپنے گھر میں موجود نہیں ہے؟'' اس نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ''پرچہ کٹوانے کے بعد خود ہی منظر سے غائب ہو گیا ہے''۔

''ہو سکتا ہے دلاور کی طرح اسے بھی آپ نے کہیں غائب کرا دیا ہو''۔ انسپکٹر صادق مشکوک انداز میں بولا۔ ''ورنہ تو اسے اور حاکم علی کو وہاں موجود ہونا چاہیے تھا''۔

''آپ عجیب بات کر رہے ہیں جناب''۔ اس نے چڑ کر کہا۔ ''میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے



کہ دلاور تین دن قبل شہر جا چکا ہے مگر آپ کو یقین ہی نہیں آ رہا۔ الٹا آپ مجھ پر جہانداد کو غائب کرنے کا بھی الزام لگا رہے ہیں حالانکہ آپ کو سب سے پہلے جہانداد اور حاکم علی کو تلاش کرنا چاہیے تھا''۔

''میں انہیں تلاش کرلوں گا''۔ انسپکٹر نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''وہ چچا بھتیجا جہاں کہیں بھی ہوئے مجھے مل جائیں گے تاہم آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی کبھی کوشش نہ کرنا ورنہ......''

''آپ مجھے میرے ہی گھر میں دھمکی دے رہے ہیں''۔ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میری پہنچ کہاں تک ہے؟''

''مجھے آپ کی پہنچ سے کچھ لینا دینا نہیں''۔ انسپکٹر نے بغیر مرعوب ہوئے جواب دیا۔ ''فی الحال میں جہانداد اور حاکم علی کے گھر جا رہا ہوں۔ اگر وہ دونوں مجھے وہاں مل گئے تو ٹھیک ورنہ آپ مشکوک ٹھہریں گے۔ ہو سکتا ہے ان کے اہلِ خانہ بھی آپ پر شک کا اظہار کریں''۔

''جائیے انسپکٹر صاحب''۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت آپ اونچا اُڑ رہے ہیں۔ جب دھڑام سے نیچے گریں گے تو تب معلوم ہوگا کہ......''

''بس''۔ انسپکٹر نے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کی۔ ''اس سے آگے ایک لفظ بھی نہ کہنا ورنہ میں تمہیں ایک باوردی انسپکٹر کو دھمکانے کے جرم میں گرفتار کرلوں گا''۔

اتنا کہہ کر اس نے اپنے ماتحتوں کو چلنے کا اشارہ کیا اور پھر خدا حافظ کہے بغیر رخصت ہو گیا۔

ملک مراد کی حویلی سے نکلنے کے بعد وہ سیدھا قاسم علی کے گھر پہنچ گیا مگر وہاں جا کر اسے مایوسی ہی ہوئی تھی گھر میں صرف پریشان حال عورتیں تھیں اور قاسم علی صبح سے بیٹے اور بھائی کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔

اس نے گھر کی عورتوں سے چند سوال کیے اور پھر انہیں تسلیاں دیتے ہوئے واپس تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

+===+===+

رات کا بقیہ حصہ جہانداد نے جاگتے ہوئے تہہ خانے میں گزار دیا تھا۔ وہ بالکل بے بس تھا سوائے کڑھنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ چند لمحوں کے جوش نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

''کاش میں نے اس وقت ہوش سے کام لیا ہوتا''۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو کوسا اور پھر اٹھ کر تہہ خانے کے اندر ٹہلنا شروع کر دیا۔ تہہ خانے کی چھت میں ایک گول جنگلا لگا ہوا تھا جس

سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی لیکن یہ روشنی براہِ راست نہیں تھی بلکہ اوپر والے کمرے میں ہونے کی وجہ سے آ رہی تھی۔ اندر بستر نام کی کوئی چیز نہیں تھی تاہم ایک کورے گھڑے میں پانی ہوا تھا۔ پانی کو دیکھتے ہی اسے اچانک شدت کے ساتھ پیاس محسوس ہوئی اور وہ گھڑے کی طرف بڑھ گیا۔

دو گلاس پانی کے غٹا غٹ پینے کے بعد اس نے دوبارہ تہہ خانے کا جائزہ لینا شروع کر تھوڑی دیر تک وہ تہہ خانے کی سپاٹ دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھتا رہا پھر سیڑھیاں چڑھ دروازے تک پہنچ گیا۔

تہہ خانے کا فولادی دروازہ بہت مضبوط تھا۔ اسے اندر سے کھولنا یا توڑنا ناممکن تھا۔ نے اچھی طرح دروازے کا جائزہ لیا۔ اس پر زور آزمائی کر کے...... اس کی مضبوطی کا اندازہ مگر دروازہ اس کے تصور سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔

اچانک اسے دروازے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر ہوا نیچے پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی سماعتوں سے دروازہ کھلنے کی آواز ٹکرائی اور دو مسلح محا سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے پہنچ گئے۔ ایک نے ناشتہ اٹھا رکھا تھا جبکہ دوسرے نے فائر پوزیشن میں رائفل پکڑی ہوئی تھی۔

دونوں محافظوں کا انداز بہت محتاط تھا۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر انہوں نے ٹر نیچے رکھ دی اور پھر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ استہزائیہ انداز میں بولا
''میں نہتا ہوں۔ تم لوگوں کو خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''ملک صاحب کہتے ہیں کہ تم بہت خطرناک شخص ہو''۔ ان میں ایک بولا۔ ''بھارتیوں قید میں بھی رہ چکے ہو، اس لیے ہم تمہارے نزدیک آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے''۔

''میں ملک مراد سے ملنا چاہتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''کیا تم لوگ میرا یہ پیغام اس تک پہ دو گے؟''

''پہنچا دیں گے''۔ اسی محافظ نے سپاٹ آواز میں جواب دیا اور پھر سیڑھیاں چڑھتے ہو دونوں باہر نکل گئے۔ تہہ خانے کا فولادی دروازہ ایک بار پھر بند ہو چکا تھا۔

محافظوں کے جانے کے بعد جہانداد پر اچانک ہی بے بسی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی بھوکا ہونے کے باوجود اس کا دل ناشتہ کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ ہی عرصہ قبل تو وہ دشمن کی سے رہا ہوا تھا۔ گاؤں آتے وقت وہ کتنا خوش تھا۔ پُرسکون زندگی گزارنے کے نہ جانے اس کتنے ہی خواب دیکھے تھے جو ایک پل میں بکھر کر رہ گئے تھے۔



جن ہم وطنوں کی خاطر بارڈر پر بارہا اس نے موت کا سامنا کیا تھا، آج وہی اس کی جان کے درپے تھے۔ انہی جگر پاش سوچوں نے ایک بار پھر اسے مشرقی پاکستان کے محاذ پر پہنچا دیا۔

✣ ===✣ ===✣

حوالدار شہادت علی کے شہید ہونے کے بعد وہ بہت اداس ہو گیا تھا۔ وہ اکثر زندگی اور موت کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار اسے حوالدار شہادت علی کی موت پر رشک آنے لگتا تھا جو نہ صرف زندگی کے جھمیلوں سے آزاد ہو گیا تھا بلکہ حیاتِ جاودانی کا راز بھی پا گیا تھا۔ کیا موت اتنی حسین اور دل کش بھی ہو سکتی ہے کہ انسان گولیاں کھا کر بھی منہ سے اُف کی آواز نہ نکالے؟

نہ جانے یہ شہادت علی کس مٹی کا بنا ہوا تھا؟

وہ بارہا خود سے یہ سوال پوچھ چکا تھا مگر اسے جواب نہیں سوجھتا تھا۔ پھر انہی دنوں انہیں بٹالین ہیڈ کوارٹر سے چٹا گانگ کے ساحلی علاقوں کی طرف کوچ کرنے کا حکم مل گیا۔ وہاں ساحل سے نہ صرف ہندوستانی فوجی دراندازی کر رہے تھے بلکہ پورے چٹا گانگ ضلع میں مکتی باہنی کی کارروائیاں عروج پر تھیں۔ مکتی باہنی کے غنڈے پاکستانی افواج کے تو دشمن تھے ہی عام شہریوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ محض ایک فردِ واحد کی خواہش کی تکمیل کے لیے انہوں نے مشرقی پاکستان میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ وہاں کسی کی عزت و جان محفوظ نہ تھی۔ ہر طرف آگ و خون کے دریا تھے۔ موت کا بھیانک دہانہ صبح و شام جیتے جاگتے انسانوں کو نگل رہا تھا۔ درندگی کے ایسے ایسے نظارے...... جنہیں دیکھ کر روح تک تھرا اٹھتی تھی۔

جہانداد کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت ہوتے تھے، خاص کر مکتی باہنی کے غنڈوں کے لیے تو وہ قہر بن جایا کرتا تھا۔

ایک روز معمول کے مطابق وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک ساحلی بستی میں گھوم رہا تھا۔ ساری بستی میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے مکان بنے ہوئے تھے جن کے اردگرد خشک بانسوں کی چار دیواریاں کھڑی کی گئی تھیں۔ پوری بستی میں کہیں بھی اینٹوں یا مٹی کے مکانات نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہاں کے باشندے بہت ہی غریب تھے اور دوسرا وہ ساحلی علاقہ تھا۔ گرمیوں میں وہاں کثرت سے سیلاب آتے تھے اس لیے لوگ لکڑی کے مکانوں کو ترجیح دیتے تھے۔

پوری بستی ناریل، کیلے اور بانس کے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ جنگ سے پہلے وہاں کی زندگی بہت ہی خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ مگر جنگ چھڑنے کے بعد وہاں زندگی بے وقعت ہو کر رہ گئی تھی۔ آئے دن بے گناہ لوگ مکتی باہنی کے غنڈوں کے ہاتھوں مارے جا رہے تھے۔ ان بے بس اور مظلوم لوگوں کی مددگار صرف پاکستانی فوج تھی جو خود بیک وقت تین محاذوں پر برسرِ پیکار تھی۔

چالاک دشمن نے ان کی عسکری قوت کم کرنے کے لیے مغربی پاکستان کی سرحدوں پر ہم
تھا۔علاوہ ازیں دشمن کی سازش سے مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کا عالم تھا اور سرحدوں پر
جنگ چھڑی ہوئی تھی۔

جہانداد اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ بستی میں گشت کر رہا تھا جب اچانک ا
مکان سے انہیں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔وہ تینوں ٹھٹک کر رک گئے اور کان
اندر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔فریاد کرتی ہوئی نسوانی آوازوں کے ساتھ سا
مردانہ قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔

''شاید مکان کے اندر مکتی باہنی کے غنڈے گھسے ہوئے ہیں''۔جہانداد اپنے ساتھی
مخاطب ہوا۔''ہمیں ان کی مدد کرنا ہوگی''۔

''ہم تیار ہیں''۔دونوں ساتھیوں نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پہلے میں اندر جاتا ہوں، تم دونوں میرے پیچھے پیچھے رہنا''۔اتنا کہہ کر
رائفل کو فائرنگ پوزیشن میں پکڑا اور تیزی سے مکان کے اندر گھس گیا۔

مکان کے اندر داخل ہونے کے بعد جو نظارا اس نے دیکھا وہ اس کے لی
برداشت تھا۔صحن میں مکتی باہنی کے چار پانچ غنڈے تین عورتوں کو زدوکوب کر رہے تھے۔
کے بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس برہنگی کی حد تک پھٹے ہوئے تھے۔ان کی فریاد اور من
غنڈوں کے قہقہوں تلے دب کر رہ گئی تھی۔

ایک مرد صحن میں اوندھے منہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا، شاید وہ مر چکا تھا یا پھر
تھا۔جہانداد سے ان کا فاصلہ پچیس تیس فٹ تھا۔جہانداد نے پودوں کی آڑ لے رکھی تھی اس
کے غنڈے اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔جہانداد مظلوم عورتوں پر یہ ظلم و تشدد دیکھ کر طیش کے
ہونٹ بھینچے ہوئے بیٹھا تھا۔اس دوران اس کے دونوں ساتھی بھی مکتی باہنی کے غنڈوں کی
سے بچتے ہوئے اس تک پہنچ چکے تھے۔پانچوں غنڈے آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

اب وہ تینوں دم سادھے غنڈوں کی کارروائی دیکھ رہے تھے تاہم رائفلیں انہ
فائرنگ پوزیشن میں پکڑ رکھی تھیں۔وقت پڑنے پر وہ غنڈوں کے لیے موت کا دہانہ ک
تھے۔دراصل انہیں ایک خاص موقعے کی تلاش تھی اگر وہ فی الفور غنڈوں پر فائرنگ کر دیتے
ممکن تھا کہ وہ مظلوم عورتیں بھی فائرنگ کی زد میں آ جاتیں کیونکہ عورتیں غنڈوں کے نرغے
ہوئی تھیں اور وہ مزاحمت کرتے ہوئے کسی ایک جگہ پر ٹک بھی نہیں رہی تھیں۔وہ ا
میں مصروف تھیں کہ کسی طرح غنڈوں کی دست برد سے نکل جائیں مگر غنڈے انہیں فر



کا موقع نہیں دے رہے تھے۔

وہ بنگالی زبان میں عورتوں سے کچھ پوچھ رہے تھے لیکن ان کی باتیں جہانداد اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔وہ محض اندازہ ہی لگا سکتے تھے کہ شاید غنڈے ان عورتوں سے کسی کا پتا دریافت کر رہے ہیں۔عورتوں کی چیخ و پکار تواتر کے ساتھ جاری تھی۔جہانداد اور اس کے ساتھیوں کی قوتِ برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔غنڈوں کا عورتوں کے ساتھ سلوک نہایت ہی وحشیانہ اور اہانت آمیز ہوتا جا رہا تھا۔

جہانداد کی انگلی کا دباؤ لاشعوری طور پر رائفل کے ٹریگر بڑھتا جا رہا تھا اور آنکھوں سے قہر و غضب برسنے لگا تھا۔

''کیا فائر کر دیں؟'' اچانک اس کے ایک ساتھی نے سرگوشی میں پوچھا اور جہانداد نے چونک کر ٹریگر سے انگلی ہٹا دی۔

اسی دوران بالکل غیر متوقع طور پر ایک عورت نے ان میں سے ایک غنڈے کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے اور پھر چشم زدن میں اس کی گرفت سے نکل کر ایک طرف بھاگ اٹھی

عورت کی یہ جسارت ان پانچوں غنڈوں کے لیے خلافِ توقع تھی۔اسے پکڑنے کے لیے وہ سب اس کے پیچھے لپکے مگر پھر اچانک ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

جہانداد اور اس کے ساتھیوں کی رائفلیں بیک وقت گرجیں اور تین غنڈے زمین بوس ہو کر تڑپنے لگے۔بقیہ دو اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد سے گھبرا کر ایک کمرے میں گھس گئے۔بھاگنے والی عورت بھی جہانداد اور اس کے ساتھیوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی جبکہ صحن میں موجود دونوں عورتیں بے تحاشا چلانے لگی تھیں۔گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ان کے ہوش و حواس گم کر دیے تھے۔

جہانداد اور اس کے ساتھیوں نے اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتے ہوئے مطلوبہ کمرے کی طرف چند گولیاں داغیں لیکن جب ردِعمل کے طور پر کچھ بھی ظاہر نہ ہوا تو وہ قدرے مطمئن انداز میں پودوں کی آڑ لیتے ہوئے کمرے کے عقب کی طرف بڑھنے لگے۔ان تینوں کی رفتار بے حد سُست تھی کیونکہ احتیاط لازم تھی۔کمرے میں پناہ لینے والے دونوں غنڈے مسلح تھے اور جوابی کارروائی کرتے ہوئے وہ انہیں نشانہ بنا سکتے تھے۔کمرے کا دروازہ جہانداد اور اس کے ساتھیوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا، سامنے کی طرف کمرے کی کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔تاہم عقب میں کسی بھی کھڑکی کی موجودگی یا غیر موجودگی سے وہ لاعلم تھے۔

کمرے میں چھپنے والے دونوں غنڈوں کی طرف سے ابھی تک کوئی جوابی کارروائی نہیں کی

گئی تھی۔ تاہم ان کے لیے خطرہ بدستور موجود تھا کیونکہ وہ کھلی جگہ پر تھے اور غنڈے کمرے میں ان کی نسبت زیادہ محفوظ تھے اور یہی بات جہانداد اور اس کے ساتھیوں کو کھٹک رہی تھی۔ غنڈوں کی خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتی تھی، اس لیے وہ تینوں نہایت ہی محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔

صحن میں موجود دونوں عورتوں کا رونا دھونا اب قدرے کم ہو چکا تھا۔ اس دوران جہانداد اپنے ساتھیوں سمیت کمرے کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔

کمرے کے عقب میں پہنچتے ہی جہانداد کی نگاہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی اور پھر بے اختیار وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ دونوں غنڈے یقیناً کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ محتاط انداز میں کھڑکی کے قریب پہنچا اور اس نے اندر جھانک کر دیکھا تو اس کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ کمرا واقعی خالی پڑا ہوا تھا۔

☩ === ☩ === ☩

اچانک تہہ خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور جہانداد کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے چونک کر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔ ملک مراد دو مسلح محافظوں کے ساتھ تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جہانداد کے قریب پہنچتے ہی اس نے ایک نظر ناشتے کی ٹرے پر ڈالی جو جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ استہزائیہ انداز میں جہانداد کی طرف دیکھنے لگا۔

"ناشتہ کیوں نہیں کیا تم نے، کیا بھوکا مرنے کا ارادہ ہے؟" اس نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔ "ایک بات کان کھول کر سن لو، تم یہاں سے جیتے جی نہیں نکل سکتے۔"

"حاکم علی کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا ہے؟" جہانداد نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ "اگر وہ زندہ ہے تو اسے چھوڑ دو۔"

"شاید تم مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہو؟" ملک مراد کا انداز مذاق اُڑانے والا تھا۔ "برخوردار! یہ بھارت کا کوئی قیدی کیمپ نہیں ہے، ملک مراد کی حویلی کا تہہ خانہ ہے۔ یہاں سے آج تک کوئی قیدی زندہ باہر نہیں نکل سکا اس لیے یہاں سے فرار ہونے کے متعلق کبھی بھول کر بھی نہ سوچنا۔"

"میں پولیس کو تمہارے متعلق اطلاع دے چکا ہوں۔" جہانداد مطمئن انداز میں بولا۔ "بہت جلد تمہاری کلائیوں میں سرکاری کنگن پڑ جائے گا۔"

"خام خیالی ہے تمہاری۔" ملک مراد نے قہقہہ لگایا۔ "پولیس کو میں جوتے کی نوک پر رکھتا



ہوں۔ تمہارے اس انسپکٹر صادق سے میں مل چکا ہوں۔ احمق مجھے دھمکانے آیا تھا مگر اب خود کو کوس رہا ہوگا۔ میں ایسے ٹکے ٹکے کے لوگوں کی دھونس میں نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ میری حویلی کا رخ نہیں کرے گا۔"

"آج بازی تمہارے ہاتھ میں ہے ملک مراد!" جہانداد بغیر مرعوب ہوئے بولا۔ "لیکن کھیل کا پانسہ پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ میرے چچا کے بدن پر اگر خراش بھی آئی تو میں تمہاری حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

"بلے بھئی بلے۔" ملک مراد اسے استہزائیہ انداز میں داد دیتے ہوئے بولا۔ "تمہاری ہمت کی داد دینا پڑے گی۔ شیر کی کچھار میں گھس کر بھی گرج رہے ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہاں سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟"

"یہ آنے والا وقت بتائے گا۔" جہانداد نے کہا۔

"چلو مان لیا، تم یہاں سے بھاگ جاتے ہو۔" ملک مراد سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن جاؤ گے کہاں؟ کیا تمہیں اپنے والدین اور نوجوان بہن کا کوئی خیال......"

آخری الفاظ ابھی ملک مراد کی زبان پر ہی تھے جب اچانک جہانداد نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

"میری بہن تک پہنچنے سے پہلے ہی میں تمہارا قصہ تمام کر دوں گا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے ملک مراد کی گردن دبوچتے ہوئے بولا۔ "تم جیسے کمینے کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

ملک مراد کو اس سے اتنی جرأت کی توقع ہی نہیں تھی تاہم محافظوں کے سنبھلنے تک جہانداد نے اس کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی۔ دونوں محافظوں نے گولی چلانے کی بجائے رائفلوں کے بٹ جہانداد کی پشت پر برسانا شروع کر دیے تھے مگر جہانداد نے کسی آکٹوپس کی طرح ملک مراد کو جکڑ رکھا تھا۔ جہانداد کے نیچے پڑے ملک مراد کا دم لحہ بہ لحہ گھٹتا جا رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے بالکل قریب تھا جب اچانک اس کے گلے پر جہانداد کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ایک محافظ نے جھنجھلا کر جہانداد کے سر پر رائفل کا بٹ رسید کر دیا تھا۔ وار اتنا کاری تھا کہ جہانداد ایک پل میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

جہانداد کے بے ہوش ہوتے ہی دونوں محافظوں نے اسے گھسیٹ کر ملک مراد کے اوپر سے ہٹایا اور پھر ملک مراد کی طرف متوجہ ہو گئے جو بے حال سا تہہ خانے کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد جب ملک مراد کی حالت بہتر ہو گئی تو وہ کسی بھوکے گدھ کی طرح بے ہوش پڑے ہوئے جہانداد پر ٹوٹ پڑا۔ وہ نہ صرف اسے بے دردی سے مار پیٹ رہا تھا بلکہ بے تحاشا گالیاں

بھی دے رہا تھا۔

جی بھر کر دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد جب اس کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا تو وہ دو
محافظوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے خوف کی وجہ سے دم سادھے ہوئے کھڑے تھے۔ ایک
دونوں محافظوں کو قہر آلود انداز میں گھورنے کے بعد وہ گرج کر بولا۔

''دل تو چاہتا ہے کہ تم دونوں کو زندہ زمین میں گاڑ دوں۔ مسلح ہونے کے باوجود تم سے ا
شخص نہیں سنبھالا گیا۔ کیوں؟''

''وہ ملک صاحب! در...... اصل ......'' ایک محافظ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ہم نہ
چاہتے تھے کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے ہلاک ہو جائے''۔

''کیوں؟'' ملک مراد نے آگے بڑھ کر اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ''وہ کیا تمہاری ماں ک
خصم لگتا ہے جو اس کے مرنے کی تمہیں فکر ہے''۔

''مم...... ملک صاحب!'' محافظ گھگیا کر بولا۔ ''ہم...... آپ...... کے لیے...... مصیبت
کھڑی کرنا نہیں چاہتے تھے''۔

''بکواس مت کرو گدھے کے بچے''۔ ملک مراد چلا کر بولا اور پھر دوسرے محافظ کی طرف
بڑھ گیا جو ندامت کے مارے تہہ خانے کے فرش کو گھور رہا تھا۔

''اور تم''۔ ملک مراد نے اس کے بال مٹھی میں پکڑتے ہوئے دو تین جھٹکے دے کر کہا۔ ''تم
نے اسے کس لیے چھوڑ دیا؟ سؤر کی اولاد! کھاتے میرا ہو اور ہمدردی میرے دشمن سے۔ کیوں؟''

''مم...... معاف...... کر دیجیے ملک صاحب''۔ محافظ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آئندہ
ایسی غلطی نہیں ہو گی''۔

''ہوش میں لے آؤ اپنی ماں کے اس کچھ لگتے کو''۔ ملک مراد نے ایک زوردار جھٹکا دے کر
اس کے بال چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں سے میں بعد میں نمٹ لوں گا''۔

ملک مراد سے نجات حاصل کرتے ہی دونوں محافظ سرعت کے ساتھ جہانداد کی طرف متوجہ
ہو گئے۔ رائفل کا بٹ لگنے سے جہانداد کے سر پر زخم تو نہیں آیا تو تاہم ایک گومڑا ابھر آیا تھا۔ وہ
شاید اب تک ہوش میں آ چکا ہوتا لیکن ملک مراد کی مار نے بے ہوشی کے وقفے کو طویل کر دیا تھا۔

''پانی پلاؤ اسے''۔ ملک مراد محافظوں کو جہانداد کی ہتھیلیاں اور تلوے سہلاتے ہوئے دیکھ
کر دھاڑا۔ ''زنانیوں کی طرح مالش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

ملک مراد کا حکم سن کر ایک محافظ اٹھا اور تہہ خانے میں موجود پانی کے گھڑے کی طرف بڑھ گیا
بہ عجلت اس نے پانی کا گلاس بھرا اور دوبارہ جہانداد کے پاس پہنچ گیا۔



دوسرے ہی لمحے دونوں محافظ بے ہوش پڑے جہانداد کے منہ میں پانی ٹپکا رہے تھے۔
محافظوں کی تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد جہانداد نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ محافظ نے
پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

پانی پینے کے بعد جہانداد کی حالت قدرے سنبھل گئی تاہم اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اب وہ
فرش پر پاؤں پسار کر بیٹھ چکا تھا۔ دونوں محافظ بھی اس کے پاس سے اٹھ گئے تھے۔ ملک مراد
کھا جانے والی نگاہوں سے جہانداد کو گھور رہا تھا اور جہانداد اپنے سر کا مضروب حصہ سہلا رہا تھا۔
غصے سے اس کا رواں رواں کھول رہا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ دو مسلح محافظوں کی موجودگی میں ملک مراد
سے ٹکرانے کا انجام وہ دیکھ چکا تھا۔ اس لیے دوبارہ کوئی ایسی حرکت کرنے سے وہ گریز کر رہا تھا۔

''بس!'' اچانک ملک مراد استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''یہی تھی تمہاری مردانگی۔ مجھے جان
سے نہیں مارو گے؟''

''مجھے گولی مار دے ملک مراد''۔ جہانداد نے عجیب سے انداز میں جواب دیا۔ ''ورنہ بہت
پچھتائے گا''۔

''ابھی سے موت کی آرزو کرنے لگا ہے''۔ ملک مراد طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔ ''ابھی تو تم
نے میرا اصل روپ دیکھا ہی نہیں ہے۔ میں تجھے گولی مار کر آسان موت نہیں ماروں گا۔ تمہاری
بے بسی کا تماشا دیکھوں گا۔ تُو اس تہہ خانے میں موت کو ترسے گا لیکن تجھے موت بھیک میں بھی نہیں
ملے گی''۔

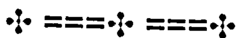
''میں تو تجھے مفت میں ایک مخلصانہ مشورہ دے رہا تھا''۔ جہانداد نے کہا۔ ''تُو اس سنہری
موقع کو ضائع کر کے کسی دن اپنے بال نوچے گا۔ مار ڈال مجھے، اسی میں تمہاری بہتری ہے''۔

''نہیں''۔ ملک مراد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تجھے بھول کر بھی گولی نہیں
ماروں گا۔ تیرا غرور توڑوں گا، تیری روح پر زخم لگاؤں گا پھر تُو خود ہی دیواروں سے سر پھوڑ کر
مر جائے گا''۔

اتنا کہہ کر ملک مراد دونوں محافظوں کے ساتھ تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''تُو بزدل ہے ملک مراد!'' جہانداد نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ''ڈرتا ہے مجھ سے''۔

ملک مراد جواب دینے کی بجائے تہہ خانے کے آہنی دروازے سے باہر نکل گیا اور جہانداد
بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ تہہ خانے کا دروازہ ایک بار پھر باہر سے بند ہو چکا تھا۔



قاسم علی گزشتہ دو روز سے جہانداد اور حاکم علی کو ڈھونڈنے کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا لیکن

ابھی تک ان دونوں کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ جہانداد کی ماں اور حاکم علی کی بیوی نے رو رو کر برا حال
کرلیا تھا مگر انہیں تسلی دینے والا کوئی نہیں تھا۔ زینب اور سکینہ بھی ان دونوں کی گمشدگی پر
پریشان تھیں۔ قاسم علی جب بھی ان دونوں کی تلاش میں گھر سے باہر نکلتا تھا، زینب اور سکینہ دعا
مانگنا شروع کردیتی تھی۔

حاکم علی کی گمشدگی کے دوسرے روز ہی اس کی بیوی اپنی بیٹیوں کو ساتھ لے کر قاسم علی کے
گھر پہنچ چکی تھی۔ جوان بیٹیوں کے ساتھ وہ اکیلی نہیں رہ سکتی تھی۔ ویسے بھی جب سے افضل
زینب پر مجرمانہ حملہ کیا تھا وہ بہت محتاط ہوگئی تھی۔ زینب کے اکیلے باہر نکلنے پر بھی اس نے پابندی
دی تھی اور اب حاکم علی کی گمشدگی کے بعد تو اس احتیاط میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔

تیسرے روز جب دوپہر کے وقت قاسم علی گھر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر
ناکامی صاف نظر آرہی تھی۔ اس کی بیوی سمیت گھر کی تمام عورتوں نے اسے گھیر لیا اور اس
طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں۔ قاسم علی پہلے ہی جھنجلایا ہوا تھا، اس لیے قدرے درشت
انداز میں بولا۔

''تم سب کیا یہ سمجھتی ہو کہ میں ان کی تلاش میں سستی سے کام لے رہا ہوں اور مجھے ان کی
کوئی فکر نہیں ہے''۔

''کیا آپ نے ملک مراد سے معلوم کیا ہے؟'' اس کی بیوی نے استفسار کیا۔ ''ہوسکتا
ان کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ ہو، جہانداد نے اس کے بھتیجے افضل کے ساتھ جو کچھ کیا ہے شاید یہ
کا ردِعمل ہو''۔

''جب بھی کروگی احمقانہ بات کروگی'' قاسم علی نے جھنجلا کر کہا۔ ''بے وقوف عورت
اگر ان دونوں کی گمشدگی میں ملک مراد کا ہاتھ ہوگا تو کیا وہ بتادے گا؟''

''پھر بھی بھائی صاحب! اس سے پوچھنا تو پڑے گا''۔ حاکم علی کی بیوی فاطمہ بولی۔ ''آپ
کا جھنجلانا بجا ہے لیکن یوں پریشان ہونے سے کیا یہ مسئلہ حل ہوجائے گا؟ ان دونوں کے بعد آپ
ہی ہمارا واحد سہارا ہیں۔ اگر آپ ابھی سے ہمت ہار دیں گے تو آگے کیا ہوگا؟''

''دیکھو فاطمہ!'' وہ ملتجی ہوا۔ ''اس وقت میں بہت پریشان ہوں اور تھکا ہوا بھی ہوں اس
لیے مجھے تنگ کرنے کی بجائے خود بھی آرام کرو اور میری حالت پر بھی رحم کرو۔ وہ دونوں کوئی
نہیں ہیں، اپنی حفاظت کرسکتے ہیں''۔

''مجھے معلوم تھا تم کچھ بھی نہیں کروگے''۔ اس کی بیوی روتے ہوئے بولی۔ ''اب میں اپنے
بیٹے کو خود ہی تلاش کروں گی''۔



''خدا کے لیے خدیجہ!'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اتنا تنگ مت کرو کہ میں گھر
چھوڑ کر چلا جاؤں۔ کیا جہانداد صرف تمہارا بیٹا ہے، میرا کچھ نہیں لگتا؟''

''میں ماں ہوں، مجھ سے صبر نہیں ہوسکتا''۔ خدیجہ بدستور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ''جب
تک بیٹا سامنے نہیں آجاتا، میرے دل پر آرے چلتے رہیں گے''۔

''کیا باپ کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ ''یوں واویلا مچا کر تم کیا
یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ میں جہانداد سے محبت نہیں کرتا؟''

''میں کچھ نہیں جانتی، مجھے بس جہانداد سے ملنا ہے۔ آپ کچھ بھی کریں مجھے اس سے کوئی
سروکار نہیں ہے لیکن مجھے اگر بیٹا نہ ملا تو میں مرجاؤں گی''۔

ایسے ہی وقت بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی اور قاسم علی بیوی کو جواب دیے
بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھولتے ہی اس کا سامنا انسپکٹر صادق حسین سے ہوا جس کے ساتھ تین سپاہی بھی
موجود تھے۔ قاسم علی نے بغیر استفسار کیے گھر سے ملحقہ بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ رسمی کلمات کی
ادائیگی کے بعد انسپکٹر صادق حسین براہِ راست اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی شکل
دیکھ کر مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ ابھی تک ان دونوں کا کوئی سراغ نہیں ملا''۔

''تھانیدار صاحب!'' قاسم علی افسردہ انداز میں بولا۔ ''میں گزشتہ دو دنوں سے ان کی
تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں مگر ان کا کوئی پتا نہیں چل رہا ہے۔ نہ جانے انہیں آسمان کھا گیا ہے یا
زمین نگل گئی ہے''۔

''ہوں''۔ انسپکٹر صادق نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''آپ ایسا کریں کہ فی الفور ملک مراد
کے خلاف پرچہ کٹوادیں، میں ان دونوں کو برآمد کروالوں گا''۔

''نہیں تھانیدار صاحب!''۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں...... بہت غریب آدمی
ہوں اور ملک مراد بہت بااختیار شخص ہے۔ میں اس کے خلاف اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جوابی
کارروائی کے طور پر میرے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے''۔

''ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''قانون تمہیں ہر قسم کا تحفظ
فراہم کرے گا۔ ملک مراد تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں کرسکے گا''۔

''مجھے قانون کی طاقت سے انکار نہیں ہے لیکن......''

''لیکن کیا؟'' انسپکٹر نے بے تابی سے پوچھا۔

''تھانیدار صاحب! قانون اکثر ہم جیسے لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہوجاتا ہے۔

مجھے آپ کے خلوص پر کوئی شک نہیں ہے۔ آپ کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ میرے بیٹے کی گمشدگی کے پیچھے ملک مراد کا ہی ہاتھ ہے لیکن میں اس کے خلاف قانون کی مدد نہیں لوں گا

''تم لوگوں کی اسی کمزوری اور بزدلی نے ملک مراد کو شیر بنا دیا ہے''۔ انسپکٹر نے اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ قانون اس کے خلاف ایکشن لینا چاہتا ہے مگر تم جیسے لوگ عدم تعاون کی وجہ سے قانون معذور ہو کر رہ گیا ہے۔ آخر کب تک ایسا چلتا رہے گا؟ کسی نہ عملی قدم اٹھانا ہی پڑے گا''۔

''تھانیدار صاحب!'' وہ شرمسارانہ انداز میں بولا۔ ''مجھے اپنی بزدلی اور کمزوری کا اعـ ہے مگر میں بے بس ہوں، شاید آپ نہیں جانتے کہ میں نہ صرف ایک نوجوان بیٹی کا باپ ہوں حاکم علی کی دونوں بیٹیاں بھی جوان ہیں اور وہ بھی میری ذمہ داری ہیں۔ میں بھلا ملک مرا شخص سے کیسے دشمنی کر سکتا ہوں؟''

''میں تمہاری مجبوریاں سمجھتا ہوں''۔ انسپکٹر نے جواباً کہا۔ ''لیکن تم سے متفق نہیں ہوں تم نہیں چاہتے کہ تمہارے بیٹے اور بھائی کو بازیاب کرایا جائے؟''

''کیوں نہیں چاہتا''۔ وہ بلاتردد بولا۔ ''میری بیوی اور بھابی کا رو رو کر برا حال ہے۔ میرا بیٹا میرے بڑھاپے کا اکلوتا سہارا ہے۔ میں اس کی بازیابی کے لیے سب کچھ کر سکتا لیکن ملک مراد کے خلاف پرچہ درج نہیں کراؤں گا''۔

''بغیر پرچے کے میں اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی نہیں کر سکتا''۔ انسپکٹر درشت انداز بولا۔ ''تم خوب سوچ لو، میں پھر آؤں گا۔ پرچہ کٹوائے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا''۔ اتنا کہہ کر انسپکٹر گیا۔

''میں نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے''۔ اس نے افسردہ انداز میں جواب د انسپکٹر بُرا سا منہ بناتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ دل ہی دل میں وہ کی حماقت اور بزدلی پر کڑھ رہا تھا۔

✣ ===✣=== ✣

حاکم علی پچھلے ایک ہفتے سے سانول ڈکیت کے ڈیرے پر اس کی قید میں تھا۔ ملک مرا کارندوں نے دلاور کو چھڑانے کے بعد حاکم علی کو راتوں رات سانول کے ڈیرے پر پہنچا دیا دلاور کو چھڑاتے وقت مزاحمت کرنے پر حاکم علی کے سر پر ایک زخم بھی آ گیا تھا کیونکہ وہ اکیلا تھا ملک مراد کے کارندے چھ سات کی تعداد میں تھے۔ اب اس کے سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی گو کہ زخم معمولی سا تھا مگر قید نے اسے کمزور کر دیا تھا۔



اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر سانول کے ڈیرے پر لایا گیا تھا۔ وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ وہ کون سے علاقے میں ہے۔ جس کمرے میں وہ قید تھا اس میں کھڑکی تو کجا کوئی روزن بھی نہیں تھا۔ سانول اور اس کے ساتھی اس کے لیے بالکل اجنبی تھے تاہم اتنا وہ جانتا تھا کہ اسے ملک مراد کے حکم پر قید میں رکھا گیا ہے کیونکہ دلاور کو چھڑانے والے ملک مراد کے ہی کارندے تھے۔ اسے باقاعدگی سے دونوں وقت کا کھانا مل رہا تھا۔ ان لوگوں کا سلوک بھی اس کے ساتھ ناروا نہیں تھا البتہ وہ اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے تھے۔ جس کمرے میں وہ قید تھا اس کے دروازے پر چوبیس گھنٹے دو مسلح پہریدار موجود رہتے تھے۔ ایسے میں فرار کے متعلق وہ سوچ تو سکتا تھا مگر اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا اس کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ وہ صرف اکھاڑے میں لڑنا جانتا تھا لیکن یہ اکھاڑا نہیں تھا، آتشیں ہتھیاروں کے سامنے اس کی پہلوانی کسی کام کی نہیں تھی۔ ویسے بھی پہلوانی چھوڑے اسے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اس میں اب وہ پہلوانوں والا دم خم نہیں رہا تھا۔ اس لیے اس کے فرار کی کوششیں صرف سوچنے کی حد تک محدود تھیں، انہیں عملی جامہ پہنانے کی اُسے ابھی تک ہمت نہیں ہوئی تھی۔

دونوں وقت کا کھانا اسے مسلح پہریداروں کی نگرانی میں پہنچایا جاتا تھا۔ دونوں پہرے دار اور کھانا لے کر آنے والا شخص اس کی باتیں سنتے رہتے تھے لیکن اس کے کسی بھی ایسے سوال کا جواب نہیں دیا جاتا تھا جو اس کی قید سے متعلق ہوتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور جو شخص اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے تو حیران رہ گیا۔ آنے والا افضل تھا، ملک مراد کا بھانجا۔

''شاید اسے ملک مراد نے بھیجا ہو گا''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر افضل کے چہرے پر جواب طلب نگاہیں گاڑ دیں جو استہزائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحہ تو افضل اسے بغور دیکھتا رہا پھر پُرتمسخر انداز میں بولا۔

''حاکم علی! دیکھ لیا ملک مراد سے دشمنی کا انجام، اب تمہاری ساری زندگی اسی کمرے میں گزرے گی۔ یہاں سے زندہ حالت میں تم کبھی بھی باہر نہیں جا سکو گے''۔

حاکم علی نے ایک نظر دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح پہرے داروں پر ڈالی اور پھر افضل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''تمہیں شاید یہ گمان ہے کہ میں تمہارے سامنے گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگوں گا۔ تمہاری منت سماجت کروں گا۔ اگر تم ایسا سوچ رہے ہو تو مجھے تمہاری سوچ پر......''

''حاکم علی!'' اس نے قہقہہ لگا کر قطع کلامی کی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم جہانداد کے بل بوتے پر اترا رہے ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جہانداد کی حالت بھی تم سے کچھ مختلف نہیں

ہے۔ وہ ماموں جان کی حویلی کے تہہ خانے میں پڑا اپنی قسمت کو کوس رہا ہوگا"۔

"نہیں"۔ وہ ایک دم پریشان ہوگیا۔ "ایسا نہیں ہوسکتا، یہ ناممکن ہے"۔

"ملک مراد کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے"۔ افضل نے جواب دیا۔ "لیکن میں چاہوں تو تمہارے ساتھ ساتھ جہانداد کو بھی آزاد کرا سکتا ہوں مگر میں مفت میں یہ کام نہیں کروں گا"۔

"میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے"۔ وہ مایوس انداز میں بولا۔ "جو کچھ تھا وہ تم لوگ پہلے ہی لوٹ چکے ہو"۔

"روپیہ پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا"۔ افضل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اور ویسے بھی تو تمہارے پاس بہت کچھ ہے"۔

"تمہاری نظر شاید زمین کے اس ٹکڑے پر ہے جو میں نے جہانداد کے......"

"تمہارا خیال غلط ہے"۔ افضل نے فوراً قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "میں کسی اور چیز کا طلبگار ہوں"۔

اسے کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا تاہم وہ انجان بن کر بولا۔ "کس چیز کا؟"

"حاکم علی! تم بچے تو نہیں ہو کہ میری بات تمہاری سمجھ میں نہ آسکے"۔ افضل نے جواب دیا۔ "عمر کی نصف صدی گزار چکے ہو۔ مجھے تمہاری بیٹی زینب بہت اچھی لگتی ہے اور میں اس سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ اگر تم......"

"بکواس مت کرو حرام زادے!" وہ کانپتی ہوئی آواز میں چلایا۔ "تمہاری گندی زبان پر اگر دوبارہ میری بیٹی کا نام آیا تو میں تمہارا خون پی جاؤں گا"۔

"غصہ تمہاری صحت کے لیے مضر ثابت ہوسکتا ہے بڑے میاں"۔ افضل ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس لیے میرے مطالبے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو، میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ بیٹی تو تم نے ویسے بھی ایک دن بیاہنی ہی ہے تو پھر مجھ میں کون سی خرابی ہے؟ کیوں یوں ہتھے سے اُکھڑ رہے ہو؟"

"قصور تمہارا نہیں ہے"۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "دراصل تم دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہو اس لیے تمہیں خامیوں اور خوبیوں کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اگر کبھی فرصت ملے تو آئینہ ضرور دیکھ لینا، تم پر تمہاری خوبی واضح ہو جائے گی"۔

"غالباً تم میری اکلوتی آنکھ پر طنز کر رہے ہو"۔ افضل مسکراتے ہوئے بولا۔ "مگر شاید تم نہیں جانتے کہ میری دوسری آنکھ اسی زہرہ جبیں کے عشق کی نذر ہو گئی ہے"۔

"بڑی اچھی طرح جانتا ہوں"۔ حاکم علی نے جواب دیا۔ "اس لیے تمہیں ایک



مشورہ دوں گا کہ اس خیال سے باز آجاؤ ورنہ یہ اکلوتی آنکھ بھی نہیں رہے گی۔ جہانداد ابھی زندہ ہے اور زینب اس کی منگیتر ہے"۔

"جہانداد کا قصہ بھی بہت جلد تمام ہو جائے گا"۔ وہ زہرخند سے بولا۔ "زینب کو پانے کے لیے میں جہانداد تو کیا اس کے پورے خاندان کو مٹا دوں گا"۔

"خواب دیکھنے چھوڑ دو افضل!" حاکم علی نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ان کی تعبیر بڑی بھیانک ہوگی"۔

"لیکن یہ خواب بہت جلد تعبیر پالے گا"۔ وہ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ "میں بہت جلد تمہارے پاس یہ خوش خبری لے کر آؤں گا"۔ اتنا کہہ کر وہ گھوما اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی پہرے داروں نے دوبارہ کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔

اس وقت تو طیش میں آکر حاکم علی نے افضل کو کھری کھری سنا دی تھیں مگر اب اس کے جانے کے بعد اچانک ہی اسے اندیشوں نے گھیر لیا تھا اور وہ خود کو کوس رہا تھا۔ افضل غصے میں جہانداد کو نہ صرف قتل کر سکتا تھا بلکہ جہانداد کے گھر والوں کے ساتھ بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔

معاً اسے ایک دوسرا خیال آیا اور وہ لرز کر رہ گیا۔ افضل زینب کے ساتھ بھی تو دست درازی کر سکتا تھا جبکہ اسے روکنے والا بھی اب کوئی نہیں رہا تھا۔ اس کی اور جہانداد کی عدم موجودگی میں افضل کے لیے یہ کام بہت آسان تھا۔

"اگر میں افضل سے مصلحت کے تحت جھوٹا وعدہ کر لیتا تو اس ممکنہ خطرے سے بچا جا سکتا تھا"۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر خود کو ملامت کرنے کی بجائے دروازہ پیٹ کر پہرے داروں کو آوازیں دینے لگا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں چلا رہے ہو؟" باہر سے ایک پہرے دار کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟"

"م...... میں افضل سے ملنا چاہتا ہوں"۔ اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "خدا کے لیے اسے فوراً بلواؤ"۔

"کس لیے؟" پہرے دار نے متحیر انداز میں پوچھا۔ "بات کیا ہے آخر؟"

"دیکھو! سوالات میں وقت ضائع مت کرو"۔ وہ عاجز ہو کر بولا۔ "میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، اگر افضل واپس نکل گیا تو شاید میں جیتے جی مر جاؤں گا"۔

"تو پھر مر جاؤ"۔ پہرے دار نے ٹکا سا جواب دیا۔ "افضل تو کب کا واپس جا چکا ہے"

"خدا کے لیے اسے واپس بلاؤ"۔ اس نے فریادی انداز میں کہا۔ "میں بہت ...... پریشان ہوں"۔

"ہمیں یہاں سے ہلنے کی بھی اجازت نہیں ہے"۔ پہرے دار نے روکھا سا جواب

حاکم علی بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صبر کے علاوہ اب اس کے پاس کوئی چارا نہیں

===

ایک روز سہ پہر کے وقت دلاور ہانپتا ہوا حویلی میں داخل ہوا اور ملک مراد کے ایک ملازم سے بولا۔ "میں فوراً ملک صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، ان کے پاس پیغام پہنچا دو کہ دلاور ہے"۔

"یہ ممکن نہیں ہے"۔ ملازم نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت ملک صاحب مل سکتے۔ صبح آنا"۔

"احمقانہ باتیں مت کرو، انہیں اگر معلوم ہو گیا کہ دلاور آ کر واپس چلا گیا ہے تو تمہاری کھا اتار دیں گے"۔

"دراصل ملک صاحب کی طبیعت ذرا سی ناساز تھی"۔ ملازم اس کی دھمکی سے مرعوب کر بولا۔ "اس لیے انہوں نے منع کر رکھا ہے۔ میں انہیں اطلاع کرتا ہوں"۔

اتنا کہہ کر ملازم دوڑتا ہوا اندر چلا گیا اور دلاور وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً پانچ من کے بعد نوکر کی واپسی ہوئی اور وہ دلاور کو ساتھ لے کر دوبارہ حویلی کی اندرونی جانب بڑھ گیا۔ دیر کے بعد دلاور ملک مراد کے کمرے میں موجود تھا۔

"ہاں دلاور کیا بات ہے؟" ملک مراد نے اپنے مخصوص انداز میں استفسار کیا۔ "تم مجھے پریشان نظر آ رہے ہو"۔

"جی ملک صاحب! بات ہی کچھ ایسی ہے"۔ وہ مؤدب انداز میں بولا۔ "کہ مجھے فی الفور پڑا۔ آپ بھی سنیں گے تو پریشان ہو جائیں گے"۔

"کیا حاکم علی فرار ہو گیا ہے؟" اس نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"نہیں ملک صاحب"۔

"تو پھر؟"

"وہ جی افضل اور سانول، حاکم علی کی بیٹی کو اٹھانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں"۔ دلاور بلا توقف بتانا شروع کیا۔ "دراصل افضل، حاکم علی کی بیٹی سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا ہے"۔



"کیا یہ بات تمہیں افضل نے بتائی ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں جی"۔ دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ خبر مجھے سانول کے ایک ساتھی سے ملی ہے اور اس نے اپنا نام مخفی رکھنے کی گزارش کی ہے۔ دراصل وہ سانول سے ڈرتا ہے ورنہ میں اسے یہیں حویلی میں لے آتا"۔

"اسے حویلی میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ ملک مراد بولا۔ "تم یہ بتاؤ کہ وہ دونوں یہ کام کب کرنا چاہتے ہیں؟"

"پرسوں رات کے وقت"۔

"ہوں...... اب آئے گا مزہ"۔ وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تم نے کسی اور کو تو یہ بات نہیں بتائی؟"

"نہیں ملک صاحب! میں کوئی پاگل تھوڑی ہوں"۔ دلاور نے جواب دیا۔ "یہ بات بھلا کسی کو بتانے والی ہے"۔

"دلاور!" ملک مراد نے کچھ سوچ کر ایک ذرا توقف سے کہا۔ "یہ بات اہم اطلاع ہے اور میں اس کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں"۔

"فائدہ؟" اس نے الجھ کر پوچھا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب، یہ تو بہت پریشان کن اطلاع ہے"۔

"تمہارے موٹے دماغ میں یہ بات نہیں آئے گی"۔ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "لیکن میں نے سوچ لیا ہے کہ میں ان دونوں کے اس منصوبے سے کیسے فائدہ اٹھاؤں گا۔ بس تم دعا کرو کہ وہ اپنا یہ منصوبہ چھوڑ نہ دیں ورنہ میرا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا"۔

"آپ...... آپ کیا کرنا چاہتے ہیں ملک صاحب؟"

"ایک تیر سے دو شکار"۔ اس نے پُراسرار انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ "جہانداد اور افضل کا ایک ساتھ خاتمہ"۔

"لل...... لیکن کیسے؟" دلاور نے حیران ہو کر پوچھا۔ "افضل اور سانول کے منصوبے سے بھلا آپ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

"تم گدھے کے گدھے ہی رہو گے"۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ "میں ان کے اس منصوبے سے وہ فائدہ اٹھاؤں گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے"۔

"کیا مجھے بتانے میں کوئی حرج ہے؟" اس نے اشتیاق کا اظہار کیا۔

"بالکل ہے"۔ ملک مراد نے جواب دیا۔ "میں اپنے اس منصوبے میں کسی کو بھی شریک نہیں

کرسکتا۔ تاہم وقت آنے پر سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔ فی الحال تم افضل کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھو۔ میں اس کی دن رات کی مصروفیت سے باخبر رہنا چاہتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ اجازت طلب انداز میں بولا۔ ''اور کوئی حکم؟''

''نہیں بس تم جاؤ جب تمہاری ضرورت ہوگی تو میں بلالوں گا''۔

دلاور خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور ملک مراد سوچوں میں مستغرق ہوگیا۔ سوچتے سوچتے اچانک وہ چونک اٹھا اور پھر اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

===

ملک مراد کی دھمکیوں کے بعد جہانداد نے سنجیدگی کے ساتھ فرار کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس قید تنہائی کا ایک ایک لمحہ اب اسے برسوں پر محیط محسوس ہونے لگا تھا۔ ملک مراد کی طرف سے اب اسے مکمل یقین ہو چکا تھا کہ وہ اسے اس تہہ خانے سے زندہ کبھی بھی باہر نہیں نکلنے دے گا۔ قید کے پہلے چند دنوں میں تو اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید انسپکٹر صادق حسین اسے چھڑانے میں کامیاب ہو جائے مگر اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ امید دم توڑ چکی تھی۔

ملک مراد پر ہاتھ اٹھانے والے واقعے کے بعد اب کھانا لانے والے پہریدار بھی ہوشیار ہو چکے تھے۔ اس واقعے سے پہلے وہ تہہ خانے کے اندر آکر اسے کھانا دیا کرتے تھے لیکن اب وہ تہہ خانے کی سیڑھیوں پر کھانا رکھ کر واپس لوٹ جاتے تھے غالباً ملک مراد نے انہیں جہانداد کے قریب جانے سے منع کر دیا تھا۔

ایسے میں جہانداد وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے تو سوچتا رہتا تھا مگر کسی منصوبے پر عمل کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ مسلح پہرے داروں کے متعلق اب اسے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی کوئی بھی غلط قدم اٹھانے پر وہ اسے گولیوں سے چھلنی کر سکتے تھے۔ تہہ خانے میں اسے کوئی ایسی چیز بھی نہیں مل سکی تھی جسے وہ بطور ہتھیار استعمال کر سکتا۔ تہہ خانے کی دیوار میں نقب لگانا بھی خالی ہاتھوں ناممکن تھا اور چھت کا جنگلا نہ صرف اس کی رسائی سے دور تھا بلکہ اس میں فولادی سلاخیں بھی لگی ہوئی تھیں۔

اس وقت بھی وہ انہی سوچوں میں مستغرق تھا جب پہرے دار تہہ خانے کی سیڑھیوں پر رات کا کھانا رکھ کر فوراً واپس لوٹ گئے۔ چراغ کی مٹیالی روشنی میں اس نے ایک نظر تہہ خانے کے فولادی دروازے پر ڈالی اور پھر مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ کھانا اٹھا کر وہ واپس اپنی جگہ پر پہنچا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی کھانا زہر مار کرنے لگا۔ کھانے کے بعد اس نے خالی برتن اٹھا کر دوبارہ سیڑھیوں پر رکھ دیے اور پھر آرام کی غرض سے تہہ خانے کے ننگے فرش پر لیٹ گیا۔



کافی دیر جاگنے کے بعد نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ وقتی طور پر تمام سوچوں سے آزاد ہوگیا۔ تہہ خانے کی خاموشی میں اب اس کے مدہم مدہم خراٹے گونجنے لگے تھے۔ نیند کی آغوش میں اسے پناہ ملی تو وہ خوابوں کے سفر پر نکل گیا۔ اس سفر میں زینب اس کی ہم سفر تھی۔ وہ دونوں ایک سرسبز و شاداب وادی میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھوم رہے تھے۔ چاروں طرف رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ پرندوں کی چہکار نے موسیقی کا سماں باندھ رکھا تھا۔ زینب بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی، اسے چھیڑ رہی تھی اور وہ اس کی شرارتوں سے جھوٹ موٹ خفا ہو رہا تھا لیکن زینب کسی طرح بھی اپنی شرارتوں سے باز نہیں آرہی تھی۔

یونہی چلتے چلتے وہ ایک چشمے کے کنارے پہنچ گئے۔ صاف وشفاف اور ٹھنڈے پانی کو دیکھ کر زینب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ شلوار کے پائنچے چڑھا کر پانی میں جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحے تو وہ جہانداد کو شریر نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر جھک کر اس پر پانی پھینکنے لگی۔ جہانداد خود کو بھیگنے سے بچانے کے لیے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ پانی کے چھینٹے اس کے چہرے اور سینے کو بھگو چکے تھے۔

''مت کرو زینب ورنہ ماروں گا''۔ وہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولا اور پھر ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب ٹوٹ چکا تھا مگر اس کا چہرہ اور لباس کا سامنے والا حصہ پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ پریشانی کے عالم میں وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور تہہ خانے میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا لیکن وہاں کوئی ہوتا تو اسے نظر آتا۔

''میں اوپر ہوں...... جنگلے کے سامنے''۔ معاً اسے ایک مدہم سی نسوانی آواز سنائی دی اور وہ چونک کر اوپر جنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں ایک دوشیزہ کا چہرہ نظر آرہا تھا۔

''تت...... تم کون ہو؟'' اس نے متحیر انداز میں پوچھا۔

''شش...... آہستہ بولو''۔ وہ تنبیہی انداز میں بولی۔ ''میں تمہیں اس طرح جگانے کی معافی چاہتی ہوں، دراصل تم جنگلے کے عین نیچے سوئے ہوئے تھے اور میں تمہیں بغیر آواز دیے جگانا چاہتی تھی اس لیے ٹھنڈے پانی کا سہارا لینا پڑا۔ امید ہے تم محسوس نہیں کرو گے''۔

''مگر تم ہو کون اور کیا چاہتی ہو؟'' اس نے دوبارہ استفسار کیا۔

''میں تمہاری ہمدرد ہوں''۔ وہ مدہم آواز میں بولی۔ ''لیکن تم کیا اس طرح سوتے ہو گدھے گھوڑے بیچ کر؟ تمہیں جگانے کے لیے آدھا جگ پانی کا صرف ہوگیا''۔

اس کی بات سن کر جہانداد اس بے بسی کی حالت میں بھی مسکرا دیا۔

''وہ...... دراصل میں خواب دیکھ رہا تھا اور خواب میں......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

’’تم کسی زینب کا نام لے رہے تھے غالباً‘‘۔لڑکی نے بتایا۔’’کون ہے یہ زینب؟‘‘

’’تم اپنے متعلق بتاؤ؟‘‘ وہ اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔’’رات کے اس
ایک قیدی سے تمہیں کیا کام پڑ گیا ہے؟‘‘

’’میرا نام ثریا ہے اور میں ملک مراد کی بیٹی ہوں‘‘۔وہ بلاتردد بولی۔’’کیا تم یقین کرو
میں تمہیں اس قید سے نکالنا چاہتی ہوں؟‘‘

’’اپنے باپ کے دشمن کو؟‘‘ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔’’یہ تمہارے باپ کی چال بھی
سکتی ہے۔میں تم پر کیسے یقین کرلوں؟‘‘

’’دشمن اگر مظلوم ہو تو یہ ممکن ہے‘‘۔وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولی۔’’تم فکر مت کرو یہ
چال نہیں ہے۔میں بڑی مشکل سے حویلی کے اس حصے تک پہنچی ہوں، اگر کسی کو خبر ہوگئی تو پھر
خیر نہیں ہے‘‘۔

’’میں اتنا احمق نہیں ہوں‘‘۔اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔’’میں جانتا ہوں کہ تمہارا باپ کو
کھیل کھیلنا چاہتا ہے اور تمہیں مہرے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔میں تم پر یقین نہیں کرسکتا۔اب
جاؤ اور مجھے سونے دو، اگر کسی پہرے دار نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو مفت میں بدنام ہو جاؤ گی‘‘۔

’’شک کرنے میں تم حق بجانب ہو‘‘۔وہ برا مانے بغیر بولی۔’’لیکن میرا خدا جانتا ہے کہ
تم سے مخلص ہوں۔کاش کہ میں کسی طرح تمہیں یقین دلا سکتی۔دراصل میں تمہیں ایک المناک مو
سے بچانا چاہتی ہوں۔میرا پھوپھی زاد افضل تمہاری جان کا دشمن ہو رہا ہے، وہ ابا جان پر زور دے
ہے کہ تمہیں اسی تہہ خانے میں ٹھکانے لگا دیا جائے، گو کہ ابا جان نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں
ہے لیکن افضل پہرے داروں کو ساتھ ملا کر کوئی بھی خطرناک قدم اٹھا سکتا ہے۔وہ...... وہ تمہارا
کھانے میں پہرے داروں کی نگاہیں بچا کر زہر بھی ملا سکتا ہے۔تمہاری عدم موجودگی کا فا
اٹھاتے ہوئے تمہارے یا حاکم علی کے گھر میں داخل ہو کر کچھ بھی کرسکتا ہے‘‘۔

’’یہ سب باتیں تمہیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں؟‘‘ اس نے چونک کر پوچھا۔’’اور کیا تم
علی کے بارے میں جانتی ہو کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے؟‘‘

’’اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی۔بہرکیف یہ باتیں میں نے چھپ کر سنی ہیں اور......
کہہ کر وہ ایک دم خاموش ہوگئی اور پھر تیزی سے جنگلے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ جنگلے کے سامنے آ کر بولی۔’’شاید پہرے داروں کو کچھ شک
گیا ہے۔میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں۔بہرکیف کل آدھی رات کو تم تیار رہنا میں پہرے دا
کو کوئی نشہ آور چیز کھلا کر تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گی۔اب میں جاتی ہوں‘‘۔



’’میں خالی ہاتھ یہاں سے کیسے باہر جاسکتا ہوں؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’میں کوئی نہ کوئی بندوبست کر کے آؤں گی۔تم بےفکر رہو، پہرے داروں کی بندوقیں بھی کام آسکتی ہیں‘‘۔

اتنا کہہ کر وہ جنگلے کے سامنے سے غائب ہوگئی اور جہانداد نے الجھے ہوئے انداز میں تہہ خانے کے اندر ٹہلنا شروع کر دیا۔اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تیزی سے پھیلتے جا رہے تھے۔کبھی اسے ثریا مخلص نظر آنے لگتی تو کبھی اس خلوص کے پیچھے ملک مراد کی کوئی سازش نظر آنے لگتی تھی۔

⁂ ==== ⁂ ==== ⁂

دو روز بعد شام کے وقت ایک بار پھر دلاور، ملک مراد کے سامنے بیٹھا اسے اپنی کارگزاری سنا رہا تھا۔

’’ملک صاحب!‘‘ وہ پُرجوش انداز میں کہہ رہا تھا۔’’آج رات بارہ بجے کے بعد افضل اور سانول اپنے منصوبے پر عمل کریں گے۔بالکل پکی اطلاع ہے‘‘۔

’’تمہیں پورا یقین ہے ناں؟‘‘ ملک مراد نے استفسار کیا۔’’اگر یہ اطلاع جھوٹی نکلی تو میرا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔خصوصاً اس معاملے میں وقت کی بہت اہمیت ہے‘‘۔

’’سو فیصد یقین ہے ملک صاحب‘‘۔وہ بلا جھجک بولا۔’’میں کچے کام نہیں کرتا۔آج رات بےچاری زینب کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہوگا؟‘‘

ملک مراد نے چونک کر اسے دیکھا

’’تمہیں زینب کی بہت فکر ہے۔کون لگتی ہے تمہاری؟‘‘

’’وہ......وہ جی...... میں نے آپ کو بتایا تھا ناں‘‘۔وہ بوکھلا کر بولا۔’’کہ زینب مجھے اچھی لگتی ہے۔وہ اگر کسی طرح افضل اور سانول سے بچ جاتی تو مجھے شاید خوشی ہوتی‘‘۔

’’لگتا ہے تمہیں اس سے عشق ہو گیا ہے‘‘۔ملک مراد کھردرے لہجے میں بولا۔’’مگر میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا، عشق آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتا بہرکیف میرے منصوبے میں زینب کو نقصان پہنچانا شامل نہیں ہے‘‘۔

’’کیا وہ محفوظ رہے گی؟‘‘ اس نے بےتابی سے پوچھا۔

’’کچھ کہہ نہیں سکتا‘‘۔ملک مراد نے جواب دیا۔’’اس کے بچنے اور لٹنے کے امکانات برابر برابر ہیں‘‘۔

’’اگر وہ بچ گئی تو کیا آپ اس کی شادی مجھ سے کرا دیں گے؟‘‘ اس نے ڈرتے ڈرتے

پوچھا۔ ''میری خدمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے؟''

''قبل از وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس کا دارومدار بھی میرے منصوبے کی کا ناکامی پر ہے''۔ ملک مراد نے خلافِ توقع نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''جیسا میں نے سوچ رکھا ہے وہی ہوا تو پھر شاید آسانی سے تمہاری خواہش پوری ہو سکے گی ورنہ مشکل ہے''۔

''وہی ہوگا ملک صاحب!'' وہ پُرامید انداز میں بولا۔ ''جو آپ نے سوچ رکھا ہے۔ آج آپ کا کوئی منصوبہ ناکام نہیں ہوا ہے، جو یہ ہوگا؟''

''بظاہر تو منصوبہ کامیاب ہی نظر آ رہا ہے لیکن بازی پلٹتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ بہرکیف تم پر نگاہ رکھو...... یہ نہ ہو کہ وہ اپنا پروگرام بدل ڈالے اور میں لاعلم رہوں''۔

''ٹھیک ہے جی''۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں فوراً آپ اطلاع پہنچا دوں گا۔ آپ بےفکر رہیں''۔

اتنا کہہ کر دلاور باہر نکل گیا اور ملک مراد تہہ خانے کی طرف چل دیا۔

==== ==== ====

آج کی رات جہانداد کے لیے بہت اہم تھی اس لیے کھانا کھانے کے بعد اس نے سو بجائے تہہ خانے میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کے اضطراب اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے شدت سے آدھی رات کا انتظار تھا۔ دل ہی دل میں وہ ایک منصو تھا۔ اب اگر ثریا کی ہمدردی کے پیچھے ملک مراد کی کوئی سازش بھی ہوتی تو بھی اسے کوئی خو تھا۔ وہ بآسانی ملک مراد جیسے چالاک شخص سے نمٹ سکتا تھا۔ گھڑی کی غیر موجودگی میں اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ محض اندازے ہی لگا سکتا تھا۔ ٹہلتے ہوئے وہ کبھی کبھار اوپر جنگلے کی طرف لیتا کہ شاید ثریا کا چہرہ نظر آ جائے۔ اس بےچینی اور انتظار میں بہت سا وقت گزر گیا اور اس پر آہستہ بےزاری طاری ہونے لگی۔ ''شاید ایک امیرزادی نے مجھ سے مذاق کیا ہے''۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر جھنجھلا کر عین جنگلے کے نیچے فرش پر پاؤں پسار کر بیٹھ ابھی اسے بیٹھے ہوئے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ تہہ خانے کا دروازہ معمولی سی آواز کے ساتھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے ثریا اندر داخل ہوئی اور جہانداد میکانکی انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس بےاختیار دھڑک اٹھا۔ نہ جانے چند لمحوں کے بعد کیا ظہور پذیر ہونے والا تھا۔

''جلدی سے آ جاؤ''۔ ثریا مدہم آواز میں بولی۔ ''دونوں پہرے دار باہر بےہوش ہیں، انہیں تہہ خانے میں بند کرنا پڑے گا''۔

''میں تمہارا احسان مند ہوں''۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ایک کمزور لڑکی



ہوئے جس بہادری کا مظاہرہ......''

''یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے''۔ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک دفعہ حویلی سے نکل جاؤ بعد میں شکریہ ادا کر لینا''۔

''پھر بھی میں تمہارا شکرگزار ہوں''۔ وہ اس کے ساتھ تہہ خانے کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ''تم اتنا بڑا خطرہ ایک اجنبی کے لیے مول لے رہی ہو''۔

''میں نے ایک بےگناہ کو رہائی دلائی ہے''۔ اس نے جواب دیا اور پھر بےہوش پڑے ہوئے پہرے داروں کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

جہانداد نے جلدی سے دونوں پہرے داروں کی رائفلیں اٹھا لیں۔ ایک ہاتھ میں پکڑ لی جبکہ دوسری رائفل کندھے سے لٹکا لی۔ اس کے بعد دونوں پہرے داروں کو باری باری اٹھا کر اس نے تہہ خانے کے اندر ڈال دیا اور ثریا نے باہر سے تالا لگا دیا۔

''اب چلو''۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ''اس سے پہلے کہ کوئی اِدھر آ نکلے میں تمہیں باہر کا راستہ دکھا دیتی ہوں''۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں حویلی کے عقبی جانب موجود ایک دروازے تک پہنچ گئے۔ دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا لیکن ثریا کے پاس چابی موجود تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا اور پھر جہانداد سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''سیدھا گھر پہنچنا وہاں تمہاری ضرورت ہے''۔

''میں تجھے زندگی بھر یاد رکھوں گا ثریا''۔ جہانداد دروازے سے باہر نکل کر بولا۔ ''مجھے معاف کر دینا میں نے تجھے غلط سمجھا تھا لیکن اب میں اپنی اس سوچ پر شرمندہ ہوں''۔

''میں بھی تجھے یاد رکھوں گی''۔ بےساختہ اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا اور جہانداد چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''وہ...... وہ دراصل...... میں یہ کہنا چاہ رہی تھی...... کہ......'' وہ ایک دم سٹپٹا گئی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ شاید دل ہی دل میں وہ اپنے باپ کو کوس رہی تھی جو اسے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

''ہماری راہیں الگ الگ ہیں ثریا''۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا اور پھر خدا حافظ کہہ کر رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ چند لمحے پریشانی کے عالم میں وہیں کھڑی رہی اور پھر دروازے کو تالا لگا کر واپس روانہ ہو گئی۔

''کاش میں اسے بتا سکتی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے''۔ وہ خود کلامی کے انداز میں

بولی اور اس کے دل سے ایک آہ نکل گئی۔ ''ابا جان! کیا آپ کو رائفل چلانے کے لیے میرا ہی ملا تھا؟ اتنا بھی نہ سوچا کہ میں ایک عورت ہوں اور عورت کا دل موم سے بھی نرم ہوتا ہے''۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے جہانداد کے متعلق نہ جانے کیا کچھ سوچ رہی تھی۔

===

جہانداد جب ثریا سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی ڈیوڑھی کے سامنے پہنچا تو ٹھٹک کر رک دروازے کا ایک کواڑ کھلا ہوا تھا اور اندر سے چیخ پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ عین اس اس کی سماعتوں میں ثریا کا کہا ہوا جملہ گونجا۔ ''سیدھے گھر پہنچنا وہاں تمہاری ضرورت ہے''۔

اس نے رائفل کو فائرنگ پوزیشن میں پکڑا اور دبے پاؤں ڈیوڑھی میں داخل ہو برآمدے اور صحن میں کوئی بھی نہیں تھا البتہ خواتین کے چیخنے چلانے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ جانے کن لوگوں کو خدا اور رسولؐ کے واسطے دے رہی تھیں۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ جلد ہی کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا تھا۔ اندر جو لوگ بھی اس کے دشمن تھے۔ ان کی تعداد کے متعلق بھی وہ لاعلم اس کا اندھا دھند اندر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

ابھی تک ڈیوڑھی کے اندر کھڑا وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک برآمدے سے دو شخص نمودار ہو اور جہانداد جلدی سے ڈیوڑھی کے ساتھ ہی بائیں ہاتھ موجود اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ تاہم اس کی نگاہیں ان دو آدموں پر مرکوز تھیں، ان میں سے ایک نے کندھے پر ایک عورت کو اٹھا تھا جو زور زور سے چلا رہی تھی مگر مرد کی گرفت سے نکلنے سے قاصر تھی جبکہ اس کے دوسرے ساتھی ہاتھ میں رائفل پکڑ رکھی تھی۔

''یہ حرام زادے تو سکینہ کو اٹھا کر لے جا رہے ہیں''۔ چیخنے چلانے کی آواز سن کر اس نے ہی دل میں کہا اور پھر طیش کے عالم میں ہونٹ بھینچ کر رائفل والے شخص کے سینے کا نشانہ لے کر داغ دیا۔ گولی ٹھیک نشانے پر لگی تھی کیونکہ وہ شخص گر چکا تھا۔ اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد دوسرے شخص نے یکدم گھبرا کر سکینہ کو چھوڑ دیا۔ جان چھوٹتے ہی سکینہ واپس برآمدے کی بھاگ کھڑ ہوئی اور وہ شخص رائفل لہراتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف دوڑا لیکن جہانداد نے اسے فرار ہو کا موقع نہ دیا۔ اس کی رائفل نے یکے بعد دیگرے تین شعلے اگلے اور فرار ہونے والا شخص خ خون میں لوٹنے لگا۔ جہانداد اس کی کربناک چیخوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس کے پہلے سا کی طرف متوجہ ہو گیا جسے چیخنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔

چوکنا انداز میں چلتے ہوئے جب وہ اس کے پاس پہنچا تو تب اس پر انکشاف ہوا کہ اسے عین دل کے مقام پر لگی ہے، شاید اس لیے وہ چلائے بغیر جہنم رسید ہو گیا تھا۔ وہ جہانداد کے



ئفل اجنبی تھا۔ اس کی رائفل اس سے چند قدم دور پڑی ہوئی تھی۔ اسے چھوڑ کر جہانداد دوسرے شخص کے پاس پہنچ گیا جو اس دوران ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اسے پہچاننے میں جہانداد کو ایک پل کی بھی دیر نہیں لگی تھی۔ وہ افضل تھا ملک مراد کا بھانجا۔

جہانداد نے اس کے مردہ جسم پر ایک ٹھوکر لگائی اور پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ برآمدے کی طرف چل پڑا۔ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ اندر سے رونے کی دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے بند دروازے پر دستک دی تو یک لخت رونے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ شاید وہ لوگ فائرنگ کی آوازیں سن کر ڈرے ہوئے تھے۔ اس لیے کسی نے دروازہ نہ کھولا۔

''دروازہ کھولیے ماں جی! میں جہانداد ہوں''۔ دوبارہ دستک دینے کی بجائے وہ اونچی آواز میں بولا۔ ''ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور پھر اس کی ماں چلاتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

''جہانداد میرے بچے! ہم لٹ گئے...... انہوں نے زینب کو...... زینب کو......'' فرطِ غم سے اس کی آواز بھرا گئی، کوشش کے باوجود وہ بات جاری نہ رکھ سکی۔

''کیا ہوا ہے زینب کو؟'' اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ''بولو ماں جی''۔

''جہانداد!'' قاسم علی آگے بڑھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آگے بڑھو وہ ابھی تک زندہ ہے۔ شاید...... اسے تمہارا انتظار ہے''۔

سامنے چند قدموں کے فاصلے پر ایک چارپائی کے گرد زینب کی ماں، سکینہ اور زینب کی چھوٹی بہن بین کرتے ہوئے رو رہی تھیں۔

جہانداد تیزی سے آگے بڑھا اور زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا زینب کے سرہانے جا کر رک گیا۔ زینب اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی، اس کے پیٹ میں ایک چھری دستے تک گھسی ہوئی تھی۔ جہانداد کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور بہ دقت تمام نحیف آواز میں بولی۔ ''تم...... آ گئے جہانداد...... میں مرنے سے...... پہلے تمہیں دیکھنا...... چاہتی تھی''۔

جہانداد نے ہاتھ آگے بڑھ کر چھری کو نکالنا چاہا تو زینب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں...... جہانداد رہنے دو...... تم نے بہت...... دیر کر دی...... اب وقت گزر چکا ہے''۔

''نہیں زینب!'' جہانداد تڑپ کر بولا۔ ''میں تجھے نہیں مرنے دوں گا۔ تُو مجھے یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتی...... میں نے تمہارے مجرموں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا ہے''۔

''م...... مجھے معاف کر دینا...... میں تمہارا...... ساتھ نہ...... دے سکی''۔ زینب نحیف آواز میں بولی۔ ''میرے پاس...... اپنی عزت...... بچانے کا اور کوئی طریقہ...... نہیں تھا''۔

"یہ...... یہ تم نے بہت برا کیا زینب!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "تمہیں اپنی جان لے کیا ضرورت تھی؟ کم از کم میرا انتظار تو کیا ہوتا۔"

کمرے میں موجود چاروں عورتوں کی دبی دبی سسکیاں گونج رہی تھیں جبکہ قاسم علی کی آنکھوں میں زمانے بھر کا درد سمٹ آیا تھا۔

"تمہارے...... انتظار نے...... تو اب تک...... زندہ رکھا...... ہوا ہے۔" وہ نقاہت آنکھیں موندتے ہوئے بولی۔ "ورنہ...... ایسی حالت...... میں...... کون جی...... سکتا ہے؟"

ان سب کے رونے اور فریاد کرنے کے باوجود زندگی زینب کے ہاتھ سے ریت مانند سرکتی چلی گئی۔ اذانِ سحر کے وقت اس کے بدن نے آخری جھرجھری لی اور پھر ساکت ہو گ شدتِ غم نے چند لمحوں کے لیے تو جہانداد کو پتھر کا بنا کر رکھ دیا پھر یکایک وہ بچوں کی طرح دھاڑ مار کر رونے لگا۔ تمام خواتین پہلے ہی رو رہی تھیں، جہانداد کو روتے دیکھ کر وہ اور بھی شدت کے سا رونے لگیں۔ وہ افضل اور اس کے ساتھی کو کوسنے دے رہی تھیں جو خود گھر کے صحن میں لاشوں صورت پڑے زندگی کی بے ثباتی کا رونا رو رہے تھے۔

قاسم علی ویران آنکھوں سے یہ تمام منظر دیکھ رہا تھا، پھر اس کی آنکھیں جہانداد پر جم کر گئیں۔ چند لمحے تو وہ اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر جارحانہ انداز میں آگے بڑھا جہانداد کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "میں نے تجھے کہا تھا ناں کہ دشمنی مت پال...... گھر ویران ہو جاتے ہیں۔ اب عورتوں کی طرح ٹسوے مت بہا، مرد بن کر ملک مراد کا نام و نشان مٹا دے۔ اس نے سارا کھیل مٹی کی خاطر کھیلا ہے، مٹی میں ملا دے اسے۔"

"مٹی تو اسے ملے گی ابا۔" وہ انگلیوں کی پوروں سے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں صاف کرتے ہوئے پُرعزم لہجے میں بولا۔ "مگر قبر کی مٹی۔ زینب کا خون اسے مہنگا پڑے گا۔"

"چل اٹھ جا۔" قاسم علی نے کہا۔ "اور پولیس کے پہنچنے سے پہلے یہاں سے نکل جا۔ ہمارا فکر مت کرنا، دشمنی کی ہے تو اسے مردوں کی طرح نبھا، گھر کو میں سنبھال لوں گا۔"

باپ کا حکم سن کر وہ اٹھا اور ماں، بہن اور چچی سے ملنے کے بعد باپ کو اشارہ کرتے ہو کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماں بہن اور چچی کے رونے کی وجہ سے اس کا دل پسیج رہا تھا مگر وہ کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

صحن میں پہلی لاش کے قریب پہنچتے ہی وہ باپ سے بولا۔ "اسے میں نہیں پہچانتا تاہم اس کے ساتھ ملک مراد کا بھانجا افضل تھا۔ پولیس کے پہنچنے تک ان دونوں کی لاشوں سے دور رہنا پولیس کو بیان دیتے وقت جھوٹ بالکل نہ بولنا۔ صاف بتا دینا کہ انہیں جہانداد نے قتل کیا ہے۔ قتل کی



وجہ بھی مت چھپانا اور انسپکٹر صادق سے کہنا کہ مجھے تلاش کرنے کی حماقت نہ کرے، وقت پڑنے پر میں خود اسے گرفتاری دے دوں گا۔"

"تم جاؤ گے کہاں؟" قاسم علی نے استفسار کیا۔

"معلوم نہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "بہرکیف میں آپ لوگوں کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کروں گا۔"

ذرا دیر بعد جہانداد ڈیوڑھی کے دروازے پر باپ کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

===

دوسرے دن سارے گاؤں میں سراسیمگی پھیل چکی تھی۔ قتل کی اتنی بڑی واردات نے لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ ایسی بھیانک وارداتیں برسوں بعد ہی کبھی ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے لوگوں کا خوفزدہ ہونا عین فطرتی تھا۔

صبح سورج نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی پولیس موقع واردات پر پہنچ گئی۔ وہاں لوگوں کا جمِ غفیر موجود تھا مگر قاسم علی نے کسی بھی شخص کو ڈیوڑھی کے اندر قدم نہیں رکھنے دیا تھا۔ انسپکٹر صادق حسین نے موقع واردات کا جائزہ لیا اور پھر ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کا حکم دے دیا۔ قاسم علی نے زینب کی لاش دینے میں تردد کیا تو انسپکٹر بولا۔ "پوسٹ مارٹم بہت ضروری ہے اس لیے تمہیں تعاون کرنا پڑے گا۔"

"نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں زینب کی لاش کی بے حرمتی نہیں ہونے دوں گا۔ اسے کسی نے قتل نہیں کیا، اس نے اپنی جان خود لی ہے، پوسٹ مارٹم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"دیکھو تم قانونی معاملے میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔" انسپکٹر نے اسے متنبہ کیا۔ "پوسٹ مارٹم کے بغیر قانونی کارروائی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تم اگر ٹال مٹول کرو گے تو میں زبردستی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"میں یہ زبردستی نہیں کرنے دوں گا۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "قانون مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔"

"تم ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔" انسپکٹر درشت انداز میں بولا۔ "ہمیں سختی کرنے پر مجبور نہ کرو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

پھر اس سے پہلے کہ انسپکٹر اور قاسم علی کے درمیان مزید کوئی تلخ کلامی ہوتی، گاؤں کے چند معززین نے اسے سمجھا بجھا کر انسپکٹر کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تینوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی گئیں۔

افضل کے ساتھ سانول ڈاکو کی لاش دیکھ کر انسپکٹر کو حیرت ضرور ہوئی تھی مگر اس نے اظہار نہ کیا تھا۔ افضل کی ماں صغرا شدتِ غم سے پچھاڑیں کھا رہی تھی لیکن انسپکٹر صادق نے اسے نظرانداز دیا تھا۔ گاؤں کی چند عورتوں نے اسے بڑی مشکل کے ساتھ سنبھالا ہوا تھا۔ وہ اونچی آواز میں افضل پکارنے کے ساتھ ساتھ جہانداد کو بھی بددعائیں دے رہی تھی۔

لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد انسپکٹر وہیں قاسم علی کے گھر میں بیٹھ کر ان کے بیان قلم بند کرنے لگ گیا۔ قاسم علی نے جہانداد کی ہدایت کے مطابق بالکل سچا بیان دیتے ہوئے انسپکٹر کو پورا واقعہ سنا دیا۔ گھر کی خواتین نے بھی قاسم علی کے بیان کی تائید کی تھی۔

''جہانداد یہاں اچانک کیسے پہنچ گیا؟'' انسپکٹر ان تمام کے بیان قلم بند کرنے کے بعد ہوا۔ ''جبکہ وہ گزشتہ کئی دنوں سے غائب تھا۔ اتنے دن کہاں رہا تھا وہ؟''

''اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا''۔ قاسم علی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ان خونچکاں حالات میں مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی مہلت ہی نہ مل سکی''۔

''اب کہاں ہے جہانداد؟'' انسپکٹر نے دوسرا سوال کیا۔

''معلوم نہیں''۔

''جھوٹ مت بولو''۔ انسپکٹر نے تنبیہ کی۔ ''تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ فرار ہو کر کہاں جا ہے؟''

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ ''اگر کچھ چھپانا ہی ہوتا تو میں یہ قتل جہانداد کے سر کیوں ڈالتا؟''

''کیا جہانداد ملک مراد کی قید میں تھا؟'' انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''شاید ایسا ہی ہو لیکن میں کسی پر الزام نہیں لگانا چاہتا۔ جہانداد نے مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی''۔

قاسم علی کے بعد انسپکٹر نے گھر کی خواتین سے بھی اسی نوعیت کے سوالات کیے مگر ان کے جوابات بھی قاسم علی سے کچھ مختلف نہیں تھے۔

انسپکٹر نے جہانداد کے نام ایف آئی آر درج کی اور پھر رخصت ہوتے وقت قاسم علی کو نصیحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر جہانداد کبھی چھپ کر واپس آئے تو اسے کہنا کہ گرفتاری دے دے۔ یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا''۔

''کہہ دوں گا''۔ اس نے مختصر سا جواب دیا اور انسپکٹر مزید کچھ پوچھے بغیر رخصت ہو گیا۔

===



جہانداد وہاں سے بے سروسامانی کے عالم میں فرار ہوا تھا۔ رائفل کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ملک مراد کے چلائے ہوئے چکر نے اسے ایک ہی رات میں قاتل اور مفرور بنا دیا تھا۔ فتح پور گاؤں سے علاقہ غیر بہت زیادہ دور نہیں تھا مگر فی الحال وہ اپنے گاؤں سے دور جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے چچا حاکم علی کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ حاکم علی ملک مراد کی قید میں ہی ہوگا۔ وہ ملک مراد پر براہِ راست تو ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا لیکن اس کے کسی کارندے کے گھر میں داخل ہو کر حاکم علی کے متعلق معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

آگ کے سمندر میں تو وہ ویسے ہی کود چکا تھا۔ اب شعلوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔

زینب کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھ کر اب اسے جینے کی خواہش نہیں رہی تھی لیکن وہ ملک مراد کو مٹا کر مرنا چاہتا تھا۔

وہ دن اس نے فتح پور سے چند کلومیٹر دور ایک جنگل میں بسر کیا۔ دن کا کھانا اسے ایک چرواہے کے توسط سے مل گیا تھا۔ چرواہا اس کے گاؤں کا رہنے والا نہیں تھا اس لیے اس نے باآسانی اسے بیوقوف بنا لیا تھا۔ چرواہے کے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے کھو جانے والے چند مویشیوں کو تلاش کر رہا ہے۔ اپنے گاؤں کا نام بتانے کی بجائے اس نے چرواہے کو ایک دور دراز کے گاؤں کا نام بتایا تھا۔ چرواہا ویسے بھی کم گو تھا اس لیے جہانداد اس کی کرید سے محفوظ رہا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے واپس جاتے ہوئے چرواہے نے اسے اپنے ہاں ٹھہرانے کی پُرخلوص پیش کش بھی کی تھی مگر اس نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد جب قدرے اندھیرا پھیل گیا تو اس نے واپسی کی راہ لی۔ اس دوران وہ دلاور کے گھر میں گھسنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ دلاور نہ صرف ملک مراد کا خاص آدمی تھا بلکہ حاکم علی بھی اسی کی موجودگی میں غائب ہوا تھا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ دلاور کو حاکم علی کے بارے میں مکمل معلومات ہوں گی۔

ٹھیک آدھی رات کے وقت وہ نالہ کراس کرتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو گیا۔ گلیاں، کوچے بالکل سنسان پڑے ہوئے تھے۔ چاروں طرف سناٹے اور تاریکی کا راج تھا تاہم کبھی کبھار کسی کتے کی آواز اس خاموشی کو وقتی طور پر مرتعش کر دیتی تھی۔ دلاور کے گھر تک پہنچنے میں اسے محض چند منٹ ہی لگے تھے۔ دیوار اتنی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس نے رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور باآسانی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحے وہ دیوار کے ساتھ دبکا کسی ردِعمل کا منتظر رہا مگر جب ردِعمل کے طور پر کچھ بھی ظہور پذیر نہ ہوا تو وہ دبے پاؤں چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ عام دیہاتیوں کی طرح دلاور کے گھر میں کوئی پالتو کتا نہیں تھا۔ دلاور کا گھرانہ صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔ دلاور، اس کا چھوٹا بھائی اور بوڑھی ماں۔ باپ چند سال

پہلے فوت ہو چکا تھا۔

موسم قدرے خنک تھا اس لیے ان تینوں کی چار پائیاں برآمدے میں بچھی ہوئی تھیں۔ جہانداد نے بغیر وقت ضائع کیے ان تینوں کو جگا دیا۔

جہانداد کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ان تینوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ سب سے زیادہ خراب حالت دلاور کی تھی کیونکہ اسے جہانداد سے کسی اچھے سلوک کی توقع نہیں تھی تاہم اس کی ماں اور چھوٹا بھائی بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے جہانداد کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دلاور کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔

برآمدے کی دیوار پر ٹنگی لالٹین کی روشنی میں دلاور کی دگرگوں حالت دیکھ کر جہانداد طنزیہ انداز میں بولا۔ ''میرے ہاتھوں میں ہتھیار تھما کر خود چین کی نیند سوتے ہو؟ چلو ان دونوں کو کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دو''۔

اتنا کہہ کر وہ براہِ راست دلاور کی ماں سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کو یقیناً دلاور کی زندگی سے پیار ہوگا؟''

''ہاں...... ہے''۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تو پھر شور مت مچانا...... ورنہ میں اسے خون میں نہلا دوں گا''۔ وہ سفاک انداز میں بولا اور بڑھیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شاید وہ زبان کھولنے سے ڈر رہی تھی۔

''میرا چچا کہاں ہے؟'' دلاور جب ماں اور بھائی کو بند کر چکا تو جہانداد نے سوال کیا۔ ''جھوٹ مت بولنا، میں جانتا ہوں کہ تجھے سب معلوم ہے''۔

''مم...... میں سچ...... کہتا ہوں...... مجھے کوئی پتا نہیں...... میرا یقین......''

جہانداد کے تھپڑ نے اسے جملہ پورا کرنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ اچانک تڑاخ کی آواز گونجی اور اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔

''میں دوبارہ سوال دہرانے کا عادی نہیں ہوں''۔ وہ گرج کر بولا۔ ''گھگھیانے کی بجائے سچ بول کر اپنی زندگی بچا لو ورنہ اب کی بار میں ہاتھ کو زحمت دینے کی بجائے اسے تکلیف دوں گا''۔

اس نے رائفل کو ہلایا اور دلاور تھوک نگل کر رہ گیا۔

''بول کہاں ہے وہ؟'' اس نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ورنہ میں گولی چلا دوں گا''۔

''سانول ڈاکو کے ڈیرے پر...... لیکن......'' دلاور کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''لیکن...... کیا؟''



''سانول کو تو تم نے قتل کر دیا ہے''۔ اس نے سہمے میں انداز میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے سانول کے ساتھیوں نے انتقاماً حاکم علی کو......''

''نہیں''۔ اس نے تڑپ کر قطع کلامی کی۔ ''میرے چچا کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ سانول کا ڈیرا کہاں ہے؟ بولو...... جلدی کرو''۔

''فتح پور سے بہت دور ہے''۔ دلاور نے بتایا۔ ''تم نہیں ڈھونڈ سکو گے''۔

''تم جاؤ گے میرے ساتھ''۔ اس نے لمحوں میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ہم اسی وقت روانہ ہوں گے۔ چلو جلدی کرو میرے پاس وقت نہیں ہے''۔

''نن...... نہیں''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں آ سکتا''۔

''تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ''۔ جہانداد رائفل کی نال اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ ''تمہیں بھی سانول اور افضل کے پاس پہنچا دیتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں مگر اس وقت......''

''ہاں اسی وقت چلنا پڑے گا''۔ جہانداد نے قطع کلامی کی۔ ''تم شاید بھول رہے ہو کہ میں ایک مفرور قاتل ہوں''۔

''مم...... میں ماں کو بتا دوں؟'' دلاور نے التجا کی۔ ''وہ پریشان ہوگی''۔

''چلو بتا دو''۔ اس نے دلاور کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود بھی اسے گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیے۔

عین اسی وقت گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور وہ دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔

جہانداد متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ حالات ایک دم اس کے خلاف ہو چکے تھے۔ دلاور پریشانی کے عالم میں کھڑا جہانداد کی شکل دیکھ رہا تھا۔

جونہی دوبارہ دستک ہوئی جہانداد ایک فیصلے پر پہنچ کر بولا۔ ''جاؤ جو کوئی بھی ہے اسے ٹال دو۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہاری ماں اور بھائی کو بلا تردد گولی مار دوں گا''۔

دلاور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف چل دیا اور جہانداد اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جہاں دلاور کی ماں اور بھائی بند تھے۔

کمرے کی کنڈی کھول کر جونہی اس نے اندر قدم رکھا اس کے سر پر ایک لاٹھی پڑی اور آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ اٹھے۔

ضرب اتنی شدید تھی کہ مضبوط بدن کا مالک ہونے کے باوجود جہانداد کے پاؤں ڈگمگانے

لگے اور دماغ پر غنودگی چھانے لگی۔ قریب تھا کہ حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے مگر غیر معمولی قو
ارادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سر جھٹک کر سیکنڈوں میں خود کو سنبھال لیا۔ دلاور کے بھ
دوسرا وار اس نے اپنی رائفل پر روکا۔ لاٹھی رائفل سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی اور حملہ آور کے ہاتھ میں لاٹھ
نصف ٹکڑا رہ گیا۔

تیسرا وار ہونے سے پہلے جہانداد نے لات چلائی اور دلاور کا بھائی منہ سے ''اوغ'' کی آ
نکال کر دہرا ہو گیا۔ لالٹین کی روشنی میں جہانداد کو اس کے چہرے پر کرب کے آثار واضح نظر آر
تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑے کراہ رہا تھا۔ جہانداد اس کے کراہنے کو نظر انداز کر
ہوئے آگے بڑھا اور رائفل کو اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''دل تو چاہتا ہے کہ تمہار
کھوپڑی اُڑا دوں لیکن بلاوجہ خون ریزی مجھے ناپسند ہے''۔

''نن...... نہیں...... خدا کے لیے اسے مت مارو''۔ اچانک دلاور کی ماں آگے بڑھ کر جہاندا
کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ''میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اسے معاف کر دو''۔

جہانداد کے سر سے بہنے والا خون اس کے دائیں رخسار سے ہوتا ہوا گردن تک پہنچ چکا تھا۔
اس کا سر درد سے چکرا رہا تھا تاہم وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ معافی کے قابل تو نہیں
لیکن میں ایک ماں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا''۔

''مہربانی پُتر!'' دلاور کی ماں احسان مندانہ انداز میں بولی۔ ''میں تمہارا احسان زندگی بھر یاد
رکھوں گی۔ تم نے میرے لیے......''

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا تم پر''۔ جہانداد نے قطع کلامی کی۔ ''تم اگر مجھ پر کوئی احسان
کرنا چاہتی ہو تو میرے سر پر پٹی باندھنے کا انتظام کر دو تاکہ یہ خون بند ہو جائے''۔

''میں ابھی پٹی باندھ دیتی ہوں''۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی ایک صندوق کے پاس پہنچ گئی۔
صندوق کھول کر اس نے ایک سفوف نما دوائی نکالی۔ اس کے بعد ایک پرانا کپڑا پھاڑ کر پٹی بنائی اور
دوبارہ جہانداد کے پاس پہنچ گئی۔ جہانداد اس دوران دروازے کو اندر سے کنڈی لگا چکا تھا شاید اسے
دلاور کی طرف سے بھی کسی غیر متوقع ردِعمل کا اندیشہ تھا۔

جہانداد کے زخم پر سفوف نما دوائی چھڑکنے کے بعد دلاور کی ماں نے پٹی باندھ دی اور پھر بیٹے
کی طرف متوجہ ہو گئی جو جہانداد کی لات کھانے کے بعد دیوار سے ٹیک لگائے افسردہ حالت میں بیٹھا
ہوا تھا۔ شاید اسے ملال تھا کہ اس کی ماں اسے نظر انداز کر کے دشمن سے تعاون کر رہی ہے۔ ماں نے
اسے اٹھا کر چارپائی پر بٹھایا اور پھر اس کی طبیعت کے بارے میں استفسار کیا۔ ''اب کیسی حالت ہے
بیٹے؟''



''میں ٹھیک ہوں''۔ اس نے ناگواری سے جواب دیا۔ ''آپ اس کی طبیعت کیوں نہیں
پوچھتیں جو چوروں کی طرح ہمارے گھر میں گھسا ہے اور اب طاقت کے بل بوتے پر من مانی کر رہا
ہے''۔

جہانداد نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''میں چور یا لیٹرا ہوتا تو شاید اب تک تم لوگوں کو لوٹ چکا
ہوتا۔ تاہم تم اپنے بھائی دلاور کے متعلق کیا کہنا چاہو گے جس کے تعلقات سانول جیسے معروف
ڈکیت کے ساتھ ہیں۔ کیا تم اس کے کارناموں سے ناواقف ہو؟''

''میرا بھائی ڈاکو نہیں ہے''۔ وہ جل کر بولا۔ ''وہ ملک مراد کے ہاں ملازم ہے، تم خواہ مخواہ
اس پر الزام تراش رہے ہو''۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور جہانداد چونک کر کھڑا ہو گیا۔ رائفل کا رخ اس نے
دروازے کی جانب کر رکھا تھا۔

''دروازہ کھولو میں دلاور ہوں''۔ دوسری دستک کے ساتھ ہی آواز آئی۔

''ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا''۔ جہانداد نے اسے تنبیہہ کی۔ ''تمہارا بھائی میرے
نشانے پر ہے''۔

اتنا کہہ کر اس نے دلاور کی ماں کو کنڈی کھولنے کا اشارہ کر دیا۔

کنڈی کھلتے ہی دلاور تیزی سے اندر داخل ہوا اور جہانداد کے سر پر پٹی دیکھ کر متحیر انداز میں
بولا۔ ''یہ پٹی کیسی ہے؟ کہیں منور اور تمہاری لڑائی تو نہیں ہو گئی؟''

''اس نے دھوکے سے مجھ پر وار کیا ہے''۔ دلاور کو خالی ہاتھ دیکھ کر جہانداد نے قدرے
اطمینان سے جواب دیا۔ ''ورنہ یہ مجھے چھو بھی نہیں سکتا تھا''۔

''ہاتھ میں ہتھیار پکڑ کر نہتوں کے سامنے تو کوئی بھی شیر بن سکتا ہے''۔ منور طنزیہ انداز میں
بولا۔ ''تم خالی ہاتھ ہوتے تو پھر تمہیں معلوم ہوتا کہ میں کیا کر سکتا ہوں''۔

''اگر تمہارے بھائی کو اعتراض نہ ہو تو میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر سکتا ہوں''۔
جہانداد نے جواب دیا۔ ''چند لمحوں میں تمہاری خوش فہمی دور ہو جائے گی''۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو منور''۔ جہانداد کے تیور دیکھ کر دلاور نے اپنے چھوٹے بھائی کو
ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ؟''

''دروازے پر کون تھا؟'' جہانداد نے موضوع بدل کر دلاور سے پوچھا۔ ''تم نے بہت دیر
لگائی ہے''۔

''ملک مراد کا آدمی تھا''۔ اس نے بتایا۔ ''پیغام لے کر آیا تھا۔ علی الصبح میں نے ملک کے

ساتھ تھانے جانا ہے''۔

''کس لیے؟''

''یہ تو ملک صاحب کو ہی معلوم ہوگا''۔ دلاور نے جواب دیا۔ ''میں تو اس کا نوکر ہو[ں] مالک نوکروں کو ایسی باتیں نہیں بتایا کرتے''۔

''ٹھیک ہے پھر چلنے کی تیاری کرو''۔ جہانداد اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے [بولا]۔ ''پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے''۔

''میں تمہیں راستے کے متعلق سمجھا دیتا ہوں''۔ دلاور نے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے یقین ہے [تم] با آسانی وہاں پہنچ جاؤ گے''۔

جہانداد نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر ایک خیال برق کے کوندے کی طرح اس کے ذ[ہن] میں لپکا۔ دلاور جان بوجھ کر وقت ضائع کر رہا تھا اور شاید اس نے باہر دیر بھی کسی خاص مقصد [کے] لیے لگائی تھی۔

''کمینے!'' جہانداد نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ''سچ بتا دروازے پر کون تھا اور تم[نے] اس سے کیا کہا ہے؟ جلدی بول ورنہ بھون کر رکھ دوں گا''

''تت...... تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو''۔ وہ بوکھلا کر بولا۔ ''مم میں نے...... تجھے......''

اچانک باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور جہانداد نے لپک کر دروازے [کو] اندر سے کنڈی لگا دی۔

''بول تم نے ایسا کیوں کیا؟'' کنڈی لگانے کے بعد وہ دوبارہ دلاور کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اب مرنے کے لیے تیار ہو جا''۔

''خد...... خدا...... کی قسم''۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مم...... میں...... بے قصو[ر] ہوں۔ میں...... نہیں جانتا...... یہ کک...... کون لوگ...... ہیں''۔

دلاور کی ماں ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر جہانداد کی طرف فریادی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''دروازہ کھول دو جہانداد''۔ یکایک دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور کسی نے جہاند[اد کو] وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ یہ کمرہ تم سب کی اجتماعی قبر بن جائے گا''۔

''دلاور اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ میرے قبضے میں ہے''۔ وہ اونچی آواز میں بولا۔ ''اگر تم لوگوں نے کوئی بھی غلط قدم اٹھایا تو میں انہیں گولی مار دوں گا۔ میرے راستے......''

اچانک دروازے پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور جہانداد کی بات ادھوری رہ گئی۔ خوش قسم[تی] سے ان میں سے کوئی بھی دروازے کے سامنے نہیں تھا ورنہ یقیناً مارا جاتا۔



''یہ نمونہ تھا''۔ باہر سے دوبارہ آواز آئی۔ ''فوراً باہر آ جاؤ ورنہ یہ دروازہ ہماری گولیوں کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گا''۔

''عقل سے کام لو اوئے!'' دلاور چلایا۔ ''کیا تم سب پاگل ہو، اس طرح تو ہم بھی مارے جائیں گے۔ ہوش سے کام لو''۔

''گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے دلاور''۔ بولنے والے نے بے رحمی سے جواب دیا۔ ''تمہاری قربانی ضائع نہیں جائے گی''۔

''ملک مراد تم لوگوں کی کھال اتار دے گا''۔ دلاور نے غصے سے کہا۔ ''میں اس کا خاص آدمی ہوں دوبارہ فائرنگ مت کرنا''۔

''ہم ملک مراد کے ہی حکم کی بجا آوری کر رہے ہیں''۔ باہر والے نے جواب دیا۔ ''اس کا حکم ہے کہ جہانداد کو زندہ یا مُردہ میرے سامنے پیش کرو چاہے اس لڑائی میں دلاور سمیت اس کا پورا خاندان کیوں نہ مارا جائے''۔

''نہیں، تم بکواس کرتے ہو''۔ دلاور نے چیخ کر کہا اور پھر بے بسی کے عالم میں جہانداد کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات نمایاں تھے اور ہونٹ بے چارگی کے عالم میں بھینچے ہوئے تھے۔

''خوفزدہ ہونے سے کچھ نہیں ہوگا دلاور''۔ جہانداد کے لہجے میں طنز تھا۔ ''ہر ظالم شخص کا یہی انجام ہوتا ہے۔ تم نے ساری زندگی ایک ظالم کا ساتھ دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمہیں انعام تو ملنا چاہیے ناں! اب گھبراتے کیوں ہو؟ تم نے خود ہی تو انہیں بلایا ہے''۔

''تمہارے پاس دو منٹ کا وقت ہے دروازہ کھول دو''۔ باہر سے وارننگ ملی۔ ''ورنہ سب کتے کی موت مارے جاؤ گے''۔

''اب کیا ہوگا؟'' دلاور نے جہانداد سے بے چارگی کے عالم میں سوال کیا۔ ''وہ...... تو ہمیں مارنے پر تلے ہوئے ہیں''۔

''اس کو شامتِ اعمال کہتے ہیں''۔ جہانداد بولا۔ ''ملک مراد جیسے لوگ کسی سے وفا نہیں کرتے بہرحال یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں اپنی جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا''۔

''کیا تم ان کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو؟'' دلاور نے پریشانی کے عالم میں پوچھا اور جہانداد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے بعد جہانداد، دلاور اور منور نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے کمرے میں موجود

تینوں چوبی صندوق دروازے کے ساتھ لگا دیے۔ اب کم از کم دروازے پر ہونے والی فائر وہ محفوظ تھے۔ گولیاں ان بھاری صندوقوں سے نہیں گزر سکتی تھیں۔

اسی دوران دروازے پر فائرنگ ہونے لگی اور دلاور کی ماں جو پہلے دم سادھے ہو کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی اچانک ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔

”منور! تم ماں کو سنبھالو“۔ اتنا کہہ کر جہانداد، دلاور کی طرف متوجہ ہو گیا جو پریشا میں دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”حملہ آور کتنی تعداد میں ہوں گے؟“ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”کم از کم چار پانچ تو ہوں گے“۔ دلاور نے جواب دیا۔ ”شاید ہم انہیں نہیں رو گے۔ وہ ہمیں......“

”بزدلی کی باتیں مت کرو“۔ جہانداد نے اسے ڈانٹ کر قطع کلامی کی۔ ”میر ہوئے وہ کمرے میں داخل نہیں ہو سکتے“۔

باہر سے دروازے پر برابر فائرنگ ہو رہی تھی۔ ابھی تک کوئی گولی چوبی صندوقوں گزر سکی تھی۔ جہانداد کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ بظاہر صورت حال بالکل اس کے خلا وہ اس چوہے دان میں پھنس کر رہ گیا تھا مگر وہ ہمت ہارنے والے انسانوں میں سے نہیں تھا۔ کی نگاہ کمرے کے روشندان پر پڑی اور وہ دلاور سے بولا۔ ”یہ روشن دان کافی کشادہ ہے۔ کوشش کروں تو اس کے ذریعے کمرے کی چھت پر پہنچا جا سکتا ہے“۔

”کیا تم فرار ہونا چاہتے ہو؟“ دلاور نے افسردہ انداز میں پوچھا۔ وہ عجیب بے عالم میں جہانداد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں ان درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مت جاؤ“۔

”فکر مت کرو“۔ جہانداد اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔ ”میں تم لوگوں کو یوں بے کر نہیں بھاگوں گا“۔

”تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”جوابی کارروائی“۔ اس نے عزم کا اظہار کیا۔ ”میں بزدلوں کی طرح یوں چھپ سکتا۔ اگر قسمت میں مرنا ہی لکھا ہے تو پھر لڑ کر کیوں نہ مروں؟“

”میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا“۔ دلاور نے کچھ سوچ کر کہا۔

”نہیں“۔ جہانداد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارا کمرے کے اندر موجود رہنا ضرو حملہ آور تم سے کچھ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ انہیں اگر جواب نہ ملا تو وہ مشکوک ہو جائیں گے“۔



”کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے؟“ اس نے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔ ”میں ان کے لیے دروازہ بھی تو کھول سکتا ہوں“۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے“۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ”مجھے کمرے میں نہ پا کر وہ کسی طرح بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ ویسے مجھے تم پر بھروسہ بھی ہے، ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں“۔

”آج کے بعد تم مجھ اپنا دوست پاؤ گے“۔ وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ”میں اس جنگ میں مرتے دم تک تمہارا ساتھ دوں گا۔ ملک مراد کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ایسے ایسے شرم ناک کام سرانجام دیے ہیں کہ سوچتے ہوئے......“

”دلاور......!“ جہانداد نے قطع کلامی کی۔ ”یہ وقت ایسی باتوں کے لیے ناموزوں ہے، باہر ملک مراد کے بھیجے ہوئے موت کے ہرکارے ہمارے منتظر ہیں۔ جلدی سے کچھ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے پہلے وہ چھت پر پہنچ جائیں“۔

”تم ٹھیک کہتے ہو“۔ دلاور تیزی سے آگے بڑھا اور ایک چارپائی اٹھا کر روشندان کے عین نیچے دیوار کے ساتھ عموداً ٹکا کر بولا۔ ”چلو جلدی کرو۔ ہماری خاموشی انہیں مشکوک کر دے گی“۔

”منور تم چارپائی کو مضبوط سے پکڑ لو“۔ جہانداد بولا۔ ”پہلے روشندان کا چوبی جنگلا اکھاڑنا ہو گا مگر اس کے لیے کسی اوزار کی ضرورت ہو گی“۔

”اوزار ہے ناں“۔ منور تیزی سے کمرے کے ایک کونے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی لاتا ہوں“۔

کمرے کے اس کونے میں گھریلو سامان اسٹور تھا۔ منور نے جلدی سے ایک کلہاڑی تلاش کی جس کا دستہ بہ مشکل ایک فٹ کے برابر تھا۔

”کیا اس سے کام چل جائے گا؟“ وہ دوبارہ ان کے پاس پہنچ کر سوالیہ انداز میں بولا۔

”مجھے دو میں کوشش کرتا ہوں“۔ دلاور اس کے ہاتھ سے کلہاڑی جھپٹتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں چارپائی کو تھام کے رکھو“۔

ان دونوں نے چارپائی کو سائیڈوں سے تھام لیا اور دلاور نے اوپر چڑھ کر روشندان کا چوبی جنگلا اکھاڑنا شروع کر دیا۔

اسی دوران فائرنگ میں ایک ذرا سا وقفہ ہوا اور باہر سے کسی نے آواز لگائی۔ ”دلاور! باہر آ جاؤ، ہم تمہیں جان بچانے کا ایک موقع دینا چاہتے ہیں“۔

”اسے میں نے مار ڈالا ہے“۔ جہانداد نے بلا تردد جواب دیا۔ ”مُردے کو آواز دینے کی حماقت کیوں کر رہے ہو؟“

جہانداد کے جواب نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور انہوں نے شدت کے ساتھ دوبارہ
شروع کر دی۔ وقفے وقفے سے وہ وارننگ بھی دے رہے تھے مگر جہانداد خاموش رہا۔

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد دلاور نے جنگلا اکھاڑ لیا۔ اس کے بعد جہانداد نے
رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور چارپائی پر چڑھ کر باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دی۔ گو کہ کام
تھا مگر فوجی تربیت اس کے کام آ گئی۔ باہر سے روشندان کا فاصلہ چھت کی منڈیر سے
قریب تھا۔ اس کا پورا جسم کمان بنا ہوا تھا۔ ہاتھ چھت کی منڈیر پر ٹکے ہوئے تھے اور ٹانگیں
کے اندر کمرے میں لٹک رہی تھیں۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ روشندان کمرے کی عقبی جانب گلی میں کھلتا تھا اور نہ اسے
حملہ آور دیکھ سکتے تھے۔ دو تین منٹ کی کوشش کے بعد وہ چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک لمحے کے لیے اس نے پھولی ہوئی سانسیں درست کیں اور پھر رائفل ہاتھ میں
رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ اگر چاہتا تو آرام سے گلی میں اتر کر فرار ہو سکتا تھا مگر دلاور اور اس
والوں سمیت یوں بے آسرا چھوڑنا اس کے ضمیر نے گوارا نہ کیا حالانکہ دلاور کل تک اس کا دشمن

===•===•

سامنے سے چھت کی منڈیر پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور اس پر پلستر بھی کیا گیا تھا۔
اونچائی ڈیڑھ فٹ کے قریب تھی۔ وہ ایک تربیت یافتہ فوجی تھا۔ یہ منڈیر اس کے لیے
آڑ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے منڈیر سے سر اٹھا کر ایک لمحے کے لیے حملہ آوروں کا جائزہ لیا۔
کر ان کی تعداد اس کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔

وہ سامنے صحن میں نظر آ رہے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق کمرے کے دروازے
ان کا فاصلہ کسی طرح بھی بیس گز سے کم نہیں تھا۔ وہ پانچوں اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔
تعداد زیادہ بھی ہو سکتی تھی مگر اس کے سامنے صرف پانچ ہی تھے۔ وہ بدستور کمرے کے دروازے
فائرنگ کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہے تھے مگر وہ
چھت پر لیٹا دل ہی دل میں ان کی حماقت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

اس نے لیٹے لیٹے رائفل کو سیدھا کیا اور ایک حملہ آور کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔
یقیناً نشانے پر ہی لگی تھی کیونکہ حملہ چیخ مار کر گر چکا تھا۔ اس دوران تیزی سے کروٹ بدلتے ہوئے
نے دوسرے حملہ آور کی ٹانگوں پر گولی چلائی اور وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح چیختا ہوا گر گیا۔
تاریکیوں کے چاند کی مدھم روشنی میں اسے زمین پر گرے ہوئے دونوں حملہ آور صاف دکھائی
رہے تھے۔



بقیہ تینوں حملہ آور اپنے ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر ایک دم حواس باختہ ہو گئے تھے۔ غالباً اس
غیر متوقع صورتِ حال کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھے۔ ان کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
جہانداد نے انہیں ڈرانے کے لیے ان کے اردگرد مزید دو تین فائر کر دیے۔ گولیاں ان کے آس پاس
کچی زمین میں لگی تھیں۔ انہوں نے سنبھلنے کی کوشش میں اپنے دائیں بائیں چند گولیاں چلائیں لیکن
جہانداد کی پوزیشن سے لاعلم ہونے کی وجہ سے کوئی ایک گولی بھی جہانداد کے قریب سے نہیں گزری
تھی۔

جہانداد نے لیٹے لیٹے دوبارہ رائفل کو لوڈ کیا اور ایک بار پھر منڈیر سے سر نکال کر حملہ آوروں
کی طرف متوجہ ہو گیا مگر اتنی دیر تک وہ پانچوں غائب ہو چکے تھے۔ غالباً وہ اپنے زخمی ساتھیوں کو بھی
ساتھ لے گئے تھے یا پھر زخمی ہونے والے وہیں صحن میں کسی آڑ کے پیچھے جا چھپے تھے۔

جہانداد کچھ دیر کسی ردِعمل کی توقع میں اپنی جگہ پر لیٹا رہا مگر جب کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا تو وہ
رینگتے ہوئے چھت کے عقبی جانب پہنچ گیا۔ ایک محتاط نظر اس نے گلی میں ڈالی لیکن گلی سنسان پڑی
ہوئی تھی۔

''کیا حملہ آور اتنے کم وقت میں فرار ہو سکتے ہیں؟'' اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا
لیکن جواب نفی میں ملا۔

''تو پھر کہاں جا سکتے ہیں؟'' اس نے دوبارہ سوچا اور پھر چھت سے گلی میں اُترنے کا فیصلہ کر
لیا۔ دراصل وہ بیرونی دروازے سے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ اگر حملہ آور وہیں کہیں صحن میں
چھپے ہوئے ہوں تو وہ انہیں سامنے آنے پر مجبور کر سکے۔

اس نے رائفل کندھے سے لٹکائی اور منڈیر پکڑ کر نیچے گلی میں اترنا ہی چاہتا تھا کہ معاً اسے
اپنے عقب میں ایک مدھم سا کھٹکا سنائی دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کسی سانپ کی طرح تڑپ کر پیچھے
پلٹا اور پھر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ چھت پر اس کے سامنے ایک موٹی تازی سیاہ بلی کھڑی
ہوئی تھی۔ اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی اور تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

بلی کو نظرانداز کر کے وہ دوبارہ منڈیر کی طرف پلٹا مگر اس دوران دلاور روشندان سے سر نکال
کر اسے مدھم آواز میں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے وہ بھاگ گئے ہیں۔ میں نے
چیخنے کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ شاید ان میں سے کوئی ہلاک بھی ہوا ہے''۔

''ہلاک کوئی بھی نہیں ہوا''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''تاہم میں نے دو کو زخمی ضرور کیا ہے
لیکن اب وہ زخمی ہونے والے بھی اپنی جگہ پر موجود نہیں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ صحن میں ہی
کہیں چھپ کر ہماری گھات لگائے بیٹھے ہوں''۔

''نہیں''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اتنے بہادر اور ذہین نہیں ہیں وہ۔ ایسا منصوبہ تم جیسے لوگ بنا سکتے ہیں۔ وہ احمق ایسا سوچ بھی نہیں سکتے''۔

''پھر بھی میں امکانات کو نظر انداز نہیں کر سکتا''۔ جہانداد قدرے توقف سے بولا۔ ''ہم سے کسی نے بھی ان کے دوڑنے کی آوازیں نہیں سنیں اور یہی بات مجھے کھٹک رہی ہے۔ ایسا نہ ہو ہم بے خوف ہو کر صحن میں نکلیں اور بے خبری میں مارے جائیں''۔

''یہ محض تمہارا اندازہ ہے''۔ دلاور نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ''ورنہ مجھے سو فیصد یقین ہے وہ لوگ بھاگ گئے ہیں۔ وہ میرے ساتھی رہ چکے ہیں، میں ان کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں''۔

''اگر واقعی ایسی بات ہے تو چلو دونوں صحن میں دیکھتے ہیں''۔

اتنا کہہ کر جہانداد نے اسے اوپر چھت پر کھینچ لیا۔ اس کے بعد وہ دونوں بغیر وقت ضائع کیے گلی میں اُترے اور دبے پاؤں بیرونی دروازے کی طرف چل پڑے۔ مسلح ہونے کی وجہ سے جہانداد آگے تھا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ جہانداد نے محتاط انداز میں اندر جھانکا۔ پورے صحن پر چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور فضا بالکل ساکت تھی۔

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو''۔ جہانداد نے اسے دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔ ''وہ لوگ اندر نہیں ہو سکتے''۔

''تو پھر اس احتیاط کی کیا ضرورت ہے؟'' دلاور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''اندر آجاؤ''۔

''رک جاؤ دلاور''۔ جہانداد نے اسے آواز دی۔ ''یوں اندھا دھند اندر جانا ٹھیک نہیں ہے''۔

دلاور اس دوران صحن کے درمیان میں پہنچ چکا تھا۔ جہانداد کی بات سن کر اچانک وہ پلٹا مگر جہانداد کو جواب دینے کی مہلت اسے نہ مل سکی۔ بیک وقت تین رائفلوں نے آگ اگلی اور دلاور لڑکھڑاتا ہوا صحن میں گر گیا۔ اسے چلانے تک کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔

حملہ آور برآمدے میں چھپے ہوئے تھے۔ جہانداد گولیوں کی آواز سنتے ہی چشم زدن میں اندر داخل ہوا اور زمین پر لیٹ کر پوزیشن لے لی۔ حملہ آوروں نے جہانداد کو پوزیشن لیتے ہوئے دیکھ کر فائرنگ شروع کر دی۔ جواباً جہانداد نے بھی تیزی سے کروٹیں بدلتے ہوئے برآمدے کی طرف دو فائر جھونک دیے۔ اس کی ایک گولی اتفاقاً نشانے پر لگی اور حملہ آوروں میں سے ایک چیختا ہوا گر پڑا۔ باقی دو حواس باختہ ہو کر برآمدے سے نکلے اور فائرنگ کرتے ہوئے تیزی سے شمالی دیوار



طرف بڑھنے لگے۔

کھلے صحن میں تیزی سے کروٹیں بدلتے ہوئے جہانداد کے لیے ان کو نشانہ بنانا بہت مشکل تھا۔ دیوار کے ساتھ خشک گھاس کا ڈھیر پڑا ہوا تھا جو اوپر تک دیوار کے ساتھ چلا گیا تھا۔ دونوں حملہ آور تیزی سے گھاس کے ڈھیر پر چڑھ گئے اور پھر جہانداد کے دیکھتے ہی دیکھتے دیوار پھلانگ گئے۔ ان کے پیچھے جانے کی بجائے جہانداد بھاگتا ہوا دلاور کے پاس پہنچ گیا مگر وہ اس دوران ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس رکنے کے بعد وہ برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں حملہ آوروں کا ساتھی مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اسے سر میں گولی لگی تھی۔

اس دوران منور اپنی ماں کے ساتھ نہ جانے کس طرح چوبی صندوق ہٹا کر باہر آ گیا تھا۔ ان دونوں کو جب جہانداد کی زبانی دلاور کے مارے جانے کی خبر ملی تو چند لمحوں کے لیے ان دونوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے جہانداد کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر اچانک دلاور کی ماں آگے بڑھی اور دھاڑیں مارتے ہوئے جوان بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی۔ اس کے نالے سن کر جہانداد کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا مگر کوشش کے باوجود اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ دل ہی دل میں وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا حالانکہ دلاور کی جان اس کے ساتھیوں نے لی تھی۔

''ماں جی! میں آپ سے شرمندہ ہوں''۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر بدقت تمام بولا۔ ''میں کوشش کے باوجود دلاور کو نہیں بچا سکا''۔

''تم نے...... اسے مارا ہے''۔ وہ اچانک اٹھی اور جنونی انداز میں جہانداد کا گریبان پکڑ کر بولی۔

''قاتل، خونی...... درندے! تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ بول کیا ملا تجھے ایک ماں کا سہارا چھین کر؟''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور جہانداد کسی بت کے مانند گنگ اور ساکت کھڑا ہوا تھا۔ وہ جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیا کرتا تھا آج ایک ماں کے سامنے مہر بہ لب بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

''مجھے دلاور کی موت کا دکھ ہے ماں جی''۔ وہ ایک طویل وقفے کے بعد بولا۔ ''آپ مجھے قتل......''

''دکھ تو مجھے ہوا ہے''۔ اس نے روتے ہوئے قطع کلامی کی۔ ''تمہارا تو کلیجا ٹھنڈا ہوا ہوگا''۔

''نہیں ماں جی! اس کا کوئی قصور نہیں ہے''۔ منور ماں کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''اس نے تو

دشمن ہوتے ہوئے ہماری حفاظت کی ہے۔ یہ اگر چاہتا تو روشن دان سے گلی میں اُتر کر باآسانی
ہوسکتا تھا۔ ان کا مقابلہ کرنے کی اسے کیا ضرورت تھی۔ یہ تو ہمارا محسن ہے اور آپ اپنے محسن
ساتھ ایسا ناروا سلوک کررہی ہیں''۔

بیٹے کی بات میں وزن تھا۔ اس نے جہانداد کا گریبان چھوڑ دیا اور دوبارہ دلاور کی لاش
لپٹ کر بین کرنے لگی۔

رات آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی۔ اب وہاں مزید ٹھہرنا جہانداد کے لیے خطرناک ثا
ہوسکتا تھا۔ ملک مراد کے فرار ہوجانے والے غنڈے کوئی نیا گل کھلا سکتے تھے اس لیے وہ منور
مخاطب ہوکر بولا۔ ''مجھے تمہارے بھائی کی موت کا بہت افسوس ہے منور! لیکن میں اس کی تجہیز و تک
کے لیے نہیں ٹھہر سکتا''۔

''میں تمہاری مجبوری کو سمجھتا ہوں''۔ منور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم بے فکر ہوکر جاؤ
پولیس کے سامنے تمہارا نام تک نہیں لوں گا''۔

''نہیں تم میرے لیے اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالو گے''۔ اس نے تنبیہی انداز میں
''مجھے معلوم ہے کہ ملک مراد تم سے اپنی مرضی کا بیان دلوائے گا۔ تم اس کا کہنا مان لینا۔ میں نہیں چا
کہ میری وجہ سے تم ماں بیٹے پر کوئی آنچ آئے۔ اپنی جنگ میں آپ لڑوں گا''۔

''لیکن میں جھوٹا بیان نہیں دوں گا۔ میں پولیس کو سچ سچ بتا دوں گا کہ میرے بھائی کو ملک
کے غنڈوں نے قتل کیا ہے''۔

''تم نے اسی گاؤں میں رہنا ہے منور!'' وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔ ''دریا میں رہ کر مگرمچھ
بیر نہیں رکھا جاتا۔ کیا تمہیں اپنی بوڑھی ماں کا کوئی احساس نہیں ہے جو ایک بیٹے کو کھو چکی ہے۔ کیا
دوسرے بیٹے کو کھو کر زندہ رہ سکے گی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے تاہم مجھے امید ہے کہ تم میر
باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو گے''۔

اس کے بعد اس نے منور سے سانول ڈاکو کے ڈیرے کے متعلق معلومات حاصل کیں اور
حافظ کہہ کر رخصت ہوگیا۔

===

دوسرے دن علی الصبح ملک مراد اپنے بھیجے ہوئے غنڈوں کی ناکامی پر سخت تاؤ کھا رہا تھا۔
غنڈوں کا لیڈر شیرا اس کے سامنے کھڑا اپنی ناکامی کی کہانی سنا رہا تھا اور ملک مراد طیش کے عالم
ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

''سؤر کی اولاد! تمہیں یوں دُم دبا کر بھاگتے ہوئے شرم نہیں آئی''۔ تفصیل سننے کے بعد



مراد گرج کر بولا۔ ''تم پانچ تھے اور وہ اکیلا، پھر بھی اس نے تمہارا ایک ساتھی مار ڈالا اور دو کو زخمی کر
دیا''۔

''وہ...... وہ اکیلا کہاں تھا ملک صاحب''۔ شیرا کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''دلاور اور اس
کا بھائی بھی اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ وہ دونوں بھائی اگر ہمارا ساتھ دیتے تو آج جہانداد کی لاش
آپ کے قدموں میں پڑی ہوتی''۔

''لیکن ابھی چند لمحے پہلے تم بکواس کرچکے ہو کہ وہ دونوں بھائی نہتے تھے''۔ ملک مراد نے
اسے غضب ناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے بہانے مت
تراشو''۔

''م...... ملک صاحب! خدا جانتا ہے کہ میں بہانے نہیں تراش رہا''۔ وہ گھگھیا کر بولا۔
''ہم نے اپنی پوری کوشش کی ہے بس اس کی قسمت اچھی تھی اس لیے بچ گیا''۔

''خاک کوشش کی ہے۔ ہاتھ آیا دشمن تم لوگوں کی بزدلی کی وجہ سے بچ کر نکل گیا ہے۔ جی
چاہتا ہے تجھے گولی مار دوں''۔

''ملک صاحب! مجھے گولی مار کر آپ کو کیا ملے گا؟ میں تو جی آپ کا غلام ہوں''۔ شیرا نے
خوشامدی انداز میں جواب دیا۔ ''آپ اس وقت منور اور اس کی ماں کے متعلق سوچیں۔ ایسا نہ ہو کہ
وہ پولیس کو کوئی الٹا سیدھا بیان دے بیٹھیں''۔

''وہ ایسی جرأت نہیں کرسکتے''۔ ملک مراد نے حکم دیا۔ ''جاؤ ان دونوں کو فوراً حویلی میں لے
آؤ، اگر وہ ٹال مٹول سے کام لیں تو گھسیٹ کر لے آنا''۔

''ملک صاحب! آپ کو زحمت تو ہوگی مگر مناسب یہی ہوگا کہ آپ ان کے ہاں چلے جائیں۔
ان کو بلانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آسانی سے میرے ساتھ نہیں آئیں گے اور اگر میں
انہیں زبردستی لے کر آگیا تو گاؤں کے لوگوں کو منہ کھولنے کا موقع مل جائے گا''۔ شیرا نے بلا جھجک
اپنے خدشے کا اظہار کردیا۔

''زندگی میں پہلی بار تم نے عقل کی کوئی بات کی ہے''۔ بالکل غیر متوقع طور پر ملک مراد رضا
مندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ان سے جہانداد کے خلاف بیان دلواؤں گا''۔

''تو چلئے ملک صاحب! پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہمیں یہ کام نمٹانا ہوگا۔ مجھے خدشہ ہے کہ
منور کہیں تھانے کی طرف نہ نکل جائے''۔

شیرا کی بات سن کر ملک مراد فوراً تیار ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں دلاور کے گھر پہنچ
گئے۔ دلاور کی ماں ابھی تک وہیں صحن میں دلاور کی لاش کے پاس بیٹھی ہوئی تھی لیکن منور نظر نہیں آرہا

تھا۔ ملک مراد نے جاتے ہی اس سے منور کے متعلق استفسار کیا لیکن وہ گم صم بیٹھی رہی ا اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''شاید بڑھیا اپنے حواس کھو چکی ہے''۔ شیرا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ورنہ آپ سن کر یقیناً بھڑک اٹھتی''۔

''یہ ہمارے حق میں بہتر ہے''۔ ملک مراد نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ''اب پولیس ا نہیں لے سکے گی تاہم منور کو سمجھانا پڑے گا لیکن وہ ہے کہاں؟''

''ہوسکتا ہے تھانے چلا گیا ہو''۔ اس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو''۔ ملک مراد نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہیں ڈھونڈو اسے۔ بھائی کی لاش کر چھوڑ وہ کہیں نہیں جاسکتا''۔

شیرا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھا مگر پھر ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ منور چ کے ساتھ بیرونی دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

''لو ملک صاحب! منور آ گیا ہے''۔ شیرا پلٹ کر بولا۔ ''آپ علیحدگی میں اس سے لیں''۔ ملک مراد کو اپنے گھر میں دیکھ کر منور کا خون کھول اٹھا تاہم وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے

''ملک صاحب! آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا''۔

''میں تم سے علیحدگی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں''۔ ملک مراد اس کی ناگوار انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے ساتھ آؤ''۔ اتنا کہہ کر وہ برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں''۔ منور اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے ''لیکن میں پولیس کے سامنے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ مہربانی فرما کر یہاں سے چلے جائیں''

''برخوردار! تمہیں پولیس کے سامنے جھوٹ بولنے کے لیے کون کہہ رہا ہے؟'' سے بولا۔ ''ظاہر ہے تم پولیس کے سامنے جہانداد کا ہی نام لو گے''۔

''میں جہانداد کا نام نہیں لوں گا''۔ منور نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میرے بھائی کو نے قتل کیا ہے میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں''۔

''کن لوگوں نے قتل کیا ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''کیا تم نہیں جانتے؟ میری زبان سے سننا چاہتے ہو؟'' منور آپ، جناب کے کرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے قتل کروایا ہے میرے بھائی کو''۔

''کیا تم پاگل ہو چکے ہو؟'' ملک مراد چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ '' خاص آدمی تھا۔ میں بھلا اسے کیوں قتل کروانے لگا؟''



''یہ اپنے آدمیوں سے پوچھو، انہوں نے علی الاعلان کہا تھا کہ وہ تمہارے حکم کے مطابق یہ کارروائی کر رہے ہیں''۔

''مجھے سختی کرنے پر مجبور مت کرو''۔ وہ زچ ہو کر دھمکی پر اُتر آیا۔ ''کیا تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے؟''

''زندگی اور موت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ تم میرا......''

''میں یہاں تمہاری بکواس سننے کے لیے نہیں آیا ہوں''۔ اس نے درشت انداز میں قطع کلامی کی۔ ''تم پولیس کو ایسا کوئی بیان نہیں دو گے جس میں میرا یا میرے آدمیوں کا نام آئے۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے''۔

''میں اپنا اچھا برا جانتا ہوں''۔ وہ مرعوب ہوئے بغیر بولا۔ ''تم سے جو بن پڑے کر لینا۔ میں پولیس کو سچا بیان ہی دوں گا''۔

اس کا جواب سن کر ملک مراد کا خون کھول اٹھا مگر اس نے کوئی عملی قدم اٹھانے سے گریز کیا کیونکہ دروازے پر بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ایسے میں اگر وہ منور پر سختی کرتا تو گاؤں والوں کے سامنے اس کی پوزیشن مشکوک ہو جاتی تاہم وہ نئی چال چلتے ہوئے بولا۔ ''بے وقوف آدمی! میں اگر چاہوں تو یہ دونوں قتل تم پر ڈال سکتا ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تمہاری ماں اپنے حواس کھو چکی ہے۔ وہ پولیس کو بیان نہیں دے سکے گی۔ اس لیے جوش سے نہیں ہوش سے کام لو ورنہ میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ انہی لوگوں گاؤں میں سے چشم دید گواہ لا کر پولیس کے سامنے کھڑے کر دوں گا۔ پھر تم کیا کرو گے؟ ایسی صورتِ حال میں کیا پولیس تمہارے بیان پر یقین کرے گی جبکہ دونوں لاشیں تمہارے گھر کے صحن میں پڑی ہیں۔ جہانداد ایک مفرور ہے جو پہلے ہی دو قتل کر چکا ہے وہ تمہارے کام نہیں آئے گا البتہ میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تم چاہو تو میں تمہیں خون بہا دینے کے لیے بھی تیار ہوں''۔

ملک مراد کی باتوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے جہانداد کی نصیحت بھی شدت کے ساتھ یاد آنے لگی تھی۔ وہ واقعی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی جہانداد کے خلاف بیان دینے کے لیے مجبور ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب پولیس موقعۂ واردات پر پہنچی تو منور نے بلاتردد جہانداد کے خلاف دوہرے قتل کا پرچہ درج کروا دیا۔ ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد انسپکٹر صادق نے دونوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ جب انسپکٹر فارغ ہو گیا تو ملک مراد نے موقع دیکھ کر کہا۔

''انسپکٹر صاحب! جہانداد چار قتل کر چکا ہے۔ پورے گاؤں میں خوف وہراس پھیلا ہوا ہے۔

جلد از جلد اسے گرفتار کریں‘‘۔

’’میں اپنے فرائض سے غافل نہیں ملک صاحب‘‘۔ انسپکٹر نے جواباً کہا۔ ’’میں جہا بہت جلد ڈھونڈ نکالوں گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے‘‘۔

’’میرا بھانجا قتل ہوا ہے انسپکٹر صاحب!‘‘ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ’’میں پریشان نہیں گا تو اور کون ہوگا؟ پولیس نے اگر چند دنوں تک قاتل کو گرفتار نہ کیا تو میں حکام بالا تک پہنچ جا بعد میں شکایت نہ کرنا‘‘۔

’’شوق سے جاؤ، میں تمہیں روکوں گا نہیں‘‘۔

انسپکٹر کا جواب سن کر ملک مراد اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور انسپکٹر منور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

’’مجھے تم سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔ چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں‘‘۔ اتنا کہہ کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا اور منور اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ملک مراد نے انہیں جاتا دیکھ کر برا سا منہ بنایا اور پھر صحن میں موجود دوسرے پولیس والو طرف متوجہ ہو گیا۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد انسپکٹر منور کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور اپنے ساتھیو لے کر رخصت ہو گیا۔

===

جہانداد وہاں سے افسردگی کے عالم میں نکلا اور ایک انجانی منزل کی طرف روانہ ہو منور کے کہنے کے مطابق سانول کا ڈیرا رحمان پورہ نامی گاؤں سے آگے ایک وسیع جنگل میں تھا جنگل قبائلی علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔ منور نے اسے تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ سانول اور اس ساتھیوں کے تعلقات جرائم پیشہ قبائلیوں کے ساتھ بھی ہیں جو ان کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ضرو کے وقت نہ صرف انہیں اسلحہ فراہم کرتے ہیں بلکہ انہیں قانون سے بچنے کے لیے اکثر اوقات علاقے میں پناہ بھی دیتے رہتے ہیں۔ گو کہ سانول اس کے ہاتھوں سے مارا جا چکا تھا مگر اس ساتھی تو ابھی زندہ تھے۔ کیا وہ اکیلا ان کی قید سے حاکم علی کو رہا کرانے میں کامیاب ہو جائے پتہ اپنے سردار کے مرنے کی خبر سن کر انہوں نے حاکم علی کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہو یا پھر پولیس چھاپے کے خوف سے انہوں نے اسے وہاں سے قبائلی علاقے میں منتقل کر دیا ہو۔

ایسے خیالات اس کے دماغ میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ گزشتہ دو روز سے اسے کرنے کے بہت کم مواقع ملے تھے۔ اس کا سر بھاری اور آنکھوں کے گرد جاگنے کی وجہ سے پڑ چکے تھے۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک بھرپور نیند کی ضرورت تھی مگر حالات اسے



مجبور کر رہے تھے۔ ویسے بھی یہ وقت آرام کرنے کے لیے مناسب نہیں تھا کیونکہ اس کی منزل بہت دور تھی۔ شام سے پہلے وہ کسی طرح بھی رحمان پورہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لیے آرام کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رحمان پورہ پہنچ کر ہی اسے آرام کرنے کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ مل سکتی تھی۔ وہاں اس کا ایک رشتے کا ماموں رہتا تھا۔ نصیر نامی وہ شخص اس کی ماں کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ نصیر سال میں کبھی کبھار ایک آدھ چکر فتح پور کا لگا لیا کرتا تھا اور وہ بھی کسی دکھ سکھ کے موقع پر ورنہ تو وہ ایک دوسرے کے حال سے بے خبر رہا کرتے تھے۔

اس نے آخری بار نصیر ماموں کو آج سے چھ برس قبل دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ابھی فوج میں بھرتی ہونے کی سوچ رہا تھا اور ماں باپ اس کے اس ارادے کی مخالفت کر رہے تھے، تب ماموں نصیر نے کھل کر اس کی حمایت کی تھی اور اس کے والدین کو قائل کر کے ہی چھوڑا تھا۔

اسے یقین تھا کہ آج بھی ماموں نصیر اس کا ساتھ دیں گے۔ عشاء کی اذان سے تھوڑی دیر قبل وہ ماموں نصیر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تیسری دستک پر ایک دس سالہ لڑکے نے دروازہ کھولا اور جواب طلب انداز میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔

’’کیا نصیر گھر میں موجود ہے؟‘‘ اس نے لڑکے سے سوال کیا۔

’’آپ کو نانا جان سے ملنا ہے؟ لیکن وہ تو......‘‘ لڑکا کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

’’ارے تم فریدہ آپا کے بیٹے ہو؟‘‘ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

’’جی ہاں لیکن آپ کون ہیں؟‘‘ لڑکے نے متحیر انداز میں سوال کیا۔

’’نانا جان سے کہو کہ فتح پور سے جہانداد آیا ہے۔ جاؤ شاباش‘‘۔ اس نے جواب دیا اور لڑکا اندر غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ نصیر ماموں کے سامنے بیٹھا اسے اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ اس کی داستان سننے کے بعد نصیر بہت پریشان نظر آ رہا تھا تاہم اس کی تھکاوٹ اور نیند کے پیشِ نظر اس نے سوالات سے گریز کیا تھا۔

’’تم کھانا کھا کر سو جاؤ‘‘۔ نصیر اٹھتے ہوئے بولا۔ ’’اس موضوع پر کل صبح بات کریں گے۔ فی الحال میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں‘‘۔ اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے بعد فریدہ کے بیٹے عارف نے اسے کھانا پہنچا دیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے کھانا کھایا اور پھر بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند نے آلیا۔ نصیر جب نماز پڑھ کر واپس آیا تو اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔

دوسرے دن جونہی وہ ناشتے سے فارغ ہوا نصیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جلد یا بدیر پولیس تمہاری تلاش میں یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اس لیے تمہارا یہاں خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تمہیں جس چیز کی......"

"میں یہاں ٹھہرنے کے لیے نہیں آیا ہوں ماموں!" اس نے فوراً قطع کلامی کی۔ "آ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں بس تھوڑی دیر کے بعد یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو جہانداد!" وہ شکایتی انداز میں بولا۔ "بات میری پریشانی ہے بلکہ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تم تین قتل کر چکے ہو، میں نہیں چاہتا کہ تم پولیس کے ہاتھ لگ جا لیے تمہیں نصیحت کر رہا تھا ورنہ تو یہ تمہارا اپنا گھر ہے جب تک جی چاہے یہاں رہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے ماموں!" اس نے جواباً کہا۔ "میں بھلا آپ کو غلط کیوں سمجھنے لگا دراصل یہاں سے آگے جانا چاہتا ہوں۔ شاید میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ حاکم چچا، سانول کے ساتھیوں کے قبضے میں ہے۔ میں نے ہر صورت میں اسے چھڑانا ہے۔"

"یہ بیوقوفی ہے جہانداد!" ماموں نے اسے سمجھایا۔ "تم اکیلے کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ بر مانو تو یہ خیال دل سے نکال دو۔"

"نہیں"۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں اپنی جان کے خوف سے حاکم چچا کو بے مددگار نہیں چھوڑوں گا۔ نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا؟ آپ بس اتنی مہربانی کریں کہ میرے ایک گھوڑے کا بندوبست کر دیں۔ آگے اللہ مالک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، گھوڑے کا بندوبست ہو جائے گا اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتا نصیر نے پُرخلوص انداز میں پوچھا۔ "مجھ سے جو بن پڑا میں تمہارے لیے کروں گا۔"

"گھوڑے کے ساتھ ساتھ اگر کسی چھوٹے ہتھیار کا بھی انتظام ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ میر پاس تو صرف یہی ایک رائفل ہے۔" اس نے بلاتردد بتایا۔

"ہتھیار بھی مل جائے گا"۔ نصیر نے جواب دیا اور اٹھ کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد جب وہ کمرے سے برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک خنجر اور ایک ریوا موجود تھا۔ ریوالور چرمی بیلٹ کے ساتھ منسلک ایک ہولسٹر میں تھا۔ اور ریوالور کی گولیاں بیلٹ م موجود تھیں۔ دونوں چیزیں لا کر اس نے جہانداد کے سامنے رکھ دیں۔

جہانداد نے فوراً ریوالور کو ہولسٹر سے باہر نکالا اور اچھی طرح پرکھنے کے بعد ستائشی انداز کہا۔ "ارے ماموں! یہ تو ولایتی نظر آتا ہے، کہاں سے خریدا ہے؟"

"کہیں سے بھی نہیں خریدا"۔ نصیر نے جواب دیا۔ "دراصل یہ ریوالور تقسیم سے پہلے ابا کو ایک انگریز نے دیا تھا۔ تب سے یہ ہمارے گھر میں موجود ہے۔ ابا جان نے ساری زندگی ا



اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا ہے۔"

ریوالور کے بعد اس نے خنجر کو نیام سے باہر نکال کر دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر دونوں ہتھیار رکھ لیے۔

"شکریہ ماموں جان!" وہ احسان مندانہ انداز میں بولا۔ "یہ دونوں چیزیں میرے پاس آپ کی امانت ہیں۔ بہت جلد لوٹانے کی کوشش کروں گا۔"

"لوٹانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ نصیر نے پُرخلوص انداز میں کہا۔ "اب یہ تمہاری ملکیت ہیں مجھے ان کی ضرورت کبھی نہیں پڑی اور نہ ہی آئندہ پڑے گی۔"

تھوڑی دیر کے بعد جہانداد گھوڑے پر سوار رحمان پورہ گاؤں سے باہر اس جنگل کا رخ کر رہا تھا جہاں سانول ڈاکو کا ڈیرا موجود تھا۔

===

سانول ڈاکو کے مارے جانے کی خبر اس دن شام کے وقت اس کے ساتھیوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے نائب رستم نے اس خبر کو سن کر فوراً ہی اپنے ساتھیوں کو بلا کر نہ صرف اپنی سرداری کا اعلان کر دیا بلکہ تمام ساتھیوں کے سامنے سانول کا انتقام لینے کی قسم بھی کھالی۔

"کیوں نا اس انتقام کی ابتداء حاکم علی سے کی جائے"۔ اس کے ایک ساتھی نے مشورہ دیا۔

"نہیں!" رستم انکار کرتے ہوئے بولا۔ "حاکم علی کے بدلے ہم اس کے گھر والوں سے تاوان کا مطالبہ کریں گے۔ اسے قتل کر کے ہمارے ہاتھ کیا آئے گا؟"

"تو کیا تاوان کی رقم لینے کے بعد تم اسے چھوڑ دو گے؟" دوسرے ساتھی نے استفسار کیا۔

"کبھی نہیں"۔ رستم مکاری سے مسکرایا۔ "وہ ہمارا ٹھکانہ دیکھ چکا ہے۔ رہا ہو کر ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"حاکم علی کے گھر والوں سے تاوان کی رقم کا مطالبہ کس طرح کریں گے؟" اس نے دوبارہ الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "وہاں پولیس ہماری تاک میں ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

"یہ میرا کام ہے"۔ رستم نے جواب دیا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں کل ہی اس کے بھائی قاسم علی تک یہ اطلاع پہنچا دوں گا۔"

"لیکن تم شاید ایک بات بھول رہے ہو"۔ ایک اور ساتھی مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "حاکم علی، ملک مراد کا قیدی ہے اور اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق بھی وہی رکھتا ہے۔ اسے اگر ہمارے منصوبے کی خبر ہو گئی تو ہمارے لیے بہت برا ہوگا۔ ہمیں کم از کم اس سے مشورہ ضرور کر لینا چاہیے

ورنہ ایک بااثر شخص سے ہمیں دشمنی مول لینا پڑ جائے گی"۔

"میں تم سے بہتر جانتا ہوں"۔ رستم بھڑک کر بولا۔ "وہ ملک ہوگا تو اپنے گاؤں والا لیے مجھے اس سے مشورہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے تو ہوتا رہے، کیا کر وہ؟ میں کوئی اس کا کاما نہیں ہوں"۔

رستم کے دیگر ساتھیوں نے بھی اس کی تائید کی اور مشورہ دینے والا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

دوسرے روز رستم نے اپنے ایک پڑھے لکھے ساتھی سے قاسم علی کے نام خط لکھوایا اور گھوڑے پر بیٹھ کر فتح پور کی طرف روانہ ہوگیا۔ پولیس کو مطلوب ہونے کی وجہ سے وہ شاہراہ عام ہٹ کر چل رہا تھا۔ سہ پہر کے وقت جب وہ فتح پور پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ جہانداد نے گزشتہ دو قتل اور کر دیئے ہیں۔ ایسے حالات میں قاسم علی کے گھر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ فتح پور میں اس کا ایک شناسا موجود تھا۔ وہ اس کی مدد حاصل کر سکتا تھا۔

قاسم علی کے گھر جانے کی بجائے وہ سیدھا اپنے جاننے والے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس کی اصلیت نہیں جانتا تھا اس لیے نہ صرف اس کی عزت کرتا تھا بلکہ خاطر تواضع میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد رستم فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔

"میں یہاں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوں"۔ رستم نے اس سے کہا۔ "دراصل میں کسی کا پیغام لایا ہوں اور مطلوبہ شخص تک یہ پیغام پہنچانے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"۔

"میری مدد کی؟" نواز نے متحیر انداز میں پوچھا۔ "مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ میں اس شخص کے لیے بالکل اجنبی ہوں"۔ رستم نے بتایا۔ "وہ شاید میری بات کو سنجیدگی سے نہ لے تاہم تمہاری بات پر ضرور اعتبار کرے گا"۔

"کون ہے وہ؟"

"قاسم علی"۔ وہ جیب سے خط نکالتے ہوئے بولا۔ "یہ خط اس تک پہنچانا ہے۔ ہو سکے تو پڑھ کر سنا دینا"۔

"یہ خط کہیں جہانداد کا تو نہیں ہے؟" نواز نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔ "میں کسی مصیبت میں پھنسنا نہیں چاہتا کیونکہ جہانداد ایک مفرور قاتل ہے"۔

"نہیں"۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ خط حاکم علی کا ہے اور......"

"وہ تمہیں کہاں مل گیا؟" نواز نے قطع کلامی کی۔ "اسے تو گم ہوئے کافی عرصہ ہوگیا"۔

"وہ گم نہیں ہوا بلکہ اسے اغوا کیا گیا ہے"۔



"تم...... تم یہ کیسی عجیب و غریب باتیں کر رہے ہو؟" نواز دوبارہ مشکوک ہوگیا۔ "کیا تمہارا تعلق ڈاکوؤں سے ہے؟"

"توبہ کرو یار"۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا میں تمہیں ڈاکو نظر آتا ہوں؟"

"تو پھر یہ سب کیا ہے؟" نواز نے الجھ کر پوچھا۔ "جب تک تم مجھے پوری بات نہیں بتاؤ گے میری الجھن دور نہیں ہوگی"۔

"میرے دوست! تمہارا مشکوک ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن خدا گواہ ہے کہ میں یہ کام نیکی سمجھ کر انجام دے رہا ہوں۔ مجھے یہ خط رحمان پورہ سے آگے جنگل میں ایک اجنبی شخص نے دیا ہے۔ میں نے خط لینے سے انکار کیا تو وہ مجھے مارنے پر تُل گیا۔ تب میں نے مجبوری کے عالم میں خط لے لیا۔ اس وقت میں نے یہ سوچا تھا کہ اس خط کو قاسم علی تک پہنچانے کی بجائے پھاڑ کر پھینک دوں گا حالانکہ خط دیتے وقت اس اجنبی شخص نے مجھے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں نے یہ کام نہ کیا تو وہ مجھے قتل کر دے گا مگر میں نے اس کی دھمکی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ بعد میں یہ خط میں نے ایک قابل اعتماد آدمی سے پڑھوایا تو پھینکنے کی بجائے یہاں لے کر آ گیا۔ کم از کم یہ خط پڑھ کر حاکم علی کے بھائی کو یہ اطمینان تو ہو جائے گا کہ اس کا بھائی زندہ ہے"۔ رستم نے بلا تردد اسے ایک من گھڑت کہانی سنا دی۔

"کیا میں یہ خط پڑھ سکتا ہوں؟" تفصیل سننے کے بعد نواز نے استفسار کیا۔

"ہاں...... شوق سے"۔ رستم نے جواب دیا۔ "بعد میں بھی تو تم نے پڑھنا ہے یہ خط"۔

نواز نے خط کھولا اور پڑھنے کے بعد بولا۔ "اس میں تو اغوا کاروں نے حاکم علی کی رہائی کے بدلے تاوان طلب کیا ہے، پچاس ہزار روپے۔ اتنی بڑی رقم قاسم علی کے پاس نہیں ہو سکتی"۔

"یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے"۔ وہ مطمئن انداز میں بولا۔ "یہ خط حاکم علی کی طرف سے ہے اور اس نے رقم کی ادائیگی پر زور دیا ہے۔ ہو سکتا ہے حاکم علی کی رقم بھائی کے پاس امانتاً رکھی ہوئی ہو؟ بہرکیف ہم نے خط پہنچانا ہے، آگے قاسم جانے اور اس کا کام"۔

"ٹھیک ہے میں خط پہنچا دیتا ہوں"۔ نواز نے رضامندی کا اظہار کیا اور رستم کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔

===

نواز کی زبانی خط سننے کے بعد قاسم علی کی پریشانی دوچند ہوگئی۔ پچاس ہزار روپے کی رقم اس نے کبھی ایک ساتھ خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ گو کہ اس کے پاس ایک ہفتے کی مہلت تھی مگر اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا اس کے لیے کارِ محال تھا۔ حاکم علی کے گھر میں نقدی کی صورت میں بمشکل پندرہ

ہزار روپیہ تھا بقیہ پینتیس ہزار ایک ہفتے کے اندر وہ کسی صورت میں بھی جمع نہیں کر سکتا تھا گھروں میں جو زیور تھا وہ بھی دس، بارہ ہزار روپے کی مالیت سے زیادہ نہیں تھا۔

اس نے بیوی اور بھابی سے مشورہ کیا مگر وہ دونوں بھی اس مسئلے کا کوئی حل نہیں بتا سوائے اس کے کہ دونوں گھروں کا زیور بیچ دیا جائے۔

''زیور کے بارے میں، میں تم سے پہلے سوچ چکا ہوں''۔ قاسم نے بے بس انداز ''وہ زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار روپے کا ہوگا''۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' حاکم علی کی بیوی فاطمہ نے بے چارگی کے عالم میں پوچھا۔ زیور کے ہمارے پاس کیا ہے، جسے بیچا جائے''۔

''ملک مراد سے قرض مانگ لیجئے''۔ اس کی بیوی نے مشورہ دیا۔ ''تھوڑے تھوڑے اسے لوٹا دیں گے''۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے خدیجہ؟'' وہ بھڑک اٹھا۔ ''ملک مراد ہمارے خون کا پیاسا تم اس سے قرض لینے کا سوچ رہی ہو۔ ہوسکتا ہے یہ اسی کا کیا دھرا ہو''۔

''کیوں ناں! پولیس کی مدد......''

''پاگلوں جیسی باتیں مت کرو''۔ اس نے درشت لہجے میں کہا اور خدیجہ کی بات ادھ گئی۔

''خط میں صاف لکھا ہے کہ اگر ہم پولیس کے پاس گئے تو حاکم کو قتل کر دیا جائے گا۔ صورت میں تاوان کی رقم کا انتظام کرنا ہوگا''۔

''بھائی صاحب! آپ حاکم کے حصے کی زمین بیچ دیں''۔ فاطمہ نے مداخلت کی۔ ''ا علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے''۔

''لیکن مطلوبہ رقم پھر بھی پوری نہیں ہوگی''۔ وہ ناامید انداز میں بولا۔ ''بارانی زمی سستی بکتی ہے اور گاہک بھی ملک مراد جیسا کوئی شخص ملے گا۔ ہماری مجبوری کو دیکھتے ہوئے قیمت لگائے گا''۔

''تو کیا اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے''۔ خدیجہ تیز لہجے میں بولی۔ ''تم کل م مراد سے بات کرو، اگر وہ قیمت کم لگائے تو اپنے حصے کی زمین کا بھی سودا کر دینا''۔

''رقم بہت زیادہ ہے خدیجہ''۔ اس نے افسردگی سے ایک آہ خارج کی۔ ''رب جا پوری ہوگی؟''

(جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت کے پچاس ہزار روپے آج کے تیس چالیس

مٹی کا کھیل (اوّل)

کے برابر ہوا کرتے تھے)

''میں جانتی ہوں کہ رقم بہت زیادہ ہے''۔ خدیجہ نے کہا۔ ''مگر پوری تو کرنی ہے ناں! حاکم کی زندگی کا سوال ہے۔ نہ جانے اس پر کیا گزر رہی ہوگی؟''

''ٹھیک ہے''۔ وہ رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''میں کل ہی ملک مراد سے زمین کے سودے کی بات کرتا ہوں۔ دعا کرنا کہ رقم پوری ہو جائے''۔

''خدا پر بھروسہ رکھو''۔ خدیجہ تسلی کے انداز میں بولی۔ ''وہ بڑا غفور الرحیم ہے''۔

دوسرے دن وہ صبح سویرے ہی ملک مراد کی حویلی میں پہنچ گیا۔ خلاف توقع ملک مراد اس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آیا تھا حالانکہ جہانداد نے کچھ روز پہلے ہی اس کے بھانجے کو قتل کیا تھا۔ ملک مراد نے جب اس کی آمد کا مقصد پوچھا تو وہ بلا تمہید بولا۔ ''ملک صاحب! میں اپنی زمین فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے رقم کی ضرورت ہے''۔

''کیا؟'' اس نے متحیر انداز میں پوچھا، شاید اسے قاسم علی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''تم......تم اپنی زمین بیچنا چاہتے ہو؟ لیکن کیوں؟''

''کیا یہ بتانا ضروری ہے؟'' وہ قدرے پریشان ہوگیا۔

''نہیں نہیں۔ میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا''۔ ملک مراد جلدی سے بولا۔ ''یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ تم اگر نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ''۔

''وہ دراصل ملک صاحب! جہانداد نے جو کچھ کیا ہے اس کے لیے کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے اور میرے پاس تو نقدی کی صورت میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اس لیے سوچا ہے کہ زمین ہی بیچ ڈالوں تاکہ ضرورت کے وقت کسی کے سامنے ہاتھ دراز نہ کرنا پڑے''۔ اس نے موقع کی مناسبت سے بہانہ گھڑ کر جواب دیا مگر ملک مراد جیسے گرگ باراں دیدہ کو اس کی بات کا یقین نہ آیا تاہم اس نے قاسم کو مزید کریدنا مناسب خیال نہ کیا۔

''ٹھیک سوچا ہے تم نے قاسم علی!'' اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے اسے قاسم کی بات کا یقین آ گیا ہو۔ ''بیٹے کی زندگی سے زمین قیمتی نہیں ہوسکتی۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ میں زمین خریدوں گا لیکن فی الحال......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''لیکن......کیا ملک صاحب؟'' قاسم نے بے تابی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں، چھوڑو اس بات کو''۔ وہ کسی خیال کے زیر اثر بولا۔ ''تم زمین کی قیمت لگاؤ''۔

''میں بھلا کیسے قیمت لگا سکتا ہوں۔ میں نے تو آج تک زمین کی خرید و فروخت کے متعلق سوچا بھی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کچھ اندازہ ہے''۔

"تو ٹھیک ہے"۔ ملک مراد فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔ "علاقے میں جو نرخ چل رہا ہے لیں گے۔ میں آج ہی پٹواری کو بلا کر بتادوں گا"۔

"کب تک کام ہو جائے گا ملک صاحب؟" اس نے اجازت طلب کرنے سے پہلے کیا۔

"کم از کم تین چار روز تو لگیں گے۔ بہر کیف تم فکر نہ کرو میں جلد ہی کام نمٹا لوں گا"۔

"اچھا ملک صاحب"۔ وہ چلتے چلتے بولا۔ "میں دو دنوں کے بعد آؤں گا"۔

قاسم علی کے جانے کے بعد ملک مراد نے اسی روز اپنے خاص آدمی شیرا کو بلوایا اور ساری بات بتا کر قاسم علی کے معمولات پر نظر رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں خاص بات کا پتا لگانا ہے کہ اسے اچانک زمین فروخت کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے؟ مجھے جو وجہ نے بتائی ہے وہ سچ نہیں لگتی۔ پس پردہ کوئی اور بات ہے جو وہ چھپانا چاہتا ہے"۔

"بہتر ملک صاحب! میں معلوم کرلوں گا"۔ شیرا نے جواب دیا۔ "آپ بے فکر ہو اب یہ میرا کام ہے۔ میں ابھی سے معلومات حاصل کرنا شروع کردوں گا"۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ"۔ ملک مراد بولا۔ "اور جلد سے جلد اصل معاملے کا پتا لگانے کی کرو"۔

ملک مراد کی اجازت پا کر شیرا رخصت ہو گیا اور ملک مراد سوچوں میں گم ہو گیا۔ اسے بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ قاسم علی جیسا شخص کیسے اپنی زمین بیچنے پر تیار ہو گیا ہے۔





جہانداد دوپہر کے وقت جنگل میں داخل ہوا اور سانول کے ڈیرے کی تلاش شروع کر دی۔ منور نے اسے محض اتنا ہی بتایا تھا کہ ڈیرا جنگل میں ہی کہیں واقع ہے۔ کیونکہ اس نے ڈیرا خود نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ جہانداد کو اس کا صحیح محلِ وقوع نہیں بتا سکتا تھا۔ یہ معلومات بھی اسے اپنے بھائی دلاور کی زبانی معلوم ہوئی تھیں۔

گھنے جنگل میں جہانداد دیر تک گھومتا رہا لیکن ڈیرا ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے پاس پانی اور کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں ورنہ شاید وہ اس تلاش سے اکتا کر واپس لوٹ جاتا۔ ظہر کے وقت اس نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پیٹ پوجا کی اور پھر پانی پینے کے بعد نئے سرے سے تلاش شروع کر دی۔ جنگل گھنا تھا اس لیے وہ گھوڑے کو دوڑانے کی بجائے آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔

اچانک ہی اسے ایک خیال آیا اور اس کا دل چاہا کہ اپنی عقل کا ماتم شروع کر دے۔ بالکل سامنے کی بات تھی۔ اسے جنگل میں احمقوں کی طرح گھومنے کی بجائے پگڈنڈی نما راستے تلاش کرنے چاہئے تھے۔ اس طرح کوئی نہ کوئی راستہ اسے منزلِ مقصود تک لے جا سکتا تھا۔ اس نے فوراً اپنی عقل کو کوسا اور پھر ایک پگڈنڈی ڈھونڈ کر گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ کافی آگے جا کر راستہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک سیدھا آگے جا رہا تھا جبکہ دوسرا بائیں ہاتھ مغرب کی جانب مڑ گیا تھا۔

اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور گھوڑے کو مغربی راستے پر ڈال دیا۔ تقریباً ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد معاً اس کی نظریں ایک آدمی پر پڑیں اور اس نے جلدی سے گھوڑے کو جھاڑیوں کی آڑ میں کر لیا۔ اب وہ اس آدمی کی نگاہوں سے بالکل محفوظ تھا تاہم جہانداد با آسانی اس پر نظر رکھ سکتا تھا۔ وہ سیدھا اسی راستے پر چلا آ رہا تھا جس کے نزدیک جہانداد چھپا ہوا تھا۔ جہانداد نے جلدی سے گھوڑے کو جھاڑی کے ساتھ باندھا اور اسے چھاپنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کندھے سے لٹکی ہوئی رائفل اسے مشکوک بنا رہی تھی۔ جوں جوں وہ قریب آ رہا تھا جہانداد کے اعصاب تنے جا رہے تھے۔ ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ وہ بالکل چوکس تھا لیکن پھر

اچانک ہی وہ آدمی راستہ چھوڑ کر دائیں ہاتھ مڑ گیا۔

اسے مڑتے دیکھ کر جہانداد اپنی جگہ سے اٹھا اور جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا تعاقب میں چل پڑا۔ اسے پکڑنے کا ارادہ اب اس نے ملتوی کر دیا تھا۔ اس لیے بڑی احتیاط ساتھ تعاقب کر رہا تھا۔ وہ آدمی تعاقب سے بے خبر مطمئن انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ تق ڈھائی فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جہانداد کو قدرے اونچی جگہ پر واقع درختوں میں ایک عمارت نظر آنے لگی۔ آگے جانے والے کا رخ سیدھا عمارت کی طرف تھا۔ جہانداد تعاقب چھوڑ کر دوسری جانب سے محتاط انداز میں عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔

گھنی جھاڑیوں میں سے گزرتا ہوا وہ بالکل عمارت کے نزدیک پہنچ گیا۔ چند کمروں پر یہ عمارت پتھروں کو کاٹ کر تعمیر کی گئی تھی۔ چار دیواری بنانے کی شاید ضرورت ہی محسوس نہیں تھی البتہ عمارت کے اردگرد کی جھاڑیاں اور درخت قدرتی طور پر چار دیواری کا کام دے رہے تھے۔ جہانداد ایک جھاڑی کے پیچھے دبکا سامنے نظر رکھے ہوئے تھے۔ ابھی تک کوئی شخص بھی کے سامنے نہیں آیا تھا تاہم کمروں کے سامنے کھلی جگہ پر چند چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چارپا کے عین درمیان لکڑی کی ایک بھاری میز پڑی ہوئی تھی جس پر چائے کے کپ اور سلور کا ایک بڑ گلاس موجود تھا۔

جس شخص کا تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچا تھا وہ شاید اس کے پہنچنے سے پہلے ہی کمرے میں جا چکا تھا کیونکہ طویل چکر کاٹتے ہوئے اسے کافی ٹائم لگا تھا جبکہ وہ شخص سیدھے راستے سے عمارت میں داخل ہوا تھا۔ بہرکیف وہ کسی کے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔

انتظار کرتے ہوئے اسے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ یکا یک ایک کمرے سے چار آدمی اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے چارپائیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ان چاروں میں سے ایک وہ جس کا اس نے تعاقب کیا تھا۔ وہ کافی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو با جہانداد کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ موضوعِ گفتگو سانول کے کارنامے اور اچانک قتل ہو جانا تھوڑی دیر کے بعد ان کی باتوں کا رخ حاکم علی کی طرف ہو گیا اور جہانداد ایک دم چوکنا ہو گیا۔

''پچاس ہزار بہت بڑی رقم ہے''۔ ان میں سے کوئی ایک کہہ رہا تھا۔ ''قاسم علی شاید ادا سکے''۔

''کرے گا کیسے نہیں''۔ دوسرے نے قہقہہ لگایا۔ ''کیا اسے بھائی کی زندگی عزیز نہیں میں نے اسے صرف ایک ہفتے کی مہلت دی ہے اور تین دن گزر گئے ہیں''۔

''اگر ملک مراد کو اس معاملے کی بھنک پڑ گئی تو وہ جوابی کارروائی ضرور کرے گا''۔ پہلے



اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''تم سب بزدل ہو بزدل''۔ اس نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔ ''میرا نام رستم ہے۔ میں نے ملک مراد جیسے کئی پھنے خان سیدھے کیے ہیں۔ اس نے اگر میرے کام میں مداخلت کی تو میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ اس کی نسلیں یاد رکھیں گے''۔

جہانداد کو مزید کچھ بھی سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمام صورتِ حال اس پر روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی تھی۔ وہ حاکم علی کے بدلے تاوان کی رقم وصول کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی پورے پچاس ہزار روپے۔ اسے غصہ تو بہت آیا لیکن وہ ضبط کر گیا۔ یہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا وقت تھا۔ اس کی ذرا سی بے احتیاطی اس کی جان لے سکتی تھی۔ وہ نہ صرف ان کی تعداد کے بارے میں لاعلم تھا بلکہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ حاکم علی کو کون سے کمرے میں رکھا گیا ہے، تہہ خانے کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ڈاکو تھے اور ڈاکو ایسے خفیہ ٹھکانے بڑے شوق سے بناتے ہیں۔ وہ واپس پلٹا اور حتی المقدور محتاط انداز میں چلتا ہوا بندھے ہوئے گھوڑے تک پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اسے گھوڑے کو کسی محفوظ جگہ پر باندھنا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ حاکم علی کو چھڑانے کے لیے کوئی لائحہ عمل بنا سکتا تھا۔ اس نے پانی پیا اور گھوڑے کو کھول کر ڈیرے کی مخالف سمت روانہ ہو گیا۔ ایک مناسب اور محفوظ جگہ دیکھ کر اس نے گھوڑے کو باندھا اور ہتھیار وغیرہ چیک کرنے کے بعد دوبارہ ڈیرے کی طرف چل دیا۔

جب وہ دوبارہ پہلے والی جگہ پر پہنچا تو چارپائیاں خالی پڑی ہوئی تھیں، شاید وہ کمروں میں جا چکے تھے۔ اس کا دماغ تیزی سے صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ وہ کوئی بے داغ منصوبہ سوچنا چاہتا تھا، ایک ایسا منصوبہ جس میں ناکامی کا شبہ تک نہ ہو۔

''کاش ان کا کوئی آدمی ڈیرے سے نکل کر جنگل کی طرف جائے تو میرا کام آسان ہو سکتا ہے''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا کمروں کے عقبی جانب بڑھ گیا۔ کمروں کے عقبی جانب بہت گھنی جھاڑیاں تھیں۔ کسی کھڑکی کی تلاش میں وہ تھوڑی دیر تک کمروں کے عقب میں محتاط انداز میں پھرتا رہا لیکن وہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی البتہ آخری کمرے میں ایک گول روزن موجود تھا۔ روزن کے عین سامنے ایک گھنا درخت تھا جس کی شاخیں روزن تک پھیلی ہوئی تھیں۔ درخت پر چڑھ کر وہ با آسانی روزن سے کمرے کے اندر جھانک سکتا تھا مگر کام ضرورت سے زیادہ خطرناک تھا۔

چند لمحے گومگو کے عالم میں وہ درخت کے نیچے کھڑا رہا۔ کوشش کے باوجود وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ تھک کر وہ واپس پلٹنے ہی لگا کہ اچانک ایک خیال کے تحت وہ اللہ کا نام لے کر درخت

پر چڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے کمرے کے اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بارآور ثابت سکی۔ اس کا اور روزن کا درمیانی فاصلہ بمشکل چودہ پندرہ فٹ کے برابر تھا تاہم ایک موٹی سی سہارا لے کر یہ فاصلہ مزید کم کیا جا سکتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس نے منتخب شاخ کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور پھر آہستہ آہستہ کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ شاخ اس کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی اور اس کا دل پہلو پارے کی طرح تڑپ رہا تھا مگر وہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر چکا تھا، اس لیے لحہ بہ لحہ آگے رہا تھا۔ روزن کے قریب پہنچتے ہی اس نے اندر جھانکا تو بے اختیار اس کی آنکھیں چمک اٹھیں کمرے کے عین درمیان میں حاکم علی بیٹھا ہوا تھا۔ روزن کی طرف اس کی پشت تھی لیکن روشنی میں اسے پہچاننا جہانداد کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ روزن میں فولادی جنگلا لگا ہوا تھا اکھاڑنا ناممکن تھا۔ ویسے بھی روزن بہت چھوٹا تھا۔ بالفرض اگر اس میں جنگلا نہ بھی لگا ہوتا اس میں سے کسی انسان کا گزرنا محال تھا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ تیزی سے درخت کے تنے کی طرف مگر بدقسمتی سے شاخ دہری ہو کر ''تڑاخ'' کی آواز پیدا کرتے ہوئے ٹوٹ گئی۔ چشم زدن میں نیچے گرا اور سنبھلنے سے پہلے ہی لڑھکنیاں کھاتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اس ڈھلوانی سطح اسے کھڑے ہونے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ وہ سیدھا نشیب میں جا کر گرا تھا۔ خوش قسمتی اسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی سوائے معمولی سی خراشوں کے ہتھیار بھی گرنے سے محفوظ تھے۔

سنبھلتے ہی اس کی سماعتوں سے دوڑنے اور باتیں کرنے کی مختلف آوازیں ٹکرائیں اٹھ کر بھاگنے لگا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ عمارت کے عقبی جانب جنگل ضرورت سے زیادہ گھنا مخالف سمت میں دوڑتا ہوا وہ ڈیرے سے کافی دور نکل گیا۔

===

کمرے کے عقب میں شاخ ٹوٹنے کی آواز دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے پہریدار نے واضح طور پر سن لی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور دروازے کو باہر سے تالا لگانے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دے کر بلانے لگا۔ آن کی آن میں چار آدمی صورتِ حال سمجھنے کمروں کے عقب میں پہنچ گئے۔ ٹوٹی ہوئی شاخ درخت کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔

''درخت پر ضرور کوئی آدمی تھا''۔ ٹوٹی ہوئی شاخ کو دیکھ کر ان میں سے ایک بولا۔ '' کہیں ہو گا چلو اسے تلاش کرتے ہیں''۔



دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاروں ڈھلوان سطح سے نیچے اتر کر جنگل میں پھیل گئے۔ مسلح ہونے کے باوجود وہ چاروں محتاط انداز میں ایک ایک جھاڑی کو چیک کرتے جا رہے تھے مگر وہ جو کوئی بھی تھا غائب ہو چکا تھا۔ دو اڑھائی گھنٹے جنگل میں خوار ہونے کے بعد جب سورج ڈوبنے لگا تو وہ چاروں اپنی ناکامی پر جھلاتے ہوئے واپس ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

جہانداد ان چاروں سے چھپتا چھپاتا دوبارہ اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی لہٰذا سب سے پہلے اس نے اپنی پیاس بجھائی اور پھر وہیں ایک صاف جگہ پر آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ اب اسے جو کچھ بھی کرنا تھا وہ نصف شب کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ اب تک کی جدوجہد میں اسے فائدے کے ساتھ ساتھ نقصان بھی ہوا تھا۔ فائدہ یہ تھا کہ اس نے وہ کمرا دیکھ لیا جہاں حاکم علی کو رکھا گیا تھا اور نقصان یہ ہوا تھا کہ اس کی ذرا سی غفلت نے ڈاکوؤں کو ہوشیار کر دیا تھا۔ ہوشیار ہونے کے بعد وہ حاکم علی کو کہیں اور بھی منتقل کر سکتے تھے۔

اس کا دماغ انہی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد اس نے گھوڑے کی خرجین سے کھانے کی چند چیزیں نکال کر پیٹ کی آگ کو سرد کیا اور پانی پینے کے بعد دوبارہ لیٹ گیا۔ یوں ہی لیٹے لیٹے جب بہت سا وقت گزر گیا تو اس پر نیند حملے کرنے لگی تب وہ اٹھ کر بیٹھ گیا کہ نیند سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

صاف وشفاف آسمان پر ستارے برقی قمقموں کے مانند ٹمٹما رہے تھے۔ ابتدائی تاریخوں کا چاند کب کا ڈوب چکا تھا۔ جنگل کے خاموش ماحول میں جھینگروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ یونہی ہی بیٹھے بیٹھے اس نے ایک نظر آسمان پر ڈالی اور وقت کا اندازہ لگانے کے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ ایک بار پھر ڈاکوؤں کے ڈیرے کی طرف تھا۔ احتیاط سے کام لیتے ہوئے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ ڈیرے کے نزدیک پہنچ گیا۔ ہر سُو گہری خاموشی طاری تھی۔ آسمان شفاف ہونے کی وجہ سے اندھیرا معمول سے کم تھا۔ ویسے بھی اتنی دیر تک اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں تاریکی میں دور تک دیکھ سکتی تھیں۔

خنجر نکال کر اس نے ہاتھ میں لیا اور دبے پاؤں جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ حاکم علی اگر اسی کمرے میں ہوا تو اس کے سامنے مسلح پہرے دار ضرور ٹہل رہے ہوں گے۔ ذرا دیر کے بعد جب اس نے جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو اس کے یقین کی تصدیق ہو گئی۔ واقعی مطلوبہ کمرے کے سامنے دو مسلح پہریدار ٹہل رہے تھے۔ ان سے نظریں ہٹا کر اس نے دوسرے کمروں کی طرف دیکھا مگر وہاں مکمل سکوت تھا اسے کسی قسم کی بھی تحریک نظر نہیں آ رہی تھی۔ یقیناً دوسرے لوگ کمروں میں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔

یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا اور وہ کسی صورت میں اسے ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ جھاڑیوں کی آڑ لے کر وہ دبے پاؤں پہریداروں کی طرف بڑھنے لگا۔ دونوں پہریدار اس کی موجودگی سے بے خبر اطمینان سے ٹہل رہے تھے۔ تاہم ان کے انداز میں کافی مستعدی پائی جاتی تھی، شاید دن والے واقعے کے بعد ان کے سردار نے انہیں خصوصی ہدایات دی تھیں تبھی تو وہ وقفے وقفے سے دوسرے کمروں کے سامنے سے بھی چکر لگا لیتے تھے۔

یہ جہانداد کی خوش قسمتی تھی کہ پہریدار ایک دوسرے کی مخالف سمت میں ٹہل رہے تھے اس لیے ٹہلتے ہوئے ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ جاتا تھا۔ جہانداد ان کی نگاہوں سے بچتا ہوا اس کمرے کی سائیڈ میں پہنچ گیا جہاں حاکم علی کو رکھا گیا تھا۔ خنجر کو اس نے مضبوطی سے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ چاروں کمرے ایک سیدھ میں واقع تھے اور جہانداد کونے والے کمرے کی سائیڈ میں گھات لگائے ہوئے کھڑا تھا۔

جونہی ایک پہریدار اس کمرے کے آخری کنارے تک پہنچ کر واپس پلٹا۔ جہانداد کے اعصاب یکدم تن گئے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کسی چیتے کی طرح عقب سے جست لگا کر پہریدار کو گردن سے دبوچ کر پلک جھپکنے کی دیر میں اس کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ یہ کام اس نے اتنی صفائی کے ساتھ انجام دیا تھا کہ ایک ہلکی سی خرخراہٹ کے علاوہ پہریدار کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے تیزی سے پہریدار کے تڑپتے ہوئے وجود کو ایک سائیڈ میں پھینکا اور پھر اس کے دوسرے ساتھی کا انتظار کرنے لگا۔

دوسرا پہریدار مخالف سمت میں آخری کنارے تک پہنچ کر واپس پلٹا تو اس نے اپنے ساتھی کو غائب پایا۔ ایک لمحے کے لیے اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا مگر پھر کسی خیال کے تحت وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر اونچی آواز میں بولا۔ ”اوئے نذیرے! کہاں مر گیا ہے، کیا تجھے پیشاب آ گیا ہے؟ بدبخت پانی کم پیا کرناں؟“

اس کی آواز سن کر جہانداد نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی اور پھر اسے جہنم رسید کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کمرے کے عین سامنے پہنچ کر پہریدار ایک دم رک گیا۔ جہانداد کا دل بے اختیار پسلیوں کے پنجرے میں اچھلنے لگا۔ پہریدار اگر ڈر کر شور مچا دیتا تو اس کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

پہریدار چند لمحے کمرے کے سامنے کھڑا رہا مگر جب اس کا ساتھی سامنے نہ آیا تو وہ جھنجھلا کر کمرے کی سائیڈ کی طرف بڑھا۔ ”شاید تیرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے ہیں۔ حرامی تو کھاتا بھی بہت زیادہ ہے ناں! چل جلدی.....“



آخری الفاظ ادا کرنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ جہانداد نے بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ایک ہاتھ اس کے منہ پر جمایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اس کی گردن پر رکھ کر چشم زدن میں اسے ذبح کر ڈالا۔ چند لمحے پہریدار کا جسم اس کے بازوؤں میں تڑپتا رہا۔ اس کی گردن سے ابلنے والا گرم گرم خون جہانداد کے ہاتھ اور بازو رنگین کرتا چلا گیا لیکن شاید اسے اس بات کی پرواہ ہی نہیں تھی۔

جب پہریدار کا جسم ساکت ہو گیا تو اس نے اسے نیچے لٹا دیا اور تیزی سے اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس کی جیبوں میں سگریٹ اور ماچس کی ڈبیہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ تب وہ دوسرے پہریدار کی لاش کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی جیب میں چابیاں موجود تھیں۔ چابیاں نکال کر وہ تقریباً بھاگتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔

پہلی چابی تالے میں نہ لگی تو اس نے دوسری کو آزمایا لیکن تالا تیسری چابی سے کھلا۔ کنڈی کھول کر وہ تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہوا مگر تاریکی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ حاکم علی کو پکارتا اسے ایک خوابیدہ آواز سنائی دی۔ ”کک.....کون ہے؟“

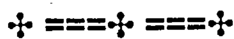
”چاچا! آہستہ بولو میں جہانداد ہوں“۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ”چلو اٹھو میں تمہیں لینے آیا ہوں“۔

”تم.....تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ اس نے خوشی کے عالم میں استفسار کیا۔ ”یہ جنگل تو ہمارے گاؤں سے بہت دور ہے“۔

”یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ جلدی کرو اگر وہ لوگ جاگ گئے تو دونوں مارے جائیں گے“۔ جہانداد تیز لہجے میں بولا۔ ”لو یہ رائفل پکڑ لو“۔

حاکم علی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے رائفل تھام لی۔ ”چلو نکلو لیکن ذرا دیکھ بھال کر یہ لوگ بہت ظالم.....“

اچانک دروازے کے عین سامنے کسی کے قدموں کی چاپ ابھری اور حاکم علی کی بات ادھوری رہ گئی۔



دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ان دونوں کے قدم رک گئے۔ جہانداد نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ریوالور نکالا اور کھلے ہوئے دروازے کے پیچھے دبک کر کھڑا ہو گیا۔ ان سنسنی خیز لمحات میں اس کا دل پہلو میں اچھل رہا تھا۔ باہر جو کوئی بھی تھا کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو جگا سکتا تھا اور پھر کھیل کا پانسا پلٹتے دیر نہیں لگتی تھی۔ وہ دونوں کسی طرح بھی اتنے

سارے آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ قدموں کی چاپ بالکل کمرے کے سامنے پہنچ کر گئی۔

''اوئے نذیرے، اوئے طیفے!'' دروازے کے عین سامنے ایک تیز آواز گونجی۔ ''تم دونوں کیا اپنی ماں کے خصم کو لوریاں سنا رہے ہو؟ کتے کے بچو باہر نکلو''۔

آواز پہچاننے میں جہانداد کو ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگی تھی۔ یہ ان ڈاکوؤں کے سردار کی آواز تھی۔ دن کے وقت اس نے قریب سے یہ آواز سنی تھی۔

رستم نے ایک لمحہ انتظار کیا لیکن کوئی بھی باہر نہ آیا تو وہ غصے میں تاؤ کھاتا ہوا کمرے کے داخل ہو گیا۔ کواڑ کے پیچھے چھپے ہوئے جہانداد نے چیتے کی طرح جست لگاتے ہوئے ایک اس کی گردن میں حمائل کر دیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کی سرد نال اس کی سے لگا دی۔

''خبردار''۔ وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''اگر آواز نکالی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا''۔

''مم...... میں......'' رستم نے کانپتی ہوئی آواز میں کچھ کہنے کی کوشش مگر اس کی آواز سینے گھٹ کر رہ گئی۔

''کمرے سے باہر نکلو''۔ جہانداد اسے دروازے کی طرف گھماتے ہوئے بولا۔ '' چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ میری انگلی ٹریگر پر رکھی ہے۔ تمہاری ذراسی حرکت تمہیں زند کی قید سے آزاد کر دے گی''۔

''مم...... میں...... کوئی حرکت...... نہیں کروں گا''۔ رستم لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بو ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ ''گو...... گولی۔ مت چلانا''۔

ایک لمحے کے بعد وہ تینوں کمرے سے باہر صحن میں آ گئے۔ جہانداد کا ریوالور بدستور رستم کنپٹی سے لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں لیکن رات کا اندھیرا ہونے کی وجہ جہانداد اور حاکم علی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھے۔

''ہمیں ایک گھوڑا چاہئے''۔ صحن میں پہنچتے ہی جہانداد رستم سے مخاطب ہوا۔ ''تم لوگوں گھوڑے کس کمرے میں ہیں؟''

''در...... درمیان والے کمرے میں ہیں''۔ اس نے بدستور کانپتی ہوئی آواز میں جو دیا۔

''گھوڑوں کے پاس تمہارا کوئی ساتھی تو نہیں سویا ہوا؟'' جہانداد نے استفسار کیا۔

''نن...... نہیں...... لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔



''لیکن کیا؟'' جہانداد نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر دباتے ہوئے پوچھا۔ ''کہیں تم کوئی چالاکی کرنے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟''

''یہ بات...... نہیں ہے...... دراصل میں نذیرے اور طیفے......''

''ان کی فکر چھوڑو''۔ جہانداد نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دونوں اب اس دنیا میں نہیں رہے البتہ تم اپنی فکر کرو، اگر تم نے ذراسی بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میں بلا جھجک گولی چلا دوں گا۔ اس لیے اپنے ساتھیوں کو جگانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں''۔

''میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا''۔ رستم سنبھل کر بولا۔ ''مگر خدا کے لیے...... مجھے مت مارنا''۔

''مجھے خون ریزی کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ ''تاہم تمہارے ساتھیوں کو میں نے مجبوری کے عالم میں قتل کیا ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا''۔

اتنا کہہ کر وہ حاکم علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''چچا! میں اسے سنبھالتا ہوں، آپ کمرے سے ایک گھوڑا کھول کر لے آئیں''۔

حاکم علی بلا جھجک گھوڑوں والے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک گھوڑے کی لگام تھامے کمرے سے نکلا اور ان کے پاس پہنچ کر جہانداد سے بولا۔ ''اسے پکڑو میں دوسرا گھوڑا لے آؤں''۔

''دوسرا گھوڑا لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا گھوڑا یہاں سے تھوڑی دور جنگل میں موجود ہے''۔

اتنا کہہ کر وہ رستم سے مخاطب ہوا۔ ''چلو ہم تمہیں وہاں پہنچ کر چھوڑ دیں گے''۔

''نن...... نہیں...... تم مجھے قتل کر دو گے''۔ وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''میں یہاں سے...... نہیں جاؤں گا''۔

''تو ٹھیک ہے''۔ جہانداد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں یہیں تمہیں ٹھکانے لگا دیتا ہوں''۔

''مم...... میں چلنے کے لیے تیار ہوں''۔ وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ ''لیکن وعدہ کرو مجھے چھوڑ دو گے؟''

جہانداد نے وقت ضائع کرنے کی بجائے اس سے وعدہ کیا اور پھر وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ جہانداد نے اپنا گھوڑا کھولا اور پھر رستم سے کہا۔ ''میں اگر چاہوں تو تمہیں مار کر اس جنگل میں چیل کوؤں کی خوراک بننے کے لیے پھینک سکتا ہوں۔ پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہوں۔ مگر میں تمہیں چھوڑنے کا وعدہ کر چکا ہوں

اور مرد کبھی اپنے وعدے سے نہیں پھرتا۔ اس لیے تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن میری ایک بات کھول کر سن لو، میری اور ملک مراد کی لڑائی میں اگر تم نے ملک مراد کا آلہ کار بننے کی کوشش کی تو تمہیں ایسی عبرت ناک موت ماروں گا کہ لوگ مثالیں دیا کریں گے''۔

اس کے بعد وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور پھر رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔ رنگو لمحے وہیں حیران و پریشان کھڑا رہا اور پھر مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا واپس اپنے ڈیرے کی طرف چل دیا۔ اذانِ سحر کے وقت جہانداد اور حاکم علی رحمان پورہ گاؤں میں نصیر کے ہاں پہنچ گئے جہانداد اتنا زیادہ تھکا ہوا تھا کہ جاتے ہی سو گیا۔ البتہ حاکم علی نصیر کو اپنی سرگزشت سنانے بیٹھ گیا نصیر پوری دلچسپی کے ساتھ اس کی کہانی سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد نصیر کی بیوی چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے حاکم علی خاموش ہو گیا لیکن اس کے جانے کے بعد دوبارہ وہیں شروع ہو گیا جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔

جہانداد اس روز دن چڑھے جاگا تھا۔ غسل کرنے کے بعد اس نے ناشتہ کیا اور پھر اس کمرے تک پہنچ گیا جسے نصیر نشست گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کمرے میں نصیر اور حاکم علی موجود تھے۔ حاکم علی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی وہ حالات سے لاعلم ہے لیکن وہ دیر تک اسے حالات سے بے خبر نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے بلاتردد زینب کے قتل سے لے کر اب تک کے تمام حالات اسے تفصیل کے ساتھ بتا دیے۔

حاکم علی نے تمام واقعات سن کر بالکل غیر متوقع طور پر صبر کا مظاہرہ کیا۔ تاہم جب وہ بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''مجھے پہلے سے کچھ کچھ اندازہ تھا''۔ وہ اداس انداز میں بولا۔ ''کہ میری زینب افضل جیسے درندے کے ہاتھوں کسی دن جان سے جائے گی تاہم مجھے یہ افسوس زندگی بھر رہے گا کہ میں اس کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے تڑپا تڑپا کر نہ مار سکا''۔

''لیکن مجھے زینب پر ہمیشہ فخر رہے گا''۔ جہانداد نے کہا۔ ''اس نے بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک لڑکی کے لیے عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اگر اپنی جان خود نہ لیتی تو وہ درندے اسے منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑتے''۔

''ملک مراد کو یہ دشمنی مہنگی پڑے گی۔ میں اسے گھر میں گھس کر ماروں گا''۔ حاکم علی تیور بدل کر بولا۔ ''اب یا وہ زندہ رہے گا یا پھر میں''۔

''آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے''۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''ملک مراد کے لیے ایک میں ہی کافی ہوں۔ آپ فی الفور اباجی کے پاس پہنچنے کی کوشش کریں وہ بہت پریشان ہوں



گے''۔

''اور تم کہاں جاؤ گے؟'' حاکم نے استفسار کیا۔

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرکیف جلد ہی یہاں سے کہیں اور نکل جاؤں گا''۔

''تم گرفتاری کیوں نہیں دے دیتے؟'' اچانک نصیر سوالیہ انداز میں بولا۔ ''یوں کب تک پولیس سے چھپتے پھرو گے کیا ساری زندگی مفرور بن کر بسر کرنے کا ارادہ ہے؟''

''میں تین قتل کر چکا ہوں ماموں!'' جہانداد نے جواباً کہا۔ ''جانتا ہوں کہ قانون مجھ سے کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ اس لیے میں گرفتاری کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا''۔

''تمہارے خلاف ایک بھی چشم دید گواہ موجود نہیں ہے''۔ نصیر نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ تمہیں چند سالوں کی قید ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوگا''۔

''اتنا تو میں بھی جانتا ہوں ماموں! لیکن شاید آپ کو نہیں معلوم کہ میرے جیل چلے جانے کے بعد ملک مراد کو کھل کر کھیلنے کا موقع مل جائے گا''۔

حاکم علی ایک آہ خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک انسان حرص و لالچ میں کیا اس قدر گر سکتا ہے کہ اپنے پرائے کی پہچان کھو بیٹھے۔ ملک مراد نے محض تھوڑی سی زمین حاصل کرنے کے لیے نہ صرف اپنی سگی بہن کا گھر اجاڑ دیا بلکہ ہمیں بھی دربدر کر دیا ہے۔ گاؤں کے کتنے لوگوں سے وہ زمینیں ہتھیا چکا ہے۔ کل تک جو لوگ بڑے فخر کے ساتھ اپنی زمینیں کاشت کیا کرتے تھے آج اس کی زمینوں پر مزارعے بنے ہوئے ہیں''۔

''چچا! سیانے کہتے ہیں کہ لالچ کی کوئی حد نہیں ہوتی''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''حتیٰ کہ انسان کو موت آ جاتی ہے تب اسے معلوم ہوتا کہ جس مٹی کی خاطر وہ زندگی بھر اپنے ہی جیسے انسانوں کے لہو سے ہولی کھیلتا رہا ہے۔ وہ مٹی تو اس کی کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ تو وہیں رہ گئی ہے اور اب کسی اور کی ملکیت کہلائے گی''۔

اس کے بعد حاکم علی فتح پور جانے کے لیے تیار ہو گیا اور جہانداد ایک دن مزید نصیر ماموں کے ہاں ٹھہر گیا تاہم اس نے دوسرے دن علی الصبح جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

✣ ===✣ ===✣

یکے بعد دیگرے ہونے والے چار قتلوں نے انسپکٹر صادق حسین کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اوپر سے ملک مراد کے اثر و رسوخ نے اس کا تھانے میں بیٹھنا دوبھر کر رکھا تھا۔ افسرانِ بالا نے اسے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر وہ قاتل کو تلاش کر کے زندہ یا مردہ قانون کے سامنے پیش کرے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جہانداد نے یہ قتل انتہائی مجبوری کے عالم میں سیلف

ڈیفنس کے طور پر کیے ہیں جبکہ سارا قصور ملک مراد کا ہے لیکن اس کا کام قاتل کو گرفتار کر کے سامنے پیش کرنا تھا۔ کون گناہ گار ہے اور کون مجرم؟ اس کا فیصلہ عدالت نے کرنا تھا۔

دفتر میں بیٹھے ہوئے اسے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ تھانے کے احاطے میں ایک کار رک گئی۔ دوسرے ہی لمحے ملک مراد اپنے دو مسلح باڈی گارڈز کے ساتھ جیپ سے اترا بھرے انداز میں چلتا ہوا دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ دفتر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے محافظوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔

"السلام علیکم انسپکٹر صاحب"۔ اس نے اونچی آواز میں سلام کرتے ہوئے کہا۔ "مخل تو نہیں ہو رہا ہوں؟"

"تشریف رکھیے"۔ انسپکٹر صادق نے سنجیدگی سے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے کہا۔ "میں ذرا یہ کام نمٹا لوں پھر......"

"تمہارے کام نمٹانے تک جہانداد وہاں سے نکل جائے گا"۔ ملک مراد نے قطع کلام

"وہ اس وقت رحمان پورہ میں موجود ہے۔ اگر تم تھوڑی سی تکلیف گوارہ کر لو تو وہ باآسانی سکتا ہے"۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" اس نے ایک دم چونک کر استفسار کیا۔ "کہ جہانداد رحمان میں موجود ہے؟"

"میرے اپنے ذرائع ہیں"۔ وہ فخریہ انداز میں گویا ہوا۔ "وہ گزشتہ رات وہاں پہنچا اب تک وہیں ہے، یہ مصدقہ اطلاع ہے"۔

ملک مراد کی بات سن کر وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "اگر یہ سچ ہے تو پھر آج وہ نہیں بچ" اتنا کہہ کر وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ خوش قسمتی سے چند روز پہلے ہی اس دیہاتی تھانے کو ایک جیپ ملی تھی ورنہ اس سے قبل تو وہ مجرموں کے تعاقب میں گھوڑے ہی دوڑاتے رہتے تھے۔

آن کی آن میں اس نے چند سپاہی ساتھ لیے اور جیپ پر سوار ہو کر رحمان پورہ کی روانہ ہوگیا۔ ملک مراد نے اسے بتا دیا تھا کہ جہانداد وہاں نصیر نامی شخص کے ہاں ٹھہرا ہوا رشتے میں اس کا ماموں لگتا ہے۔ دن کے تقریباً بارہ بجے ان کی جیپ رحمان پورہ میں داخل پھر ایک آدمی کی رہنمائی میں نصیر کے دروازے تک پہنچ گئی۔ جیپ روک کر وہ تیزی سے اور سروس ریوالور نکال کر ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چاروں سپاہی بھی سنبھال کر اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے اندر داخل ہونے کے لیے دروازے کو دھکیلا



اندر سے بند تھا۔ دروازہ کھٹکھٹا کر وہ مجرم کو ہوشیار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے ایک قد آور سپاہی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "سلیمان! تم ایسا کرو کہ دیوار سے اندر کود کر دروازہ کھول دو مگر احتیاط سے کام لینا وہ چار آدمیوں کا خون کر چکا ہے"۔

"بہت بہتر سر!" سلیمان تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا اور پھر اپنے ساتھیوں کی مدد سے دیوار کے اوپر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ ہلکی سی "دھپ" کی آواز گونجی لیکن دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے صحن میں گھر کا کوئی بھی آدمی موجود نہیں تھا اس لیے کوئی بھی اسے نہ دیکھ سکا۔ وہ رائفل سنبھال کر جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کھولتے ہوئے اسے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگی تھی۔

انسپکٹر ریوالور تھامے ہوئے تقریباً دوڑنے کے انداز میں اندر داخل ہوا اور پھر ایک سپاہی کو دروازے پر رکنے کا حکم دیتے ہوئے بقیہ تین سپاہیوں سے بولا۔ "سنو! اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دینا مگر اسے فرار نہ ہونے دینا"۔

"یس سر"۔ کہتے ہوئے تینوں سپاہی اس کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ وہ چاروں بلی کی طرح دبے پاؤں چل رہے تھے۔ انسپکٹر صادق بہت پُرجوش نظر آ رہا تھا اور کسی چیتے کے مانند اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے بے تاب تھا۔ برآمدے میں پہنچتے ہی اس نے تینوں سپاہیوں کو پوزیشن لینے کا اشارہ کیا اور پھر اونچی آواز میں بولا۔ "جہانداد! تم اس وقت پولیس کے گھیرے میں ہو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ہتھیار ڈال کر خود کو قانون کے حوالے کر دو ورنہ مارے جاؤ گے"۔

جہانداد کونے والے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ انسپکٹر کی آواز سنتے ہی وہ بستر سے چھلانگ لگا کر اٹھا اور پھر رائفل اور ریوالور سنبھال کر کمرے کے کونے والی کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ یہ کھڑکی بائیں جانب بالکل ڈیوڑھی کی سیدھ میں واقع تھی۔ یہاں سے ڈیوڑھی کا دروازہ صاف دکھائی دیتا تھا لیکن برآمدہ اوجھل تھا۔ بند کھڑکی کے پیچھے کھڑے ہوئے اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ صورت حال غیر متوقع طور پر اس کے لیے خطرناک ہوگئی تھی۔ وہ اس کمرے میں محصور تھا اور باہر موت اس کی تاک میں تھی۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا لیکن معاملہ نصیر ماموں کی عزت کا تھا۔ اس کے گھر میں پولیس والوں سے فائرنگ کا تبادلہ کرنے سے پہلے وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ کسی صورت میں خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا مگر عین اسی وقت برآمدے میں ماموں نصیر کی آواز سنائی دی اور اس نے وقتی طور پر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"جہانداد یہاں نہیں ہے انسپکٹر صاحب"۔ ماموں پولیس کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ آپ چاہیں تو......"

"ہمیں مصدقہ اطلاع ملی ہے"۔ انسپکٹر نے درشت انداز میں قطع کلامی کی۔ بھلائی اسی میں ہے کہ قانون سے تعاون کرو ورنہ ایک مجرم کا ساتھ دینے کے جرم میں گرفتار بھی کر سکتا ہوں"۔

"یہ...... یہی...... تو میں کہہ رہا تھا"۔ ماموں نصیر بوکھلا کر بولا۔ "کہ آپ میرے گھر لے سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے مجرم چوری چھپے گھر میں داخل ہو گیا ہو اور ہمیں پتا بھی نہ چلا ہو"۔

"ٹھیک ہے"۔ انسپکٹر نے کہا۔ "ہم ایک ایک کمرے کی تلاشی لے لیتے ہیں"۔

انسپکٹر کا جواب سن کر جہانداد کے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر سرایت کر گئی۔ وہ اس دان میں بالکل پھنس گیا تھا۔ اب اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں تھا کہ وہ پروا کیے بغیر یا تو پولیس سے مقابلہ شروع کر دے یا پھر ہتھیار ڈال کر خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔ ہر دو صورتیں اس کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ نہ تو وہ ہتھیار ڈال کر خود کو پولیس کے حوالے کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی بے گناہ پولیس اہلکار کو قتل کرنے کے حق میں تھا۔

بہر کیف سب کچھ حالات پر چھوڑتے ہوئے اس نے آہستہ سے کھڑکی کو کھولا اور کی پرواہ کیے بغیر باہر چھلانگ لگا دی۔ اُسے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز دی تھی شاید پولیس والے اس کے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

کھڑکی سے کودتے ہی وہ اندھا دھند ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ پیچھے سے اسے گونجدار آواز سنائی دی۔

"رک جاؤ جہانداد۔ ورنہ میں گولی چلا دوں گا"۔

لیکن وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے دوڑتا چلا گیا۔ انسپکٹر نے جھنجھلا کر اس کی ٹانگ کا نشانہ کر فائر کر دیا مگر گولی خطا ہو گئی۔ اس دوران وہ دروازے پر تعینات سپاہی کے سر پر پہنچ گیا۔ نے اسے دیکھ کر رائفل کو سیدھا کر لیا مگر وہ گولی چلنے سے پہلے زمین پر گر گیا۔ گولی اس کے گزر گئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ سپاہی اس پر دوبارہ گولی چلاتا اس نے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کو سیدھا کیا اور سپاہی کی ٹانگ کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ گولی سیدھی سپاہی کی پنڈلی اور وہ چیخ مار کر گر پڑا۔

جہانداد کے سنبھلنے کے لیے اتنا وقفہ کافی تھا۔ چشم زدن میں وہ اٹھا اور پھر ڈیوڑھی دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے عقب میں بیک وقت تین دھماکے ہوئے ڈیوڑھی کا دروازہ پار کرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے بائیں بازو



رکھ دیا ہو۔ گولی اس کے بازو میں لگی تھی۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے پورے بدن میں سرایت کر گئی تھی مگر یہ رکنے کا وقت نہیں تھا۔ موت اس کے تعاقب میں تھی۔ اسے اپنے پیچھے پولیس والوں کے دوڑنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دروازے سے نکلتے ہی وہ دائیں ہاتھ موجود ایک گلی میں دوڑتا چلا گیا۔ آگے جا کر یہ گلی بائیں جانب مڑ گئی۔ ہاتھ میں ریوالور تھامے وہ مختلف گلیوں سے گزرتا چلا گیا۔ لوگ اسے متعجب اور خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اس نے ریوالور جیب میں رکھا اور کندھے سے رائفل اتار کر ہاتھ میں تھام لی۔ ابھی تک کسی شخص نے بھی اس کے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ جس گلی میں دوڑ رہا تھا تھوڑی دور جا کر وہ مغرب کی جانب گھوم گئی۔ یہ گلی نہ صرف کشادہ تھی بلکہ گاؤں سے باہر بھی نکل رہی تھی۔ دوڑتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر اپنے عقب میں دیکھا لیکن شاید پولیس والے بہت پیچھے رہ گئے تھے یا پھر اس گلی کے سرے پر اس کی گھات میں کہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ بہر کیف اسے ہر صورت میں اس گاؤں سے باہر نکلنا تھا۔ جونہی وہ بھاگتے ہوئے گلی کے سرے پر پہنچا عین اس وقت ایک نوجوان گھوڑے پر سوار گلی میں داخل ہوا۔ نوجوان کو دیکھتے ہی اس نے رائفل کو سیدھا کیا اور پھر غراہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "گھوڑا میرے حوالے کر دو ورنہ گولی مار دوں گا"۔

گھوڑسوار نے اس کا خون آلود بازو اور چہرے پر چھائی وحشت دیکھ کر بغیر کوئی سوال کیے گھوڑا اس کے حوالے کر دیا۔

بغیر وقت ضائع کیے وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا دی۔ اس کا رخ مغرب کی جانب تھا۔ اس اثناء میں ایک دوسری گلی سے پولیس جیپ برآمد ہوئی اور پھر فضا گولیوں کی آواز سے گونج اٹھی مگر رینج سے دور ہونے کی وجہ سے کوئی گولی بھی اس تک نہ پہنچ سکی تھی۔ اب پولیس جیپ اس کے تعاقب میں لگ گئی لیکن راستہ کچا ہونے کی وجہ سے جیپ پیچھے رہ گئی اور وہ بہت آگے نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پولیس والوں کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہو چکا تھا۔

یہ صورت حال دیکھ کر انسپکٹر صادق نے ڈرائیور کو جیپ واپس موڑنے کے لیے کہہ دیا۔ اب ان کا رخ دوبارہ گاؤں کے جانب ہو چکا تھا۔ شاید انسپکٹر صادق نصیر سے نمٹنا چاہتا تھا۔ جس نے ایک مفرور اور قاتل کا ساتھ دے کر ایک غیر قانونی کام کیا تھا۔

✣===✣===✣

تھانے سے نکلنے کے بعد ملک مراد دوبارہ جیپ پر سوار ہوا اور حلقے کے پٹوار خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے علاقے کے پٹواری سے بات کی اور پھر اسے ساتھ لے کر اپنے گاؤں کی طرف

روانہ ہو گیا۔ آج صبح ہی اس نے قاسم علی سے حتمی بات کر لی تھی۔ اب بس قاسم علی کی زمین ا
نام منتقل ہونے والی تھی۔ پٹواری کو اس نے سمجھا دیا تھا۔ تقریباً سارے معاملات طے پاچ
صرف قاسم علی کا انتقال پر نشانِ انگوٹھا لگانا رہ گیا تھا۔ دن کے تقریباً پونے بارہ بجے وہ پٹ
ساتھ لیے قاسم علی کے ہاں پہنچ گیا۔

قاسم علی نے انہیں بیٹھک میں بٹھایا اور پھر بغلی دروازے سے گزر کر اندر چلا گیا۔ شاید
سے کوئی مشورہ وغیرہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ملک مراد نے مکارانہ انداز میں پٹوا
طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کی زمین ایک مدت سے میری آنکھوں میں کھٹک رہ
بڑے عرصے کے بعد خدا نے یہ دن دکھایا ہے۔ بس انگوٹھا لگ جائے اس کے بعد میں تمہیں خوش
گا''۔

''وہ تو ٹھیک ہے ملک صاحب''۔ پٹواری خوش ہو کر بولا۔ ''لیکن آپ نے زمین کی ق
نصف سے بھی کم لگائی ہے۔ آج کل فی کنال ایک ہزار روپے سے زیادہ کا نرخ چل رہا ہے
آپ اسے فی کنال پانچ صد روپے دے رہے ہیں۔ کہیں وہ انکاری نہ ہو جائے''۔

''وہ انکار نہیں کر سکتا''۔ ملک مراد نے پورے یقین سے کہا۔ ''اس کے حالات ہی ا
ہیں۔ اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے''۔

''میں سمجھا نہیں ملک صاحب!'' اس نے متحیر انداز میں استفسار کیا۔ ''کیا اس کا بھائی
شدید بیمار ہے یا پھر کوئی اور بات ہے؟''

ملک مراد نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''پٹواری صاحب! ان باتوں کو تم نہیں
گے۔ خیر تم بھی اپنے متر ہو اس لیے بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دراصل قاسم علی کے بھائی
عرصہ پہلے ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا۔ پہلے تو اس کی کوئی خبر ہی نہیں مل رہی تھی مگر چند دن
اچانک ہی قاسم علی کو ڈاکوؤں کا پیغام ملا کہ تمہارا بھائی ہمارے پاس ہے۔ اگر اس کی زندگی
ہو تو پچاس ہزار روپے کی رقم ادا کر دو، ہم اسے چھوڑ دیں گے بصورت دیگر ہم اسے گولی ما
گے۔ ڈاکوؤں نے اسے ایک ہفتے کی مہلت دی ہے۔ اب بتاؤ کیا ایسی صورت حال میں
کرنے کی جرأت کر سکتا ہے جبکہ اس کے بھائی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہو؟''

''ہاں ملک صاحب! مجبوری کے عالم میں انسان سب کچھ کر سکتا ہے''۔ پٹواری ن
''قاسم علی بھی اس کٹھن وقت میں کچھ نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ اس انتقال پر اپنا انگوٹھا
دے''۔

اس دوران قاسم علی بغلی دروازے سے اندر داخل ہوا اور ملک مراد کچھ کہتے کہتے



''کہاں رہ گئے تھے بھئی؟'' اسے دیکھتے ہی پٹواری باچھیں چوڑی کرتے ہوئے بولا۔ ''انگوٹھا لگاؤ اور اپنی رقم کھری کرو۔ ہمیں اور بھی بیسیوں کام کرنے ہوتے ہیں، سارا دن کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے''۔

اتنا کہہ کر پٹواری نے کاغذات نکال کر اس کے سامنے پھیلا دیے۔

قاسم علی نے کہا۔ ''پٹواری صاحب! میں انگوٹھا ضرور لگاؤں گا لیکن پہلے زمین کی قیمت وغیرہ کا تو پتا چلے۔ ملک صاحب نے نرخ کیا لگایا ہے؟''

''کیسی باتیں کرتے ہو؟'' ملک مراد مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہاری زمین کا ٹھیک ٹھاک نرخ لگایا ہے۔ علاقے میں فی کنال چار سو روپے کا نرخ چل رہا ہے مگر میں تمہیں پانچ سو روپیہ فی کنال دے رہا ہوں اور کیا چاہیے تمہیں؟''

''یہ تو بہت کم ہے ملک صاحب''۔ وہ مایوسی سے بولا۔ ''دس برس پہلے بھی یہی نرخ تھا''۔

''قاسم علی!'' پٹواری مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ''بارانی زمینوں کا آج کل یہی نرخ چل رہا ہے۔ تم کسی سے بھی معلوم کر سکتے ہو۔ میں ایک ہفتے کے بعد دوبارہ آ جاؤں گا اور پھر''

''نہیں''۔ اس نے جلدی سے قطع کلامی کی۔ ''تب تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ مجھے تو آج ہی رقم چاہیے''۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر ٹال مٹول کیوں کر رہے ہو؟'' ملک مراد قدرے جھنجھلا کر بولا۔ ''انگوٹھا لگاؤ اور رقم سنبھالو، خواہ مخواہ وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے ملک صاحب''۔ وہ مرے ہوئے لہجے بولا۔ ''میں انگوٹھا لگانے کے لیے تیار ہوں۔ کل رقم کتنی بنتی ہے؟''

''تم دونوں بھائیوں کی کل منتقلہ اراضی ایک سو بیس کنال ہے اس طرح تم ساٹھ کنال کے بلا شراکت غیرے مالک ہو جس کی قیمت مبلغ تیس ہزار روپیہ بنتی ہے''۔ پٹواری نے ملک مراد کا اشارہ پا کر تفصیل بتائی۔

''لیکن مجھے تو پچاس ہزار روپیہ درکار ہے''۔ اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''بقیہ رقم میں کہاں سے پوری کروں گا؟''

''یہ تمہارا کام ہے''۔ ملک مراد بیزاری سے بولا۔ ''جتنی تمہاری رقم بنتی ہے وہ میں دینے کے لیے تیار ہوں''۔

پٹواری بولا۔ ''قاسم علی! ملک صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سوچو مت انگوٹھا لگاؤ اور ہمیں

فارغ کرو''۔

''اچھا جی''۔ کہہ کر اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا اور پٹواری نے اس کے کاغذ پھیلا کر اسٹمپ پیڈ نکال لیا۔

''انگوٹھے کو گیلا کر کے یہاں لگا دو''۔ پٹواری نے اس کے سامنے پھیلے ہوئے کاغذ رکھتے ہوئے کہا۔ قاسم علی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر انگوٹھے کو گیلا کر کے اسٹمپ پیڈ دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ انگوٹھا اٹھا کر نشان ثبت کرتا، اچانک بغلی دروازے سے حاکم علی داخل ہوا اور قاسم علی متعجب انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''حاکم! تم....'' وہ مسرت سے کانپتی آواز میں بولا۔ ''اگر تمہیں ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو شاید میں لٹ گیا ہوتا''۔

''بھائی صاحب!'' حاکم علی اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ ''میری زندگی کوئی ایسی تو نہیں تھی کہ آپ دشمن کے ہاتھ اپنی زمین بیچنے کے لیے تیار ہو گئے''۔

''اٹھیے پٹواری صاحب''۔ ملک مراد نے جل کر کہا۔ ''نیکی کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں رہا''۔

''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں ملک مراد''۔ حاکم نے زہرخند سے کہا۔ ''تم اپنی نیکی اپنے پاس رکھو اور مہربانی فرما کر یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا''۔

''میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا''۔ اس نے جواب دیا۔ ''تمہارے بھائی نے بلایا مجھے''۔

''اس لیے تو میں تمہارے ساتھ مہربانی سے پیش آ رہا ہوں''۔ حاکم بولا۔ ''ورنہ نہ جانے کیا کر بیٹھتا؟''

''ورنہ کیا تم مجھے مار ڈالتے؟'' ملک مراد نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا اپنی اوقات بھول چکے ہو؟''

''مجھے اپنی اوقات یاد ہے''۔ وہ تپ کر بولا۔ ''لیکن تم اگر فوراً یہاں سے نہ نکلے تو میں تیری اوقات یاد دلانے کے لیے مجبور ہو جاؤں گا''۔

ملک مراد کو غصہ تو بہت آیا مگر مجبوری کے عالم میں وہ صرف دانت پیس کر رہ گیا۔ فطرتاً وہ درجے کا منتقم مزاج شخص تھا لیکن اس نے ہمیشہ دشمن کی پیٹھ پر وار کیا تھا آج تک اس نے سامنے ہو کر اپنے کسی دشمن کو نہیں للکارا تھا۔

صورتِ حال کو بگڑتے دیکھ کر پٹواری نے جلدی سے مداخلت کی اور ملک مراد کو سمجھا وہاں سے لے جانے کے لیے راضی کر لیا تاہم جاتے جاتے اس نے حاکم علی کو واشگاف الفاظ



دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''بہت جلد تم سے نمٹ لوں گا۔ میں اپنے دشمنوں کو کبھی نہیں بھولتا''۔

''میری فکر چھوڑ کر تم اپنی خیر مناؤ''۔ حاکم نے جواب دیا۔ ''جہانداد تم سے ملنے کے لیے بہت بے تاب ہے۔ مجھے یقین ہے وہ بہت جلدی تمہاری مزاج پُرسی کے لیے آئے گا اس لیے حویلی کے محافظوں کی تعداد ابھی سے بڑھا دو۔ میں نے جہانداد کی آنکھوں میں تمہاری موت دیکھی ہے''۔

ملک مراد استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ خوش فہمی اچھی ہے لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ پولیس اب تک رحماں پورہ والے نصیر کے گھر کو محاصرہ میں لے چکی ہو گی۔ جہانداد اب تک گرفتار ہو چکا ہو گا یا پھر اوپر پہنچ چکا ہو گا''۔

''یہ آنے والا وقت بتائے گا''۔ اس نے بغیر مرعوب ہوئے کہا۔ ''کہ اوپر کون پہنچتا ہے۔ جاؤ جا کر صدقہ خیرات کرو سنا ہے بلائیں ٹل جاتی ہیں''۔

ملک مراد بغیر جواب دیے پٹواری کے ساتھ باہر نکل گیا اور حاکم بھائی کی طرف متوجہ ہو گیا جو پریشانی کے عالم میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

===

جہانداد پولیس سے فرار ہو کر اس روز عصر کے وقت ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گیا۔ یہ گاؤں علاقہ غیر کی سرحد پر واقع تھا۔ وہاں حسین عرف سونو نامی ایک نوجوان اسکول کے زمانے کا اس کا دوست نکل آیا۔ جہانداد کی حالت دیکھتے ہی سونو نے بغیر کوئی سوال کیے اس کے لیے اپنے گھر کے دروازے کھول دیے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد سونو نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اس کی خونچکاں سرگزشت سنی تھی۔

''جہانداد!'' اس کی ساری کہانی سننے کے بعد سونو پُرخلوص انداز میں کہنے لگا۔ ''تم پر بہت ظلم ہوا ہے میرے دوست، لیکن تم فکر مت کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھ سے جو ہو سکا تمہارے لیے کروں گا۔ تم یہاں اطمینان سے دن گزار سکتے ہو، یہ علاقہ پولیس کی دست برد سے محفوظ ہے لیکن مجھے فی الحال تمہارے زخم کی فکر کرنا چاہیے، یہاں ایک قابل جراح موجود ہے۔ ان شاء اللہ تمہارا زخم ایک ہفتے کے اندر بھر جائے گا۔ اب میں تمہارے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں اس کے بعد ہی جراح کے پاس جاؤں گا''۔

''کھانا میں کھا چکا ہوں''۔ جہانداد بے تکلفی سے بولا۔ ''تاہم چائے کی طلب شدت کے ساتھ ہو رہی ہے''۔

"میں ابھی کہہ دیتا ہوں"۔ سونو اٹھتے ہوئے بولا۔ "تب تک تم منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ"۔

تھوڑی دیر کے بعد سونو چائے لے کر پہنچ گیا۔ ساتھ ایک پلیٹ میں بسکٹ اور مٹھائی رکھی ہوئی تھی۔

"تکلف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ سونو نے پیالیوں میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم بھوک محسوس کر رہے ہو گے اس لیے میں یہ بسکٹ اور مٹھائی بھی لے آیا ہوں۔ چلو بسم اللہ کرو"۔

جہانداد نے بے تکلف ہو کر چائے کے ساتھ بسکٹ اور مٹھائی کھائی۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتے رہے مگر جہانداد بازو میں بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے سونو جراح کو بلا کر لے آیا۔ جہانداد کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد جراح نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "گولی بازو کے اندر موجود ہے اگر نکالی نہ گئی تو زہر پھیلنے کا خطرہ ہے۔ تمہیں برداشت کا مظاہرہ کرنا پڑے گا ویسے میرے پاس زخم کو سن کرنے والی دوائی موجود ہے"۔

"آپ گولی نکال دیں جناب"۔ وہ بلا جھجک بولا۔ "مجھے درد برداشت کرنے کی عادت ہے"۔

"زمانے کے ستائے ہوئے لگتے ہو نوجوان!" ادھیڑ عمر جراح اپنے تھیلے سے اوزار نکالتے ہوئے کہنے لگا۔ "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

سونو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "چاچا! یہ میرا دوست ہے اور بہت دور کا رہنے والا ہے۔ آپ براہِ کرم اس کے بازو سے گولی نکال دیں، بعد میں، میں آپ کو اس کی کہانی سناؤں گا"۔

جراح نے اثبات میں سر ہلایا اور اوزار تھام کر جہانداد کے زخم پر جھک گیا۔ دوسرے ہی لمحے جہانداد کے لبوں سے ایک سسکی خارج ہو گئی۔ درد ناقابل برداشت تھا لیکن اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جراح گولی نکال کر اس کے زخم پر پٹی باندھ چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے جہانداد کو کچھ گولیاں اور سفوف نما دوائی کی پڑیاں دیتے ہوئے ہدایت کی۔ "یہ دوائی دن میں تین مرتبہ استعمال کرنی ہے۔ پٹی میں خود آ کر تبدیل کروں گا اور زخم کو پانی سے بچا کر رکھنا ورنہ بگڑ جائے گا"۔

سونو نے جراح کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے فیس ادا کی اور جراح سلام کرتے ہوئے



رخصت ہو گیا۔

اس کے بعد تین دن لگاتار جراح آ کر اس کی پٹی تبدیل کرتا رہا۔ چوتھے روز اس کا زخم مندمل ہونا شروع ہو گیا اور پھر دسویں دن وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو گیا۔ اس کا زخم قریب قریب خشک ہو چکا تھا۔ اس عرصے کے دوران سونو نے اس کی جی جان سے خدمت کی تھی۔ جہانداد جب بھی اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کرتا تو وہ مسکرا کر ٹال دیتا تھا۔

آخر کار پندرہویں روز جب جہانداد نے اس سے اجازت طلب کی تو وہ قدرے پریشان ہو کر بولا۔ "یہاں تمہیں کیا تکلیف ہے، کیا میرے خلوص میں تم نے کوئی کمی محسوس کی ہے؟"

"نہیں میرے دوست"۔ وہ مروت سے بولا۔ "تم نے میرے لیے جو کچھ کیا ہے وہ میرا سگا بھائی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں چاہوں بھی تو تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتا"۔

"تو پھر جانے کی بات کیوں کرتے ہو؟" سونو نے شکایتی انداز میں سوال کیا۔ "یہاں مزے سے دن گزارو، ویسے بھی چند روز کے بعد یہاں بابا ناگ شاہ بخاری کا عرس شروع ہونے والا ہے، وہ دیکھ کر چلے جانا"۔

"بابا ناگ شاہ بخاری، یہ کیسا نام ہے؟" اس نے متحیر ہو کر پوچھا۔ "میں تو پہلی بار یہ نام سن رہا ہوں"۔

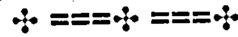
"اس لیے تو کہتا ہوں کہ مت جاؤ"۔ سونو اسے دلچسپی لیتے دیکھ کر پُرجوش انداز میں بولا۔ "عرس کے دنوں میں یہاں بہت رونق ہوتی ہے۔ قسم قسم کے کھیل تماشے ہوتے ہیں جن میں کبڈی کے مقابلے، کشتیاں اور نشانے بازی قابلِ ذکر ہے۔ تم تو فوج میں رہ چکے ہو نشانے بازی کے مقابلے میں حصہ لے کر انعام بھی جیت سکتے ہو"۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن تم نے مجھے بابا ناگ شاہ بخاری کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟" اس نے دوبارہ استفسار کیا۔

"بابا ناگ شاہ بخاری کے متعلق مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں"۔ سونو نے بتایا۔ "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک جن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ولایت کے درجے پر فائز کر دیا ہے تاہم ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ بابا ناگ شاہ بخاری اللہ کا ایک متقی اور پرہیزگار بندہ تھا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے روپ بدلنے کی صلاحیت ودیعت کی تھی اور وہ اکثر ناگ کے روپ میں نظر آیا کرتا تھا۔ سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ وہ عرس کے دنوں میں ایک ناگ کے روپ میں اب بھی لوگوں کو دیدار کراتا ہے۔ چاہو تو تم بھی اسے دیکھ سکتے ہو"۔

"چلو تم کہتے ہو تو کچھ دنوں کے لیے رک جاتا ہوں"۔ جہانداد رضامندی کا اظہار کرتے

ہوئے بولا اور سونو کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔



جہانداد کے فرار ہونے کے بعد انسپکٹر صادق حسین نے اسی دن نصیر کو گرفتار کر لیا۔ جہانداد کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے پہلے تو اس نے عادت کے مطابق نرمی سے کام لیا لیکن نصیر نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کردیا تو وہ پولیس کا روایتی انداز تفتیش اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے نصیر پر تشدد کی انتہا کردی لیکن جہانداد کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ کر سکا۔ نصیر کو جہانداد کے متعلق سرے سے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

آخر کار جھنجھلا کر اس نے افسران بالا سے رابطہ کیا اور جہانداد کو ایک خطرناک مجرم ثابت کرانے کے ساتھ ساتھ اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر سرکار کی طرف سے پانچ ہزار انعام بھی مقرر کروا دیا۔ جہانداد نے اس کے عملے کا ایک سپاہی زخمی کر کے واقعی ایک پولیس کی دشمنی مول لے لی تھی۔ زخمی سپاہی ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد ان دنوں چھٹی پر تھا۔

انسپکٹر صادق حسین کی حالت زخمی شیر کی سی تھی۔ آج تک چھاپے کے دوران اس سے کبھی بھی مجرم فرار نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے کریڈٹ پر بے شمار کارنامے تھے۔ کئی مفرور قاتل وہ اب تک پکڑ چکا تھا لیکن جہانداد نے فرار ہو کر نہ صرف اس کی اجلی وردی پر داغ لگا دیا تھا بلکہ افسران کے سامنے اس کی نگاہیں بھی جھکا دی تھیں۔ اس لیے جہانداد کا غصہ وہ گزشتہ کئی روز سے اس کے ماموں نصیر پر اتار رہا تھا۔ مار مار کر اس نے نصیر بے چارے کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس روز بھی وہ تھانے پہنچا تو اپنی سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے سیدھا لاک اَپ میں موجود نصیر کے پاس پہنچ گیا۔ نصیر اسے دیکھتے ہی سہم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے نصیر کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ''احمق انسان! خود پر رحم کرو اور مجھے بتا دو کہ جہانداد کہاں چھپا ہے؟ ورنہ ایسا کیس بناؤں گا کہ دس سال تک جیل میں چکی پیستے رہو گے''۔

''صاحب جی!'' وہ منت آمیز انداز میں بولا۔ ''میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جہانداد کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ وہ آپ کے سامنے میرے گھر سے فرار ہوا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرار ہوتے وقت اسے مجھ سے بات کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا''۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو''۔ انسپکٹر نے بھڑک کر اسے ایک چھڑی رسید کر دی۔ ''اس نے پہلے ہی تمہیں بتا دیا ہو گا کہ وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جلدی بتاؤ ورنہ کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا''۔

''میں سچ کہتا......''



اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انسپکٹر نے وحشیانہ انداز میں اس پر چھڑی برسانا شروع کر دی۔

''حرام زادے!'' انسپکٹر چلا کر بولا۔ ''تو شرافت کی زبان کبھی نہیں سمجھے گا۔ آج میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گے''۔

نصیر انسپکٹر کی چھڑی سے بچنے کے لیے لاک اَپ میں دوڑتا پھر رہا تھا لیکن اس تنگ کوٹھڑی میں اسے کہیں بھی جائے امان نہیں مل رہی تھی۔ وہ چلاتے ہوئے انسپکٹر کو واسطے دے رہا تھا، کبھی ایک کونے کی طرف تو کبھی دوسرے کی طرف بھاگ رہا تھا لیکن انسپکٹر پر تو شاید جنون سوار ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی بے دردی کے ساتھ منہ ناک دیکھے بغیر اسے جانور سمجھ کر پیٹ رہا تھا۔ لاک اَپ نصیر کی چیخوں سے گونج رہا تھا اور اس کی قمیص جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ نصیر بس بے دم ہو کر گرنے ہی والا تھا کہ عین اس وقت دو سپاہی ہراساں انداز میں بھاگتے ہوئے لاک اَپ کے دروازے پر پہنچ گئے۔

''سر، سر!'' ایک سپاہی بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''خدا کے لیے اسے چھوڑ دیجیے ورنہ آج پورا تھانہ معطل ہو جائے گا''۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' انسپکٹر نے پلٹ کر پوچھا۔ ''کس میں اتنی جرأت ہے کہ انسپکٹر صادق حسین کو معطل کر سکے، کہیں نشے میں تو نہیں ہو؟''

''آہستہ بولیں سر''۔ سپاہی نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''اگر ان کے کانوں تک آپ کی آواز پہنچ گئی تو بہت برا ہو گا۔ یوں سمجھیے قیامت برپا ہو جائے گی''۔

''تم سیدھی طرح بتا نہیں سکتے؟'' انسپکٹر گرج کر بولا۔ ''کون آیا ہے اس حرامی کا سفارشی بن کر؟''

''سردار......فر......فراست علی خان...... بہ نفس نفیس''۔ سپاہی نے اٹکتے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''انہوں نے فی الفور آپ کو مجرم کے ساتھ طلب فرمایا ہے''۔

''کک...... کیا کہہ رہے؟'' انسپکٹر ایک دم بوکھلا اٹھا۔ ''سردار صاحب تھانے کیسے پہنچ گئے؟''

''ہمیں کیا پتا سر؟'' سپاہی نے جواب دیا۔ ''بس اچانک ان کی گاڑی تھانے کے احاطے میں آ کر رکی اور پھر انہوں نے......''

''ٹھیک ہے ٹھیک''۔ انسپکٹر نے جلدی سے قطع کلامی کرتے ہوئے انہیں حکم دیا۔ ''تم فوراً نصیر کی حالت درست کر کے اسے کوئی ڈھنگ کا لباس پہنا دو اور پانچ منٹ کے اندر اسے میرے

آفس میں پہنچا دو"۔ اتنا کہہ کر انسپکٹر نے اپنی ٹوپی درست کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آفس کی بڑھ گیا۔

اس کے آفس میں سردار فراست علی خان پورے کروفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے ہی اسے سلیوٹ کیا اور پھر خوشامدی انداز میں بولا۔ ''سر! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ کام تھا تو مجھے حکم بھجوا دیا ہوتا میں حاضر ہو جاتا''۔

''انسپکٹر!'' سردار فراست علی خان نے اسے گھورتے ہوئے پکارا۔ ''سنا ہے آج کل تم اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو اور بے گناہوں کو پکڑ کر ٹارچر کر رہے ہو؟''

''نن...... نہیں سر''۔ وہ بوکھلا کر بولا۔ ''یہ...... اطلاع درست نہیں ہے۔ میرے کسی نے شاید......''۔

''کیا نصیر کی بیوی تمہاری دشمن ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں قطع کلامی کی۔ ''بولو، جواب دو؟''

''بس...... سر! نصیر نے ایک مفرور قاتل کو اپنے گھر......''

''شٹ اپ''۔ وہ دھاڑا اور انسپکٹر ایک دم چپ ہو گیا۔ ''مجرم تمہارے ہاتھ سے نکل گیا تم نے اسے تلاش کرنے کی بجائے ایک بے گناہ کو پکڑ لیا۔ کیا قانون نے تمہیں یہی پڑھایا ایک منٹ کے اندر نصیر کو میرے سامنے پیش کرو''۔

انسپکٹر نے ''یس سر''۔ کہا اور پھر دوڑتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے اندر ہی نصیر سردار فراست علی خان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ سپاہیوں نے طرف سے اس کی حالت درست کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس کے چہرے اور گردن پر نیل چلا چلا کر انسپکٹر کے وحشیانہ تشدد کا اعلان کر رہے تھے۔

نصیر کی دگرگوں حالت ملاحظہ کرنے کے بعد سردار فراست علی خان نے قہر آلود نظروں انسپکٹر کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''تم اپنے آپ کو معطل سمجھو''۔

''پلیز سر''۔ انسپکٹر نے فریاد کی۔ ''آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ صرف ایک مرتبہ معاف دیجئے۔ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں''۔

''بس...... میں نے فیصلہ کر دیا ہے''۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب یہ فیصلہ تبدیل نہیں سکتا''۔

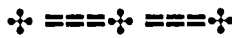
انسپکٹر کو دوبارہ لب کشائی کا حوصلہ نہ ہوا اور سردار فراست علی خان نصیر کو ساتھ لے کر گیا۔ تھانے کے احاطے میں اس کی گاڑی موجود تھی جس میں ڈرائیور کے علاوہ چار مسلح باڈی



بھی موجود تھے۔ چاروں کے ہاتھ میں غیر ملکی آٹومیٹک گنیں تھیں۔ وہ چاروں مفرور قاتل تھے لیکن پولیس کو ان کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہو سکی کیونکہ وہ سردار فراست علی خان کے محافظ تھے جو نہ صرف صوبائی اسمبلی کا رکن تھا بلکہ سارے صوبے کی ایک اہم شخصیت تھا۔ جرائم پیشہ اور غنڈے اس کا نام سن کر تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو معاف کرنے کا بالکل قائل نہیں تھا۔ بے حد اصول پرست اور ناداروں اور کمزوروں کا حامی تھا البتہ اس کی ایک عادت بری تھی کہ وہ ہر قاتل کو بغیر اس کا حسب نسب جانے اپنے ہاں رکھ لیا کرتا تھا۔ اس نے آج تک کبھی کسی قاتل سے یہ دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ اس نے کیوں قتل کیا ہے؟ مقتول گناہ گار تھا یا بے گناہ؟

جدی پشتی جاگیردار ہونے کی وجہ سے دولت کی اس کے پاس فراوانی تھی۔ سرحد کا سردار ہونے کے باوجود وہ انگریزی لباس کو پسند کرتا تھا اور ہمیشہ پینٹ شرٹ اور ہیٹ میں ملبوس رہا کرتا تھا۔ جب بھی کسی نے اس سے اس بارے میں استفسار کیا۔ اس نے ایک ہی جواب دیا کہ ہمارے ملک میں لوگ صاحب حیثیت ہی انگریزی لباس پہننے والے کو سمجھتے ہیں، سو میں مجبوری کے عالم میں ایسا لباس پہنتا ہوں۔

آج صبح نہ جانے وہ کیسے رحمان پورہ کی طرف نکل آیا اور پھر گاؤں کے درمیان سے گزرتے ہوئے نصیر کی بیوی نے اس کا راستہ روک لیا۔ تب اس نے استفسار کیا تو اس مظلوم عورت نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہاں سے وہ سیدھا تھانے پہنچا اور اب نصیر کو ساتھ لے کر واپس جا رہا تھا۔



اس سرحدی گاؤں میں مختلف قبائل آباد تھے اور یہ قبائل اکثر آپس کی دشمنیوں میں ہی الجھے رہتے تھے۔ ان کی حالت بالکل ویسی ہی تھی جیسی زمانہ جاہلیت میں عربوں کی تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر گولیاں چلنے لگتی تھیں۔ کبھی کبھار تو یوں ہوتا کہ کتوں کی لڑائی کے دوران ہی وہ آپس میں کسی بات پر بگڑ کر ایک پل میں انسانی خون بہانا شروع کر دیتے تھے۔ عربوں ہی کی طرح وہ مہمان نوازی میں فقید المثال تھے۔ مہمان کی عزت کے لیے جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ سونو بھی اس گاؤں کا رہنے والا تھا اس لیے اس نے جہانداد کی خدمت اور مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ جہانداد اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہو چکا تھا۔ جو تھوڑی بہت کمزوری تھی وہ بھی آرام کرنے کی وجہ سے دور ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو وہ مکمل طور پر چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔

چند روز کے بعد بابا ناگ شاہ بخاری کا عرس شروع ہو گیا اور آس پاس کے دیہاتوں کے زائرین وہاں جوق در جوق آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس چھوٹے سے گاؤں میں ہر طرف رونق اور شغل میلے نظر آنے لگے۔ کبڈی اور کشتیوں کے مقابلے شروع ... جہانداد سارا دن سونو کے

ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ رات کے وقت وہ دونوں دیر گئے تک دربار پر ہونے والی قوالیاں سنتے تھے۔ وقتی طور پر ان ہنگاموں میں کھو کر جہانداد سب کچھ بھول چکا تھا۔

آخری دن نشانہ بازی کے مقابلے سردار فراست علی خان کی صدارت میں ہوتے تھے۔ جیتنے آنے والے نشانہ باز کو وہ اپنے ہاتھوں سے انعام دیتے تھے۔ علاقے کا مایہ ناز سردار ہونے سے وہ ہر سال باقاعدگی کے ساتھ نہ صرف عرس میں شمولیت اختیار کرتے تھے بلکہ ناگ شاہ کے دربار پر بھی حاضری دیا کرتے تھے۔

نشانہ بازی کے مقابلے میں حصہ لینے والے افراد عرس کے پہلے روز ہی اپنے نام درج دیتے تھے۔ ان کے نام سردار فراست علی خان کا ماہر نشانے باز سکندر خان درج کرتا تھا۔ پہلے سورج ڈھلنے سے قبل ہی نام درج کروانا لازمی تھا۔ سورج ڈھلنے کے بعد کسی امیدوار کا نام نہیں کیا جاتا تھا۔

عصر کے وقت سونو نے جب اس سلسلے میں جہانداد سے بات کی تو وہ ہنس کر ٹال گیا۔ "یار دوست! مجھے ایسے مقابلوں میں حصہ لینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تم اپنا نام درج کروا دو"۔

"وہ تو میں ہر سال کرواتا رہتا ہوں"۔ سونو نے کہا۔ "لیکن اس سال میں تمہارا نشانہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے فوجی بڑے ماہر نشانہ باز ہوتے ہیں"۔

"یہ سچ نہیں ہے"۔ جہانداد بولا۔ "فوجی بھی تمہاری طرح کے انسان ہوتے ہیں"۔

لیکن سونو اس کے سمجھانے کے باوجود نہ مانا تو اس نے رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے میں مقابلہ میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوں، جاؤ میرا نام بھی لکھوا دو"۔

اس کے بعد سونو نام درج کروانے کے لیے چلا گیا اور جہانداد یوں ہی گھومتا پھرتا دربار کی طرف نکل گیا۔ جہاں ایک مقرر بابا ناگ شاہ بخاری کے سوانح بیان کر رہا تھا۔ وہ بڑے دلنشیں انداز میں زائرین سے مخاطب تھا:

"میرے بھائیو! بابا ناگ شاہ بخاری آج سے کوئی ڈھائی تین صدیاں پہلے مشہور و معروف شہر بخارا سے یہاں تشریف لائے تھے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ مشہور جنگجو احمد شاہ ابدالی کے دور میں بھی ناگ شاہ بخاری یہیں آباد تھے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ احمد شاہ ابدالی کے کارندے علاقے میں لوگوں سے ٹیکس لینے کے لیے آئے تو ناگ شاہ بخاری نے ان کے ہاتھ احمد شاہ ابدالی کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ علاقے کے لوگ نادار مفلس ہیں اور بڑی مشکل سے گزر اوقات کرتے ہیں اس لیے آج کے بعد ان کا ٹیکس معاف کر دیا جائے۔ اس پیغام کے بعد پھر کبھی احمد شاہ ابدالی کے کارندوں نے اس علاقے کا رخ نہ کیا"۔



جہانداد کافی دیر تک تقریر سنتا رہا اور پھر وہیں دربار سے ملحق ایک چھوٹی سے مسجد میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے چلا گیا۔ نماز پڑھ کر وہ مسجد سے باہر نکلا تو دربار کے آس پاس سونو اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ وہ کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔ جہانداد پر نظر پڑتے ہی وہ بھاگ کر اس کے قریب پہنچا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔ "کہاں رہ گئے تھے تم؟ کب سے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں"۔

"بات کیا ہے؟" جہانداد نے استفسار کیا۔ "تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"سکندر خان تمہارا نام درج نہیں کر رہا۔ کہتا ہے کہ امیدوار کو ساتھ لے کر آؤ لیکن اب تو کوئی فائدہ نہیں ہے سورج غروب ہو چکا ہے"۔

"اس کا مطلب ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد سکندر خان کسی کا نام درج نہیں کرتا؟" اس نے دوبارہ سوال کیا۔ "یہ طریقہ کار کچھ نامناسب نہیں ہے؟"

"ہے تو نامناسب لیکن کوئی اس کے منہ نہیں لگتا"۔ سونو نے بتایا۔ "دراصل لوگ سردار فراست علی خان سے ڈرتے ہیں"۔

"اسے میرا نام درج کرنا پڑے گا"۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے پُرعزم انداز میں بولا۔ "نہیں کرے گا تو میں سردار فراست علی خان سے اس کی شکایت کر دوں گا"۔

"رکو جہانداد!" سونو نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "سکندر خان بہت کینہ پرور شخص ہے۔ خواہ مخواہ دشمنی مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سکندر خان کئی قتل کر چکا ہے"۔

"قتل کرنے سے ناانصافی اور غنڈہ گردی کرنے کا لائسنس تو نہیں مل جاتا"۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا۔ "آؤ میں دیکھتا ہوں وہ کیسے میرا نام درج نہیں کرتا"۔

اس کے بعد سونو نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے سونو کی ایک بھی نہ سنی۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں سکندر خان کے سامنے موجود تھے۔ سکندر خان ایک بھرے بھرے جسم کا مالک شخص تھا۔ اس کے بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ باریک نوکدار مونچھیں اور ترشی ہوئی داڑھی اس کے شخصی رعب داب میں اضافے کا باعث بن رہی تھیں۔ اس کی سبز اور گول گول سی آنکھیں مخاطب کو اپنے جسم کے آر پار گزرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ سردار فراست علی خان کا خاص آدمی ہونے کی وجہ سے اس نے کندھے سے آٹومیٹک گن لٹکا رکھی تھی۔ اس وقت اس کے ساتھ چند بدمعاش ٹائپ لوگ بھی موجود تھے۔

چند لمحے تو وہ جہانداد کو گھور گھور کر دیکھتا رہا مگر پھر ناگوار انداز میں بولا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"نشانہ بازوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانا چاہتا ہوں"۔ جہانداد نے بغیر مرعوب ہوئے

جواب دیا۔

اس نے ایک نظر استہزائیہ انداز میں جہانداد کو سر سے لے کر پیروں تک دیکھا اور ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سب جہانداد کو تمسخرانہ انداز میں دیکھتے قہقہے لگانے لگے لیکن جہانداد نے ان کے بھونڈے قہقہوں پر کوئی توجہ نہ دی وہ بدستور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔

"بھاگ ...... بھاگ جاؤ بچے"۔ سکندر بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولا۔ "نشانہ مردوں کا کھیل ہے۔ مفت میں اپنا تماشا مت بناؤ۔ ابھی تو تمہاری عمر غلیل سے کھیلنے کی ہے اور بندوق اٹھالی؟ بہت بری بات ہے۔ جاؤ شاباش کھیل تماشا دیکھو"۔

بات کے اختتام پر سکندر کے ساتھیوں نے دوبارہ ایک زبردست قہقہہ لگایا مگر جہانداد کے تمسخر کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی مردانگی کا ثبوت دینے کے لیے تم سب کو نشانہ میں چیلنج کرتا ہوں۔ کل صبح سب لوگ یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ کون کتنا بڑا مرد ہے"۔

سکندر کو یوں محسوس ہوا جیسے اچانک ہی اس کے سر پر بم پھٹ پڑا ہو، آج تک کسی نے اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ تاہم وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم پاگل تو نہیں ہو؟ کیا تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ سکندر خان کے سامنے کیسے بولا جاتا ہے؟ لوگ نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور تم مجھے مقابلے کی دعوت دے رہے ہو؟"

"بھول ہے تمہاری"۔ اس نے نڈر انداز میں جواب دیا۔ "لوگ تم سے نہیں بلکہ فراست علی خان سے ڈرتے ہیں۔ جس دن انہوں نے تمہارے سر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ تمہارا رعب و دبدبہ جھاگ بن کر اڑ جائے گا"۔

"لگتا ہے تم مرنے کے لیے یہاں چلے آئے ہو"۔ سکندر گن سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ سونو نے خوفزدہ انداز میں جہانداد کا بازو تھام لیا۔

"بھاگو جہانداد!" سونو چلایا۔ "ورنہ مارے جاؤ گے"۔

جہانداد نے غصے سے اس کا بازو جھٹک کر کہا۔ "میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔

اس کے بعد جیسے بجلی سی کوندی، جہانداد نے کسی چیتے کی طرح جست لگائی اور سکندر کی گن اڑتی ہوئی دور جا گری۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ریوالور کی سرد نال سکندر کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے وقوع پذیر ہوا تھا کہ سکندر کے ساتھیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"سکندر!" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "تیرے جیسے کئی سورما مجھ سے ٹکرا کر مٹی میں مل چکے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو ایک سیکنڈ میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر سکتا ہوں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے"۔



اتنا کہہ کر اس نے سکندر کو نشانے پر رکھتے ہوئے اس کی گن اٹھالی۔ سکندر اور اس کے ساتھیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے جہانداد کو دیکھ رہے تھے۔ جسے انہوں نے اناڑی سمجھ کر اس کا مذاق اڑایا تھا۔ وہ ان کی توقع سے بڑھ کر چالاک اور کھلاڑی ثابت ہوا تھا۔ سکندر نگاہیں جھکا کر کسی مجرم کی طرح کھڑا ہوا تھا۔

"میں تمہاری بندوق ساتھ لے کر جا رہا ہوں"۔ جہانداد ریوالور کو جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "کل اگر میں تم سے نشانہ بازی کا مقابلہ ہار گیا تو تمہیں تمہاری بندوق واپس مل جائے گی۔ میرا نام جہانداد ہے۔ یاد سے فہرست میں درج کر دینا"۔

"تم پچھتاؤ گے نوجوان!" سکندر سر اٹھا کر گویا ہوا۔ "میں اپنے دشمنوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں ہوں"۔

"اور میں دشمنوں کو خوش آمدید کہنے کا عادی ہوں"۔ جہانداد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر پیٹھ پر وار کرنا پسند نہیں کرتا اور اپنے دشمن سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں"۔

اس کے بعد اس نے سونو کو ساتھ لیا اور سکندر اور اس کے ساتھیوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر ایک طرف چل پڑا۔ سونو پلٹ پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھ رہا تھا شاید اسے سکندر کی طرف سے کسی ردِ عمل کا خطرہ تھا تاہم جہانداد نے اس خدشے کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

•|• ===•|• ===•|•

دوسرے دن صبح سویرے ہی ایک وسیع و عریض میدان میں شامیانے اور قناتیں لگائی جا رہی تھیں یہ سارا کام سکندر اور اس کے ساتھیوں کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب شامیانے اور قناتیں لگ گئیں تو شامیانوں کے نیچے کرسیاں بچھا کر ایک اسٹیج کی شکل دے دی گئی۔ یہ سارا انتظام سردار فراست علی خان کے لیے کیا جا رہا تھا۔ نشانہ بازوں کو انعامات دینے کی تقریب یہیں منعقد ہونا تھی۔ سردار فراست علی خان جیتنے والے ہر ایک نشانہ باز کی نہ صرف بھرپور حوصلہ افزائی کرتے بلکہ اپنے ہاتھ سے اسے مناسب انعام سے بھی نوازتے تھے۔ وہ ماہر نشانہ بازوں کی دل سے قدر کرتا تھا۔ اب تک اول آنے والے کئی نشانہ باز اس کے محافظوں میں شامل ہو چکے تھے۔

سکندر بھی آج سے دو سال قبل اسی جگہ نشانہ بازی کا فائنل جیت کر سردار فراست علی خان کے محافظوں میں شامل ہوا تھا۔ وہ ان گنے چنے محافظوں میں تھا جنہیں باقاعدہ تنخواہ بھی ملتی تھی۔

سردار صاحب بھی اسے بہت زیادہ پسند کرتے تھے کیونکہ اس کا شمار لوگوں کی اس قبیل میں جو اندھا دھند آگ میں کود جاتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ آگ صرف حضرت ابراہیمؑ کے لیے تھی۔

سکندر جیسے قاتل اور مفروروں کو پناہ دے کر سردار فراست علی خان نے کبھی بھی سودا نہیں کیا تھا۔ ایسے لوگ اس کی ذاتی دشمنی کی آگ میں ایندھن کا کام دیتے تھے بلاتردد ایسی آگ میں جھونک دیا کرتا تھا۔ اپنے اس فعل پہ آج تک اس نے ندامت محسوس تھی۔ اپنے انتہائی بااعتماد ساتھیوں سے وہ اکثر کہتا رہتا تھا کہ میرا یہ فعل بالکل راست قانون سے بھاگے ہوئے ہیں، کئی انسانی جانوں سے کھیل چکے ہیں، یہ معاشرے کے جسم ہوئے ناسور ہیں اور میں یہ ناسور کاٹ کر پھینک دینے والا جراح ہوں۔

''سردار صاحب!'' کوئی ساتھی دلیل دیتے ہوئے کہتا۔ ''آپ انہیں قانون کے حوالے تو کر سکتے ہیں''۔

''بالکل کر سکتا ہوں''۔ وہ بلاجھجک جواب دیتا۔ ''لیکن نتیجہ کیا نکلے گا؟ انہیں کوئی سزا جائے گی اور باآسانی بری کر دی جائے گا۔ میں اس ملک کے مجبور معذور قانون کو تم سے زیادہ ہوں''۔ یہ جواب سن کر دلیل دینے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا اور تب سردار صاحب موضوع بدل دیا کرتے تھے۔

دن کے دس بجے کے قریب سردار فراست علی خان کی مخصوص جیپ تقریب گاہ کے پہنچ کر رکی اور وہ جیپ سے اتر کر مسلح محافظوں کے جلو میں تقریب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ موجود تمام لوگوں نے والہانہ انداز میں اس کا استقبال کیا۔ مگر جب چند جوشیلے نوجوانوں کے حق میں نعرے لگانے شروع کیے تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''میں تمہاری عقیدت کو سلام کرتا لیکن یہاں کوئی سیاسی جلسہ نہیں ہو رہا۔ اس لیے نعرے لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ الیکشن ابھی بہت دور ہیں''۔

اس کا جواب سن کر نعرے لگانے والے بالکل خاموش ہو گئے اور سردار فراست علی مخصوص نشست پر براجمان ہو گیا۔

اس کے بعد سردار صاحب کے اشارے پر سکندر سے نشانہ بازوں کے ناموں کی طلب کی گئی۔ فہرست پر سرسری سی نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے فہرست نزدیک بیٹھے ہوئے آدمی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اسٹیج پر جا کر یہ نام پڑھ دو، ہو سکتا ہے مقابلے میں حصہ لینے والا کوئی امیدوار



ہو''۔

''بہت بہتر سردار صاحب''۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فہرست پکڑی اور اٹھ کر اسٹیج پر پہنچ گیا۔

''معزز سامعین!'' وہ فہرست سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں مقابلے میں حصہ لینے والے امیدواروں کے نام پڑھ دیتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی ساتھی غیر حاضر ہو تو مہربانی کر کے بتا دینا تاکہ اسے بروقت بلایا جا سکے''۔

اس کے بعد اس نے باری باری تمام نام پڑھ کر سنا دیے۔ اس مجمع میں جہانداد بھی سونو کے ساتھ موجود تھا لیکن اس کا نام نہیں پکارا گیا تھا۔ فہرست پڑھ کر سنانے والا شخص ابھی تک اسٹیج پر موجود مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہانداد فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور با آواز بلند بولا۔ ''جناب! میرا نام فہرست میں شامل نہیں کیا گیا جبکہ کل میں نے سکندر کو بتا دیا تھا کہ میں مقابلے میں حصہ لینا چاہتا ہوں''۔

جونہی جہانداد کی بات مکمل ہوئی سکندر نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''یہ سورج ڈھلنے کے بعد میرے پاس پہنچا تھا اس لیے میں نے اس کا نام شامل نہیں کیا۔ میں اس کے لیے مقابلے میں شامل ہونے کے اصول وضوابط تو نہیں توڑ سکتا''۔

''تم مجھ سے ڈرتے ہو''۔ جہانداد نے براہِ راست اسے مخاطب کیا۔ ''ورنہ فہرست میں ضرور میرا نام شامل کرتے''۔

''تم پاگل ہو اور میں کسی پاگل کے منہ نہیں لگنا چاہتا''۔ سکندر نے جل کر جواب دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ ان دونوں کے درمیان بات مزید بگڑتی سردار فراست علی خان اٹھ کر اسٹیج پر پہنچ گیا۔ ''کیا بات ہے سکندر؟'' اس نے بارعب انداز میں پوچھا۔ ''کون ہے یہ نوجوان؟''

''پتا نہیں جناب!'' سکندر نے بیزاری سے کہا۔ ''کوئی پاگل لگتا ہے۔ کل شام یہ میرے ہاتھ سے مرتے مرتے بچا ہے۔ میری بندوق بھی اس نے کسی طرح چرا لی......''

''جھوٹ مت بولو سکندر''۔ جہانداد نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ''میں نے بندوق چرائی ہے یا تم سے چھینی ہے؟ شرم نہیں آتی اپنے مربی اور محسن کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے''۔

''ادھر آؤ نوجوان!'' صحیح صورتِ حال جاننے کے لیے سردار صاحب نے جہانداد کو پکارا۔ ''اور مجھے پورا واقعہ سناؤ لیکن جھوٹ بولنے کی کوشش بالکل نہ کرنا ورنہ......'' اس نے وارننگ کے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ جہانداد ہاتھ میں سکندر سے چھینی گئی بندوق پکڑے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا معاملہ ہے؟" اس نے جہانداد کو سر سے لے کر پیروں تک گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تم دونوں میں سچا کون ہے؟"

"سردار صاحب!" وہ بلا جھجک بولا۔ "میں آپ کو پوری کہانی سنا دیتا ہوں۔ آپ سچائی کی تصدیق کرنے والے بھی مل جائیں گے"۔

"تمہید مت باندھو"۔ سردار صاحب نے اسے ٹوکا۔ "اصل واقعہ سناؤ؟"

جہانداد نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر پورا واقعہ من وعن اس کے گوش گزار کر دیا۔

"ویری گڈ"۔ پورا واقعہ سننے کے بعد اس نے جہانداد کی طرف ستائشی انداز میں دیکھا۔ "نہتا ہوتے ہوئے بھی سکندر سے گن چھین لی...... لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا، کہیں تم مبالغہ تو نہیں کر رہے ہو؟"

"آپ اس کی تصدیق میرے دوست سونو اور سکندر کے ساتھیوں سے کر سکتے ہیں"۔ جہانداد نے بغیر گھبرائے جواب دیا۔ "انہوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کریں گے"۔

اس کے بعد سردار صاحب کی خواہش پر تمام چشم دید گواہان کو پیش کیا گیا اور انہوں نے جہانداد کے بیان کی تصدیق کر دی۔ اب سردار فراست مطمئن نظر آ رہا تھا البتہ سکندر سخت گھبرایا ہوا تھا۔ جہانداد نے اس بھرے مجمع میں اسے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔ وہ سردار صاحب کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا مگر سردار صاحب کلی طور پر جہانداد کی طرف متوجہ تھا۔

"اب کیا چاہتے ہو نوجوان؟" سارا معاملہ صاف ہونے کے بعد اس نے جہانداد سے سوال کیا۔

"میرا نام جہانداد ہے جناب"۔ اس نے بلا تردد کہا۔ "اور میں نشانہ بازی کے مقابلے میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔ خصوصاً میں سکندر کو مقابلے کی دعوت دینا چاہوں گا"۔

"سکندر بہت ماہر نشانہ باز ہے"۔ وہ اسے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج تک اس سے کوئی نہیں جیت سکا۔ شاید تم اس کا مقابلہ نہ کر پاؤ"۔

"میں آپ کو نا امید نہیں کروں گا"۔ اس نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔ "ویسے میں اسے کل شام چیلنج کر چکا ہوں"۔

"ٹھیک ہے"۔ سردار صاحب نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ "میں تمہاری یہ خواہش کر دیتا ہوں"۔

اس کے بعد سردار صاحب کے حکم پر تمام نشانہ بازوں کو دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔



جہانداد مخالف ٹولیوں میں شامل تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سب ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ جہاں ایک پختہ دیوار کے ساتھ لکڑی اور گتے کے بنے ہوئے ٹارگٹ موجود تھے۔ ہر ٹارگٹ کے عین درمیان میں ایک گول سیاہ نشان بنایا گیا تھا۔ یہی سیاہ نشان اصل ٹارگٹ تھا جسے نشانہ بازوں نے ہٹ کرنا تھا۔

سردار فراست علی خان کی اجازت سے مقابلے کا آغاز کر دیا گیا۔ پہلے سکندر والی ٹولی کو موقع دیا گیا۔ ہمیشہ کی طرح سکندر نے اپنی ٹولی میں پہلی پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد جہانداد والی ٹولی کے باری آئی تو جہانداد نے متواتر تین بار ٹارگٹ کو ہٹ کر کے وہاں موجود تمام لوگوں کو چونکا دیا۔ اس طرح اس نے بھی اول پوزیشن حاصل کر لی تھی۔

اب اول آنے والے دو امیدواروں کے درمیان مقابلہ ہونا تھا۔ سکندر قدرے گھبرایا ہوا تھا تاہم جہانداد بالکل مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اسے مکمل یقین تھا کہ وہ سکندر جیسے عام نشانہ باز کو با آسانی ہرا دے گا اور ایک تربیت یافتہ فوجی ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ خیال کچھ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ فوج میں نشانہ بازی کی نہایت ہی عمدہ تربیت دی جاتی ہے۔ ایک عام فوجی بھی بہت اچھا نشانہ باز ہوتا ہے مگر جہانداد کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ اپنی سروس کے دوران یونٹ کا مانا ہوا نشانہ باز رہ چکا تھا۔

چند لمحوں کی دیر کے بعد ان دونوں کے مابین مقابلہ شروع ہو گیا۔ جہانداد نے ابتداء کرتے ہوئے پانچ گولیاں ٹارگٹ پر چلائیں۔ پانچوں کی پانچوں گولیاں عین نشانے پر لگی تھیں۔ سکندر نے بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے پانچ گولیاں داغیں اور ہر گولی نشانے پر لگی۔

وہاں موجود سب لوگوں نے آگے بڑھ کر سکندر کو خوب داد دی۔ سردار فراست علی خان بھی اسے ستائشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"بس بھئی مقابلہ برابر رہا"۔ وہ دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں ہی بہت اچھے نشانہ باز ہو"۔

جہانداد نے عجیب تمسخرانہ انداز میں سکندر کی طرف دیکھا اور پھر سردار صاحب سے کہا۔ "جناب! مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اب ہم دونوں پوزیشن بدل کر ٹارگٹ کو نشانہ بنائیں گے یعنی پیٹ کے بل لیٹ کر، پھر کھڑا ہو کر، اگر فیصلہ پھر بھی نہ ہو سکا تو پھر چلتے ہوئے ٹارگٹ پر فائر کریں گے"۔

سردار سمیت سب لوگوں نے چونک کر جہانداد کی طرف دیکھا۔

"تم...... شاید ملٹری میں رہ چکے ہو"۔ سردار حیران ہو کر بولا۔ "مگر یہاں تو مقابلہ اسی طرح

ہوتا ہے‘‘۔

’’میں مانتا ہوں‘‘۔ جہانداد نے کہا۔ ’’لیکن ہار جیت کے بغیر مقابلہ کیسے ختم کیا جاسکتا ہے؟ کیا دو شخص بیک وقت اول پوزیشن حاصل کر سکتے ہیں؟‘‘

بات سردار صاحب کی سمجھ میں آگئی۔ اس لیے مقابلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اب وہ دونوں ... ہوئی پوزیشن میں ٹارگٹ کو نگاہوں ہی نگاہوں میں تول رہے تھے۔ پہلے سکندر کو موقع دیا گیا ... نے نشانہ باندھ کر پانچ گولیاں چلائیں مگر ٹارگٹ پر صرف ایک ہی گولی لگ سکی تھی۔

اس کے بعد جہانداد نے اپنی باری پر جونہی ٹارگٹ کا نشانہ لیا تو یکایک اس کی سماعت ... ویپن (Weapon) انسٹرکٹر کی بارعب آواز گونجی۔ ’’پکڑ مضبوط رکھو، رائفل کا بٹ کندھے ... ہلنے نہ پائے اور سانس روک لو۔ رائفل کی فائرنگ ٹپ (Tip) بالکل ٹارگٹ کی سیدھ میں ... چاہیے‘‘۔

جہانداد نے ان ہدایات پر عمل کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے ٹارگٹ پر پانچ گولیاں ... دیں۔ پانچوں گولیاں عین نشانے پر لگی تھیں۔

لوگ دم بخود ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ ایسا ماہر نشانے باز شاید انہوں نے اپنی زندگی ... پہلی بار دیکھا تھا۔ سکندر حد سے زیادہ شرمندہ نظر آرہا تھا۔ جہانداد اپنی جگہ سے مسکراتے ہوئے ... اور پھر سکندر کے قریب پہنچ کر بولا۔ ’’مجھے افسوس ہے دوست! لیکن غلطی تمہاری ہے، تم نے ... پہچاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ بہرکیف افسردہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم ایک اچھے ... باز ہو تاہم تھوڑی سی تربیت تمہیں اس سے بھی اچھا نشانہ باز بنا سکتی ہے‘‘۔

بعد میں جب انعامات دینے کی تقریب ہوئی تو سردار صاحب نے نہ صرف سکندر ... بندوق جہانداد کے حوالے کر دی بلکہ اسے نقد انعام سے بھی نوازا۔ دوسرا انعام سکندر کو ملا تھا ... اچھے نشانہ بازوں کو بھی انعامات دیے گئے تھے۔

تقریب کے اختتام پر سردار فراست علی خان ایک بار پھر جہانداد سے ملا اور اس کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ’’نوجوان! تم بہت بہادر اور ایک ماہر نشانہ باز ہو، اگر چاہو تو میں تمہیں ذاتی باڈی گارڈ رکھنے کے لیے تیار ہوں‘‘۔

’’آپ کا بہت بہت شکریہ جناب‘‘۔ جہانداد بولا۔ ’’میں کرائے کا سپاہی بن کر نہیں ... سکتا‘‘۔

اس کا ٹکا سا جواب سن کر سردار فراست علی خان کی تیوری پر بل پڑ گئے تاہم وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’تم نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے لیکن میں بہادروں کا قدر دان ہوں ...



میں نے تمہیں معاف کر دیا‘‘۔ اس کے بعد سردار صاحب اپنے محافظوں کے ساتھ رخصت ہو گیا اور لوگوں نے جہانداد کو گھیر لیا۔

+===+===+

انسپکٹر صادق حسین کو معطل کر دیا گیا تھا۔ تھانے کا نیا انچارج نادر خان نامی ایک شخص تھا۔ وہ نہ صرف روایتی پولیس والا تھا بلکہ انتہائی ظالم اور رشوت خور بھی تھا۔ تھانے کا چارج سنبھالتے ہی ملک مراد نے اسے کھانے کی دعوت دے ڈالی جو اس نے خوشدلی سے قبول کر لی۔ اس دعوت کے بعد اس کے اور ملک مراد کے تعلقات رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے دوستی میں تبدیل ہو گئے۔ ملک مراد ہر دوسرے، تیسرے روز تھانے جا کر گھنٹوں نئے تھانیدار کے ساتھ گپ شپ لگائے رکھتا تھا۔ دراصل وہ نئے تھانیدار کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا اس لیے گاہے گاہے اس کی خدمات میں تحائف اور نذرانے پیش کرتا رہتا تھا۔ انسپکٹر نادر خان کو تو ویسے بھی یہی کچھ چاہیے تھا۔ تنخواہ سے آج تک اس کا پیٹ نہیں بھرا تھا کیونکہ وہ ایک عیاش طبع شخص تھا اور تنخواہ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں ہی اس کی عیاشیوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ اس لیے وہ کمانے کے متبادل ذرائع ڈھونڈتا رہتا تھا۔

اس روز بھی حسب معمول نادر خان اپنی سیٹ پر بیٹھا مجرموں کی فائلیں دیکھ رہا تھا کہ ایک سپاہی نے اسے ملک مراد کی آمد کی اطلاع دی۔

’’اسے یہیں دفتر میں لے آؤ‘‘۔ نادر خان نے فائل سے سر اٹھا کر حکم دیا اور سپاہی اثبات میں سر ہلاتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

چند منٹوں کے بعد ملک مراد چہرے پر مسکراہٹ بکھیرے اندر داخل ہوا اور نادر خان اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس نے گرم جوشی کے ساتھ ملک مراد سے مصافحہ کیا اور پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔ میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہا تھا‘‘۔

’’یہ تو میری خوش قسمتی ہے خان صاحب‘‘۔ وہ مسکرایا۔ ’’کہ میری عدم موجودگی میں مجھے یاد کیا جا رہا ہے۔ ویسے بات کیا ہے؟‘‘

’’شہر میں ایک پلاٹ دیکھا ہے ملک صاحب‘‘۔ نادر خان فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔ ’’بس دل للچا گیا لیکن جیب اجازت نہیں دیتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے رقم کا انتظام کروں۔ آج اس کی قیمت ہزاروں میں ہے۔ کل لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔ زمین کی قیمت آج جس رفتار سے بڑھ رہی ہے وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میں پریشانی کے عالم میں اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک تمہاری یاد آ گئی۔ اب تم ہی اس کا کوئی حل بتاؤ‘‘۔

اس کی بات سن کر ملک مراد کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تاہم وہ ایک کائیاں شخ اس لیے ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنا جانتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نادر خان کی نظر اس کی جیب پر ہے۔

''خان صاحب!'' چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ گویا ہوا۔ ''رقم کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اگر ذرا ہمت کا مظاہرہ کرو تو''۔

''میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' نادر خان نے الجھ کر پوچھا۔

''تم نے جہانداد نامی قاتل کی فائل ضرور دیکھ لی ہوگی''۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر سرکار نے انعام بھی رکھا ہے۔ تم ایسا کرو کہ......''

''میں ایک قاتل کے پیچھے خوار نہیں ہو سکتا''۔ نادر خان نے ناگواری سے قطع کلامی کی۔ ''کوئی آسان حل بتاؤ؟''

''پہلے میری بات تو سنو''۔ وہ ایک دم جھنجھلا کر بولا۔ ''تمہیں قاتل کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا باپ اسی گاؤں میں موجود ہے بس اسے گرفتار کر لو باقی کام میں سنبھال لوں گا''۔

''وہ مجھے کیا دے سکے گا؟'' نادر خان نے بدستور ناراضی سے سوال کیا۔ ''سوائے چند سو روپیوں کے۔ میں نے پلاٹ خریدنا ہے کوئی بھیڑ بکری نہیں لینی''۔

''پلاٹ کی قیمت کیا ہوگی؟'' ملک مراد نے موضوع بدل کر پوچھا۔

''کم سے کم بیس ہزار روپے''۔ (ستر کی دہائی میں بیس ہزار روپے بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی)۔

''ٹھیک ہے''۔ ملک مراد نے کہا۔ ''تم جہانداد کے باپ قاسم علی کو گرفتار کر لو رقم کا بندوبست میں کر دوں گا''۔

''کیا تم اپنی جیب سے دو گے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ہاں میں دوں گا''۔ ملک مراد عیاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''دراصل کچھ عرصہ پہلے میرے ہاتھ اپنی زمین فروخت کر رہا تھا۔ انتقال بھی درج ہو چکا تھا بس اس کا انگوٹھا لگنا باقی تھا کہ کام اچانک بگڑ گیا۔ اب اگر تم کسی طرح اس سے انتقال پر انگوٹھا لگوا دو تو میں تمہیں بیس ہزار روپے دے دوں گا۔ اس طرح ہم دونوں کا کام ایک ساتھ ہو جائے گا''۔

''واہ ملک صاحب واہ''۔ وہ باچھیں چوڑی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہارے بچے جئیں میں آج ہی قاسم علی پر ہاتھ ڈالتا ہوں۔ تم فوراً پٹواری سے مل کر معاملات طے کر لو۔ انگوٹھا تو قاسم



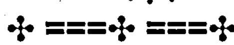
کا باپ بھی لگائے گا۔ میرا نام نادر خان ہے۔ مجھ سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے قاسم علی تو ایک کمزور سا انسان ہے۔ اس کی اوقات ہی کیا ہے جو مجھے انکار کر سکے''۔

''بس تو پھر اسی خوشی میں تم آج رات کا کھانا میرے ہاں کھاؤ گے''۔ ملک مراد اجازت طلب انداز میں بولا۔ ''دراصل آج میرے بیٹے چند دنوں کے لیے گاؤں آ رہے ہیں اور میں ان کے اعزاز میں خصوصی دعوتِ طعام کا اہتمام کر رہا ہوں۔ کالج کے ہاسٹل کا کھانا کھا کر وہ دونوں یقیناً تنگ آ چکے ہوں گے''۔

''ضرور کھاؤں گا ملک صاحب''۔ اس نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کہا۔ ''تم جیسے دوستوں کو بھلا انکار کیا جا سکتا ہے''۔

ملک مراد نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا اور پھر دفتر سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد نادر خان نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور سر کو کرسی کی پشت سے ٹکا کر سوچوں میں کھو گیا۔ ملک مراد سے رقم حاصل کرنے کا جو طریقہ سمجھا گیا تھا وہ اتنا آسان بھی نہیں تھا لیکن کوشش کرنے میں حرج ہی کیا تھا۔ کسی بھی اونچ نیچ کی صورت میں وہ سارا نزلہ با آسانی ملک مراد کے سر پر گرا سکتا تھا۔ وہ صرف نوٹوں کا دوست تھا۔ ملک مراد جیسے کئی ملک اور وڈیرے وہ اپنی سروس کے دوران انگلیوں پر نچا چکا تھا۔



حاکم علی نے عین وقت پر پہنچ کر قاسم کو بہت بڑے نقصان سے بچا لیا تھا۔ گزر اوقات کے لیے اس کے پاس اس زمین کے ٹکڑے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے گزارہ ہو رہا تھا۔ وہ اکثر سوچوں میں گم رہا کرتا تھا۔ اکلوتے بیٹے نے ہاتھ میں بندوق تھام کر بظاہر اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی مگر وہ جیسے تیسے کر کے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ جہانداد کے متعلق اسے نصیر کی زبانی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ پولیس سے بچ کر کسی انجانی منزل کی طرف نکل گیا ہے۔ وہ ہر رات بیٹے کا منتظر رہا کرتا تھا کہ شاید کسی طرح چھپ چھپا کر وہ ملنے کے لیے آ جائے مگر ہر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس کی یہ امید دم توڑ دیتی تھی۔ جب سے جہانداد مفرور ہوا تھا وہ اس کی صورت دیکھنے کے لیے ترس گیا تھا۔ سکینہ اور اس کی ماں الگ سے جہانداد کو یاد کیا کرتی رہتی تھیں۔ حاکم اور اس کی بیوی بھی ہر دوسرے تیسرے دن ان کے گھر کا چکر لگایا کرتے تھے۔ ان کا پہلا سوال جہانداد کے متعلق ہی ہوا کرتا تھا۔ جس کا جواب قاسم علی ہمیشہ سر کو مایوسی سے منفی انداز میں ہلا کر دیا تھا۔

آج شام کے وقت جب وہ دن بھر کا تھکا ہارا چارپائی پر لیٹا تو بہت اداس تھا۔ اسے شدت کے ساتھ جہاں داد کی یاد ستا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت خدیجہ باورچی خانے سے نکل کر اس کے پاس

پہنچی اور اس کے سامنے دھری دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے؟ آج تو نماز بھی نہیں پڑھی۔ خیر تو ہے کہیں خدانخواستہ تمہاری طبیعت تو نہیں خراب؟''

''نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں''۔ وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''سکینہ سے کہو کہ… لیے پانی رکھ دے''۔

''سکینہ گائے کا دودھ نکال رہی ہے، میں خود رکھ دیتی ہوں''۔ اتنا کہہ کر خدیجہ اٹھ… ہوئی اور وہ دوبارہ سوچوں میں غرق ہوگیا۔

اچانک ڈیوڑھی کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور وہ چونک اٹھا۔ پہلا… اسے یہی آیا کہ شاید ملک مراد کی جیپ ہوگی مگر پھر اس خیال کو اس نے خود ہی یہ سوچ کر مستر… کہ ملک مراد کو بھلا جیپ لے کر آنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرے گھر تک آنے کے لیے وہ… استعمال نہیں کرسکتا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی اور وہ متحیر… میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نگاہیں ڈیوڑھی کی طرف لگی ہوئی تھیں اور دل بے اختیار دھڑ… تھا۔ ایک دم ہی کسی انجانے خدشے نے اسے گھیر لیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے انسپکٹر نادر خان چار سپاہیوں کے ساتھ دندناتا ہوا اندر داخل ہوا اور ا… رنگ متغیر ہوگیا۔ پولیس والوں کے ارادے نیک نہیں لگتے تھے۔

''گھر کے ایک ایک کونے کی تلاشی لو''۔ اس کے قریب پہنچتے ہی انسپکٹر نے چاروں سپا… کو حکم دیا۔ ''کسی قسم کی سستی کا مظاہرہ مت کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا''۔

اس کا حکم سنتے ہی چاروں سپاہی مختلف اطراف میں پھیل گئے اور وہ حیران و پریشان کھڑ… ہوئے قاسم کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''با...... بات...... کیا ہے تھانیدار صاحب؟'' اس نے بمشکل لرزتی ہوئی آواز میں… کیا۔ ''آپ کسے تلاش کررہے ہیں؟''

''بھولے مت بنو بڑے میاں''۔ نادر خان نے غصے سے کہا۔ ''بول جہانداد کہاں ہے… ورنہ کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ مجھے مصدقہ اطلاع ملی ہے کہ وہ چوری چھپے گھر آتا رہتا ہے اور خط وغیرہ بھی بھیجتا رہتا ہے''۔

''خد...... خدا...... کی قسم یہ جھوٹ ہے''۔ وہ گڑگڑایا۔ ''آپ کو...... کسی نے غلط اطلاع دی ہے''۔

''بکواس مت کرو''۔ انسپکٹر گرج کر بولا۔ ''کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو؟ بولو انسپکٹر نادر…



بیوقوف سمجھتے ہو۔ سیدھی طرح بتادو نہیں تو بہت برا ہوگا''۔

''م...... میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں جناب؟'' قاسم نے گھبرا کر اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''خدا کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ جہانداد کہاں ہے؟''

''مجھے سچ اگلوانے کے بہت طریقے آتے ہیں بڈھے''۔ انسپکٹر نے اسے ایک چھڑی رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ میرا نام انسپکٹر نادر خان ہے۔ میں گونگوں کے حلق سے بھی سچ اگلوا لیتا ہوں تمہارے پاس تو پھر بھی بولنے والی زبان ہے تم کیسے سچ چھپا سکتے ہو؟'' انسپکٹر نے اسے دوبارہ چھڑی رسید کردی۔

چھڑی کھا کر قاسم کے منہ سے ایک کراہ نکلی مگر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ انسپکٹر اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں خدا کو یاد کررہا تھا۔

اسی دوران چاروں سپاہی واپس آگئے اور انسپکٹر ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ قاسم نے موقع پاتے ہی خدیجہ اور سکینہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں مگر وہ دونوں اسے نظر نہ آئیں شاید کسی کونے کھدرے میں چھپ گئی تھیں۔

انسپکٹر نے باری باری سب سپاہیوں سے استفسار کیا مگر انہیں جہانداد کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

''بیوقوفو!'' انسپکٹر انہیں ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ''تم نے جہانداد کے خطوط تلاش کرنے کی کوشش کی ہے؟ صندوق اور بکسے وغیرہ کھول کر دیکھے ہیں؟ بس گئے اور منہ اٹھا کر واپس آگئے''۔

''سر! بکسوں کو تو تالے لگے ہوئے ہیں''۔ ایک سپاہی نے صفائی پیش کی۔ ''باقی جگہیں ہم نے اچھی طرح چیک کی ہیں مگر کچھ نہیں ملا''۔

''کیا بکسے کھلوا نہیں سکتے تھے؟'' انسپکٹر چلایا۔ ''چابیاں نہیں تھیں تو تالے توڑ دیتے''۔

''سر! ہم نے تالے کھلوانے کی کوشش کی تھی لیکن......''

''لیکن کیا؟'' اس نے سپاہی کو درمیان سے ٹوک دیا۔

''وہاں اندر دو عورتیں ہیں سر''۔ سپاہی نے بتایا۔ ''انہوں نے ہمیں بکسوں کے نزدیک ہی نہیں جانے دیا۔ اب ہم عورتوں پر ہاتھ تو نہیں اٹھا سکتے تھے ناں! اس لیے واپس آگئے''۔

سپاہی کی بات ختم ہوتے ہی انسپکٹر دوبارہ قاسم پر چڑھ دوڑا۔ ''بڈھے کھوسٹ! میں تمہارے سارے خاندان کو حوالات میں بند کردوں گا۔ تم نے گھر کی عورتوں کو اتنا بھی نہیں سمجھایا کہ سرکاری کام میں مداخلت کرنا جرم ہے۔ چلو بکسے کھلوا کر تلاشی دو''۔

''تھانیدار صاحب! وہ ناسمجھ عورتیں ہیں''۔ قاسم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو

ساری بکسے کھول کر دکھا دیتا ہوں۔ ان میں جہانداد کا کوئی خط......"

"میں ایک قاتل کے باپ کی کوئی صفائی نہیں سننا چاہتا"۔ انسپکٹر نے اسے جھڑکا۔ "جلدی کرو"۔

وہ قاسم کی رہنمائی میں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے۔ داخل ہونے سے پہلے ہی انسپکٹر نے اپنی پتلون کی جیب سے چند تہہ شدہ کاغذ نکالے اور جلدی ایک سپاہی کو تھما دیے۔ قاسم ان کی اس کارگزاری سے لاعلم ہی رہا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی قاسم نے بیوی اور بیٹی کو ایک بغلی دروازے سے ملحقہ کمرے میں بھیج دیا اور پھر ایک ایک کر کے وہاں موجود تینوں بکسوں کے تالے کھول دیے۔

تالے کھلتے ہی انسپکٹر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے بکسوں کے اندر پڑے ہوئے کپڑے اور دیگر سامان الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔ انسپکٹر کی نگاہیں مطلوبہ سپاہی پر جمی ہوئی تھیں جبکہ قاسم حیران و پریشان ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔

"سر ادھر آیئے"۔ اچانک انسپکٹر کا مطلوبہ سپاہی بکسے سے ایک پوٹلی نکال کر چلایا۔ "خط یقیناً اسی پوٹلی کے اندر ہوں گے"۔

غالباً سپاہی نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے بکسے کے اندر ہی زیورات کی اس پوٹلی میں [illegible] کے دیے ہوئے کاغذ گھسیڑ دیے تھے۔

انسپکٹر نے تیزی سے آگے بڑھ کر سپاہی کے ہاتھ سے پوٹلی لے کر کھول دی۔ پوٹلی کے [illegible] زیورات کے ساتھ کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ زیورات کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور [illegible] میں پلاٹ گھومنے لگا۔ اس کے عیار دماغ نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ تقریباً کامیاب ہو چکا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ پوٹلی تھامے ہوئے قاسم کی طرف بڑھا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ جہا[illegible] تمہیں خط نہیں لکھتا مگر یہاں تو اس کے خطوط کے ساتھ ساتھ ڈکیتیوں میں لوٹے گئے زیورات موجود ہیں۔ آخر ہو نا ں ایک قاتل اور ڈاکو کے باپ"۔

"نہیں...... تھانیدار صاحب! خدا کے لیے"۔ وہ فریادی انداز میں گڑگڑایا۔ "یہ زیور[illegible] بیٹی کے ہیں ہم نے بڑی مشکل سے اور اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر بنوائے ہیں"۔

"صبر کرو بڈھے! ابھی پتا چل جائے گا کہ یہ زیورات کہاں سے آئے ہیں؟ جہاند[illegible] خطوط میں ساری تفصیل ہوگی"۔

اتنا کہہ کر اس نے ایک سپاہی کو فرضی خطوط پڑھنے کا حکم دیا۔

سپاہی نے جلدی سے ایک کاغذ کھولا اور پھر یوں ہونٹ ہلانے شروع کر دیے جیسے [illegible]



خط پڑھ رہا ہو۔ انسپکٹر پہلے ہی تمام سپاہیوں کو سارا منصوبہ سمجھا کر لایا تھا اس لیے اس کی توقع کے عین مطابق خط پڑھنے والا سپاہی ذرا دیر بعد پُرجوش انداز میں بولا۔ "ارے واقعی سر! اس خط میں صاف لکھا ہے کہ جہانداد ڈکیتیاں ڈالتا ہے اور یہ زیور بھی اس نے ایک ڈکیتی میں لوٹے ہیں۔ نہ جانے کس غریب کے ہیں؟"

"ہاں اب کیا کہتا ہے بڑے میاں؟" انسپکٹر نے تمسخر سے پوچھا۔ "یہ خطوط کون لاتا ہے اور جہانداد کہاں ہے؟ مجھے تو تم بھی اس کے شریکِ کار لگتے ہو"۔

"میں سمجھ گیا تھانیدار صاحب"۔ قاسم بالکل غیر متوقع طور پر اطمینان سے بولا۔ "آپ نے اچھا منصوبہ بنایا ہے زیورات ہضم کرنے کا مگر ہضم نہیں کر سکو گے۔ یہ حلال کی کمائی سے بنائے گئے ہیں اور میرا بیٹا ابھی زندہ ہے وہ......"

"بکواس مت کرو"۔ انسپکٹر اس کی زبان سے سچ سن کر ایک دم بھڑک اٹھا۔ "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم بھی جہانداد کے ساتھ ڈکیتی کی وارداتوں میں شامل ہو"۔

اتنا کہہ کر وہ سپاہیوں کی طرف پلٹا۔ "گرفتار کر لو اسے اور لے چلو تھانے وہیں اس سے نمٹ لیں گے"۔

اس کا حکم سن کر ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر قاسم کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اسی دوران بغلی دروازے سے خدیجہ اور سکینہ روتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور انہوں نے انسپکٹر کی منت سماجت شروع کر دی مگر انسپکٹر پر ان کی آہ و زاری کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے قاسم کو چھوڑنے سے قطعی انکار کر دیا۔

ذرا دیر بعد وہ قاسم کو پولیس جیپ میں بٹھائے تھانے کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

✢ ===✢=== ✢

جہانداد سے بری طرح شکست کھانے کے بعد سکندر انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ زندگی میں اس سے پہلے اس کی کبھی بھی اس قدر بے عزتی نہیں ہوئی تھی جتنی جہانداد کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ فطرتاً وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا۔ اس نے آج تک اپنے کسی دشمن کو معاف نہیں کیا تھا تو جہانداد کو کیسے کرتا۔ دوسرے دن ہی وہ اپنے دو ساتھیوں سے ملا اور اس نے جہانداد کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ ساتھیوں نے اسے بڑا سمجھایا کہ یہ معاملہ کسی نہ کسی طرح سردار فراست علی خان تک پہنچ جائے گا اور پھر ہم سب بے موت مارے جائیں گے لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس نے اپنے دوستوں کی ہر دلیل مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگ میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو کوئی بات نہیں میں اکیلا ہی یہ کام کر لوں گا لیکن مہربانی کر کے مجھے سردار صاحب سے مت

ڈراؤ''۔

''بات ساتھ دینے یا نہ دینے کی نہیں ہے سکندر''۔ شوکت نامی دوست نے اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ سردار صاحب کی ہے۔ اسے اگر پتا چل گیا تو کیا وہ ہمیں چھوڑے گا؟''

''تم کیا کہتے ہو حیدر؟'' سکندر نے دوسرے دوست سے پوچھا۔ ''میرا ساتھ دو گے یا شوکت کا؟''

''میرا جینا مرنا تو تم دونوں کے ساتھ ہے سکندر بھائی۔'' حیدر بولا۔ ''جو تم لوگ چاہو گے میں وہی کروں گا''۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ ایک دم جھنجھلا گیا۔ ''سیدھی طرح بتاؤ کس کا ساتھ دوگے''

''اسے کیوں ڈانٹتے ہو؟'' شوکت نے کہا۔ ''یہ ہم دونوں کا دوست ہے، اس لئے کسی کو ناراض نہیں کرسکتا''۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم دونوں میرا ساتھ دینا نہیں چاہتے؟'' سکندر ناراضی کے عالم میں بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں اکیلا ہی جہانداد کا قصہ تمام کردوں گا''۔

''ایک تو تمہاری یہ عادت بہت بری ہے''۔ شوکت نے مسکراتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔ ''بات بات پر عورتوں کی طرح منہ پھلا لیتے ہو۔ سمجھ نہیں آتی لوگ تمہاری کس چیز سے ڈرتے ہیں؟''

''مذاق چھوڑو شوکت''۔ وہ بدستور سنجیدگی سے بولا۔ ''میں تم دونوں کا فیصلہ سننے کے لیے منتظر ہوں۔ بولو کیا کہتے ہو۔ انکار یا اقرار؟''

''تمہیں کون انکار کرسکتا ہے؟'' شوکت نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں۔ بتاؤ کب چلنا ہے؟''

''آج رات''۔ سکندر نے گویا دھماکا کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اتنی جلدی؟'' شوکت نے چونک کر پوچھا۔ ''پہلے کوئی بے داغ منصوبہ سوچو۔ ہم گیدڑوں کا شکار کھیلنے نہیں جا رہے۔ جہانداد بہت چالاک شخص ہے، یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں''۔

''منصوبہ میں بنا چکا ہوں''۔ سکندر نے بتایا۔ ''تم دونوں اسی وقت میرے ساتھ چلو۔ شام ہونے والی ہے رات کا کھانا میرے ہاں کھالینا۔ وہیں میں تم دونوں کو منصوبے سے بھی آگاہ کر دوں گا''۔



''جیسے تمہاری مرضی''۔ شوکت نے کہا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں''۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں سکندر کے ساتھ اس کے گھر کا رخ کررہے تھے اور شوکت آنے والے وقت کے متعلق سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ ابھی سے اس کے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی نہ جانے آنے والے لمحات اسے کیا کیا منظر دکھانے والے تھے۔

✣ ===✣ ===✣

سکندر کو نشانہ بازی کے مقابلے میں شکست دینے کے بعد جہاں، جہانداد کو بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی وہاں وہ بہت زیادہ ہوشیار بھی رہنے لگا تھا۔ دوران سروس اسے یہی تربیت دی گئی تھی کہ دشمن چاہے جتنا بھی کمزور ہو اس کی طرف سے غافل نہیں رہنا ورنہ وہ انجانے میں وار کر جاتا ہے۔ اس اندیشے کو مدِنظر رکھتے ہوئے جہانداد نے پہلے دن ہی سونو کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ سکندر سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ ہماری غفلت سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔

سونو نے اسی دن اپنے ایک جاننے والے شخص کو سکندر کے معمولات پر نظر رکھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ فاروق نامی وہ شخص نہ صرف سونو کا پڑوسی تھا بلکہ اس کا بہت اچھا دوست بھی تھا۔ وہ روزانہ باقاعدگی کے ساتھ سونو اور جہانداد تک سکندر کی خبریں پہنچاتا رہتا تھا۔ اس میں دن رات کی کوئی تفریق نہیں تھی اسے جب بھی کوئی اہم خبر معلوم ہوتی تھی وہ دوڑتا ہوا سونو کے دروازے پر پہنچ جاتا تھا اور سب کچھ ان کے گوش گزار کردیتا تھا۔

اس روز فاروق نے جب سکندر کو شوکت اور حیدر کے ساتھ دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ سکندر کے گھر کے اردگرد گھومنے لگا۔ ان تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرتا رہا تاہم اس کی نگاہیں بدستور سکندر کے گھر کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں ابھی تک ان تینوں میں سے کوئی بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ جب چاروں طرف رات کی تاریکی پھیل گئی تو وہ ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا ایک بغلی گلی میں گھس گیا۔ اس تنگ سی گلی میں سکندر کی بیٹھک کا ایک دروازہ تھا جو اکثر بند رہتا تھا۔ بیٹھک کا اصل دروازہ گھر کی طرف کھلتا تھا اس لیے گلی والا دروازہ کبھی کبھار ہی انتہائی ضرورت کے تحت کھولا جاتا تھا۔

فاروق سن گن لینے کی امید میں احتیاط سے چلتا ہوا بیٹھک کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر کان لگا کر اس نے کچھ سننے کی کوشش کی مگر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی شاید اندر کوئی بھی موجود نہیں تھا یا اگر کوئی تھا بھی تو وہ خاموش تھا تاہم دروازے کی جھریوں سے نمودار ہونے والی روشنی دیکھ کر اسے امید بندھ گئی کہ جلد یا بدیر بیٹھک میں ضرور کوئی ہل چل مچے گی۔

چند لمحے وہ دروازے کے پاس ٹھہرا رہا مگر پھر آہستہ سے آگے بڑھ گیا کیونکہ زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ اس تاریک گلی میں کوئی بھی شخص اچانک نمودار ہو کر اس کے سر پر پہنچ سکتا اور پھر اسے مشکوک حالت میں دیکھ کر چونک سکتا تھا۔ وہ گلی کے موڑ تک جا کر واپس پلٹا اور محتاط انداز میں چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اس بار جب اس نے دروازے کے ساتھ کان لگائے تو اندر سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سکندر دونوں دوستوں کے ساتھ مل کر جہانداد اور سونو کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا رہا تھا اور یہ کام وہ آج رات ہی کر دینے والے تھے۔

ان کی باتیں سن کر فاروق کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سرایت کر گئی۔ یہ بہت اہم ... جہانداد اور سونو کی زندگیاں خطرے میں تھیں۔ انہیں بروقت اطلاع پہنچانا بہت ضروری تھا۔ ... بھی اب مزید کچھ سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی کچھ سوچ کر وہ عجلت میں چلتا ہوا سونو کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جہانداد اور سونو کے سامنے بیٹھا انہیں سکندر کے منصوبے سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ دونوں بڑے غور کے ساتھ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ جب فاروق انہیں سارا ... سنا چکا تو جہانداد نے سوال کیا۔

''وہ کتنی تعداد میں ہوں گے؟''

''میں نے اس کے ساتھ صرف حیدر اور شوکت کو دیکھا ہے''۔ فاروق نے بتایا۔ ''ہو سکتا ہے ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی سکندر کے ساتھ ہو''۔

''ٹھیک ہے میں انہیں دیکھ لوں گا''۔ جہانداد مطمئن انداز میں بولا۔ ''وہ کس ٹائم ... داخل ہوں گے؟''

''انہوں نے بارہ بجے کے بعد کا پروگرام بنایا ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ ''لیکن ان کا فیصلہ کوئی حتمی نہیں ہے اس میں ردوبدل بھی ہو سکتا ہے''۔

''فاروق! تمہارا بہت بہت شکریہ''۔ جہانداد نے احسان مندانہ انداز میں کہا۔ ''میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے''۔

''شکریہ کس بات کا؟'' وہ پُرخلوص لہجے میں بولا۔ ''تم سونو کے دوست ہو، اس نسبت میں بھی تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں پھر احسان کیسا؟ اس جنگ میں تم دونوں کا ساتھ دوں گا''۔

''نہیں''۔ جہانداد نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گا۔ سکندر کی دشمنی ... سے ہے میں خود ہی اس سے نمٹ لوں گا۔ تم دونوں کو میرا ساتھ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ...



تمام لوگوں کو اپنی دشمنی کی آگ میں نہیں جھونکوں گا''۔

''یہ آگ تو کب کی میرے گھر تک پہنچ چکی ہے''۔ سونو نے جواب دیا۔ ''میں تمہارا ساتھ دوں یا نہ دوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ سکندر جیسا کینہ پرور شخص زندگی بھر میرے پیچھے پڑا رہے گا۔ میں اس کے خوف کی وجہ سے تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا''۔

''ٹھیک ہے''۔ جہانداد نے کچھ سوچتے ہوئے۔ ''تم ایسا کرو کہ آج رات کے لیے گھر والوں کو کہیں اور بھجوا دو۔ اس دوران میں سکندر سے نمٹنے کا کوئی منصوبہ سوچتا ہوں''۔

تھوڑی دیر کے بعد سونو بیوی بچوں کو ان کے ننھیال پہنچا کر واپس آ گیا۔ فاروق ابھی تک جہانداد کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہ ان دونوں کا ساتھ دینے کے لیے بضد تھا لیکن سونو نے اسے سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا۔

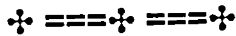
''ہاں اب بتاؤ کیا پروگرام بنایا ہے؟'' فاروق کے جانے کے بعد سونو نے سوال کیا۔

''بہت اچھا پروگرام بنایا ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ ''آج رات سکندر کی ساری غنڈہ گردی میں اس کی ناک کے راستے نکال دوں گا۔ وہ اگر زندہ بچ گیا تو ساری زندگی تمہارے سائے سے بھی دور بھاگے گا''۔ اتنا کہہ کر وہ اسے منصوبے کی تفصیل بتانے لگا۔

''واقعی بہترین منصوبہ ہے''۔ تفصیل سننے کے بعد سونو نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن چھت پر کیا ہم محفوظ رہیں گے؟''

''یہ سب مجھ پر چھوڑ دو''۔ وہ بے پروائی سے بولا۔ ''تم بس تماشا دیکھتے رہنا۔ آج رات سکندر کا وہ حشر کروں گا کہ عمر بھر کسی کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرے گا''۔

جہانداد کا جواب سن کر وہ مطمئن ہو گیا ویسے بھی وہ جہانداد کی صلاحیتوں کا معترف ہو چکا



منصوبے کے مطابق رات کے گیارہ بجتے ہی وہ دونوں ایک سیڑھی کے ذریعے کمرے کی چھت پر پہنچ گئے۔ چھت پر پہنچنے کے بعد سیڑھی انہوں نے اوپر کھینچ لی تھی۔ اسلحے کے طور پر جہانداد کے پاس سکندر والی آٹومیٹک گن، ایک ریوالور اور خنجر موجود تھا جبکہ سونو کے ہاتھ میں عام سی رائفل تھی۔ چھت پر جہانداد نے پہلے ہی سے فوجی تربیت سے کام لیتے ہوئے دو ایسے مورچے بنا رکھے تھے جن سے گولی ٹکرا تو سکتی تھی لیکن انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ سونو کو بھی اس نے مناسب ہدایات دے دی تھیں۔ جہانداد والا مورچہ سامنے والے کمرے کی چھت پر تھا جب کہ دوسرا مورچہ دائیں طرف والے کمرے کی چھت پر بنایا گیا۔ دونوں مورچے چھوٹی چھوٹی بوریوں میں مٹی بھر کر

بنائے گئے تھے۔ اس طرز کے مورچے عموماً فوجی بنایا کرتے ہیں۔

زندگی کے ان کٹھن لمحات میں فوجی تربیت قدم قدم پر جہانداد کے کام آ رہی تھی۔ قانون کے خلاف ہتھیار اٹھا کر اس نے بے شمار دشمن پیدا کر لیے تھے جو دن رات اس کی گھات میں رہتے تھے۔ اگرچہ زندگی اور موت کے فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں مگر اس میں کچھ نہ کچھ عمل دخل انسانی تدبیر کا بھی ہوتا ہے۔ گو کہ اپنی کسی بھی تدبیر سے وہ موت کے مقررہ وقت کو ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں کر سکتا لیکن کوشش پھر بھی جاری رکھتا ہے اور اس کی یہ کوشش آخری سانس تک جاری ہے۔

رات کے بارہ بجے تک وہ دونوں سامنے والے مورچے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ ان کی نگاہیں گھر کے بیرونی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کمروں کے عقب میں گلی واقع تھی۔ اس سے وہ بڑی حد تک محفوظ تھے۔ سکندرا اور اس کے ساتھی کمروں کی چھت پر چڑھنے کی جسارت کر سکتے تھے۔ انہیں بیرونی دروازے سے یا پھر دیوار پھاند کر آنا تھا۔ بارہ بجے کے بعد جہانداد نے سونو کو دوسرے مورچے میں بھیجتے ہوئے کہا۔

''جب تک میں گولی نہ چلاؤں تم نے کوئی کارروائی نہیں کرنی۔ ضرورت کے وقت گولی چلانا مگر یہ خیال رہے کہ ہم نے انہیں زخمی کرنا ہے جان سے نہیں مارنا''۔

''میں سمجھ گیا''۔ سونو نے اثبات میں سر ہلایا''۔ تم بے فکر رہو میری گولی سے کوئی نہیں مرے گا''۔

سونو کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد جہانداد دوبارہ بیرونی دروازے اور دیوار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس پر اضطرابی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے دشمن کس جانب سے وار کرے گا۔ ان کی تعداد کتنی ہو گی ان کے پاس ہتھیار کون کون سے ہوں گے؟ اس کے دماغ میں اَن گنت سوالات اٹھ رہے تھے لیکن ایک سوال کا جواب بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ ان تمام سوالات کے جوابات آنے والے وقت کے پاس تھے۔ وہ محض اندازے ہی قائم کر سکتا تھا کہ آنے والا وقت اپنے جلو میں اس کے لیے کیسے ہنگامے لا رہا ہے۔

وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اچانک اسے بیرونی دروازے کی طرف سے ایک کھٹکا سنائی دیا یوں جیسے کسی نے دروازے کی باہر والی کنڈی کو چھیڑا ہو۔ کھٹکے کی آواز سن کر اس نے سونو کو ہوشیار رہنے کا مخصوص اشارہ کیا اور پھر گن سیدھی کر کے دروازے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ آنکھیں سرچ لائیٹ کی طرح دروازے، دیوار اور صحن میں گھوم رہی تھیں۔ اعصاب تنے



تھے کہ جیسے کوئی خونخوار چیتا اپنے شکار پر جھپٹنے والا ہو۔ دل کی دھڑکن معمول سے کچھ تیز ہو گئی تھی۔ سونو کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی اس کے پورے جسم میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی شاید زندگی میں پہلی بار وہ ایسی صورتِ حال سے گزرنے والا تھا جس میں جان جانے کا خطرہ تھا تاہم جہانداد کی صحبت نے اسے لمحاتی طور پر انتہائی نڈر بنا دیا تھا۔ وہ رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازے اور دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس دوران دوبارہ بیرونی دروازے کی طرف سے ہلکی سی آواز گونجی اور جہانداد کی انگلی گن کے ٹریگر پر جم گئی دوسرے ہی لمحے ایک آدمی دروازے کے اوپر سے ہوتا ہوا صحن میں کودا اور دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے کی کنڈی کھولنے لگا۔ دروازہ کھلتے ہی گلی میں کھڑے ہوئے اس کے دوسرے ساتھی تیزی سے اندر آ گئے۔ فاروق کی اطلاع کے مطابق ان کی تعداد تین ہی تھی۔ اندر آنے کے بعد وہ تینوں محتاط انداز میں چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تینوں کے چہرے ڈھاٹوں میں چھپے ہوئے تھے اور وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ سکندرا اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے صاف پہچانا جا رہا تھا۔

جب وہ تینوں صحن کے درمیان میں پہنچ گئے تو جہانداد نے سکندر کو اونچی آواز میں للکارتے ہوئے کہا۔

''سکندر! ہتھیار پھینک دو ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔ تم تینوں اس وقت ہمارے نشانے پر ہو۔ اگر ذرا سی بھی ہوشیاری......''

جہانداد کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سکندر نے گن سیدھی کرتے ہوئے آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے تڑاتڑ فائرنگ شروع کر دی۔ اس کی پیروی کرتے ہوئے اس کے ساتھیوں نے بھی کمرے کی چھت کے جانب گولیاں داغنا شروع کر دیں۔

صورتِ حال کو اچانک بگڑتے دیکھ کر جہانداد نے چلا کر سونو کو تاکید کی۔ ''مورچے سے سر باہر مت نکالنا''۔

اس کی آواز سر کے اوپر سے گزرنے والی گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے ہم آہنگ ہو کر سونو کی کانوں تک پہنچ گئی۔ سونو دم سادھ کر دبک گیا اور جہانداد مورچے سے سر نکال کر حملہ آوروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو اندھادھند فائرنگ کر رہے تھے۔

سمت کا تعین کیے بغیر وہ نہایت ہی نڈر انداز میں کارروائی کر رہے تھے۔ جہانداد کے سر کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گولیاں گزر رہی تھیں مگر یہ صورتِ حال اس کے لیے کوئی نئی نہیں تھی، مشرقی پاکستان کے محاذ پر وہ بارہا ایسے حالات سے گزر چکا تھا۔ کئی بار تو اسے موت چھو کر گزر گئی تھی۔ دشمن

کی سینکڑوں گولیاں اس کے دائیں بائیں اور اوپر سے گزر رہی تھیں لیکن وہ کبھی نہیں گھ
اس کا ایمان تھا کہ موت کا ایک دن طے ہے وقت سے پہلے وہ اسے چھو بھی نہیں سکتی، جو رات قبر
آنی ہے وہ اپنے مقررہ وقت پر ہی آئے گی نہ ایک سیکنڈ پہلے اور نہ ایک سیکنڈ بعد میں۔

سینکڑوں دشمنوں سے بیک وقت لڑنے والے شیر کے سامنے گلی کے ان غنڈوں کی ح
ہی کیا تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ انہیں ڈرا دھمکا کر واپس بھیجنے کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن اب ان کی
دلیری دیکھ کر اس نے مصلحت پسند جہانداد کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ اب اس کے اندر وہ جہ
بیدار ہو چکا تھا جو دشمن پر قہر بن کر ٹوٹ پڑتا تھا اور منٹوں میں لڑائی کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا کرتا تھا۔

اندر کے وحشی انسان کے بیدار ہوتے ہی اس کی انگلی خود کار انداز میں گن کے ٹریگر
چلی گئی اور آٹو میٹک گن آگ اگلنے لگی۔ سکندر کے دونوں ساتھی دیکھتے ہی دیکھتے چھلنی ہو کر صحن میں
پڑے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سکندر ایک دم حواس باختہ ہو گیا۔ چند لمحے پہلے وہ شیر بن کر اس
میں داخل ہوا تھا مگر اب اسے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ جہانداد کی گولیوں سے
کے لیے وہ دوڑتا ہوا ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا لیکن دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔

دروازے پر تالا دیکھ کر وہ کھڑکیوں کی طرف بھاگا مگر دونوں کھڑکیاں اندر سے بند تھیں
پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا دوسرے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہاں بھی وہی عالم تھا۔ دوسرے
کمرے سے وہ تیسرے تک پہنچا لیکن اسے چھپنے کی جگہ نہ مل سکی۔ جھنجھلا کر وہ پلٹا اور نتائج کی
کیے بغیر بیرونی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

جہانداد نے اسے راہِ فرار اختیار کرتے دیکھ کر ایک بار پھر گن کو سیدھا کیا۔ تڑتڑ کی آواز
اور سکندر اچھل کر صحن کے درمیان میں منہ کے بل گر پڑا۔ اس کا جسم چند لمحوں کے لیے تڑپا اور
اپنے ساتھیوں کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی تھی لیکن اڑوس پڑوس کا کوئی بھی شخص ابھی تک
کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قبائلی علاقوں میں دن یا رات کسی وقت بھی فائرنگ
ہونا روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا۔ وہاں انسانی زندگیوں سے کھیلنا کوئی حیران کن بات
تھی۔ قتل و غارت گری وہاں کے مردانہ کھیل تھے۔ قانون کو وہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔
زندگیوں کے اہم فیصلے جرگوں کے ذریعے ہوا کرتے تھے اور یہ ان کے آج کے نہیں صدیوں
کے رسم و رواج تھے جو اسی شکل میں چلے آ رہے تھے۔

ان تینوں کے واصلِ جہنم ہوتے ہی جہانداد سونو کو ساتھ لے کر چھت سے نیچے اترا اور
باری ان سب کو چیک کرنے لگا۔ کسی میں بھی زندگی کی رمق باقی نہیں تھی۔ تینوں کے



لاشوں کے قریب ہی پڑے ہوئے تھے۔ جہانداد نے بغیر کسی ہتھیار کو چھیڑے سونو سے کہا۔ "ان
لاشوں کا کیا کرنا ہے؟ کہیں باہر پھینک آئیں یا پھر یہیں پڑی رہنے دیں؟"

"یہیں پڑی رہیں"۔ سونو نے جواب دیا۔ "یہاں کون سا پولیس نے آنا ہے؟ اب تو جرگہ
ہی اس واقعے کی تحقیق کرے گا"۔

"فیصلہ ان شاء اللہ ہمارے ہی حق میں ہوگا"۔ جہانداد مطمئن انداز میں بولا۔ "تمہیں
پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنی جانیں بچانے کے لیے انہیں مارا ہے"۔

"میں جانتا ہوں کہ جرگے کا فیصلہ ہمارے خلاف نہیں ہوگا"۔ سونو نے قدرے پریشان
انداز میں کہا۔ "تاہم سردار فراست علی خان ہمارے پیچھے پڑ سکتا ہے۔ سکندر اس کا خاص آدمی تھا وہ
شاید جرگے کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرے گا"۔

"کوئی پروا نہیں، بے شک نہ کرے"۔ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "مجھے اس سے
ڈرنے یا چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم شاید اسے اچھی طرح نہیں جانتے ہو"۔ وہ تنبیہی انداز میں کہنے لگا۔ "بہتر ہوگا کہ اس
سے "پنگا" مت لینا ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے،
بے تحاشا دولت کے ساتھ ساتھ غنڈوں کی پوری فوج ہے اس کے پاس اور غنڈے بھی ایسے جو کئی کئی
قتل کر چکے ہیں اس کا قانون کچھ نہیں بگاڑ سکا تو تم کیا کر لو گے؟"

"میں اس سے نمٹ لوں گا"۔ وہ اطمینان سے بولا۔ "تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں
ہے۔ میرا ہتھیار ظالموں کے خلاف اٹھا ہے اگر اوپر والے نے میری موت کسی ظالم وڈیرے، ملک
یا سردار کے ہاتھوں لکھی ہے تو تمہاری نصیحتیں مجھے نہیں بچا سکیں گی"۔

اس کے بعد وہ چند لمحوں تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے، پھر آرام کرنے کی غرض سے
ایک کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

-:- ===-:- ===-:-

قاسم گزشتہ کئی روز سے تھانے کے حوالات میں بند تھا۔ انسپکٹر نادر خان سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اسے انتقال پر انگوٹھا لگانے کے لیے مجبور کر رہا تھا مگر قاسم نے تو شاید قسم ہی کھائی تھی کہ وہ مر جائے گا مگر انتقال پر انگوٹھا نہیں لگائے گا۔ نادر خان نے کئی بار جھنجھلا کر اس پر تشدد بھی کیا تھا۔ جسمانی اذیت کے ساتھ اسے ذہنی اذیتیں بھی پہنچائی تھیں لیکن وہ تو پتھر بن چکا تھا۔ اس نے انسپکٹر کی کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ نادر خان کو اب یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ڈھیٹ بوڑھے کے ساتھ کرے تو کیا کرے۔ اس نے تو سوچا تھا کہ دو چار جھانپڑ کھا کر بوڑھا ڈھ جائے گا اور بلا چوں و چرا ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دے گا مگر اس نے تو شاید سر جھکانا سیکھا ہی نہیں تھا۔

انسپکٹر نادر خان کی نگاہوں میں بیس ہزار روپے کی وہ رقم گھوم رہی تھی جس کی پیش کش ملک مراد نے کی تھی۔ مفت میں ہاتھ آنے والی یہ رقم وہ کسی صورت میں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اگر وہ بیس ہزار روپیہ مل جاتا تو قاسم کے گھر سے ملنے والے زیورات اس کے لیے بونس ہو جاتے۔ وہ کا مانا ہوا حرام خور تھا۔ حرام کی کمائی سے اس نے شہر میں دو بنگلے بنا رکھے تھے۔ تیسرا بنگلہ بنانے کے لیے اس نے جو پلاٹ دیکھ رکھا تھا وہ بس چند روز کے بعد اس کے ہاتھوں سے نکلنے والا تھا۔ پراپرٹی ڈیلر نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ صرف پانچ دن مزید انتظار کر سکتا ہے، اگر ان پانچ دنوں کے اندر بیس ہزار روپے کا بندوبست ہو گیا تو پلاٹ اس کا ورنہ وہ پلاٹ دوسری پارٹی کا ہو جائے گا۔ دوسری پارٹی نے اسے بیس ہزار سے زیادہ کی پیش کش کر رکھی تھی۔ پراپرٹی ڈیلر صرف نادر خان سے خائف تھا ورنہ پلاٹ کب کا فروخت ہو چکا ہوتا۔

پراپرٹی ڈیلر کی طرف سے ملنے والی حتمی مہلت نے وقتی طور پر نادر خان کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ پلاٹ ہاتھ سے کھونے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے اس کا عیار دماغ اس مسئلے کو سلجھانے کے لیے تیزی سے سوچ رہا تھا۔ کوئی ایسا منصوبہ جو نہ صرف بے داغ ہو بلکہ ملک مراد کے لیے بھی قابلِ قبول ہو۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے ایک سپاہی کو آواز دی اور پھر کرسی سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔



"جی سر!" سپاہی فوراً دفتر کے اندر قدم رکھتے ہوئے بولا۔ "حکم کیجئے"۔

"فوراً جاؤ اور ملک مراد سے کہو کہ صاحب نے بلایا ہے"۔ اس نے سپاہی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "اگر پٹواری حویلی میں ہو تو اسے بھی ساتھ لیتا آئے ورنہ کسی کو بھیج کر پٹواری کو بلوا لے"۔

سپاہی "یس سر"۔ کہتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔

نادر خان بھی دفتر سے نکلا اور ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا حوالات کے دروازے پر پہنچ گیا۔ قاسم علی ایک دیوار سے ٹیک لگائے گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ویران آنکھوں سے مایوسی جھلک رہی تھی اور چہرے کی جھریوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ گزشتہ کئی روز سے وہ نادر خان جیسے درندے کے تشدد کا نشانہ بن رہا تھا۔ تشدد کرتے وقت نادر خان نے صرف اتنا ہی خیال رکھا تھا کہ اس کی ہڈی پسلی سلامت رہے باقی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

قاسم کا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کے منہ سے کراہیں نکل جاتی تھیں مگر وہاں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ تھانے کا کوئی بھی اہلکار نادر خان کے خوف کی وجہ سے اس سے ہمدردی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

نادر خان نے ایک لمحے کے لیے اسے گھور کر دیکھا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اسے خبر ہی نہ ہو سکی کہ انسپکٹر کی غضب ناک آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ اسے بے خبر بیٹھے دیکھ کر نادر خان نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی زور سے آہنی سلاخوں پر ماری تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا سوچا ہے تم نے بڈھے"۔ وہ بدتمیزی سے بولا۔ "انگوٹھا لگاؤ گے یا پھر ہڈیاں تڑوانی ہیں؟ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنی ناتواں جان پر رحم کرو"۔

"تم سو بار بھی پوچھو گے تو میرا جواب انکار میں ہو گا"۔ اس نے ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔ "تمہارا جو جی میں آئے کرو، میں تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ میرا بیٹا ابھی زندہ ہے، وہ میرا بدلہ ضرور لے گا"۔

"بکواس بند کرو کتے کی اولاد"۔ نادر خان چلا کر بولا۔ "میں تمہاری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ جس بیٹے کی دھونس تم مجھے دے رہے ہو وہ حرام کا پلا تو خود قانون سے بھاگتا پھر رہا ہے۔ وہ کیا مجھ سے بدلہ لے گا؟ میں خود اسے جہنم رسید کرنے کے لیے بے تاب ہوں"۔

"میں دعا کروں گا کہ اس کا اور تمہارا سامنا جلد ہو جائے"۔ قاسم نے عجیب ظریفانہ انداز میں کہا۔ "تاکہ تمہاری یہ بے تابی دور ہو جائے"۔

"مجھے تمہارا چیلنج قبول ہے بڈھے"۔ وہ بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "میں تمہاری یہ

خواہش ضرور پوری کروں گا، لیکن فی الحال تم اپنی خیر مناؤ اگر تم نے انتقال پر انگوٹھا نہ لگایا تو آ
جانتے ہو کیا ہوگا؟"

بات ادھوری چھوڑ کر وہ استہزائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوگا؟" نادر خان کی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی کمینگی دیکھ کر اس نے پریشانی کے عا
پوچھا۔ نادر خان نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بھونڈے انداز میں مسکرا کر کہا۔ "میں نے سنا ہے تمہ
بیٹی پر ٹوٹ کر جوانی آئی ہے۔ گاؤں کے کئی دل جلے اسے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ اس
جب میں نے تمہیں گرفتار کیا تھا تو شام کا اندھیرا پھیلنے والا تھا اس لیے میں تمہاری بیٹی کو ٹھیک طرح
نہیں دیکھ سکا تھا مگر اب لوگوں سے اس کے حسن کے چرچے سن کر میں بے تاب ہو گیا ہوں۔ اس
میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آج رات تمہاری بیٹی کے ساتھ جشن مناؤں گا"۔

نادر خان کا جواب سن کر پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ سکینہ کی جان و عزت خطرے میں ہے۔
خان جیسے بھیڑیے سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ سکینہ کو آسانی سے اٹھا کر تھانے لا سکتا تھا۔ اس کے
پر قانون کی وردی تھی۔ اسے روکنے کی کوئی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرح سے وہ علاقے
سیاہ سفید کا مالک تھا۔ خاکی وردی میں چھپے ہوئے اس شیطان کے منہ لگنا آسان نہیں تھا۔ اسے
علی کی طرف سے مزاحمت کا بھرپور یقین تھا مگر وہ اکیلا نادر خان سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ نادر خان کے پا
نہ صرف قانون کی طاقت تھی بلکہ ملک مراد جیسا بااثر اور طاقتور شخص بھی اس کی پشت پر تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو بڑے میاں؟" نادر خان نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔ "صرف ایک انگو
لگانے سے تمہاری بیٹی کی عزت بچ سکتی ہے۔ ابھی ایک گھنٹے کے بعد ملک صاحب اور پٹواری آ جا
گے۔ اچھی طرح سوچ لو تمہارے پاس ایک گھنٹے کی مہلت ہے"۔ اتنا کہہ کر نادر خان بغیر اس کا جواب
سنے واپس پلٹ گیا۔

"سؤر کی اولاد، کمینہ، کتا"۔ اس کے جانے کے بعد قاسم نے خود کلامی کے انداز میں دل
بھڑاس نکالی۔ نادر خان واپس دفتر میں پہنچا تو وہاں حاکم علی اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر نادر خان
تیوری پر بل پڑ گئے۔ اسے اپنا منصوبہ خاک میں ملتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ عین موقع پر اسے حاکم کی آمد
ناگوار گزر رہی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ حاکم علی بھائی سے ملاقات کرنے کے لیے آیا ہے۔ وہ نہیں چا
تھا کہ وہ بھائی سے ملاقات کرے اور اس کی سازش ابتدائی مرحلے میں ہی ناکام ہو جائے۔

"کیوں آئے ہو یہاں؟" اسے ایک نظر گھورنے کے بعد نادر خان نے کاٹ کھانے وا
انداز میں سوال کیا۔ "یہ تھانہ ہے، کوئی گاؤں کا چوپال نہیں ہے کہ جب جی چاہا منہ اٹھا کر چلے آئے"
"تھانیدار جی! میں بھائی صاحب سے ملنے کے لیے آیا ہوں"۔ اس نے گزارش کی۔ "مہر



فرما کر مجھے اس سے ملنے دیں۔ دراصل اس کی بیوی سخت بیمار ہے"۔

"بیوی بیمار ہے تو اسے کسی ڈاکٹر حکیم کے پاس لے جاؤ"۔ نادر خان نے بدستور درشت لہجے میں کہا۔ "یہاں کیا لینے آئے ہو؟ اٹھو دفع ہو جاؤ"۔

"کچھ خدا کا خوف کریں تھانیدار صاحب"۔ وہ منت کرتے ہوئے بولا۔ "ایک تو تم نے اسے بے گناہ پکڑ کر بند کر لیا ہے اور اب ملنے پر بھی پابندی لگا رہے ہو"۔

"بکواس مت کرو"۔ نادر خان ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "وہ پکا واردا تیا ہے۔ اپنے قاتل اور مفرور بیٹے کے ساتھ مل کر ڈکیتیاں کرتا ہے۔ میں نے اسے ثبوتوں کے ساتھ گرفتار کیا ہے"۔

"اگر وہ مجرم ہے تو پھر اسے عدالت میں پیش کیوں نہیں کرتے؟" حاکم علی نے ناگوار انداز میں سوال کیا۔ "آج دس دن ہو گئے ہیں اسے حوالات میں بند ہوئے"۔

"تم...... تم مجھے قانون سکھاؤ گے"۔ چھڑی اٹھا کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "انسپکٹر نادر خان کو جس کا نام سن کر بڑے بڑوں کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ غصے سے پھنکارتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

عین اسی وقت ملک مراد نے دفتر کے اندر قدم رکھا اور نادر خان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"کیا بات ہے نادر خان؟" ملک مراد نے ایک نظر سہمے ہوئے حاکم علی پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا، کیا ہے اس بے چارے نے جو تم اتنا غصے ہو رہے ہو؟"

"ملک صاحب!" نادر خان کے بولنے سے پہلے ہی حاکم علی بول پڑا۔ "تھانیدار صاحب میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ میں یہاں بھائی سے ملاقات کرنے کے لیے آیا ہوں مگر یہ اجازت نہیں دے رہے"۔

"کیوں نادر خان؟" ملک مراد دوبارہ انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "یہ حاکم علی کیا کہہ رہا ہے بھئی۔ تم اسے اس کے بھائی سے کیوں ملنے نہیں دے رہے؟ ملاقات کرنا تو ملزم کے رشتہ داروں کا قانونی حق ہے"۔

"ملک صاحب! اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ......"

"بس بس رہنے دو"۔ ملک مراد نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا اور پھر حاکم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جاؤ اور اپنے بھائی سے ملاقات کر لو لیکن زیادہ دیر نہیں لگانا۔ دیکھ رہے ہو نا انسپکٹر صاحب کا پارہ چڑھا ہوا ہے"۔

"یہ...... یہ کیا کر رہے ہو ملک صاحب؟" نادر خان جھنجھلا کر بولا۔ "آخر قانون بھی کوئی چیز

ہے۔یوں ہر روز مجرم کے رشتہ دار ملاقاتوں کے لیے آتے رہے تو پھر اس تھانے میں میری... رہ جائے گی“۔

نادر خان عجیب کش مکش کا شکار ہو گیا تھا حاکم علی کے سامنے وہ ملک مراد کو کسی طرح... سکتا تھا۔اس نے چند غیر محسوس اشارے بھی کیے تھے مگر ملک مراد حاکم علی کی طرف متوجہ تھا۔

”تمہاری اوقات کو کچھ نہیں ہو گا یار“۔ملک مراد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔”تم... معمولی سی بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو......“

”یہ معمولی سی بات نہیں ہے“۔وہ زچ ہو کر چلایا۔”میں......میں تمہیں کیسے سمجھاؤں... اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہو“۔

”تم صاف صاف مجھے بتا کیوں نہیں دیتے؟“ ملک مراد کو بھی ایک دم غصہ آ گیا۔... کیوں بجھوا رہے ہو؟“ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الجھتے دیکھ کر حاکم علی چپکے سے وہاں... اور پھر تیزی سے حوالات کی طرف روانہ ہو گیا۔دونوں کو خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ جس کی... دوسرے کے منہ لگ رہے ہیں وہ وہاں سے جا چکا ہے۔

حوالات کے سامنے ایک سنتری بادشاہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو وہ چلایا...

”سنتری بادشاہ! میں اجازت لے چکا ہوں“۔

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور سنتری بادشاہ دوبارہ ایک بنچ پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔شاید... تھکاوٹ دن میں اتار رہا تھا۔

حاکم علی کو اپنے سامنے دیکھ کر قاسم فوراً اٹھا اور سلاخیں تھام کر بولا۔”تم بہت اچھے موقع... ہو، تھوڑی دیر پہلے میں تم سے ملنے کی دعائیں مانگ رہا تھا“۔

”کیوں......بات کیا ہے؟“ اسے ہراساں دیکھ کر حاکم علی نے جلدی سے سوال کیا۔... تھانیدار نے آپ کو دوبارہ تو......“

”نہیں نہیں......یہ بات نہیں ہے“۔اس نے جلدی سے قطع کلامی کی۔”دراصل تھانیدار... پر اتر آیا ہے“۔اتنا کہہ کر اس نے حوالات سے باہر دائیں بائیں ایک محتاط سی نگاہ ڈالی اور... آواز میں گویا ہوا۔”حاکم علی! یہ تھانیدار بہت حرامی قسم کا بندہ ہے۔انتقال پر زبردستی انگوٹھا لگو... لیے اس نے مجھے ایک ایسی دھمکی دی ہے کہ بتاتے ہوئے زبان میرا ساتھ نہیں دیتی۔دل... زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں......“

”بھائی صاحب!“ حاکم التجائیہ انداز میں بولا۔”میں بڑی مشکل کے ساتھ یہاں... تک پہنچا ہوں۔ابھی تھانیدار میرے پیچھے آنے ہی والا ہو گا۔آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے جلدی...



دیں۔میرے پاس وقت بہت کم ہے“۔

”ہاں ہاں......وقت تو واقعی کم ہے“۔وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہنے لگا۔”تم ایسا کرو کہ سکینہ کو فوراً فتح پور سے کہیں دور لے جاؤ، جہاں یہ کمینہ تھانیدار نہ پہنچ سکے۔وہ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے دھمکی دے چکا ہے، سکینہ کی عزت اور جان خطرے میں ہے، جلدی کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔اس پاپی نے مجھے ایک گھنٹے کی مہلت دی ہے“۔

”تھانیدار کی ایسی کی تیسی“۔وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔”کوئی جنگل کا قانون ہے۔میں اسے مار ڈالوں گا۔حرام زادہ خود کو سمجھتا کیا ہے۔میں ابھی اسے دیکھ لیتا ہوں“۔

”بیوقوف مت بنو“۔وہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔”جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔تم نے اگر یہاں کوئی گڑبڑ کی تو وہ تمہیں بھی کوئی الزام لگا کر بند کر دے گا“۔

”بھائی صاحب! بزدلی کی باتیں مت......“

”یہ بزدلی نہیں ہے احمق“۔اس نے زچ ہو کر اسے ٹوکا۔”وقت کا تقاضا ہے۔سمجھنے کی کوشش کرو۔ابھی بازی تھانیدار اور ملک مراد کے ہاتھ میں ہے۔ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔تم فوراً سکینہ کو لے کر گاؤں سے نکل جاؤ۔سیدھا نصیر بھائی کے ہاں چلے جانا۔سکینہ کو وہاں چھوڑ کر جہانداد کی تلاش میں نکل جانا۔مجھے یقین ہے کہ تم کوشش کر کے اسے تلاش کر لو گے۔ملنے پر سب کچھ اسے سچ سچ بتا دینا بلکہ میری طرف سے اسے یہ حکم دے دینا کہ تھانیدار اور ملک مراد کو عبرت کا نشان بنا دے“۔

”چلو ٹھیک ہے لیکن آپ کا کیا بنے گا؟“ اس نے رضامند ہوتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔”وہ ناکام ہو کر سارا غصہ آپ پر اتار دیں گے۔آپ کی جان بھی لے سکتے ہیں“۔

”تم میری فکر چھوڑو“۔وہ اس کے خدشے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔”وہ اپنا پورا زور لگا کر بھی ناکام رہیں گے۔میں ان کے ارادے کبھی پورے نہیں ہونے دوں گا“۔

”میں جانتا ہوں بھائی صاحب“۔اس نے مغموم انداز میں کہا۔”آپ ان کا ہر ظلم برداشت کر لیں گے مگر آپ کو اس حال میں چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔آپ ان کی بات مان کیوں نہیں لیتے؟ یہ زمین جائیداد انسان کی جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے“۔

”زمین......ماں ہوتی ہے کسان کی حاکم علی“۔وہ جوش میں آ کر بولا۔”اور کوئی بیٹا اپنی جان بچانے کے لیے ماں کا سودا نہیں کرتا۔تمہارا یہ مشورہ میرے لیے ناقابلِ قبول ہے۔بس اب تم جاؤ، وقت ضائع مت کرو“۔

”ٹھیک ہے“۔وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا روانہ ہو گیا۔

حاکم علی تیز تیز چلتے ہوئے تھانے کے صدر دروازے کی طرف بڑھا مگر اس دوران
اور ملک مراد اپنے منصوبے کو حتمی شکل دے چکے تھے۔ دراصل حاکم علی کے دفتر سے نکلتے ہی
خان نے پورا پلان ملک مراد کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ملک مراد کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو
اس وقت تک حاکم علی حوالات کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ ایسے میں انہوں نے اسے کچھ
سے گریز کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اب تک قاسم نے بھائی کو بتا دیا ہوگا کہ تھانیدار کون سا
چاہتا ہے۔

حاکم علی کے جانے کے بعد ہی نادر خان نے ایک دوسرا منصوبہ بنالیا تھا اور منصوبہ یہ تھا
علی کو تھانے سے باہر جانے ہی نہ دیا جائے۔ کوئی بھی الزام لگا کر اسے گرفتار کرلیا جائے۔ اس
ہی قاسم علی کی بیٹی کو اٹھانے کا پروگرام بنایا جائے تاکہ کوئی مزاحمت کرنے والا باقی نہ رہے۔

منصوبے کے مطابق جب حاکم علی تھانے کے صدر دروازے پر پہنچا تو دو سپاہیوں نے
روک لیا۔

"چلو تمہیں صاحب نے بلایا ہے"۔ ایک سپاہی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"کیوں؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "صاحب کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے؟"

"یہ تم صاحب سے چل کر پوچھنا"۔ سپاہی نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "ہمیں کچھ معلوم
ہے"۔

"اگر میں نہ جاؤں تو......"

"تو ہم تمہیں زبردستی پکڑ کر لے جائیں گے"۔ سپاہی اس کی بات پوری ہونے سے قبل
پڑا۔

صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی حاکم علی دروازے کی طرف بھاگا مگر سپاہی
طرف سے غافل نہیں تھے، انہیں اس ردِعمل کی پہلے سے توقع تھی۔ دونوں سپاہیوں نے تیز
حرکت کرتے ہوئے اسے دروازے سے نکلنے سے پہلے ہی چھاپ لیا۔ ایک سپاہی نے اسے
سے بازوؤں میں جکڑ لیا اور دوسرے کے ہاتھ میں اس کا گریبان آگیا۔

"چھوڑ دو مجھے"۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلایا۔ "میں...... میں گھر
ہوں۔ میں تھانیدار کے پاس نہیں جاؤں گا۔ وہ ملک مراد کے ساتھ ملا ہوا ہے"۔

وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چلا رہا تھا مگر سپاہی سنی ان سنی کرتے ہوئے اسے دفتر
گھسیٹ رہے تھے۔ حکم کے ان غلاموں پر اس کی فریاد بے اثر ثابت ہو رہی تھی۔ ان کا کا
تھا۔ اشاروں پر چلنے والے روبوٹ احساسات و جذبات سے عاری ہوتے ہیں، ظالم



گناہگار و بے گناہ کا فرق انہیں کب معلوم ہوتا ہے؟ انہیں تو اوپر سے جو حکم ملتا ہے وہ وہی کرتے ہیں
چاہے کسی کا بھلا ہو یا برا، اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

جب حاکم علی کی مزاحمت حد سے تجاوز کرنے لگی تو سپاہیوں نے اسے لاتوں اور ٹھڈوں پر رکھ
لیا۔ ایسے ہی وقت حاکم علی کا ہاتھ ایک سپاہی کے گریبان پر پڑا اور "چھرر" کی آواز کے ساتھ اس کی
قمیص پھٹتی چلی گئی۔

تھانے کے احاطے میں قانون کے ایک محافظ کے ساتھ اس کی یہ جسارت ناقابلِ معافی تھی۔

دفتر میں بیٹھے ہوئے نادر خان نے کھڑکی سے جب یہ نظارا دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
ارنے بھینسے کی طرح وہ پھنکارتا ہوا دفتر سے باہر نکلا اور حاکم علی پر جھپٹ پڑا۔ منہ، ناک، دیکھے بغیر وہ
اسے انتہائی ظالمانہ انداز میں پیٹ رہا تھا۔ حاکم علی مار کھاتے ہوئے چلا رہا تھا، اس کی منتیں کر رہا تھا،
اسے خدا اور رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا مگر نادر خان اس کی کسی فریاد کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ سچ
کہتے ہیں کہ قانون اندھا ہوتا ہے، نادر خان بھی اس وقت اندھا ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں پر ملک مراد
کے دیے ہوئے نوٹوں کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی نظر نہیں آتی لیکن قانون کے رکھوالوں کو پھر بھی
اندھا کردیتی ہے۔ ایسے ہی وقت دولت کو سلام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ داد دینے کو من کرتا ہے، دلوں
کو ایسے مسخر کرتی ہے کہ بڑے بڑے فاتح حیران رہ جاتے ہیں۔

نادر خان اسے مارنے کے ساتھ ساتھ غلیظ گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔ پولیس کی مروجہ گالیوں کا
اس کے پاس نہ ختم ہونے والا اسٹاک تھا۔ ٹھڈے، لاتیں اور چھڑیاں کھاتے کھاتے آخرکار حاکم علی
بے ہوش ہوگیا۔ اب اسے ٹھڈوں اور لاتوں کی کوئی تکلیف نہیں تھی، کبھی کبھی بے ہوشی بھی ایک نعمت
بن جاتی ہے جیسے اس وقت حاکم علی کے لیے بن گئی تھی۔

"اٹھا کر لے جاؤ اس سؤر کی اولاد کو"۔ نادر خان اسے آخری لات رسید کرتے ہوئے ہانپ کر
دونوں سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "جا کر حوالات میں پھینک دو، میں دیکھتا ہوں اسے کون چھڑانے
کے لیے آتا ہے۔ ایسا پرچہ کاٹوں گا کہ حرام زادہ تین برس تک جیل میں چکی پیستا رہے گا۔ ماں کا خصم
قانون کے گریبان پر ہاتھ ڈالتا ہے"۔

نادر خان کا حکم سنتے ہی سپاہیوں نے بے ہوش پڑے ہوئے حاکم علی کو ڈنڈا ڈولی کیا اور جا کر
حوالات کے ٹھنڈے فرش پر پھینک دیا۔ وہ ملاقاتی بن کر آیا تھا اور اب قیدی بن کر دیناومافیہا سے بے
خبر ہو کر پڑا تھا۔

نادر خان ہانپتا ہوا دوبارہ دفتر میں داخل ہوا اور اپنی سیٹ پر گر گیا۔ ہانپتے ہوئے اس کی غیر
معمولی توند ایک تواتر کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پیٹ پر کسا ہوا بیلٹ

ڈھیلا کیا اور سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ اس کی چڑھی ہوئی سانس دیکھ کر لگتا تھا جیسے سو میٹر کی ریس میں حصہ لے کر آیا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک سپاہی پانی کا جگ لے کر اندر داخل ہوا اور گلاس بھر کر نادر خان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ نادر خان نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ سپاہی نے گلاس بھرا، پھر سہ بارہ بھرا۔ یکے بعد دیگرے تین گلاس پینے کے بعد نادر خان کی حالت سنبھل گئی۔ اب وہ بڑی حد تک مطمئن نظر آ رہا تھا۔

ملک مراد جو بڑے غور و خوض سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ اس کے سنبھلتے ہی بولا۔ "میرے خیال میں تو قاسم علی کی بیٹی کو اٹھانے کا پروگرام کچھ روز کے لیے ملتوی کر دینا چاہیے"۔

"نہیں"۔ نادر خان نے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ پروگرام ملتوی نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں تمہیں کوئی جلدی نہیں ہے لیکن مجھے ہے، چند روز کے بعد تو وہ پلاٹ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا"۔

اس کا جواب سن کر ملک مراد نے تھوڑی دیر کے لیے چپ سادھ لی۔ شاید اس کے اندر کوئی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر نادر خان نے سوال کیا۔ "کہیں قاسم کے مفرور بیٹے سے خوفزدہ تو نہیں ہو گئے ہو؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے"۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "دراصل ہم دیہاتی لوگ بہو بیٹی پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسے بزدلی تصور کیا جاتا ہے"۔

"ارے چھوڑو ملک صاحب"۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہاری سوچ پر افسوس ہو رہا ہے۔ غریبوں کی بہو بیٹیاں تو ہوتی ہی ہم جیسوں کی تسکین کے لیے ہیں۔ ایک وڈیرے کو اپنا رعب دبدبہ قائم رکھنے کے لیے ایسے کام کرنا پڑتے ہیں ورنہ گاؤں کا ہر دوسرا نوجوان جہانداد کی طرح تمہیں آنکھیں دکھانے لگے گا۔ ویسے بھی جہانداد کو سبق سکھانے کے لیے یہ کارروائی ناگزیر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب اسے واقعے کے بارے میں معلوم ہو گا، وہ اندھا دھند گھر کی طرف بھاگے گا۔ تب میں اسے باآسانی پولیس مقابلے میں پار کر دوں گا۔ یہ سارا منصوبہ میں نے تمہارے بھلے کے لیے بنایا ہے"۔

نادر خان کی شخصیت میں تمام برائیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اپنی چرب زبانی سے کام لے کر اس نے لمحوں میں ملک مراد کو قائل کر لیا۔ منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ملک مراد نے پٹواری کو لانے کے لیے فوراً جیپ بھجوا دی تھی۔

پٹواری کے پہنچنے کے بعد انہوں نے منصوبے کو حتمی شکل دی اور پھر نادر خان چار سپاہیوں کو



ساتھ جیپ لے کر فتح پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد وہ قاسم علی کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر انہیں دستک دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ دروازہ پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔ نادر خان چاروں سپاہیوں کے ساتھ دندناتا ہوا اندر داخل ہوا اور پھر سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے بولا۔ "اچھی طرح تلاشی لو پورے گھر کی۔ وہ حرامزادہ یہیں کہیں چھپا ہو گا"۔

پولیس والوں کو دیکھ کر وہ ماں بیٹی ویسے ہی حواس باختہ ہو چکی تھیں۔ نادر خان کا حکم سن کر تو ان کی آدھی جان ہی نکل گئی۔

"تھانیدار جی! کیا بات ہے؟" قاسم علی کی بیوی خدیجہ نے سہمے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"جہانداد کو کہاں چھپا رکھا ہے تم ماں بیٹی نے؟" نادر خان نے الٹا سوال کر دیا۔ "جلدی بتاؤ ورنہ میں تمہاری بیٹی کو گرفتار کر کے لے جاؤں گا"۔

"خدا کی قسم ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے"۔ وہ پریشانی کے عالم میں بولی۔ "تم گھر کی تلاشی لے سکتے ہو وہ اگر......"

"بڑی بی!" اس نے گرج کر قطع کلامی کی۔ "میں یہاں سچ سننے کے لیے آیا ہوں۔ تم شاید نہیں جانتی ہو کہ پولیس کے سامنے غلط بیانی کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ بولو...... سچ سچ بتاؤ۔ تمہارا بیٹا کہاں چھپا ہوا ہے؟ ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا"۔

"تھانیدار صاحب!" اچانک سکینہ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری آمد کا مقصد جان گئی ہوں لیکن اب اس گھر میں کچھ بھی باقی نہیں بچا، سب کچھ تو تم پہلے ہی لوٹ کر لے گئے ہو"۔

"واہ سوہنیے واہ......" وہ لوفرانہ انداز میں بولا۔ "دل خوش ہو گیا تمہارا جواب سن کر، ایک قاتل اور مفرور کی بہن کو ایسا ہی دلیر ہونا چاہیے تھا مگر تم ایک بات بھول رہی ہو کہ ابھی اس گھر کی سب سے قیمتی چیز باقی ہے اور وہی چیز تو میں لوٹنے کے لیے آیا ہوں"۔

نادر خان کا جواب سن کر سکینہ کو ایک دم خطرے کا احساس ہوا۔ وہ اس کا اشارہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ نادر خان اسے یوں ندیدے پن سے دیکھ رہا تھا جیسے زندہ ہی نگل جائے گا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ خود میں سمٹ کر رہ گئی لیکن اس نازک وقت میں یوں سمٹنے سے کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ اسے اپنی عزت بچانے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا تھا۔ تھانیدار کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ معاف کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ مجسم شیطان نظر آ رہا تھا۔

سکینہ نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کیا اور پھر بیرونی دروازے کی طرف دوڑ لگا

دی۔

نادر خان کو اس سے اتنی جرأت کی توقع نہیں تھی اس لئے اس کے سنبھلنے تک سکینہ نے ... قدم کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ نادر خان نے اس کے پیچھے بھاگنے کی بجائے سرعت کے ساتھ ریوالور نکالا اور دوڑتی ہوئی سکینہ کے دائیں بائیں دو فائر جھونک دیے۔ گولیاں اس کے کان کے پاس سے گزری تھیں مگر دھماکوں کی آواز سن کر اس نے ایک چیخ ماری اور دہشت زدہ ہو کر منہ کے بل گر پڑی۔ خدیجہ نے گڑگڑاتے ہوئے نادر خان کے پیر پکڑ لیے تھے اور چاروں سپاہی بھی فائرنگ سن کر بوکھلا کر باہر نکل آئے۔ ان چاروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مسلح ہونے کے باوجود ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ غالباً انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جہانداد آ گیا ہے۔

نادر خان کو سلامت کھڑے ہوئے دیکھ کر انہوں نے اطمینان کی سانس لی اور جواب طلب انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، اس ماں کو پکڑ و ورنہ دوبارہ بھاگ جائے گی''۔ نادر خان ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ''وہ سامنے پڑی ہوئی ہے۔ جلدی کرو''۔ اس نے گری ہوئی سکینہ کی طرف اشارہ کیا۔

اتنا کہہ کر اس نے قدموں میں سسکتی ہوئی خدیجہ کو ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ ''بڑی بی! مجھے سیدھے واسطے مت دو۔ ایک ڈاکو اور قاتل کی ماں میرے نزدیک کسی رحم کی مستحق نہیں ہو سکتی''۔

''تمہیں...... خدا کا واسطہ...... میری بیٹی کو مت مارو''۔ خدیجہ اس کی ٹھوکر کھانے کے باوجود وہاں سے نہ ہٹی۔ ''اسے جہانداد کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ ہم یہ گاؤں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کرو ہم...... ہم بہت غریب اور چھوٹے لوگ ہیں''۔

''غریب اور چھوٹے لوگ تیرے بیٹے کی طرح قتل کرتے نہیں پھرتے''۔ نادر خان نے دوسری بار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ملکوں اور وڈیروں سے دشمنیاں نہیں پالتے بلکہ ان کے ڈھور ڈنگر چراتے ہیں۔ ان کی زمینیں کاشت کرتے ہیں، ان کی ''مٹھی چاپی'' کرتے ہیں''۔

اس دوران چاروں سپاہی سکینہ کو پکڑ کر لے آئے تھے۔ خوف اور دہشت سے وہ کانپ رہی تھی۔ یوں جیسے اس نے موت کے فرشتے کو دیکھ لیا ہو۔ نادر خان ان کمزور اور اکیلی عورتوں کے لیے موت کا فرشتہ ہی تو تھا۔ اس کی بے رحم آنکھوں میں ان ماں بیٹی کے لیے رحم کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔

خدیجہ بدستور سسکیوں میں روتے ہوئے نادر خان کو واسطے دے رہی تھی لیکن ... والے کان نادر خان کے پاس کہاں تھے؟ اس کی سماعت و بصارت تو ملک مراد کے پاس ...



... اس کے دل و دماغ پر تو بیس ہزار روپے کے نوٹ چھائے ہوئے تھے۔

نادر خان چند لمحے تو کانپتی ڈرتی سکینہ کو گھورتا رہا۔ پھر سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے بولا۔ ''اس ... تھانے لے چلو۔ میں دیکھتا ہوں جہانداد کیسے خود کو قانون کے حوالے نہیں کرتا''۔

''نہیں''۔ خدیجہ چیختے ہوئے ہوئے دوبارہ نادر خان کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ''خدا کے لیے ظلم مت کرو، جہانداد کے جرم کی سزا میری بیٹی کو مت دو۔ ہمارے پاس عزت کے سوا اور کچھ نہیں ... تمہیں خدا کا واسطہ ہماری عزت کو مٹی میں نہ ملاؤ...... میری...... میری بیٹی کو چھوڑ دو''۔

''آنسو مت بہاؤ مکار بڑھیا''۔ ایک جھٹکے سے وہ اپنے پاؤں چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا بیٹا جب تک خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہیں کرتا تب تک اس کی بہن انسپکٹر نادر خان کی مہمان بن کر رہے گی۔ بیٹے تک پیغام پہنچا دو کہ اگر بہن کی عزت پیاری ہے تو سر کے بل چل کر تھانے پہنچ جائے ورنہ ......''

اس نے سکینہ پر پُر ہوس نگاہیں ڈالتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سکینہ کو بالکل چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ یوں خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جیسے ذہنی توازن کھو بیٹھی ہو۔ حتیٰ کہ جب سپاہی اسے پکڑ کر بیرونی دروازے کی طرف جانے لگے تو بھی اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ وہ یوں چل رہی تھی جیسے کسی تنویمی عمل کے زیر اثر ہو یا پھر کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے احساسات و جذبات کھو بیٹھی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ سکینہ کو جیپ میں ڈال کر تھانے کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ خدیجہ گھر کے صحن میں چیختی چلاتی اور سینہ پیٹتے رہ گئی لیکن وہاں اس کے نالے سننے والا کوئی نہیں تھا۔

•✣ ===•✣ ===•✣

رات کے تقریباً نو بجے نادر خان کی جیپ تھانے کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ سپاہیوں کو اس نے سکینہ کا خیال رکھنے کا حکم دیا اور پھر دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کرسی پر ایک حوالدار بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ نادر خان کے قدموں کی چاپ سن کر وہ بوکھلا کر اٹھا اور فوراً سیلوٹ مار دیا۔

''رحیم گل!'' نادر خان حکمیہ انداز میں بولا۔ ''فوراً کوئی بندہ ملک مراد کو بلانے کے لیے روانہ کر دو۔ اسے کہنا کہ پٹواری کو ساتھ لانا نہ بھولے''۔

حوالدار رحیم گل ''یس سر'' کہتا ہوا باہر نکل گیا اور نادر خان خیالات میں کھو گیا۔ سکینہ کو دیکھ کر اس کی نیت بہک گئی تھی مگر پہلے انتقال پر قاسم علی کا انگوٹھا لگوانا ضروری تھا۔ سکینہ تو اب ویسے ہی اس کے لیے گھڑے کی مچھلی تھی۔ ملک مراد کا کام ہو جانے کے بعد وہ جب چاہتا گھڑے میں سے اس کو نکال سکتا تھا۔ وہ مکافاتِ عمل کو بھول کر شیطانی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ ویسے بھی اپنی سروس

کے دوران اس نے آج تک کوئی نیکی کا کام نہیں کیا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ملک مراد پٹواری کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ منصوبے کے مطابق نادرخان
سکینہ کو دو سپاہیوں کی معیت میں حوالات کے عین سامنے ایک کھلی جگہ پر پہنچا دیا۔ سکینہ کو دیکھ کر
علی نے رونا دھونا اور گڑگڑانا شروع کر دیا تھا۔ وہ دونوں سپاہیوں کو خدا اور رسولؐ کے واسطے د
لیکن دونوں سپاہی اس کی کسی بات کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھ رہے تھے۔

سکینہ کی بدستور پہلی والی حالت تھی، سحرزدہ سی۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ ابھی تھوڑی دیر بعد
ایک قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ ایک ایسی قیامت جو زندگی بھر کے لیے اس کی جان کا روگ بن
گی۔ وہ اپنی مرضی سے نہ جی سکے گی نہ مر سکے گی۔ لوگ اس کے کردار پر انگلیاں اٹھائیں گے۔
عمر بھر معاشرے کی نوکیلی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک عجیب بے حسی اس پر طاری تھی۔
سلاخوں کے پیچھے قید روتے گڑگڑاتے باپ کو دیکھ کر بھی اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک
لہرائی تھی۔ باپ کے نالے آسمان کو چھید رہے تھے لیکن قانون کے محافظوں کی طرح وہ بھی
و بصارت سے محروم نظر آ رہی تھی۔

"سکینہ!" اچانک قاسم علی نے رونا، گڑگڑانا چھوڑ کر بیٹی کو حلق کی پوری طاقت صرف
ہوئے پکارا۔ "میری طرف دیکھو بیٹی...... میں...... میں تمہارا باپ ہوں۔ م...... مجھے پہچانتی
کیوں نہیں ہو؟ چپ کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ...... ان ظالموں نے کیا کیا ہے تمہارے ساتھ"

سکینہ چپ رہی۔ اس کی آنکھوں میں معمولی سی شناسائی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ معاً
احساس ہوا جیسے وہ کسی نشے کے زیر اثر ہو۔ وہ دوبارہ چلایا مگر اس بار اس نے دونوں سپاہیوں کو
کیا تھا۔

"ظالمو! اسے چھوڑ دو۔ اس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ خدا کا خوف کرو اس کی
لاٹھی سے ڈرو۔ وہ دیکھ رہا ہے۔ تم...... تم اس کے انتقام سے......"

اچانک اس کی نگاہ ملک مراد اور پٹواری کے ساتھ ساتھ نادر خان پر پڑی اور اس
ادھورا رہ گیا۔ نفرت کی ایک تیز لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور وہ سرتاپا ایک
آگ میں سلگنے لگا۔

"کیا خیال ہے بڑے میاں؟" نادر خان لاک اپ کے عین سامنے پہنچ کر استہزائیہ
پوچھنے لگا۔ "انتقال پر انگوٹھا لگاؤ گے یا پھر کھیل شروع کر دیا جائے؟"

"جب تک میری بیٹی مجھے پہچانے گی نہیں، میں انتقال پر انگوٹھا لگانا تو ایک طرف
پسند نہیں کروں گا"۔ اس نے نادر خان کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔



ان دونوں کے درمیان سلاخیں حائل نہ ہوتیں تو شاید قاسم علی نتائج کی پرواہ کیے بغیر اس پر
جھپٹ پڑتا۔ نادر خان اس کا جواب سن کر دونوں سپاہیوں کی طرف پلٹا۔ "اوئے! کیا کیا ہے تم لوگوں
نے اس کے ساتھ...... کہیں اسے نشہ مشہ تو نہیں پلا دیا؟ یہ اپنے باپ کو پہچانتی کیوں نہیں ہے؟"

"نن...... نہیں سر"۔ ان میں سے ایک جلدی سے بولا۔ "ہم نے تو اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یہ
پہلے سے یونہی کھوئی کھوئی اور گم صم ہے۔ ابھی تک اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا، لگتا ہے گونگی
ہے"۔

"ہوں...... گونگی"۔ نادر خان سکینہ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ابھی جب اس کے تن پر
کپڑے کی دھجی نہیں رہے گی تو اپنا باپ تو ایک طرف رہا یہ ہمیں بھی ابا کہنے پر مجبور ہو جائے گی"۔

اتنا کہہ کر اس نے ایک جھٹکے سے سکینہ کے کندھے پر سے قمیص پھاڑ ڈالی مگر وہ ٹس سے مس نہ
ہوئی، نہ اس نے خود میں سمٹنے کی کوشش کی اور نہ چیخنے چلانے کی تاہم سلاخیں ہاتھ میں تھامے قاسم علی
پوری قوت سے چلا رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں نادر خان کو واسطے دے رہا تھا، رو رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا
لیکن نادر خان نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

سکینہ کا ایک بازو ننگا کرنے کے بعد نادر خان نے غور سے اس کے چہرے کے تاثرات
دیکھے۔ اس کے چہرے پر خوف یا دہشت کا ہلکا سا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے بالکل
ناک کی سیدھ میں دیکھ رہی تھی۔ وہ ان سے یوں لاتعلق نظر آ رہی تھی جیسے نابینا ہو، جیسے اس کا وجود پتھر کا
ہو چکا ہو، ہر احساس سے عاری۔ جیسے اپنی عزت و جان کی اسے کوئی پروانہ ہو۔ نادر خان کے لیے اس
کی یہ کیفیت واقعی چونکا دینے والی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات
ابھرے لیکن جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے سکینہ کا دوسرا بازو بھی کندھے سے عریاں کر
دیا۔ اس بار اسے امید تھی کہ وہ روئے گی، گڑگڑائے گی اور اس کے قدموں میں گر کر رحم کی بھیک مانگے
گی۔ مگر جب ایسا کچھ بھی نہ ہوا تو وہ چلا کر بولا۔ "حرامزادی! چپ کیوں ہو؟ روؤ، گڑگڑاؤ...... تمہاری
عزت کا جنازہ نکلنے والا ہے"۔

سکینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور کھوئے کھوئے انداز میں کھڑی رہی۔ نادر خان کا غصہ
آسمان کو چھو رہا تھا۔ اپنی پوری سروس کے دوران اسے سکینہ جیسی لڑکی نہیں ٹکرائی تھی۔ جھنجھلا کر اس نے
سکینہ کو ایک تھپڑ رسید کر دیا لیکن نتیجہ وہی صفر رہا۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ نادر خان"۔ سلاخوں کے پیچھے قاسم علی ہذیانی انداز میں چلا رہا تھا۔ "تم
...... تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔ میں ایک انگوٹھا تو کیا سینکڑوں انگوٹھے لگانے کے لیے تیار ہوں،
لیکن میری بیٹی کو چھوڑ دو"۔ طیش، بے بسی اور بے چارگی نے اس پر عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔ کبھی

وہ رو رو کر فریادی انداز میں بولنے لگتا تو کبھی جھنجھلا کر نادر خان کے ساتھ ساتھ جہانداد کو بھی بد دعائیں دینے لگتا تھا۔

نادر خان کے کانوں تک شاید اس کی فریاد پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ اسے تو سکینہ نے "دخت" ہوا تھا۔ وہ اس کی چیخیں سننے کا منتظر تھا۔ وہ اسے گھائل اور خوفزدہ ہرنی کے مانند تھانے کے احاطے دوڑانا چاہتا تھا اور خود شاید شکاری کتا بن کر اس پر جھپٹنا چاہتا تھا۔ اپنے خونخوار پنجوں سے اس کا گداز گوشت نوچنا چاہتا تھا مگر سکتہ زدہ اور گم صم سی سکینہ اس کے ارادوں کو خاک میں ملانے پر تلی تھی۔ وہ کسی بے جان بت کی طرح زمین میں پیوست ہو کر کھڑی ہوئی تھی۔ اپنے دونوں ع بازوؤں کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ نادر خان کا تھپڑ کھا کر اس کی اوڑھنی ڈھلک کر گلے میں جھول رہی تھی مگر اسے کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ وہ جو شرم و حیا کا پیکر تھی، کبھی باپ بھائی کے سامنے بھی اس نے اپنا سر ننگا نہیں کیا تھا، آج وقت کے فرعونوں کے ہاتھوں لٹنے والی تھی۔ کیسا ظلم تھا کہ اسے اپنے لٹنے کا احساس ہی نہیں تھا۔ عاجز آ جانے کے بعد تو ایک بلی بھی پنجہ مار کر دفاع کرتی ہے۔ کیا وہ بلی سے بھی گئی گزری تھی جو ظالموں کے سامنے بے بسی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ نہیں وہ بلی سے زیادہ طاقتور تھی۔ وہ اشرف المخلوقات تھی، اپنی عزت بچانے کے لیے کر جانتی تھی مگر قسمت کی نامہربانی سے وہ اپنا شعور کھو بیٹھی تھی۔ وہ نادر خان کی چلائی ہوئی گولیوں خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ اگر ان درندوں کے درمیان بے بسی کی علامت بن کر کھڑی ہوئی تھی تو اس یہی وجہ تھی کہ اس کا مان ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے جوان بھائی پر سے، خود پر سے بلکہ زندگی پر سے۔ یہ اسے پتھر کا بت بنانے کے لیے کافی تھا۔ آج سے پہلے اس نے کسی نامحرم کی شکل تک نہیں دیکھی تھی آج پچھلے چند گھنٹوں سے ان درندوں کے رحم و کرم پر تھی جو رحم کے لفظ سے ناآشنا معلوم ہوتے تھے۔ نادر خان کی کارروائی سے اسے جسمانی تکلیف ابھی تک نہیں پہنچی تھی تاہم جو زخم اس کی روح پر تھے انہوں نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ شرم و حیا والیاں ایسا ہی تو کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک سر سے اترنا عزت لٹنے ہی کے برابر ہوتا ہے اور جب عزت لٹ جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ جسے بچانے کے لیے فریاد کی جائے، ظالموں کے سامنے ہاتھ جوڑے جائیں یا ان کے پاؤں پر گرا جائے۔

اپنے ارادوں کی ناکامی نے نادر خان کو بالکل ایک درندہ بنا دیا تھا۔ طیش میں آ کر اس نے سکینہ کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ گر گر کر اٹھنے لگی، اٹھ اٹھ کر گرنے لگی۔ وہاں سب تماشائی والے تھے سوائے ایک لاچار اور بے بس باپ کے جو آہنی سلاخوں کے پیچھے تڑپ رہا تھا، چلا رہا تھا دور کہیں آسمانوں میں بیٹھے ہوئے خدا کو پکار رہا تھا لیکن شاید ابھی لمحۂ قبولیت بہت دور تھا۔ پھر جھپکتے ہی وہ سب کچھ ہو گیا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔



ادھر نادر خان کا گستاخ ہاتھ سکینہ کے گریبان کی طرف بڑھا، ادھر قاسم علی نے وحشیانہ انداز میں دوڑ کر اپنا سر آہنی سلاخوں سے ٹکرایا۔ فولادی سلاخوں کا تو کچھ نہ بگڑا مگر اس کا کاسہ سر ضرور ٹوٹ گیا۔ وہ دھڑام سے ننگے فرش پر گرا اور سود و زیاں سے بے نیاز ہو گیا۔

اس ٹکراؤ کے نتیجے میں جو آواز پیدا ہوئی تھی، اس نے نادر خان کا بڑھتا ہوا ہاتھ روک دیا تھا۔ صورتِ حال کا پتا چلتے ہی تھانے میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک قیدی نے تھانے کی حوالات میں خودکشی کر لی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ نادر خان نے حواس باختہ ہو کر حوالات کا دروازہ کھلوایا اور جلدی سے اندر گھس گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دونوں سپاہی، ملک مراد اور پٹواری بھی اندر چلے گئے۔

نادر خان نے فرش پر پڑے قاسم علی کو ہلایا جلایا۔ اس کی نبض چیک کی۔ پھر کان اس کے سینے سے لگا دیا۔ وہ ان دھڑکنوں کو سننے کی کوشش کر رہا تھا جو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر قاسم علی کے چہرے کی طرف دیکھا تو بے اختیار ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس کا ماتھا تقریباً پچکا ہوا تھا اور سر سے بہنے والے خون نے چہرے پر آڑی ترچھی سرخ لکیریں کھینچ دی تھیں۔ اس کی کھلی ہوئی ساکت آنکھوں سے آخری لمحوں کا وہ اذیت ناک کرب نمایاں ہو رہا تھا جو قیامت بن کر اس پر گزرا تھا۔ مٹی کے کھیل کا ایک کردار ہمیشہ کے لیے مٹی میں مل کر مٹی ہونے والا تھا۔ اس کی ساکت آنکھیں زبانِ حال سے پکار پکار کر نادر خان اور ملک مراد کو بھیانک انجام کی خبر دے رہی تھیں۔

"اب..... کیا ہوگا ملک صاحب؟" نادر خان نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔ "یہ..... یہ تو مر گیا ہے"۔

"ہونا کیا ہے؟" ملک مراد نے بے پروائی سے کہا۔ "انتقال پر انگوٹھا لگوا کر پھینک دیں گے کہیں جنگل میں۔ کس نے پتا کرنا ہے؟ حرام زادے کا کون ہے جو تمہیں پوچھے گا؟"

"پھر بھی ملک صاحب! وہ ایک قیدی تھا"۔ نادر خان نے خدشہ ظاہر کیا۔ "کافی لوگ جانتے ہیں کہ وہ گزشتہ کئی روز سے تھانے کے حوالات میں بند ہے۔ ایسے میں اگر لوگوں کو اس کی لاش ملی تو سارا الزام مجھ پر آئے گا"۔

"اس کا حل بہت آسان ہے"۔ ملک مراد کے عیار دماغ نے فوراً ایک منصوبہ سوچ لیا۔ "تم حاکم علی کو فرار ہونے کا موقع دو اور پھر تندہی سے دونوں بھائیوں کی تلاش کرو۔ ان اَن پڑھ جاہل دیہاتیوں کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا کہ تمہاری تلاش محض ایک ڈرامہ ہے"۔

نادر خان کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ انہوں نے فوراً پٹواری کو اشارہ کیا اور پھر لاش سے انگوٹھا لگوانے کی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ فلک کہنہ سال اور صدیوں سے اس کے رازدان ستارے یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن پھر بھی خاموش تھے۔ ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، ایسے لاکھوں

کروڑوں دلخراش مناظر وہ دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے جس انسان کو غاروں اور گپھاؤں میں دھڑنگ رہتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ درجہ بدرجہ ترقی کی منازل طے کرتا ہوا، ہواؤں میں سفر کر... اس کا رہن سہن، کھانا پینا، اوڑھنا، بچھونا سب کچھ بدل چکا تھا۔ اگر کچھ نہیں بدلا تھا تو وہ اس کی... تھی۔ جیسی صدیوں پہلے تھی اب بھی بالکل ویسی ہی تھی۔

وہ اپنی کارروائی میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں سکینہ کے غائب ہونے کا پتا بھی نہیں چ... سکینہ کب کی تھانے کی عمارت سے نکل کر کسی انجانی منزل کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ انتقال... لگوانے کے بعد جب وہ باہر نکلے تو تب انہیں معلوم ہوا کہ سکینہ وہاں نہیں ہے۔

''یہ...... یہ لڑکی کہاں چل گئی ہے؟'' نادر خان دونوں سپاہیوں پر چڑھ دوڑا۔ ''ڈھونڈ... جلدی کرو۔ وہ چشم دید گواہ ہے۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے''۔

دونوں سپاہی اس کا حکم سنتے ہی دوڑتے ہوئے تھانے سے باہر نکل گئے۔

===

ادھر قبائلی گاؤں میں جرگے کی نوبت آنے سے پہلے ہی سردار فراست علی خان کے غنڈے بھوکے گدھوں کے مانند جہانداد پر ٹوٹ پڑے تھے۔ انہوں نے اتنی تیزی سے حملہ کیا تھا... جہانداد اور سونو صبح کا ناشتا بھی نہیں کرسکے تھے۔ رات کے وقت سکندر اور اس کے ساتھیوں کو... واصل کرنے کے بعد وہ دونوں مطمئن ہو کر سو گئے تھے۔ جرگے کا سوچ کر انہوں نے وہاں سے لاشیں بھی نہیں ہٹوائی تھیں۔ جہانداد کو سردار فراست کی طرف سے ویسے بھی کسی خاص ردِعمل کی توقع نہ... کیونکہ وہ اسے ایک بہادر اور بااصول شخص سمجھتا تھا لیکن جب صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی مسلح غنڈوں نے سونو کے مکان پر چڑھائی کردی تو جہانداد کی ساری خوش فہمی دور ہوگئی۔ جسے وہ اعلیٰ ظرف انسان سمجھ کر مطمئن تھا وہ تو ایک عام غنڈہ نکلا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ وہ جس کمرے میں سو... ہوئے تھے اس کا دروازہ ایک ایسی مضبوط اور موٹی لکڑی سے بنایا گیا تھا جس سے گولی نہیں گزر... تھی۔

وہ گولیوں اور للکاروں کی آواز سن کر ہی جاگے تھے۔ جاگتے ہی جہانداد کو گڑبڑ کا احساس ہو... وہ فوراً گن کی طرف لپکا۔ گن اٹھا کر اس نے سیفٹی کیچ ہٹایا اور پھر سہمے ہوئے سونو سے مخاطب ہو... ''میں باہر نکلتا ہوں تم یہاں دروازے پر پوزیشن سنبھال لو لیکن اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خطرے کے وقت تم بلا جھجک اندر سے دروازہ بند کردینا۔ میرا انتظار بالکل نہ کرنا۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں''۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟'' سونو نے اسے کچھ اس طرح دیکھا جیسے اس کی دماغی صحت...


مٹی کا کھیل (اوّل)

...مشکوک ہو چکا ہو۔'' وہ تمہارا نام لے لے کر باہر سے اندھا فائرنگ کررہے ہیں۔ کیا خودکشی کرنے کا ارادہ ہے؟ تمہیں دیکھتے ہی وہ گولیوں سے بھون ڈالیں گے''۔

''تو پھر...... ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔ ''یہ لکڑی کا دروازہ کب تک انہیں روک پائے گا؟ فائرنگ اور نعروں کی آواز سن کر تو ان کی تعداد درجن بھر لگتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں انہیں......''

''باہر نکل خنزیر کا بچہ''۔ اچانک باہر سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''آج اَم تمارا ٹکڑے ٹکڑے کردے گا''۔ بولنے والا کوئی قبائلی تھا اور پشتو لہجے میں اردو بول رہا تھا۔

سونو نے جواب دینے کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کی لیکن جہانداد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔

اسی اثناء میں کمرے کے دروازے پر کسی نے برسٹ مارا مگر مضبوط اور غیر معمولی موٹائی والے دروازے سے کوئی گولی نہ گزر سکی۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا''۔ جہانداد نیچی آواز میں بولا۔ ''فائرنگ کی آواز سے پتا چل رہا ہے ان کے پاس خودکار ہتھیار ہیں۔ دستی بم کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ کمرا ہی ہمارے لیے مقبرہ بن جائے اور......''

ابھی اس کی بات ادھوری تھی کہ باہر سے دوبارہ اسی قبائلی کی آواز سنائی دی۔ ''جہانداد! تُو کدر چپا ہوا ہے؟ مرد کا بچہ ہے تو باہر نکل ورنہ اَم پورے گھر کو آگ لگادے گا''۔

قبائلی کی بات سن کر جہانداد نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ایک چارپائی کو اس دیوار کے ساتھ عموداً کھڑا کردیا جس میں کمرے کا اکلوتا روشندان لگا ہوا تھا۔

''اسے پکڑ کر رکھو''۔ وہ بہ عجلت سونو سے مخاطب ہوا۔ ''میں کسی طرح ان کی تعداد معلوم کرنا چاہتا ہوں''

سونو نے فوراً چارپائی کو تھام لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چارپائی پر چڑھ کر روشندان سے باہر جھانک رہا تھا۔ خوفناک شکلوں والے چھ سات غنڈے غیظ وغضب کے عالم میں سامنے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ وہ سب کے سب آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

''کیا وہ نظر آرہے ہیں؟'' سونو نے مدہم لہجے میں پوچھا۔ ''کتنے لوگ ہیں؟''

''یہاں سے تو صرف چھ سات ہی نظر آرہے ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ مقابلہ کیے بغیر ہم ان کا گھیرا نہیں توڑ سکتے''۔ اچانک وہ خاموش ہوگیا اور اس کی یہ خاموشی بے سبب نہیں تھی۔ حملہ آوروں کا ایک ساتھی کندھے پر ''گین'' اٹھائے تقریباً دوڑنے کے انداز میں اپنے

ساتھیوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ان کے جوش میں اضافہ ہو چکا تھا۔ کین میں پٹرول یا پھر مٹی کا تیل تھا بہرکیف اس نے رسک لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

کین بدستور اس شخص نے اٹھا رکھا تھا اور باقی لوگ اسے تقریباً گھیرے ہوئے تھے۔ وہ اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن جہانداد کے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ پشتو میں نہ جانے کون سی بکواس کر رہے تھے تاہم پشتو زبان کے جو چند ایک الفاظ وہ سمجھتا تھا اس سے اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کمرے کے دروازے کو آگ لگانا چاہتے ہیں۔

"وہ پٹرول لے آئے ہیں"۔ جہانداد سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ ہمارے لیے یہاں سے نکلنے کا بہترین موقع ہے۔ میں پٹرول والے کین کو نشانہ بنانے لگا ہوں۔ تم میرے پیچھے باہر کے لیے تیار رہنا۔ ہوسکتا ہے کمرے کے عقب میں ابھی تک سیڑھی موجود ہو اور ہم چھت اور مورچوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں"۔

"مم...... میں تیار ہوں"۔ سونو نے جواب دیا۔ "لیکن......"

"لیکن...... کیا؟" اس نے استفسار کیا۔

"کمرے کے عقب میں سیڑھی موجود نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟" سونو نے ممکنہ خدشے کا اظہار کیا۔

"ہم عقبی دیوار پھاند کر باہر نکلنے کی کوشش کریں گے"۔ اس نے جواباً کہا۔ "اس وقت گھبراہٹ کی بجائے ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہے"۔

"اگر ہم کمروں کے عقبی جانب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ہمیں دیوار پھاندنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی"۔ وہ پہلی بار پُرجوش انداز میں بولا۔ "وہاں عقبی دیوار میں پانی کی نکاسی والی ایک کشادہ "موری" موجود ہے۔ ہم جیسی عام جسامت رکھنے والا کوئی بھی شخص باآسانی "موری" سے گزر سکتا ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔ جہانداد نے کہا۔ "ہم اسی موری سے نکلنے کی کوشش کریں گے"۔

اتنا کہہ کر وہ حملہ آوروں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ اب کین اٹھائے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے تھے۔ غالباً سردار فراست نے انہیں اچھی طرح سمجھا بجھا کر بھیجا تھا کہ جہانداد سے بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کی چالاکی اور چستی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

جہانداد کے ہاتھ میں وہی سکندر والی خودکار گن تھی۔ سیفٹی کیچ پہلے ہی سے ہٹا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے گن کو سنگل سے "برسٹ" پر رکھا اور پھر اس کا دہانہ روشندان میں فٹ کر دیا۔ اب کین والے آدمی سمیت تقریباً چار آدمی اس کے نشانے پر تھے۔ اس نے ٹریگر پر رکھی انگلی کو حرکت دی۔ خودکار گن لرزی اور "تڑتڑ" کی آواز کے ساتھ ہی کین والا شخص اچھل کر پشت کے بل گر پڑا۔ دوسرے



ہوئے ٹین کو پھاڑتے ہوئے گزر گئی تھیں اور پٹرول نے آگ پکڑ لی تھی۔ دو آدمیوں کو اس نے دیوانہ وار صحن میں چکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی تھی اور وہ بری طرح چلا رہے تھے۔

اس نے تیزی سے مزید ایک برسٹ مارا اور چارپائی سے کود کر نیچے آگیا۔ صحن میں چیخ و پکار اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ گن کو دوبارہ برسٹ سے سنگل پر ایڈجسٹ کرتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔

"جلدی کرو"۔ وہ چلا کر سونو سے بولا۔ "اس وقت انہیں اپنی پڑی ہوئی ہے۔ ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی ہمیں یہاں سے نکلنا ہے"۔

اتنا کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور جست لگا کر باہر نکل گیا۔ سونو نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ حملہ آور اپنے ساتھیوں کے کپڑوں میں لگی ہوئی آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ اس لیے فوری طور پر ان کے فرار سے آگاہ نہ ہوسکے۔ تاہم جب وہ دونوں کمرے کے کونے تک پہنچ کر عقبی جانب مڑنے لگے تو انہیں اپنے عقب میں ایک چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "وہ جا رہے ہیں کتے کے بچے"۔

آواز کے ساتھ ہی انہیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی تھی مگر اس وقت تک وہ کمرے کی سائیڈ میں گھوم چکے تھے، اس لیے گولیوں سے محفوظ رہے تھے۔

"وہ سامنے جھاڑیوں کے اندر ہے موری"۔ عقب میں پہنچتے ہی سونو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔ "جلدی کرو۔ وہ پیچھے آ رہے ہیں"۔ اتنا کہہ کر وہ اندھا دھند خودرَو جھاڑیوں کی طرف بھاگا۔

جہانداد نے ایک نظر جھاڑیوں پر ڈالی اور محتاط انداز میں الٹے قدموں جھاڑیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی نگاہیں سرچ لائیٹ کی طرح سامنے اور دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ اپنا عقب اس نے سونو پر چھوڑ دیا تھا۔ اسے زیادہ خطرہ کمرے کے کونے کی جانب سے تھا۔ عقبی راستہ اسی کونے سے گزرتا تھا۔ اس لیے امکان یہی تھا کہ تعاقب کرنے والے اسی راستے سے آئیں گے۔

معاً کمرے کے کونے سے ایک سر نمودار ہوا اور اس نے ایک سیکنڈ میں فائر جھونک دیا۔ پیچھے آنے والا گولی کی زد سے بچ نکلا تھا ورنہ اس کی چیخ جہانداد کی سماعتوں تک لازمی پہنچ گئی ہوتی۔ اس نے اسی جانب دو تین فائر مزید کیے اور پھر ایک دم پلٹ کر جھاڑیوں میں پوشیدہ "موری" کی طرف دوڑ لگا دی۔ احتیاطاً وہ "زگ زیگ" بناتے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ عسکری تربیت قدم قدم پر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ جھاڑیوں سے وہ ابھی چند قدم دور ہی تھا جب اچانک اس کے عقب میں دو تین رائفلیں بیک وقت گرجیں۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کے پیروں نے زمین چھوڑ دی اور وہ تقریباً

اُڑتا ہوا جھاڑیوں میں جا گرا۔ گولیوں کی زد سے تو وہ محفوظ رہا تھا تاہم خاردار جھاڑیوں نے اچھی خاصی مزاج پُرسی کی تھی۔ اگر چھلانگ لگاتے وقت اس نے چہرے پر بازو کی آڑ نہ بنائی ہوتی تو عین ممکن تھا کہ اس کا چہرہ بھی کانٹوں کی زد سے محفوظ نہ رہتا۔ دیگر جسم پر اسے اچھے خاصے کانٹے لگے تھے مگر اس کڑے وقت میں کانٹوں کی چبھن کی پرواہ کسے تھی۔ موت اپنا خونی جبڑا کھولے اس کے تعاقب میں تھی اور جب موت تعاقب میں ہو تو انسان راستے کی دشواریوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

اس نے بھی ایک جھٹکے سے اپنا الجھا ہوا دامن کانٹوں سے چھڑایا اور نظریں ''موری'' کی تلاش میں دوڑائیں۔ ایسے ہی وقت اسے سونو کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تھوڑا سا دائیں ہو کر بڑھو جہانداد! موری بالکل سامنے ہی ہے''۔

وہ آواز کی سمت تیزی سے آگے بڑھا اور پھر اسے چند قدموں کے فاصلے پر دیوار کے موری نظر آگئی۔ موری کے عین سامنے دوسری طرف سونو بیٹھا ہوا جھانک رہا تھا۔

''جلدی کرو''۔ جہانداد پر نظر پڑتے ہی وہ عجلت سے بولا۔ ''گن مجھے دے دو''۔

جہانداد نے تیزی سے گن اسے تھمائی اور زمین پر لیٹ کر کہنیوں کے بل سرکتا ہوا موری سے گزرنے لگا۔ عین اسی وقت کسی نے جھاڑیوں میں برسٹ مارا لیکن گولیاں اوپر دیوار میں لگی تھیں۔ اگر برسٹ ذرا سا بھی نیچے لگتا تو جہانداد کی پشت چھلنی ہو جاتی۔

''یہیں جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں''۔ فائرنگ کے فوراً بعد کوئی چلا کر بولا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ دوبارہ فائرنگ ہوتی وہ موری سے باہر نکل گیا۔ سونو کے ہاتھ سے گن لینے کے بعد اس نے اطراف میں نگاہیں گھمائیں۔ کوئی مشتبہ شخص نظر نہ آیا تاہم دیوار کی دوسری جانب جھاڑیوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ پُرجوش اور جھنجھلائی ہوئی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید انہیں موری نظر آگئی تھی۔ اب وہاں ایک پل کے لیے بھی رکنا ان کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ بائیں ہاتھ ایک کھلی گلی گاؤں سے سیدھی باہر نکلتی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے گلی میں داخل ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ گلی خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس قبائلی گاؤں میں زندگی ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ موسم سردیوں کا تھا اور لوگ دن چڑھے ہی گھروں سے باہر نکلا کرتے تھے۔

وہ بغیر کسی خطرے کا سامنا کیے گلی کے سرے تک پہنچ گئے۔ وہاں سے کئی راستے مختلف اطراف میں نکل رہے تھے اور ہر راستہ پتھریلا تھا۔ گاؤں کو چاروں طرف سے چھوٹی بڑی پہاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ ایک پیالہ نما وادی تھی۔ سبزے کے نام پر وہاں پہاڑی پودے اور جھاڑیاں بکثرت پھیلی ہوئی تھیں کہیں کہیں ہموار زمین کا بھی کوئی نہ کوئی قطعہ نظر آجاتا تھا جس میں فصل کے نام پر ہاتھ کی



بڑا موجود ہوتا تھا۔

سامنے والا راستہ قدرے کشادہ تھا۔ یہ ناہموار راستہ لہراتا بل کھاتا دور پہاڑیوں میں غائب ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ کشادہ راستہ کسی منزل کا پتا دیتا تھا۔ انہوں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور پھر اسی کشادہ راستے پر دوڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی انہوں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک انہیں اپنے عقب میں کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ جہانداد نے بھاگتے ہوئے ایک دم پلٹ کر پیچھا دیکھا تو اس کی نگاہ ایک کھلی چھت کی جیپ پر پڑی جو گلی سے نکل کر تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

جیپ کو دیکھ کر انہوں نے حتی المقدور اپنی رفتار تیز کر دی، لمحہ بھر کے لیے تو یوں محسوس ہوا جیسے ان کی پوری طاقت قدموں میں سمٹ آئی ہو، ان کے سانس لگاتار دوڑنے کی وجہ سے پھولے ہوئے تھے۔ جیپ لمحہ بہ لمحہ ان کے نزدیک پہنچتی جا رہی تھی۔ کنی کترا کر وہ دائیں بائیں جانے سے بھی قاصر تھے کیونکہ اس وقت جہاں وہ دوڑ رہے تھے وہاں وہ سڑک نما راستہ سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ ان کے دائیں بائیں عمودی چٹانیں تھیں جن کی اونچائی کسی طرح بھی تیس چالیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ ایسے میں وہ صرف اپنے قدموں پر انحصار کرتے ہوئے دوڑنے پر مجبور تھے۔

جہانداد کے ساتھ اگر سونو نہ ہوتا تو شاید وہ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تعاقب کرنے والوں سے بھڑ جاتا اور اپنی جان دینے سے پہلے ان میں سے کئی لوگوں کو لازماً جہنم رسید کر جاتا۔ دوڑتے ہوئے وہ ایک موڑ کے قریب پہنچ گئے مگر اسی دوران جیپ بھی تقریباً ان کے سر پر پہنچ گئی۔

موڑ کو دیکھ کر انہیں بچ نکلنے کی امید بندھ گئی۔ دوسرے ہی لمحے ان دونوں کے قدموں میں جیسے پر لگ گئے، لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا جیسا انسان سوچتا ہے اور اسی کا نام تقدیر ہے۔ وہ تدبیر سے تقدیر کو مات دینے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکامی اس کے گلے کا طوق بن جاتی ہے۔ وہ دونوں بھی کامیابی کی دھن میں اندھا دھند آگے بڑھ رہے تھے، ایسے میں وہ تقدیر کو بھول گئے تھے جو موڑ کے دوسری طرف ان کے ارادے کو شکست دینے کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔

جیسے ہی وہ موڑ مڑ کر دوسری جانب پہنچے ایک دم ٹھٹک کر رک گئے چند قدموں کے فاصلے پر راستے کے عین درمیان میں ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ جیپ کے بونٹ پر ایک گرانڈیل شخص بالکل فلمی انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک خطرناک قسم کی گن پکڑی ہوئی تھی۔ شکل وصورت سے وہ چھٹا ہوا بدمعاش نظر آتا تھا۔ اس کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی اور حلیہ کچھ ایسا تھا کہ لمحہ بھر کے لیے تو وہ متحیر رہ گئے۔

اس کے سر پر استرا پھرا ہوا تھا بالکل انڈے کی طرح صاف تھا اس کا سر، چہرے کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، سوائے بھنوؤں کے وہاں بال ندارد تھے۔ پینٹ شرٹ کے ساتھ اس نے سیاہ رنگ کا لانگ

کوٹ پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں بھی سیاہ رنگ کے لانگ شوز تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں اور وہ کچھ عجیب تمسخرانہ انداز میں جہانداد کو گھور رہا تھا۔

اسی دوران پچھلی جیپ بھی ان کے عقب میں پہنچ کر کچھ فاصلے پر رک گئی۔ جیپ سے چھلانگیں لگاتے ہوئے چھ مسلح افراد اترے اور ان دونوں پر رائفلیں تان کر کھڑے ہو گئے۔

"خنزیر کا بچہ! ام سے بھاگتا ہے"۔ پشتو لہجے میں اردو بولنے والا گرجا۔ "آج ام تمہارا کھوپڑی اُڑا دے گا"۔ ایک دم اس نے گن سیدھی کر لی تھی۔

"نہیں"۔ سامنے والی جیپ کے بونٹ پر بیٹھا ہوا گنجا اچھل کر نیچے اترتے ہوئے بولا۔ "گولی نہیں چلائے گا۔ خان جی نے اسے زندہ لانے کا حکم دیا ہے"۔

"خان جی" سے اس کی مراد سردار فراست علی خان تھا۔ جیپ کے بونٹ سے اترنے کے بعد پہلی بار جہاں داد نے اس کے قد و قامت پر نظر ڈالی۔ وہ کسی طرح بھی ساڑھے چھ فٹ کی قامت سے کم نہیں تھا۔ عام قامت کا کوئی بھی شخص اس کے سامنے آ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

رنگیلی اردو بولنے والے قبائلی کو جھڑکنے کے بعد وہ جہانداد سے مخاطب ہوا۔ "ویلکم، خوش آمدید جی آیانوں، مسٹر جہانداد عرف مفرور سولجر"۔ اس کا انداز مذاق اُڑانے والا تھا لیکن چہرے پر سنجیدگی کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی۔

"کون ہو تم؟" جہانداد نے اکھڑ لہجے میں زبان کھولی۔ "یوں ہمارا راستہ روکنے کا کیا مطلب ہے"۔

"تمہارے پرستار تمہارے میزبان"۔ وہ اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "آیئے۔ جیپ میں تشریف رکھیے، کوئی تمہارا شدت سے منتظر ہے اور......"

"اگر میں انکار کر دوں تو؟" اس نے قطع کلامی کی۔

"تو میں تمہارے ساتھی کو گولی نہیں ماروں گا"۔ وہ بیلٹ میں اُڑسا ہوا خنجر نکالتے ہوئے بولنے لگا۔ "بلکہ اس کا سر اتار کر اس سنگلاخ زمین پر اس کے ساتھ فٹ بال کھیلوں گا"۔

وہ عجیب ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ لگتا تھا غصہ اسے چھو کر بھی نہیں گزرا۔ جہانداد اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسے مزاج کے آدمی حقیقتاً کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ سونو کے ساتھ نے وقتی طور پر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا تاہم چند لمحے سوچنے کے بعد وہ گویا ہوا۔ "دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو میں......"

"میں جو کوئی نہیں ہوں"۔ اس نے فوراً جہانداد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میرا نام موسیٰ خان ہے۔ تم بخوشی مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو"۔



"موسیٰ خان"۔ جہانداد نے قدرے متحیرانہ انداز میں اس کا نام دہرایا۔

"چونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ماں قبائلی تھی"۔ وہ پہلی بار مسکرایا۔ "بہرکیف تمہارا انداز ٹھیک ہے۔ میرا تعلق جنوبی پنجاب سے ہے"۔

اس کا جواب سن کر جہانداد ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کم بخت سوچیں پڑھنے میں ماہر تھا۔ ایک نظر میں دل کا حال بھانپ لیتا تھا۔ اس کا نام سن کر واقعی جہانداد ایک پل کے لیے چونکا تھا کیونکہ لب و لہجے میں وہ مکمل پنجابی نظر آتا تھا جبکہ نام خالص پٹھانوں والا تھا۔

"ٹھیک ہے مسٹر موسیٰ خان"۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد جہانداد نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے"۔

"موسیٰ خان نے آج تک شرطوں پر کوئی بھی معاملہ طے نہیں کیا"۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "بہرکیف تم ایک بہادر انسان ہو اور میں بہادروں کا قدردان ہوں اس لیے شرط بتاؤ، ہوسکتا ہے میرے لیے قابل قبول ہو"۔

"میرے ساتھی کو جانے دو"۔ اس نے بلاتردد شرط بتائی۔ "یہ بالکل بے قصور ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ بس مجھے پناہ دے کر پھنس گیا ہے بے چارہ"۔

"مجھے منظور ہے"۔ اس نے جہانداد کی توقع کے برعکس جواب دیا۔ "اس کا ہم نے کون سا اچار ڈالنا ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے متوقف ہو کر دوبارہ بولا۔ "اب تم ایسا کرو کہ غیر مسلح ہو کر جیپ میں بیٹھ جاؤ لیکن اتنا خیال رہے کہ ہتھیار کے نام پر تمہارے پاس ایک بلیڈ تک نہیں رہنا چاہیے دراصل میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھی کے جانے کے بعد تم پر ہیرو بننے کا بھوت سوار ہو جائے اور کوئی بے چارہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے"۔

"کوئی بے چارہ"۔ پر اس نے ذومعنی انداز میں زور دیا تھا اور یہ واضح طور پر جہانداد کی طرف اشارہ تھا۔ اس کے اس تمسخرانہ انداز نے ایک لمحے کے لیے جہانداد کو کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے لیے اکسایا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے دل میں بھڑکنے والے شعلے کو صبر کا پانی ڈال کر بجھا دیا۔ اسے اپنی جان سے زیادہ سونو کی زندگی کی فکر تھی۔ اس لیے اس نے چپ چاپ گن اور ریوالور موسیٰ خان کے حوالے کر دیے۔

"چلو...... میں تیار ہوں، تمہارے "خان جی" کے پاس جانے کے لیے"۔

"خان جی"۔ پر جہانداد نے بالکل اسی انداز میں زور دیا تھا، جس طرح موسیٰ خان نے "کوئی بے چارہ" پر دیا تھا۔

"بہت خوب...... مجھے تمہارا انداز پسند آیا"۔ وہ ستائشی انداز میں بولا۔ "اب ذرا یہ پنڈلی کے

ساتھ بندھا ہوا خنجر بھی میرے حوالے کر دو تا کہ میں تمہاری شرط پر عمل درآمد کر سکوں"۔

وہ جہانداد کی توقع سے کہیں زیادہ عیار تھا۔ اس لیے اس بار چونکنے کی بجائے اس نے شلوار کا پائنچا اوپر کیا اور خنجر نکال کر موسیٰ خان کے قدموں میں پھینک دیا۔

موسیٰ خان نے خنجر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اب مزہ آئے گا تمہاری شرط پوری کرتے ہوئے" اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ جہانداد کو اچانک ہی خطرے کا احساس ہوا تھا۔ موسیٰ خان نے چالاکی اور دھوکے سے غیر مسلح کر دیا تھا۔ سونو کو پہلے ہی موسیٰ خان کے ساتھی غیر مسلح کر چکے تھے۔ موسیٰ خان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر جہانداد نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن موسیٰ خان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"بس"۔ وہ غرایا۔ "اب ہم نہیں بلکہ ہمارے ہتھیار بولیں گے"۔

اتنا کہہ کر اس نے گن سیدھی کر لی اور جہانداد نے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ہوئی جیپ کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ایسے میں شاید وہ اپنے دوست سونو کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ وہ اڑتا ہوا جیپ کے پہلو میں گرا اور عین اسی لمحے فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔

===

جیپ کے پہلو میں گرتے ہی جہانداد نے تیزی سے پلٹ کر سونو کی طرف دیکھا تھا۔ سونو اس وقت بالکل کچے سڑک نما راستے کے کنارے پر کھڑا ہوا تھا۔ موسیٰ خان کی چلائی ہوئی گولیاں براہ راست اس کی چھاتی میں لگی تھیں۔ جہانداد اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ پشت کے بل گرتا ہوا وہ ایک لمحے میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ کنارے کے اس طرف شاید ڈھلوان تھی اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا تھا۔

زندگی میں اسے غیر مسلح ہونے کا اس قدر افسوس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ فوج میں دست بدست لڑائی کی بہترین تربیت دی جاتی ہے لیکن جہاں مقابلے میں آدھ درجن سے زیادہ مسلح افراد ہوں وہاں کوئی بھی نہتا شخص لڑنے کی حماقت بھول کر بھی نہیں کرتا۔ وہ بھی اس وقت صرف اپنی جان بچانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سونو کا بدلہ تو بعد میں موقع ملنے پر وہ کسی وقت بھی لے سکتا تھا۔

وہ پتھریلی زمین پر کرالنگ کرتا (کہنیوں کے بل آگے بڑھتا) جیپ کے عقب میں پہنچ گیا۔ گھٹنوں کے بل اٹھ کر اس نے جیپ کے اندر جھانکا مگر وہاں ہتھیار کے نام پر کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ اب وہ بھاگ کر ہی اپنی جان بچانے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ یہ ایک ایسا رسک تھا جس کے بارے میں سوچا تو جا سکتا تھا مگر اس پر عمل کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ عین اسی لمحے اس کی سماعتوں سے موسیٰ خان کی مکروہ آواز ٹکرائی۔



"مسٹر سولجر! سامنے آجاؤ"۔ ایک بار پھر وہ دوستانہ انداز میں بول رہا تھا۔ "تیرا اور میرا حساب برابر ہو گیا ہے۔ تُو نے میرے دوست سکندر کو قتل کیا تھا اور میں نے تیرے دوست کو عدم آباد پہنچا دیا ہے۔ آگے تم جانو اور خان جی"۔

وہ عجیب انسان تھا گرگٹ کی طرح پل پل رنگ بدلنے کا ماہر، آدھے گھنٹے کے اندر اس نے جہانداد کے ہوش اُڑا کر رکھ دیے تھے۔

"موسیٰ خان"۔ جہانداد جیپ کی آڑ سے نکلا اور سامنے آ کر بولا۔ "تم نے میرے دوست کو دھوکے سے مارا ہے۔ میں نے تم پر بھروسا کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ بہرصورت میں......"

"تم سے بدلہ ضرور لوں گا"۔ وہ جہانداد کی بات اچکتے ہوئے بولا۔ "یہی کہنا چاہتے تھے نا؟"

اس کا انداز استہزائیہ تھا مگر چہرے کے نقوش نارمل تھے۔ ایک لمحے کے لیے جہانداد کا دل چاہا انجام کی پرواہ کیے بغیر اس پر چھلانگ لگا دے مگر اس کے دیگر چھ ساتھی جہانداد کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے، اس لیے وہ کڑوا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"موقع ملے تو ضرور لینا بدلہ"۔ موسیٰ خان آگے بڑھتے ہوئے گویا ہوا۔ "دشمن جی دار ہو تو مزہ آتا ہے دشمنی کا"۔

"میرا وعدہ ہے تم سے موسیٰ خان"۔ جہانداد نے نڈر انداز میں کہا۔ "میں تمہیں جب بھی ماروں گا للکار کر ماروں گا۔ تمہاری طرح دھوکے سے میں نے آج تک اپنے کسی دشمن پر وار نہیں کیا"۔

"سولجر!" وہ دھیمے انداز میں بولا۔ "ایک بہت پرانی کہاوت ہے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ میں نے عقل کا استعمال کرتے ہوئے تمہیں نہتا کیا ہے"۔

"بہت جلد تم اپنی اس عقل پر ماتم کرو گے"۔ اس نے جواب دیا۔ "آج سے تم اپنی زندگی کے دن گننا شروع کر دو"۔

"مجھے غصہ نہیں آتا"۔ وہ لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ "اور نہ ہی میں دشمن کو طنز کا نشانہ بناتا ہوں۔ میں دل سے نہیں دماغ سے سوچتا ہوں کیونکہ یہ آنکھوں کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ دل دشمنی جی داری سکھاتا ہے۔ سود و زیاں دیکھے بغیر انسان کو آگ میں کودنے پر مجبور کر دیتا ہے جبکہ اس کے برعکس عقل......"

"جب بے بھاؤ کی پڑتی ہے تو عقل رخصت ہو جاتی ہے"۔ جہانداد نے اسے ٹوکا۔ "ایسے میں دل والا ہی حالات کے سامنے سینہ سپر ہو سکتا ہے"۔

"موسیٰ خان، گولی مار دو اس کو"۔ پشتو لہجے میں اردو بولنے والے قبائلی نے مداخلت کرتے

ہوئے غصے سے کہا۔ "بوہت باتیں بناتا ہے"۔

"ناں.....گل شیر خاناں!" موسیٰ خان پشتو زبان میں بولا۔ "داز مونگ کار نہ دے خان جی گوری"۔ (گل شیر خان، یہ ہمارا کام نہیں ہے، اسے خان جی دیکھے گا)

"خو، خان جی اس بد بخت کو چوڑ دے گا" گل شیر خان نے کہا۔ "یہ امارا ایک آدمی مار دیا اور دو شدید زخمی ہے۔ امارا دل اس کو گولی مارنے کو کرتا ہے"۔

"قطعی نہیں"۔ موسیٰ خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں اس کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔ یہ خان جی کا مجرم ہے۔ خان جی ہی اس کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے"۔

"پھر ام خان جی کو بولے گا کہ اس کو امارے حوالے کر دو" گل شیر خان نے جواب دیا۔ موسیٰ خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے بعد انہوں نے گن پوائنٹ پر جہانداد کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ کر اسے جیپ میں بٹھا دیا۔ ایسے میں جہانداد صرف سونو کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو لاش کی صورت میں نہ جانے کس کھائی میں پڑا ہوا تھا۔ حالانکہ اس وقت اس کی اپنی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اسے فراز خان سے کسی بھی نیک سلوک کی توقع بالکل نہیں تھی۔ اس نے جس زندگی کو غیر محفوظ جان کر اس علاقے کا رخ کیا تھا، اب وہی زندگی موت کے ان دیکھے جبڑے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیپ گل شیر خان ڈرائیو کر رہا تھا اور جہانداد عقبی سیٹ پر دو مسلح قبائلیوں کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا۔ بقیہ چار دوسری جیپ میں سوار تھے۔ جو ان کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

تقریباً تین گھنٹے جیپیں مغرب کی جانب محوِ سفر رہیں۔ تمام راستہ کچا اور پہاڑی تھا۔ جہاں سڑک کے دونوں جانب ویران و غیر آباد چٹانوں کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ سبزے کے نام پر صرف پہاڑی جھاڑیاں اور پودے تھے۔ دورانِ سفر وہ آپس میں پشتو زبان میں باتیں کرتے رہے تھے۔ کوئی نہ کوئی جملہ جہانداد کی سمجھ میں آ جاتا تھا ورنہ تو وہ گونگوں کی طرح ان کی شکلیں ہی دیکھ رہا تھا۔

جیپیں اب بائیں ہاتھ ایک پختہ سڑک پر چڑھ کر جنوب کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ سڑک کے اردگرد اب سبزہ اور آبادی کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ راستے میں جتنے بھی لوگ انہیں ملے، حیرت انگیز طور پر سبھی مسلح ہی ملے تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد جیپیں ایک قبائلی گاؤں میں داخل ہو گئیں۔ مختلف گلیوں سے ہوتی ہوئیں آخر کار دونوں جیپیں ایک قلعہ نما عمارت کے صدر دروازے پر پہنچ کر رک گئیں۔ موسیٰ خان نے دو بار مخصوص انداز میں ہارن دیا تو دروازہ ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ دروازے سے دو خوفناک شکلوں والے قبائلی دربان ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار تھامے ہوئے اور موسیٰ خان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ پشتو زبان میں باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار جہانداد کا نام بھی لے رہے تھے۔ ان کی گفتگو سے جہانداد محض اتنا ہی اندازہ لگا سکا تھا کہ سرفراز علی خان یعنی "خان جی" تھوڑی دیر پہلے کہیں چلے گئے ہیں۔



موسیٰ خان چند لمحے دربانوں سے کچھ پوچھتا رہا اور پھر مطمئن انداز میں جیپ کو عمارت کے اندر لے گیا۔ دوسری جیپ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ عمارت کے اندر ایک چھوٹا سا شہر آباد تھا۔ بادی النظر میں جہانداد کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی جیل کے اندر آ گیا ہو۔ وہاں چاروں طرف بیرک نما چھوٹے بڑے کمروں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں اور ہر بیرک کی اپنی چار دیواری تھی۔ زیادہ تر رہائشیں پتھروں کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ عمارت کی تعمیر میں بھی زیادہ تر پتھر استعمال کیا گیا تھا۔

دونوں جیپیں مختلف عمارتوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک وسیع گیراج کے اندر جا کر رک گئیں، موسیٰ خان نے جیپ سے اتر کر گل شیر خان کو پشتو زبان میں کچھ ہدایات دیں اور پھر گیراج سے باہر نکل گیا۔

"چلو"۔ موسیٰ خان کے جانے کے بعد گل شیر خان نے جہانداد کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا قسمت اچھا ہے۔ ابی خان جی موجود نہیں ہے"۔

جہانداد نے ان کے منہ لگنے کی بجائے ان کا کہنا ماننا بہتر سمجھا اور خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑا۔

دس منٹ کے بعد وہ ایک چار دیواری کے اندر داخل ہوئے اور جہانداد متحیر رہ گیا۔

چار دیواری کے اندر بے شمار چھوٹے چھوٹے سیل بنے ہوئے تھے اور ہر سیل کے اندر کوئی نہ کوئی بدقسمت قیدی موجود تھا۔ سیلوں کے سامنے برآمدے میں کوئی دس کے قریب خونخوار شکلوں والے مسلح پہریدار باقاعدگی سے ٹہل رہے تھے۔ تمام پہریدار سیاہ رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس تھے، یہ ان کا یونی فارم تھا۔

گل شیر خان نے ایک پہریدار سے کہہ کر ایک خالی سیل کھلوایا اور جہانداد کو اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"ابی ادر موج کرو۔ کھانا شانا بھی ملے گا مگر ایک بات یاد رکھنا یہاں سے "پھرار" ہونے کی کوشش مت کرنا ورنہ پہریدار لوگ تم کو گولی سے اُڑا دے گا"۔

اتنا کہہ اس نے جہانداد کو ایک لمحے کے لیے عجیب انداز میں گھورا اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولا۔ "ابی کچھ بولنا ہے تو بولو"۔

"میرے دوست کی لاش اس کے ورثاء تک پہنچا دو"۔ اس نے بلا تمہید کہا۔ "وہ بے گور و کفن

رہے گا تو مجھے......"

"تم "پھکر" مت کرو"۔ گل شیر خان نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔ "... سکندر خان کے پہلو میں گاڑے گا"۔

اس کے بعد گل شیر خان نے وہاں موجود پہریداروں کو چند ہدایات دیں اور اپنے ... لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔



خان جی کی اس نجی جیل میں تیس کے قریب قیدی تھے اور وہ سب کے سب الگ الگ بند تھے۔ دس ضرب بارہ فٹ کے یہ سیل ایک ہی نمونے کے تھے۔ ہر سیل میں قیدی کے لیے ... اور کمبل موجود تھا۔ وہاں روشنی کا بھی مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ ہر سیل کی چھت سے ایک ... بلب لٹک رہا تھا، جو ساری رات جلتا رہتا تھا۔ حوائج ضرور کے لیے قیدیوں کو مسلح پہرے میں ... جاتا تھا تاہم دونوں وقت کا کھانا انہیں سیلوں ہی میں پہنچا دیا جاتا تھا۔

وہاں سے فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ ہر سیل کے عقبی جانب ایک گول روزن رکھا گیا ... میں آہنی سلاخیں لگائی گئی تھیں تاہم ہر روزن کا حجم اتنا کم تھا کہ آہنی سلاخیں نہ بھی ہوتیں تو بھی ... کوئی قیدی فرار نہیں ہو سکتا تھا۔

جہانداد کو جس دن وہاں ڈالا گیا تھا وہ اس دن سے فرار ہونے کے منصوبے بنا رہا تھا ... کوئی مناسب منصوبہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ موسیٰ خان نے بھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی اور نہ ... تک خان جی کے اسے دیدار ہوئے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں تھا؟ حالانکہ اسے وہاں قید ہوئے ... گزر چکا تھا۔ گاہے گاہے سیل کے سامنے ٹہلنے والے پہریداروں سے وہ خان جی اور موسیٰ ... متعلق استفسار کرتا رہتا تھا لیکن وہ اسے جواب دینے کی بجائے جھڑک دیا کرتے تھے حالانکہ ... قیدیوں سے گپ شپ لگاتے انہیں جہانداد نے کئی بار دیکھا تھا۔ شاید موسیٰ خان یا پھر گل شیر ... پہریداروں کو اس کے ساتھ بات چیت کرنے سے منع کر رکھا تھا۔

یہ دسویں رات کا ذکر ہے۔ جہانداد رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے سیل میں ٹہل ... اچانک اسے اپنے پیٹ میں ہلکا سا درد اٹھتا محسوس ہوا۔ پہلے تو اس نے درد کو نظر انداز کر دیا مگر ... کے ساتھ ساتھ اس کے پیٹ میں مروڑ بھی اٹھنے لگے تو مجبوراً اس نے سیل کے سامنے ٹہلنے ... پہریدار کو آواز دی۔

"اے سنو میرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں"۔ اس نے استدعا کی۔ "مجھے باتھ روم جانا ہے"۔



"صبح جانا"۔ پہریدار نے ناگواری سے جواب دیا۔ "موسیٰ خان کا یہی حکم ہے۔ میں اس کی حکم عدولی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا"۔

"دیکھو میں بہت تکلیف میں ہوں"۔ جہانداد نے دوبارہ گزارش کی۔ "چند منٹوں کا کام ہے موسیٰ خان کو پتہ بھی نہیں چلے گا"۔

"میں نے کہا ہے ناں کہ میں خطرہ مول نہیں لے سکتا"۔ اس نے بدتمیزی سے کہا۔ "تم یہیں سیل کے کونے میں بیٹھ جاؤ۔ صبح صفائی کروا دیں گے"۔

"تیرے موسیٰ خان کی ایسی کی تیسی"۔ جہانداد ایک دم بھڑک کر بولا۔ "دروازہ کھول دے حرامزادے ورنہ بہت برا ہوگا۔ میں تجھے......"

"تیری اتنی جرأت ...... قیدی ہو کر گالیاں بکتا ہے، کتے کے بچے"۔ پہریدار طیش میں آ کر بھڑکا اور پھر رائفل کی بیرل سلاخوں میں سے گزار کر جہانداد کے چہرے پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔ جہانداد اس وقت بالکل سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا تھا۔

چشم زدن میں اس نے رائفل کی ضرب سے اپنے چہرے کو بچایا اور پھر اس سے پہلے کہ پہریدار رائفل کو پیچھے کی طرف کھینچتا۔ اس نے رائفل کی بیرل پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اندر کی طرف کھینچا اور نتیجے میں پہریدار کا چہرہ زور سے آہنی سلاخوں کے ساتھ ٹکرایا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ خارج ہوئی اور وہ چہرے پر دونوں ہاتھ دھر کر وہیں سیل کے سامنے جھکتا چلا گیا۔

یہ جہانداد کے لیے فرار ہونے کا سنہری موقع تھا۔ پہریدار کی چیخ کا ابھی تک کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ غالباً دوسرے پہریدار اس وقت رات کا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ جہانداد کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر سرایت کر گئی، وقت بہت کم تھا کسی بھی وقت وہاں دوسرے پہریدار پہنچ سکتے تھے۔ مضروب پہریدار ابھی تک سیل کے سامنے بیٹھا درد کی شدت سے ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

اس نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے سیل کے تالے کا جائزہ لیا۔ وہ گولی سے باآسانی ٹوٹ سکتا تھا مگر جہانداد گولی چلانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ فائر کی آواز سن کر دوسرے پہریدار ہوشیار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ بغیر وقت ضائع کیے اس نے سامنے بیٹھے ہوئے پہریدار کے سر پر رائفل کی ایک زوردار ضرب لگا کر اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا اور پھر اس کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ رائفل پھینک کر تالے میں چابی لگا رہا تھا۔ انجانے خوف اور عجلت کی وجہ سے تالہ اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا اور دل اس کے سینے میں پارے کی طرح اچھل رہا تھا۔

اس کی مسلسل کوشش سے پانچویں چابی تالے میں لگ گئی اور ایک کھٹکے سے تالہ کھل گیا۔ رائفل

اٹھا کر وہ تیزی کے ساتھ سَیل سے باہر نکلا اور عمارت کے صدر دروازے کی طرف بھاگ
حیرت انگیز طور پر اب اس کے پیٹ میں اٹھنے والے مروڑ بھی دم توڑ چکے تھے۔ بغیر کسی خطرے
کے وہ صدر دروازے پر پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا تاہم اس جنگلہ
دار دروازے کو اندر سے ایک بھاری تالہ لگا ہوا تھا۔ دروازے سے دائیں ہاتھ تقریباً بیس گز
پر ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکیوں سے پھوٹنے والی یہ روشنی بمشکل
دروازے تک پہنچ رہی تھی۔

جہانداد نے رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور دروازے کی سلاخیں تھام لیں۔ معاً
سے شور کے ساتھ ساتھ ایک تیز نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی اور وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا۔
نگاہیں کمرے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اندر سے مردانہ گالیوں کی تیز تیز آوازیں آرہی تھیں۔
کمرے سے ایک لڑکی نکلی اور چلاتی ہوئی اس طرف آنے لگی جہاں جہانداد دروازے کی
تھامے ہوئے وہاں سے نکلنے کے لیے تیار کھڑا ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ کر دروازہ پھلانگ کر
نکل جائے مگر پھر اچانک ہی اس کے اندر کا ہمدرد انسان اس کے راستے کی دیوار بن گیا۔ لڑکی
کے۔ لیے پکارتی ہوئی آواز سن کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زینب اسے پکار رہی ہے۔ ایک پل
نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ لڑکی کے پیچھے پیچھے دو مرد بھی بھاگتے ہوئے
تھے۔

لڑکی اس کے قریب پہنچ کر ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔ پھر اس کے منہ سے خوفزدہ سی آواز
''تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے جانے دو''۔

لڑکی شاید جہانداد کو بھی ان لوگوں کا ساتھی سمجھ رہی تھی اس لیے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔
میں لڑکی کا پیچھا کرنے والے دونوں شخص بھی وہاں پہنچ گئے۔ جہانداد پر نظر پڑتے ہیں ان
ایک بولا۔ ''کون ہو تم اور یہاں دروازے پر کیا کر رہے ہو؟''

رات کا وقت ہونے کی وجہ سے وہ جہانداد کو نہیں پہچان سکے تھے۔

''اگر تم لوگوں نے اب اس لڑکی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں دونوں کو گولی مار دوں گا''۔ ان
کا جواب دینے کی بجائے جہانداد نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ''خیریت
ہو تو دروازہ کھول کر اسے جانے دو''۔

دونوں پہریدار خالی ہاتھ تھے اور جہانداد کے تیور بتا رہے تھے کہ انہوں نے ذرا سی
دکھایا تو وہ بے دریغ گولی چلا دے گا۔



''تت..... تم شاید نئے قیدی.....''

''سوال نہیں''۔ جہانداد نے اسے تنبیہی انداز میں ٹوکا۔ ''دروازے کا تالہ کھولو اور لڑکی کو جانے

ایک پہریدار نے فوراً جیب سے چابی نکالی اور تالہ کھول دیا۔ جہانداد نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور
دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپکا۔ عین اسی لمحے دور سَیلوں کی طرف سے ایک شور بلند ہوا اور پھر سیٹیاں
بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جہانداد لڑکی کا ہاتھ پکڑے اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔

''یہاں سے نکلنے کا کوئی محفوظ راستہ جانتی ہو؟'' بھاگتے ہوئے اس نے لڑکی سے استفسار کیا۔

''م..... میں.....'' لڑکی نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ جواب دیا۔ ''کچھ..... نہیں
پتی..... وہ میری..... آنکھوں پر..... پٹی باندھ کر لائے تھے''۔

وہ دونوں بھاگتے ہوئے جیل خانے کی عمارت سے دور نکل آئے تھے لیکن باہر جانے کے
راستے سے دونوں لاعلم تھے۔ خان جی کی وہ قلعہ نما عمارت دو سو کنال کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس
کی بیرونی دیواریں بالکل کسی قلعے کی دیواروں کی طرح بلند و بالا تھیں۔ اس کا حفاظتی نظام کسی جیل کے
نظام سے بھی سخت تھا۔ وہاں سے باہر نکلنا ناممکنات میں سے تھا مگر جہانداد ایک امید کے سہارے لڑکی
کو ساتھ لیے بھاگتا پھر رہا تھا۔ معاً ان دونوں پر تیز روشنی پڑی اور جہانداد لڑکی کو کھینچتا ہوا ایک عمارت
کے سائے میں لے گیا۔ یہ تیز روشنی سرچ لائیٹ کی تھی جو ایک ٹاور سے پوری عمارت پر پھینکی جا رہی
تھی۔

''ہم یہاں سے نہیں نکل سکیں گے''۔ لڑکی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ..... مجھے دوبارہ پکڑ
لیں گے''۔

''چپ ہو جاؤ''۔ جہانداد نے اسے مدہم آواز میں ڈانٹا۔ ''جب تک میں زندہ ہوں تجھ پر آنچ
نہیں آنے دوں گا''۔

اتنا کہہ کر اس نے دوبارہ لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور عمارت کی آڑ میں آگے بڑھنے لگا۔ یوں چھپتے
چھپاتے وہ عمارت کی عقبی دیوار تک پہنچ گئے۔ مگر انہیں دیوار میں کہیں بھی کوئی دروازہ نظر نہ آیا۔ دیوار
کے ساتھ ساتھ قد آدم جھاڑیاں اور پودے دور تک جا رہے تھے۔ ٹاور کی لائیٹ بدستور چاروں طرف
گھوم رہی تھی۔

''اب کیا ہو گا؟'' لڑکی نے رو دینے والے انداز میں پوچھا۔ ''ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟
اس طرف تو کوئی دروازہ بھی نظر نہیں آرہا''۔

''شاید یہ عمارت کی عقبی دیوار ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''آؤ آگے بڑھتے ہیں شاید کوئی.....''

اچانک دائیں ہاتھ جھاڑیوں پر کسی نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور جہانداد کی بات ادھوری رہ گئی۔لڑکی کو کھینچتا ہوا وہ ایک لمحے میں جھاڑیوں کے اندر غائب ہو گیا۔

''خاموش رہنا''۔اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں لڑکی کو تنبیہہ کی۔''وہ غالباً ادھر ہی آ رہے ہیں''۔

''اگر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تو......''

''چپ رہو احمق''۔جہانداد نے اسے ٹوکا۔''ان جھاڑیوں کے پیچھے وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے''۔

''اچھا جی......اب نہیں بولوں گی''۔

لڑکی نے کچھ اس انداز میں جواب دیا کہ جہانداد اس کٹھن صورتِ حال میں بھی مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

''یہ میں تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں''۔وہ سرگوشی میں لڑکی کو سمجھاتے ہوئے بولا۔''ورنہ میں تو یہاں سے باآسانی نکل سکتا ہوں''۔

تلاش کرنے والے لمحہ بہ لمحہ ان کے نزدیک پہنچتے جا رہے تھے اور اب ان کی آوازیں بالکل واضح طور پر جہانداد کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھیں۔

''تم دونوں بالکل گدھے ہو''۔کوئی سخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔''موسیٰ خان کو اگر لڑکی کے بارے میں معلوم ہو گیا تو وہ تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایسے کاموں کا وہ کتنا سخت مخالف ہے''۔

''ہم لڑکی کو مار کر کسی کونے کھدرے میں دفنا دیں گے''۔کسی دوسرے نے جواب دیا۔''موسیٰ خان کو پتا بھی نہیں چلے گا''۔

''یہاں کتنے ہی لوگ انہیں ڈھونڈ رہے ہیں''۔پہلی آواز نے کہا۔''اگر وہ کسی اور کے ہاتھ لگ گئے تو پھر کیا ہوگا؟ واقعہ کا پتا چلتے ہی موسیٰ خان تمہیں صفائی پیش کرنے کا موقع تک نہیں دے گا''۔

''ضروری تو نہیں ہے کہ وہ کسی اور کے ہی ہاتھ لگیں گے''۔دوسری آواز نے قدرے بے پروائی سے کہا۔''تم خواہ مخواہ ہمیں پریشان کر رہے ہو''۔

یونہی باتیں کرتے ہوئے وہ بالکل ان کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ان کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہے۔جہانداد نے سیکنڈوں میں ایک فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔محض ایک اندازہ لگا کر ایک بار پھر وہ موسیٰ خان پر اعتبار کر رہا تھا۔اس نے لڑکی کے کان سے منہ لگا کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور پھر دبے پاؤں بڑھ کر جھاڑیوں سے باہر جھانکنے لگا۔

اس کے اندازے کے مطابق وہ واقعی تین آدمی تھے اور جھاڑیوں سے چند قدم دور کھڑے ہوئے تھے۔ان میں سے ایک ابھی تک باقی دو کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔تینوں کی جھاڑیوں کی طرف پشت تھی۔جہانداد کسی بلی کی طرح بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے جھاڑیوں سے نکلا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر ایک کی پشت پر رائفل رکھ کر سرد لہجے میں بولا۔''خبردار! ہتھیار پھینک دو ورنہ میں اس کی پشت میں سوراخ کر دوں گا''۔

بقیہ دو بوکھلا کر پیچھے پلٹے مگر اپنے ساتھی کی پشت پر ٹکی جہانداد کی رائفل دیکھ کر وہ کش مکش کا شکار ہو گئے۔

''رائفلیں پھینک دو''۔جہانداد دوبارہ غرایا۔''میری انگلی ذرا سی جنبش کی منتظر ہے''۔

''تم یہاں سے بچ کر......''ان دونوں میں سے ایک نے جہانداد کو سنگین نتائج کی دھمکی دینے کی کوشش کی مگر جہانداد نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں زندگی کو ہتھیلی پر لے کر پھرتا ہوں۔ہتھیار پھینک کر دور چلے جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا''۔

''ہاں ہاں......پھینک دو''۔جس کی پشت سے رائفل لگی ہوئی تھی وہ گڑگڑایا۔''جیسا یہ کہتا ہے ویسا ہی کرو''۔

اس کے بعد چند لمحوں میں جہانداد نے ان تینوں کو نہتا کر کے ان کی رائفلیں خالی کر کے جھاڑیوں میں پھینک دیں اور پھر لڑکی کو جھاڑیوں سے باہر بلا لیا۔

''چلو''۔لڑکی کے جھاڑیوں سے باہر آنے کے بعد جہانداد نے ان تینوں کو نشانے پر رکھتے ہوئے حکم دیا۔

''کک......کہاں؟''ایک نے استفسار کیا۔

''موسیٰ خان کے پاس''۔جہانداد نے کہا۔''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔اگر کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو کتے کی موت مارا جائے گا''۔

ان کے پاس جہانداد کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا،اس لیے بلاں چوں و چرا چل پڑے۔



تلاش کرنے والے محافظوں اور پہریداروں سے بچتے بچاتے جہانداد ان تینوں کو لے کر موسیٰ خان کی رہائش گاہ تک پہنچ گیا۔اس وقت تک موسیٰ خان تک بھی اس ہنگامے کی خبر پہنچ چکی تھی۔جیل خانے کے تمام پہریدار رہائش گاہ کے احاطے میں موجود تھے اور موسیٰ خان انہیں اپنے

مخصوص انداز میں ڈانٹ رہا تھا۔ رہائش گاہ کی تمام بیرونی لائٹس آن تھیں اور موسیٰ خان اپنے پہریدار کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جہانداد کے ہاتھوں زخمی ہونے والے پہریدار کو رہائش گاہ کے اندر موجود ڈاکٹر کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔

"تم لوگوں نے غفلت کا ثبوت دے کر اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں"۔ موسیٰ خان پہریداروں سے کہہ رہا تھا۔ "اگر سولجر یہاں سے نکل گیا تو جانتے ہو میں کیا کروں گا؟" آخری الفاظ اس نے خلافِ معمول بلند آواز میں ادا کیے تھے۔

تمام پہریدار دم سادھے ہوئے کھڑے تھے۔ موسیٰ خان کے کسی سوال کا جواب دینا ان کے لئے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔

"بولو! مجھے کیا کرنا چاہیے؟" موسیٰ خان دوبارہ اونچی آواز میں بولا۔ "اپنی سزا خود تجویز کر دو ورنہ کل خان جی آنے والا ہے اور تم ......"

اچانک جہانداد تینوں پہریداروں اور لڑکی کے ساتھ صدر دروازے سے نمودار ہوا اور موسیٰ خان کی بات ادھوری رہ گئی۔ پہریداروں کو جہانداد کے نشانے پر دیکھ کر ایک لمحے کے لیے موسیٰ خان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے مگر پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے پھر دل کی مانی ہے سولجر"۔ جہانداد کے نزدیک پہنچتے ہی موسیٰ خان نے مسکرا کر کہا۔ "اگر تم لڑکی کے چکر میں نہ پڑتے تو تمہارے پاس یہاں سے فرار ہونے کا بہترین موقع تھا"۔

"میں ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا موسیٰ خان"۔ جہانداد نے جواب دیا۔ "میں اگر عقل کی سنتا تو اس لڑکی کے ساتھ نہ جانے تمہارے آدمی کیا سلوک کرتے۔ اب اس لڑکی کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے"۔

موسیٰ خان نے جہانداد کی بات کا جواب دینے کی بجائے ایک پہریدار کے ہاتھ سے رائفل لی اور لڑکی اٹھا کر لانے والے دونوں پہریداروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیا سوچ کر تم لوگوں نے خان جی کی حکم عدولی کی ہے؟ کیا تم یہ بھول گئے تھے کہ یہاں عورت کا داخلہ منع ہے؟"

"ہم ...... مم ...... معافی ...... چا ...... ہتے ......" دونوں پہریدار یک زبان ہو کر گڑگڑائے مگر موسیٰ خان کے تیور دیکھ کر وہ اپنی بات مکمل کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

"جو کام جان بوجھ کر کیا جائے، اس کی معافی نہیں ہوتی"۔ موسیٰ خان نے یوں اطمینان



سے کہا جیسے کسی کو قرض دینے سے انکار کر رہا ہو۔ "اوپر جا کر معافی مانگ لینا"۔

اتنا کہہ کر اس نے رائفل سیدھی کر لی۔

"نہیں ...... موسیٰ خان ...... تمہیں خدا کا واسطہ"۔ دونوں پہریدار ہاتھ جوڑ کر چلائے۔ "یہ پہلی غلطی ...... ہے ہم آئندہ ......"

"آئندہ کس نے دیکھا ہے؟" موسیٰ خان نے زہرخند سے کہتے ہوئے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔

یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے اور دونوں پہریداروں کی پیشانیوں میں سوراخ ہو گئے۔ ایک پل میں دونوں کٹے ہوئے شہتیر کی طرح لہرا کر زمین بوس ہو گئے۔

موسیٰ خان نے رائفل کی نالی میں پھونک ماری اور جہانداد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "دیکھا! دل پھر ہار گیا"۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "جیت ہمیشہ عقل کے حصے میں آتی ہے۔ میں دل کی مان کر ان دونوں کو معاف کر سکتا تھا مگر عقل نے مشورہ دیا کہ یہ نادانی ہے، خان جی کے ساتھ غداری ہے۔ انہیں کسی اور ذرائع سے یہ بات معلوم ہو جائے گی اور پھر تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ میرے لیے عقل کے اس مشورے سے انکار ممکن نہیں تھا۔ سو میں نے عقل کی سنتے ہوئے ایک درست فیصلہ کیا ہے"۔

"اس لڑکی کے متعلق تمہاری عقل نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" جہانداد نے استفسار کیا۔

"یہ جہاں سے لائی گئی ہے وہیں پہنچا دی جائے گی"۔ اس نے جواب دیا اور پھر ایک لمحہ توقف کے بعد دوبارہ کہا۔ "جانتے ہو یہ فیصلہ میں نے کیا سوچ کر کیا ہے؟"

"میں کوئی نجومی نہیں ہوں موسیٰ خان"۔ جہانداد بولا۔ "اور نہ ہی سوچیں پڑھنے والا کوئی علم جانتا ہوں"۔

"سولجر!" وہ مسکرا کر بولا۔ "تو عقل کا مشورہ مان کر میرے پاس آیا ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ عقل ہار جائے چاہے وہ میرے دشمن کی عقل کیوں نہ ہو"۔

اس کے بعد موسیٰ خان نے دو پہریداروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "لڑکی کو ابھی اس کے گاؤں تک پہنچا دو"۔

لڑکی جو بڑی دیر سے موسیٰ خان اور جہانداد کی باتیں سن رہی تھی۔ اپنی رہائی کا حکم سن کر موسیٰ خان سے بولی۔ "میں اپنے محسن سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں"۔

"اوہ ......" موسیٰ خان نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ "ایسی کیا بات ہے، جو تم اکیلے میں سولجر سے ملنا چاہتی ہو؟ کہیں تم کوئی ......"

"میں جانتا ہوں موسیٰ خان"۔ جہانداد اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔ "کہ یہ اکیلے … کس لئے ملنا چاہتی ہے"۔

"اگر تم جانتے ہو تو پھر اکیلے میں ملنے کی کیا ضرورت ہے؟" موسیٰ خان نے تردد …

"میرا دل کہتا ہے کہ تمہارا دماغ تجھے کوئی نامعقول مشورہ دے چکا ہے"۔ جہانداد … استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ورنہ تم ایک کمزور لڑکی کی بات بلاتردد مان لیتے"۔

"میرے دماغ نے آج تک مجھے کوئی غلط مشورہ نہیں دیا تو اب کیسے دے گا؟" موسیٰ … نے جواب دیا اور جہانداد کے ہاتھ سے رائفل لینے کے بعد قدرے توقف سے دوبارہ … چند قدم دور جا کر لڑکی سے بات کر سکتے ہو مگر دس منٹ سے زیادہ نہیں"۔

"شکریہ"۔ کہہ کر جہانداد نے لڑکی کو ساتھ لیا اور چند قدم اور دور جا کر جواب طلب … میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"دیکھئے"۔ لڑکی اس کا مطلب بھانپتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ یہاں سے … کر میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا مگر میں تمہیں کٹھن حالات میں بھی نہیں بھولوں گی کاش وقت … اتنی مہلت دے سکتا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی سرگزشت سن لیتے۔ تم نے میری خاطر … دی ہے وہ......"

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا"۔ اس نے قطع کلامی کی۔ "اور میں تمہیں اس … سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا کہ میرا نام جہانداد ہے اور میں پولیس سے بھاگا ہوا ایک مجرم … یہاں سے باہر جا کر مجھے بھول جانا۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے"۔

"گل بانو اپنے محسن کو ہمیشہ یاد رکھے گی"۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اور مجھے یقین ہے کہ ہم دوبارہ کسی دن ملیں گے اور اس دن ہمارے پاس لامحدود وقت ہو گا"۔

"اگر زندہ بچ گیا تو"۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "دراصل میں خان جی کے چند آدمی قتل کر چکا … اور غالب گمان یہی ہے کہ وہ میری موت......"

"نہیں"۔ گل بانو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹی۔ "تم زندہ رہو گے۔ میرا دل کہتا … خان جی تمہیں معاف کر دیں گے۔ وہ بہادروں کی بڑی قدر کرتے ہیں"۔

"تم کیا جانتی ہو خان جی کے بارے میں؟" اس نے استفسار کیا۔

"یہی کہ وہ بہادر لوگوں کو پسند کرتا ہے اور انہیں اپنے پاس رکھ لیتا ہے"۔

"لیکن میں اس کے پاس نہیں رہنا چاہتا"۔ جہانداد نے ناگواری سے کہا۔ "دستِ … بن کر رہنا میری فطرت کے خلاف ہے"۔



اسی اثناء میں موسیٰ خان نے آواز لگائی۔ "بس سولجر! دس منٹ ختم ہو گئے ہیں اب آ جاؤ"۔
اس کے بعد موسیٰ خان نے دو پہریداروں کے ساتھ لڑکی کو رخصت کر دیا اور جہانداد کو ایک … پھر اسی سیل میں پہنچا دیا گیا جہاں سے وہ بھاگا تھا۔

===

دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب موسیٰ خان نے اس کے سیل کا دروازہ کھلوایا اور اسے باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آؤ...... تمہیں خان جی نے بلایا ہے"۔

جہانداد سیل سے باہر نکلا اور چپ چاپ اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ یہ عمارت اندر سے بہت شاندار تھی۔ گراسی لان کے چاروں طرف کیاریوں میں مختلف قسم کے پھلدار اور پھولدار پودے لگے ہوئے۔ ایک طرف پورچ میں نئی چمچماتی ہوئی ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ دو نوکر کیاریوں کی گوڈی کرنے کے ساتھ ساتھ پودوں کو پانی بھی لگا رہے تھے۔ برآمدے کا شفاف فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ برآمدے اور کمروں کی تعمیر میں سنگِ مرمر استعمال کیا گیا تھا۔

برآمدے میں داخل ہونے کے بعد وہ مختلف کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آخری کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ موسیٰ خان نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اندر سے فراست علی خان عرف خان جی کی سپاٹ آواز سنائی دی۔ "لیس کم اِن"۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اندر خان جی ایک صوفے پر بیٹھا ولایتی سگار کے کش لگا رہا تھا۔ آج خلافِ معمول وہ شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔

"خان جی! مجرم حاضر ہے"۔ موسیٰ خان نے اندر داخل ہوتے ہی مؤدب انداز میں کہا۔ "اس نے ہمارے تین آدمی......"

"میں سب سن چکا ہوں موسیٰ خان"۔ خان جی اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولا۔ "مرنے والے بزدل تھے ورنہ ان کی جگہ آج یہ میرے سامنے نہ کھڑا ہوتا"۔

"آپ درست کہتے ہیں خان جی"۔ موسیٰ خان نے فوراً تائید کی۔ وہ ایک غلام کی طرح خان جی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا تھا اور جہانداد دل ہی دل میں اس کی اداکاری کو داد دے رہا تھا۔ وہ واقعی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر تھا۔ بڑے بڑے پھنے خانوں کو خاطر میں نہ لانے والا موسیٰ خان، خان جی کے سامنے نگاہیں تک اٹھانے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

خان جی کی نگاہیں جہانداد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ نہ جانے وہ اسے دیکھتے ہوئے کیا سوچ رہا تھا۔ شاید اس کی موت کا حکم صادر کرنے والا تھا یا پھر کوئی اور بدترین سزا۔ تاہم جہانداد

اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

''موسیٰ خان!'' چند لمحوں کے توقف کے بعد خان جی دوبارہ گویا ہوا۔ ''تم نے
ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کیا۔ اسے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟''

''نہیں خان جی! غلام بھلا ایسی جرأت کر سکتا ہے''۔ موسیٰ خان نے جواب دیا۔
کے حکم کے مطابق اسے انگلی تک نہیں لگائی گئی۔ یہ......''

''لیکن میرے دوست کو میری آنکھوں کے سامنے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا
جہانداد، موسیٰ خان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔'' حالانکہ وہ بے قصور تھا۔
صرف مجھے پناہ دینے کا جرم کیا تھا''۔

''خان جی نے صرف تمہارا خیال رکھنے کا حکم دیا تھا''۔ موسیٰ خان نے ناگواری سے
''تمہارے متعلقین کا نہیں''۔

''گزری باتوں کو بھول جاؤ جہانداد''۔ خان جی بولا۔ ''تم مردِ میدان ہو، ایسی چھوٹی
باتوں سے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ جس راستے کا انتخاب تم نے کیا ہے کہ اس میں
خون کے دریا بھی آئیں گے۔ اپنے خونی رشتوں کی قربانی بھی دینا پڑے گی۔ اگر تم ابھی سے
ہار گئے تو ملک مراد جیسے لوگ تم سے جینے کا حق چھین لیں گے۔ تم اکیلے کس کس سے لڑو گے
تک تمہاری پشت پر کوئی طاقتور ہاتھ نہیں ہوگا۔ یونہی اپنوں کے حال سے بے خبر ہو کر در در
پھرو گے''۔

''میرے اپنوں کو کیا ہوا ہے؟'' اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ ''کہیں ملک مراد نے
کوئی......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ایک دم اسے پریشان کن خیالات نے گھیر لیا۔ اماں،
سکینہ، حاکم چچا اور اس کے گھر والوں کی صورتیں اس کی سوچوں میں ابھرنے، ڈوبنے لگیں۔
پھر ان سب چہروں پر اچانک ہی ایک کرخت اور سنگدل چہرہ حاوی ہو گیا۔ وہ ملک مراد کا تھا۔
اس کی خوفناک آنکھوں میں اس کے لیے تمسخر تھا اور لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔ جیسے
بے بسی کا مذاق اُڑا رہا ہو۔

خان جی اس کے رنگ بدلتے چہرے کو بڑے انہماک سے دیکھ دیا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ
اس کے اندر کیسی جنگ چھڑ چکی ہے اور وہ کس کرب سے گزر رہا ہے۔ خان جی ایک گرگِ باراں
دیدہ شخص تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنا مطلب کیسے نکالا جاتا ہے؟ کیسے بے ڈھب لوہے کو
پگھلا کر ہتھیار میں ڈھالا جاتا ہے؟ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ سب انتظامات مکمل



جہانداد کو راہ پر لانا باقی تھا۔

''دیکھو جہانداد!'' چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''میری مدد کے بغیر تم ملک مراد کا
بال بیکا بھی نہیں کر سکتے...... وہ ایک بارسوخ شخص ہے، علاقے کا نیا تھانیدار اس کی مٹھی میں ہے
اور ان دونوں نے تمہارے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے۔ میں تمہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا لیکن
تمہیں اندھیرے میں بھی تو نہیں رکھا جا سکتا''۔

اتنا کہہ کر وہ ایک ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا اور جہانداد کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔
اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ خان جی کوئی بُری خبر سنانے والا ہے۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں ہے''۔ خان جی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ملک مراد نے
تھانیدار نادر خان کے ساتھ مل کر نہایت ہی گری ہوئی حرکت کی ہے۔ ان دونوں نے جائیداد کے
کاغذات پر انگوٹھا لگوانے کے لیے تمہارے باپ کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا تھا مگر اس نے
کاغذات پر انگوٹھا لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ تب نادر خان نے اس پر غیر انسانی تشدد کیا۔ وہ
پھر بھی نہ مانا تو نادر خان نے کمینگی کی انتہا کرتے ہوئے تمہاری اکلوتی بہن کو اٹھوا لیا اور......''

''بس خان جی''۔ وہ حلق کے بل چیخا۔ ''خدا کے لیے مجھے جانے دو...... صرف چند دنوں کی
مہلت دے دو پھر بے شک میری جان لے لینا، میں اُف تک نہیں کروں گا''۔

''یہی اندھا جوش تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے''۔ خان جی نے ناصحانہ انداز اختیار کرتے
ہوئے کہا۔ ''اور تمہیں آج تک جتنا بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی جوش اور غصے کی وجہ سے اٹھانا پڑا
ہے۔ احمق آدمی! پہلے میری پوری بات اطمینان سے سن لو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔ تمہاری بہن اور ماں
اس وقت میری حفاظت میں ہیں۔ میں انہیں وہاں سے نکال لایا ہوں۔ مجھے نہایت افسوس کے
ساتھ تمہیں یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ تمہارا باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ اس نے حوالات کے اندر
سلاخوں سے سر ٹکرا کر خودکشی کر لی تھی اور تمہاری بہن اسی دن سے آج تک سکتے کی حالت میں
ہے۔ میں نہیں جانتا اس کے ساتھ دشمنوں نے کیا سلوک کیا ہے؟ تاہم اس کی جان محفوظ ہے''۔

''میں ماں اور بہن سے ملنا چاہتا ہوں''۔ اس نے خان جی سے گزارش کی۔ ''نہ جانے ان
پر کیا گزری ہوگی؟''

''میں نے کہا ہے ناں کہ وہ دونوں محفوظ جگہ پر ہیں''۔ خان جی نے جواب دیا۔ ''تمہیں
ان کے متعلق فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ملک مراد جیسا کوئی بھی گھٹیا قدم نہیں
اٹھاؤں گا۔ ہم قبائلی آپس کی دشمنیوں میں عورتوں کو نقصان نہیں پہنچاتے''۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر ان دونوں کو یہاں کس مقصد کے لیے لایا گیا ہے؟'' اس نے

بگڑے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''کیا انہیں میری کمزوری سمجھ کر استعمال نہیں کیا جائے گا؟''

''تم بہت بیوقوف ہو''۔ خان جی برا مانے بغیر بولا۔ ''میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ چاہتا ہوں اور تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟''

''میں کوئی بچہ نہیں ہوں خان جی''۔ وہ زہر خند سے بولا۔ ''تمہاری چال خوب ہوں۔ تم جو کھیل کھیلنا چاہتے ہو اس سے میں واقف ہوں اور......''

''خان جی کے سامنے اس لہجے میں بات مت کرو''۔ موسیٰ خان نے تنبیہی انداز میں کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ نقصان اٹھاؤ گے''۔

''تمہاری طرح میں خان جی کا غلام نہیں ہوں''۔ اس نے بھڑک کر جواب دیا۔ ''اور معاملے کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق ہے''۔

''خان جی! مجھے اجازت دیجیے''۔ موسیٰ خان نے التجائیہ انداز میں کہا۔ ''یہ حد سے بڑھ ہے۔ ہماری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ موسیٰ خان کس بلا کا ہے۔ دس منٹ کے اندر میں اس کی ہڈی پسلی برابر کر دوں گا''۔

''سکندر نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا''۔ جہانداد نے تمسخر سے کہا۔ ''اور پھر دعوے سمیت ہو گیا زمین میں۔ تمہارا خاتمہ بھی میرے ہی......''

''بس!'' خان جی ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے گرجا۔ ''میں تم دونوں کو خالی ہاتھوں لڑنے موقع ضرور دوں گا مگر ابھی نہیں۔ جب تک انفضال خٹک زندہ ہے میں بے چین رہوں گا''۔

اتنا کہہ کر اس نے ذرا سا توقف کیا اور پھر جہانداد سے بولا۔ ''جہانداد! تم نے اگر ماں اور بہن سے ملنا ہے تو پھر بلا چوں و چرا میرے حکم پر چلنا پڑے گا بصورت دیگر تم ان کی شکلیں دیکھنے کے لیے ترستے رہو گے۔ بولو کیا چاہتے ہو؟ ماں اور بہن سے ملنا یا جیل خانے کے کسی سیل میں ہمیشہ کے لیے سڑنا چاہتے ہو؟ فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے''۔

''واہ خان جی واہ''۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ ''آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ تم بھی ملک مراد کی طرح مطلب پرست ہو''۔

''میں اگر مطلب پرست ہوتا تو تمہاری ماں اور بہن کی حفاظت کی ضمانت کبھی نہ دیتا۔ مجھے غلط سمجھ رہے ہو...... ملک مراد کے مقابلے میں مَیں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں در در بھٹکنے سے بچانا چاہتا ہوں۔ تم کب تک قانون سے بھاگتے پھرو گے؟ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا ہے، کیا ہو گا تمہارا اور تمہاری بوڑھی ماں اور بہن کا؟ کیا تم انہیں تحفظ دینا نہیں چاہتے؟'' لمحہ بھر کے لیے متوقف ہو کر دوبارہ بولا۔ ''آج دشمنوں سے لڑنے کے لیے جتنی اہمیت دولت



تم اچھی طرح جانتے ہو، غربت بذاتِ خود ایک جرم ہے۔ آج صاحب ثروت لوگ دولت کی بدولت سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ ناجائز کو جائز، مجرم کو بے گناہ اور بے گناہ کو باآسانی مجرم ثابت کر دیتے ہیں۔ دولت چابی ہے ہر بند تالے کی۔ تم خود سوچو، کیا ملک مراد تمہاری طرح کا ایک انسان نہیں ہے؟ اس کے پاس ایسی کون سی چیز ہے جو اسے عام انسانوں سے ممتاز کرتی ہے؟ کیا وہ دولت نہیں ہے؟''

اس کی چکنی چپڑی باتیں آہستہ آہستہ جہانداد کو متاثر کرتی جا رہی تھیں۔ بڑے غیر محسوس انداز میں وہ جہانداد کو شیشے میں اتار رہا تھا۔

''دولت کے زور پر ملک مراد نے کیا کچھ نہیں کیا تمہارے ساتھ؟'' وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا باپ اس کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بہن سکتے میں چلی گئی اور تمہاری منگیتر قتل کر دی گئی۔ تمہاری موروثی زمین اس نے زبردستی اپنے نام کروا لی لیکن تم پھر بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ محض اس لیے کہ تمہارے پاس دولت کی طاقت نہیں تھی۔ آج اگر تمہارے پاس دولت آ جائے تو یہی نیا تھانیدار نادر خان اور علاقے کا پٹواری تمہارے سامنے دُم ہلاتے نظر آئیں گے۔ یہ وہ کتے ہیں جو دولت کی ہڈی پر جھپٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ دشمنوں سے لڑنا ہے تو دولت مند بنو''۔

خان جی کی باتوں نے جہانداد کے دماغ میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔ اس نے چند لمحے ٹھنڈے دل سے سوچا تو خان جی اسے حق بجانب نظر آنے لگا۔ دولت کی افادیت اسے معلوم ہوئی تو وہ خان جی کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

''میں تمہارے لیے کام کرنے کو تیار ہوں''۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولا تو اس کے لہجے سے عزم جھلک رہا تھا۔ ''لیکن سب سے پہلے میں ماں اور بہن سے ملنا چاہوں گا''۔

''کیا میری بات پر تجھے اعتبار نہیں ہے؟'' خان جی نے کہا۔ ''وہ دونوں بالکل خیریت سے ہیں۔ تم ان کی فکر مت کرو، میں......''

''نہیں خان جی''۔ اس نے قطع کلامی کی۔ ''ان سے ملے بغیر میں ایک قدم بھی نہیں اٹھاؤں گا۔ اگر تم نے مجھ سے کوئی کام لینا ہے تو پھر میری بات ماننا پڑے گی''۔

''ٹھیک ہے''۔ خان جی نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ان سے مل کر اگر تم نے اپنا ارادہ بدل دیا تو پھر مجھ سے بھلائی کی توقع مت رکھنا''۔

''خان جی! بے وجہ کے اندیشے کیوں کرتے ہو؟'' جہانداد مسکرا کر بولا۔ ''میں جب کسی کام کا ارادہ کر لوں تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا۔ میری زبان پر بھروسہ کرو یہ ایک مرد کی زبان ہے''۔

"اچھی بات ہے"۔ خان جی نے رضا مندی کا اظہار کیا۔ "میں تمہاری زبان پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں تمہارے پاس ہوں گی"۔

=== ===

اسی دن بارہ بجے کے قریب سکینہ اور اس کی ماں کو اس قلعہ نما عمارت میں پہنچا دیا گیا۔ جہانداد کو ماں سے ملنے کی جتنی زیادہ خوشی ہوئی تھی بہن سے مل کر وہ اتنا ہی اداس ہوا تھا۔ اس کے جھنجھوڑنے کے باوجود سکینہ نے اسے نہیں پہچانا تھا تاہم ماں نے اسے گھر پر ٹوٹنے والی قیامت کے بارے میں پوری تفصیل بتا دی تھی۔ نادر خان کی کمینگی کے متعلق بتاتے ہوئے ماں نے رونا شروع کر دیا تھا۔

"وہ کسی بھیڑیے سے زیادہ خونخوار ہے جہانداد"۔ ماں نے روتے ہوئے بتایا۔ "نہ جانے اس نے میری بچی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ بے چاری نہ بولتی ہے، نہ ہنستی ہے، نہ روتی ہے۔ بس گھنٹوں کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ تم نے ملک مراد کے ساتھ دشمنی کر کے بہت برا کیا ہے۔ سب کچھ لٹ گیا ہے ہمارا۔ دل چاہتا ہے زہر پھانک کر جان چھڑا لوں اس زندگی سے مگر سکینہ کے متعلق سوچ کر ارادے پر عمل کرنے سے ڈرتی ہوں کہ میرے بعد کون اس زندہ لاش کی دیکھ بھال کرے گا؟"

"ماں! یہ دشمنی مجھ پر مسلط کی گئی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ "میں نے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ خیر جو ہونا تھا۔ وہ تو ہو گیا مگر اب میں جو دشمنوں کے ساتھ کروں گا ایک زمانہ دیکھے گا۔ نادر خان سمجھو تھوڑے دنوں کا مہمان ہے"۔

اس کے بعد خان جی کی اجازت سے سکینہ کے لیے ایک قابل ڈاکٹر کا بندوبست کیا گیا۔ ڈاکٹر نے سکینہ کو چیک کرنے کے بعد دوائیاں تجویز کرتے ہوئے بتایا کہ یہ کسی بہت بڑے صدمے کا اثر ہے ان شاء اللہ ان دوائیوں کے استعمال سے اس کی حالت میں کافی بہتری آئے گی۔

"ڈاکٹر صاحب!" جہانداد نے استفسار کیا۔ "یہ بولتی کیوں نہیں ہے؟ کیوں نہیں بتاتی اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"خدا پر بھروسہ رکھو"۔ ڈاکٹر نے تسلی دی۔ "یہ ضرور بولے گی۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے۔ بہت بڑے صدمے سے گزرنے کے بعد وقتی طور پر انسان کی قوتِ گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ ایسا دماغ کے متاثر ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے"۔

اتنا کہنے کے بعد ڈاکٹر نے اسے انسانی دماغ کے متعلق تفصیل سے بتا دیا کہ دماغ کیا کام کرتا ہے؟ کیسے جسم کے اعضاء کو احکامات صادر کرتا ہے اور قوتِ گویائی کیسے متاثر ہوتی ہے؟

یہ ڈاکٹری باتیں جہانداد کی سمجھ میں تو نہ آ سکیں تاہم وہ کسی حد تک مطمئن ضرور ہو گیا تھا۔



ماں اور بہن چند دن اس کے پاس رہیں اور پھر خان جی کے حکم سے انہیں واپس بھیج دیا گیا۔

رات کے کھانے کے بعد خان جی نے جہانداد کو طلب کر لیا۔ موسیٰ خان بھی وہیں موجود تھا۔ خان جی نے جہانداد سے اس کی ماں اور بہن کے متعلق چند باتیں کیں اور پھر براہِ راست مطلب کی طرف آ گیا۔

"جہانداد!" وہ سگار جلاتے ہوئے بولا۔ "اب جبکہ تم نے میرا ساتھ دینے کی ہامی بھر لی ہے تو کیوں نہ میں تمہارا امتحان لے لوں؟ اگر تم اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہاری توقع سے بڑھ کر انعام دوں گا"۔

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں"۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"افضال خٹک کا نام سنا ہے کبھی؟" خان جی نے استفسار کیا۔

"سنا ہے"۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بہت مشہور سیاستدان ہے"۔

"اس مشہور سیاستدان نے ایک عرصے سے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے"۔ خان جی نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "اور اب میری برداشت جواب دیتی جا رہی ہے۔ میں نے ہر ممکن طریقے اسے ڈھب پر لانے کی کوشش کر لی ہے مگر وہ کتے کی دُم ہے جو کبھی سیدھی نہیں ہوگی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے عدم آباد روانہ کر دیا جائے تاکہ میری جان چھوٹے۔ کیا تم یہ کام کر لو گے؟"

"کوشش کروں گا"۔ اس نے جواب۔ "قبل از وقت کامیابی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ افضال خٹک ایک اہم سیاسی شخصیت ہے، یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا جتنا تم سمجھ رہے ہو"۔

"یہی سوچ کر تو میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے"۔ وہ کھنکار کر بولا۔ "ورنہ آدمیوں کی میرے پاس کیا کمی ہے؟ ایک سے بڑھ کر ایک قاتل موجود ہے یہاں، مگر میں ناکامی کے پیشِ نظر کسی کو بھی یہ موقع دینے کے حق میں نہیں ہوں"۔

"تو اس خاص آدمی کو سونپ دیجیے"۔ جہانداد نے موسیٰ خان کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کی چالاکی اور عیاری تو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ دھوکا دینے میں اسے جو کمال حاصل ہے شاید ہی کسی اور کو ہو"۔

"میں یہ کام کر سکتا ہوں سولجر"۔ موسیٰ خان اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "مگر خان جی ایسا نہیں چاہتے"۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے"۔ خان جی نے اس کی تائید میں کہا۔ "دراصل افضال خٹک اور اس کے کارندے اسے میرے حوالے سے اچھی طرح پہچانتے ہیں اس لیے میں اسے یہ کام نہیں سونپ سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ افضال خٹک کی موت کا الزام مجھ پر آئے"۔

''اگر میں پکڑا گیا تو تب کیا ہوگا؟'' جہانداد اس کا مطلب بھانپتے ہوئے متفسر ہوا۔ طرح الزام تم پر نہیں آئے گا؟''

''میں جانتا ہوں''۔ وہ مسکرایا۔ ''پکڑے جانے کی صورت میں تم میرا نام لینے کی غلطی بھی نہیں کرو گے؟ آخر ماں اور بہن کی محبت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ کیا تم ان کی سلامتی کے میں نہیں سوچو گے؟''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے پاس یرغمال ہیں؟'' اس نے ناگوار انداز میں پوچھا۔

''تم ایسا سوچ سکتے ہو''۔ وہ برا مانے بغیر گویا ہوا۔ ''تاہم میں ملک مراد جیسی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کروں گا''۔

''ٹھیک ہے''۔ جہانداد نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کب جانا ہے اور کتنے دن کا وقت دیا جا رہا ہے؟ کیونکہ کام بہت مشکل ہے''۔

''زیادہ سے زیادہ ایک ماہ''۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور آج ہی روانہ ہونا پڑے گا۔ ضرورت کی ہر چیز تمہیں مل جائے گی، ڈرائیونگ آتی ہے ناں؟''

''آتی ہے......لیکن......؟''

''لیکن......کیا؟'' خان جی نے متحیر ہو کر سوال کیا۔

''رات کا وقت ہے اور یہ علاقہ میرے لیے انجان ہے''۔ اس نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''بہتر ہے کہ میں صبح سویرے یہاں سے نکلوں؟ اس وقت بھٹک جانے کا امکان ہے''۔

''اوکے''۔ خان جی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''صبح کا وقت ٹھیک رہے گا۔ تب تک موسیٰ تمہیں افضال خٹک کے بارے میں بہت کچھ بتا دے گا اور تمہارا جعلی شناختی کارڈ بھی پہنچ جائے گا''

اتنا کہہ کر وہ موسیٰ خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ضرورت کے لیے اسے مناسب رقم بھی دینا کیونکہ وہاں اسے کسی ہوٹل میں ہی رہنا پڑے گا''۔

''بہتر خان جی''۔ موسیٰ خان مؤدب انداز میں بولا۔ ''آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں سب گا۔ جتنی رقم یہ مانگے گا دے دوں گا اور اسے سب کچھ تفصیل سے سمجھا بھی دوں گا''۔

اس کے بعد خان جی نے جہانداد کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ اب آرام صبح سویرے جاگنے کی کوشش کرنا۔ سفر بہت لمبا ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

* === * === *

دوسرے دن صبح سویرے جہانداد ابھی ناشتہ کرنے کے بعد فارغ ہی ہوا تھا کہ موسیٰ



پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جہانداد کا ریوالور اور خنجر موجود تھا۔

''میں تمہارے ہتھیار لے آیا ہوں''۔ موسیٰ خان نے دونوں ہتھیار اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''انہیں چیک کر لو''۔

جہانداد نے ریوالور اٹھا کر اچھی طرح چیک کیا اور پھر ہولسٹر میں ڈال کر قمیص کے نیچے کمر کے ساتھ باندھ لیا۔ ہولسٹر کے ساتھ منسلک بیلٹ میں اچھی خاصی گولیاں موجود تھیں اور ریوالور پہلے سے لوڈ تھا۔ خنجر کو اس نے ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنی مخصوص جگہ یعنی پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا تھا۔

جونہی جہانداد فارغ ہوا موسیٰ خان نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہزار روپیہ ہے میرے خیال میں کافی رہے گا اس گڈی کے اندر تمہارا شناختی کارڈ بھی موجود ہے''۔

''کافی ہیں''۔ اس نے روپے لے کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں وہاں شاپنگ کرنے کے لیے تو نہیں جا رہا ہوں''۔

''گو کہ گزشتہ شب میں نے تمہیں افضال خٹک کے بارے میں تمام تفصیلات بتا دی تھیں''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''پھر بھی کوئی جواب طلب بات رہ گئی ہو تو پوچھ لو۔ خان جی اس مہم میں ناکامی برداشت نہیں کریں گے''۔

''کچھ نہیں پوچھنا مجھے''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''بس میری ماں اور بہن کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے''۔

''تم بے فکر رہو''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''وہ خان جی کی مہمان ہیں۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جائے گا''۔

تھوڑی دیر کے بعد جہانداد ایک جیپ میں سوار اس قلعہ نما عمارت کے صدر دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ ظہر کے وقت وہ سونو کے گاؤں پہنچ چکا تھا۔ اس کی پریشان حال روتی ہوئی بیوی اور معصوم بچوں سے مل کر اسے بے حد افسوس ہوا۔

''اللہ کرے۔ میرے شوہر کے قاتلوں کو قبر کی مٹی نصیب نہ ہو''۔ جہانداد کے سامنے سونو کی بیوی دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے بولی۔ ''جس طرح دو روز تک اس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی خدا کرے اس کے قاتلوں کا اس سے بھی برا انجام ہو۔ یہ ایک مجبور اور بے بس بیوہ کی بددعا ہے''۔

''بھابی! میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں''۔ جہانداد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وہ میری وجہ سے مارا گیا ہے۔ دشمنوں نے اسے میری دوستی کا صلہ دیا ہے، لیکن آج میں آپ کے سامنے یہ عہد کرتا ہوں کہ ایک دن سونو کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گا''۔

''میں تم سے خفا نہیں ہوں''۔ وہ دوپٹے سے بھیگی ہوئی پلکیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے اس لیے تمہیں پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا مقدمہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کر دیا ہے، وہ ضرور انصاف کرے گا''۔

''میں اس کے قاتل کو جانتا ہوں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا''۔

''کیوں؟'' اس نے تحیر سے پوچھا۔ ''ایسی کیا مجبوری ہے؟''

''میری ماں اور بہن کو انہوں نے یرغمال بنا کر رکھا ہوا ہے''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں، اگر کبھی موقع ملا تو آپ کو تفصیل سے بتا دوں گا''۔

''جاؤ میرے بھائی! اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے''۔ وہ دعائیہ انداز میں بولی۔ ''اس گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ یہ مت سوچنا کہ تمہارا دوست نہیں رہا تو کوئی تمہیں خوش آمدید کہنے والا نہیں رہا''۔

''میں اس گھر کا راستہ کیسے بھول سکتا ہوں؟''

اتنا کہہ کر اس نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس میں سے تین ہزار روپے کی رقم نکال کر سونو کی بیوی کو پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ یہ رکھ لیں۔ ضرورت کے وقت کام آئیں گے''۔

''نہیں بھائی جی! میں یہ نہیں رکھ سکتی''۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''فی الحال گزارہ چل رہا ہے آگے اللہ مالک ہے''۔

''آپ کے انکار سے میرا دل ٹوٹ جائے گا''۔ جہانداد نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یہ روپے لینا ہی پڑیں گے۔ سونو میرا بھائی تھا۔ میں اس کی بیوہ کو پریشان کیسے دیکھ سکتا ہوں؟''

جہانداد کے اصرار کو دیکھتے ہوئے اس نے روپے رکھ لیے۔ جہانداد نے وہاں تھوڑی دیر قیام کیا۔ کھانا کھایا اور پھر اجازت طلب کرنے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستہ بھر وہ افضال خٹک کے متعلق سوچتا رہا۔ ملٹری سروس کے دوران اس نے متعدد اخبارات میں افضال خٹک کی تصاویر دیکھی تھیں۔ اس کے علاوہ موسیٰ خان نے بھی اسے افضال خٹک کے متعلق تفصیل سے بتا دیا تھا، حتیٰ کہ ایک کاغذ پر موسیٰ خان نے اسے افضال خٹک کے بنگلے کا نقشہ بھی بنا کر دے دیا تھا۔ پشاور شہر کے ایک پوش علاقے میں اس کا بنگلا واقع تھا اور وہ اکثر اسی میں رہتا تھا حالانکہ پشاور شہر میں اس کے دو تین بنگلے اور بھی تھے۔ علاوہ ازیں اپنے آبائی گاؤں میں بھی ایک حویلی تھی۔ جہاں اس کی اَن پڑھ دیہاتی بیوی رہتی تھی مگر وہاں وہ کبھی کبھار ہی جاتا تھا کیونکہ شہر والی بیوی اسے منع کرتی رہتی تھی۔

صبح سویرے کا نکلا وہ رات کے دس بجے پشاور شہر میں داخل ہوا اور جیپ ڈرائیو کرتا ہوا



شہر کے ہوٹل تک پہنچ گیا۔ جیپ پارک کرنے کے بعد وہ خود اعتمادی سے چلتا ہوا ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچا اور ڈیوٹی پر موجود بکنگ کلرک سے کرائے پر کمرا لینے کی بات کی۔

''سنگل بیڈ روم مل جائے گا سر''۔ بکنگ کلرک کاروباری انداز میں بولا۔ ''مگر کرایہ پیشگی ادا کرنا ہو گا۔ کتنے دن رہنا ہے؟''

''فی الحال تین روز کے لیے بکنگ کر دیجیے''۔ جہانداد نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر مزید مجھے یہاں رہنا پڑا تو میں ایک روز قبل بتا دوں گا''۔

''اوکے سر''۔ بکنگ کلرک نے رجسٹر کھول کر اندراج کرتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال میں تین دن کی بکنگ کر دیتا ہوں''۔

جہانداد نے کارڈ اٹھا کر جیب میں رکھا، بکنگ کلرک کو ادائیگی کی اور چابیاں لے کر اوپری منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ کلرک نے اسے جو کمرا دیا تھا وہ ہوٹل کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ جہانداد نے اوپر پہنچ کر کمرا نمبر تلاش کیا اور پھر تالا کھول کر کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ سرسری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے بستر پر گر گیا۔ کافی لمبا سفر طے کرنے کے بعد وہ یہاں تک پہنچا تھا اس لیے تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ایک ویٹر جیپ سے اس کا بیگ نکال کر کمرے میں پہنچ گیا۔

''کھانا لے آؤں جناب''۔ ویٹر بیگ رکھتے ہوئے بولا۔ ''یا پھر تھوڑی دیر کے بعد کھائیں گے''۔

''آدھے گھنٹے کے بعد لے آنا''۔ اس نے جواب دیا اور ویٹر سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ویٹر کے جانے کے بعد اُس نے بیگ سے نیا لباس نکالا اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔ ایک بھرپور شاور لینے کے بعد اس کی طبیعت کی کسل مندی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی اور اب اسے شدت سے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ ویٹر کو بلانے کے لیے اس نے کمرے میں موجود گھنٹی کا بٹن دو بار دبایا اور پھر بیگ اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔

اسی دوران ویٹر کھانا لے کر پہنچ گیا۔ اس نے ویٹر کو تھوڑی دیر کے بعد چائے لانے کو کہا اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

رات پونے بارہ بجے کے قریب جب وہ بستر پر سونے کے لیے لیٹا تو اس کے دماغ میں افضال خٹک کے متعلق طرح طرح کے خیالات تھے۔ وہ ایک مشہور سیاسی لیڈر تھا اسے قتل کرنا بہت آسان کام تھا، پکڑے جانے کی صورت میں اس پر نہ مقدمہ چلتا اور نہ ہی کوئی تفتیش کی جاتی، بس فوراً

گولی ماردی جاتی۔ اگر اس کی ماں اور بہن خان جی کے پاس یرغمال نہ ہوتیں تو شاید وہ بھی خطرناک قدم اٹھانے کی نہ سوچتا لیکن موجودہ صورتِ حال ایسی تھی کہ اسے کسی بھی طرح یہ کام کر دینا تھا، سو وہ سوچ رہا تھا اور وقت آہستہ آہستہ آگے کی طرف سرک رہا تھا۔ اسے کوئی مناسب ترکیب نہیں سوجھ رہا تھا۔ کوئی ایسا منصوبہ جس پر عمل کرتے ہوئے وہ باآسانی یہ کام کر گزرتا اور اس پر آنچ نہ آتی۔

سوچتے سوچتے ایک بج گیا مگر وہ کوئی مناسب منصوبہ نہ سوچ سکا۔ تھک ہار کر اس نے سب کچھ حالات پر چھوڑ دیا اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔

صبح وہ دیر گئے تک سوتا رہا۔ جس وقت اس کی آنکھ کھلی دس بج رہے تھے۔ جلدی سے بستر چھوڑتے ہوئے وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ باہر نکلا اور پھر ناشتے کے لیے گھنٹی بجادی۔ چند لمحوں کے بعد اسے ناشتہ سرو کر دیا گیا۔ تیزی سے الٹا سیدھا ناشتہ کرنے کے بعد وہ باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ کمرے کو لاک کرنے کے بعد وہ نیچے استقبالیہ پر پہنچا اور چابی جمع کرانے کے بعد ہوٹل کے پارکنگ ایریے کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی جیپ ہوٹل کے مین گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ آنے والے لمحات اس کے لیے سنسنی خیز ثابت ہونے والے تھے۔ دل ہی دل میں وہ افضال خٹک کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں اس نے سوائے میلے کپڑوں کے اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ بکنگ رجسٹر میں ویسے بھی اس کا غلط پتہ درج تھا۔ تفتیش کرنے والوں کو ہوٹل کے عملے سے صرف اس کا حلیہ ہی معلوم ہو سکتا تھا اور محض اس سے کسی قاتل تک پہنچنا پولیس کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔

•:• === •:• === •:•

اس معروف علاقے میں پہنچتے ہی اس نے جیپ ایک مناسب جگہ پر پارک کر دی اور پیدل آگے بڑھ گیا۔ مختلف بنگلوں کی نیم پلیٹیں پڑھتا ہوا آخر کار وہ افضال خٹک کے بنگلے تک پہنچ گیا۔ گیٹ پر تعینات چوکیدار سے جب اس نے افضال خٹک کے متعلق دریافت کیا تو وہ مشکوک انداز میں بولا۔ ”تم کون ہو...... کہاں سے آئے ہو اور صاحب سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”یہ میں تمہارے صاحب کو بتاؤں گا“۔ اس نے پُر وقار انداز میں کہا۔ ”تم اس تک پہنچا دو کہ اسلام آباد سے کوئی صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں“۔

”واہ...... ایسے کیسے کہہ دوں؟“ چوکیدار عورتوں کی طرح ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔



”پتہ تو بتایا ہی نہیں ہے۔ میں صاحب کو کیا بتاؤں گا؟“

”کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ میں اسلام آباد سے آیا ہوں“۔ جہانداد نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم ایک بار جا کر صاحب سے بولو تو سہی۔ مجھے یقین ہے وہ میرا نام معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے“۔

”شکل وصورت سے تو تم تعلیم یافتہ نظر آتے ہو“۔ چوکیدار نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”لیکن باتیں بیوقوفوں کی سی کرتے ہو...... بغیر نام و پتہ بتائے اور ٹائم لیے تم صاحب سے نہیں مل سکتے“۔

”ٹھیک ہے“۔ جہانداد برا منائے بغیر بولا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو پھر صاحب کے پرسنل سیکرٹری کو بلوا دیجیے۔ میں اس سے ملاقات کا ٹائم لے لوں گا“۔

”سیکرٹری صاحب بارہ بجے کے بعد مل سکیں گے“۔ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”اگر ملاقات کا ٹائم لینا ہو تو اس وقت آجانا“۔

اب جہانداد کے لیے مزید وہاں ٹھہرنا بےکار تھا چنانچہ وہ واپس اپنی جیپ کی طرف چل پڑا۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ اسے یوں افضال خٹک سے نہیں ملنے دیا جائے گا تاہم اس کی اس تگ ودو کا اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اس نے افضال خٹک کا بنگلہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اب موقع ملنے پر وہ قسمت آزمائی کر سکتا تھا۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کا دماغ مسلسل سوچ رہا تھا۔ پھر اچانک کسی خیال کے تحت اس کے قدموں میں پھرتی آگئی۔ تیزی سے چلتا ہوا وہ جیپ کے پاس پہنچا اور فوراً روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ درہ آدم خیل کی طرف تھا۔

دو بجے کے قریب وہ درہ پہنچ چکا تھا۔ یہ صوبہ سرحد کا وہ علاقہ ہے جو اسلحے کے لیے مشہور ہے۔ یہاں ملکی اور غیر ملکی ساخت کا اسلحہ سستے داموں مل جاتا ہے۔ جہانداد نے وہاں سے ایک دور مار رائفل خریدی اور اسے حصوں میں تقسیم کر کے بیگ میں رکھ لیا۔ چائنا ساخت کی یہ دور مار رائفل اسے توقع سے زیادہ سستی مل گئی تھی۔ چار بجے وہ دوبارہ ہوٹل میں پہنچ چکا تھا۔ کھانے کا وقت نکل چکا تھا اس لیے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے چائے کا آرڈر دے دیا تھا۔

تھوڑی دیر تک اس نے کمرے میں آرام کیا اور پھر پانچ بجتے ہی وہ دوبارہ ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ ایک بار پھر اس کا رخ افضال خٹک کی رہائش گاہ کی طرف تھا۔ جیپ پر جانے کی بجائے اس بار وہ پیدل ہی جا رہا تھا۔ اس کے کندھے سے لٹکتے ہوئے بیگ میں دور مار رائفل موجود تھی۔ سردیوں کے دن تھے، اس لیے اُسے وہاں تک پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ دن کے وقت اس نے افضال خٹک کے بنگلے کا باہر سے اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ بنگلے کے عین سامنے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک دو منزلہ پلازہ زیرِ تعمیر تھا پلازہ کی چھت سے وہ بہ آسانی افضال خٹک کا نشانہ لے سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا

کہ اس نے آج تک افضال خٹک کو روبرو نہیں دیکھا تھا صرف اس کی تصویریں ہی دیکھی تھیں وہ بھی اخبارات میں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ غلطی سے اس کے ہاتھوں کوئی اور شخص مارا جائے۔

زیر تعمیر پلازہ کے احاطے میں ایک بوڑھا چوکیدار سُست روی سے گھوم رہا تھا۔ چوکیدار کی نگاہوں سے بچتا ہوا وہ سیڑھیوں کے ذریعے پلازہ کی چھت پر پہنچ گیا۔ چھت پر جاتے ہی اس نے بیگ کھول کر رائفل کے پُرزے باہر نکالے اور انہیں چابکدستی سے فٹ کر دیا۔ رائفل پر نائیٹ اسکوپ لگا ہوا تھا۔ اس نے رائفل کو لوڈ کیا اور پھر ایک مناسب جگہ پر گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ایک آنکھ رائفل کے ٹیلی اسکوپ پر لگی ہوئی تھی۔ افضال خٹک کے بنگلے کا احاطہ، کاریڈورز اور کمروں کی کھڑکیاں اسے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈیڑھ دو سو گز کا فاصلہ دور مار رائفل کے ٹیلی اسکوپ نے گھٹا کر بہت کم کر دیا تھا۔

کھڑکیوں میں اسے روشنی نظر آ رہی تھی مگر ان کے عقب میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ غالباً تمام کھڑکیوں میں بلائنڈ شیشے لگے ہوئے تھے تاہم کاریڈور میں اسے وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی شخص آتا جاتا دکھائی دے جاتا تھا۔ ابھی تک اسے کسی بھی شخص پر افضال خٹک کا گمان نہیں گزرا تھا۔ زیادہ تر اسے دکھائی دینے والے افراد گھریلو ملازم ہی معلوم ہو رہے تھے۔

گاہے گاہے وہ مین گیٹ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا جہاں ایک مسلح چوکیدار تعینات تھا اور گیٹ اندر سے بند تھا البتہ اس کی بغلی کھڑکی نیم وا تھی۔ اچانک گیٹ کے عین سامنے ایک سفید رنگ کی کار رکتے دیکھ کر اس کے اعصاب تن گئے مگر پھر جلد ہی اس کی امید پر پانی پھر گیا۔ کار کو ایک نوجوان لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی جبکہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک موٹی سی ادھیڑ عمر خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ کار کی عقبی سیٹ پر دو بچے بیٹھے کوئی چیز کھا رہے تھے۔ چوکیدار نے بغیر وقت ضائع کیے مین گیٹ کھول دیا اور لڑکی کار اندر لیتی چلی گئی۔

کار سے نگاہیں ہٹا کر جہانداد کاریڈور کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کاریڈور اور احاطے میں موجود تمام لائیٹس آن تھیں۔ جہانداد کو ایک ایک منظر بالکل واضح دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد کار والی عورتیں اور بچے کاریڈور میں داخل ہوئے اور پھر دائیں ہاتھ گھوم کر اس کی نگاہ سے اجھل ہو گئے۔ اسکوپ پر آنکھ رکھے رکھے اب وہ اکتا چکا تھا۔ اسے اس پوزیشن میں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ دن کے وقت بھی اس نے کھانا نہیں کھایا اس لیے اسے شدت کے ساتھ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ یکا یک کاریڈور کی طرف سے ایک مرد اور عورت نمودار ہوئے اور جہانداد کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ مرد کی شکل بالکل ان تصویروں سے



ملتی جلتی تھی جو اس نے کچھ عرصہ قبل اخبارات میں دیکھی تھیں۔ بس اتنا سا فرق تھا کہ ان تصویروں میں وہ قدرے کمزور نظر آتا تھا جبکہ حقیقت میں وہ فربہ اندام تھا۔

"شاید یہی افضال خٹک ہے"۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر اس پر نشانہ فوکس کرنے لگا۔ وہ دونوں کاریڈور سے نکلے اور لان میں پہنچ کر ٹہلنے لگے۔ عورت بالکل جوان نظر آتی تھی جبکہ مرد کسی طرح بھی پینتالیس برس سے کم کا نہیں لگتا تھا۔ جہانداد نے پہلے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا مگر پھر کچھ سوچ کر اس کی چھاتی کا نشانہ لے لیا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور جہانداد ان کے ٹھہرنے کا منتظر تھا۔ چلتی حالت میں وہ اگر اسے نشانہ بناتا تو نشانہ خطا بھی ہو سکتا تھا۔

پھر بالکل غیر متوقع طور پر مرد ایک پودے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ عورت ہاتھ ہلا ہلا کر نہ جانے اس سے کون سی بات کر رہی تھی۔ جہانداد کو اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مرد کی چھاتی اب بالکل نشانے پر تھی۔ جہانداد نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ بس سیکنڈوں میں گولی چلنے والی تھی کہ اچانک وہ جھک گیا۔ جہانداد نے برا سا منہ بنایا اور اس کے سیدھا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک پھول تھا اور ہونٹ مسکرانے کے انداز میں کھنچے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ اپنی خوبصورت اور جوان بیوی سے اظہارِ محبت کے موڈ میں تھا۔ جہانداد کی انگلی ایک بار پھر ٹریگر پر دباؤ بڑھانے لگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں افسوس کی لہر اٹھی مگر جلد ہی معدوم ہو گئی۔ ان حالات میں اس کے مدِنظر صرف ماں اور بہن کی زندگی تھی جس سے وہ کسی بھی صورت میں دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چشم زدن میں اس کی انگلی نے ٹریگر دبایا ایک دھماکا ہوا اور مرد چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پودے کے نزدیک ہی زمین بوس ہو گیا۔

اس کے بعد تیزی سے حرکت کرتے ہوئے اس نے رائفل کو دوبارہ پُرزوں میں تبدیل کیا اور بیگ میں رکھنے کے بعد ریوالور نکالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ افضال خٹک کے بنگلے کی طرف سے اسے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بیگ کو کندھے سے لٹکا کر وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگا مگر پھر اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ نیچے سے کوئی سیڑھیاں چڑھتا ہوا تیزی سے اوپر آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا مگر پھر وہ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اب نیچے سے جو کوئی اوپر آ رہا تھا اسے وہ باآسانی کور کر سکتا تھا۔ ریوالور کو اس نے مضبوطی سے دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

ایک لمحے کے بعد سیڑھیوں کی طرف سے آنے والا اوپر پہنچ چکا تھا۔ وہ زیر تعمیر پلازہ کا

بوڑھا چوکیدار تھا۔ جہانداد اس کے عقب میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ بوڑھا چوکیدار اس کی جانب گھومتا اس نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر مارا اور وہ ایک آہ کی آواز خارج کرتا ہوا گر پڑا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری تھی۔

بوڑھے چوکیدار کو لڑھکا کر وہ تقریباً دوڑتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیچے پہنچ کر اس نے ایک نظر افضال خٹک کے بنگلے کی طرف دیکھا تو اسے گیٹ سے ایک کار نکلتی ہوئی نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھاگتا ہوا وہاں سے دور ہوتا گیا۔ ایک چوراہے پر جا کر اس نے ٹیکسی پکڑی اور پھر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اس نے ہوٹل کا نام بتانے کی بجائے ساتھ کی ایک مارکیٹ کا نام بتایا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے بیس منٹ کے اندر مارکیٹ تک پہنچا دیا۔ ٹیکسی سے اتر کر اس نے ایک بڑا نوٹ جیب سے نکالا اور ڈرائیور کو دے دیا۔

"صاحب! چھٹا نہیں ہے میرے پاس"۔ ڈرائیور دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "اگر حکم ہو تو سامنے والی دکان سے کروا کر لے آؤں؟"

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ "بس رکھ کر لو مجھے دیر ہو رہی ہے"۔

"شکریہ صاحب"۔ ڈرائیور ٹیکسی اسٹارٹ کرنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

جب ٹیکسی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ تیز تیز قدموں سے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

✣ === ✣ === ✣

دوسری صبح وہ دیر گئے تک سوتا رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کی وال کلاک گیارہ بجا رہی تھی مگر اس کا دل بستر چھوڑنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کل دن بھر کی اور پھر رات کی کارروائی نے اسے ضرورت سے زیادہ تھکا دیا تھا مگر اٹھنا ضروری تھا چنانچہ اس نے بستر چھوڑا اور مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر اس نے لباس تبدیل کیا اور پھر ویٹر کو بلانے کے لیے گھنٹی بجا دی۔ چند لمحوں کے بعد ویٹر اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے ناشتے کے ساتھ ساتھ اخبار لانے کا بھی آرڈر دے دیا۔ دس منٹ کے اندر ویٹر نے اسے اخبار اور ناشتہ سرو کر دیا۔ پہلے اس نے ناشتہ کیا اور پھر اخبار اٹھا کر سرخیاں دیکھنے لگا۔ اسے جس خبر کی تلاش تھی وہ اسے اخبار کے فرنٹ پیج پر ہی مل گئی تھی۔ سرخی تھی۔ "مشہور سیاستدان افضال خٹک کو قتل کر دیا گیا"۔ سرخی کے ساتھ افضال خٹک کی تصویر بھی لگائی گئی تھی۔ نیچے خبر کی تفصیل تھی۔

"مشہور و معروف سیاستدان افضال خٹک کو کل رات کسی نامعلوم شخص نے گولی



مار کر ہلاک کر دیا۔ تفصیلات کے مطابق گزشتہ رات نو اور دس بجے کے درمیان میں افضال خٹک اپنی بیگم کے ساتھ گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک ایک اندھی گولی نے اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ مقتول کی بیگم نے اسے سیاسی دشمنی کا شاخسانہ کہا ہے جبکہ بنگلے کے چوکیدار نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے بتایا کہ کل دن کے گیارہ بجے کے قریب ایک مشکوک نوجوان خٹک صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا مگر میں نے معذرت کر کے اسے واپس لوٹا دیا۔ چوکیدار نے پولیس کو اس نوجوان کا حلیہ تفصیل کے ساتھ بتا دیا ہے۔ پولیس سرگرمی کے ساتھ مشکوک نوجوان کو تلاش کر رہی ہے"۔

خبر کی تفصیل پڑھ کر جہانداد کے بدن میں سنسنی کی ایک سرد لہر سرایت کر گئی۔ اس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ چوکیدار نے یقینی طور پر پولیس کو اس کا حلیہ بتایا تھا۔ اب اس کے لیے موجودہ حلیے میں ہوٹل کے کمرے سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا بلکہ وہ ہوٹل میں بھی غیر محفوظ تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتی تھی۔ بیوقوفی کی حد تو یہ تھی کہ وہ ہوٹل میں آلۂ قتل سمیت موجود تھا۔ پولیس اگر شک کی بنیاد پر اسے پکڑ لیتی تو دور مار رائفل کی برآمدگی اس کے شک کو ایک لمحے میں یقین میں بدل سکتی تھی اور پھر...... اس سے آگے کا سوچ کر اس کے لہو کی روانی تیز ہو گئی۔

"مجھے فوراً اپنا حلیہ تبدیل کرنا پڑے گا"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر ویٹر کو بلانے کے لیے گھنٹی بجا دی۔

"جی سر"۔ دو منٹ کے اندر ویٹر چراغ کے جن کی طرح دروازے سے نمودار ہو کر بولا۔ "کچھ چاہیے تو حکم کیجئے جناب"۔

"دراصل میں شیونگ کا سامان ساتھ لانا بھول گیا"۔ وہ بات بناتے ہوئے کہنے لگا۔ "اگر تم منگوا دو تو میں ممنون ہوں گا"۔

"ارے جناب! یہ تو میرے فرائض میں شامل ہے"۔ ویٹر متوقع ٹپ کی خوشی میں باچھیں چوڑی کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "میں ابھی پانچ منٹ کے اندر لا دیتا ہوں۔ اس میں ممنون ہونے کی کون سی بات ہے؟ ہمیں یہاں گاہکوں کی سہولت ہی کے لیے تو رکھا گیا ہے"۔

جہانداد نے اسے سو کا نوٹ تھمایا اور ویٹر الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔ جہانداد نے دوبارہ اخبار پر نگاہیں جما دی تھیں کیونکہ ویٹر کے پہنچنے کے بعد ہی وہ کوئی عملی قدم اٹھا سکتا تھا۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد ویٹر شیونگ کا سامان لے کر پہنچ گیا۔ جہانداد نے اس کے ہاتھ سے سامان لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"یہ رہی جناب آپ کی بقیہ رقم"۔ ویٹر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ روپے باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی حکم ہو تو فرمائیں؟"

"یہ تم رکھ لو، تمہاری ٹپ ہے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"شکریہ جناب"۔ ویٹر نے دانت نکالتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا اور پھر خالی برتن اٹھاتے ہوئے بولا۔ "کچھ چاہیے ہو تو بتائیں؟"

"نہیں...... فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے"۔

اتنا کہہ کر جہانداد دوبارہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا اور ویٹر باہر نکل گیا۔

ویٹر کے جانے کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور شیونگ کا سامان اٹھا کر باتھ روم میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نہ صرف وہ خط نما داڑھی صاف کر چکا تھا بلکہ اپنی خوبصورت مونچھوں کا بھی صفایا کر چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کلین شیو کیا تھا اس لیے خود کو بہت بدلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ کہیں سے پینٹ شرٹ کا بندوبست کر لیتا تو یکسر ایک مختلف شخص نظر آتا۔ اس نئے حلیے میں پولیس اسے پہچاننے میں قطعی ناکام ہو جاتی مگر پینٹ شرٹ اسے یہاں ہوٹل میں نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے لیے اسے خطرہ مول لے کر مارکیٹ تک جانا ہی تھا مگر دن کا وقت اس کام کے لیے مناسب نہیں تھا چنانچہ وہ پورا دن اس نے ہوٹل کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ وقت گزارنے کے لیے اس کے پاس وہی ایک اخبار ہی تھا لہٰذا وہ ایک بار پھر اپنے سامنے اخبار پھیلا کر بیٹھ گیا۔ دو بجے کھانا اس نے اپنے کمرے میں منگوا کر کھا لیا تھا تاہم اس نے ویٹر کو اپنا بدلا ہوا چہرہ دکھانے سے گریز کیا تھا۔ ویٹر جس وقت کمرے میں کھانا لے کر آیا تھا اس وقت وہ باتھ روم میں گھسا ہوا تھا اور ویٹر کھانا رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔

شام تک اس نے جیسے تیسے وقت گزارہ۔ اندھیرا پھیلتے ہی اس نے الماری سے بیگ نکال کر اور دور مار رائفل کے پارٹس نکال کر ایک سیاہ رنگ کے شاپنگ بیگ میں ڈال دیے۔ اس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ راہداری سنسان پڑی ہوئی تھی۔ شاپنگ بیگ اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ راہداری میں جہاں سے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں وہاں دائیں ہاتھ ایک کونے میں گھی کے بہت سے خالی کنستر ایک ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جلدی سے شاپنگ بیگ ایک خالی کنستر کے اندر ڈال دیا اور پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگا۔ ابھی اس نے نصف سیڑھیاں ہی اُتری تھیں کہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے ہوٹل کے استقبالیے پر ایک پولیس آفیسر چند سپاہیوں کے ساتھ موجود استقبالیہ کلرک سے کچھ پوچھ رہا تھا۔



اب پولیس والوں کی نگاہوں میں آئے بغیر وہ وہاں سے نہیں گزر سکتا تھا اور ویسے بھی پولیس کو دیکھ کر اس کے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر سرایت کر گئی تھی۔ یقیناً پولیس اس کا پتہ لگانے کے لیے ہی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ شاید شہر کی تمام پولیس کو افضال خٹک کے قاتل کی تلاش پر لگا دیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہ باہر نہ نکلتا تو شاید بے خبری میں با آسانی پولیس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا۔

وہ سیڑھیوں سے واپس پلٹا اور دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ دروازے کو اندر سے چٹخنی لگانے کے بعد اس نے جلدی جلدی اپنا سامان بیگ میں رکھا اور بیگ کو کندھے سے لٹکا کر وہاں سے فرار ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ سوچنے کا وقت اس کے پاس بالکل نہیں تھا۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا فی الفور کرنا تھا۔ کسی بھی وقت پولیس اس کے کمرے تک پہنچ سکتی تھی۔ پولیس والے استقبالیے پر اس کا حلیہ بتا کر با آسانی اس کا کمرا نمبر معلوم کر سکتے تھے۔ سب سے زیادہ خطرہ اسے اس ویٹر کی طرف سے تھا جس سے اس نے بہانہ بنا کر شیونگ کا سامان منگوایا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس نے پورے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اس کھڑکی کی جانب بڑھ گیا جو کمرے کے عقبی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر اس نے نیچے دیکھا اور بلندی کا اندازہ قائم کرنے کے بعد نیچے اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔ بظاہر یہ کام ناممکن نظر آ رہا تھا مگر جب جان پر بنی ہو تو انسان کوئی بھی ناممکن کام کرنے سے نہیں جھجکتا چاہے نتیجے میں اپنی جان سے ہاتھ کیوں نہ دھو بیٹھے۔

اس کے اندازے کے مطابق کھڑکی زمین سے تقریباً ساٹھ، ستر فٹ بلند تھی۔ اگر کوئی رسی وغیرہ دستیاب ہو جاتی تو وہ با آسانی نیچے اتر سکتا تھا مگر ہوٹل کے اس کمرے میں رسی تلاش کرنا حماقت ہی ہوتی چنانچہ رسی کا خیال چھوڑ کر وہ کوئی متبادل طریقہ سوچنے لگا۔ اسی دوران باہر راہداری میں اسے قدموں کی دھمک سنائی دی اور وہ فوراً اچھل کر کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ ہوٹل کی سیکورٹی لائٹس میں اسے کھڑکی کے دائیں طرف ایک فولادی پائپ اوپر سے نیچے جاتا ہوا نظر آ گیا۔ پائپ کھڑکی سے چار یا ساڑھے چار فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اگر وہ کوشش کر کے کسی طرح اس پائپ کو پکڑ لیتا تو پھر شاید اس کے لیے نیچے اترنا ممکن ہو سکتا تھا تاہم ناکام ہونے کی صورت میں اس کی ہڈی پسلی بھی برابر ہو سکتی تھی۔

بہرکیف اسی گومگو کے عالم میں کھڑے ہو کر اس نے کھڑکی کا اوپری چھجا تھام لیا اور محتاط انداز میں پائپ کی جانب سرکنا شروع کر دیا۔ کھڑکی کے کنارے تک پہنچنے کے بعد ترچھا ہو کر اس نے پائپ کی طرف دایاں ہاتھ بڑھایا مگر پائپ اس کی رسائی سے دور رہا۔ دو تین بار اس نے مزید کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ انجام کی پرواہ کیے بغیر اچھل کر پائپ پکڑنے کی کوشش کرتا یا پھر خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا۔

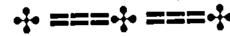
وہ ابھی اسی کش مکش کا شکار تھا کہ معاً کمرے کے دروازے پر ایک زوردار دستک ہوئی۔ دوسرے لمحے اس نے اللہ کا نام لے کر پائپ کی طرف جمپ لگا دیا۔ خوش قسمتی سے پائپ اس کے ہاتھوں میں آ گیا مگر ٹانگیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ چند منٹ تو وہ نیچے کی طرف پائپ کے ساتھ ساتھ پھسلتا چلا گیا لیکن پھر کوشش کر کے وہ اپنے پیر بھی پائپ پر ٹکانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے نیچے اُترتا جا رہا تھا۔

زمین تک پہنچتے پہنچتے اس کی بری حالت ہو گئی تھی۔ دونوں کہنیاں چھل چکی تھیں اور وہ پسینہ پسینہ ہو کر تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ سانس ہموار کرتے ہی وہ ہوٹل کے پارکنگ ایریے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ابھی تک وہ کسی کی نگاہوں میں نہیں آیا تھا۔ پارکنگ میں پہنچتے ہی وہ اچھل کر جیپ میں سوار ہوا اور اگنیشن میں چابی لگا کر جیپ کو اسٹارٹ کرنے کے بعد یوٹرن لے کر ہوٹل کے مین گیٹ کی طرف بڑھا۔

اسی دوران ہوٹل کے استقبالیے کی طرف سے پولیس والے بھاگتے ہوئے ہوئے نمودار ہوئے۔ آگے آگے انسپکٹر تھا اور اس نے ہاتھوں میں سروس ریوالور پکڑ رکھا تھا۔

’’رک جاؤ‘‘۔ انسپکٹر نے چلا کر جہانداد کو وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ’’ورنہ میں گولی چلا دوں گا‘‘۔ جہانداد نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے جیپ کو گیئر لگا کر اسپیڈ بڑھا دی۔

’’فائر‘‘۔ انسپکٹر نے جھنجھلا کر تینوں سپاہیوں کو حکم دیا اور فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔





انسپکٹر کی وارننگ سنتے ہی جہانداد ایک دم اسٹیئرنگ پر جھک گیا تھا۔ پولیس والوں کی چلائی ہوئی گولیاں کچھ اس کے اوپر سے گزر گئی تھیں اور کچھ جیپ کی باڈی سے ٹکرائی تھیں۔ جیپ لہراتی ہوئی آگے بڑھی اور ہوٹل کے گیٹ کو سائیڈ مارتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھوں میں میکانکی انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں اسے سڑک خالی نظر آ رہی تھی۔

باہر نکلتے ہی اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ کو دائیں جانب گھمایا، طاقتور جیپ چنگھاڑتی ہوئی سڑک کے عین درمیان میں پہنچ کر سیدھے ہاتھ گولی کی رفتار سے آگے بڑھی۔ سامنے ایک موٹر سائیکل سوار فل اسپیڈ سے آ رہا تھا۔ ممکنہ ٹکراؤ سے بچنے کے لیے اس نے جیپ کو سڑک کے دائیں کنارے کی طرف بڑھایا لیکن اس دوران موٹر سائیکل سوار حواس باختہ ہو کر غلطی کر چکا تھا۔ اپنی سائیڈ چھوڑ کر وہ جیپ کی طرف آ رہا تھا۔ جہانداد نے اسے ایک گالی دیتے ہوئے اسٹیئرنگ وہیل کو تیزی سے بائیں جانب گھما دیا۔ موٹر سائیکل سوار جیپ کی سائیڈ سے گزرتا ہوا فٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور پھر چشم زدن میں فٹ پاتھ کے قریب کھڑی ہوئی ایک ریڑھی سے جا ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں مالٹا فروش تو بچ گیا مگر اس کی ریڑھی الٹ چکی تھی اور مالٹے فٹ پاتھ اور سڑک پر اچھلتے ہوئے دور دور تک بکھرتے چلے گئے۔

جہانداد کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ رک کر موٹر سائیکل سوار کا انجام دیکھتا۔ وہ گیئر پر گیئر بدلتا کرتا سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس دوران سائرن بجاتی پولیس موبائل بھی ہوٹل کے گیٹ سے نکل کر کھلی سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ دائیں ہاتھ فٹ پاتھ پر پولیس والوں کو موٹر سائیکل سوار کے گرد چند لوگ نظر آئے تھے مگر انہوں نے رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

پولیس انسپکٹر سخت جھنجھلایا ہوا تھا اور اپنا غصہ ماتحتوں پر اتار رہا تھا۔ خاص کر ڈرائیور کو وہ سخت سست کہہ رہا تھا کیونکہ وہ بروقت گاڑی اسٹارٹ کر کے ہوٹل سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔

’’تیز چلو‘‘۔ کھلی سڑک پر آتے ہی وہ ڈرائیور کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ’’اگر مجرم نکل گیا تو میں تمہیں معطل کرا دوں گا‘‘۔

''پلیز سر''۔ ڈرائیور نے فریاد کی۔ ''رات کا وقت ہے گاڑی بے احتیاطی میں کہیں کر جائے گی۔ یہ ہے''۔

''شٹ اپ''۔ انسپکٹر چلا کر بولا۔ ''باتیں بنانے کی بجائے مجرم کے تعاقب پر توجہ دو''۔

''اوکے سر''۔ ڈرائیور نے برا سامنہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

جہانداد کے پاس طاقت ور جیپ تھی اس لیے وہ با آسانی پولیس موبائل سے دور نکل گیا۔ اسے شہر کی سڑکوں کی پہچان تو نہیں تھی لیکن قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی، جلد ہی وہ شہر کے مضافات میں پہنچ گیا۔ راستے میں اس کے ساتھ کوئی بھی مشکل پیش نہیں آئی تھی تاہم اسے یہ پتا نہیں تھا کہ اُس کا رخ کس طرف ہے اور وہ کون سے علاقے میں پہنچ چکا ہے۔ اس وقت وہ ویران سڑک پر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک جیپ ایک جھٹکا کھا کر رک گئی۔ اس نے جیپ دوبارہ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر جیپ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ نیچے اتر کر اس نے جیپ کا بونٹ اٹھا کر انجن پر ہاتھ رکھا اور پھر فوراً اٹھا لیا۔ انجن بے حد گرم ہو چکا تھا۔ اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ سڑک کے آس پاس اسے آبادی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے بیگ سے ریوالور نکال کر نیفے میں اُڑس لیا، خنجر پہلے ہی سے مخصوص انداز میں اس کی پنڈلی کے ساتھ بندھا تھا۔ اگنیشن سے چابی نکال کر اس نے جیپ کی کھڑکی بند کی اور پانی کی تلاش میں سڑک پر سیدھا روانہ ہو گیا۔

تقریباً نصف کلومیٹر آگے جانے کے بعد اسے دائیں طرف مغرب کی جانب روشنیاں نظر آنے لگیں۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ سڑک سے اُتر اور تیز تیز قدموں سے روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ دو اڑھائی فرلانگ آگے جانے کے بعد اسے ایک وسیع و عریض عمارت نظر آنے لگی مگر اس عمارت کے اردگرد دور دور تک کوئی دوسری عمارت دکھائی نہیں دے رہی تھی شاید وہ کوئی فارم ہاؤس تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فارم ہاؤس کے صدر دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور وہاں کوئی چوکیدار بھی موجود نہیں تھا۔ چند لمحے وہ دروازے کے سامنے کش مکش کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر دروازے پر دستک دینے کے بعد ردِ عمل کا انتظار کرنے لگا۔

دو تین منٹ کے بعد دروازے کے عقب میں قدموں کی چاپ ابھری اور پھر کوئی گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کک...... کون ہے؟''

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بھئی''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''میں ایک مسافر ہوں۔ دراصل میری گاڑی کا انجن گرم ہو گیا ہے اور میں پانی کی تلاش میں اِدھر نکل آیا ہوں۔ براہ کرم دروازہ کھول دیں مجھے آپ کی مدد درکار ہے''۔



''میں دروازہ نہیں کھول سکتا''۔ اندر سے آواز آئی۔ ''میرے مالک کا یہی حکم ہے۔ تم کہیں اور پانی تلاش کرلو''۔

''کیا تم اس فارم ہاؤس کے چوکیدار ہو؟'' اس نے قدرے متحیر انداز میں پوچھا۔

''تم کس لیے پوچھ رہے ہو؟'' بولنے والے نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ''میں کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے کیا غرض ہو سکتی ہے؟ جاؤ اپنا کام کرو۔ میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ میرا بھی وقت ضائع کر رہے ہو؟''

''ارے بھلے آدمی! تم نے تو خواہ مخواہ لڑنا شروع کر دیا ہے حالانکہ میں تو یہاں......''

''پلیز...... یہاں سے چلے جاؤ''۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا''۔

''پانی تو میں لے کر ہی جاؤں گا''۔ جہانداد کو بھی اس کے خشک رویے پر طیش آ گیا۔ ''اگر تم نے نہیں کھولو گے تو میں دیوار پھاند کر اندر آ جاؤں گا۔ بہتر ہو گا خود ہی دروازہ کھول دو''۔

''اگر تم نے دیوار پھاندنے کی کوشش کی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا''۔

اس کا جواب سن کر معاً جہانداد کو محسوس ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے ورنہ وہ جو کوئی بھی تھا ایسا رویہ نہیں اپنا سکتا تھا۔ جہانداد نے اس سے پانی ہی تو مانگا تھا اور یہ کوئی عجیب یا حیران کن بات نہیں تھی کہ جواباً ایسا ردِعمل ظاہر کیا جاتا۔

ایک لمحے کے لیے جہانداد نے اس پر لعنت بھیج کر واپس جانے کا ارادہ کر لیا مگر پھر تجسس نے اس کے قدم روک لیے۔

''شاید اندر کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے معلوم کرنا چاہیے کہ چکر کیا ہے؟ یہ چوکیدار دروازہ کیوں نہیں کھولنا چاہتا''۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر مخاطب سے گزارشانہ انداز میں بولا۔ ''دیکھو! میں ایک مسافر آدمی ہوں۔ پلیز دروازہ کھول دو میں پانی لے کر واپس چلا جاؤں گا۔ تمہیں کوئی......''

اچانک دروازے کی بغلی کھڑکی ایک جھٹکے کے ساتھ کھلی اور جہانداد کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک رائفل بردار برآمد ہوا اور اسے نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اندر چلو...... مگر کوئی غلط حرکت کرنا ورنہ گولی مار دوں گا''۔

''دیکھو تم مجھے غلط......''

''اپنے ہاتھ اوپر کر لو''۔ رائفل بردار نے درشت انداز میں قطع کلامی کی۔ ''اور زبان کی بجائے حرکت دو نہیں تو ایک سیکنڈ میں ٹریگر دبا دوں گا''۔

ایک لمحے کے لیے اس کے لہجے نے جہانداد کے تن بدن میں آگ لگا دی مگر پھر اس نے اپنا غصہ ضبط کر لیا۔ دراصل وہ معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا ورنہ رائفل بردار کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ جہانداد مزید کچھ بولے ہاتھ اٹھائے رائفل بردار کے آگے پڑا تاہم اس کی نگاہیں سرچ لائیٹ کی طرح فارم ہاؤس کے اندرونی منظر کا جائزہ لے رہی رائفل بردار چوکنا انداز میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور اس نے رائفل کو بالکل فائرنگ میں پکڑ رکھا تھا۔ جہانداد کی معمولی سی ہوشیاری دیکھ کر شاید وہ گولی چلانے سے ذرا بھی نہ ہچکچا کا احساس جہانداد کو بھی تھا تبھی وہ خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

پورے فارم ہاؤس میں صرف چار کمرے تھے جو انگریزی کے حرف ایل کی شکل بنے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ایل ہی کی شکل کا برآمدہ تھا۔ گن پوائنٹ پر جہانداد کو جس کمرے گیا وہاں تین آدمی موجود تھے جن میں سے دو کے پاس آتشیں ہتھیار موجود تھے جبکہ تیسرا آدمی اور ایک صوفے پر نیم دراز ہو کر سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ شکل وصورت سے وہ ان سب کا باس تھا۔ گن مین کے ساتھ جہانداد کو دیکھ کر وہ فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ میں پولیس کے مخبروں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا جہانداد کو لمحہ بھر کے لیے گھورنے کے بعد وہ سپاٹ انداز میں گویا ہوا۔ "یہ جمشید خان تو مجھے کوئی ہے۔ میں اس کے ساتھ ڈیل کرنا چاہتا ہوں اور وہ اُلو کا پٹھا میرا سراغ لگانے کے چکر میں ہے"۔

"تم لوگ غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہو"۔ جہانداد نے متحیر لہجے میں جواب دیا۔ "میں پولیس نہیں ہوں اور نہ ہی میرا تعلق کسی جمشید خان سے ہے بلکہ میں تو یہاں پانی کی تلاش میں دراصل میری گاڑی خراب ہوگئی۔ وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر......"

"اب مجھے یقین ہوگیا ہے"۔ باس نے مسکرا کر قطع کلامی کی۔ "تم واقعی پولیس کے اور یہاں ایس پی جمشید خان کے کہنے پر آئے ہو لیکن تمہیں شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ میرا نام خلیل چاقو والا ہے۔ میں اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں، تم کیا چیز ہو؟"

"مجھے تو تم خلیل خان فاختہ والے لگتے ہو"۔ جہانداد نے اس کی حماقت پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں کسی جمشید خان کو نہیں جانتا تو پھر تم مان کیوں نہیں لیتے؟"

"تلاشی لو اس کی"۔ خلیل بھائی چاقو والا اپنے آدمیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "خلیل بھائی کے سامنے دادا گیری کرتا ہے پولیس کا چمچہ"۔

اس کا حکم سن کر تینوں گن مین تیزی سے آگے بڑھے مگر اب جہانداد کی برداشت جو



ب دے گئی تھی۔ اسے خلیل بھائی کی حماقت پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا جو اس کی شرافت کو بزدلی پر محمول کر رہا تھا۔ اسے جواب دینا اب ناگزیر ہوگیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ گن مین اس تک پہنچتے اور اس کی تلاشی لیتے۔ اس نے اپنی جگہ سے چیتے کی طرح جست لگائی اور خلیل بھائی کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ریوالور چھین کر اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔

"خلیل بھائی!" وہ غراہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "تم بہت بے وقوف شخص ہو۔ اپنے آدمیوں سے بولو ہتھیار پھینک دیں ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا"۔

"ہتھ...... ہتھیار...... پھینک دو"۔ خلیل بھائی فوراً کانپتی ہوئی آواز میں اپنے آدمیوں سے بولا۔ "جلدی کرو"۔ تینوں گن مینوں نے ایک لمحے میں ہتھیار نیچے پھینک دیے۔

"اب سامنے والی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ"۔ جہانداد نے انہیں حکم دیا۔ "لیکن پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی مت کرنا ورنہ تمہارا یہ خلیل بھائی چاقو والا دوسرا سانس نہیں لے سکے گا"۔

تینوں بلا چوں و چرا آگے بڑھے اور دیوار کی طرف منہ کر کے رک گئے۔ اس کے بعد جہانداد نے خلیل بھائی کو نشانے پر رکھتے ہوئے تینوں رائفلیں اَن لوڈ کر کے کمرے کی کھڑکی سے باہر پھینک دیں۔ خلیل بھائی صوفے پر سہما ہوا بیٹھا تھا اور جہانداد کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے منہ ٹیڑھا کر کے باتیں کرنے والے کا اب سانس تک خشک ہو چکا تھا ہر ظالم اور غنڈے کی طرح وہ بھی فطرتاً بزدل تھا۔

"ہاں خلیل خان فاختہ والے"۔ رائفلیں باہر پھینکنے کے بعد جہانداد اس سے استہزائیہ انداز میں بولا۔ "اب بولو کیا کہتے ہو...... گولی ماردوں تمہیں یا پھر......" اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"مم...... معاف کر دو مجھے"۔ وہ گھگیا کر بولا۔ "مم...... میں نے...... تمہیں سمجھنے میں...... غلطی کی ہے"۔

"کیا اب مجھے پہچان لیا ہے؟" جہانداد نے اسی لمحے میں پوچھا۔

"ب...... بالکل...... پہچان لیا ہے"۔ اس نے جھٹ سے جواب دیا۔ "تم ایک شریف نوجوان ہو اور تمہاری گاڑی خراب ہوگئی ہے اور تم پانی تلاش کرتے ہوئے......"

"چپ"۔ جہانداد نے اسے ڈانٹتے ہوئے قطع کلامی کی۔ "مجھے ایک رسی چاہیے"۔

"ر...... رسی...... کک...... کس لیے؟" اس نے سہم کر پوچھا۔

"تم سچ مچ اتنے احمق ہو یا یونہی بننے کی کوشش کرتے ہو؟" جہانداد نے درشت انداز میں کہا۔ "کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس سے کیا کام لیا جاتا ہے؟"

''جانتا......ہوں''۔ اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

''جانتے ہو تو پھر رسی اٹھاؤ اور اپنے ان گرگوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دو''۔ جہانداد دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ گولی اندر اور دم باہر''۔

ذرا دیر کے بعد جہانداد تینوں گن مینوں کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھوا کر انہیں ایک کمرے میں بند کر چکا تھا۔ اس دوران خلیل بھائی نے بلا تردد اس کا ساتھ دیا تھا، وہ حقیقتاً جہانداد سے بہت خوفزدہ نظر آ رہا تھا حالانکہ جہانداد نے ابھی تک اس پر کوئی سختی نہیں کی تھی۔

''اب بتاؤ خلیل بھائی! یہ کیا چکر ہے؟'' گن مینوں کو بند کرنے کے بعد جہانداد نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔ ''مگر اتنا یاد رہے کہ میں صرف سچ سننا پسند کرتا ہوں۔ مجھے اگر ذرا سا بھی شک گزرا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو میں تمہیں بلا تردد گولی مار دوں گا۔ یہ جمشید خان کون ہے اور تم نے یہ کیوں کہا کہ میں جمشید خان کا آدمی ہوں''۔

''چکر تو کوئی نہیں ہے''۔ اس نے مُردہ لہجے میں کہا۔ ''بس ویسے ہی میری زبان سے جمشید خان کا نام......''

''میرے خیال میں تمہیں اپنی زندگی سے کوئی محبت نہیں ہے''۔ جہانداد نے فوراً قطع کلامی کرتے ہوئے کہا اور ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور گولی خلیل بھائی کے کندھے کے بالکل پاس سے گزرتی ہوئی صوفے کی پشت میں پیوست ہوگئی۔ ردِعمل کے طور پر خلیل بھائی ہراساں ہو کر پیچھے کی طرف اچھلا اور صوفہ الٹ گیا۔ یہ نظارا دیکھ کر بے ساختہ جہانداد کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

چند لمحوں کے بعد جب خلیل بھائی کانپتا ہوا اٹھا تو جہانداد نے ایک بار پھر ریوالور سیدھا کر لیا۔

''میں جو کہتا ہوں کر گزرتا ہوں خلیل بھائی''۔ وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنا شروع کر دو ورنہ اس بار گولی صوفے کی بجائے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دے گی۔ چلو شروع ہو جاؤ''۔

''جمشید خان میرا سب سے بڑا دشمن ہے''۔ جہانداد کی وارننگ نے آخر کار اسے سچ بولنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی سرگزشت سنانے کے لیے تیار ہوگیا۔ ''ہم تین بھائی تھے اور تینوں شیر تھے۔ علاقے میں ہماری دہشت تھی۔ جس طرف نکلتے تھے لوگ سلام کرتے تھے مگر اس نئے ایس پی جمشید خان کے آنے کے بعد ہماری زندگی اجیرن ہوگئی ہم نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ تو بڑھ کر اسے رقم کی آفر کی لیکن وہ بدبخت ایمانداری اور فرض شناسی کے گن گاتا رہا اور ہاتھ دھو کر ہمارے دھندے کے پیچھے پڑ گیا۔ دنوں میں ہم عرش سے فرش پر آ گئے بعد میں اس حرام زادے نے ایک پولیس مقابلے میں میرے ایک بھائی کو مار ڈالا اور دوسرے کو گرفتار کر لیا۔ میں نے اسے



میرے بھائی کو چھوڑ دے مگر وہ نہ مانا تب میں نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے اس کی بہن کو اٹھوا لیا تاکہ اس کی قید سے اپنے بھائی کو چھڑوا سکوں۔ اب گزشتہ کئی روز سے میں اس کے ساتھ ڈیل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن وہ بہت ضدی ہے میری بات ماننے کی بجائے اس نے میرے پیچھے جاسوس لگا دیے ہیں''۔

اتنا کہہ کر لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہوگیا اور سانس ہموار کرنے کے بعد دوبارہ بولا۔ ''بس اسی غلط فہمی کی بناء پر میں نے تمہیں پولیس کا آدمی سمجھ لیا۔ میں اپنی غلطی پر سخت شرمندہ ہوں پلیز مجھے معاف کر دو''۔

''تم تینوں بھائی کون سا دھندا کرتے تھے؟'' جہانداد نے اس کی التماس کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''اسمگلنگ یا منشیات کا؟''

''دونوں دھندے کرتے تھے''۔ اس نے بلا تردد جواب دیا۔ ''لیکن قتل وغارت گری سے دور رہتے تھے''۔

''لڑکی کہاں ہے؟''

''کک......کون سی لڑکی؟'' خلیل بھائی نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''ایس پی جمشید خان کی بہن''۔ جہانداد نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''بولو۔ کہاں رکھا ہے تم نے، جلدی بتاؤ ورنہ دوسرا سانس نہیں لے سکو گے''۔

''وہ......وہ تو......یہاں......''

''جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا''۔ جہانداد نے غراہٹ آمیز انداز میں قطع کلامی کی۔ ''میں پہلے بھی وارننگ دے چکا ہوں کہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ خلیل بھائی سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں لڑکی تمہارے حوالے کر دیتا ہوں مگر میری ایک شرط تمہیں ماننا پڑے گی''۔

''کون سی شرط؟'' جہانداد نے استفسار کیا۔

''مجھے اور میرے ساتھیوں کو یہاں سے جانے دو گے''۔ اس نے جواب دیا۔

''اگر مجھے تمہاری شرط منظور نہ ہو تو پھر؟''

''تو پھر میں لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا''۔ وہ حتمی انداز میں بولا۔ ''تم شوق سے مجھے گولی مار سکتے ہو۔ ایس پی کے ہاتھوں مرنے سے کہیں بہتر ہے میں تمہارے ہاتھوں سے مرجاؤں''

''ٹھیک ہے''۔ جہانداد فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ اب بتاؤ لڑکی

کہاں ہے؟''

''میرے ساتھ آؤ''۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اسے میں نے تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے''۔

''چلو''۔ جہانداد اس کی تقلید کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر کوئی بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میری انگلی ریوالور کے ٹریگر پر رکھی ہوئی ہے اور نشانہ بے خطا ہے''۔

''مجھے معلوم ہے''۔ خلیل بھائی نے جواب دیا۔ ''بے فکر رہو۔ میں کوئی بھی ایسی ویسی حرکت نہیں کروں گا۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں''۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کونے والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے کے ایک کونے میں فرش پر لکڑی کا ایک بھاری تختہ لگا ہوا تھا۔ یہ تختہ فرش کا ہی ہم رنگ تھا۔ خلیل بھائی نے بغیر رکے تختے کو ہٹا دیا اور پھر جہانداد کو اشارہ کرتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ جہانداد بھی اس کی تقلید میں تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ زیرو پاور بلب کی مدھم روشنی میں جہانداد کو کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک نوجوان لڑکی نظر آ گئی۔ جہانداد ابھی لڑکی کو نظر بھر کر دیکھنے بھی نہیں پایا تھا کہ یکدم ماحول روشن ہو گیا۔ خلیل بھائی نے ٹیوب لائٹس جلا دی تھیں۔

لڑکی نے متوحش نگاہوں سے جہانداد کی طرف دیکھا اور پھر حواس باختہ ہو کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ کو ٹیپ لگا کر بند کیا گیا تھا۔ خوفزدہ نگاہوں سے جہانداد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے منہ سے ''غوں...... غاں'' کی آوازیں نکالیں اور بھاگ کر ایک کونے میں دبک گئی۔

''ڈرو نہیں''۔ جہانداد ہمدردانہ انداز میں کہتا ہوا آگے بڑھا۔ ''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ بلکہ تمہیں یہاں سے چھڑانے کے لیے آیا ہوں''۔

جواباً لڑکی ''غوں...... غاں'' کر کے رہ گئی۔ منہ پر ٹیپ چپکی ہونے کے باعث کوشش کے باوجود وہ بولنے سے قاصر تھی۔ جہانداد کو لڑکی کی حالتِ زار پر بہت ترس آیا اور وہ ایک لمحے کے لیے خلیل بھائی کو بالکل بھول گیا۔ خلیل بھائی کے لیے یہ سنہری موقع تھا خوش قسمتی سے جہانداد نے ابھی تک اس کی تلاشی نہیں لی تھی۔ اس کی جیب میں ایک رامپوری چاقو موجود تھا۔ وہ جہانداد کے عقب میں چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ جہانداد اس کی طرف سے پوری طرح غافل ہو کر لڑکی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ جواب بھی کونے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

''لائیے۔ یہ ٹیپ میں کھول دوں''۔ لڑکی کے قریب پہنچ کر جہانداد نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شاباش...... ڈرنے کی ضرورت بالکل نہیں ہے''۔

لڑکی نے ایک لمحے کے لیے ممنون نگاہوں سے جہانداد کی طرف دیکھا اور پھر ایک دم اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ یوں جیسے اس نے کوئی خوفناک چیز دیکھ لی ہو۔

''شاید تم ریوالور سے ڈر رہی ہو؟'' جہانداد مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو...... اسے میں جیب میں رکھ لیتا ہوں...... اب ٹھیک ہے ناں؟''

لڑکی پر جہانداد کی بات کا مطلق اثر نہ ہوا۔ وہ اب بھی جہانداد کے عقب میں دہشت زدہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک بالکل غیر متوقع طور پر جہانداد کو خطرے کا احساس ہوا۔ ایک لمحے کے دسویں حصے میں وہ تیزی سے پیچھے پلٹا اور جیب سے ریوالور نکال کر خلیل بھائی کی ٹانگ پر فائر جھونک دیا۔ اس ساری کارروائی میں بمشکل دس سیکنڈ ہی لگے تھے۔ ایک دھماکا ہوا اور خلیل بھائی چیختا ہوا پختہ فرش پر گر پڑا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گھسٹتا ہوا دور جا پڑا۔ اسے اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو خلیل بھائی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔

آگے بڑھ کر اس نے فرش پر کراہتے ہوئے خلیل بھائی کی پسلیوں میں پاؤں کی ایک ٹھوکر لگائی اور پھر غراہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''میں اگر چاہوں تو ریوالور کے ساری گولیاں تمہاری کھوپڑی میں اتار سکتا ہوں لیکن تمہارے گندے خون سے میں اپنے ہاتھ ناپاک نہیں کرنا چاہتا''۔

''مم...... مجھ سے...... غلطی......'' خلیل بھائی نے درد اور خوف سے کانپتی آواز میں کہنا چاہا مگر جہانداد کی ٹھوکروں نے اسے اپنی بات مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔

''مجھے بیوقوف بناتا ہے گدھے کے بچے''۔ جہانداد نے اسے سر کے بالوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں اگر پیچھے نہ مڑتا تو تم نے تو میرا کام تمام کر دیا تھا''۔

اتنا کہہ کر اس نے ریوالور کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ ''جی چاہتا ہے اس کی ساری گولیاں تمہارے حلق میں اتار دوں''۔

''مم...... غاں...... غوں''۔ منہ میں ریوالور کی نال ہونے کی وجہ سے وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

''چپ!'' جہانداد نے اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ذرا سی بھی آواز نکالی تو میں بلاتردد ٹریگر دبا دوں گا''۔

جہانداد کے لہجے میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ خلیل بھائی کی ''غوں غاں'' یک لخت رک گئی اور آنکھیں خوف کی شدت سے پھیلتی چلی گئیں۔ موت اسے اپنے سامنے نظر آنے لگی تھی مگر وہ فریاد کرنے سے بھی قاصر تھا۔ منہ میں رکھی ریوالور کی نالی ٹریگر پر دبا[illegible]ظر تھی، ایسی صورتِ حال میں وہ جہانداد کے سامنے رونے یا گڑگڑانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

پھر کچھ سوچ کر جہانداد نے اس کے منہ سے ریوالور کی نال نکالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہاں فون ہے؟"

"ج...... جی ہاں موجود ہے"۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کہاں ہے؟" جہانداد نے دوبارہ سوال کیا۔

"دو...... سرے کمرے میں پڑا ہوا ہے"۔ وہ جلدی سے بولا۔ "کک...... کیا لے آؤں؟"

"ایس پی جمشید خان کا نمبر بتاؤ؟" جہانداد نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

خلیل بھائی کے پاس سوائے اس کی بات ماننے کے کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے بلا تردد اس نے جہانداد کو ایس پی جمشید خان کا نمبر بتا دیا۔

خلیل بھائی کی زخمی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بہت اذیت محسوس کر رہا تھا مگر خوف سے چپ تھا۔ جہانداد کے تیور دیکھ کر اسے کچھ کہنے کی جرأت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ جہانداد اس کی تکلیف کو نظر انداز کرتا ہوا ایک بار پھر سہمی ہوئی لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے اس کے منہ پر چپکی ہوئی ٹیپ اتاری اور پھر اس کے بندھے ہوئے ہاتھ بھی کھول دیے۔ اس کے بعد اس نے وہی رسی اٹھائی اور خلیل بھائی کو کرسی پر بٹھا کر مضبوطی سے باندھ دیا۔

"اب اگر تم نے کوئی بھی غلط حرکت کی تو میں سوال و جواب کیے بغیر تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"خد...... خدا کی قسم...... میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا"۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "پلیز مجھے گولی مت مارنا"۔

"ٹیلی فون کون سے کمرے میں رکھا ہوا ہے؟" جہانداد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

"آخری کمرے میں ہے لیکن......"

"لیکن...... کیا؟" جہانداد نے فوراً قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ "کہیں تم دوبارہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟"

"نن...... نہیں"۔ وہ جلدی سے تردید کرتے ہوئے بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس کمرے کو تالا لگا ہوا ہے اور چابی میری جیب میں پڑی ہوئی ہے۔ نکال لو۔"

"اگر تم پہلے ہی اس طرح تعاون کرتے تو تمہارا یہ حشر تو نہ ہوا ہوتا"۔ جہانداد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہر کیف دیر آید درست آید۔ اب اسی طرح تعاون کرتے رہنا فائدے میں رہو گے۔"

"کیا ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟" خلیل بھائی فریادی انداز میں بولا۔

"پوچھو؟" جہانداد نے مختصر سا جواب دیا اور پھر اس کی جیب سے چابی نکال لی۔



"تم جمشید خان کو کس لیے فون کرنا چاہتے ہو؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا مجھے اور ان حسینوں کو گرفتار کرانا چاہتے ہو؟"

"ہاں......" جہانداد نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "پہلے میرا ایسا کوئی بھی ارادہ نہیں تھا مگر ابھی تھوڑی دیر قبل تم نے جو کمینگی کا مظاہرہ کیا ہے اسے دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔ تم جیسے حرامیوں کے لیے بہترین جگہ جیل ہی ہو سکتی ہے۔ باہر رہ کر خلقِ خدا کے لیے وبالِ جان بنو گے"۔

"جمشید خان ہمارے ساتھ تمہیں بھی گرفتار کر لے گا"۔ خلیل بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ یہ بات کبھی نہیں مانے گا کہ تم نے اس کی اکلوتی بہن کو چھڑایا ہے"۔

"کیوں؟" اس نے بھڑک کر پوچھا۔ "کس لیے نہیں مانے گا۔ کیا وہ پاگل ہے یا اندھا ہے۔ اپنی بہن کی زبانی سچ سن کر کیسے نہیں مانے گا؟"

"اس کی بہن کے پاس زبان ہی نہیں ہے"۔ خلیل بھائی انکشاف کرتے ہوئے بولا۔ "وہ گونگی ہے۔ یقین نہیں آتا تو اس سے بات کر کے دیکھ لو۔ سب کچھ تم پر واضح ہو جائے گا"۔

خلیل بھائی کے اس انکشاف نے لمحہ بھر کے لیے تو جہانداد کو متحیر کر دیا مگر پھر وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟" اس نے لڑکی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "تم واقعی گونگی ہو؟"

لڑکی نے چند لمحے ممنونیت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر۔ "اوں...... آں"۔ کر کے رہ گئی۔ اس کے ہونٹ بے چارگی کے احساس سے کانپ رہے تھے اور خوبصورت سیاہ آنکھوں میں نمکین پانی تیر رہا تھا۔ قدرت نے اسے بڑی فراخدلی کے ساتھ حسن و جمال سے نوازا تھا۔ وہ واقعی ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ اسے دیکھ کر یہ ماننے کو دل ہی نہیں کرتا تھا کہ وہ گونگی ہے۔ قوتِ گویائی چھین کر یقیناً قدرت نے اس کے ساتھ ایک سنگین مذاق کیا تھا۔ وہ اس مذاق کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اس لیے بے چارگی کے آنسو بہا رہی تھی۔ مگر بات وہی تھی کہ مشیتِ ایزدی کے سامنے کس کا زور چلتا ہے۔ اوپر والے کی مرضی ہے جس کو چاہے جیسے بنائے۔ فانی انسان اس سے گلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ خالق ہے اور اپنی تخلیق کے بارے میں خوب جانتا ہے۔

جہانداد نے اپنا دایاں ہاتھ فون کے ریسیور کی طرح کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے بھائی کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا نام بتاؤ؟"

لڑکی نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دو تین بار۔ "آں...... آں...... اوں"۔ کیا اور پھر انگلی سے خلیل بھائی کی طرف اشارہ کر دیا۔

"میں سمجھ گیا"۔ جہانداد مسکراتے ہوئے بولا۔ "خلیل بھائی کو تمہارا نام معلوم ہے۔ یہی کہنا

چاہتی ہو ناں؟"
"اوں......اوں"۔ لڑکی نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے جہانداد کے خیال کی تر
دی۔
"ہاں......خلیل بھائی"۔ جہانداد فوراً اس کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔"لڑکی کہہ ر
اس کا نام جانتے ہو......بتاؤ کیا نام ہے اس کا؟"
"میمونہ"۔ خلیل بھائی نے مختصر سا جواب دیا۔
"کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟" جہانداد ایک بار پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔"تمہارا نام م
ہے ناں؟"
"آں......آں"۔ لڑکی نے سر کو مثبت انداز میں ہلایا۔
"تو آؤ تمہارے بھائی کو فون کر کے بتاتے ہیں کہ میمونہ یہاں ہے"۔ جہانداد نے بڑ
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"فوراً آ کر اسے لے جاؤ"۔
"آں......آں" میمونہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اسے کسی چیز کے متعلق بتا
کوشش کی اور پھر اپنے کندھے کی طرف اشارہ کر دیا۔
اس کا اشارہ اتنا واضح تھا کہ جہانداد فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔
"کون کہتا ہے کہ تم بول نہیں سکتیں"۔ وہ ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
بہت ذہین ہو۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ تم اپنے شولڈر بیگ کے متعلق پوچھ رہی ہو ناں؟
"آں......" اس بار میمونہ نے قدرے شرما کر سر ہلایا تھا۔
"گڈ!" جہانداد مسکرایا۔"اچھا یہ بتاؤ اس میں کتنی رقم تھی؟"
"آں......آں"۔ میمونہ اپنے دونوں ہاتھ کھول کر اس کے سامنے کر دیے۔
"ایک ہزار روپیہ تھا؟" اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے جہانداد نے استفسار کیا۔
"آں......" میمونہ نے سر کی جنبش سے تصدیق کر دی اور جہانداد خلیل بھائی کی طرف م
گیا۔
"میمونہ کا بیگ کہاں ہے؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
"وہ وہیں فون والے کمرے میں ہے"۔ خلیل بھائی نے بتایا۔"الماری میں رکھا ہوا ہے۔"
"رقم کے علاوہ اس میں اور کیا کچھ تھا؟" جہانداد نے دوبارہ پوچھا۔
"زنانہ استعمال کی چند چیزیں ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔"ہم نے کسی چیز کو بھی نہیں
سب کچھ بیگ کے اندر موجود ہے"۔



"الماری کی چابی کہاں ہے؟"
"الماری بغیر تالے کے ہے"۔ خلیل بھائی بولا۔"اس میں کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی
"پینے والی چیزوں میں کیا کچھ ہے؟" جہانداد نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔
"کوئی خاص نہیں"۔ اس نے شرمندگی سے کہا۔"بس دیسی کی چند بوتلیں ہیں۔ کبھی کبھار
مہمان آ کر شغل میلہ کرتے رہتے ہیں۔ بس مجبوری ہے رکھنا پڑتی ہے"۔
"تیرے جیسے لوگ تو مہمانوں کے لیے ولایتی رکھا کرتے ہیں"۔ جہانداد استہزائیہ انداز میں
بولا۔"پھر تم نے دیسی کیوں رکھی ہوئی ہے۔ کیا ولایتی آج کل نہیں ملتی؟"
"کبھی کبھار مل جاتی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔"مگر مہنگی بہت ہوتی ہے۔ کیا تم شغل کرتے
رہتے ہو؟"
"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی چیزوں پر"۔ جہانداد نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔
"تمہیں مبارک ہو یہ پینا پلانا"۔
اتنا کہہ کر اس نے میمونہ کو اشارہ کیا اور پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ جہانداد نے تختے کو دوبارہ اپنی جگہ پر لگایا اور مطمئن ہونے کے بعد میمونہ سے بولا۔
"چلو تمہارے بھائی کو فون کرتے ہیں اور تمہارا بیگ بھی ڈھونڈتے ہیں"۔
"آں......" میمونہ نے خوشی سے سر ہلایا اور جہانداد کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔
چند لمحوں کے بعد وہ دونوں مطلوبہ کمرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ جہانداد نے بغیر وقت ضائع کیے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میمونہ بھی اس کی تقلید میں کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ کمرے کے اندر ایک میز پر ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میز کے گرد تین کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں، کرسیوں اور میز پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کمرے میں موجود دیگر اشیاء کا بھی یہی حال تھا۔ شاید اس کمرے کو کبھی کبھار ہی استعمال کیا جاتا تھا۔
"بیٹھو"۔ جہانداد ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میمونہ سے مخاطب ہوا۔"میں تمہارا بیگ ڈھونڈنے کے بعد ابھی تمہارے بھائی کو فون کرتا ہوں"۔
میمونہ اس کا اشارہ پا کر بلا تردد کرسی پر بیٹھ گئی اور جہانداد کمرے کی اکلوتی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر اس نے اندر موجود چیزوں کا جائزہ لیا اور پھر اوپر کے خانے میں اسے میمونہ کا شولڈر بیگ رکھا ہوا نظر آ گیا۔ بغیر کسی چیز کو چھیڑے اس نے بیگ اٹھایا اور پلٹ کر میمونہ کے پاس پہنچ

گیا۔

"کیا یہی ہے تمہارا بیگ؟" اس نے میمونہ کے سامنے بیگ کو میز پر رکھتے ہوئے سوال کیا۔

اپنے بیگ پر نظر پڑتے ہی میمونہ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر بیگ اٹھالیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس کی زپ کھول کر اسے میز پر الٹ چکی تھی۔ اب وہ بیگ سے برآمد ہونے والی چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی توجہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے جہانداد کی موجودگی کو بھی نظرانداز کر دیا تھا۔ جہانداد بڑے غور سے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایک چیز اٹھا کر چیک کرنے کے بعد دوبارہ بیگ میں رکھتی جارہی تھی۔ اب میز پر چھوٹے بڑے نوٹ اور کچھ ریزگاری رہ گئی تھی۔ پہلے اس نے نوٹ اٹھا کر گنے اور مطمئن ہو کر انہیں بیگ میں رکھ دیا۔ اس کے بعد ریزگاری اٹھا کر بغیر گنے بیگ کے اندر ڈال دی۔

"تمام چیزیں برابر ہیں ناں؟" اس کے فارغ ہوتے ہی جہانداد نے سوال کیا۔ "اگر کچھ غائب ہے تو بتاؤ میں خلیل بھائی کو پکڑ کر یہیں لے آتا ہوں"۔

میمونہ نے "آں.....آں"۔ کی آوازیں نکالتے ہوئے ہاتھوں کی مدد سے چند اشارے کیے اور پھر مطمئن انداز میں مسکرا دی۔

"اوکے....." جہانداد نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمہاری سب چیزیں موجود ہیں۔ چلو اب تمہارے بھائی سے بھی بات کر لیتے ہیں"۔

اتنا کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ فون کی طرف بڑھا دیا۔ عین اسی لمحے "ٹرن.....ٹرن"۔ کی آواز سے فون بج اٹھا اور اس کا آگے کو بڑھتا ہوا ہاتھ یک لخت رک گیا۔

فون مسلسل ٹرن ٹرن کی آواز سے شور مچا رہا تھا اور جہانداد کش مکش کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے؟ شاید میمونہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ اب تک فون کا ریسیور اٹھا چکا ہوتا۔ میمونہ بھی پریشانی کے عالم میں کبھی اس کی طرف تو کبھی فون کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس اثناء میں فون کی گھنٹی خاموش ہو گئی اور جہانداد ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ مگر اس کا اطمینان لمحاتی ثابت ہوا، فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔

"اوہ.....میرے خدایا! یہ کیا مصیبت ہے"۔ جہانداد ایک دم جھنجھلا اُٹھا۔ "کون ہے یہ الو کا پٹھا گھنٹی پر گھنٹی کیے جارہا ہے"۔

"آں.....آں"۔ اچانک میمونہ نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بنا کر کان پر رکھتے ہوئے اسے ریسیور اٹھانے کا اشارہ کیا۔



"کیا پاگل ہو گئی ہو؟" جہانداد نے جواب دیا۔ "میں نہیں اٹھاؤں گا۔ پھر کوئی مصیبت نازل ہو جائے گی۔ نہ جانے کون ہوگا؟"

"آں.....آں"۔ میمونہ نے دوبارہ پُرزور انداز میں اصرار کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے"۔ جہانداد نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اٹھا لیتا ہوں اگر کوئی مصیبت نازل ہو گئی تو پھر گلہ نہ کرنا"۔

اتنا کہہ کر اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا دیا۔

"ہیلو"۔ دوسری طرف سے ایک پُرجوش مردانہ آواز سنائی دی۔ "خلیل بھائی! میں راجو بات کر رہا ہوں میری بات دھیان سے سنو.....درمیان میں ٹوکنے کی کوشش نہ کرنا"۔

"بولو"۔ جہانداد نے حتی المقدور خلیل بھائی کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"خلیل بھائی! یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟" بولنے والا فوراً مشکوک ہو گیا۔ "کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے"۔

"آواز کو چھوڑو"۔ جہانداد نے درشت انداز میں کہا۔ "زکام کی وجہ سے گلا خراب ہے۔ تم بات بتاؤ۔ کیا کہنے والے تھے؟"

"خلیل بھائی! گونگی کو لے کر فوراً فارم ہاؤس چھوڑ دو"۔ راجو نے بتانا شروع کیا۔ "جمشید خان پولیس موبائل لے کر تمہاری طرف آرہا ہے۔ فوراً نکل جاؤ اس کے پاس تمہیں دیکھتے ہی گولی مارنے کے آرڈر ہیں"۔

"تمہیں کس نے دی ہے یہ خبر؟" جہانداد نے استفسار کیا۔

"خلیل بھائی! یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" راجو متحیر انداز میں بولا۔ "کہیں آج زیادہ تو نہیں چڑھا لی؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟"

"ایم سوری راجو"۔ وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ "بہرکیف تمہارا شکریہ۔ میں یہاں سے ابھی نکل رہا ہوں"۔

"اوکے.....اللہ حافظ"۔ اتنا کہہ کر راجو نے سلسلہ منقطع کر دیا اور جہانداد نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

میمونہ جو بڑی دیر سے جہانداد کو فون پر باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ریسیور رکھتے ہی ہاتھ کے اشارے سے استفسار کرنے لگی۔

"تمہارا بھائی آرہا ہے میمونہ"۔ جہانداد نے قدرے پریشانی سے بتایا۔ "اب شاید میں بھی تمہارے بھائی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ پکڑا جاؤں گا۔ اگر تم اجازت دو تو میں فوراً یہاں سے نکل

جاتا ہوں"۔

"آں......آں......"اس نے نفی میں سر کو دائیں بائیں ہلایا اور پھر ہاتھوں کی مدد سے اشارے کرتے ہوئے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"کیا تم بھائی کو اطمینان دلاسکو گی کہ میں بے گناہ ہوں"۔ وہ اضطراب کے عالم میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔"اور میں نے تمہیں قید سے رہائی دلائی ہے"۔

میمونہ نے۔"آں......آں"۔ کرتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش دی اور پھر آگے بڑھ کر جہانداد کا بازو پکڑ لیا۔ وہ اسے کھینچتی ہوئی کرسی کی طرف لائی اور اسے بٹھانے کے بعد خود بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم بہت معصوم ہو میمونہ"۔ جہانداد اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔"خدا تمہیں ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو"۔

میمونہ نے ایک نظر ممنونیت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ ہمدردانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھپک رہی تھی۔ شاید وہ اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کررہی تھی۔

"فکر مت کرو میمونہ"۔ جہانداد مسکراتے ہوئے بولا۔"میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں اور نہ ہی یہ حالات میرے لیے نئے ہیں۔ میں ایسی آزمائشوں سے بارہا گزر چکا ہوں"۔

میمونہ سے باتیں کرتے ہوئے جہانداد یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ صرف بول نہیں سکتی تھی۔ سن سکتی تھی اور مخاطب کی بات بھی باآسانی سمجھ لیتی تھی۔ گزشتہ دو گھنٹوں سے وہ اس کے ساتھ تھی۔ جہانداد کو اس سے بات کرتے ہوئے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ کافی دیر تک وہ اشاروں کی زبانی میمونہ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ جتنی خوبصورت اور معصوم تھی دل کی بھی اتنی ہی اچھی تھی۔ جہانداد کے لیے یہ بات بھی حیرت انگیز تھی کہ بے زبان اور لڑکی ہونے کے باوجود وہ بہت باحوصلہ اور بہادر تھی۔ تہہ خانے میں جہانداد کی جان بچا کر وہ اپنی جرأت مندی کا ثبوت دے چکی تھی۔

"آؤ......"اچانک جہانداد اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔"بیرونی دروازے پر جا کر تمہارے بھائی کا انتظار کرتے ہیں"۔

میمونہ نے اپنا بیگ کندھے سے لٹکایا اور بلا چوں و چرا اس کے ساتھ چل دی۔

"اپنے بھائی کو میرے بارے میں کیسے بتاؤ گی؟" جہانداد نے چلتے چلتے سوال کیا۔

"آں......آں"۔ میمونہ نے کچھ عجیب انداز میں اپنے ہاتھوں کو اوپر نیچے حرکت دی۔ جہانداد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔



"غالباً اب تم نے گونگوں کی کسی مخصوص زبان میں بات کی ہے"۔ جہانداد تصدیق طلب انداز میں بولا۔"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟"

"اوں......اوں"۔ اس نے سر ہلا کر جہانداد کی تردید کی۔

"تو پھر کیا بات ہے؟" جہانداد نے الجھ کر پوچھا۔"مجھے آسان اشاروں میں سمجھاؤ"۔

"آں......آں"۔ میمونہ نے دونوں ہاتھوں سے اشارے کرنا شروع کر دیے۔ **اس بار اس** کے اشارے بہت واضح تھے اور جہانداد باآسانی سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے اپنے بھائی کے **متعلق بتا رہی تھی** کہ وہ اس سے کس طرح بات کرتا ہے۔ کیسے اس کی بات سمجھتا ہے اور اس سے کتنا پیار کرتا ہے۔

چند لمحے اشارے کرنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر جہانداد کا دایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنے سر پر رکھ دیا۔ اب وہ پھر"اوں......آں"۔ کرتے ہوئے اشارے کر رہی تھی۔

"او کے......او کے۔ میں سمجھ گیا۔ جہانداد ہنستے ہوئے بولا۔"تم نے مجھے اپنا بھائی بنا لیا ہے اور اپنے پولیس والے بھائی کو اپنی زبان میں سمجھاؤ گی کہ میں نے تمہاری جان بچائی ہے اور اب تم مجھے اپنا بھائی سمجھتی ہو اس لیے مجھ سے کوئی تفتیش نہ کی جائے۔ میں ٹھیک سمجھا ہوں ناں؟"

"آں......آں"۔ میمونہ نے مثبت انداز میں سر ہلا کر اس کی تصدیق کر دی۔

"تم بہت سمجھدار ہو...... میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا تھا"۔ جہانداد نے سنجیدگی سے کہا اور میمونہ نے مسکرا کر اپنا سر جھکا دیا۔

بیرونی دروازے پر منتظر کھڑے ابھی انہیں تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ معاً سامنے سے دروازے پر سرچ لائیٹ کی تیز روشنی پڑی اور جہانداد میمونہ کا ہاتھ پکڑ کر سائیڈ میں ہو گیا۔ ایسا اس نے احتیاطاً کیا تھا کیونکہ پولیس والوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ اکثر بلا سوچے سمجھے ہی گولی چلا دیتے ہیں۔

"لگتا ہے تمہارا بھائی پہنچ گیا ہے"۔ جہانداد نے میمونہ سے کہا۔"استقبال کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ"۔

"آں......آں"۔ میمونہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر نکلنے کے لیے کہا۔

"معاف کرنا...... مس میمونہ! میں یہ رسک نہیں لے سکتا"۔ جہانداد سنجیدگی سے بولا۔ "تمہارا بھائی بہت غصے میں ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ سے صفائی سننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے اور اندھا دھند گولی چلا دے"۔

پھر اس سے پہلے کہ میمونہ اوں......آں کر کے اسے کوئی جواب دیتی اچانک نیم وا دروازے کے سامنے قدموں کی ہلکی سی چاپ ابھری اور پھر دروازہ بے آواز انداز میں کھلتا چلا گیا ہے۔

"سر! لگتا ہے وہ فرار ہو گئے ہیں"۔ کسی کی آواز سنائی دی۔"شاید پھر کسی نے مخبری کر دی

ہے''۔

''اوئے راجو! تجھے کیا الہام ہوا ہے''۔ ایک بھاری بھرکم آواز نے جواب دیا۔ ''انہیں تجھ پر کیسے ہوسکتی ہے؟''

راجو کا نام سن کر جہانداد کے کان کھڑے ہوگئے مگر اس نے سامنے آنے کا رسک پھر بھی نہ لیا۔

''چلو احتیاط سے آگے بڑھو''۔ بھاری بھرکم آواز نے اس بار حکمیہ انداز میں کہا۔ ''ایک ایک کمرے کو گھیر لو آج خلیل بھائی کو بچ نکلنے کا موقع کسی صورت نہیں دینا۔ کوئی بھی بھاگنے کی کوشش......''

ابھی اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ معاً میمونہ ''آں......آں''۔ کرتی ہوئی دروازے کی طرف دوڑ پڑی جہانداد کو اسے روکنے یا کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

بھاری بھرکم آواز والا یقیناً ایس پی جمشید خان تھا۔ اچانک میمونہ کو سامنے پا کر لمحہ بھر کے لیے تو وہ متحیر ہی رہ گیا۔ پھر پُرمسرت آواز میں بولا۔ ''تم......تم ٹھیک تو ہو میری جان؟ میں نے کہاں کہاں تمہیں تلاش نہیں کیا''۔ اتنا کہہ کر اس نے میمونہ کو گلے سے لگا لیا۔

میمونہ اس سے لپٹی چند لمحے تو روتی رہی۔ پھر آں......آں کرتے ہوئے اسے اشاروں میں کچھ بتانے لگی۔ جوں جوں وہ اشارے کرتی جارہی تھی جمشید خان کی حیرت دو چند ہوتی جارہی تھی۔ جہانداد ان سے چند قدم دور لیموں کے پودوں کے عقب میں چھپا میمونہ کی آں......آں اور جمشید خان کی تسلی آمیز آوازیں صاف سن رہا تھا۔ شاید میمونہ اسی کے متعلق اپنے بھائی کو بتارہی تھی تاہم اس کا یہ اندازہ غلط بھی ہوسکتا تھا۔ میمونہ سے اس کی رفاقت دو ڈھائی گھنٹے ہی رہی تھی اور اتنی کم رفاقت میں کسی بھی انسان کے متعلق اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ جبکہ یہاں تو صورت حال ہی مختلف تھی کیونکہ میمونہ گونگی تھی بول کر اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کرسکتی تھی۔ دوسرا اس پر جذباتی کیفیت بھی طاری تھی۔ جذبات میں آ کر وہ بھائی کو کچھ الٹا سیدھا بھی بتا سکتی تھی۔ بہرکیف جو بھی ظہور پذیر ہونے والا تھا وہ جہانداد کے لیے نیا نہیں ہوسکتا تھا۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اب ان دونوں کی آوازوں کے ساتھ دوسرے پولیس والوں کی آوازیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔

''کیا وہ میمونہ صاحبہ کو چھوڑ کر فرار ہوچکے ہیں سر؟'' کسی پولیس والے کی پُرجوش آواز سنائی دی۔

''فی الحال کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا''۔ جمشید خان کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''ابھی میمونہ پر جذباتی کیفیت طاری ہے اس لیے ٹھیک طور پر وہ کچھ بتا نہیں پارہی۔ بہرکیف عمارت خالی نہیں ہے، یہاں لوگ موجود ہیں۔ ان لوگوں میں میمونہ کا کوئی ہمدرد بھی شامل ہے''۔



جونہی جمشید خان کی بات مکمل ہوئی میمونہ آں......آں کرتے ہوئے لیموں کے اُن پودوں کی طرف دوڑ پڑی جن کے عقب میں جہانداد چھپا ہوا تھا۔

''رکو......میمونہ''۔ جمشید خان چلا کر بولا۔ ''کہاں جارہی ہو؟''

اب جہانداد کے لیے چھپے رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ معاً وہ دونوں ہاتھ اٹھائے پودوں کی آڑ سے نکل کر سامنے روشنی میں آگیا۔ میمونہ ناقابلِ فہم آوازیں نکالتی ہوئی اس کے قریب پہنچی اور پھر اس کا ایک جہانداد کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر جمشید خان اور اس کے پیچھے آنے والے دوسرے پولیس مین ٹھٹک کر رک گئے۔ ان کے چہروں پر حیرت ثبت ہوکر رہ گئی تھی۔

''کون ہو تم؟'' جمشید خان اپنا سروس ریوالور سیدھا کرتے ہوئے بارعب انداز میں بولا۔ ''کیا خلیل بھائی کے آدمی ہو؟''

''خلیل بھائی کے کسی آدمی کا ہاتھ میمونہ بھلا اپنے سر پر کیسے رکھ سکتی ہے؟'' جہانداد نے بلاجھجک جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''عورت کے سر پر اس کے بھائی کا یا پھر باپ کا ہی ہاتھ ہوسکتا ہے''۔

''اگر تم خلیل بھائی کے ساتھی نہیں ہو تو پھر کون ہو؟'' جمشید خان نے دوبارہ سوال کیا۔

''ابھی تم مجرموں کو پکڑنے کی سوچو''۔ جہانداد بولا۔ ''میں کہیں بھاگا نہیں جارہا۔ تمہارے ساتھ ہوں۔ اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ بہرکیف میرا نام جہانداد ہے''۔

''سب پوزیشن لے لو''۔ جہانداد کی بات سنتے ہی جمشید خان پلٹ کر اپنے ماتحتوں سے مخاطب ہوا۔ ''کسی کو بچ کر نہیں جانا چاہیے''۔

''پوزیشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''خلیل بھائی اور اس کے ساتھی بندھے ہوئے پڑے ہیں''۔

''کیا......'' جمشید خان متحیر انداز میں چلایا۔ ''وہ تو بہت خطرناک مجرم ہیں۔ یہ کام تم نے اکیلے کرلیا؟''

''بس کرلیا......مگر تفصیل بعد میں بتاؤں گا''۔ جہانداد نے جواب دیا۔

''چلو پھر ہماری رہنمائی کرو''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''انہیں گرفتار کرنے کے بعد میں تمہاری کہانی سنوں گا''۔

''میں ضرور سناؤں گا''۔ جہانداد آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''مگر صرف تمہیں اور وہ بھی اکیلے میں''۔

جہانداد نے جمشید خان اور اس کے ساتھیوں سمیت سیدھا اس کمرے کا رخ کیا جہاں خلیل بھائی سمیت تمام ساتھی بند تھے۔ دروازے کے کھلتے ہی پولیس والوں نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے

وہاں موجود تینوں آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔

"ان میں خلیل بھائی تو موجود نہیں ہے"۔ جمشید خان ان تینوں کو غور سے دیکھنے کے بعد جہاندار سے بولا۔ "کہیں وہ فرار تو......"

"اسے میں نے فرار ہونے کے قابل ہی نہیں چھوڑا"۔ جہانداد نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دوسرے کمرے کے تہہ خانے میں زخمی حالت میں پڑا ہوا ہے"۔

"اسے تم نے زخمی کیا ہے؟" جمشید خان نے استفسار کیا۔

"ہاں...... میں نے کیا ہے"۔ جہانداد نے جواب دیا۔ "اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے اور میمونہ کو زخمی کر دیتا۔ ایسا میں نے صرف اپنے دفاع کے لیے کیا ہے؟"

"او کے...... تہہ خانے والے کمرے کی طرف چلو"۔ جمشید خان تحکمانہ انداز میں بولا۔ جہانداد خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ لکڑی کا تختہ ہٹا کر تہہ خانے کی سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔ نیچے پہنچے خلیل بھائی انہیں بے ہوشی کے عالم میں ایک کرسی پر بندھا ہوا ملا۔

"جلدی سے کھولو اسے"۔ جمشید خان نے ایک سپاہی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "چیک کرو حرام زادہ زندہ بھی ہے کہ نہیں؟"

اس کا حکم سنتے ہی ایک کی بجائے دو سپاہی آگے بڑھے اور خلیل بھائی کو کھول کر فرش پر لٹا دیا۔ اس کے بعد ایک سپاہی نے اس کی کلائی تھام کر نبض چیک کی اور پھر جمشید خان سے بولا۔ "سر! یہ زندہ ہے نبض ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے"۔

"ٹھیک ہے اسے اٹھا کر باہر لے چلو"۔ جمشید خان نے حکم دیا۔ "اور ہوش میں لانے کا بندوبست کرو"۔

حکم سنتے ہی سپاہیوں نے خلیل بھائی کو ٹانگوں اور ہاتھوں سے پکڑ کر ڈنڈا ڈولی کیا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ اوپر کمرے میں پہنچ کر انہوں نے اسے ایک بستر پر لٹایا اور پھر ایک سپاہی جگ میں پانی لے آیا۔ آخر کار آٹھ دس منٹ کی تگ و دو کے بعد سپاہی اسے ہوش میں لے ہی آئے۔

"مم...... میں...... کہاں ہوں؟" ہوش میں آتے ہی خلیل بھائی کراہتے ہوئے بولا۔ "مم مجھے پیاس لگی ہے۔ پلیز پانی......"

"فکر مت کرو"۔ جمشید خان اس پر جھکتے ہوئے بولا۔ "تم قانون کی پناہ میں ہو۔ تمہارا پانی اب ہمارے ذمے ہے"۔

اتنا کہہ کر وہ ایک سپاہی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "پانی پلاؤ اسے"۔ وہ حکمیہ انداز میں بولا۔



"یس سر"۔ کہتے ہوئے پانی کا گلاس خلیل بھائی کے لبوں سے لگا دیا۔

===

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جمشید خان فارم ہاؤس کو سیل کروانے کے بعد واپس روانہ ہونے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ فارم سے نہ صرف خاصی مقدار میں منشیات برآمد ہوئی تھیں بلکہ غیر قانونی اسلحہ بھی ان کے ہاتھ لگا تھا۔ خلیل بھائی اور اس کے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں لگا کر ایک بڑی وین میں بٹھا دیا گیا۔ میمونہ کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھانے کے بعد جمشید خان جہانداد کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "آ جاؤ۔ تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ"۔

"نہیں"۔ جہانداد بولا۔ "میرے پاس اپنی جیپ ہے جو یہاں سے تھوڑی دور سڑک کے بیچ کھڑی ہوئی ہے۔ دراصل انجن گرم ہونے کے بعد وہ بند ہو گئی تھی اور میں اس فارم ہاؤس کی طرف پانی کی تلاش میں نکل آیا تھا"۔

"تم بیٹھو...... جیپ آ جائے گی"۔ اتنا کہہ کر اس نے دو سپاہیوں کو جیپ لانے کے لیے بھیج دیا اور جہانداد مطمئن ہو کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میمونہ اب بے حد خوش نظر آ رہی تھی اور اشاروں سے بولی کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ پہلے والی میمونہ ہے۔ تھانے پہنچ کر خلیل بھائی اور اس کے ساتھیوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا اور میمونہ کو ایک جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیا گیا۔ ان تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد جمشید خان جہانداد سے بولا۔ "آؤ میرے آفس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ میں تمہارے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب ہوں"۔

"میری کہانی میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے"۔ جہانداد اس کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا بولا۔ "دراصل میں یہاں کسی کی تلاش میں آیا ہوں مگر وہ مجھے کوشش کے باوجود نہیں مل رہا"۔

"اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں"۔ آفس میں داخل ہونے کے بعد وہ کرسی سنبھالتے ہوئے بولا۔ "تم بیٹھو۔ پہلے میں تمہارے لیے کھانے کا آرڈر دیتا ہوں"۔

"کھانا میں کھا چکا ہوں"۔ جہانداد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "تاہم چائے کی طلب شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ بیل کا بٹن دباتے ہوئے بولا۔ "چائے منگوا لیتے ہیں۔ تمہارے ساتھ میں بھی پی لوں گا"۔ اردلی کے اندر آنے کے بعد جمشید خان نے اسے چائے لانے کا حکم دیا اور دوبارہ جہانداد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سب سے پہلے تو میں تمہارا تہہ دل سے مشکور ہوں"۔ وہ ممنون انداز میں بولا۔ "تمہاری وجہ سے میری معذور بہن کو نہ صرف رہائی ملی ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اسے نئی زندگی ملی ہے"۔

"یہ بس اتفاق تھا کہ میں اس طرف جا نکلا ورنہ......"

"میں شروع سے تمام تفصیل سننا چاہوں گا"۔ جمشید خان نے قطع کلامی کی۔ "دراصل خ... بھائی ایک بہت بڑے گینگ کا رکن ہے اور میں اس پورے گینگ کو سلاخوں کے پیچھے دیکھ... ہوں"۔

"مگر میں......سب سے پہلے ایک اہم راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں"۔ جہانداد نے سنجی... سے کہا۔ "اگر میرا شک ٹھیک نکلا تو تم پر حیرت انگیز انکشافات ہوں گے"۔

"کون سا راز......کیسے انکشافات؟" اس نے پُر جوش انداز میں پوچھا۔

"تمہارے عملے میں کوئی راجو نام کا شخص ہے؟" جہانداد نے الٹا سوال کر دیا۔

"ہاں ہے......مگر راجو کا اس معاملے کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" وہ متحیر انداز میں بولا۔ "وہ تو ایک ایماندار اور فرض شناس ہیڈ کانسٹیبل ہے"۔

"وہ خلیل بھائی کے لیے مخبری کرتا ہے"۔ جہانداد نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "اگر م... فارم ہاؤس میں موجود نہ ہوتا تو تمہیں وہاں کچھ بھی نہ ملتا۔ بس اتفاقاً ہی فون پر اس نے مجھے خلیل بھا... سمجھتے ہوئے اس چھاپے کے متعلق بتا دیا تھا"۔

"یہ......یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" جمشید خان حیرت سے اچھل پڑا۔ "راجو اور خلیل بھائی کا مخ... بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کوئی اور را... بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"کسی اور راجو کو تمہارے منصوبے کی خبر کیسے ہو سکتی ہے؟" جہانداد نے دلیل پیش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں......یہ بات بھی سوچنے والی ہے"۔ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "اتنے فول پروف منصوبے کی خبر باہر کے کسی آدمی کو نہیں ہو سکتی۔ ضرور کوئی چکر ہے"۔

اسی اثناء میں اردلی چائے لے کر آفس میں داخل ہوا تو جمشید خان نے اسے فوراً ہیڈ کانسٹیبل ریاض احمد عرف راجو کو بلانے کے لیے کہہ دیا۔ اردلی یس سر کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"چائے لیجیے"۔ اردلی کے جانے کے بعد جمشید خان جہانداد سے بولا۔ "ابھی راجو آنے وا... ہے۔ سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا"۔

جہانداد نے ایک کپ اٹھا کر اپنے سامنے میز پر رکھ دیا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "وہ اپنی... آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا......اسے......"

"تم فکر مت کرو"۔ جمشید خان نے گرما گرم چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے قطع کلامی کی۔



...ایک پولیس آفیسر ہوں اور بڑی اچھی طرح سچ جھوٹ کو پرکھ سکتا ہوں۔ اب تم مجھے اپنے بارے ...بتاؤ؟"

جہانداد ابھی کوئی مناسب جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اردلی دوبارہ اندر داخل ہوا اور جمشید خان ...مؤدب انداز میں بولا۔ "سر! راجو تو گھر چلا گیا ہے۔ اب کیا حکم ہے؟"

"کیا اس کا گھر نزدیک ہے؟" جمشید خان نے سوال کیا۔

"نہیں سر! کافی دور ہے"۔ اردلی نے جواب دیا۔ "اس لیے تو وہ جلدی نکل گیا ہے۔ کیا اسے ...رے بلانا ہے"۔

"نہیں رہنے دو"۔ جمشید خان نے منفی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں صبح اس سے بات ...روں گا۔ بس تم جاؤ"۔

اردلی پلٹ کر باہر نکل گیا اور جمشید خان ایک بار پھر جہانداد کی طرف متوجہ ہو گیا جو تھکے ہوئے ...داز میں جمائیاں لے رہا تھا۔

"میرے خیال میں تمہیں نیند آ رہی ہے؟" جمشید خان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا گھر ...ہیں؟"

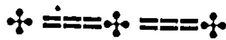
"واقعی نیند آ رہی ہے"۔ جہانداد نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے کہا۔ "مجھے کافی دیر سے آرام کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے جمائیوں پر جمائیاں آنے لگی ہیں"۔

"تو ٹھیک ہے گھر چلتے ہیں"۔ وہ اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہاری کہانی کل سن لیں گے"۔

ذرا دیر بعد جمشید خان کی سرکاری گاڑی تھانے کے احاطے سے باہر نکل رہی تھی۔ جہانداد بھی ...کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جس وقت جمشید خان کی گاڑی پورچ میں جا کر رکی اس وقت رات کے ...رہے تھے۔ جہانداد کی تھکاوٹ کے پیش نظر اس نے فوراً گیسٹ روم کو کھلوایا اور ایک نوکر کو بستر ...نے کے لیے کہہ دیا۔

"او کے......اب میں چلتا ہوں"۔ وہ اجازت طلب انداز میں بولا۔ "تم آرام کرو صبح بات کریں گے......کسی چیز کی ضرورت ہو تو نوکر کو بتا دینا"۔

"فی الحال تو مجھے ایک پُر سکون نیند کی ضرورت ہے"۔ جہانداد نے تھکے ہوئے انداز میں جواب دیا اور جمشید خان خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔



جہانداد نے وقتی طور پر نیند کا بہانہ بنا کر جمشید خان کو ٹال دیا تھا مگر یہ مہلت صرف کل صبح تک ...لیے تھی۔ کیوں کہ جمشید خان کی گونگی بہن کو بچا کر اس نے اس پر احسان کیا تھا لیکن جمشید خان ایک

پولیس آفیسر تھا اور وہ قانون سے بھاگا ہوا ایک مفرور تھا۔ جلد یا بدیر اس نے جہانداد کی اصلیت معلوم کر ہی لینی تھی۔ افضال خٹک جیسی اہم سیاسی شخصیت کو قتل کرنے کے بعد وہ اس شہر میں زیادہ دیر چھپ کر نہیں رہ سکتا تھا۔ تاہم وقتی طور پر وہ جمشید خان کو سنانے کے لیے کوئی موزوں کہانی سوچ رہا تھا۔ کوئی ایسی کہانی جسے سن کر جمشید خان کو اس پر رتی بھر بھی شک نہ ہو سکے۔ گھنٹہ بھر سوچتے رہنے کے بعد آخر کار اسے ایک مناسب کہانی مل ہی گئی اور وہ مطمئن ہو کر سو گیا۔ دوسری صبح تقریباً سات بجے کے قریب ایک نوکر نے اسے جگانے کے بعد کہا۔ ''آپ جلدی سے غسل وغیرہ کر لیں۔ ناشتہ تیار ہو رہا ہے۔ صاحب نے کہا ہے کہ مل کر ناشتہ کریں گے''۔

''میں غسل کر کے کیا کروں گا؟'' وہ خمار آلود انداز میں بولا۔ ''میرے پاس پہننے کے لیے صاف کپڑے ہی نہیں ہیں۔ دراصل میرا سفری بیگ میری جیپ میں ہی رہ گیا ہے۔ پتا کرو میری جیپ پہنچ گئی کہ نہیں''۔

''جیپ تو ابھی نہیں پہنچی جناب!''۔ نوکر نے جواب دیا۔ ''البتہ صاحب نے آپ کے لیے ایک سوٹ پریس کروا دیا ہے۔ آپ اٹھ کر غسل کریں میں سوٹ لے کر ابھی آتا ہوں''۔

''لیکن صاحب تو قمیص پتلون پہنتے ہوں گے''۔ جہانداد معترض ہوا۔ ''جبکہ مجھے شلوار قمیص استعمال کرنے کی عادت ہے''۔

''بس جناب گزارہ کر لیں''۔ نوکر ہنستے ہوئے بولا۔ ''پتلون قمیص بھی تو لباس ہی ہوتا ہے۔ انہیں کبھی کبھار مجبوری کے عالم میں استعمال کرنا ہی پڑتا ہے''۔

''اچھا...... ٹھیک ہے تم لے آؤ''۔ وہ اٹھ کر بستر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ''آج انگریزی لباس کے مزے بھی لے لیتے ہیں''۔

''ابھی لاتا ہوں جناب''۔ اتنا کہہ کر نوکر باہر نکل گیا اور جہانداد ایک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر وہ کمرے میں ٹہلتا رہا پھر نوکر کے آنے کے بعد ملحقہ باتھ روم میں گھس گیا۔ ایک بھرپور شاور لینے کے بعد وہ ایک دم فریش ہو گیا۔ سستی اور کسلمندی دور ہو گئی تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ باتھ روم سے باہر نکلا اور قدِ آدم آئینے کے سامنے پہنچ کر بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ اب اسے بڑی شدت کے ساتھ بھوک محسوس ہو رہی تھی چنانچہ نوکر کے بلانے پر وہ فوراً کمرے سے باہر نکلا اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

''آؤ...... آؤ مسٹر جہانداد میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا''۔ اسے دیکھتے ہی جمشید خان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کہو...... رات کیسی گزری؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ناں؟''

''نہیں......'' وہ اس کے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''کوئی تکلیف نہیں



بس ذرا اس انگریزی لباس میں الجھن محسوس کر رہا ہوں۔ دراصل پہلے کبھی پہننے کا اتفاق نہیں ہوا

''بس تھوڑی دیر کی بات ہے''۔ جمشید خان بولا۔ ''تمہاری جیپ تھانے سے یہاں پہنچا دی گئی ہے۔ یقیناً اس میں تمہارے روزمرہ استعمال کا سامان اور کپڑے وغیرہ موجود ہوں گے''۔

''ہاں موجود ہیں''۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

اسی اثناء میں ایک نوکر نے ان کے سامنے ناشتہ لگا دیا اور جمشید خان نے باتوں کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے اسے ناشتہ کرنے کا اشارہ کر دیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد جب وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تو جمشید خان پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔

''میرے خیال میں اب ہم دونوں کے پاس کافی وقت ہے۔ کیوں ناں اس دوران تمہاری کہانی سن لی جائے مگر پہلے میمونہ کو چھڑانے والا واقعہ سنائیے''۔

جہانداد نے پہلے سے ذہن میں ترتیب دی گئی کہانی دہرانا شروع کر دی۔ ''کل شام کے وقت میں شہر کی ایک مشہور شاہراہ سے گزر رہا تھا کہ یکایک میرے سامنے ایک کار تیز رفتاری سے گزرتی چلی گئی۔ جو شخص وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا اس کی ایک جھلک دیکھتے ہی میں حیرت کا ایک جھٹکا کھا کر رہ گیا۔ وہ یقیناً وہی شخص تھا جس کی تلاش میں مَیں گزشتہ ایک ہفتے سے اس شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے تعاقب میں اپنی جیپ دوڑا دی۔ مختلف سڑکوں اور شاہراہوں سے گزرتے ہوئے کار والا شخص مجھ سے کہیں ٹریفک کے ہجوم میں کھو گیا۔ میں محض اندازے کی بناء پر ایک ویران سڑک پر جا نکلا مگر وہ سڑک دور دور تک ویران پڑی ہوئی تھی۔ ابھی میں واپس مڑنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میری جیپ دو تین جھٹکے کھا کر رک گئی۔ میں نے بہتیرا جیپ کو دوبارہ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن جب جیپ ٹس سے مس نہ ہوئی تو مجبوراً میں نے اس کا تیل چیک کیا جو برابر تھا۔ میں نیچے اترا اور جیپ کا بونٹ اٹھا کر انجن چیک کرنے کے لیے اس پر جھک گیا۔ انجن بے حد گرم ہو چکا تھا اور میرے پاس پانی بھی نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں مگر دور دور تک آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے''۔ اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور سانسیں ہموار کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ ''اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں کہیں سے پانی ڈھونڈ کر لاتا۔ پس میں نے جیپ کا بونٹ گرا دیا اور پانی کی تلاش میں سڑک پر پیدل ہی آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سڑک پر کچھ دور آگے جانے کے بعد مجھے دائیں جانب کچھ فاصلے پر روشنیاں نظر آنے لگیں اور میں بلا سوچے سمجھے اسی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے پولیس کا مخبر سمجھ کر پکڑ لیا گیا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ بس اتفاقاً ہی ہو

گیا۔ ورنہ میرا شمار تو ان لوگوں میں ہوتا ہے جو لڑائی جھگڑے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں"۔ یہاں تک پہنچ کر جہانداد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" اس کے چپ ہوتے ہی جمشید خان نے بے چینی سے سوال کیا۔ "تم نے ان لوگوں پر قابو کیسے پایا۔ میمونہ کو کس طرح رہا کرایا اور راجو کا فون کیسے سن لیا؟"

جہانداد نے چائے کا آخری گھونٹ لینے کے بعد خالی پیالی ٹیبل پر رکھتے ہوئے بقیہ واقعات بھی اسے تفصیلاً بتانا شروع کر دیے۔ جمشید خان پورے غور وخوض کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی توجہ کا یہ عالم تھا جیسے کوئی بہت ہی سنسنی خیز اور دلچسپ فلم دیکھ رہا ہو۔ جہانداد جب سارے واقعات اسے بتا چکا تو تب اس نے سوال کیا۔

"وہ شخص کون تھا؟ جس کا تم تعاقب کر رہے تھے؟"

"وہ ایک فراڈیہ اور چالباز شخص ہے"۔ جہانداد نے بلاتردد جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گاؤں کے ایک غریب شخص کی نوجوان بیٹی کو بھگا لایا ہے"۔

"یہ تو پولیس کیس ہے"۔ جمشید خان متحیر انداز میں بولا۔ "کیا تم لوگوں نے اس کے خلاف کسی قریبی پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر درج کروائی تھی؟"

"بالکل کروائی تھی"۔ اس نے جواب دیا۔ "مگر پولیس والے عام لوگوں کی کب سنتے ہیں۔ چند دن جوش وخروش دکھانے کے بعد حسب معمول وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ تب مجھے اس کی تلاش میں نکلنا پڑا"۔

"کیا لڑکی تمہاری کچھ لگتی تھی؟" جمشید خان نے باقاعدہ تفتیشی انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... دور کی رشتہ دار لگتی ہے"۔ جہانداد نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر اس کا کوئی بھائی ہوتا تو شاید میں کبھی اس چکر میں نہ پڑتا۔ بس مجھ سے اس کے ماں باپ اور چھوٹی بہنوں کی حالت نہ دیکھی گئی۔ سو میں اس کی تلاش میں نکل پڑا"۔

"یقیناً لڑکی اپنی مرضی سے بھاگی ہو گی"۔ جمشید خان پرسوچ انداز میں بولا۔ "پولیس اس سلسلے میں ویسے بھی تمہاری مدد کرنے سے قاصر ہے۔ میرے خیال میں تو تم اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے"۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں"۔ جہانداد نے اس کی تائید میں کہا۔ "یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے"۔

اسی دوران ایک پروقار خاتون میمونہ کے ساتھ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی اور جمشید مسکرا کر اٹھ کھڑا ہو گیا۔ "آئیے امی جان! یہ ہے وہ بہادر نوجوان جس نے آپ کی بیٹی کی جان بچانے کے علاوہ خلیل بھائی جیسے مجرم کو پکڑوانے میں بھی میری مدد کی ہے"۔



اتنا کہہ کر وہ جہانداد کی طرف متوجہ ہوا۔ "اور جہانداد یہ ہے اس ناچیز کی امی مسز سلطانہ حمید"۔

جہانداد نے فوراً اٹھ کر مسز سلطانہ حمید خان کو آداب کہا تو وہ پرشفقت انداز میں مسکراتے ہوئے بولیں۔ "جیتے رہو بیٹا۔ ہمیشہ خوش رہو۔ میمونہ نے مجھے تمہارے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ مجھے تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ تم نے ہم پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ ہم مرتے دم تک نہیں چکا سکیں گے"۔

"نہیں ماں جی! اس میں بھلا احسان کی کون سی بات ہے"۔ جہانداد پرخلوص انداز میں بولا۔ "میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو شاید وہ بھی یہی کچھ کرتا۔ جو میں نے کیا ہے"۔

"یہ تو تمہاری انکساری ہے بیٹا"۔ مسز سلطانہ نے کہا۔ "ورنہ جو کام تم نے کیا ہے وہ کوئی بھائی ہی بہن کے لیے کر سکتا ہے"۔

"میمونہ میری بہن ہی تو ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ براہِ راست میمونہ سے مخاطب ہوا۔ "کیوں میمونہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟"

"آں......" میمونہ نے سر کو اثباتی جنبش دے کر اس کی تائید کی اور پھر شرما کر پلکیں جھکا دیں۔

مسز سلطانہ نے کہا۔ "بیٹے! یہ بول نہیں سکتی لیکن بہت ذہین ہے۔ ایک ایک بات سمجھتی ہے۔ گزشتہ رات یہ دیر گئے تک مجھے تمہاری باتیں بتاتی رہی ہے کہ کس طرح خلیل بھائی تم پر دھوکے سے وار کرنے لگا تھا اور پھر تم نے بروقت اسے گولی مار کر زخمی کر دیا"۔

"اوہ...... خوب یاد دلایا"۔ جمشید خان چونک کر بولا۔ "تم لوگ باتیں کرو میں ابھی آتا ہوں"۔

"کیوں...... کیا یاد آ گیا ہے تمہیں بیٹھے بٹھائے؟" مسز سلطانہ نے استفسار کیا۔

"میں ابھی آ کر بتاتا ہوں"۔ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

"تم محسوس مت کرنا بیٹے"۔ جمشید خان کے جانے کے بعد مسز سلطانہ نے جہانداد سے کہا۔ "دراصل جمشید خان ان پولیس والوں میں سے ہے جو فرض کو ہر رشتے پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اسی میمونہ کے سلسلے میں خلیل بھائی اسے متواتر تین روز تک دھمکیاں دیتا رہا لیکن جمشید نے اس کی کسی بات پر کان نہیں دھرا۔ اسے صاف کہہ دیا کہ وہ بے شک میمونہ کو کاٹ کر پھینک دے وہ اس کے بھائی کو رہا نہیں کر سکتا"۔

"ایک پولیس آفیسر کو ایسا ہی ایماندار ہونا چاہیے"۔ جہانداد بولا۔ "لیکن میمونہ کے سلسلے میں

اسے اس سختی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خلیل بھائی جیسے لوگ فطرتاً بالکل درندے ہوتے ہیں۔ بہرکیف خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میمونہ اس کی درندگی سے محفوظ رہی۔ اب آئندہ کے لیے احتیاط ضروری ہے''۔

''ہم تو پہلے بھی بہت محتاط رہتے تھے''۔ مسز سلطانہ نے کہا۔ ''مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ اب ہم میمونہ کو گھر میں قید کر کے تو نہیں رکھ سکتے۔ ضروریاتِ زندگی کے لیے کبھی کبھار گھر سے نکلنا ہی پڑتا ہے''۔

''تو پھر ایسا کریں میمونہ کے ساتھ کوئی مسلح باڈی گارڈ بھیج دیا کریں''۔ جہانداد نے مشورہ دیا۔ ''اس طرح کوئی بھی مجرم باآسانی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گا''۔

'اب تو یہی کرنا پڑے گا''۔ وہ ایک طویل سانس خارج کرتی ہوئی بولی۔ ''آج ہی جمشید سے بات کرتی ہوں کہ وہ کسی......''

ایسے ہی وقت جمشید خان پریشانی کے عالم میں اندر داخل ہوا اور مسز سلطانہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

''کیا بات ہے؟'' جہانداد نے فوراً استفسار کیا۔ ''تم بہت پریشان لگ رہے ہو خیر تو ہے؟''

''خیر کہاں ہے میرے دوست''۔ وہ افسردگی سے بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تھانے پر کچھ افراد نے حملہ کیا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف خلیل بھائی بلکہ ہیڈ کانسٹیبل راجو بھی ہلاک ہو گیا ہے۔ مجھے فوراً تھانے پہنچنا ہے''۔

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' جہانداد نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ ''کیا جیپ آنے کے بعد چلا جاؤں یا تمہاری واپسی کا انتظار کروں؟''

''تم اتنی جلدی نہیں جاسکتے''۔ جمشید خان کی بجائے اس کی ماں نے جواب دیا۔ ''کچھ دن ہمارے مہمان بن کر رہو۔ میمونہ بہت اچھے اچھے کھانے پکاتی ہے''۔

''ہاں امی ٹھیک کہہ رہی ہے''۔ جمشید خان ماں کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''تم ابھی جا کر کیا کرو گے؟ چند دن ٹھہر کر چلے جانا''۔

''ٹھیک ہے جیسے تم لوگوں کی مرضی''۔ جہانداد اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''میں چند روز تک ٹھہر جاتا ہوں''۔

''او کے...... پھر مجھے اجازت دیجیے۔ اگر فرصت ملی تو لنچ کے ٹائم پہنچ جاؤں گا ورنہ میرا انتظار مت کرنا''۔ اتنا کہہ کر وہ بہ عجلت چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

''یہ پولیس کی نوکری بھی بس جی کا جنجال ہی ہے''۔ اس کے جانے کے بعد مسز سلطانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ بس ہر وقت مجرموں کے پیچھے بھاگتے پھرو''۔



''ارے اتنی اچھی نوکری ہے ماں جی...... آپ پھر بھی شکوہ کررہی ہیں''۔ جہانداد خوشدلی سے بولا۔ ''اوپر والے کا شکر ادا کریں جس نے آپ کو اتنے بڑے افسر کی ماں بنایا ہے''۔

''رہنے دو میاں''۔ وہ بھی ترکی بہ ترکی بولی۔ ''بڑے افسر کو لمحہ بھر تو گھر میں رہنے کی فرصت نہیں ملتی اور......''

معاً باہر گلی میں فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی اور مسز سلطانہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

جہانداد فوراً باہر کی طرف بھاگا۔ سامنے سے ایک نوکر دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

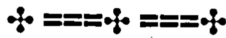
''وہ...... وہ صاحب کی گاڑی پر کسی نے گولیاں چلائی ہیں''۔ نوکر بدحواسی کے عالم میں بولا۔ ''پتا نہیں صاحب زندہ بھی بچا ہے یا......''

''نہیں......'' پیچھے سے مسز سلطانہ جو بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''یہ نہیں ہوسکتا''۔

اتنا کہہ کر وہ لہراتی ہوئی گر پڑی اور میمونہ آس...... آس کرتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔

''تم ان ماں بیٹی کو سنبھالو''۔ جہانداد ریوالور نکالتے ہوئے چلایا۔ ''میں صاحب کو دیکھتا ہوں''۔

یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی طرف بھاگا۔ گلی میں پہنچتے ہی جو نظارا اس کی آنکھوں نے دیکھا اس نے ایک لمحے کے لیے اسے شل کردیا۔ جمشید خان گاڑی کے اسٹیئرنگ وہیل پر لہولہان حالت میں جھکا ہوا تھا اور گاڑی کی فرنٹ اسکرین متعدد جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ جمشید خان کے بدن سے بہنے والا خون گاڑی کی فرنٹ سیٹ کو رنگین کرتا جارہا تھا۔



یہ شاک صرف لمحاتی تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے برق رفتاری سے حرکت کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور جمشید خان کو سائیڈ والی سیٹ پر دھکیلنے کے بعد اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ گاڑی کا صرف سامنے والا شیشہ (فرنٹ اسکرین) ہی ناکارہ ہوا تھا باقی گاڑی بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اگنیشن میں چابی بھی موجود تھی۔ جہانداد نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا کھلی سڑک پر پہنچ گیا۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے ٹریفک کا رش معمول سے بہت کم تھا۔ برق رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا وہ مختلف شاہراہوں سے گزرتا چلا گیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جمشید خان زندہ ہے کہ مردہ؟ بس ایک امید کے سہارے وہ ہسپتال کی طرف اڑا چلا جارہا تھا۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ

خود قانون سے بھاگا ہوا ایک مجرم ہے۔ گو کہ اس کا حلیہ اور لباس یکسر مختلف تھا مگر خدشہ تو پھر بھی جگہ موجود تھا۔ راستے میں کہیں بھی پہچان لیے جانے کی صورت میں وہ پھنس سکتا تھا۔ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال کے نزدیک پہنچتے ہی اس نے ایک نظر جمشید خان کے لہولہان وجود پر ڈالی اور پھر ہسپتال کے صدر دروازے سے گاڑی گزارتا ہوا اندر لے گیا۔ گاڑی سے اتر کر وہ بھاگتا ہوا ایمرجنسی روم میں داخل ہوا اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو سانحے کی اطلاع دینے کے بعد پلٹ کر واپس گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔

دس منٹ کے اندر جمشید خان کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی میں شفٹ کر دیا گیا اور جہانداد ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں وہ جمشید خان کی زندگی کی دعائیں کر رہا تھا اور ان مجرموں کے متعلق بھی سوچ رہا تھا جنہوں نے دن دیہاڑے ایک پولیس آفیسر کو عین اس کے گھر کے سامنے گولیوں سے چھلنی کر ڈالا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مجرم نہ صرف بااثر ہیں بلکہ ان کی معلومات کے ذرائع بھی بہت فعال ہیں۔ ایک ہی رات میں انہوں نے تھانے پر حملہ کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ قانون ان کے سامنے بے بس ہے۔ راجو اور خلیل بھائی کو بھی شاید اسی مقصد کے لیے قتل کیا گیا تھا۔ مجرم اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ پولیس کے پاس ان کے سراغ کا واحد ذریعہ راجو اور خلیل بھائی ہی تھے جنہیں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ ٹھکانے لگا دیا گیا۔

ویٹنگ روم میں بیٹھا وہ یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ معاً دو اخباری رپورٹرز اندر داخل ہوئے اور جہانداد سے واقعے کی تفصیل پوچھنے لگے۔ دونوں رپورٹرز موقع واردات سے ہو کر آئے تھے اور انہوں نے وہاں گھر کے ملازموں سے جہانداد کے بارے میں معلوم کر کے آئے تھے۔ جہانداد کو جتنا کچھ معلوم تھا وہ اس نے بلا جھجک انہیں بتا دیا مگر رپورٹرز کی تشفی نہ ہو سکی اور انہوں نے حسب معمول بال کی کھال اتارنے کے لیے سوالات شروع کر دیے۔

''جناب''۔ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔ ''ایس پی صاحب پر یہ قاتلانہ حملہ کسی ذاتی دشمنی کا نتیجہ تو نہیں ہے؟''

''مجھے جتنا کچھ معلوم تھا۔ وہ میں نے آپ لوگوں کو بتا دیا ہے''۔ جہانداد نے قدرے ناگوار انداز میں کہا۔ ''زیادہ تفصیلات مجھے معلوم نہیں ہیں''۔

''کیا ایس پی صاحب بچ گئے ہیں؟'' دوسرے رپورٹر نے اس کی ناگواریت کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ انہیں زندہ حالت میں ہسپتال لائے تھے؟''

''ایس پی صاحب ابھی تک آپریشن تھیٹر میں ہیں''۔ جہانداد بولا۔ ''بہتر ہوگا آپ ڈاکٹر سے تفصیلات معلوم کریں''۔



''میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ ایس پی صاحب کو زندہ حالت میں......''

''عجیب احمقانہ سوال ہے''۔ جہانداد نے رپورٹر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے وہ زندہ ہوں گے ورنہ ڈاکٹرز آپریشن روم میں کیا جھک مار رہے ہیں؟''

''آپ شاید سوال کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے''۔ رپورٹر برا منائے بغیر بولا۔ ''میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ کیا اس وقت ایس پی صاحب کی سانسیں چل رہی تھیں؟''

''میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ان کی سانسیں چیک کر سکتا۔ انہیں ہسپتال لانا ضروری تھا اس لیے میں اندھا دھند کار دوڑاتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔ اب ڈاکٹر باہر نکلے گا تو معلوم ہوگا کہ ایس پی صاحب کس حال میں ہیں''۔ جہانداد نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کا ایس پی صاحب سے کیا رشتہ ہے؟'' پہلے رپورٹر نے دوبارہ سوال کیا۔

''انسانیت کا''۔ جہانداد نے عجیب فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ ''اس رشتے پر اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہے تو فرمائیں؟ میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا''۔

''آپ غالباً برا......'' رپورٹر نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر جہانداد ڈاکٹر کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' جہانداد نے بے تابی سے بولا۔ ''کیا ایس پی صاحب......''

''پلیز''۔ ڈاکٹر نے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی''۔ وہ زندہ ہے لیکن خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے اور بدقسمتی سے اس کے گروپ کا خون بہت نایاب ہے۔ اگر فی الفور بندوبست نہ ہو سکا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے''۔

''کون سا گروپ ہے ڈاکٹر صاحب؟'' جہانداد نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''اے بی نیگیٹو''۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''پھر تو...... بات ہی کوئی نہیں''۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ''میرے خون کا گروپ بھی اے بی نیگیٹو ہے اور میں بخوشی خون کا عطیہ دینے کے لیے تیار ہوں''۔

''تو چلیے میرے ساتھ''۔ ڈاکٹر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''دیر مریض کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے''۔

''تو پھر جلدی کریں ڈاکٹر صاحب''۔ جہانداد اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ایس پی صاحب کو بچانے کے لیے جتنا خون چاہیے لے لیں''۔

اس کے بعد تین گھنٹوں کی انتھک کوششوں سے ڈاکٹرز جمشید خان کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دوران نہ صرف جمشید خان کے اہلِ خانہ بلکہ پولیس کے چند ایک آفیسر بھی ہسپتال پہنچ چکے

تھے۔ ان آفیسر نے جہانداد سے سوالات بھی کیے تھے اور اس کی بہادری کی تعریف بھی دل کھول کر کی تھی۔ خاص طور پر جمشید خان کی ماں مسز سلطان حمید خان تو جہانداد پر قربان ہوئی جا رہی تھی۔ وہ بار بھی "آں......آں" کرتے ہوئے بار بار جہانداد کا شکریہ ادا کیے جا رہی تھی۔

"میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے"۔ مسز سلطانہ پُرخلوص انداز میں کہہ رہی تھی "کہ میرے دو بیٹے ہوتے۔ آج یہ خواہش بھی پوری ہوگئی ہے۔ خدا نے مجھے تمہاری صورت میں دوسرا بیٹا دے دیا ہے"۔

"ماں جی! میں نے کوئی کمال نہیں کیا ہے"۔ جہانداد نے انکساری سے کہا۔ "صرف اپنا فرض پورا کیا ہے۔ میرے خون کے چند قطروں نے اگر جمشید خان کی زندگی بچالی ہے تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ بار بار میرا شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں"۔

"بات تو بہت بڑی ہے بیٹے"۔ مسز سلطانہ نے ممنونیت سے کہا۔ "تم نے جو احسان مجھ پر کیا ہے میں شاید زندگی بھر اس کا بدلہ نہ دے سکوں لیکن اتنا تو کر سکتی ہوں کہ تمہیں عمر بھر ایک ماں کا پیار دوں"۔

"میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گا"۔ جہانداد نے جواب دیا۔ "ایک ماں کے پیار سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"آں......آں"۔ اچانک میمونہ نے جہانداد کو اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اشاروں کی زبان میں اسے کچھ سمجھانا شروع کر دیا۔

"میں سمجھ گیا"۔ جہانداد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ماں کے ساتھ ایک بہن کی دعاؤں کی بھی مجھے ضرورت پڑے گی۔ ویسے بھی تُو میرے لیے کسی طرح بھی سکینہ سے کم نہیں ہے"۔

"سکینہ غالباً تمہاری بہن کا نام ہے"۔ مسز سلطانہ نے پُرشفقت انداز میں سوال کیا اور جہانداد نے اثبات میں سرہلا دیا۔

اس دوران مسز سلطانہ نے جمشید خان کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر سے بات کی تو وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔

"آج اس سے کوئی بھی نہیں مل سکتا۔ میں آپ کے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں لیکن فی الحال ایس پی صاحب سکون آور دواؤں کے زیر اثر ہیں۔ بہرکیف آپ کو پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خطرے سے بالکل باہر ہیں۔ ان شاء اللہ کل صبح تک گفتگو کرنے کے بھی قابل ہو جائیں گے"۔

"ہوں"۔ وہ ایک آہ خارج کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کی بات بجا ہے مگر میں اسے دور سے



دیکھ تو سکتی ہوں ناں؟"

"آئیے"۔ ڈاکٹر بادلِ نخواستہ بولا۔ "لیکن صرف ایک نظر...... آپ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہر سکتیں کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے کمرے کے سامنے پولیس گارڈز کھڑے کر دیے گئے ہیں"۔

"میں ایک منٹ سے زیادہ وہاں نہیں رکوں گی"۔ مسز سلطانہ نے جواب دیا۔ "آپ فکر مند نہ ہوں"۔

"اوکے......" ڈاکٹر اثبات میں سرہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد مسز سلطانہ اور میمونہ کھڑکی سے بے ہوش پڑے ہوئے جمشید خان کا نظارہ کر رہی تھیں۔ سفید پٹیوں میں لپٹا وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ بستر کے ساتھ ہی اسٹینڈ پر خون کی تھیلی لٹکی ہوئی تھی۔ غالباً اسے بدستور خون دیا جا رہا تھا۔ میمونہ نے اپنے اکلوتے بھائی کی حالت دیکھ کر آں۔ اوں کرنے کی کوشش کی تو مسز سلطانہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ اس کی اپنی کیفیت بھی میمونہ سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ دوڑتی ہوئی جائے اور اپنے اکلوتے بیٹے کو سینے سے لگا لے۔ اس کی پیشانی پر بے شمار بوسے ثبت کرتی جائے...... شفقت مادری کا ایک سمندر اس کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن مجبوری آڑے آ رہی تھی اس لیے وہ ایک منٹ سے زیادہ وہاں نہ ٹھہر سکی اور میمونہ کا ہاتھ پکڑ کر واپس جہانداد کے پاس پہنچ گئی۔

"مل آئیں ماں جی"۔ جہانداد نے اس کے بیٹھتے ہی سوال کیا۔ "کس حال میں ہے وہ؟"

"بس ایک جھلک دیکھی ہے بیٹے"۔ وہ تاسف سے بولی۔ "سکون آور دواؤں کے زیر اثر سو رہا ہے۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اسے جلد سے جلد صحت یاب کرے۔ ویسے ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ کل صبح تک وہ بولنے کے قابل ہو جائے گا"۔

"کل صبح کون سی دور ہے ماں جی؟" جہانداد تسلی آمیز انداز میں بولا۔ "اللہ تعالیٰ نے کرم کیا ہے۔ اس کی جان بچ گئی ہے ورنہ مارنے والوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی"۔

"اس لیے تو میں اکثر اس سے کہتی رہتی ہوں کہ پولیس کی نوکری میں کیا رکھا ہے؟" وہ شاکی انداز میں کہنے لگی۔ "اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ صرف زمینوں سے اتنا آتا ہے کہ بغیر کوئی کام کیے شاندار زندگی بسر کر سکتے ہیں ہم"۔

"ماں جی! کیا پولیس کی نوکری کا مقصد صرف پیسہ کمانا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو اور کیا ہے؟...... لوگ پیسے کی خاطر ہی تو سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں"۔ وہ پُرزور انداز میں بولی۔ "ورنہ کس کو پڑی ہے کہ دن رات خطرناک مجرموں کے پیچھے بھاگتا پھرے۔ جمشید نے اپنے ساتھ ساتھ ہم ماں بیٹی کی زندگی بھی داؤ پر لگا رکھی ہے۔ لاکھ منت ساجت کرتی ہوں مگر وہ سنتا ہی

نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ......"

معاً ایک پولیس انسپکٹر دندناتا ہوا اندر داخل ہوا مسز سلطانہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

"جہانداد کس کا نام ہے بھئی؟" پولیس انسپکٹر نے روایتی انداز میں پوچھا اور جہانداد کا دل کسی انجانے خدشے کے تحت یکبارگی دھڑک اٹھا۔ پولیس انسپکٹر کے موٹے بھدے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور وہ جہانداد کو ناگوار انداز میں گھور رہا تھا۔

"جی فرمایئے۔ میرا نام جہانداد ہے"۔ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا"۔ انسپکٹر نے جواب دیا۔ "چلو...... جلدی کرو"۔

"کس جرم میں جناب؟" اس نے پریشانی کے عالم میں استفسار کیا۔ "کیا...... کیا ہے میں نے؟"

"زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے"۔ انسپکٹر درشت لہجے میں بولا۔ "جو کہا جا رہا ہے......"

"انسپکٹر صاحب! تم ہوش میں تو ہو؟" مسز سلطانہ نے قطع کلامی کی۔ "جہانداد ہمارا مہمان ہے۔ تم اسے کس جرم میں تھانے لے جانا چاہتے ہو؟ اس نے تو اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جمشید خان کی جان بچائی ہے"۔

"اس مہمان کے بارے میں آپ کتنا کچھ جانتی ہیں بیگم صاحبہ؟" انسپکٹر نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ "یہ کون ہے۔ کہاں کا رہنے والا ہے اور پشاور کیوں آیا ہے؟"

"احمقانہ باتیں مت کرو"۔ مسز سلطانہ غصے میں آ کر بولی۔ "میں نے کہہ دیا ہے۔ تم اسے نہیں لے جا سکتے"۔

"کیوں نہیں لے جا سکتا"۔ انسپکٹر کو بھی غصہ آ گیا۔ "یہ ایک مشتبہ شخص ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی جیپ کی باڈی پر گولیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ اس کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے"۔

"یہ میرا نہیں جمشید خان کا حکم ہے۔ تم اسے نہیں لے جا سکتے"۔ اس نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ "اب تم جاؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ بات آئی جی صاحب کے کانوں تک پہنچ جائے گی"۔

"آپ قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش مت کریں ورنہ"۔

"میں نہیں...... تم قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کر رہے ہو"۔ وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔



جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے"۔

"آپ زیادتی کر رہی ہیں بیگم صاحبہ"۔ انسپکٹر نے جھنجھلا کر کہا۔ "خواہ مخواہ ایک مشتبہ شخص کو پناہ دے رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ انہی مجرموں کا ساتھی ہو جنہوں نے ایس پی صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا"

"اس کا فیصلہ ایس پی صاحب خود کریں گے۔ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ"۔ وہ حتمی انداز میں بولی اور انسپکٹر غصے میں ہوا باہر نکل گیا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ انسپکٹر کے جانے کے بعد وہ جہانداد سے ہوئی۔ "شاید انسپکٹر کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے"۔

"اصل میں غلطی میری ہے"۔ جہانداد نادم ہو کر بولا۔ "کیونکہ میں نے ابھی تک آپ لوگوں کو بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں ہے ورنہ انسپکٹر میرے بارے میں کبھی بھی مشکوک نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اب میں آپ لوگوں کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا"۔

"ہمیں تمہارے بارے میں جان کر خوشی ہوگی"۔ مسز سلطانہ نے جواب دیا۔ "لیکن ابھی نہیں۔ جب جمشید مکمل صحت یاب ہو کر گھر پہنچ جائے گا تو پھر ہم سب مل کر تمہاری سرگزشت سنیں گے"۔

وقتی طور پر مصیبت ٹل جانے کے باوجود جہانداد پریشان تھا۔ وہ ایک اہم سیاسی شخصیت کو قتل کر چکا تھا۔ اس کا بھید کھلنے کے بعد جمشید خان جیسا اعلیٰ افسر بھی اس کی مدد کرنے سے قاصر ہو جاتا۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ چپ چاپ کسی کو بتائے بغیر یہاں سے نکل جائے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی جیپ تھانے میں تھی اور بغیر جمشید خان کی مدد کے وہ وہاں سے جیپ نہیں نکال سکتا تھا۔ اسے بہرکیف جمشید خان کے صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا ہی تھا۔ جمشید خان کو سنانے کے لیے وہ ایک فرضی کہانی گھڑ چکا تھا۔



پانچویں دن جمشید خان کی استدعا پر اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ تفتیشی افسر کو بیان دیتے ہوئے اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ قاتلانہ حملہ کرنے والوں کے بارے میں مکمل لاعلم ہے۔ جہانداد سے بھی اس کے سامنے ہی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ اس نے بھی حملہ آوروں کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ مگر تفتیشی انسپکٹر اس کے بیان سے مطمئن نہ ہو سکا تو تب ایس پی جمشید پولیس والوں کے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔ "انسپکٹر! یہ میرا مہمان ہے۔ اس نے نہ صرف میری

بہن کو خلیل بھائی جیسے درندے سے چھڑایا ہے بلکہ میری جان بچانے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ تم بے
اس کے متعلق مشکوک ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا مجرموں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔
یہ ایک شریف انسان ہے۔ تم اپنی کارروائی کرو یہ میرا حکم ہے''۔

''آپ کے حکم سے مجھے انکار نہیں ہے سر''۔ انسپکٹر نے مؤدبانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔
''لیکن آپ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر ہونے کے ناتے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ پولیس کی تفتیش
شک سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے ہی قدم پر میری تفتیش کے سامنے رکاوٹ کھڑی کردی گئی تو شاید میں
مجرموں تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ پلیز آپ''۔

''بس''۔ جمشید خان نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا۔ ''یہ کیس اب میں خود ہینڈل کروں گا۔ اب تم جا
سکتے ہو اور ہاں اب اپنے آپ کو اس کیس سے آزاد سمجھو''۔

''او کے سر''۔ انسپکٹر نے بادل نخواستہ اسے سلیوٹ کیا اور مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل
گیا۔

''میرے خیال میں جناب مجھے فی الفور یہاں سے نکل جانا چاہیے''۔ انسپکٹر کے جاتے ہی
جہانداد پریشانی کے عالم میں بولا۔ ''لوگ سچ کہتے ہیں کہ پولیس والوں کی دوستی اچھی نہ دشمنی''۔

''تمہارا یوں بھاگ جانا تو مجھے بھی مشکوک کر دے گا''۔ جمشید خان نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ویسے تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی بھی ٹیڑھی نگاہوں
سے نہیں دیکھ سکتا اور ابھی تمہاری جیپ بھی تو منگوانی ہے''۔

''پھر بھی مجھے جانا تو پڑے گا ناں''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''میں کب تک آپ کے ہاں
رہوں گا۔ وہاں گاؤں میں شدت سے میرا انتظار ہو رہا ہوگا''۔

''چلے جانا بھئی چلے جانا۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا، لیکن یہ انسپکٹر جب تک مطمئن نہیں ہوگا
تمہارا یہاں سے جانا ٹھیک نہیں ہوگا...... اور ہاں''۔ جمشید خان نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ انسپکٹر تمہاری
جیپ کی باڈی پر گولیوں کے نشانات کی بات کیوں کر رہا تھا؟''

جمشید خان کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے تو جہانداد کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا مگر اس نے
چہرے کے تاثرات نارمل رکھے۔ اس کی ذرا سی بے احتیاطی اس کا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔

''میں نہیں جانتا''۔ اس نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میری جیپ
رات سے تھانے میں کھڑی ہے۔ جس رات تھانے پر حملہ ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے جیپ کی آڑ میں
مجرموں نے یا پھر پولیس والوں نے فائرنگ کا تبادلہ کیا ہو اور یوں جیپ کی باڈی میں کچھ گولیاں لگی
ہوں''۔



''ویری گڈ''۔ جمشید خان نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''بالکل یہی بات ہوگی...... لیکن''۔
اس نے الجھے ہوئے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور جہانداد کا دل ایک بار پھر پہلو میں
...

''لیکن...... کیا؟'' آخر کار اس نے متحیر انداز میں پوچھا۔
''یہ بات تمہیں انسپکٹر کو بھی بتانا چاہیے تھی''۔ جمشید خان نے جواب دیا۔ ''وہ احمق خواہ مخواہ
تمہارے بارے میں مشکوک ہو رہا تھا''۔
''میں آپ کا لحاظ کر رہا تھا''۔ جہانداد نے کہا۔ ''ورنہ اسے ضرور کھری کھری سناتا۔ بہر کیف
اب اسے ضرور بتاؤں گا''۔
''اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''میں اسے خود بتادوں گا''۔
''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی''۔ جہانداد اجازت طلب انداز میں بولا۔ ''اب میں چلوں
ہوسکتا ہے دیر سے پہنچوں اس لیے فکر نہ کرنا''۔
''کیا تمہیں باہر جانے کا ارادہ ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔
''ہاں...... رحیم خان کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''پہلے ہی میرا بہت وقت
ضائع ہوچکا ہے۔ چالیس ہزار روپے کی رقم کچھ کم تو نہیں ہوتی ناں؟...... نہ جانے وہ کمینہ کس بل میں
چھپا ہوا ہے؟ رقم نہ ملی تو میری بہن کی شادی نہیں ہوسکے گی''۔
''کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے تمہیں اپنا صحیح نام و پتا بتایا ہوگا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔
ایسے لوگ اکثر فراڈیے ہوتے ہیں''۔
''نہیں...... میں نہیں مان سکتا''۔ جہانداد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ گزشتہ ایک سال سے
ہمارے علاقے میں رہائش پذیر ہے اور شادی بھی اس نے وہیں سے کی ہے۔ اس کی بیوی ہمارے
ہی گاؤں کی ہی رہنے والی ہے۔ رحیم خان دھوکے باز نہیں ہوسکتا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ پشاور آ کر
کسی مصیبت میں پھنس گیا ہو''۔
''وہ پشاور کب آیا تھا؟''
''جناب! میں آپ کو ساری کہانی سنا چکا ہوں''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''رحیم خان کو پشاور
آئے ایک ماہ ہونے والا ہے اور وہ یہاں لکڑی لے کر آیا تھا۔ غالباً کسی فرنیچر فیکٹری کے ساتھ اس کا
معاہدہ ہے۔ وہ ہمارے علاقے سے لکڑی خریدتا ہے۔ آرہ مشین سے خریدی ہوئی لکڑی کے تختے بنواتا
ہے پھر فروخت کرنے کے لیے یہاں لے آتا ہے''۔
''تم اس کی بیوی سے مل کر آئے تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

"نہیں"۔ وہ متاسف انداز میں بولا۔ "کاش میں اس سے مل کر آتا تو شاید یوں خوار ہونا نہ پڑتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟...... کیا منہ لے کر واپس جاؤں گا؟ ماں سے کیا کہوں گا۔ چچا کو کیا بتاؤں گا؟"

"دیکھو...... پریشان ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے"۔ جمشید خان اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "غلطی تمہاری اپنی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم لوگوں نے ایک اجنبی شخص کو ادھار لکڑی دی اور دوسری بات یہ ہے کہ رحیم خان کے بارے میں بغیر کچھ معلوم کیے یہاں چلے آئے۔ حتیٰ کہ تمہیں اس فرنیچر فیکٹری کا نام تک معلوم نہیں ہے۔ جس کے ساتھ بقول تمہارے رحیم خان کا معاہدہ ہے۔ ایسی صورت حال میں تم اسے کیسے ڈھونڈ سکتے ہو؟ یہ اتنا بڑا شہر ہے یہاں تو کئی رحیم خان ہوں گے۔ بہرکیف میں اپنی سی کوشش کروں گا۔ ہوسکتا ہے کوئی معجزہ ہوجائے"۔

"نہیں جناب رہنے دیں"۔ وہ مشکور انداز میں بولا۔ "آپ پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ میں خود اسے تلاش کرلوں گا۔ اگر نہ ملا تو واپس جاکر اس کی بیوی سے اس کا پتا ٹھکانا معلوم کروں گا"۔

"ٹھیک ہے جاؤ ڈھونڈو...... لیکن ذرا احتیاط رہنا"۔ جمشید خان نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "نہ صرف مجرموں کی تم پر نظر ہوگی بلکہ پولیس کا بھی کوئی نہ کوئی جاسوس تمہاری تاڑ میں ہوگا"۔

"آپ بے فکر رہیں۔ مجھے اپنی حفاظت کرنا خوب آتی ہے۔ ویسے بھی میں مسلح ہوکر جاؤں گا"۔

اتنا کہہ کر جہانداد باہر نکل گیا اور جمشید خان نے سائیڈ میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھالیا۔



جہانداد ایس پی جمشید خان کے بنگلے سے نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور شہر کے مصروف علاقے میں پہنچ کر اُتر گیا۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک پولیس والا نہایت احتیاط کے ساتھ اس کا تعاقب کررہا تھا۔ گوکہ اس نے اپنی طرف سے ایک گھڑی گھڑائی کہانی سنا کر ایس پی جمشید خان کو مطمئن کردیا تھا مگر یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ جمشید خان ایک ذہین آفیسر تھا اس نے بڑی توجہ سے اس کی کہانی سنی تھی جس میں کئی جھول تھے لیکن اس نے جہانداد کو ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ایک پولیس والا تھا اور پولیس والوں کی ہی طرح جہانداد کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔ یہ سادہ لباس والا پولیس مین جمشید خان کے حکم سے ہی جہانداد کا پیچھا کر رہا تھا۔ جمشید خان نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ جہانداد کی کڑی نگرانی کرے مگر جہانداد کے کسی بھی معاملے میں ٹانگ نہ اڑائے۔



جہانداد اپنے تعاقب سے بے خبر سوچوں میں کھویا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دونوں کے درمیان پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ اس وقت وہ شہر کے صنعتی علاقے سے گزر رہا تھا اردگرد چھوٹی بڑی فیکٹریوں کے سائن بورڈ دیکھتے ہوئے معاً وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ بائیں ہاتھ ایک فرنیچر فیکٹری کا سائن بورڈ نظر آرہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا اور پھر سڑک کراس کرتا ہوا فیکٹری کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر جاکر اس نے فیکٹری کے مالک سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو چوکیداروں سے اسے معلوم ہوا کہ مالک تو ابھی تک پہنچا ہی نہیں تاہم منیجر اپنے آفس میں موجود ہے۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے وہ منیجر کے آفس میں داخل ہوگیا۔

"جی فرمائیے"۔ منیجر اسے دیکھتے ہی کاروباری انداز میں بولا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"بہت شکریہ جناب...... لیکن میں یہاں کسی کاروباری سلسلے میں نہیں آیا۔ بلکہ کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں"۔ اس نے خوش اخلاقی سے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔ "امید ہے آپ مجھ سے تعاون فرمائیں گے"۔

"پوچھیں جی۔ کیا پوچھنا ہے؟" منیجر نے بیزار انداز میں سوال کیا۔

"کسی رحیم خان کو جانتے ہیں آپ؟...... وہ فرنیچر فیکٹریوں کو لکڑی سپلائی کرتا ہے"۔ جہانداد نے اس کی عدم دلچسپی کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں"۔ منیجر نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمیں جتنے بھی لوگ لکڑی سپلائی کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا نام رحیم خان نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں کہ سیدھے خیبر فرنیچر فیکٹری چلے جائیں۔ امید ہے وہ لوگ جانتے ہوں گے"۔

"بہت شکریہ جناب"۔ جہانداد الٹے قدموں واپس مڑتے ہوئے بولا۔ "تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہوں"۔

فیکٹری سے نکلتے ہوئے غیرارادی طور پر اس کی نگاہ ایک نوجوان شخص پر پڑی اور وہ چونک اٹھا۔ اس کے لبوں پر ایک مضحکہ خیز مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

"مان گئے جمشید خان"۔ وہ زیرلب خودکلامی کے انداز میں بولا۔ "تو ایک پولیس والا ہے تو میں بھی ایک فوجی ہوں۔ تیری چال تجھ پر نہ پلٹ دی تو میرا نام بدل دینا"۔

اپنا شک دور کرنے کے لیے اس نے دوبارہ ایک سرسری سی نگاہ اس مشکوک نوجوان پر ڈالی اور تیزی سے ایک قریبی مارکیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چند دکانیں گھومنے کے بعد اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ نوجوان شخص واقعی اس کا تعاقب کررہا تھا مگر جہانداد نے اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا

تھا کہ وہ نظر میں آچکا ہے تاہم جہانداد کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جمشید خان کا شک دور کرنے کے لیے رحیم خان کی تلاش کا ڈرامہ جاری رکھے۔ مارکیٹ سے نکل کر وہ دوبارہ صنعتی علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوپہر تک اس نے مزید تین فرنیچر فیکٹریوں سے فرضی رحیم خان کے متعلق معلومات حاصل کیں مگر اسے ہر جگہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ آخری فیکٹری میں اسے رحیم خان نامی ایک شخص ملا تھا لیکن وہ فیکٹری میں کام کرنے والا ایک کاریگر تھا۔

آخری فیکٹری سے وہ بالکل تھکے تھکے سے انداز میں نکلا تھا اور قدرے جھنجلایا ہوا بھی تھا۔ یوں جیسے کسی سے اس کی تلخ کلامی ہوئی ہو۔ دراصل تعاقب کرنے والے شخص کو وہ ایک ایسا تاثر دینا چاہتا تھا جیسے وہ سچ مچ کسی کو تلاش کرتے کرتے جھنجلا چکا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ جو کوئی بھی ہے اس کا تعلق جمشید خان سے ہے اور یہ جمشید خان کو جلد یا بدیر ضرور رپورٹ دے گا۔

فیکٹری سے نکلنے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی روکی اور تعاقب کرنے والے کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

"کہاں چلنا ہے صاحب؟" اس کے بیٹھنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلو"۔ اس نے بلاتردد جواب دیا۔ "جہاں کا کھانا شاندار ہو"۔

"ضرور صاحب جی"۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

جہانداد نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو تعاقب کرنے والا نوجوان ایک خالی ٹیکسی روک چکا تھا۔ "احمق کہیں کا"۔

اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر اطمینان سے آنکھیں موند لیں۔ بیس منٹ کے بعد ٹیکسی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

"لیجیے صاحب"۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "یہ شہر کا بہترین ہوٹل ہے۔ یہاں نہ صرف بہترین کھانا ملتا ہے بلکہ یہاں کے ریٹ بھی مناسب ہیں۔ گاہکوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا ہے"۔

"بہت مہربانی"۔ جہانداد اسے کرایہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے کسی ایسے ہی ہوٹل کی تلاش تھی"۔

ہوٹل کے مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اپنے عقب میں دیکھا تو تعاقب کرنے والا نوجوان ایک خوانچہ فروش کے پاس رکا ہوا تھا۔ وہ شاید ایسا جہانداد کو دھوکا دینے کے لیے کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ اس کی حماقت پر مسکراتا ہوا ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ ہال میں پہنچنے کے بعد اس نے ایک پرسکون گوشے میں سیٹ سنبھال لی۔

"جی صاحب"۔ فوراً ہی ایک ویٹر اس کے پاس پہنچ کر بولا۔ "کیا لینا پسند کریں گے؟"



"بھئی میں نے اس ہوٹل کی بڑی تعریف سنی ہے"۔ جہانداد گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بولا۔ "ایسا کرو کہ پہلے کھانا لے آؤ"۔

"بالکل ٹھیک سنا ہے صاحب"۔ ویٹر نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "یہاں ایک دم فسٹ کلاس کھانا ملتا ہے۔ حکم کریں کیا کھانا پسند کریں گے؟"

"جو کھانا سب سے لذیذ پکتا ہے۔ وہ لے آؤ"۔

"یہاں کا ہر کھانا لذیذ ہوتا ہے صاحب"۔ ویٹر نے جواب دیا۔ "مگر بریانی اور کڑاہی گوشت تو لاجواب ہوتے ہیں"۔

"تو ٹھیک ہے بریانی ہی لے آؤ"۔ جہانداد نے مسکرا کر کہا اور ویٹر اثبات میں سر ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ پانچ منٹ کے اندر ویٹر نے اس کے سامنے ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ اس نے خوب ڈٹ کر کھایا اور پھر پانی پینے کے بعد ویٹر کو گرما گرم چائے لانے کے لیے کہہ دیا۔ ویٹر نے فوراً اس کے سامنے چائے لا کر رکھ دی۔ عین اسی وقت ہال میں ایک ساتھ تین شخص داخل ہوئے اور تیزی سے چلتے ہوئے جہانداد کے سر پر پہنچ گئے۔ جو چائے کی چسکیاں لینے میں مصروف تھا۔

"چپ چاپ کھڑے ہو کر ہمارے ساتھ چلو"۔ ان میں سے ایک نے سرد لہجے میں جہانداد کو حکم دیا۔ "ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دیں گے"۔

"کون ہو تم......اور مجھے یوں لے جانے کا کیا مطلب ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ہمیں تم سے کچھ پوچھنا ہے"۔ دوسرے نے ایک خوفناک ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ "چلو اٹھو......ورنہ"۔

"آرام سے بھئی آرام سے"۔ جہانداد نے پرسکون انداز میں کہا۔ "یوں دھمکانے سے کام نہیں چلے گا۔ ہاں اگر تم لوگوں کو کچھ پوچھنا ہے تو میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے لیے ریوالور نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس کی تلاشی لو"۔ اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یہ ایسے نہیں مانے گا"۔

"تماشا مت بناؤ یہاں"۔ جہانداد ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ورنہ خون خرابا ہو جائے گا"۔

"تم شرافت سے نہیں مانو گے تو خون خرابا ہونا ہی ہے"۔ اس نے جواباً کہا۔ "ہمیں یہی حکم ملا ہے کہ ٹال مٹول کرنے پر تمہیں گولی مار دی جائے۔ چلو نہیں تو اوپر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ"۔

جہانداد کی جیب میں ریوالور موجود تھا مگر نکالنے کی مہلت نہیں تھی۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور وہ اس کی ذرا سی حرکت پر ایکشن میں آسکتے تھے صورتِ حال مکمل طور پر ان کے حق میں

تھی۔ ہال میں موجود دوسرے لوگ بھی اب ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے مگر کوئی بھی نزدیک آنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ معاً ان تینوں میں سے ایک لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر چلایا۔ ''بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ورنہ سب مارے جاؤ گے''۔ اتنا کہہ کر اس نے ایک ہوائی فائر کر دیا اور لوگ حواس باختہ ہو کر ہال سے باہر نکل گئے۔

''پولیس کو فون کرو۔ جلدی کرو''۔ استقبالیے کی طرف سے کسی کی چلاتی ہوئی آواز آئی اور فائر کرنے والا بھاگتا ہوا استقبالیہ کلرک کے سر پر پہنچ گیا۔

''خبردار!'' کلرک کو نمبر ڈائل کرتے دیکھ کر اس نے ریوالور لہرایا۔ ''ریسیور رکھ کر فون سے دور ہو جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا''۔

استقبالیہ کلرک نے فوراً ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور کانپتا ہوا اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''چلو بھاگ جاؤ یہاں سے''۔ اس نے دوبارہ ریوالور لہرا کر کلرک کو ڈانٹنے کے بعد فون کی تار کاٹ دی۔

دوسری طرف اس کے دونوں ساتھیوں نے جہانداد کو بدستور نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ جہانداد کے لیے یہ صورت حال نئی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ان کرائے کے ٹٹوؤں سے خوفزدہ تھا لیکن وہ ایک عوامی مقام پر ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی فائرنگ کا تبادلہ کرتے ہوئے کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا چاہتا تھا۔

اپنے تیسرے ساتھی کے واپس پہنچنے کے بعد انہوں نے جہانداد کی تلاشی لے کر ریوالور نکال لیا تھا۔ تاہم اس کی پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا خنجر محفوظ رہا تھا اور یہ بات جہانداد کے اطمینان کے لیے کافی تھی۔ وقت پڑنے پر وہ اپنی حفاظت کر سکتا تھا۔ ان تینوں کے گھیرے میں ہال سے نکلتے ہوئے جہانداد نے تعاقب کرنے والے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائی تھیں لیکن وہ اسے کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔

===

جونہی وہ ہوٹل کے مین گیٹ سے باہر نکلے ایک بند شیشوں والی وین حرکت میں آئی اور ان کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ وین کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور انہوں نے جہانداد کو تیزی سے اندر دھکیل دیا۔ ان تینوں کے بیٹھتے ہی وین حرکت میں آئی اور ہوٹل کے گیٹ سے کھلی شاہراہ پر پہنچ گئی۔ وین کے شیشے بلائنڈ تھے باہر سے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا تاہم اندر والوں کو باہر کے مناظر بخوبی نظر آرہے تھے۔ کھلی شاہراہ پر پہنچتے ہی انہوں نے جہانداد کی آنکھوں پر ایک سیاہ پٹی باندھ دی تھی۔

''تم احمق ہو''۔ جہانداد نے احتجاجاً کہا۔ ''پٹی باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس شہر



اجنبی ہوں''۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو''۔ اس کی دائیں جانب والا غرا کر بولا۔ ''چپ چاپ بیٹھے رہو۔ ہمیں جو حکم ملا ہے ہم وہی کریں گے''۔

''اچھا ٹھیک ہے...... لیکن تم لوگوں کا باس کون ہے؟'' جہانداد نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ''کم از کم اتنا تو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے اغوا کرانے والا کون ہے؟''

''کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے؟'' وہ بھڑک کر بولا۔ ''بند کرو یہ بک بک''۔

''ارے بھئی...... میں تم لوگوں سے اتنا تعاون کر رہا ہوں۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ میں تم لوگوں سے حال احوال پوچھ سکوں''۔ جہانداد شاید دل لگی کرنے پر تل چکا تھا۔

''تمہارے حال پر لعنت بھیجو''۔ وہ زچ ہو کر چلایا۔

''حال تو کیا، میں تمہارے مستقبل پر بھی لعنت بھیجنے کے لیے تیار ہوں''۔ جہانداد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بس تم لوگ مجھ سے باتیں کرتے رہو اور......''

''چپ''۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے جہانداد کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا۔ ''اب اگر آواز نکالی تو بھیجا اُڑا کر رکھ دوں گا''۔

''میں جانتا ہوں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''کیونکہ تم لوگ ڈگڈگی پر ناچنے والے بندر ہو اور بندر مداری کے حکم پر وہی کرتا ہے جو مداری چاہتا ہے۔ تمہارا مداری...... سوری باس بھی شاید میری لاش سے ملنا پسند نہیں کرے گا۔ اس لیے مجھے دھمکانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''خدا کے لیے چپ ہو جاؤ میرے باپ''۔ اس نے جھنجھلا کر گزارش کی۔

''لو بھئی...... اس نے تو مجھے اپنا باپ بنا کر قصہ ہی ختم کر دیا ہے''۔ جہانداد نے ہنس کر کہا۔ ''چلو شاباش اب بتاؤ اپنے باپ کو کس کے پاس لے جا رہے ہو؟''

''میں...... میں پاگل ہو جاؤں گا''۔ وہ رونی شکل بنا کر بولا۔ ''یا اللہ۔ یہ کس مصیبت میں پھنس گیا؟''

''جانی''...... اس بار جہانداد کی بائیں جانب والا بولا۔ ''احمق مت بنو۔ چپ چاپ بیٹھے رہو اس کے منہ لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''واہ بھئی واہ''۔ جہانداد نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''ایک تو تم لوگوں نے مجھے دن دیہاڑے اغوا کر لیا ہے اور دوسرا میری کسی بات کا جواب دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہو۔ اچھی ناانصافی ہے''۔

اس کی بات کا کسی نے جواب نہ دیا، لیکن وہ بھی خاموش رہنے والا نہیں تھا۔

"کیوں جانی!" ایک ثانیے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ "تم نے اپنے مداری باس کا نام نہیں بتایا۔ ارے بھئی اب ایسی بھی کیا ناراضی۔ بتاؤ ناں۔ کیا نام ہے اس ڈگڈگی بجانے والے کا جو تم جیسے بندروں کو نچاتا ہے؟"

اس کا طنز سن کر جانی اور اس کے ساتھی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے مگر خاموش رہے۔ بول کر دوبارہ جہانداد کے منہ نہیں لگنا چاہتے تھے۔

اس کے بعد جہانداد نے ان کا منہ کھلوانے کی بہت کوشش کی مگر انہوں نے چپ کا روزہ نہ توڑا۔ حتیٰ کہ وین ایک عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہوگئی۔

✣ ==== ✣ ==== ✣

جمشید خان کے سامنے وہی سادہ لباس والا شخص کھڑا ہوا تھا جس نے جہانداد کا تعاقب کیا تھا۔ اس سے پوری کارگزاری سننے کے بعد جمشید خان بولا۔ "احمد علی! کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انہوں نے جہانداد کو گن پوائنٹ پر اغوا کیا ہے؟ یہ جہانداد کا ڈرامہ بھی تو ہوسکتا ہے"۔

"سر! ایک بات کہوں؟" احمد علی نے پوچھا۔

"کہو"۔

"آپ برا تو نہیں مانیں گے؟" احمد علی نے دوبارہ ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"پہیلیاں مت بجھواؤ احمد علی"۔ جمشید خان نے ناگوار انداز میں کہا۔ "جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو"۔

"سر میں جہانداد پر آپ کے شک کی وجہ جان سکتا ہوں؟" احمد علی نے پوچھا۔ "حالانکہ آج وہ دوپہر تک شہر کی فرنیچر فیکٹریاں چھانتا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے واقعی کسی رحیم خان کی تلاش ہے؟"

"بالکل یہی ظاہر ہوتا ہے"۔ جمشید خان نے جواب دیا۔ "مگر اس سے پہلے وہ مجھے کوئی اور کہانی سنا چکا ہے۔ اس کے جھوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ...... وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے۔ پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جس شخص کو تلاش کر رہا ہے وہ ان کے گاؤں سے ایک لڑکی کو بھگا لایا ہے اور آج صبح اس نے مجھے نئی کہانی سنائی ہے۔ رحیم خان والی"۔

"اصل بات نہ بتانا اس کی کوئی مجبوری بھی ہوسکتی ہے"۔ احمد علی نے کہا۔ "کیا خبر پہلے اس نے آپ کے سامنے جھوٹ بولا ہو اور یہ رحیم خان والی کہانی سچی ہو۔ ورنہ اسے فرنیچر فیکٹریاں چھاننے کی کیا ضرورت تھی؟"

"احمد علی! تم بہت بے وقوف ہو"۔ اس نے جواباً کہا۔ "تمہارے تعاقب سے آگاہ ہو کر



اس نے فرنیچر فیکٹریوں کا رخ کیا ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مجرم ہے لیکن بہت چالاک ہے۔ شاید میری جان بھی اس نے اسی سلسلے میں بچائی ہے"۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں سر"۔ احمد علی شکست خوردہ انداز میں بولا۔ "حالانکہ میں نے اس کا تعاقب بہت محتاط انداز میں کیا تھا۔ کیا خبر اس نے مجھے چیک کرلیا ہو۔ بہرکیف اب کیا حکم ہے؟"

"تم واپس جاؤ"۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "اپنے ساتھ سادہ لباس میں دو کانسٹیبل بھی لے جاؤ اور اس عمارت پر نظر رکھو۔ کسی بھی اہم واقعے کی صورت میں فی الفور مجھے رپورٹ کرنا"۔

"اوکے سر...... لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

"لیکن...... کیا؟" جمشید خان نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"سر! ہوسکتا ہے جہانداد کو آپ کی مدد کی ضرورت ہو"۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اسے اغوا کرنے والے خلیل بھائی کے گینگ کے لوگ بھی تو ہوسکتے ہیں"۔

"احمد علی! تم ایک اے ایس آئی ہو"۔ جمشید خان ناگوار انداز میں بولا۔ "اپنے دائرۂ اختیار میں رہو۔ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہیں جو حکم دیا جارہا ہے وہ کرو۔ مجھے سکھانے کی بجائے اپنے فرائض پر توجہ دو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے"۔

"ایم سوری سر"۔ وہ ندامت سے بولا۔ "میں نے تو یونہی ایک خیال ظاہر کیا تھا ورنہ آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے"۔ جمشید خان نے اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم جاؤ اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو خاص کر اغوا کاروں پر نظر رکھو"۔

"یس سر"۔ احمد علی نے سلیوٹ کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

احمد علی کے جانے کے بعد جمشید خان گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جہانداد اس کا محسن تھا اور اسے اس کے ساتھ ہمدردی تھی مگر اس کے سامنے جھوٹ بول کر جہانداد نے خود کو مشکوک کردیا تھا۔ وہ ایک پولیس والا تھا اور جہانداد جس طرح اتفاقاً اس سے ٹکرایا تھا وہ انداز بھی بڑی حد تک مشکوک تھا۔

"یہ مجرموں کا بنایا ہوا کوئی پلان بھی ہوسکتا ہے"۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "شاید وہ مجھے الجھا کر کوئی بڑا جرم کرنا چاہتے ہیں"۔

"یہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟" اچانک مسز سلطانہ نے پوچھا جو ایک لمحہ پہلے اس کی بے خبری میں اندر آچکی تھیں۔

"ہاں۔ میں جہانداد کے بارے میں سوچ رہا ہوں"۔ وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ "مجھے وہ ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔ ہم لوگ کو اس نے جو کہانی سنائی ہے وہ"۔

"وہ محسن ہے تمہارا جمشید خان"۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "گو کہ زندگی اور موت کے فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں لیکن تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ تمہاری رگوں میں زندگی بن کر دوڑنے والا لہو جہانداد کا ہے"۔

"اس کے اسی احسان نے تو میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں ماں! ورنہ اب تک میں اس کے خلاف ایکشن لے چکا ہوتا۔ اس کا تعلق سو فیصد کسی مجرم تنظیم سے ہے"۔ اس نے بدستور پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں"۔ مسز سلطانہ نے کہا۔ "اس نے ہمیں جو کہانی سنائی ہے وہ جھوٹی ہے لیکن اس کا جھوٹ مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ یا اس نے کسی مجبوری کے عالم میں کیا ہے"۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ اس کی اصلیت سے آگاہ ہیں؟" اس نے شکایتی انداز میں پوچھا۔ "ایک میں ہی احمق بے خبر ہوں"۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو"۔ وہ اسے ڈانٹتے ہوئے کہنے لگی۔ "تمہاری طرح میں بھی اس کی اصلیت سے لاعلم ہوں مگر میں نے اسے ایک ماں کی نگاہوں سے دیکھنے کی......"

"مجھے بنانے کی کوشش نہ کریں"۔ اس نے قطع کلامی کی۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ نے اسے بیٹے کا درجہ دیا ہے اور بیٹا چاہے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو ماں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجھے بتائیں کون ہے وہ اور یہاں کیا کرنے آیا ہے؟ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ چھپائیں گی تو اس کا نقصان ہو جائے گا"۔

"کیسی مدد...... کہاں ہے وہ؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"اسے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا ہے"۔ جمشید خان نے بتایا۔ "اے ایس آئی احمد علی نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے اطلاع دی ہے"۔

"واہ جمشید خان واہ"۔ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "تمہارے محسن کو تمہارے ہی دشمنوں نے اغوا کر لیا اور تم اس کی مدد کرنے کی بجائے اس پر شک کر رہے ہو۔ ارے تم کیسے پٹھان ہو؟ پٹھان تو اپنے مہمان کی حفاظت کرنے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں"۔

"آپ کیسے جانتی ہیں کہ اسے میرے دشمنوں نے اغوا کیا ہے؟" جمشید خان نے استفسار کیا۔ "اسے اغوا کرنے والے اس کے اپنے دوست بھی ہو سکتے ہیں"۔

"کیا تمہیں اپنی ماں کی بات پر اعتبار نہیں ہے؟" وہ شکایتی انداز میں بولی۔ "وہ مجرم نہیں ہے میرا یقین کرو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں"۔

"میں اس کی اصلیت جانے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا"۔ وہ سر کو منفی انداز میں جنبش دیتے



ہوئے بولا۔ "اس نے مجھ سے جھوٹ بول کر خود ہی اپنی شامت کو آواز دی ہے"۔

"اس کی مدد کرو جمشید خان"۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "یہ تمہاری ماں کا حکم ہے۔ جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے"۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ شرط عائد کرتے ہوئے بولا۔ "میں اسے بچانے کا انتظام کرتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے"۔

"کیسی شرط؟"

"آپ مجھے اس کی اصلیت ضرور بتائیں گی"۔ اس نے جواب دیا۔ "وہ کون ہے اور یہاں کون سا مقصد لے کر آیا ہے؟ میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے ورنہ شاید میں اس کی ٹھیک طرح سے مدد نہیں کر پاؤں گا"۔

"ہو سکتا ہے اس نے مجھے بھی غلط بتایا ہو"۔ وہ بولی۔ "لیکن میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اس کی اصلیت جاننے کی کوشش کروں گی اور ساری بات تمہیں سچ سچ بتا دوں گی۔ بہر کیف فی الحال اس کی اصلیت جاننے سے زیادہ اہم اس کی بازیابی ہے"۔

"اوکے"۔ وہ رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ کرتا ہوں۔ آپ فکر مند نہ ہوں مجرم پولیس کی نگاہوں میں ہیں۔ میں بہت جلد جہانداد کو بازیاب کرا لوں گا"۔

اس کے بعد جمشید خان ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہو گیا اور مسز سلطانہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

===•===•===

وہ ایک شاندار عمارت تھی۔ وین ایک وسیع پورچ میں جا کر رک گئی۔ انہوں نے جہانداد کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھولی اور پھر اسے گن پوائنٹ پر اترنے کا اشارہ کر دیا۔

"ارے بھئی اب تو بتا دو تم لوگوں کا باس کون ہے؟" جہانداد نے وین سے اترنے کے بعد گزارش کی۔

"صبر کر طرم خان کی اولاد!" جانی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ہم تجھے ابھی باس کے پاس پہنچا دیتے ہیں"۔

مختلف راہداریوں اور کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ایک ہال کمرے میں پہنچ گئے۔ یہ ہال نما کمرا کسی کلاس روم کی طرح سجا ہوا تھا۔ قدرے بلند چبوترے پر چار کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور پیچھے ایک بورڈ بھی پڑا تھا۔ چبوترے سے نیچے تیس کے لگ بھگ کرسیاں قطاروں میں لگی ہوئی تھیں۔ یہ سب کرسیاں فولادی تھیں اور ان کے پائے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔

"جانی بھائی! یہ تم مجھے اٹھا کر کہاں لے آئے ہو؟" جہانداد نے متحیر انداز میں آنکھیں

پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے سکول سے بہت ڈر لگتا ہے یار۔ میں تو آٹھویں کلاس سے ہی بھاگ گیا تھا''۔

''یہ وہ سکول نہیں ہے''۔ جانی نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تم سے دونی کا پہاڑہ کوئی نہیں سنے گا''۔

''پہاڑہ مجھے آتا ہے یار...... اس وقت بھی آتا تھا اور اب بھی''۔

''چلو بکواس مت کرو''۔ جانی نے یکدم سنجیدہ ہو کر قطع کلامی کی۔ ''آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤ''۔

''یار یہ تم بات بات پر غصہ کیوں ہو جاتے ہو؟'' جہانداد ہمدردی سے بولا۔ ''تمہارے معدے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ کسی ڈاکٹر یا حکیم وغیرہ سے رجوع کرو''۔

''میرے غصے سے معدے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟'' جانی نے حیرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔ ''کہیں تم سچ مچ پاگل تو نہیں ہو؟''

''میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ البتہ تم نے اگر معدے کا علاج نہ کرایا تو ان شاء اللہ ضرور پاگل ہو جاؤ گے''۔

جہانداد نے سنجیدگی سے جواب دیا اور جانی پریشانی کے عالم میں اپنے ساتھیوں کی شکل دیکھنے لگا۔

''ابے بیوقوف بنا رہا ہے تمہیں''۔ ایک ساتھی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تمہارا معدہ بھلا کب خراب رہا ہے''۔

اتنا کہہ کر وہ جہانداد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''سوری مسٹر جہانداد! امید ہے آپ نے ہماری گستاخیوں کا برا نہیں منایا ہوگا۔ خصوصاً جانی کی بکواس کا۔ میرا نام گل نواز ہے اور یہ دلبر ہے۔ جانی کا نام آپ کو معلوم ہی ہے''۔

''ارے تم سب لوگ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' جہانداد نے حیرت سے کہا۔ ''یا پھر مجھ سے دل لگی کر رہے ہو؟ سچ بتاؤ کون ہو تم لوگ اور مجھے یہاں کس کے حکم سے اغوا کر کے لائے ہو؟''

''میرے حکم سے مسٹر سولجر''۔ اچانک ہال میں موسیٰ خان داخل ہو کر اپنے مخصوص انداز میں بولا اور جہانداد لمحہ بھر کے لیے متحیرہ رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اچانک ہی اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''اتنا حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ موسیٰ خان اس کے نزدیک پہنچ کر رکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہاں خان جی نے بھیجا ہے''۔



''کاش موسیٰ خان''۔ وہ طیش میں آ کر بولا۔ ''میں مجبور نہ ہوتا تو تمہیں وہ سبق سکھاتا کہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ تیری صورت سے نفرت ہے مجھے۔ تم میرے دوست کے قاتل ہو''۔

''تمہیں پتا ہے سولجر! کہ مجھے غصہ نہیں آتا''۔ اس نے ہیٹ اتار کر اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''غصہ عقل کو کھا جاتا ہے''۔

''مجھے اغوا کر کے کیوں لایا گیا ہے یہاں؟'' جہانداد نے برا سا منہ بناتے ہوئے پوچھا۔ ''اب کیا چاہتا ہے تمہارا خان جی۔ اس کا کام تو کر دیا ہے میں نے''۔

''خان جی کے کام کبھی ختم نہیں ہوتے''۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب ایک اور کام سونپنے کے لیے انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے...... تم''۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' جہانداد نے قطع کلامی کی۔ ''میں مزید ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔ پہلے ہی میں اپنے کیے پر پچھتا رہا ہوں''۔

''کام تو تجھے ہر حال میں کرنا پڑے گا''۔ وہ جہانداد کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''خوشی سے کرو گے تو انعام ملے گا ورنہ''۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر جہانداد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پھر ذرا توقف سے دوبارہ کہا۔ ''نقصان کے تم خود ذمہ دار ہو گے''۔

''میری ماں اور بہن کس حال میں ہیں؟'' جہانداد نے سوال کیا۔

''بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش و خرم ہیں''۔

''بھیڑیوں کے بھٹ میں اور خوش و خرم؟'' جہانداد استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''تم شاید مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''تم یقین کرو نہ کرو تمہاری مرضی''۔

ٹھیک ہے کام بتاؤ؟'' جہانداد نے بیزاری سے پوچھا۔ ''اب کس بے گناہ کو جان سے جانا ہو گا؟''

''یہاں نہیں۔ میرے ساتھ آؤ''۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہم کہیں آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں''۔ دونوں ہال سے نکل کر ایک کمرے میں پہنچ گئے۔

''بیٹھو''۔ کمرے میں پہنچتے ہی موسیٰ خان نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا ایس پی جمشید خان کو جانتے ہو؟''

''کیا؟'' وہ تقریباً اچھل پڑا۔ ''ایس پی جمشید خان نے کیا، کیا ہے؟''

''وہ خان جی کے بزنس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے''۔ موسیٰ خان اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''اور خان جی اس سے بہت عاجز آیا ہوا ہے۔ اسے ہر طریقے سے راستے پر

لانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہ کتے کی دُم ہے جسے کسی طریقے سے بھی سیدھا نہیں کیا جا سکتا۔
اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ اسے راستے سے ہٹا دیا جائے اور خان جی نے یہ مشن تمہیں
ہے۔ امید ہے پہلے کی طرح تم"۔

"نہیں"۔ جہانداد نے چلا کر قطع کلامی کی۔ "میں یہ ظلم نہیں کر سکتا"۔

"احمقانہ باتیں مت کرو"۔ موسیٰ خان نے کمرے کی دیوار میں نصب ایک الماری
رنگ کا بریف کیس نکالتے ہوئے جواب دیا۔ "تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تمہاری فیملی خان جی
مہمان ہے اور تمہارا انکار ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ دیکھو"۔ اتنا کہہ کر اس
بریف کیس کھول کر جہانداد کے سامنے پڑی ہوئی میز پر رکھ دیا۔

"اس میں پورے پچاس ہزار روپے ہیں"۔ موسیٰ خان نے کہا۔ "اتنے ہی اور ملیں گے
جمشید خان کو خان جی کے راستے سے ہٹانا پڑے گا"۔

"پیسہ میری کمزوری کبھی نہیں رہا موسیٰ خان"۔ وہ ناگوار انداز میں بولا۔ "اور نہ خان جی
پیسے کے بل بوتے پر خرید سکتا ہے۔ جس دن میں نے ماں اور بہن کو اس کے چنگل سے چھڑا لیا
خان جی اور تمہاری زندگی"۔

"بس"۔ موسیٰ خان نے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کی۔ "میں یہاں تمہاری تقریر سننے کے لیے
آیا ہوں۔ مجھے ہاں یا ناں میں تمہارا جواب درکار ہے۔ بولو کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟ میرے پاس
وقت نہیں ہے اور بھی بہت کچھ کرنا ہے میں نے"۔

"کاش انکار کرنا میرے بس میں ہوتا"۔ وہ شکست خوردہ انداز میں بولا اور پھر سوالیہ انداز
پوچھا۔ "کیا پہلا حملہ جمشید خان پر تم لوگوں نے کروایا تھا؟"

"اس بات کو رہنے دو"۔ موسیٰ خان نے بے پروائی سے کہا۔ "تم یہ پیسے گنو۔ اب یہ تمہارے
ہیں اور ہاں بریف کیس میں چابیاں بھی موجود ہیں۔ اپنے پاس رکھ لو یہ ایک محفوظ ٹھکانے کی
ٹھکانے کے بارے میں تمہیں گل نواز بتا دے۔ تمہاری جیپ بھی اس ٹھکانے پر پہنچا دی گئی ہے"۔

"جیپ"۔ جہانداد نے متحیر ہو کر کہا۔ "وہ تو پولیس اسٹیشن میں تھی"۔

"میں اس جیپ کی بات نہیں کر رہا"۔ موسیٰ خان بولا۔ "خان جی نے تمہارے لیے
جیپ بھجوائی ہے۔ اسے تمہارے آرام کا بہت خیال رہتا ہے"۔

"ٹھیک کہتے ہو"۔ اس نے زہر خند سے کہا۔ "قربانی کے بکرے کی خاطر تواضع ہر دور
مگر پھر خوشی خوشی اس کے گلے پر چھری بھی پھیر دی جاتی ہے"۔

"میں سچ کہتا ہوں سولجر۔ خان جی تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو میں تم



نہ کرنے لگتا ہوں"۔

"تو پھر خان جی سے بات کیوں نہیں کرتے"۔ وہ بولا۔ "میری ماں اور بہن کو چھوڑ دے۔ میں
وں پر لعنت بھیج کر درمیان سے نکل جاؤں گا"۔

"میں خان جی کو مشورہ دینے کی غلطی نہیں کر سکتا"۔ اس نے برا منائے بغیر جواب دیا۔ "وہ
باپ جیسا ہے۔ اس نے پالا ہے مجھے ورنہ میرا بے غیرت باپ تو مجھے اور میری ماں کو زمانے کی
ٹھوکریں کھانے کے چھوڑ گیا تھا۔ خدا کی قسم اگر زندگی کے کسی موڑ پر ٹکرا گیا تو اپنے ہاتھوں سے زندہ جلا
دوں گا اسے"۔ اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور جہانداد بریف کیس پر جھک گیا۔

===

سہ پہر کے وقت جب جہانداد وہاں سے نکلنے والا تھا اور موسیٰ خان اسے آخری ہدایات دے رہا
تھا جانی بوکھلائے ہوئے انداز میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور حواس باختہ ہو کر بولا۔ "باس!
ہمیں چاروں طرف سے پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے کیا حکم
ہے"۔

"کیا بکواس کرتے ہو؟" موسیٰ خان نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "پولیس کو کیسے معلوم ہو گیا
کیا کسی نے مخبری کی ہے؟"

"م...... معلوم نہیں جناب"۔ جانی نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ہم نے تو بہت
احتیاط کی تھی۔ بے شک آپ گل نواز سے پوچھ لیں۔ ہم"۔

"بکومت"۔ موسیٰ خان نے تیز لہجے میں قطع کلامی کی۔ "تم لوگوں کی حماقت سے ہی پولیس
یہاں تک پہنچی ہے"۔

"ان لوگوں کی نہیں تمہاری حماقت کی وجہ سے پولیس کو یہ موقع ملا ہے"۔ جہانداد نے طنزیہ
انداز میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اغوا نہ کراتے تو شاید ایسی صورتِ حال کبھی پیش نہ آتی۔
ویسے آج کل تمہاری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے مسٹر افلاطون"۔

"میں نے کون سی حماقت کی ہے؟" اس نے ٹھنڈا پڑتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری حماقت یہ ہے کہ تم نے مجھے بے خبر رکھ کر یہاں بلایا ہے"۔ جہانداد نے جواب دیا۔
"اپنے آدمیوں کے ذریعے مجھے پیغام بھجوا کر بھی بلوا سکتے تھے۔ پولیس تمہارے آدمیوں کا نہیں بلکہ
میرا پیچھا کر رہی تھی"۔

"تمہارا پیچھا...... میں سمجھا نہیں؟" وہ حیران نظر آ رہا تھا۔

"سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے"۔ جہانداد کا انداز استہزائیہ تھا۔ "جمشید خان کو مجھ

پرشک ہو گیا ہے اور اس نے سادہ لباس میں ایک پولیس والا''۔

''کیا...... کیا تمہیں جمشید خان جانتا ہے؟'' موسیٰ خان نے چونک کر قطع کلامی کی اور پھر ... سوچ کر بولا۔ ''اوہ...... اب میں سمجھا۔ خلیل بھائی تمہاری وجہ سے پکڑا گیا ہے۔ تو وہ تم تھے جو ... فارم ہاؤس میں گھس کر''۔

''کیا ہمارے پاس ان باتوں کا وقت ہے؟'' جہانداد نے جھنجھلا کر اسے ٹوک دیا۔ ''یہاں ... سے فرار ہونے کی سوچو ورنہ سب مارے جائیں گے''۔

''جانی! یہاں کل کتنے آدمی ہیں؟'' موسیٰ خان فوراً جانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ان سب ... پولیس مقابلے کے لیے تیار ہونے کا حکم سنا دو۔ جاؤ جلدی کرو''۔

جانی بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور موسیٰ خان دوبارہ جہانداد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں تم سے یہ واقعہ ضرور سنوں گا''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''لیکن فی الحال پولیس سے ... ضروری ہے''۔

''پولیس ہمیں آسانی سے فرار نہیں ہونے دے گی''۔ وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ ''اور ... میں یہاں سے بھاگ بھی گیا تو یہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا''۔

''کس لیے اچھا نہیں ہوگا؟'' موسیٰ خان نے استفسار کیا۔

''ابھی جمشید خان میرے متعلق صرف مشکوک ہوا ہے۔ اگر میں اسے یہاں نہ ملا تو''۔

اسی دوران باہر سے ایک گونجتی ہوئی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی اور جہانداد کی بات ادھوری رہ گئی۔ پولیس انہیں وارننگ دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''تم چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ ہم تمہیں دس منٹ کا وقت دیتے ہیں۔ اس دوران اگر کسی نے فرار کی کوشش کی تو مارا جائے گا''۔

''اب کیا کریں؟'' موسیٰ خان نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔ ''پولیس پارٹی تو ... مارنے پر تلی ہوئی ہے۔ بہت خون خرابا ہوگا''۔

''یہ پولیس کا اور تمہارا معاملہ ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟'' جہانداد نے جواباً کہا۔ ''بہتر ہے مجھے معمولی سا زخمی کر کے کسی کرسی پر باندھ دو۔ آگے میں جانوں اور پولیس''۔

''لیکن تمہارے پاس اتنی بڑی رقم ہے اور پولیس اس معاملے میں بہت بدنام ہے''۔

''رقم تم لے جاؤ''۔ جہانداد نے کہا۔ ''میرے ٹھکانے پر چھوڑ جانا۔ چلو اب جلدی کرو ... منٹ گزر چکے ہیں''۔

اس کے بعد موسیٰ خان نے جہانداد کے بازو پر چاقو سے ایک معمولی سا چرکا لگایا اور پھر ...



...بٹھا کر باندھ دیا۔

''بس ٹھیک ہے''۔ موسیٰ خان کے فارغ ہونے کے بعد جہانداد بولا۔ ''اب تم جاؤ۔ دروازہ ...لاک کرتے جانا''۔

''ایک بار پھر سوچ لو سولجر''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔ ...اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتی ہے''۔

''موسیٰ خان دل خطرے مول لیتا ہے اور عقل مصلحت پسند ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ...دل کی مانتا ہوں۔ جاؤ تمہارے اور میرے راستے ہمیشہ جدا رہیں گے''۔ جہانداد نے جواب دیا ...موسیٰ خان کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ اس نے باہر سے لاک کر دیا تھا۔

جونہی دس منٹ ختم ہوئے پولیس کی طرف سے انہیں آخری وارننگ ملی مگر جب کوٹھی سے کوئی ...باہر نہ نکلا تو پولیس فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ موسیٰ خان کے ساتھیوں نے بھی جوابی ...فائرنگ شروع کر دی لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔

موسیٰ خان اپنے آدمیوں کو پولیس کے ساتھ الجھا کر چپکے سے کوٹھی کی چھت پر پہنچ گیا۔ وہاں ...وہ پولیس کی نگاہیں بچا کر ساتھ والی کوٹھی پر کود گیا اور پھر با آسانی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو ...گیا۔

دوسری طرف اس کے ساتھیوں نے تقریباً ایک گھنٹہ پولیس کا مقابلہ کیا مگر انہیں کوٹھی سے دور ...نے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی تعداد دس تھی جبکہ پولیس والے پچاس سے بھی زیادہ تھے۔ وہ کوٹھی ...ہت سے پولیس پر فائرنگ کر رہے تھے۔

ایک گھنٹے کی فائرنگ کے دوران ان میں سے پانچ کو پولیس کی گولیاں چاٹ گئیں۔ گل نواز اور ...فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے جبکہ دلبر مارا گیا۔ اسے پولیس نے بھاگتے دیکھ کر گولی ماری تھی۔ ...صرف دو کو پولیس زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔

جہانداد کرسی پر بندھا فائرنگ کی آوازیں سن رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ...ایک گھنٹے کے بعد فائرنگ کی آوازیں بند ہو گئیں اور پھر دس پندرہ منٹ گزرنے کے بعد کوٹھی میں ...بوٹوں کی آواز گونجنے لگی۔ جس سے جہانداد نے یہ اندازہ لگایا کہ جیت پولیس کے حصے میں آئی ...اب اسے اپنے کمرے کا دروازہ ٹوٹنے کا انتظار تھا۔

اچانک راہداری میں بھاری بوٹوں کی آواز گونجی اور جہانداد کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ ...اس کے کمرے کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ اب کسی بھی وقت دروازہ ٹوٹ سکتا تھا۔

''سر! یہاں تو سب کمرے خالی پڑے ہوئے ہیں''۔ کسی نے بلند آواز میں کہا۔ ''شاید یہاں

کوئی نہیں ہے"۔

"تلاش کرو کوٹھی میں ضرور کوئی تہہ خانہ ہوگا"۔ ایک بارعب آواز نے جواب دیا۔"ہمیں ایس پی صاحب کے مہمان کو ہر صورت میں تلاش کرنا ہے"۔

"او کے سر"۔ پہلی آواز نے کہا اور بوٹوں کی دھمک دور ہوتی چلی گئی۔

"یہ اُلّو کے پٹھے تو بالکل احمق ہیں"۔ ان کی گفتگو سن کر جہانداد نے دل ہی دل میں سوچا۔

"اب تو انہیں آواز دینا پڑے گی لیکن"۔ وہ الجھ گیا۔ دراصل وہ بے ہوشی کا ڈرامہ رچانے کے بارے میں سوچ بیٹھا تھا مگر پولیس والوں کی حماقت کی وجہ سے اس کا یہ منصوبہ کامیاب ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ پولیس والوں کو الٹی سیدھی گالیاں دے رہا تھا اور ان کے شجرۂ نسب میں بیان ردوبدل کر رہا تھا۔

"چھت سے کتنی لاشیں ملی ہیں؟" ایک بار پھر راہداری میں وہی بارعب آواز گونجی۔

"پانچ سر"۔ کسی نے فوراً جواب دیا۔

"اور جو دو زندہ گرفتار ہوئے ہیں ان سے معلوم کرو۔ انہیں ایس پی صاحب کے مہمان کے بارے میں ضرور معلوم ہوگا"۔ بارعب آواز نے حکم دیا۔

"لعنت ہو تم پر اور تیرے اگلے پچھلوں پر"۔ جہانداد دانت پیستے ہوئے خودکلامی کے انداز میں بولا۔"اس محکمے کا بھی جواب نہیں ہے گدھوں کو بھی وردی پہنا دیتا ہے"۔

بوٹوں کی دھمک اور پولیس والوں کی آوازیں ایک بار پھر معدوم ہو چکی تھیں۔ جہانداد پر آہستہ آہستہ جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ اب اس کے پاس کڑھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ پولیس اسے تلاش کیے بغیر واپس چلی جاتی تو اس کا بنا بنایا منصوبہ خاک میں مل کر رہ جاتا۔ ایک ایک لمحہ عذاب بن کر گزر رہا تھا۔ اس بے زاری میں پندرہ بیس منٹ مزید گزر گئے لیکن راہداری میں کوئی آواز نہ گونجی۔

"لگتا ہے وہ واپس جا چکے ہیں" اس نے خودکلامی کی۔"اب مجھے اپنی مدد آپ کے تحت ہی کچھ کرنا پڑے گا"۔

اسی دوران دوبارہ اس کی سماعتوں سے پولیس والوں کی آوازیں ٹکرائیں اور اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ایک بار پھر وہ پُرامید نظر آ رہا تھا۔

"ارے یہ کمرا تو شاید اندر سے بند ہے"۔ کسی نے دروازے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ جہانداد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اب کم از کم میں یہ گواہی تو دے سکوں گا کہ قانون اندھا نہیں ہوتا۔ دیر سے ہی سہی لیکن



کھلتی ضرور ہیں"۔ اتنا کہہ کر وہ مسکرا دیا۔

"سر! اس کمرے میں کوئی چھپا ہوا ہے؟" باہر سے ایک پریشان آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھول کر باہر آ جاؤ"۔ کسی نے زور سے دروازہ دھڑ دھڑاتے ہوئے کہا اور جہانداد نے دل ہی دل میں ایک بار پھر ان پر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔

دو تین بار انہوں نے مزید دروازہ دھڑ دھڑایا اور پھر لاک پر فائر کر دیا۔ گولی کا دھماکا گونجا اور جہانداد نے بے ہوشی کے انداز میں گردن جھکا دی۔ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور پھر جہانداد کی سماعتوں سے ایک بارعب آواز ٹکرائی۔"خبردار ہلنے کی کوشش"۔

"ارے یہ تو بندھا ہوا ہے"۔ کسی نے قطع کلامی کی۔"اور...... زخمی بھی ہے"۔

"احمقو! فوراً کھولو اسے"۔ بارعب آواز نے حکم دیا۔"یہی ایس پی صاحب کا مہمان ہے"۔

اس کے بعد انہوں نے جلدی سے جہانداد کو کرسی سے کھولا اور فرش پر لٹانے کے بعد اسے ہوش میں لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

"جلدی کرو پانی لاؤ"۔ کسی نے کہا اور جہانداد دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ پولیس کی بوکھلاہٹ اسے محظوظ کر رہی تھی۔

ذرا دیر کے بعد وہ اس کے منہ میں نہ صرف پانی ٹپکا رہے تھے بلکہ اس کا جسم بھی ہمدردی سے سہلا رہے تھے۔ اب جہانداد کے لیے مزید ڈرامہ جاری رکھنا غیر اہم تھا اس لیے اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

"م...... میں کہاں ہوں"۔ اس نے کمزور سی آواز میں سوال کیا۔"اور...... اور وہ درندے کہاں گئے؟"

"تھینکس گاڈ"۔ ایک انسپکٹر نے اسے ہوش میں آتے دیکھ کر مطمئن انداز میں کہا اور پھر اس پر جھکتے ہوئے بولا۔"جہانداد صاحب! میں معذرت خواہ ہوں۔ ہمیں تم تک پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہو گئی۔ بہرکیف شکر ادا کرو تمہاری جان بچ گئی"۔

"شکریہ انسپکٹر صاحب"۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔"مجھے ایس پی صاحب کے پاس پہنچاؤ"۔

"کیوں نہیں۔ ابھی لے چلتے ہیں"۔ انسپکٹر پُرخلوص انداز میں بولا۔"ویسے ان لوگوں نے تمہیں اغوا کیوں کیا؟ کیا تم انہیں پہلے سے جانتے ہو؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو انسپکٹر صاحب!" اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔"میں نے ان لوگوں کو پہلی بار دیکھا ہے۔ دراصل یہ ایس پی صاحب کے دشمن تھے"۔

''ہوں......'' انسپکٹر پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''میں سمجھ گیا یہ خلیل بھائی کے ساتھی تھے۔ بہر حال اب یہ لوگ قانون سے بچ نہیں سکیں گے۔ ہم نے اس گینگ کے دو آدمیوں کو زندہ پکڑ لیا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد ہمارے ہاتھ گینگ کے سرغنہ کی گردن پر ہوں گے''۔

انسپکٹر کی بات سن کر جہانداد کے بدن میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہاں موسیٰ خان کے بہت سے آدمی اس کی اصلیت سے آگاہ تھے۔ خصوصاً جانی اور گل نواز تو اس کے نئے منصوبے سے بھی واقف تھے۔ دورانِ تفتیش پولیس انہیں ٹارچر کر کے بہت کچھ اگلوا سکتی تھی۔ دل ہی دل میں وہ دعا کر رہا تھا کہ گرفتار ہونے والوں میں سے کوئی جانی یا علی نواز نہ ہو ورنہ اس کا بھانڈا پھوٹتے دیر نہیں لگے گی۔

''تم کچھ پریشان ہو گئے ہو، کیا بات ہے؟'' انسپکٹر نے جہانداد کو سوچتے دیکھ کر سوال کیا۔

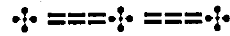
''میرے بازو میں شدید درد ہو رہا ہے''۔ اس نے بات بناتے ہوئے جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں ہم تمہیں یہاں سے سیدھا ہسپتال لے چلتے ہیں''۔ انسپکٹر نے ہمدردی سے کہا۔

''نہیں''۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''سب سے پہلے میں ایس پی صاحب سے ملنا چاہوں گا''۔

''مگر کیوں؟'' انسپکٹر نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور پھر ایک سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جاؤ۔ دونوں گرفتار ہونے والے مجرموں کو یہیں لے آؤ۔ مجھے ان سے کچھ پوچھنا ہے''۔

سپاہی یس سر کہتے ہوئے باہر نکل گیا اور جہانداد متعجب انداز میں انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید چند لمحوں کے بعد اس کا بھانڈا پھوٹنے والا تھا۔ دل ہی دل میں وہ خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے ہسپتال جانے سے انکار کیوں کیا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سپاہی کسی بھی لمحے ان دونوں کو لے کر حاضر ہونے والا تھا۔



دس پندرہ منٹ کے بعد کمرے سے باہر راہداری میں قدموں کی چاپ گونجی اور جہانداد کا دل اس چاپ کے ساتھ دھک دھک کرنے لگا۔ آنے والے لمحات اپنے جلو میں اس کے لیے نہ جانے کون سی مصیبت لا رہے تھے۔ ''اگر ان دونوں میں سے کوئی جانی یا گل نواز نکلا تو میں کیا کروں گا؟'' اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا مگر جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

اسی دوران سپاہی ان دونوں کو لے کر کمرے میں داخل ہوا اور جہانداد کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہو گئی۔ پکڑے جانے والے دونوں شخص جہانداد کے لیے قطعی اجنبی تھے۔



وہ اسی عمارت سے گرفتار ہوئے تھے لیکن جہانداد انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ بات جہانداد کے لیے اطمینان بخش تھی کہ ان دونوں نے جہانداد کو دیکھ کر کسی شناسائی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

پولیس انسپکٹر جہانداد کی توقع سے بھی بڑھ کر چالاک واقع ہوا تھا۔ اس نے دونوں مجرموں سے براہ راست تفتیش شروع کر دی تھی۔ غالباً وہ نیا نیا انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوا تھا اس لیے ضرورت سے زیادہ پیشہ ورانہ مستعدی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ دونوں سے ان کے نام معلوم کرنے کے بعد انسپکٹر نے باقاعدہ تفتیش کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اکرم اور اختر۔ تم دونوں کے نام کچھ ملتے جلتے ہیں۔ کہیں تم آپس میں بھائی تو نہیں ہو؟''

''بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہیں''۔ اختر بولا۔ ''لیکن سگے بھائی نہیں ہیں''۔

''تو کیا سوتیلے بھائی ہو؟'' انسپکٹر نے روانی میں سوال کیا اور وہ دونوں اس کی حماقت پر مسکرا دیے۔ انسپکٹر ذرا سا خفیف ہو کر بولا۔ ''دانت نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سوال کا جواب دو۔ ورنہ یہیں پولیس مقابلے کے نام پر دونوں کو پار کر دوں گا''۔

''صاحب''۔ اکرم نے کہا۔ ''ہم کسی اور رشتے سے بھائی ہیں۔ جس طرح پولیس میں پیٹی بھائی ہوتے ہیں ہم بھی بالکل ویسے ہی بھائی ہیں''۔

اکرم کی اس دلچسپ وضاحت نے نہ صرف انسپکٹر اور سپاہیوں کو بلکہ جہانداد کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اوہ...... آئی سی''۔ انسپکٹر نے ذرا توقف سے کہا۔ ''تم دونوں پروفیشنل بھائی ہو۔ بہت اچھے بھئی اب ذرا اس ذات گرامی کا نام بتاؤ جس کے لیے تم دونوں کام کرتے ہو؟''

''ہم اس کا نام نہیں جانتے''۔ اختر بولا۔ ''اور نہ ہی ہم نے کبھی اسے دیکھا ہے''۔

''بکواس مت کرو''۔ انسپکٹر نے بھڑک کر کہا۔ ''سیدھی طرح نام بتاؤ ورنہ کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ شاید تم مجھے جانتے نہیں میرا نام انسپکٹر چنگیز خان ہے۔ چنگیز کا مطلب سمجھتے ہو ناں؟''

''جناب! ہمیں تو ہر وہ شخص چنگیز خان ہی نظر آتا ہے جس نے کالی قمیص اور خاکی پتلون پہن رکھی ہو۔ ایک آپ پر ہی کیا موقوف، ہم تو ہر پولیس والے کو دیکھ کر راستہ تبدیل کر لیتے ہیں''۔ اکرم نے بدستور اسی سادگی اور بھولپن سے جواب دیا۔ وہ بہت چالاک تھا یا پھر انسپکٹر کو بنا رہا تھا۔ جہانداد ان کی اور انسپکٹر کی نوک جھونک سن کر محظوظ ہو رہا تھا۔

انسپکٹر نے بھڑک کر کہا۔ ''اپنے باس کا نام تو تم لوگوں کو ہر صورت میں بتانا ہی پڑے گا۔ بغیر ٹال مٹول کیے بتا دو گے تو یہ تمہاری صحت کے لیے بہتر ہو گا ورنہ ہم تمہاری ہڈیاں توڑ کر بھی ہر بات اگلوا سکتے ہیں۔ فیصلہ تم لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ لنگڑا لولا بننا چاہتے ہو تو ہمیں کوئی انکار نہیں ہے''۔

"ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں صاحب"۔ اختر نے کہا۔ "اور اگر معلوم ہوتا بھی تو شاید ہم زبان بند ہی رکھتے۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے شوق سے کریں۔ ہم آپ سے رحم کی درخواست نہیں کریں گے"۔

اختر کے جواب نے انسپکٹر کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھوکے گدھ کی طرح ان دونوں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ ہاتھ، لات اور چھڑی کا بے تحاشا استعمال کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ انہیں پولیس کی مروجہ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ چند سپاہی بھی جی جان سے اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ شاید انہیں اپنے افسر اعلیٰ سے پیچھے رہنا گوارہ نہیں تھا۔ پولیس انسپکٹر انہیں انسان کی بجائے جانور سمجھ کر پیٹ رہا تھا۔

وہ دونوں مار کھاتے ہوئے بھی خاموش تھے۔ دونوں کے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ انسپکٹر چلا چلا کر ان سے ان کے باس کا نام پوچھ رہا تھا مگر وہ چپ تھے شاید وہ اب نہ بولنے کی قسم کھا چکے تھے۔ ان کی چپ انسپکٹر کے غصے کو مہمیز کر رہی تھی۔ "بولو حرام زادو۔ کتے کے بچو!" انسپکٹر پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ "کون ہے وہ تمہاری ماں کا یار؟ جسے بچانے کے لیے تم گدھے کی طرح مار کھا رہے ہو؟ بتا دو ورنہ میں گولی مارنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا"۔

جہانداد زندگی میں پہلی بار پولیس کی تفتیش کا یہ انوکھا انداز دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ انسپکٹر کی حماقت پر افسوس کر رہا تھا جو عادی مجرموں کی زبان سے یوں بچکانہ انداز میں سچ اگلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بے وقوفی کی انتہا تھی جہانداد بولنا چاہ رہا تھا۔ مگر انسپکٹر کو منہ سے کف اُڑاتے دیکھ کر وہ چپ تھا۔ ویسے بھی اس کی اپنی پوزیشن ابھی تک مشکوک تھی۔ وہ اگر اکرم اور اختر کو بچانے کی کوشش کرتا تو لازماً انسپکٹر کا شک قوی ہو جاتا اور پھر جہانداد کے لیے بھی کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ فی الحال چپ میں ہی عافیت تھی اور جہانداد چپ تھا تاہم اکرم اور اختر کی قوتِ برداشت اس کے لیے قابل دید تھی۔ وہ دل ہی دل میں انہیں داد دے رہا تھا جو گزشتہ پندرہ منٹ سے پولیس والوں کی وحشیانہ مار کھاتے ہوئے بھی چپ تھے زبان کھولنا نہیں چاہ رہے تھے۔

ان کی چپ کے پیچھے یقیناً موسیٰ خان کی دہشت کا ہاتھ تھا یہ بات جہانداد اچھی طرح جانتا تھا لیکن انسپکٹر کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ انسپکٹر جب ان دونوں کو مارتے مارتے تھک گیا تو اسی کرسی پر بیٹھ کر تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپنے لگا جس پر کچھ دیر پہلے جہانداد بندھا ہوا تھا۔ اکرم اور اختر کی بری حالت ہو گئی تھی اور اب وہ کراہ رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر سخت اذیت کے آثار تھے۔

"پانی پلاؤ مجھے"۔ انسپکٹر ہانپتے ہوئے ایک سپاہی سے بولا۔ "ان ماں کے یاروں سے تھانے جا کر نمٹ لیں گے۔ میں دیکھوں گا یہ کیسے زبان نہیں کھولتے"۔

سپاہی نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر انسپکٹر کو پیش کر دیا۔ اکرم اور اختر حریص نگاہوں



سے پانی کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن انسپکٹر ان پر توجہ دیے بغیر غٹا غٹ پانی کا گلاس پی گیا۔

سپاہی نے ازراہِ ہمدردی انسپکٹر سے پوچھا۔ "سر! انہیں بھی پانی پلا دوں؟"

"نہیں"۔ انسپکٹر نے بھڑک کر کہا۔ "جب تک یہ اپنے باپ کا نام نہیں بکیں گے۔ انہیں پانی کی بوند بھی نہیں ملے گی چاہے پیاس سے یہ مر کیوں نہ جائیں"۔

"میرے باپ کا نام اکبر ہے اور اس کے باپ کا نام اسلم ہے"۔ اکرم نے انسپکٹر کو چڑانے والے انداز میں کہا۔ "آپ کو ان سے کوئی کام ہے؟"

اکرم کا جواب سن کر انسپکٹر ایک بار پھر اسے ماں بہن کی گالیاں بکتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "انسپکٹر چنگیز خان کا مذاق اُڑاتا ہے؟" وہ فرش پر بیٹھے ہوئے اکرم کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولا۔ "کتے کے بچے! مجھے تیری ماں سے کام ہے؟ بول کہاں رہتی ہے وہ؟"

"قبرستان میں"۔ اکرم نے جواب دیا۔ "اسے مرے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔ پولیس والوں کو سخت ناپسند کرتی تھی اور انہیں موٹی موٹی گالیاں بھی دیتی رہتی تھی البتہ عام لوگوں کے لیے بہت مہربان تھی"۔

انسپکٹر نے غصے میں اسے یکے بعد دیگرے دو تین ٹھوکریں مزید رسید کرتے ہوئے سپاہیوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد وہ جہانداد کی طرف پلٹا۔ "مسٹر جہانداد! میں معذرت خواہ ہوں کہ ہماری وجہ سے تمہیں انتظار کی کوفت اٹھانا پڑی بہرکیف اب بھی اگر تم زخمی بازو میں تکلیف محسوس کر رہے ہو تو یہیں سے تمہیں ہسپتال بھجوا دیتے ہیں"۔

"میں پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں"۔ جہانداد بولا۔ "آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس مجھے ایس پی صاحب کے گھر تک چھوڑ دینا"۔

"اوکے"۔ انسپکٹر اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور جہانداد سوچوں میں غرق ہو گیا۔



جس وقت پولیس کی گاڑی نے جہانداد کو ایس پی جمشید خان کے بنگلے کے سامنے اتارا وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ اپنے بازو میں معمولی سا درد محسوس کر رہا تھا۔ گو کہ موسیٰ خان نے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ زخمی کیا تھا لیکن زخم تو پھر زخم ہوتا ہے۔ درد تو اس نے کرنا ہی تھا۔ انسپکٹر کے زور دینے کے باوجود اس نے ہسپتال جانے سے انکار کر دیا تھا اور انسپکٹر نے بھی ایس پی صاحب کا خیال رکھتے ہوئے اس سے کوئی خاص پوچھ تاچھ نہیں کی تھی۔

گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے وہ اندر داخل ہوا تو پٹھان چوکیدار اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ "صیب! یہ تم کو کیا ہو گیا؟" چوکیدار نے متحیر انداز میں پوچھا۔ "کدر لڑا وغیرہ تو نہیں کیا؟"

"دلدار خان!" جہانداد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا میں تمہیں لڑائی جھگڑے والا آدمی دکھائی دیتا ہوں؟"

"نہیں صیب"۔ دلدار خان نے جلدی سے کہا۔ "ام تو ایسے ہی تمہارا حال چال پوچھ رہا تھا۔ تمہارا بازو زخمی ہے ناں۔ ام نے سوچا کدر جگڑا ہوا ہوگا۔ دراصل جمشید صیب بی تمہارا واسطے بہت پریشان رہے۔ تم کدر چلا گیا تھا؟"

"میں یہیں تھا شہر میں"۔ جہانداد بولا۔ "تم ابھی جا کر صاحب کو بتا دو کہ جہانداد واپس آ گیا ہے۔ میں گیسٹ روم میں جا کر لباس تبدیل کرنے کے بعد ابھی پہنچتا ہوں"۔

"ام ابی بولتا اے صیب"۔ اتنا کہہ کر دلدار خان بہ عجلت روانہ ہو گیا۔

جہانداد گیسٹ روم میں پہنچا اور تھکے سے انداز میں بستر پر گر گیا۔ اس کا دماغ تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ جمشید خان کا سامنا کرنے سے پہلے وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا تھا۔ جمشید خان پہلے سے ہی اس کے بارے میں مشکوک تھا ایسے میں اس کی معمولی سی غلطی بھی اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ بستر پر لیٹے ابھی اسے دس پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک نوکر داخل ہو کر اسے سلام کرنے کے بعد بولا۔ "جناب! آپ کو جمشید صاحب بلا رہے ہیں۔ وہ دلدار کہہ رہا تھا کہ آپ زخمی ہیں۔ صاحب تو خود آنا چاہتے تھے لیکن انہیں ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے منع کیا ہے"۔



"تم جاؤ میں ابھی آتا ہوں"۔ جہانداد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "صاحب سے کہنا میں ٹھیک ٹھاک ہوں بس معمولی سا زخم ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے"۔

"صاحب نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے جناب"۔ نوکر واپس جاتے ہوئے بولا۔ "جلدی آنا۔ ڈاکٹر بس پہنچنے ہی والا ہوگا"۔

"میں بس دس منٹ کے اندر پہنچ جاؤں گا"۔ وہ اٹیچ باتھ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور نوکر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ تولیے سے خشک کیا اور پھر بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد کمرے سے باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتا ہوا وہ جمشید خان کے کمرے میں داخل ہوا اور اسے سلام کرنے کے بعد اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جمشید خان تکیے کے سہارے بستر پر نیم دراز تھا۔ جہانداد کے سلام کا جواب دینے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون لوگ تھے تمہیں اغوا کرنے والے؟" جہانداد کے چہرے پر ایک بھرپور نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے سوال کیا۔ "کیا چاہتے تھے تم سے؟"

"خلیل بھائی کے ساتھی تھے جناب"۔ جہانداد نے بلاتردد جواب دیا۔ "اور انہوں نے مجھے خفیہ پولیس کا آدمی سمجھ کر اغوا کیا تھا۔ مجھ سے معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ خدا کا لاکھ شکر ہے کہ عین وقت پر پولیس نے پہنچ کر مجھے ان کے چنگل سے نجات دلا دی ورنہ وہ تو میرے ہاتھ پاؤں توڑنے کے لیے تیار ہو چکے تھے بس قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا"۔

"کیسی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے؟" اس نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ ایس پی جمشید خان آئندہ ان کے خلاف کیا کیا کارروائی کرنے والا ہے۔ آپ ان کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔ کہتے تھے کہ اگر آپ نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا تو وہ آپ کی ساری فیملی کو قتل کر دیں گے اور آپ کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی پشت پناہی کوئی بڑا آدمی کر رہا ہے۔ کوئی ایسا آدمی جو سیاسی اثر رسوخ رکھتا ہے کیونکہ وہ آپ کو معطل کرانے کی بھی دھمکی دے رہے تھے"۔ جہانداد سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بے دریغ جھوٹ بولتا چلا گیا۔

"پھر تم نے کیا بتایا انہیں؟" جمشید خان نے سوال کیا۔

"میں نے کیا بتانا تھا جناب"۔ جہانداد بولا۔ "کچھ معلوم ہوتا تو شاید ان کے تشدد سے بچنے کے لیے زبان کھول دیتا مگر جب آدمی کو کچھ معلوم ہی نہ ہو تو وہ چپ رہنے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟ بس میں بھی چپ رہا۔ ان کا تشدد برداشت کرتا رہا اور اپنی قسمت کو کوستا رہا۔ ایسے ہی وقت پولیس پہنچ گئی اور پھر میری جان چھوٹ گئی لیکن مجھے ایک بات کی سمجھ ابھی تک نہیں آ رہی ہے۔ پولیس مجرموں کے

اس خفیہ ٹھکانے تک کیسے پہنچ گئی؟''

''بس پہنچ گئی''۔ اس نے جواب دیا۔ ''کیسے پہنچی اور کیوں پہنچی؟ یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہیں''۔

''میں سمجھ گیا جناب''۔ جہانداد بولا۔ ''یہ پولیس کی خفیہ باتیں ہیں اور میں ایک غیر متعلق عام سا شخص ہوں۔ میرے لیے یہ اہم معلومات جان لیوا ثابت ہوسکتی ہیں''۔

''بالکل یہی بات ہے''۔ اس نے کہا۔ ''لیکن تم ایک عام آدمی نہیں ہو۔ بلکہ بہت گہرے انسان ہو۔ تم سے دل کی باتیں اگلوانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے''۔

جمشید خان کی ذومعنی باتیں سن کر بے اختیار جہانداد کا دل دھڑک اٹھا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے جمشید خان کی تیز نگاہیں اس کے دل ودماغ کا ایکسرے لے رہی ہوں۔ اسے اندر لفظ بہ لفظ پڑھ رہی ہوں۔ تاہم اس نے پریشانی کی بجائے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''جہانداد!'' جمشید خان بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم بچے نہیں ہو اور نہ ہی شکل سے احمق نظر آتے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے کہنے کا کیا مطلب تھا؟''

''یقین کریں میں بالکل نہیں سمجھا''۔ جہانداد کی حیرت دوچند ہوگئی۔ ''اگر مجھ سے کوئی شکایت ہے تو حکم کریں؟ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی شکایت دور ہوجائے''۔

''کتنے جھوٹ بولو گے جہانداد؟'' جمشید خان نے شکایتی انداز میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟ یا پھر تم مجھے کم ظرف اور احسان فراموش انسان سمجھتے ہو؟''

''کب جھوٹ بولا ہے میں نے آپ کے سامنے؟'' جہانداد نے بدستور حیران انداز استفسار کیا۔ ''مجھے لگتا ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے''۔

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی''۔ اس نے جواب دیا۔ ''سیدھی طرح مجھے اپنے بارے میں کچھ بتادو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے؟ مجھے مجبور مت کرو۔ میں احسان فراموش نہیں بننا چاہتا''۔

''ٹھیک کہتے ہو صاحب''۔ جہانداد ایک افسردہ سی آہ خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آج معلوم ہوگیا کہ لوگ پولیس والوں کی دوستی سے کیوں کتراتے ہیں؟ کیوں ان کے خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیوں ان پر اعتبار نہیں کرتے؟ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس بات کی سچائی پر مجھے یقین آگیا ہے کہ پولیس والوں کی دوستی مطلب کی ہوتی ہے۔ جب مطلب نکل جاتا ہے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں''۔

''دیکھو جہانداد!'' وہ نرم انداز میں گویا ہوا۔ ''تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میرے خلوص



کو شک کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہو حالانکہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے محسن ہو۔ تمہیں جرم کے راستے پر چلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا اس لیے تمہارے ماضی کے متعلق جاننا چاہتا ہوں''۔

''میرا ماضی بالکل بے داغ ہے۔ میں نے کبھی......''

اسی وقت ایک نوکر ڈاکٹر کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوا اور جہانداد کی بات ادھوری رہ گئی۔ جمشید خان کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ ان کی جان پہچان برسوں پر محیط تھی۔ چنانچہ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد جمشید خان کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب! جہانداد میرا معزز مہمان ہے۔ میں آپ کو رات کے وقت تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہوں۔ دراصل معاملہ ہی ایسا تھا کہ آپ کو تکلیف دینے کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔ اسے میرا مہمان سمجھ کر کچھ مجرم پیشہ لوگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی اور نتیجے میں یہ زخمی ہو گیا۔ میں اگر اسے ہسپتال بھجوادیتا تو یہ پولیس کیس بن جاتا۔ سو میں نے آپ کو بلوالیا تاکہ معاملہ گھر میں ہی نمٹ جائے''۔

''کوئی بات نہیں ہے خان صاحب''۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں آپ کا مہمان میرا بھی مہمان ہے''۔

''شکریہ ڈاکٹر صاحب''۔ جمشید خان نے جواب دیا اور ڈاکٹر جہانداد کی طرف متوجہ ہوگیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر اس کے زخم کی بینڈیج سے فارغ ہوچکا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے جہانداد کو کچھ دردکش ادویات دیں اور اجازت طلب کرتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

===

''تم کچھ کہہ رہے تھے؟'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد جمشید خان اصل موضوع پر آتے ہوئے گویا ہوا۔

''ہاں...... میں کہہ رہا تھا کہ میں نہ ماضی میں مجرم رہا ہوں اور نہ ہی اب کوئی ایسی بات ہے۔ میں آپ کو اپنی کہانی سنا چکا ہوں۔ اگر آپ......''

''تم مجھے دو کہانیاں سنا چکے ہو''۔ جمشید خان نے استہزائیہ انداز میں قطع کلامی کی۔ ''ان میں سے سچی کہانی کون سی ہے، میں نہیں جانتا یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں کہانیاں من گھڑت ہوں''۔

''جمشید خان! یہ پٹھانوں کی روایات سے بغاوت ہے''۔ اچانک مسز سلطانہ کمرے میں داخل ہوکر بولی۔ غالباً اس نے جمشید کی بات سن لی تھی تبھی ناگوار انداز میں بول رہی تھی۔ ''مہمانوں سے ان کے بارے میں پوچھنا ہماری روایات کے خلاف ہے''۔

''میں جانتا ہوں ماں''۔ اس نے کہا۔ ''لیکن میں ایک پولیس والا ہوں اور آپ مجھ سے ایک وعدہ بھی کرچکی ہیں کہ جہانداد کی بازیابی کے بعد آپ......''

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے"۔ مسز سلطانہ نے قطع کلامی کی۔ "لیکن یہ وقت ایسی باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ جہانداد زخمی ہے ابھی اسے آرام اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے"۔

اس کے بعد وہ جہانداد کی طرف متوجہ ہوگئی۔ "معاف کرنا بیٹے!" وہ نادم انداز میں بولی۔ "تمہیں یقیناً جمشید خان کی باتوں سے تکلیف پہنچی ہوگی۔ پولیس والا ہے ناں! اسی لیے دوست دشمن سب کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بہرکیف میں تم سے معذرت خواہ ہوں"۔

"کوئی بات نہیں ہے ماں جی"۔ وہ فرماں برداری سے بولا۔ "جمشید خان کو میں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ اس کی کسی بات کا میں برا منا ہی نہیں سکتا"۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹا"۔ وہ ممنون انداز میں بولی۔ "تم یقیناً کسی نیک ماں باپ کے بیٹے ہو۔ بہرکیف تم گیسٹ روم میں جاکر آرام کرو میں تمہارے لیے کھانا بھجواتی ہوں"۔

"شکریہ ماں جی"۔ اس نے احسان مندانہ لہجے میں جواب دیا اور جمشید خان پر ایک نگاہ ڈالتا ہوں کمرے سے باہر نکل گیا۔

"جمشید!" اس کے جانے کے بعد مسز سلطانہ ناگوار انداز میں بولی۔ "تم بہت برا کر رہے ہو۔ تمہیں اس پر شک کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ کیا سوچے گا ہمارے بارے میں کہ ہمیں مہمان نوازی کے اصول تک معلوم نہیں ہیں۔ مہمانوں سے بھی بھلا کوئی ایسا سلوک کرتا ہے؟"

"پلیز ماں!" اس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنا شک دور کرنا ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر وہ مجھے قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا"۔

"یہ کام میں کروں گی"۔ مسز سلطانہ نے کہا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے"۔

"آپ کو وہ کچھ نہیں بتائے گا"۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ بہت چالاک شخص ہے۔ پھر کوئی من گھڑت کہانی سنا دے گا اور آپ اعتبار کرلیں گی۔ بہتر ہوگا کہ مجھے ہی تفتیش کرنے دیں؟"

"کبھی نہیں"۔ اس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔ "تم اس سے کچھ نہیں پوچھو گے یہ میرا حکم ہے"۔

"آپ یہ اچھا نہیں کر رہیں"۔ وہ شکوہ کناں ہوا۔ "یہ زیادتی ہے ماں اور میں اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ پلیز اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں"۔

"جمشید! کیا تمہیں اپنی ماں پر اعتماد نہیں ہے؟" اس نے متاسف انداز میں پوچھا۔ "یا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟ میں نے کہہ دیا ہے ناں کہ میں اس سے حقیقت معلوم کرلوں گی۔ میرے پاس ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ہوتے ہوئے بڑے سے بڑا مجرم بھی سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے"۔

"کیسا ہتھیار؟" جمشید خان نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔



"وہ ہتھیار جو ہر ماں کے پاس ہوتا ہے"۔ وہ فخریہ انداز میں بولی۔ "ماں کا ہتھیار جس کے آگے کوئی غیرت مند بیٹا جھوٹ نہیں بول سکتا"۔

"لیکن وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے"۔ جمشید خان معترض ہوا۔ "بلکہ سرے سے اس کا آپ کے ساتھ کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ وہ بھلا آپ کو اپنے دل کی بات کیوں بتائے گا؟"

"ضرور بتائے گا"۔ وہ واپس مڑتے ہوئے بولی۔ "اور بہت جلد بتائے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے بے فکر رہو"۔ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئی اور جمشید خان ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔ ماں کے سامنے وہ اپنی ...ری نہیں دکھا سکتا تھا۔

•:• ===•:• ===•:•

علاقہ غیر میں سکینہ اور خدیجہ کی زندگی بظاہر پُرسکون گزر رہی تھی۔ انہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ خان جی نے انہیں ایک پُرآسائش گھر میں رکھا ہوا تھا جہاں انہیں ضروریات زندگی کی ہر چیز دستیاب تھی۔ ان کی زندگی میں اگر کوئی کمی تھی تو جہانداد کی تھی جس کے بارے میں وہ دونوں مکمل طور پر لاعلم تھیں۔ خدیجہ کے کئی بار پوچھنے کے باوجود اسے جہانداد کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ ان کا رابطہ صرف موسیٰ خان سے تھا وہی ان کے پیغامات خان جی تک پہنچایا کرتا تھا۔

خان جی کی مہربانی اور عنایت سے سکینہ کا بہترین علاج ہوا تھا اور اب وہ بالکل صحت مند تھی مگر ...ں دلدوز واقعے کو کوشش کے باوجود فراموش نہیں کر پائی تھی۔ خوابوں میں اب بھی وہ نادر خان کو دیکھ کر ڈرتی رہتی تھی۔ نادر خان کی ہوس آلود نظریں کسی زہریلے بچھو کے مانند اسے اپنے بدن پر رینگتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اکثر راتوں کو وہ چیخ مار کر اٹھ جاتی تھی اور پھر ماں سے لپٹ کر رونے لگتی تھی۔ ایسے میں ماں اسے تسلیاں دیتی، اس کی پشت سہلاتی اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہتی۔ "سکینہ! میری بچی ہر انسان کی زندگی میں اچھے بُرے دن آتے رہتے ہیں۔ خدا ہم پر ایک مرتبہ پھر مہربان ہوگا اس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ بندے کے حال سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا۔ تُو اس سے اپنے لیے سکون کی دعا مانگ وہ تمہاری دعائیں ضرور سنے گا"۔

"ماں مجھے بہت ڈر لگتا ہے"۔ وہ کسی کمسن بچی کی طرح سہم کر جواب دیتی۔ "وہ تھانیدار پھر آجائے گا۔ اور...... اور مجھے پکڑ کر لے جائے گا۔ مجھے کہیں چھپا لو وہ بہت ظالم ہے اس نے بابا کو بھی مار ڈالا۔ سب اس سے ڈرتے ہیں"۔

وہ رونا شروع کر دیتی اور خدیجہ نادر خان کو بددعائیں دینے لگتی۔ جی بھر کر اسے کوستی اور پھر ...ے اپنے ساتھ سلا کر رات کا بقیہ حصہ جاگ کر گزار دیتی تھی۔

ایک روز صبح ہی صبح سکینہ کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ پہلے تو وہ درد برداشت کرتی رہی مگر جب

درد اس کی برداشت سے باہر ہونے لگا تو وہ بستر پر تڑپنے لگی۔ خدیجہ بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر دو
پر تعینات پہریداروں کے پاس پہنچ گئی۔ دونوں پہریدار موسیٰ خان کے حکم سے مستقل وہیں رہتے
وہ نہ صرف ان ماں بیٹی پر نظر رکھتے تھے بلکہ ان کے بیرونی کام سرانجام دینا بھی پہرے داروں
ڈیوٹی میں شامل تھا۔

''موسیٰ خان کو اطلاع کر دو ہمیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے''۔ خدیجہ جاتے ہی پریشانی کے
میں پہریدار سے بولی۔ ''میری بیٹی کے پیٹ میں درد ہے اور وہ بہت تکلیف میں ہے''۔

''موسیٰ خان تو کہیں گیا ہوا ہے''۔ پہریدار نے کہا۔ ''اسے خان جی نے.....''

''موسیٰ خان نہیں ہے تو کسی اور ذمہ دار شخص سے بات کرو''۔ اس نے قطع کلامی کی۔
جلدی کرو''۔

''ٹھیک ہے جی''۔ پہریدار نے اثبات سر ہلایا۔ ''میں کچھ کرتا ہوں آپ فکر نہ کریں۔ ویسے
پیٹ درد کی گولیاں میرے پاس پڑی ہوئی ہیں اور بہت اچھی گولیاں ہیں۔ آپ اگر کہیں تو میں لا
ہوں''۔

''نہیں ڈاکٹر کی تشخیص کے بغیر دوائی کھانا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کیا خبر وہ گولیاں
پرانی ہو چکی ہوں''۔

''گولیاں تو بالکل نئی ہیں جی''۔ پہریدار نے بتایا۔ ''ایک ہفتہ پہلے مجھے ڈاکٹر صاحب نے
تھیں۔ اگر آپ ڈرتی ہیں تو پھر رہنے دیجیے۔ میں اپنے ساتھی کو حویلی بھیج دیتا ہوں''۔

''اچھا جلدی کرو۔ میری بیٹی درد سے تڑپ رہی ہے''۔ وہ واپس پلٹتے ہوئی بولی اور پہریدار
اپنے ساتھی کو آوازیں دینے لگا۔

خدیجہ جب دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو سکینہ درد کی شدت سے کراہ رہی تھی اسے بستر
کہیں بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ کبھی دائیں بائیں کروٹ بدلتی تو کبھی اوندھی لیٹ کر پیٹ کے نیچے تکیہ
رکھ لیتی۔ خدیجہ چند لمحے تو بے بس نگاہوں سے اسے تکتی رہی پھر آگے بڑھ کر اس کے ساتھ بستر پر بیٹھتے
ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہنے لگی۔ ''صبر کرو سکینہ! میں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے پہریدار کو بھیج
ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار کر لو''۔

''ماں!'' وہ درد سے تڑپتے ہوئے بولی۔ ''میرے پیٹ کو کوئی خنجر سے کاٹ رہا ہے۔ میں مر
رہی ہوں۔ خدا کے لیے کچھ کیجیے''۔

''ماں صدقے میری جان''۔ وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے بولی۔ ''بس تھوڑی دیر صبر
ڈاکٹر آتا ہی ہوگا''۔



''ڈاکٹر کے پہنچنے تک تو میں مرجاؤں گی''۔ وہ رونے لگ گئی۔

''اللہ نہ کرے''۔ خدیجہ نے تڑپ کر کہا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو پگلی؟ تم تو سو سال تک جیو گی۔
نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟ اللہ کرے تمھیں میری بھی عمر لگ جائے''۔

''بہت شدید درد ہو رہا ہے''۔ وہ کراہتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔ ''پتا کرو ڈاکٹر کب آئے گا''۔

''اچھا جاتی ہوں''۔ اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور سکینہ دوبارہ کراہتے ہوئے کروٹیں
نے لگی۔

کمرے سے نکلنے کے بعد خدیجہ جونہی بیرونی دروازے تک پہنچی ٹھٹک کر رک گئی کھلے
ے میں پہریدار کے ساتھ ایک اجنبی شخص موجود تھا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر
تھے۔ خدیجہ پر نظر پڑتے ہی پہریدار بولا۔ ''لو جی وہ خود ہی آگئی ہے۔ آپ بات کرلیں''۔

''خالہ..... میرا نام شمروز خان ہے''۔ اجنبی اپنا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں موسیٰ
دوست ہوں اور اس کی عدم موجودگی میں اس کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر کو
کے لیے آدمی بھیج دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد پہنچ جائے گا۔ کیا میں آپ کی بیٹی کی عیادت کر
سکتا ہوں؟''

''اسے عیادت کی نہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے''۔ وہ پریشانی کے عالم میں بولی۔ ''وہ درد سے
رہی ہے۔ اسے اپنا ہوش تک نہیں ہے ایسی صورتِ حال میں تم اس کی کیا عیادت کرو گے؟''

''مجھے موسیٰ خان آپ لوگوں کا خیال رکھنے کے لیے کہہ گیا ہے''۔ شمروز خان نے کہا۔ ''اگر
راستہ آپ کی بیٹی کو کچھ ہو گیا تو موسیٰ خان مجھے کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔ اگر آپ محسوس نہ
تو میں اُسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں؟''

''تمھیں قیدیوں سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔
بھلا کیسے اعتراض کر سکتے ہیں؟''

''میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں خالہ''۔ شمروز خان نے جواب دیا۔ ''آپ ماں بیٹی میری
ہیں۔ میں موسیٰ خان کی حکم عدولی نہیں کر سکتا''۔

''آجاؤ''۔ وہ راستہ چھوڑتے ہوئے نیم دلی سے بولی اور شمروز خان اندر آگیا۔



شمروز خان جب خدیجہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو سکینہ بدستور بستر پر پڑی درد کی
سے کراہ رہی تھی۔ بار بار کروٹیں بدلنے سے اس کا لباس بے ترتیب ہو گیا تھا۔ پیٹ سے قمیص
ہٹ کر شلوار سرکی ہوئی تھی۔ شدید درد نے اسے لباس سنبھالنے کا موقع ہی کب دیا تھا۔ یہ

منظر دیکھ کر ایک لمحے کے لیے شمروز خان کی آنکھوں میں ہوس کی چمک لہرا کر معدوم ہوگئی اور اس کی سماعتوں میں پہریدار کی آواز گونج لگی۔ ''شمروز خان، بڑھیا کی بیٹی قیامت ہے قیامت، اچھے اچھوں کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اس کا حسن و جمال دیکھ کر''۔

خدیجہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر بیٹی کا بے ترتیب لباس درست کیا اور پھر شمروز خان سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''تم اس کی تکلیف کا اندازہ نہیں لگا سکتے مگر میں لگا سکتی ہوں کیونکہ میں اس کی ماں ہوں۔ میں نے اسے جنم دیا ہے۔ جاؤ خدا کے لیے جلدی سے ڈاکٹر کو لے آؤ''۔

''ڈاکٹر بس پہنچنے ہی والا ہوگا''۔ شمروز خان بدستور کروٹیں بدلتی ہوئی سکینہ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''آپ اسے کوئی قہوہ وغیرہ پلائیں شاید درد میں افاقہ ہوجائے''۔

''پیٹ کا درد بھی بھلا کبھی قہوہ پینے سے ٹھیک ہوا ہے''۔ خدیجہ نے اس کے احمقانہ مشورے پر کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم باہر جاؤ میں اسے سنبھالتی ہوں''۔

اس کے لہجے میں ناگواری محسوس کرتے ہوئے شمروز خان بادلِ نخواستہ باہر نکلا اور بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ دل ہی دل میں وہ بڑھیا کو صلواتیں سنا رہا تھا جس نے اسے ایک دلکش نظارے سے محروم کر دیا تھا تاہم اس کے تصور میں سکینہ کا پُر شباب بدن چکرا رہا تھا۔ صرف ایک لمحے کے نظارے نے اس کے دل میں آگ لگا دی تھی۔ فطرتاً وہ ایک عیاش طبع شخص تھا لیکن خان جی موسیٰ خان کے سامنے دکھاوے کا شریف بنا رہتا تھا۔

''یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں شمروز خاناں؟'' پہریدار اسے دیکھتے ہی طنزیہ انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے بڑھیا نے تجھے زبردستی گھر سے نکال دیا ہے اور شاید بیٹی تک پہنچنے ہی نہیں دیا''۔

''نہیں یار''۔ وہ خواب ناک انداز میں گویا ہوا۔ ''میں اس کی بیٹی کو دیکھ چکا ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا وہ قیامت سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیا بدن ہے شیشے کی طرح شفاف۔ ایمان سے نظر ہی نہیں ٹھہرتی تھی اس پر اب تو آنا جانا لگا رہے گا''۔

''موسیٰ خان کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟'' پہریدار نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ''وہ تو ہم دونوں کو زندہ جلا دے گا''۔

''اسے اگر پتا چل گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم دونوں کا نام نہیں لوں گا''۔ شمروز خان نے جواب دیا۔ ''بس محتاط رہو۔ کسی کے سامنے اس بات کا ذکر نہ کرنا اپنے ساتھی کو بھی اچھی طرح سمجھا دو۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد میں تم دونوں کو منہ مانگا انعام دوں گا''۔

''دیکھو شمروز خان! زبردستی مت کرنا لڑکی کے ساتھ، میں نے سنا ہے وہ بڑی اکھڑ مزاج ہے۔



پہریدار کو بھی اس نے گھاس نہیں ڈالی تھی۔ وہ مرنے مارنے پر تل جانے والی......''

''میں سب سن چکا ہوں''۔ شمروز خان نے قطع کلامی کی۔ ''تم بے فکر رہو میں احمق نہیں ہوں کہ اس کے ساتھ زبردستی کروں گا۔ میں اسے پیار سے بہلا پھسلا کر لائن پر لاؤں گا''۔

''اور اگر اس نے تمہیں دھتکار دیا تو کیا کرو گے؟'' پہریدار نے قدرے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''میں نے کہہ دیا ہے ناں! کہ تم دونوں پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ پھر تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟ موسیٰ خان کوئی غیب کا علم تو نہیں رکھتا؟'' اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''موسیٰ خان غیب کا علم تو نہیں رکھتا مگر وہ کسی شیطان سے کم نہیں ہے''۔ پہریدار نے کہا۔ ''وہ آدمی کا چہرہ دیکھ کر دماغ پڑھ لیتا ہے اور پھر کسی کی معمولی سی غلطی بھی معاف نہیں کرتا۔ عورت کے معاملے میں تو مجرم کو اپنی صفائی میں ایک لفظ کہنے کا موقع تک نہیں دیتا''۔

''ٹھیک ہے میں احتیاط کروں گا''۔ وہ زچ ہوکر بولا۔ ''اب نصیحتیں رہنے دو''۔

اسی دوران انہیں سامنے سے ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی اور وہ باتوں کا سلسلہ ادھورہ چھوڑ کر جیپ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ جیپ ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ شمروز خان تیزی سے آگے بڑھا اور ڈاکٹر کو سلام کرنے کے بعد اس کے ہاتھ سے فرسٹ ایڈ بکس لیتے ہوئے بولا۔ ''آیئے ڈاکٹر صاحب! مریضہ بہت تکلیف میں ہے''۔

''چلو''۔ ڈاکٹر نے ایک لفظ کہنے پر اکتفا کیا اور پھر شمروز خان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ شمروز خان نے جیپ کے ڈرائیور کو وہیں رکنے کی تاکید کر دی تھی۔

مریضہ کے پاس پہنچتے ہی ڈاکٹر نے اس سے حالت دریافت کی تو سکینہ کی بجائے اس کی ماں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو بتاتی ہوں۔ صبح ناشتہ کرنے کے بعد ہی اس کے پیٹ میں درد شروع ہوگیا تھا۔ پہلے ہلکا ہلکا سا تھا مگر بعد میں شدید ہوتا گیا''۔

''ناشتے میں کیا چیز کھائی تھی اس نے؟'' ڈاکٹر نے استفسار کیا۔

''وہی جو ہر روز کھاتی ہے''۔ اس نے بتایا۔ ''ایک پراٹھا اور چائے کی دو پیالیاں''۔

ڈاکٹر اور خدیجہ کی گفتگو سے بے نیاز ہوکر شمروز خان ایک بار پھر ہوسناک نگاہوں سے تڑپتی کراہتی ہوئی سکینہ کو گھور رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ سکینہ پر جھپٹ پڑتا مگر ڈاکٹر اور اس کی ماں کی موجودگی میں وہ اپنی گندی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے ایک دو باتیں کراہتی ہوئی سکینہ سے پوچھیں اور پھر انجکشن تیار کر کے سکینہ کے بازو کی رگ میں لگا دیا۔ انجکشن فوری اثر کرنے والا پین کلر تھا۔ پانچ دس منٹ کے اندر سکینہ کی حالت بہتر ہونا

شروع ہوگئی اور ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے خدیجہ کو چند دوائیں دیں اسے کھانے کا طریقہ اور اوقات سمجھانے کے بعد وہ تاکیدی انداز میں بولا۔ ''چند روز اسے ہلکی غذا دینا۔ خیال رکھنا کہ کوئی ثقیل چیز نہ کھائے اور دوائی باقاعدگی کے ساتھ دیتی رہنا ناغہ نہ ہونے پائے ورنہ درد دوبارہ اٹھ سکتا ہے''۔

''میں خیال رکھوں گی ڈاکٹر صاحب''۔ خدیجہ ممنون انداز میں بولی۔ ''آپ تشریف رکھیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں''۔

''نہیں خاتون! آپ کا بہت بہت شکریہ''۔ ڈاکٹر نے اجازت طلب انداز میں کہا۔ ''میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کلینک پر مریض میری واپسی کے شدت سے منتظر ہوں گے۔ عام طور پر میں گھروں میں جا کر مریض دیکھنے سے گریز کرتا ہوں لیکن خان جی کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ اب اجازت چاہوں گا''۔ شمروز خان ڈاکٹر کی بات سن کر دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیج رہا تھا تاہم خدیجہ ڈاکٹر کی معذرت قبول کرتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ آپ نے ہم جیسے عام لوگوں کے لیے اتنی تکلیف اٹھائی ہے''۔

''ڈاکٹر کے لیے مریض صرف مریض ہوتا ہے۔ عام اور خاص نہیں ہوتا بہر کیف میں.....''

''جناب!'' شمروز نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ان کا دل رکھنے کے لیے ہی چائے پی لیں۔ دیر نہیں لگے گی اور ویسے بھی میرے خیال میں کسی غریب کی خوشی کے لیے چند لمحات ضائع کیے جا سکتے ہیں''۔

''نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب''۔ خدیجہ اُن جانے میں شمروز خان کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا وقت میری چائے اور خوشی سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں''۔

''شکریہ خاتون''۔ ڈاکٹر نے مشکور انداز میں کہا اور پھر خدا حافظ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ شمروز خان نے ایک آخری نگاہ سکینہ کے سراپے پر ڈالی، اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری پھر ڈاکٹر کی شان میں دل ہی دل میں قصیدہ گوئی کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

بیرونی دروازے سے باہر نکل کر شمروز خان نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اس سے فیس وغیرہ معلوم کرنے کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

''بولو شمروز خان!'' ڈاکٹر کے رخصت ہونے کے بعد پہریدار نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ ''مریضہ خاص کا کیا حال ہے؟ ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے؟''

''مریضہ تو ٹھیک ہو گئی ہے لیکن''۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک ٹھنڈی آہ خارج کی۔



گویا ہوا۔ ''لیکن اپنا برا حال ہے۔ وصالِ یار کے لیے ابھی سے تڑپنے لگا ہوں''۔

''اتنا جلد باز مت بن یار! کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں''۔ پہریدار نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''پہلے لڑکی سے جان پہچان بڑھا۔ بعد میں موقع دیکھ کر اپنی خواہش پوری کر لینا''۔

''بڑھیا بڑی چالاک ہے''۔ شمروز خان بولا۔ ''مگر میرا نام بھی شمروز خان ہے۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو مجھے انگلیاں ٹیڑھی کرنا بھی آتا ہے''۔

''جو کچھ بھی کرنا احتیاط سے کرنا''۔ پہریدار نے کہا۔ ''ہم دونوں کا نام کہیں بھی نہیں آنا چاہیے''۔

''نہیں آئے گا بے فکر رہو۔ بہرکیف ابھی تو میں جا رہا ہوں شام کو دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ تم اپنے ساتھی کو سمجھا دینا''۔

''شام کے وقت میری ہی ڈیوٹی ہوگی''۔ پہریدار نے جواب دیا اور شمروز خان اسے خدا حافظ کہتے ہوئے چل دیا۔

•:• ===•:• ===•:•

چند روز کے بعد جہانداد کا زخم بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس دوران مسز سلطانہ اسے متعدد بار کرید چکی تھی مگر اس نے اسے اصل بات نہیں بتائی تھی۔ ایک دو بار جمشید خان نے بھی اس سے بات کی تھی اور اس کی سنائی ہوئی دونوں کہانیوں کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے اسے سچ بتانے کے لیے مجبور کیا تھا، لیکن جہانداد رحیم خان والی کہانی پر ڈٹا رہا اور دلیل یہ پیش کی کہ اس نے جو پہلی کہانی سنائی تھی وہ جھوٹی تھی محض پولیس کی تفتیش سے بچنے کے لیے اس نے وقتی طور پر گھڑی تھی۔ تب جمشید خان نے اس سے مشکوک انداز میں استفسار کیا۔ ''اگر وہ کہانی جھوٹی تھی تو خلیل بھائی کے فارم ہاؤس پر تمہاری موجودگی کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟ وہاں تم کیا کرنے گئے تھے؟''

''یہ بات کئی مرتبہ میں آپ کو بتا چکا ہوں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''میں وہاں پانی تلاش کرتے ہوئے پہنچ گیا تھا یہ محض اتفاق ہی تھا''۔

''تمہاری زندگی میں اتفاقات کا کچھ زیادہ عمل دخل نہیں ہے؟'' جمشید خان نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ ''اتفاق سے تم اس ویران سڑک پر جا نکلے، اتفاق سے تمہاری جیپ کا انجن گرم ہو گیا۔ اتفاق سے وہاں نزدیک کہیں بھی پانی موجود نہیں تھا۔ اتفاق سے تم خلیل بھائی کے فارم ہاؤس تک پہنچ گئے۔ اتفاق سے تم فارم ہاؤس کے اندر داخل ہو گئے۔ اتفاق سے تم نے ان سب پر قابو پا لیا اور پھر اتفاق سے ہی تم میمونہ تک پہنچ گئے۔ واہ کیا خوبصورت کہانی گھڑی ہے کہیں یہ اتفاق تمہارا ہمزاد تو نہیں ہے؟ آخر ہر وقت اور ہر موقع پر تمہارے ساتھ کیوں رہتا ہے؟''

''آپ شاید مجھے خلیل بھائی کا ساتھی سمجھ رہے ہیں''۔ جہانداد متاسف لہجے میں بولا۔ ''اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر مجھے گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیں۔ سوالات پوچھ پوچھ کر کیوں وقت ضائع کر رہے ہیں مجھے کچھ تو قانون کی مدد کرنے کا صلہ ملنا چاہیے''۔

''مجھے جذبات میں بہانے کی کوشش مت کرو''۔ اس نے کہا۔ ''جو سچ ہے وہ بتاؤ ورنہ مجبور ہو کر مجھے تمہیں گرفتار کرنا پڑ جائے گا''۔

''گرفتار کریں ناں! میں نے کب انکار کیا ہے؟'' جہانداد نے جواب دیا۔

''تو یہ طے ہے کہ تم سچ نہیں بتاؤ گے؟''

''سچ تو بتا دیا ہے میں نے آپ کو''۔ جہانداد بولا۔ ''اب آپ کو یقین نہیں آتا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تمہیں شاید یہ بات معلوم نہیں ہے کہ انسپکٹر چنگیز خان کی تفتیش کون سا رخ اختیار کر چکی ہے۔ اختر اور اکرم کا بیان قلم بند ہو چکا ہے۔ انہوں نے جو انکشافات کیے ہیں وہ نہ صرف حیرت انگیز بلکہ بہت دلچسپ اور اہم ہیں''۔ جمشید خان نے اسے طنزیہ انداز میں بتایا۔ ''اور کل صبح انسپکٹر چنگیز خان مجھے کوئی اہم بات بتانے کے لیے آ رہا ہے''۔

اس کی بات سن کر بے اختیار جہانداد کا دل دھڑک اٹھا اور بیک وقت بیسیوں پریشان کن خیالات نے اسے گھیر لیا۔ وہ اگر مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو دل کا حال اس کے چہرے پر نمودار ہو چکا تھا تاہم پھر بھی اس کے چہرے پر معمولی سے پریشانی کے آثار ایک لمحے کے لیے ابھر کر معدوم ہو گئے۔

''اکرم اور اختر کے انکشافات سے میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟'' اس نے اک ذرا توقف سے پوچھا۔ ''میں تو انہیں جانتا تک نہیں ہوں''۔

''سوچ لو جہانداد!'' جمشید خان اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں اب بھی تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں مگر شرط وہی ہے کہ تم مجھے اپنے متعلق سب کچھ سوچ سچ بتا دو۔ میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے''۔

جہانداد لمحہ بھر کے لیے سوچوں میں ڈوب گیا۔ جمشید خان اپنی جگہ پہ سچا تھا لیکن وہ اس کے سامنے لگاتار جھوٹ بولتا چلا آ رہا تھا۔ صرف اپنے نام کی حد تک ہی اس نے جمشید خان کے سامنے سچ بولا تھا ورنہ تو اس کی سنائی ہوئی ساری کہانیاں من گھڑت تھیں۔ جمشید خان کا مشکوک ہونا بجا تھا۔ جہانداد کو اب اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کے سامنے عملاً یہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے یا ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔ وہ



شکار ہو چکا تھا ایک طرف جمشید خان کا اصرار تھا تو دوسری طرف اس کی اپنی زندگی تھی، ماں اور بہن کی سلامتی تھی۔ ''میں اگر جمشید خان کو سچ بتا دیتا ہوں تو یقیناً جیل ہی میرا ٹھکانا ہو گی''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''کیا مجھے ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟''

''سچ میں اطمینان اور سکون ہے میرے دوست!'' جمشید خان نے اسے سوچوں میں کھویا دیکھ کر دوستانہ انداز میں کہا۔ ''کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے یا تم مجھے احسان فراموش سمجھتے ہو؟''

''مجھے آپ پر اعتبار نہ ہوتا تو میں دوبارہ یہاں آتا ہی کیوں؟'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''کہیں اور بھی تو جا سکتا تھا''۔

''جہانداد! تم ایک اچھے اور بہادر انسان ہو''۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا ثبوت تم دو بار دے چکے ہو۔ ایک بار میمونہ کو بچا کر اور دوسری بار مجھے۔ تم اگر بر وقت مجھے ہسپتال نہ لے جاتے تو شاید آج میں منوں مٹی کے نیچے ہوتا۔ میں تمہارا تہہ دل سے مشکور اور احسان مند ہوں اور ان احسانوں کے بدلے تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم خود مجرم نہیں ہو تمہاری کسی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر تمہیں جرم کے راستے پر ڈالا گیا ہے۔ یہ میرا اندازہ ہے جو غلط نہیں ہو سکتا۔ اپنی پروفیشنل زندگی میں میرا واسطہ بارہا ایسے لوگوں سے پڑ چکا ہے جو مجبوری کے عالم میں جرم کے راستے پر چل رہے تھے۔ تم بھی انہی لوگوں میں شامل ہو جو اپنی خوشی سے جرم نہیں کرتے بلکہ جرم ان سے کرایا جاتا ہے''۔ سانس درست کرنے کے لیے اس نے ایک ذرا توقف کیا اور دوبارہ گویا ہوا''۔ میں پچھلے کئی روز سے مسلسل تمہارے متعلق سوچ رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کوئی تمہیں بلیک میل کر رہا ہے۔ تم ذہنی اذیت میں مبتلا نظر آتے ہو۔ تمہیں اگر مجھ پر بھروسہ ہے اور تم مجھے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتے ہو تو پھر میرے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دو''۔

اس کی باتیں سن کر جہانداد نے بالکل چپ سادھ لی تاہم اس کے دل و دماغ میں ایک فیصلہ کن جنگ چھڑ چکی تھی۔ جمشید خان پُر امید نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جہانداد کے چہرے کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے تاثرات اس کی اندرونی حالت کو عیاں کر رہے تھے۔ خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد جب وہ بولا تو جمشید خان ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''میرا خلیل بھائی اور اس کے گینگ سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ جہانداد نے کہنا شروع کیا۔ ''لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں مجرم ہوں اور ایک ایسی ہستی کا آلہ کار ہوں جس کا نام سن کر آپ کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آئے گا کیونکہ وہ شخص قانون کی نگاہوں میں نہ صرف قابلِ احترام ہے بلکہ اس نے قانون کو اپنے گھر کی لونڈی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ میری ماں اور بہن اس کے پاس یرغمال ہیں اور میں اس کے اشاروں پر ناچتا پھر رہا ہوں اگر میں ایسا نہ کروں تو وہ میری ماں اور بہن کو گولی مار دے گا اور

میرے پیچھے صوبے بھر کی پولیس لگا دے گا۔ میں جس مشکل میں پھنسا ہوا ہوں اس سے نکلنا ناممکن ہے۔"

"جہانداد! دنیا میں ہمت والوں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ تم مجھے اس شخص کا نام بتاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے گرفتار کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور اگر خدانخواستہ میں اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا تو اس لڑائی میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ بس تم مجھے اپنی پوری سرگزشت سنا دو؟"

"اس معزز ہستی کا نام سردار فراست علی خان ہے۔" جہانداد نے زہر خند سے کہا۔ "بولو! اسے گرفتار کر سکو گے؟"

"اوہ...... نو......" جمشید خان کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا۔ وہ تو بہت اہم شخص ہے ملک گیر شہرت کا مالک ہے۔ وہ مجرم کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں نے آپ سے کہا تھا ناں؟" جہانداد بولا۔ "آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ افضال خٹک کو بھی اسی نے مروایا ہے۔ ایک مہرے کے ہاتھوں اور دوسرا مہرہ اس وقت آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔"

"یہ...... یہ تم نے کیسی بکواس شروع کر دی ہے؟" جمشید خان کو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ "کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟ جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو اور کس کے سامنے کہہ رہے ہو؟ میں ایک ذمہ دار پولیس آفیسر ہوں۔"

"اور اب اس نے حکم دیا ہے کہ آپ کو بھی راستے سے ہٹا دیا جائے۔" جہانداد اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ آپ اس کے منشیات اور اسمگلنگ کے دھندے میں رکاوٹ بن رہے ہیں اس کے کارندوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔"

"مجھے تفصیل بتاؤ؟" جمشید خان حیرت کے ابتدائی جھٹکوں سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ "تم اس کے لیے اور کون کون سے جرائم سرانجام دے چکے ہو؟"

اس کے استفسار پر جہانداد نے تفصیل کے ساتھ اسے اپنی سرگزشت سنا دی۔ حتیٰ کہ اس نے یہ بات بھی پوشیدہ نہ رکھی کہ وہ چند سال ملٹری میں سروس کر چکا ہے۔

"تمہارے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا ہے مگر قانون کو ہاتھ میں لے کر تم نے اپنی مشکلات میں اضافہ ہی کیا ہے۔ افضال خٹک کے قاتل کو پوشیدہ رکھنا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہے۔ تمہیں شاید بالکل خبر نہیں ہوگی کہ یہ کیس کرائم برانچ کے جس آفیسر کے ہاتھ میں ہے وہ اپنے سگے باپ کا جرم بھی معاف نہیں کرتا۔ آئی جی صاحب تک کی بات نہیں مانتا۔ پورے ڈپارٹمنٹ میں سرپھرا صاحب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں تمہارا ساتھ دینا میرے لیے سخت مشکلات کھڑی کر سکتا



تمہارے وعدے کے مطابق میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔" اس کی پوری کہانی سننے کے بعد جمشید خان نے صاف گوئی سے اپنے خیالات بیان کر دیے۔

"میں ہر قسم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔" جہانداد نے کہا۔ "مگر ماں اور بہن کی زندگی کسی قیمت داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے جان سے ہی کیوں نہ گزرنا پڑے۔"

اس کی بات سن کر جمشید خان چند لمحوں کے لیے سوچوں میں ڈوب گیا۔ جہانداد امید و بیم کی کیفیت میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اس کی قسمت کا فیصلہ اس وقت جمشید خان کے ہاتھوں میں تھا۔

"یہ موسیٰ خان کہاں ملے گا؟" خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد جمشید خان نے استفسار کیا۔ "یہ اگر گرفتار ہو جائے تو تم با آسانی بچ سکتے ہو۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" جہانداد بولا۔ "ہو سکتا ہے اسی شہر میں کہیں روپوش ہو لیکن یہ صرف امکان ہے ورنہ تو اسے اس وقت خان جی کے پاس علاقہ غیر میں ہونا چاہئے۔"

"یہ خان جی کون ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"سردار فراست علی خان اپنے علاقے میں خان جی کے نام سے مشہور ہے۔" جہانداد نے جواب دیا۔

"اس خان جی پر تو فی الحال ہاتھ ڈالنا ناممکن ہے۔" وہ افسوسناک انداز میں بولا۔ "تاہم اگر تم چاہو تو اس کی راتوں کی نیندیں حرام کی جا سکتی ہیں۔ اسے اپنا سیاسی مستقبل محفوظ کرنے کے لیے تمہارے سامنے جھکنا پڑ جائے گا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہاری ماں اور بہن کو اپنی مرضی کے خلاف زندہ رکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"میں تیار ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا؟" جہانداد نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

"اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا پڑے گا۔" اس نے جواب دیا۔ "تم اسے افضال خٹک قتل کیس میں وعدہ معاف گواہ بننے کی دھمکی دو اور......"

"تاکہ وہ وقت سے پہلے میری ماں اور بہن کو کاٹ ڈالے۔" جہانداد اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "اور میرے پیچھے قاتلوں کی فوج لگا دے۔"

"تم بیوقوف ہو...... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" اس نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔ "میں نہ صرف تمہیں بچانا چاہتا ہوں بلکہ تمہاری ماں اور بہن کو بھی اس کے شر سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ تم اس کے خلاف بغاوت کر دو۔ آج تک وہ تمہیں بلیک میل کرتا رہا ہے۔ اب تم اسے بلیک کرنا شروع کر دو۔"

''اگر وہ بلیک میل نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟'' جہانداد نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ ''کون میری ماں اور بہن کی سلامتی کی ضمانت دے سکتے ہیں؟''

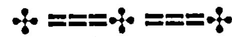
''اس کے بلیک میل ہونے کے سو فیصد امکانات ہیں''۔ جمشید خان نے جواب دیا۔ ''جہاں تک تمہارے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ رسک لیے بغیر کسی بھی خطرے کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس مسئلے کا یہی ایک حل ہے۔ صرف تمہاری بغاوت ہی اسے انتہائی قدم اٹھانے سے باز رکھ سکتی ہے ورنہ اس بساط پر سارے اچھے مہرے اس کے ہاتھ میں ہیں۔''

''مجھے اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''لیکن ماں اور بہن کی زندگی رسک لینا میرے لیے ناممکن ہے...... آپ کچھ اور سوچیں کوئی اور لائحہ عمل......''

''مجھے گولی مار دو''۔ اس نے جھنجھلا کر قطع کلامی کی۔ ''یہ اس مسئلے کا آسان حل ہے''۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا''۔ جہانداد شکایتی انداز میں بولا۔ ''میں صرف اپنی ماں اور بہن کی سلامتی کے متعلق فکر مند ہوں ورنہ تو میرے دل میں خان جی کے خلاف جو نفرت بھری ہوئی ہے اس کا آپ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے''۔

''تمہارے پاس صرف آج کا دن ہے جہانداد! جتنا چاہو اس مسئلے پر سوچ سکتے ہو۔ میں کل دوبارہ تم سے بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے اس عرصے کے دوران تم کوئی مثبت فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے''۔ اس نے حتمی انداز میں کہا اور پھر جہانداد کو سوچوں میں غرق چھوڑ کر باہر نکل گیا۔



موسیٰ خان کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شمروز خان گزشتہ کئی روز سے بہانے بہانے سے خدیجہ کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹی دوسرے دن سے ہی شمروز خان کے متعلق مشکوک ہوگئی تھیں مگر کوشش کے باوجود اسے گھر آنے سے روک نہیں سکی تھیں۔ خدیجہ جب بھی اسے منع کرتی تو وہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا۔ ''میں آپ لوگوں کا دشمن تو نہیں ہوں۔ خدمت گار ہوں نوکر ہوں۔ پھر آپ کو میرا آنا ناگوار کیوں گزرتا ہے؟''

''تم پچھتاؤ گے شمروز خان!'' وہ دھمکی دیتی۔ ''تم نے اگر اپنی یہ روش ترک نہ کی تو میں خان جی تک پیغام پہنچا دوں گی''۔

''یہ تو وہی بات ہوگئی خالہ کہ نیکی برباد اور گناہ لازم''۔ وہ دانت نکالتے ہوئے جواب دیتا۔ ''میں تو آپ لوگوں کا حال دریافت کرنے کے لیے آتا ہوں اور یہ کام مجھے موسیٰ خان سونپ گیا ہے میں اپنی مرضی سے نہیں آتا''۔



اس کے بعد دونوں ماں بیٹی اس پر لعنت بھیج کر اپنے کاموں سے لگ جاتیں اور شمروز خان بے حیا بنا وہیں بیٹھا رہتا۔ خدیجہ کئی بار دونوں پہریداروں سے اس کی شکایت کر چکی تھی مگر انہوں نے ان کی شکایت کو قابل اعتناء نہیں سمجھا تھا۔ دراصل دونوں پہریداروں کا منہ شمروز خان کی رشوت نے بند کر رکھا تھا۔

ایک روز حسبِ معمول صبح ہی صبح جب شمروز خان ان کے گھر آدھمکا تو خدیجہ نے طیش میں آ کر اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا مگر وہ برا منانے کی بجائے ڈھیٹ بن کر مسکراتا رہا تب اچانک ہی بالکل غیر متوقع طور پر سکینہ بھاگ کر باورچی خانے میں داخل ہوئی اور سبزی کاٹنے والی چھری اٹھانے کے بعد دوڑتے ہوئے باہر نکلی اور پھر کر شمروز خان پر حملہ آور ہوگئی۔ اس کا حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ سنبھلتے سنبھلتے بھی شمروز خان کے بازو پر ایک زخم آگیا۔ تاہم اس نے ایک جھٹکے سے سکینہ کو دور پھینک دیا تھا۔

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی حرام زادے''۔ اس پر ایک وار کرنے کے بعد سکینہ چلاتے ہوئے اٹھی اور زخمی شیرنی کی طرح دوبارہ اس پر جھپٹی مگر شمروز خان اس بار پہلے سے تیار تھا اس نے چشم زدن میں سکینہ کی کلائی پکڑی اور چھری چھین کر دور پھینک دی۔

''کتیا! شمروز خان پر ہاتھ اٹھاتی ہے''۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے سکینہ کو اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ چکرا کر گر پڑی۔ ''میں تجھے ہاتھ تو کیا آنکھیں اٹھانے کے لائق بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تُو سب سے منہ چھپاتی پھرے گی۔'' شمروز خان چلاتا ہوا آگے بڑھا۔

اس سنگین صورت حال نے ایک لمحے کے لیے تو خدیجہ کو پتھر کا بت بنا کر رکھ دیا تھا مگر پھر جلد ہی سنبھل کر عقب سے شمروز خان پر حملہ آور ہوگئی۔ اس نے شمروز خان کو بیٹی تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا۔ دونوں بازو شمروز خان کی گردن میں ڈال کر وہ اس کی پیٹھ پر سوار ہوگئی۔ شمروز خان نے اسے ایک ننگی گالی دیتے ہوئے اپنی گردن اس کے شکنجے سے چھڑائی اور پھر جنونی انداز میں خدیجہ پر ٹوٹ پڑا۔ بالوں سے پکڑ کر اس نے خدیجہ کو دو تین جھٹکے دیے اور پھر اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ ریس میں دوڑنے والے کتے کی طرح ہانپتے ہوئے دونوں ماں بیٹی کو فحش گالیاں بک رہا تھا۔ اس دوران سکینہ کو ایک بار پھر اٹھنے کا موقع مل گیا۔ قریب ہی ایک موٹی چھڑی پڑی ہوئی تھی جو غالباً کسی کلہاڑی کا استعمال شدہ دستہ تھا۔ سکینہ نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے شمروز خان کے عقب میں پہنچ گئی جو اس کی ماں کو زدوکوب کر رہا تھا۔ سکینہ نے چھڑی کو دونوں ہاتھوں میں لے کر سر سے بلند کیا اور پوری قوت کے ساتھ شمروز خان کے سر پر وار کر دیا۔ اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد نے شمروز خان کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں زخمی سر تھام کر وہ پیچھے گھوما تو سکینہ نے ایک

اور وار کر دیا۔ شمروز خان لہراتا ہوا زمین بوس ہو گیا اور سکینہ چھڑی پھینک کر کراہتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔

اس سارے جھگڑے کے دوران پہریداروں نے ایک لمحے کے لیے بھی اندر نہیں جھانکا تھا۔ وہ بیرونی دروازے کو باہر سے کنڈی لگائے آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ گھر کے اندر سے آنے والی نسوانی چیخ و پکار سے وہ قطعی لاتعلق نظر آ رہے تھے اور غالباً ان کی یہ لاتعلقی شمروز خان کی ہدایت کے مطابق تھی۔

خوش قسمتی سے خدیجہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی تاہم شمروز خان کی لاتیں اور تھپڑ کھا کر اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ سکینہ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور برآمدے میں پڑی ہوئی ایک چارپائی تک لے گئی۔ اسے چارپائی پر لٹانے کے بعد وہ دوڑ کر پانی لے آئی۔ سہارا دے کر اس نے ماں کو پانی پلایا اور پھر اس سے طبیعت کا حال پوچھنے لگی۔

''میں ...... ٹھیک ہوں بیٹی''۔ وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ ''بس پسلیوں میں درد ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اسے دیکھو کہیں مر ہی نہ جائے۔ تمہیں یوں اس کے سر پر ڈنڈا نہیں مارنا چاہیے تھا۔ وہ اگر مر گیا تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے لیکن تمہیں میں درندوں کے ہاتھوں میں تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتی''۔

''میرا دل چاہتا ہے اس حرامزادے کے گلے پر چھری پھیر دوں''۔ سکینہ نے زہریلے انداز میں کہا۔ ''اور اس کی گندی آنکھیں نکال کر چولہے میں جھونک دوں''۔

''ہم یہاں قیدی ہیں سکینہ''۔ اس نے التجا کی۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو۔ جاؤ جا کر پہریداروں کو اطلاع کر دو۔ یہ نہ ہو کہ یہیں مر مرا کر ہمارے گلے پڑ جائے''۔

ماں کا حکم سن کر وہ بادل نخواستہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ وہ باہر سے بند ہے۔ تب اس نے اندر سے کنڈی کھٹکائی مگر جب کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے زور زور سے دروازے کو دھڑ دھڑاتے ہوئے چلا کر کہا۔ ''دروازہ کھولو۔ جلدی کرو ورنہ پچھتاؤ گے''۔

اس کی پکار کا کوئی جواب نہ ملا۔ پہریدار دروازے کے سامنے کھڑے اس کی چیخ و پکار سن رہے تھے اور معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''ٹھیک ہے مت کھولو''۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد سکینہ نے دوبارہ کہا۔ ''شمروز خان صحن میں پڑا کتے کی موت مر رہا ہے۔ اسے بچانا چاہتے ہو تو اٹھا کر لے جاؤ ورنہ میں اس پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دوں گی''۔



اس بار اس کی وارننگ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور پہریدار بلاتردد دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔

''کہاں ہے شمروز خان؟'' ان میں سے ایک حواس باختہ ہو کر بولا جبکہ اس کا ساتھی متوحش انداز میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''وہ برآمدے کے سامنے پڑا ہوا ہے''۔ سکینہ نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ ''جاؤ اسے اٹھا کر خان جی کے پاس لے جاؤ۔ کہہ دینا اسے سکینہ نے اس حال تک پہنچایا ہے اور کیوں پہنچایا ہے، اس سوال کا جواب شاید تم دونوں کو معلوم ہے ورنہ تم دونوں ہماری چیخ و پکار سن کر بغیر پکارے کب کے اندر پہنچے ہوتے''۔

دونوں پہریدار بھاگتے ہوئے شمروز خان کے پاس پہنچے اور اسے چیک کرنے کے بعد اٹھا کر باہر لے گئے۔ انہوں نے سکینہ سے مزید کچھ بھی پوچھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد سکینہ نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور مطمئن انداز میں چلتی ہوئی ماں کے پاس پہنچ گئی۔

''کیا وہ زندہ تھا؟'' خدیجہ نے اسے دیکھتے ہی پریشانی کے عالم میں استفسار کیا۔

''پتا نہیں''۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''لیکن مر جائے تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ ایسے کمینوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے جو عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں اور ہر شریف زادی کو دیکھ کر پاگل کتے کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں''۔

''سکینہ! وہ خان جی کا کوئی اہم آدمی بھی ہو سکتا ہے''۔ خدیجہ نے اپنی تشویش ظاہر کی۔ ''مجھے ڈر ہے کہ تم کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں۔ کاش میں تمہیں یہاں سے کسی طرح نکال سکتی''۔

''میں تمہیں چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گی''۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''خان جی کیا کر سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ مجھے گولی مار سکتا ہے ناں! میں موت سے نہیں ڈرتی۔ ویسے بھی اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ زینب، بابا اور بھیا کے بغیر میں جی کر کیا کروں گی''۔ وہ جذباتی ہو گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''مت رو میری جان! میں ابھی زندہ ہوں''۔ خدیجہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے جیتے جی تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی''۔

اتنا کہہ کر اس نے سکینہ کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا اور بولی۔ ''جاؤ اپنی حالت درست کرو اور پھر میرے لیے چائے بنا لاؤ۔ میرا جسم بہت دکھ رہا ہے شاید چائے پی کر کچھ آرام آ جائے''۔

ماں کی بات سن کر سکینہ اٹھی اور اوڑھنی کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

•|• ===•|• ===•|•

شمروز خان کو سر پر اچھی خاصی ضربات آئی تھیں لیکن وہ بہت سخت جان انسان تھا۔ دوسرے دن ہی سنبھل گیا تھا۔ اس کے سر پر چھ ٹانکے آئے تھے۔ زخم کے متعلق ڈاکٹر نے اس سے کوئی خاص استفسار نہیں کیا تھا۔ کیونکہ علاقہ غیر میں ایسی باتیں اور واقعات روزمرہ کے معمولات میں شامل تھے اور آئے دن ڈاکٹروں کے پاس ایسے کیسز آتے رہتے تھے۔ شمروز خان تو ویسے بھی خان جی کا آدمی تھا اس لیے ڈاکٹر نے کوئی بھی ایسا ویسا سوال کرنے سے احتراز کیا تھا۔

اس کے سر کی بینڈیج کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اسے چند دوائیاں دیں اور کھانے کے اوقات اور طریقہ سمجھا کر رخصت کر دیا۔

شمروز خان کی ہدایات کے پیش نظر پہریداروں نے اس معاملے کو اپنی ذات تک محدود رکھا تھا۔ اس لیے خان جی لاعلم تھا تاہم موسیٰ خان کی طرف سے نہ صرف پہریداروں کو بلکہ شمروز کو بھی خدشہ تھا وہ اگر موجود ہوتا تو یقیناً اب تک معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا ہوتا۔ پہریداروں کو اس روز شمروز خان نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ان ماں بیٹی کو کسی صورت میں خان جی تک نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ بہت برا ہوگا میرے ساتھ ساتھ تم بھی نہیں بچو گے۔

"لیکن موسیٰ خان سے یہ معاملہ پوشیدہ نہیں رہے گا"۔ ایک پہریدار نے خدشہ ظاہر کیا۔ "وہ کسی بھی وقت آندھی اور طوفان کی طرح وہاں پہنچ سکتا ہے"۔

"اس کی واپسی سے پہلے ہی میں اپنا بدلہ لے کر یہاں سے نکل جاؤں گا"۔ شمروز خان نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔ "تم دونوں بس ان پر نظر رکھو۔ انہیں گھر سے قدم بھی باہر نہ نکالنے دینا ورنہ میں تم دونوں کی کھال کھینچ لوں گا"۔

"ہم تو حکم کے غلام ہیں شمروز خان"۔ پہریدار نے جواب دیا۔ "جو تم کہو گے وہ کریں گے لیکن ہم موسیٰ خان کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکیں گے۔ تم جانتے ہو کہ اس کی آنکھیں انسان کا دماغ تک پڑھ لیتی ہیں۔ وہ کسی جادوگر سے کم نہیں ہے"۔

"احمق آدمی! تم موسیٰ خان سے اتنے خائف کیوں ہو؟" شمروز خان نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "وہ کیا ہمارا آقا ہے؟ یا پھر موت کا فرشتہ؟"

"ہمارے لیے تو موت کا فرشتہ ہی ہے"۔ پہریدار نے بلاتردد جواب دیا۔ "وہ غلطی پوچھے بغیر گولی مار دیتا ہے اور لڑکی کے معاملے میں تو مجرم کو صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ یہ نہ ہو کہ تمہارے ساتھ ساتھ ہم بھی اس کے عتاب کا نشانہ بن کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں"۔

"گدھے کے بچے! تمہیں اس وقت موسیٰ خان سے نہیں مجھ سے ڈرنا چاہیے"۔ وہ چلا کر بولا۔ "میرے سینے میں جس نادیدہ آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں وہ اگر باہر آ گئے تو تم دونوں جل کر



راکھ ہو جاؤ گے۔ میں جب تک اس لڑکی کے غرور کا بت پاش پاش نہیں کروں گا تب تک آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ جاؤ اور جا کر ان دونوں پر نگاہ رکھو۔ موسیٰ خان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ خود کو سورما سمجھتا ہے تو میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا تو میرا نام بھی شمروز خان نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے شمروز خان"۔ پہریدار نے کہا۔ "ہم انہیں گھر سے قدم باہر نہیں نکالنے دیں گے لیکن اس دوران اگر موسیٰ خان پہنچ گیا تو ہم بری الذمہ ہوں گے۔ اس وقت ہمیں الزام نہ دینا"۔

"جاؤ"۔ اس نے بھڑک کر کہا۔ "موسیٰ خان کی ایسی کی تیسی"۔

دونوں پہریدار مزید کچھ بولے رخصت ہو گئے اور شمروز خان سوچوں میں ڈوب گیا۔ سکینہ نے جو اس کے ساتھ کیا تھا اسے مرتے دم تک نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ بدلے کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ اس کے زخمی سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور دل کو ایک نادیدہ آگ جھلسا رہی تھی۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر خود کلامی کے انداز میں سکینہ کو برے نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ "میں تجھے چھوڑوں گا نہیں سکینہ! تو بہت جلد اپنے کیے پر پچھتائے گی۔ میں تجھے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑوں گا۔ تیری زندگی موت سے بدتر کر دوں گا۔ بس ایک بار میں تندرست ہو جاؤں پھر تجھے بتاؤں گا کہ شمروز خان پر ہاتھ اٹھانے کا کیا انجام ہوتا ہے"۔

وہ دیر تک خود کلامی کے انداز میں بکتا جھکتا رہا۔ پھر اس کی بیوی نے کمرے میں داخل ہو کر اسے دوائی کھلائی اور آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مسکن دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا۔

✣ ===✣ ===✣

دوسرے دن ناشتے کی میز پر جب جمشید خان کا جہانداد سے سامنا ہوا تو اس نے بلاتمہید جہانداد سے استفسار کر لیا۔ "ہاں تو کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟ میرے مشورے پر عمل کرو گے یا پھر اپنی جنگ اکیلے ہی لڑنے کا ارادہ ہے؟"

"فیصلہ تو میں نے کر لیا ہے لیکن اس پر اتنی جلدی عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا"۔ اس نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں کیا جا سکتا؟" جمشید خان نے پوچھا۔ "مسئلہ کیا ہے مجھے بتاؤ؟ میں حل کرنے کی کوشش کروں گا"۔

"موسیٰ خان اب تک واپس جا چکا ہوگا"۔ جہانداد بولا۔ "اس کی عدم موجودگی میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ میں خود علاقہ غیر جا کر اس سے بات کر لوں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا یا

پھر میں‘‘۔

’’نہیں‘‘۔ جمشید خان نے اس کی بات کاٹی۔ ’’میں تمہیں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ علاقہ غیر سے وہ لوگ تجھے واپس نہیں آنے دیں گے۔ مار ڈالیں گے یا پھر قید کر لیں گے۔ ہمیں اپنی لڑائی کا آغاز اسی شہر سے کرنا پڑے گا۔ یہاں ہمارے پاس وسائل بھی ہیں اور افرادی قوت بھی‘‘۔

’’ٹھیک ہے آپ حکم کریں۔ میں تیار ہوں‘‘۔

’’سب سے پہلے تمہیں موسیٰ خان کو ڈھونڈنا ہوگا‘‘۔ جمشید خان نے کہا۔ ’’ویسے جہاں تک میرا اندازہ ہے موسیٰ خان خود تمہیں ملنے کے لیے بے تاب ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے اس نے تمہارے پیچھے اپنا کوئی آدمی لگا دیا ہو۔ بہر کیف موسیٰ خان یا اس کا کوئی آدمی تمہیں ٹکرا جائے تو اس سے صاف کہہ دینا کہ تم نے اپنا راستہ الگ کر لیا ہے اور اب تم ان کے لیے کوئی بھی کام نہیں کر سکتے۔ یہ وارننگ بھی دے دینا کہ تمہاری ماں اور بہن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو تم افضال خٹک قتل کیس کے بڑے مجرم کو بے نقاب کر دو گے‘‘۔

’’میں سمجھ گیا‘‘۔ جہانداد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’آپ بے فکر رہیں ایسا ہی ہوگا‘‘۔

’’چند پولیس والے سادہ لباس میں تمہارے آس پاس رہیں گے۔ تم ناشتہ کرنے کے بعد فوراً روانہ ہو جانا‘‘۔ اتنا کہہ کر جمشید خان خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جمشید خان نے ایک بار پھر اسے ضروری ہدایات دیں اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ذرا دیر کے بعد وہ فون پر کسی کو ہدایات دے رہا تھا۔

جہانداد ناشتے کی میز سے اٹھ کر سیدھا گیسٹ روم میں پہنچا اور جلدی جلدی تیار ہونے کے بعد باہر نکلا تو کوٹھی کے لان میں اسے مسز سلطانہ اور میمونہ ٹکرا گئیں۔ وہ دونوں چہل قدمی کے انداز میں ٹہل رہی تھیں۔ جہانداد کو دیکھتے ہی میمونہ نے مسکرا کر سلام کیا اور پھر اشاروں میں اس سے کچھ استفسار کرنے لگی۔

جہانداد نے کہا۔ ’’میری ننھی بہن! میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ گھر میں پڑے پڑے اکتا گیا ہوں اس لیے ذرا باہر گھومنے کے لیے جا رہا ہوں‘‘۔

’’بڑی اچھی بات ہے بیٹے‘‘۔ مسز سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’شوق سے جاؤ لیکن پہلے کی طرح غائب نہ ہو جانا۔ ذرا خیال رکھنا اس شہر میں جمشید خان کے دشمن آوارہ کتوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ تلخ تجربہ تمہیں ایک بار ہو چکا ہے‘‘۔

’’بے فکر رہیں ماں جی‘‘۔ اس نے جواب دیا۔ ’’مجھے دشمنوں سے نمٹنا اچھی طرح آتا ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ دشمن مجھے اغوا کر لیں گے‘‘۔



’’جو ایک دفعہ ایسا کر چکے ہوں وہ دوبارہ بھی یہ قدم اٹھا سکتے ہیں‘‘۔ مسز سلطانہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ’’دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہیے‘‘۔

’’ٹھیک میں احتیاط کروں گا‘‘۔ وہ خدا حافظ کہتا ہوا کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف چل پڑا۔

باہر نکل کر وہ تھوڑی دیر تک یونہی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا لیکن یہ آوارہ گردی بے مقصد نہیں تھی۔ دراصل اسے موسیٰ خان یا اس کے کسی آدمی کی تلاش تھی۔ موسیٰ خان یا اس کا کوئی آدمی تو اسے نہ ٹکرایا البتہ اس نے گھومتے پھرتے تین ایسے آدمی ضرور چیک کر لیے تھے جو بڑے غیر محسوس انداز میں اس کے آس پاس گھوم رہے تھے۔ یہ سادہ لباس میں ملبوس پولیس کے آدمی تھے جو ایس پی جمشید خان کی ہدایت کے مطابق جہانداد پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

اس آوارہ گردی سے جلد ہی اکتا کر جہانداد نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو ایک پتا سمجھانے کے بعد ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ایک جھٹکا کھا کر آگے بڑھی اور پھر سڑک پر رواں دواں ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔ مختلف شاہراہوں اور سڑکوں سے گزرتی ہوئی ٹیکسی آدھے گھنٹے کے اندر ایک پُر رونق کالونی میں داخل ہو گئی۔ جہانداد اردگرد کے مکانوں کو بڑے غور و خوض کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی جسے ٹیکسی ڈرائیور سامنے والے شیشے کے ذریعے گاہے بگاہے چیک کر رہا تھا۔

’’صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟‘‘ ڈرائیور اس کی سنجیدگی دیکھ کر چپ نہ رہ سکا۔ ’’خیریت تو ہے ناں؟‘‘

’’نہیں تو‘‘۔ اس نے چونک کر کہا۔ ’’میں پریشان تو نہیں ہوں‘‘۔

’’کیا بات کرتے ہیں صاحب! میں نے ایک دنیا دیکھ رکھی ہے‘‘۔ ڈرائیور فخریہ انداز میں بولا۔ ’’گزشتہ بیس برس سے ٹیکسی چلاتے ہوئے ہزاروں چہرے دیکھ چکا ہوں‘‘۔

’’پلیز‘‘۔ جہانداد نے اسے شائستگی سے ٹوکا۔ ’’تم ڈرائیونگ پر توجہ دو۔ سواری پریشان ہے یا نہیں اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے‘‘۔

’’میں معافی چاہتا ہوں جناب‘‘۔ ڈرئیور نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ’’شاید آپ برا مان گئے ہیں حالانکہ میں تو ہمدردی کی بناء پر آپ سے پوچھ رہا تھا‘‘۔

جہانداد ڈرائیور کی بات کا جواب دینے ہی لگا تھا کہ معاً ایک طاقتور جیپ ان کی ٹیکسی کو کراس کرتے ہوئے گزر گئی۔ جہانداد نے صرف ایک نظر ہی جیپ سوار کو دیکھا تھا۔ وہ سو فیصد موسیٰ خان تھا۔ جیپ ایک پل میں ٹیکسی سے کافی دور نکل گئی تھی مگر سڑک بالکل سیدھی ہونے کی وجہ سے وہ جہانداد کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکی تھی۔

"اس جیپ کا پیچھا کرو"۔ جہانداد نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "میں منہ مانگا کرایہ دوں گا لیکن جیپ کو نکلنا نہیں چاہیے"۔

"میں یہ کام نہیں کر سکتا صاحب"۔ ڈرائیور نے ٹکا سا جواب دیا۔ "میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور یہ ٹیکسی میرا واحد ذریعہ معاش ہے"۔

"میں کہتا ہوں پیچھا کرو"۔ اچانک جہانداد نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ شاباش جلدی کرو"۔

ڈرائیور نے گردن گھما کر عقب میں دیکھا تو اسے جہانداد کے ہاتھ میں ایک خوفناک ریوالور نظر آ گیا۔ اب تردد کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ چنانچہ سب کچھ خدا پر چھوڑتے ہوئے اس نے ٹیکسی کی اسپیڈ بڑھا دی لیکن اس دوران جیپ کافی دور جا چکی تھی۔

"اور تیز چلاؤ"۔ جہانداد نے ٹیکسی اور جیپ کا درمیانی فاصلہ نوٹ کرتے ہوئے ڈرائیور کو حکم دیا۔

"جناب اس سے زیادہ رفتار بڑھانا خطرناک ہو سکتا ہے"۔ ڈرائیور نے التجائیہ انداز میں کہا۔ "آپ خود پر نہ سہی مجھ پر تو رحم کریں۔ میرے بچے میرے بعد رُل جائیں گے"۔

"بکواس مت کرو"۔ جہانداد نے اسے چلا کر ڈانٹا۔ "اسپیڈ بڑھاؤ ورنہ میں ٹریگر دبا دوں گا۔ جلدی کرو"۔

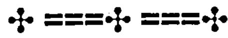
"بب...... بڑھاتا ہوں جی"۔ ڈرائیور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر حواس باختہ ہو کر ایکسیلیٹر کو فل دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ٹیکسی بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح آگے بڑھی اور سڑک پر موجود گاڑیوں کو کراس کرتی چلی گئی۔ جہانداد کی نگاہیں آگے جانے والی جیپ پر جمی ہوئی تھیں جو کم از کم دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر جا رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر کانپ رہے تھے لیکن جہانداد اس صورتِ حال سے لاعلم تھا ورنہ وہ ایسا رسک کبھی بھی نہ لیتا۔

ٹیکسی اور جیپ کا درمیانی فاصلہ لحہ بہ لحہ گھٹتا جا رہا تھا مگر ڈرائیور کے ہاتھ بدستور لرز رہے تھے۔ اس بے چارے کا واسطہ کبھی ایسے حالات سے نہیں پڑا تھا اس لیے وہ بے حد فزدہ ہو گیا تھا۔ ٹیکسی کی عقبی سیٹ پر بیٹھا ہوا جہانداد اس کے لیے موت کے فرشتے سے کم نہیں تھا۔ جو معمولی سی اسپیڈ کم ہونے پر اس کے بھیجے میں گولی اتار سکتا تھا۔

اب ٹیکسی اور جیپ کا درمیانی فاصلہ کم ہو کر آدھا فرلانگ رہ گیا تھا اور لحہ بہ لحہ مزید کم ہو رہا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر جہانداد پُرجوش انداز میں بولا۔ "شاباش ہمت کرو۔ میں تمہیں توقع سے بڑھ کر انعام دوں گا"۔



پھر اس سے پہلے کہ ڈرائیور جہانداد کی بات کا جواب دیتا اچانک دائیں طرف سے ایک بڑی گاڑی نمودار ہوئی اور چشم زدن میں سڑک کے عین وسط میں پہنچ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بوکھلا کر سٹیئرنگ وہیل گھمانے کی بجائے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ جہانداد لاشعوری طور پر سیٹ پر جھک گیا اور ٹیکسی ڈرائیور نے کسی خوفزدہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔ جہانداد کی سماعتوں سے ٹکرانے والی آخری آواز ایک زوردار دھماکے کی تھی۔



بھاری گاڑی ایک مال بردار ٹرالر تھا۔ ٹیکسی اس کے عین درمیان سے...... گزرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ٹیکسی کی چھت مکمل طور پر تباہ ہو کر سیٹوں سے جا لگی تھی اور وہ خود بخود تھوڑی دور جا کر رک گئی تھی غالباً ڈرائیور کا پاؤں بلا سوچے سمجھے بریک پر پڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ہی خاصے زخمی ہو کر ٹیکسی میں پھنسے ہوئے تھے۔ ڈرائیور تو بالکل بے ہوش ہو چکا تھا تاہم جہانداد ہوش میں تھا مگر ناقابلِ بیان اذیت محسوس کر رہا تھا اس میں ہلنے جلنے کی سکت تک نہیں تھی۔ ٹرالر کا عملہ تین افراد پر مشتمل تھا فوراً ٹیکسی تک پہنچ گیا۔ ان دونوں کو باہر نکالنے کے لیے انہوں نے ٹیکسی کی کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کی تو انہیں معلوم ہوا کہ چھت کا دباؤ پڑنے کی وجہ سے کھڑکیاں جام ہو چکی تھیں۔ جہانداد اب تقریباً نیم غشی کے عالم میں اپنے مددگاروں کی آوازیں سن رہا تھا جو افراتفری میں ٹیکسی کی کھڑکیاں کھولنے میں مصروف تھے۔

"یہ کھڑکیاں جام ہو چکی ہیں"۔ جہانداد کی سماعتوں سے ایک پریشان کن آواز ٹکرائی۔ "جلدی کرو اپنی گاڑی سے کوئی اوزار وغیرہ نکال لاؤ"۔

اس کے فوراً بعد جہانداد نے بھاگتے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ پھر اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا اور اس کی سماعت و بصارت نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ بے ہوش ہونے کے بعد وہ وقتی طور پر چند لمحے پہلے والی اذیت سے نجات پا چکا تھا۔

جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ یہ ایک شاندار کمرہ تھا۔ کھلی کھڑکی سے سورج کی شفاف کرنیں براہِ راست کمرے میں اجالا پھیلا رہی تھیں۔ سردیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے یہ تمازت بخش کرنیں اسے سکون فراہم کر رہی تھیں۔ کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر اس نے باآسانی اندازہ لگا لیا کہ یہ جگہ مکمل طور پر اس کے لیے اجنبی ہے۔ ہسپتال کا کمرہ ایسا شاندار ہو ہی نہیں سکتا تھا بلکہ یہ کمرہ تو کسی کی خوابگاہ معلوم ہوتا تھا۔ چند لمحے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنے وجود پر نظر ڈالی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی بائیں کہنی پٹیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ پھر بے اختیار اس کا دایاں ہاتھ سر کی جانب اٹھا۔ وہاں بھی پٹیاں موجود تھیں۔ گویا اسے ایکسیڈنٹ میں بائیں

کہنی اور سر پر چوٹیں آئی تھیں۔

اسے ہوش میں آئے دس پندرہ منٹ ہو چکے تھے لیکن ابھی تک نہ تو کوئی شخص کمرے میں داخل ہوا تھا اور نہ ہی اس نے کوئی آوازیں سنی تھیں۔ نہ جانے گھر کے مکین کہاں تھے؟ معاً اس کا خیال ٹیکسی ڈرائیور کی طرف چلا گیا۔ ''خدا کرے بچ گیا ہو بے چارا''۔ اس نے دل ہی دل میں ٹیکسی ڈرائیور کے لیے دعا مانگی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی بے زاری بڑھتی گئی۔ آخر کار تنگ آ کر وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا سر پکے ہوئے پھوڑے کی طرح درد کرنے لگا اور اس کی نگاہوں کے سامنے نیلگوں ستارے سے رقص کرنے لگے درد کی شدت سے اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ بے حد نقاہت محسوس کر رہا تھا بہ مشکل دو تین منٹ ہی وہ بستر پر بیٹھ سکا تھا۔ اس کے بعد اسے چاروناچار دوبارہ لیٹنا پڑا۔ لیٹنے سے اس کا سر درد کافی حد تک کم ہو گیا اور وہ دوبارہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کھڑکی سے سورج کی روشنی اب براہِ راست اس کے بستر تک پہنچنے لگی تھی۔ سامنے والے کلاک کی سوئیاں صبح کے دس بجے کا اعلان کر رہی تھیں۔

اچانک کمرے کے دروازے کے سامنے قدموں کی چاپ ابھری اور جہانداد دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ لڑکی نے نرسوں کی طرح سفید یونیفارم پہنی ہوئی تھی جو اس کے سرو قد پر بہت سج رہی تھی۔ لڑکی بے حد حسین و جمیل تھی اور جہانداد بغیر پلک جھپکائے اسے دیکھ رہا تھا اس کی نگاہوں میں نہ صرف ستائش تھی بلکہ حیرت بھی تھی شاید وہاں کسی خوبصورت لڑکی کی موجودگی اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

لڑکی نے عین اس کے بستر کے سامنے پہنچ کر ٹرالی کھڑی کر دی اور پھر ایک دلآویز مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر بولی۔ ''اوہ۔ تو تم جاگ گئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میں تمہیں دیکھ کر گئی تھی۔ اس وقت تو تم گہری نیند میں تھے''۔ شکل کی طرح لڑکی کی آواز بھی مٹھاس لیے ہوئی تھی۔

''محترمہ! میں تو پچھلے آدھے گھنٹے سے جاگ رہا ہوں لیکن تم کون ہو؟ اور مجھے یہاں......''

''پہلے ناشتا کر لیجیے''۔ لڑکی نے اپنی مترنم آواز میں قطع کلامی کی۔ ''اس کے بعد میں سب کچھ بتا دوں گی''۔

کافی تیز طرار لڑکی تھی۔ جہانداد کے ساتھ اس قدر اپنائیت سے بات کر رہی تھی جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔ جہانداد نے ایک بھرپور نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی اور پھر بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میرے سر میں بہت شدید درد ہے۔ اٹھتا ہوں تو چکر سے آنے لگتے ہیں''۔



''یہ صرف وقتی چکر ہیں''۔ لڑکی اس کے ہاتھ دھلاتے ہوئے بولی۔ ''ناشتے کے بعد میں تمہیں انجکشن لگا دوں گی یہ چکر اور سر درد ختم ہو جائے گا''۔

ہاتھ دھونے کے بعد جہانداد نے دو تین کلیاں کیں اور پھر ناشتے میں جت گیا۔ ناشتا کافی پُرتکلف تھا اور اس نے بھوکا ہونے کی وجہ سے ڈٹ کر کیا تھا۔ لڑکی اس دوران ایک کرسی پر بیٹھی رہی تھی۔ جونہی جہانداد ناشتے سے فارغ ہوا لڑکی نے چائے بنا کر کپ اسے تھما دیا۔ شکریہ کہتے ہوئے جہانداد نے چائے کی ایک چسکی لی اور پھر لڑکی سے پوچھا۔ ''ہاں اب بتاؤ تم کون ہو اور مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

''جہانداد صاحب!'' لڑکی پہلی بار اسے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام شہناز ہے اور مجھے تمہاری خدمت پر مامور کیا گیا ہے اور تمہیں یہاں تمہارا ایک خیر خواہ لے کر آیا ہے''۔

''اس خیر خواہ کا نام کیا ہے؟'' جہانداد نے استفسار کیا۔

''وہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد یہاں پہنچ جائے گا''۔ شہناز نے جواب دیا۔ ''خود ہی دیکھ لینا''۔

''کیا تمہیں نام بتانے سے منع کیا گیا ہے؟'' جہانداد نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں''۔ شہناز نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''ورنہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ تم سے چھپاتی''۔

''اوکے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا، لیکن اتنا بتا دو یہ جگہ کون سی ہے؟''

''یہ فردوس کالونی ہے''۔ شہناز نے بتایا۔ ''شہر یہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے''۔

''شکریہ''۔ جہانداد نے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم محسوس نہ کرو تو میں تمہارے بارے میں جاننا چاہوں گا۔ تم کہاں کی رہنے والی ہو اور میرے خیر خواہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''میری کہانی بہت لمبی ہے''۔ وہ بولی۔ ''جو فی الحال میں تمہیں نہیں سنا سکتی''۔

''لگتا ہے میرے نامعلوم خیر خواہ نے تم پر بہت زیادہ پابندیاں لگا رکھی ہیں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''ورنہ ایک خوبصورت لڑکی سے اس سلوک کی توقع کم از کم میں نہیں رکھ سکتا تھا''۔

''پہلے میں تمہیں انجکشن لگا دوں پھر بات کریں گے''۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی اور پھر سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی جہاں میڈیسن رکھی ہوئی تھیں۔ سرنج نکال کر اس نے انجکشن تیار کیا اور کسی ماہر نرس کی طرح جہانداد کے بازو میں انجکٹ کر دیا۔

''اب تمہیں پھر نیند آ جائے گی''۔ وہ خالی سرنج کو ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے بولی۔ ''جب تم دوبارہ اٹھو گے تو خود کو بالکل تر و تازہ محسوس کرو گے۔ اس دوران تمہارا خیر خواہ بھی آ چکا ہو گا''۔

''ٹیکسی ڈرائیور کا کیا بنا؟'' جہانداد نے اچانک ہی ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

''مجھے نہیں معلوم''۔ شہناز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ اسی کو پتا ہو گا جو تمہیں یہاں لایا ہے''۔

"پھر بھی تمہیں کچھ نہ کچھ تو معلوم ہوگا ہی کہ وہ زندہ ہے یا......" جہانداد نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جواب طلب انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں سچ کہتی ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے"۔ شہناز نے جواب دیا۔ "ویسے بھی مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر معلوم ہوتا تو تمہیں ضرور بتا دیتی۔ بہرکیف تم مطمئن رہو کھانے کے وقت تک تمہارا خیر خواہ آجائے گا تب تمہیں ہر سوال کا جواب مل جائے گا"۔

جہانداد نے اس سے مزید چند باتیں کیں اور پھر اس پر انجکشن کا اثر شروع ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سو چکا تھا۔

---

اے ایس آئی احمد علی پریشانی کے عالم میں ایس پی جمشید خان کی طرف دیکھ رہا تھا جو اضطراب کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے جمشید خان رکا اور احمد علی کو ملامت آمیز نظروں سے دیکھتے بولا۔

"مجھے تم سے ایسی لاپرواہی کی توقع بالکل نہیں تھی۔ میں نے تم لوگوں کو جہانداد کے قریب رہنے کی تاکید کی تھی"۔

"ہم سے کوئی لاپرواہی نہیں ہوئی سر"۔ وہ اپنی صفائی دیتے ہوئے بولا۔ "ہم لوگ احتیاط سے اس ٹیکسی کا تعاقب کر رہے تھے کہ اچانک ٹیکسی کی اسپیڈ بڑھ گئی اور پھر ہماری کوشش کے باوجود ٹیکسی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ سمجھ میں نہیں آتا جہانداد نے ایسا کیوں کیا؟"

"ٹرالر کے ڈرائیور نے کیا بتایا ہے؟" جمشید خان نے پوچھا۔ "کم از کم اس نے اس نامعلوم شخص کا حلیہ وغیرہ تو بتایا ہوگا"۔

"ٹرالر کا تمام عملہ حوالات میں بند ہے سر"۔ احمد علی نے بتایا۔ "آپ خود ان لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں۔ ہمیں تو ان لوگوں نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ جہانداد کو لے جانے والے شخص نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا اور وہ ایک قدآور جوان سال شخص تھا"۔

"اور ٹیکسی ڈرائیور نے کون سی معلومات دی ہیں؟" جمشید خان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"اسے آج صبح ہی ہوش آیا ہے"۔ اس نے کہا۔ "میں ہسپتال کی طرف ہی جانے لگا تھا کہ آپ نے طلب کرلیا۔ شاید اب تک اس کے پاس تفتیش کے لیے انسپکٹر چنگیز خان پہنچ چکا ہوگا"۔

"معاملہ بہت اہم ہے"۔ جمشید نے ایک دم کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے خود ٹیکسی ڈرائیور اور ٹرالر کے عملے سے تفتیش کرنا پڑے گی۔ تم گاڑی نکالو میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں"۔

"او کے سر"۔ احمد علی اتنا کہہ کر باہر نکل گیا اور جمشید خان تیاری کرنے کے لیے اپنے کمرے



میں گھس گیا۔ دس منٹ کے بعد جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا تو راہداری میں اسے مسز سلطانہ ٹکرا گئی۔

"کہاں کے ارادے ہیں؟" اسے عجلت میں دیکھ کر مسز سلطانہ نے متفکر انداز میں سوال کیا۔

"جہانداد پھر اغوا ہوگیا ہے"۔ جمشید خان نے بتایا۔ "اس بار وہ زخمی بھی ہے۔ میں ذرا تھانے تک جا رہا ہوں۔ پوری کہانی آپ کو واپسی پر سناؤں گا ابھی میں جلدی میں ہوں"۔

"یہ حماقت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ مسز سلطانہ نے اسے سرزنش کی۔ "ڈاکٹر نے تمہیں بھاگ دوڑ کرنے سے منع کر رکھا ہے ابھی تو تمہارے زخم......"

"میرے زخم بھر چکے ہیں ماں"۔ اس نے قطع کلامی کی۔ "ڈاکٹر کا کیا ہے وہ تو مہینوں بیڈ ریسٹ دے سکتا ہے، لیکن میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں آپ فکر نہ کریں مجھے کچھ نہیں ہوگا"۔

"تم اگر نہیں جاؤ گے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی"۔ مسز سلطانہ اپنی بات پر اڑ گئی۔ "تھانے کا عملہ خود ہی یہ معاملہ دیکھ لے گا۔ آخر وہ لوگ بھی تو تنخواہ لیتے ہیں ان کا بھی تو کچھ فرض بنتا ہے"۔

"وہ لوگ کام کر رہے ہیں ماں"۔ اس نے جواب دیا۔ "لیکن معاملہ جہانداد کی زندگی کا ہے جو نہ صرف ہمارا محسن ہے بلکہ آپ نے اسے بیٹا بھی بنا رکھا ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ وہ قانون کی مدد کر رہا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں میں اگر بستر پر پڑا انتظار کرتا رہوں تو کیا یہ ٹھیک ہوگا؟"

"میں تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتی"۔ وہ نیم رضامندی سے بولی۔ "بہرکیف تم اپنا خیال رکھنا۔ کہیں چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ نہ چلے جانا"۔

"ماں! میں سادہ لباس میں ہوں"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تھانے سے واپس آجاؤں گا آپ مطمئن رہیں۔ میں کسی پارٹی کے ساتھ نہیں جا رہا"۔

"کب تک آجاؤ گے؟" اس نے استفسار کیا۔

"وقت پر آجاؤں گا"۔ جمشید خان نے جواب دیا اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ کے بعد وہ احمد علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تھانے کا رخ کر رہا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل احمد علی نے تھام رکھا تھا۔

آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد گاڑی تھانے کے احاطے میں پہنچ کر رک گئی۔ جمشید خان گاڑی سے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آفس کی طرف چل پڑا۔ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے انسپکٹر چنگیز خان کو طلب کیا تو اردلی نے بتایا کہ وہ ہسپتال جا چکا ہے۔ تب جمشید خان نے ٹرالر کے عملے کو پیش کرنے کا حکم دے دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرالر کا عملہ جمشید خان کے سامنے حاضر تھا۔ اس دوران اے

ایس آئی احمد علی بھی گاڑی پارک کرنے کے بعد وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ تینوں سخت گھبرائے ہوئے تھے غالباً انسپکٹر چنگیز خان نے ان کی اچھی خاصی مرمت کی تھی۔

"مائی باپ! ہم بے قصور ہیں"۔ جمشید خان کے استفسار پر ڈرائیور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "غلطی ٹیکسی ڈرائیور کی تھی شاید وہ نشے کے عالم میں ڈرائیونگ کر رہا تھا بغیر دیکھے بھالے اس نے ٹیکسی ہماری گاڑی سے ٹکرا دی تھی۔ حضور آپ بے شک ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھ لیں"۔

"ٹھیک ہے"۔ جمشید خان نے کہا۔ "میں ٹیکسی ڈرائیور سے ضرور تفتیش کروں گا مگر اس وقت میں تم سے کچھ اور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جوابات دینا ورنہ پھنس جاؤ گے"۔

"میں...... میں سچ بتاؤں گا صاحب"۔ ڈرائیور نے جھٹ سے جواب دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" جمشید خان نے سوال کیا۔

"گل زرین...... جناب"۔

"ہاں تو گل زرین! مجھے سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ بتاؤ؟" جمشید خان تحکمانہ انداز میں بولا۔ "خیال رکھنا کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہ رہے"۔

"صاحب! یہ حادثہ فردوس کالونی کے ساتھ بڑی شاہراہ پر پیش آیا۔ ہم ایک ذیلی سڑک سے جونہی شاہراہ پر آئے عین اسی وقت دائیں طرف سے ایک ٹیکسی گولی کی رفتار سے آئی اور ہمارے ٹرالر کے نیچے سے گزرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ تاہم حادثے کے فوراً بعد ہم تینوں دوڑتے ہوئے ٹیکسی تک پہنچ گئے۔ ٹیکسی کی چھت پچک گئی تھی اور تمام کھڑکیاں جام ہو چکی تھیں۔ کوشش کے باوجود ہم سے کھڑکیاں نہیں کھل رہی تھیں۔ تب ہم نے اپنی گاڑی کے ٹول بکس سے ایک فولادی سلاخ نکالی اور پھر اس کی مدد سے کھڑکی کھولنے لگے۔ ٹیکسی میں ڈرائیور کے علاوہ صرف ایک سواری تھی جو پچھلی سیٹ پر موجود تھی۔ دونوں بے ہوش تھے۔ ہم نے کوشش کر کے کھڑکیاں کھول دیں لیکن اس دوران وہاں ایک جیپ آ کر رکی اور پھر جیپ سوار ٹیکسی والی سواری کو اپنی جیپ میں ڈال کر چلتا بنا۔ بعد میں ہم نے بے ہوش ڈرائیور کو ٹیکسی سے باہر نکالا تو یہ صاحب وہاں اپنے ساتھیوں سمیت پہنچ گئے"۔ ٹرالر ڈرائیور نے تفصیل بیان کرتے ہوئے اے ایس آئی احمد علی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور پھر ہمیں گرفتار کر کے یہاں تھانے میں لے آئے۔ صاحب ہم بالکل بے قصور ہیں"۔

"دوسرے آدمی کو لے جانے والے شخص کا حلیہ کیسا تھا؟" جمشید خان نے اس کی التجا کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سوال کیا۔



"صاحب! اس نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا"۔ گل زرین نے بتایا۔ "وہ ایک قد آور شخص تھا اور مسلح بھی تھا"۔

"تم لوگوں نے اسے مسافر لے جانے سے روکا کیوں نہیں؟" جمشید خان نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ "تم تین تھے اور وہ اکیلا۔ پھر وہ کس طرح مسافر کو لے گیا؟"

"روکا تھا صاحب"۔ گل زرین سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ "لیکن اس نے ہماری بات کا جواب دینے کی بجائے ریوالور نکال لیا تھا۔ جناب وہ بہت خطرناک شخص لگتا تھا"۔

"اور کوئی اہم بات جو تم نے اس واقعہ کے دوران دیکھی ہو؟" جمشید خان نے سوال کیا۔ "شاباش یاد کرنے کی کوشش کرو......اغوا ہونے والا شخص ایک اہم سرکاری آدمی تھا"۔

جمشید خان کی بات سن کر گل زرین تھوڑی دیر کے لیے سوچوں میں غرق ہو گیا۔ جمشید خان غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"صاحب!" چند لمحوں کے بعد گل زرین گویا ہوا۔ "اس شخص کے ساتھ ٹیکسی کی سیٹ پر ایک ریوالور بھی پڑا ہوا تھا جسے جیپ سوار نے بعد میں اٹھا لیا تھا"۔

یہ گل زرین نے ایک اہم بات بتائی تھی۔ ایکسیڈنٹ کے وقت جہانداد کے ہاتھ میں ریوالور کی موجودگی جمشید خان کے لیے ایک حیرت انگیز بات تھی۔ یہ عقدہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہی حل کر سکتا تھا کہ جہانداد نے اپنے ہاتھ میں ریوالور کیوں پکڑ رکھا تھا۔ جمشید خان نے گل زرین اور اس کے ساتھیوں سے مزید چند سوالات پوچھے مگر اسے کوئی اہم بات معلوم نہ ہو سکی تب اس نے انہیں دوبارہ حوالات میں بند کرنے کا حکم سنا دیا۔

"اب کیا حکم ہے سر؟" گل زرین اور اس کے ساتھیوں کے جانے کے بعد اے ایس آئی احمد نے جمشید خان سے پوچھا۔ "ہسپتال چلنا ہے یا پھر انسپکٹر چنگیز خان کی واپسی کا انتظار کریں؟"

"تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "اگر اس دوران انسپکٹر واپس آ گیا تو ٹھیک ورنہ ہسپتال چلے جائیں گے"۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے اردلی کو بلانے کے لیے بیل بجا دی۔

-:-====-:-====-:-

جہانداد جب دوبارہ بیدار ہوا تو اس وقت دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ انجکشن کے زیر اثر وہ تقریباً سوا ایک گھنٹہ سویا رہا تھا۔ جاگنے کے بعد وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اب نہ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا اور نہ ہی جسم میں۔ چند لمحے خالی نگاہوں سے چھت کو گھورنے کے بعد وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اب اسے شہناز کا انتظار تھا مگر وہ غائب تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر پانی رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک گلاس پانی کا پیا اور پھر بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

بارہ بج کر دس منٹ پر شہناز کمرے میں داخل ہوئی اور اسے ٹہلتے دیکھ کر لگاوٹ بھرے انداز میں بولی۔ ''تمہیں ابھی اٹھنا نہیں چاہئے تھا۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے پلیز لیٹ جاؤ''۔

''میرا خیر خواہ کہاں ہے؟'' جہانداد نے اس کی ہمدردی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میں اس سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں''۔

''وہ خود تم سے ملنے کے لیے بے چین ہے''۔ شہناز نے جواب دیا۔ ''بس تھوڑی دیر انتظار کرو وہ آنے والا ہوگا''۔

''اگر وہ ایک گھنٹے کے اندر نہ پہنچا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا''۔ جہانداد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میرے پاس ضائع کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے اور ہاں میرا ریوالور اور خنجر کہاں ہے؟''

''یہیں اسی کمرے میں ہیں''۔ اتنا کہہ کر شہناز آگے بڑھی اور الماری سے دونوں چیزیں نکال کر جہانداد کو پیش کر دیں۔

''اور کوئی حکم؟'' وہ مسکراتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''جا کر پتا کرو۔ میرا خیر خواہ کب آئے گا؟'' جہانداد نے ریوالور کا چیمبر چیک کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا''۔

''میں آ گیا ہوں سولجر''۔ اچانک موسیٰ خان دروازے سے نمودار ہو کر بولا۔ ''تمہارا انتظار ختم ہو گیا ہے''۔

''تم......؟'' جہانداد لمحہ بھر کے لیے متحیر رہ گیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہیں تو میں......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''تم ہمارے لیے بہت اہم ہو سولجر!'' موسیٰ خان اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے میں تمہیں ہسپتال لے جانے کی بجائے یہاں اٹھا کر لے آیا ہوں کہ اپنی زیر نگرانی تمہارا علاج کروا سکوں۔ اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو۔ ویسے ڈاکٹر ابھی تھوڑی دیر کے بعد یہاں پہنچ جائے گا''۔

''ٹیکسی ڈرائیور کا کیا بنا؟'' جہانداد نے استفسار کیا۔ ''کیا وہ بچ گیا ہے؟''

''میں نہیں جانتا''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جس ٹرالر سے تم لوگوں نے ٹیکسی ٹکرائی تھی اس کا عملہ ٹیکسی ڈرائیور کو نکال رہا تھا مگر میں نے وہاں رکنا مناسب نہ سمجھا اور تمہیں جیپ میں ڈال کر چلا بنا''۔

''اللہ کرے وہ غریب بچ گیا ہو''۔ جہانداد نے صدقِ دل سے کہا۔ ''نہ جانے اس وقت مجھے



یہ ہو گیا تھا۔ میں نے ہی اسے تیز رفتاری پر مجبور کر دیا تھا''۔

''کس لیے؟'' موسیٰ خان نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارا تعاقب کرنے کے لیے''۔ اس نے جواب دیا۔

''میرا تعاقب؟'' موسیٰ خان نے چونک کر کہا۔ ''کس لیے؟ تمہیں مجھ سے......''

''ہاں مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے مسٹر موسیٰ خان''۔ جہانداد نے طنزیہ انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے ریوالور سیدھا کر لیا۔

''یہ...... یہ تم......'' موسیٰ خان نے بوکھلا کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور غیر محسوس انداز میں ہاتھ جیب کی طرح بڑھا دیا۔

''خبردار''۔ جہانداد نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''تم نے اگر چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں بلا دریغ گولی چلا دوں گا۔ جیب سے ہاتھ دور رکھو''۔

''سولجر! تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ ''مجھے گولی مارو گے؟''

''ضرور ماروں گا اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو''۔ جہانداد نے جواب دیا۔

''یہ تم بہت غلط کر رہے ہو سولجر''۔ موسیٰ خان نے دھمکی کے انداز میں کہا۔ ''شاید تم یہ بھول چکے ہو کہ تمہاری بہن اور ماں ہمارے قبضے میں ہیں''۔

''انہی کا سوچ کر تو تمہیں زندہ چھوڑنے کے لیے مجبور ہوں''۔ جہانداد نے زہر خند سے کہا۔ ''ورنہ سونو کے قاتل کو تو زندہ جلا دینے کو دل کرتا ہے''۔

''با...... باہر...... میرے آدمی......''

''منہ بند رکھو''۔ جہانداد نے گرج کر اس کی بات کاٹ دی۔ ''تمہارے آدمیوں سے میں نمٹ لوں گا۔ اس وقت تم اپنے بارے میں سوچو اگر میں نے ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی دبا دی تو تمہارا یہ ساڑھے ...ٹ کا بدن ایک لمحے میں لاش میں تبدیل ہو جائے گا''۔ اتنا کہہ کر جہانداد نے ایک ثانیے کے لیے ...ف کیا اور پھر دوبارہ بولا۔ ''میری بات غور سے سنو اور جا کر اپنے خان جی سے بھی کہہ دینا۔ میں ...ن کے لیے کوئی بھی غیر قانونی کام نہیں کروں گا اور اگر اس نے میری بہن اور ماں کے خلاف ...ی قدم اٹھایا تو پھر میں وہ کروں گا جو تمہارا خان جی سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں افضال خٹک کے قتل ...م میں گرفتاری پیش کر کے وعدہ معاف گواہ بن جاؤں گا اور ایس پی جمشید خان نے میرا ساتھ ...نے کا وعدہ کیا ہے''۔

''تم...... سچ مچ پاگل ہو گئے ہو سولجر''۔ موسیٰ خان نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''ایس پی

جمشید خان تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ خان جی کا کچھ نہیں بگڑے گا البتہ تم ضرور پھانسی چڑھا دیے جاؤ گے"۔

"مجھے تمہارے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ جہانداد نے کہا۔ "میں اپنا اچھا برا جانتا ہوں"۔

"تم پچھتاؤ گے"۔ اس نے دھمکی دی۔ "تمہیں خان جی کی پہنچ کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ تم جس ایس پی کی شہ پر اتنا اترا رہے ہو وہ خان جی کے سامنے ایک چیونٹی جتنی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ خان جی جب چاہے گا اسے مسل کر رکھ دے گا"۔

"موسیٰ خان! تم نے میری جان بچا کر مجھ پر انجانے میں جو احسان کیا ہے اسی کے صلے میں آج تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ دوبارہ اگر تم میرے سامنے آئے تو زندہ نہیں بچو گے"۔ اتنا کہہ کر جہانداد موسیٰ خان کو نشانے پر رکھتے ہوئے شہناز سے مخاطب ہوا۔ "میرے ساتھ چلو گی یا پھر اسی کے ساتھ تمہیں بھی کمرے میں بند کرتا جاؤں"۔

"نہیں میں یہاں نہیں رہنا چاہتی"۔ وہ بدحواس ہو کر بولی۔ "میں اپنے گھر جاؤں گی"۔

"ٹھیک ہے چلو"۔ جہانداد اسے باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ موسیٰ خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"موسیٰ خان! تمہیں ذرا تکلیف اٹھانا پڑے گی"۔ اس نے کہا۔ "میں تمہیں یہاں بند کر کے جا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھی تمہیں نکال لیں گے"۔

"ٹھیک ہے سولجر"۔ موسیٰ خان عین اپنی فطرت کے مطابق ٹھنڈا پڑتے ہوئے بولا۔ "اس وقت بازی تمہارے ہاتھ میں ہے جو مرضی آئے کرو لیکن اپنی امانت لیتے جاؤ"۔

"امانت......کیسی امانت؟" اس نے متحیر انداز میں پوچھا۔

"تمہارے پچاس ہزار روپے"۔ موسیٰ خان نے کہا۔ "وہ اسی کمرے میں موجود ہیں یہ سامنے والی الماری میں رکھے ہیں نکال لو"۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دولت پر"۔ جہانداد نے جواب دیا۔ "تم خود رکھ لو یا پھر خان جی"۔

"نا سولجر"۔ اس نے جہانداد کی بات کاٹی۔ "موسیٰ خان پرائی کمائی نہیں کھاتا۔ بے خوف ہو کر الماری سے رقم نکال لو میں کوئی بھی غلط حرکت نہیں کروں گا۔ تم زخمی ہو اور موسیٰ خان نے آج تک کسی بھی زخمی دشمن پر وار نہیں کیا۔ میں اس کھلونے سے نہیں ڈرتا جو تم نے ہاتھوں میں پکڑ رکھا ہے"۔

جہانداد نے ایک پل کے لیے کچھ سوچا اور پھر دروازے میں کھڑی ہوئی شہناز سے بولا۔



"الماری سے رقم نکالو۔ جلدی کرو"۔

"میں خود نکال دیتا ہوں"۔ موسیٰ نے الماری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"رک جاؤ"۔ جہانداد نے چلا کر کہا۔ "ورنہ میں گولی چلا دوں گا"۔

موسیٰ خان اس کی وارننگ سن کر رک گیا۔ "میں خالی ہاتھ ہوں سولجر"۔ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "میری گن باہر گاڑی میں رکھی ہوئی ہے۔ تم ڈر کیوں رہے ہو؟"

"میں تم پر قطعی اعتبار نہیں کر سکتا"۔ جہانداد نے کہا۔ "تم لومڑی سے زیادہ چالاک اور سانپ سے زیادہ خطرناک ہو۔ میں اک ذرا سا رسک بھی نہیں لے سکتا"۔

"ٹھیک ہے"۔ موسیٰ خان با دل نخواستہ بولا۔ "جیسے تمہاری مرضی"۔

"آگے بڑھو اور الماری میں سے رقم والا بریف کیس نکالو"۔ جہانداد نے سہمی ہوئی شہناز کو حکم دیا۔

شہناز آگے بڑھی اور الماری کھول کر بریف کیس اٹھا لیا۔

"باہر نکلو"۔ جہانداد نے اسے دوبارہ حکم دیا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"خدا حافظ موسیٰ خان"۔ جہانداد نے استہزائیہ انداز میں کہا اور باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ باہر شہناز اس کی منتظر تھی۔ جہانداد نے اس سے بریف کیس لیا اور پھر وہ دونوں صدر دروازے کی طرف چل پڑے۔ جہانداد چوکنا انداز میں اپنے اردگرد نگاہیں دوڑا رہا تھا لیکن کوٹھی غالباً سنسان پڑی ہوئی تھی باہر موسیٰ خان کا کوئی آدمی بھی موجود نہیں تھا۔ شاید موسیٰ خان نے ایسے ہی جہانداد کو ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی فطرت کے مطابق اس نے عیاری دکھانے کی کوشش کی تھی جو کارگر ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ کوٹھی سے باہر نکلتے ہی جہانداد نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے شہناز سے کہا۔ "اب تم جا سکتی ہو"۔

"کک......کہاں جاؤں؟" اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"اپنے گھر اور کہاں؟" جہانداد نے جواب دیا۔

"مگر میرا تو کوئی گھر نہیں ہے"۔ شہناز نے کہا۔ "میں تو اکیلی ہی کرائے کے فلیٹ میں رہتی تھی اور وہاں جاتے ہوئے اب مجھے ڈر لگتا ہے۔ موسیٰ خان......"

"مس شہناز"۔ جہانداد اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش فضول ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم موسیٰ خان کی آلۂ کار ہو اور اسی کے اشارے پر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو لیکن میں موسیٰ خان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ تم چلی جاؤ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے ورنہ میری اور موسیٰ خان کی دشمنی کا ایندھن بن جاؤ گی"۔

''میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں موسیٰ خان کی آلہ کار نہیں ہوں''۔ اس نے پُر زور انداز میں کہا۔ ''موسیٰ خان مجھے گن پوائنٹ پر اس کوٹھی میں لایا تھا''۔

''کیا تم پیشہ ور نرس ہو؟'' جہانداد نے موضوع بدل کر سوال کیا۔

''نہیں'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ڈاکٹر ہوں''۔

''ڈاکٹر؟'' جہانداد نے چونک کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اب تک تمہاری گمشدگی کی رپورٹ درج ہو چکی ہوگی۔ تم میرے لیے مصیبت بن سکتی ہو''۔

''قطعی نہیں''۔ شہناز بولی۔ ''میری گمشدگی کا کسی کو پتا نہیں ہوگا کیونکہ ان دنوں میں ایک ہفتے کی چھٹیوں پر ہوں''۔

''ٹھیک ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''فی الحال میں تمہیں ساتھ لے جاتا ہوں۔ تمہارا مسئلہ ایس پی صاحب کے سامنے پیش کریں گے۔ سوچ لو اگر تم جھوٹی نکلیں تو پھر قانون کی گرفت میں آ جاؤ گی؟''

''میں سمجھتی ہوں''۔ اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر مت کرو۔ ایس پی صاحب سے میں خود بات کر لوں گی''۔

اسی اثناء میں ایک خالی ٹیکسی ان کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور وہ دونوں فوراً ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔





جمشید خان کو انسپکٹر چنگیز خان سے خاصی سنسنی خیز معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ انسپکٹر کے کہنے طابق جہانداد نے گن پوائنٹ پر ٹیکسی ڈرائیور کو ایک جیپ کا تعاقب کرنے پر مجبور کر دیا تھا مگر یک پہنچنے سے پہلے ہی ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ انسپکٹر سے ساری تفصیل سننے کے بعد جمشید یک بار پھر جہانداد کے متعلق شکوک و شبہات کا شکار ہو چکا تھا۔

''کون ہو سکتا ہے وہ؟'' جمشید خان نے اے ایس آئی احمد علی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال ''اور جہانداد کیوں اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں سر''۔ احمد علی نے کہا۔ ''آپ نے ہمیں اس سے دور دور رہنے کا حکم دیا

''اپنی نااہلی چھپانے کے لیے بہانے مت گھڑو''۔ جمشید خان نے اسے سرزنش کی۔ ''میں نے ں کو اس سے دور نہیں بلکہ نزدیک رہنے کی ہدایت کی تھی''۔

''سر! میں نے عرض کیا ناں کہ اچانک ہی ٹیکسی کی اسپیڈ بڑھ گئی تھی اور بدقسمتی سے ہمیں ایک سگنل پر رکنا پڑ گیا تھا ورنہ ہم ٹیکسی کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے''۔ اس نے صفائی پیش تے ہوئے جواب دیا۔

''اب میں جہانداد کو کہاں سے ڈھونڈوں؟'' جمشید خان نے سوال کیا۔ ''تمہاری ذرا سی بے ے میرا بنا بنایا منصوبہ چوپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ جانے وہ جیپ والا کون تھا؟ ٹرالر کا عملہ بھی اتنا لا کہ انہوں نے جیپ کا نمبر تک نوٹ نہیں کیا۔ اب تو ہم مکمل اندھیرے میں ہیں''۔

''سر! ایسا کرتے ہیں کہ شہر کے ہسپتالوں کو چیک کرتے ہیں''۔ احمد علی بولا۔ ''ہو سکتا ہے اغوا ہانداد کو کسی ہسپتال میں لے گیا ہو''۔

''احمقانہ باتیں مت کرو''۔ اس نے ناگوار انداز میں کہا۔ ''اغوا کار اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔ ر جہانداد کو ہسپتال ہی لے جانا ہوتا تو پھر یہ قدم کس لیے اٹھاتا؟''

''تو پھر سر آپ ہی بتائیں کیا کیا جائے؟'' احمد علی نے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا۔

احمد علی کا سوال سن کر چند لمحے جمشید خان سوچوں میں غرق ہو گیا اور پھر پُر سوچ انداز میں گویا ہوا۔ ''صرف ٹیکسی ڈرائیور ہی اغوا کار کی جیپ کو پہچان سکتا ہے اور وہ فی الحال زیرِ علاج ہے ورنہ اسے ساتھ رکھ کر شہر میں اُس جیپ کو تلاش کیا جا سکتا تھا''۔

''سر! کیا ٹیکسی ڈرائیور بھی جیپ کی نمبر پلیٹ نہیں دیکھ سکا تھا؟'' احمد علی نے سوال کیا۔

''اس بے چارے کو جہانداد نے اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ جیپ کی نمبر پلیٹ کی طرف اس کا خیال ہی نہ جا سکا۔ بہرکیف کوئی نہ کوئی لائحہ عمل......''

اس دوران فون کی گھنٹی بجنے لگی اور جمشیدہ خان نے بات ادھوری چھوڑ کر ریسور اٹھا لیا۔

''ہیلو''۔ ریسور کان سے لگاتے ہی اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''جمشید!'' دوسری طرف سے مسز سلطانہ کی آواز آئی۔ ''فوراً گھر پہنچو۔ ایک خوشخبری تمہاری منتظر ہے''۔

''کیسی خوش خبری؟'' اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''جہانداد گھر پہنچ چکا ہے''۔ مسز سلطانہ نے جواب دیا۔

''کیا؟'' وہ تقریباً اچھل پڑا۔ ''کب پہنچا ہے اور کیسا ہے وہ؟''

''تم بس فوراً پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں فون پر تفصیل نہیں بتا سکتی''۔

''ٹھیک ہے میں ابھی پہنچ رہا ہوں خدا حافظ''۔ اتنا کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''احمد علی! میں جا رہا ہوں''۔ وہ سیٹ چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''جہانداد گھر پہنچ چکا ہے''۔

''میرے لیے کیا حکم ہے سر؟'' احمد علی نے پوچھا۔

''تم فارغ ہونے کے بعد پہنچ جانا''۔ اس نے جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد وہ جہانداد کے سامنے بیٹھا اس کی سرگزشت سن رہا تھا۔ شہناز بھی وہیں موجود تھی۔ اپنی سرگزشت میں جہانداد نے شہناز کے متعلق بھی تفصیلاً بتا دیا تھا۔

''موسیٰ خان اب جوابی کارروائی ضرور کرے گا''۔ پورا واقعہ سنانے کے بعد جہانداد نے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے میری ماں اور بہن کے ساتھ......''

''نہیں''۔ جمشید خان نے قطع کلامی کی۔ ''سردار فراست علی خان ایسا بھول کر بھی نہیں کر سکتا اور رہا موسیٰ خان تو فراست علی خان کی مرضی کے خلاف وہ کوئی بھی قدم نہیں اٹھا سکتا البتہ تم پر وار ضرور کر سکتا ہے اس لیے تمہیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے''۔

''مجھے اپنی جان کی کوئی پروا نہیں ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''اور نہ ہی میں موسیٰ خان سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا تو اسے کمرے میں بند کرنے کی بجائے زندگی کی قید سے بھی آزاد کر سکتا تھا لیکن پھر



...غام خان جی تک نہ پہنچ پاتا۔ بہرکیف اس کی موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے مجھے جب بھی موقع ...ے چھوڑوں گا نہیں''۔

''اب تمہیں قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ جمشید خان نے تنبیہی انداز میں ...ورنہ میں تمہاری مدد کرنے سے دست بردار ہو جاؤں گا''۔

''وطن دشمنوں کو ٹھکانے لگانا جرم تو نہیں ہے؟'' جہانداد شکایتی لہجے میں بولا۔ ''موسیٰ خان جیسے ...کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کون سا ایسا جرم ہے جو اس نے نہیں کیا ہوگا۔ قتل و غارت گری ...ے کر اسلحے کی اسمگلنگ، منشیات کا دھندا اور......''

''ایسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے قانون موجود ہے''۔ جمشید خان نے دوبارہ قطع کلامی کی۔ ''تم ...آگ کے دریا میں چھلانگ لگانا چاہتے ہو؟''

''مجھ پر جو ظلم ڈھائے گئے ہیں انہیں برداشت کرنے کے لیے پتھر کا دل چاہیے۔ میری ...وں کے سامنے اسی موسیٰ خان نے میرے جگری دوست کو گولیوں سے چھلنی کر ڈالا تھا۔ وہ دن تک ...لاش بے گور و کفن ایک ویرانے میں پڑی رہی تھی۔ میری ماں اور بہن ان کے قبضے میں نہ ہوتیں ...میں نے موسیٰ خان کو زندہ نہ چھوڑا ہوتا''۔ جہانداد نے متاسف انداز میں جوب دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم پر بہت مظالم ڈھائے گئے ہیں''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''لیکن یہ باتیں ...اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت ہمیں ڈاکٹر شہناز کے بارے میں سوچنا چاہیے''۔

''میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گی جناب''۔ شہناز بولی۔ ''مجھے بس صرف چند دنوں کے ...چاہیے۔ دراصل میں تنہا رہتی ہوں اس لیے ڈرتی ہوں کہ کہیں دوبارہ کوئی مصیبت نازل نہ ہو ...ے''۔

''تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''موسیٰ خان کا تمہارے پیچھے پڑنے کا کیا جواز ...ے۔ پہلے تو اس نے تمہیں جہانداد کا علاج کرنے کے لیے اغوا کیا تھا۔ دوبارہ وہ ایسا کیوں کرے

''آپ کی بات بجا ہے لیکن مجھے اپنے فلیٹ پر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے''۔ شہناز نے جواب

''...رکے! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے''۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ...تمہارے متعلق معلومات ضرور حاصل کرے گی۔ اگر تم کسی بات میں جھوٹی نکلیں تو میں تمہیں ...رنے کے لیے مجبور ہو جاؤں گا''۔

''مجھے منظور ہے جناب''۔ وہ جھٹ سے بولی۔ ''آپ جب چاہیں میری باتوں کی تصدیق

کروا سکتے ہیں اگر میں جھوٹی نکلوں تو جو دل چاہے مجھے سزا دینا"۔

اس کے بعد جمشید خان کے لیے اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی چنانچہ اس نے شہناز کو بخوشی اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی تھی یوں جہانداد کے لیے بھی مفت میں ایک ڈاکٹر کا بندوبست ہو گیا تھا۔ لنچ کرنے کے بعد شہناز نے پہلی فرصت میں ہی جہانداد کی پٹیاں تبدیل کر دی تھیں۔ اس دوران جمشید خان نے اے ایس آئی احمد علی کو بلوا کر شہناز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا کام سونپ دیا تھا۔

✣ === ✣ === ✣

ادھر علاقہ غیر میں شمروز خان گزشتہ کئی روز سے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ سکینہ اور اس کی ماں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس نے اس کے تن من میں آگ لگا رکھی تھی۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے وہ دن رات منصوبے سوچتا رہتا تھا لیکن کوشش کے باوجود کوئی موقع اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ اگرچہ دونوں پہریدار بدستور اس کے ساتھ تھے اور انہوں نے ہر ممکن تعاون کا اسے یقین دلا رکھا تھا مگر شمروز خان کوئی بھی قدم اٹھانے سے ڈر رہا تھا۔ خان جی سے زیادہ اسے موسیٰ خان کی اچانک آمد کا خوف تھا۔ موسیٰ خان اس کے لیے ایک چھلاوہ تھا جو کسی بھی وقت کہیں بھی پہنچ سکتا تھا۔

ایک طرف موسیٰ خان کا خوف اور دوسری طرف اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کی دھن۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ موسیٰ خان کی عدم موجودگی میں خان جی کے اکثر احکامات شمروز خان ہی بجا لاتا تھا اس لیے وہ حویلی سے زیادہ دیر کے لیے غائب بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ گزشتہ واقعہ کی خبر خان جی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ وقتی طور پر شمروز خان مطمئن تھا۔ جب تک موسیٰ خان کی واپسی نہیں ہوتی وہ ہر طرح سے محفوظ تھا تاہم موسیٰ خان کی واپسی کے بعد اس کے لیے خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔ موسیٰ خان ان ماں بیٹی کے گھر بلا روک ٹوک جاتا رہتا تھا۔ یہ واقعہ زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں شمروز خان کو جو کچھ بھی کرنا تھا وہ موسیٰ خان کی آمد سے قبل ہی کر گزرنا تھا۔ ورنہ تو موسیٰ خان کی آمد کے بعد اس کی زندگی ہی خطرے میں پڑنے والی تھی۔ اتنے بڑے واقعے کے بعد وہ علاقہ غیر میں نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت خان جی نے اس کے لیے بلاوا بھجوایا تو لمحہ بھر کے لیے اس کا سانس خشک ہو گیا لیکن پھر وہ پیغام لانے والے نوکر سے سنبھل کر بولا۔ "خیر تو ہے خان جی کو اس وقت میری ضرورت کیسے پڑ گئی ہے۔ کہیں موسیٰ خان واپس تو نہیں پہنچ چکا؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا لیکن خان جی بہت اضطراب میں نظر آ رہے تھے"۔ نوکر نے جواب دیا۔ "انہوں نے نے فوراً تمہیں بلایا ہے"۔



"خان جی کیوں پریشان ہیں؟" اس نے استفسار کیا۔

"مجھے کیا معلوم؟" نوکر نے کہا۔ "وہ نوکروں کو اپنی پریشانیاں کب بتاتے ہیں؟"

"پھر بھی کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوئی ہو گی؟" اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا۔ "تمہیں کچھ نہ کچھ تو معلوم ہی ہو گا؟"

"شمروز خان!" نوکر حیران ہو کر بولا۔ "یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم بے حد پریشان نظر آ رہے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟"

"نہیں میں پریشان تو نہیں ہوں"۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "بس خان جی کے غصے سے ذرا ڈرتا ہوں اس لیے تم سے معلومات حاصل کر رہا تھا"۔

"یقین کرو مجھے خان جی کی پریشانی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہے ورنہ میں تمہیں ضرور بتا دیتا"۔ نوکر نے جواب دیا۔ "اب چلنے کی کرو خان جی شدت سے تمہارے منتظر ہیں"۔

"کیوں نہیں...... ابھی چلتے ہیں"۔ اتنا کہنے کے بعد وہ مرے مرے قدم اٹھاتے ہوئے نوکر کے ساتھ خان جی کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

حویلی میں پہنچتے ہی وہ خان جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ خان جی اپنے کمرے میں بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔

"حکم خان جی؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مؤدب انداز میں سر جھکا کر بولا۔ "نصیب ہمارے کہ آپ......"

"شمروز؟" خان جی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "تم ابھی پشاور جانے کی تیاری کرو اور وہاں جا کر معلوم کرو کہ یہ موسیٰ خان وہاں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا؟"

"خان جی میں اور پشاور......" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "میں بھلا وہاں موسیٰ خان کو کیسے ڈھونڈ سکوں گا۔ آپ کسی اور......"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" خان جی نے کڑک دار آواز میں قطع کلامی کی۔ "ہوش کرو۔ کس کے سامنے کھڑے ہو۔ کہیں جان سے ہاتھ دھونے کا ارادہ تو نہیں ہے؟"

"مم...... معاف...... کرنا خان جی...... مم...... میں وہ......" اس نے گڑبڑا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بکری کی طرح ممیانا چھوڑو اور جانے کی تیاری کرو"۔ خان جی نے حکم صادر کیا۔ "آج شام سے پہلے تمہیں یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ مجھے دو دنوں کے اندر موسیٰ خان چاہئے"۔

"ب...... بہت بہتر خان جی"۔ وہ جلدی سے بولا۔ "میں تیار ہوں"۔

''تمہارے ساتھ صرف ڈرائیور جائے گا''۔ خان جی نے کہا۔ ''وہ بھی اگر تم لے جانا چاہو تو ورنہ اکیلے چلے جانا۔ اب جاؤ اور جا کر تیاری کرو''۔

خان جی کا حکم سن کر وہ سلام کرتا ہوا الٹے قدموں باہر نکل گیا۔ وہ بہت پریشان تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ خان جی کا حکم ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اسی کش مکش میں وہ گھر پہنچ گیا۔ بیوی نے اس کی اتری ہوئی شکل دیکھی تو روایتی بیویوں کی طرح سوال کیا۔ ''یہ تمہاری شکل پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟ کیا آج پھر جوئے میں ہار گئے ہو یا پھر کہیں مارا ماری کی ہے؟''

''بکواس مت کر سؤر کی بچی''۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے''۔

''گرا گدھے سے اور غصہ کمہار پر''۔ بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''ایسے کام کرتے ہی کیوں ہو کہ منہ چھپا کر پھرنا پڑے؟ انسان کی عزت اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے''۔

''چپ کر جا حرام زادی''۔ وہ حلق کے بل دھاڑا۔ ''ورنہ آج میرے ہاتھ سے ماری جائے گی''۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے؟'' اس کی پریشانی کے پیشِ نظر اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں کیا پریشانی ہے؟''

''مجھے جہنم میں جھونکا جا رہا ہے''۔ وہ جل کر بولا۔ ''تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو۔ کیا مجھے بچا سکتی ہو؟''

''تم جب تک مجھے ٹھیک بات نہیں بتاؤ گے میں کیا کر سکتی ہوں''۔ وہ ٹھنڈا پڑتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کچھ معلوم ہو گا تو میں مشورہ دے سکوں گی ناں؟''

''بس اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو''۔ وہ تحکمانہ انداز میں کہتے ہوئے بستر پر گر گیا اور اس کی بیوی پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

شمروز خان دیر تک بستر پہ پڑا سوچتا رہا مگر نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی نہ ہی وہ خان جی کو انکار کرنے کی جرأت کر سکتا تھا اور نہ ہی موسیٰ خان کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ سکینہ کو بھی کسی صورت معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں اسے جو کچھ بھی کرنا تھا وہ آج ہی کر گزرنا تھا ورنہ موسیٰ خان کی آمد کے بعد وہ کچھ بھی نہ کر سکتا۔ یونہی سوچتے سوچتے کسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور لبوں پر بے اختیار ایک زہریلی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

''اب تو یہی کرنا پڑے گا ورنہ عمر بھر کا پچھتاوا گلے پڑ جائے گا''۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا اور پھر بلند آواز میں اپنی بیوی کو پکارنے لگا۔ ''زرتاج ارے او زرتاج! کہاں ہو تم؟''



''اب کیا قیامت آ گئی ہے؟'' وہ دروازے سے نمودار ہو کر بولی۔ ''کیوں چلا رہے ہو؟''

''تم کچھ عرصہ کے لیے میکے چلی جاؤ''۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کہیں جا رہا ہوں''۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' زرتاج نے حیرانی سے استفسار کیا۔

''یہ میں واپس آ کر بتاؤں گا''۔ اس نے جواب دیا۔ ''بس تم آج ہی چلی جاؤ۔ کہو تو میں چھوڑ آتا ہوں''۔

''میں خود چلی جاؤں گی لیکن بتاؤ تو سہی کہ......''

''میں نے کہا نہیں کہ واپس آ کر بتاؤں گا''۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر تم ضد کیوں کر رہی ہو؟''

''ٹھیک ہے''۔ وہ بادلِ نخواستہ بولی۔ ''کب تک واپس آ جاؤ گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بہرکیف فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جلدی لوٹنے کی کوشش کروں گا''۔

''مجھے لینے کے لیے آؤ گے یا میں خود ہی واپس چلی آؤں؟'' زرتاج نے پوچھا۔

''نہیں''۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں واپس آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ل وہیں آ جاؤں گا''۔

''تمہیں جانا کب ہے'' زرتاج نے سوال کیا۔ ''آج یا کل؟''

''آج جاؤں گا''۔ اس نے جواب دیا۔ ''شام سے پہلے۔ اب تم جاؤ اور جانے کی تیاری کرلو''۔

زرتاج اثبات میں سر ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی اور وہ دوبارہ بستر پر لیٹ کر اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ اگر اس کا یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا تو پھر سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔

•⁘• ===•⁘• ===•⁘•

شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ ایک بار پھر خان جی کے سامنے حاضر تھا۔ خان جی بڑی بے تابی کے ساتھ اپنے مخصوص کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ غالباً موسیٰ خان کی غیر متوقع دیر نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا لیکن وہ بغیر کسی اطلاع کے غائب تھا۔ ایسی صورتِ حال میں خان جی کی پریشانی بجا تھی۔ موسیٰ خان اس کا دستِ راست تھا۔ اس کی بنائی گئی لنکا کا راون تھا۔ اگر وہ نہ رہتا تو اس کی لنکا بھی سلامت نہیں رہ سکتی تھی۔ جہاندرام بن کر اس کی لنکا کے درپے تھا۔

''تیاری مکمل ہے ناں؟'' شمروز خان پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے استفسار کیا۔

''جی خان جی''۔ اس نے مؤدب انداز میں کہا۔ ''میں تیاری مکمل کر کے آیا ہوں''۔

''کیا ڈرائیور کی ضرورت پڑے گی؟'' خان جی نے سوال کیا۔

''نہیں خان جی میں گاڑی چلا سکتا ہوں''۔ اس نے جواب دیا۔ ''ڈرائیور کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ خان جی نے کہا۔ ''تم گیراج میں جا کر انتظار کرو...... باقی ہدایات تمہیں تھوڑی دیر کے بعد مل جائیں گی''۔

''بہت بہتر خان جی''۔ اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا اور پھر سلام کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ ایک جیپ ڈرائیور کرتا ہوا حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ خان جی نے اسے موسیٰ خان کے نام ایک خط بھی دیا تھا اور زادِ راہ کے لیے اچھی خاصی رقم بھی دے دی تھی۔ وہ مین گیٹ سے نکل کر کھلی سڑک پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک سورج مغربی پہاڑیوں کے عقب میں غروب ہو چکا تھا مگر ابھی تک اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اسے اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ تقریباً دو کلومیٹر آگے جا کر اس نے جیپ کو کچے میں اتارا اور احتیاط سے چلاتا ہوا جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں پہنچ گیا۔ پکی سڑک سے اب جیپ نظر نہیں آ سکتی تھی۔ انجن بند کرنے کے بعد وہ نیچے اترا اور پیدل ہی واپس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگرچہ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا مگر وہ احتیاطاً سڑک چھوڑ کر چل رہا تھا۔ شاید موسیٰ خان کی عدم موجودگی میں بھی وہ اس سے خائف تھا تاہم موسیٰ خان سے خائف ہونے کے باوجود وہ اپنا انتقام لینے سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سکینہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔ اسے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں تھی۔

رات کے تقریباً آٹھ بجے لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے وہ دونوں پہریداروں کے پاس پہنچ گیا۔ چند لمحوں کے لیے تو دونوں پہریدار اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے مگر پھر نوٹوں کی جھلک دیکھ کر ان کی حیرت خوشی میں بدل گئی۔

''اگر آج میرا کام ہو گیا تو اتنے ہی نوٹ اور دوں گا''۔ شمروز خان پُر جوش انداز میں بولا۔ ''بس تم لوگ زبان بند رکھنے کا وعدہ کرو۔ میں تمہیں مالا مال کر دوں گا''۔

''ٹھیک ہے''۔ ان میں سے ایک نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور دوسرے نے اس کی تائید کی۔ ''ہم تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارا نام نہیں آنا چاہئے ورنہ تم بھی پھنس جاؤ گے''۔

فکر مت کرو۔ میں ایک ایسا منصوبہ بنا کر آیا ہوں کہ ہم میں سے کسی کا نام بھی اس معاملے میں



نہیں آئے گا''۔ وہ مکارانہ انداز میں بولا۔ ''خان جی اور موسیٰ خان لاکھ سر پٹختے رہیں وہ میرا سراغ نہیں لگا سکتے اور نہ ہی تم دونوں کو کوئی الزام دے سکیں گے''۔

''کیسا منصوبہ؟'' دونوں پہریداروں نے ایک ساتھ سوال کیا۔ ''ہمیں بھی تو پتا چلے''۔

''منصوبہ یہ ہے کہ میں رات کے دس بجے کے بعد اندر داخل ہو جاؤں گا اور پھر اسلحے کی نوک پر مطلب حاصل کرنے کے بعد ان دونوں ماں بیٹی کو گولی مار دوں گا اور......''

''لیکن اس طرح تو ہم پھنس جائیں گے''۔ ایک پہریدار نے اس کی بات کاٹی۔ ''خان جی تو ہم دونوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیں گے''۔

''احمق آدمی! پہلے میری بات تو پوری ہونے دو''۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ان دونوں کو گولی مارنے کے بعد میں تم دونوں کو باندھ کر تمہاری کوٹھڑی میں ڈال دوں گا۔ صبح تمہیں خان جی کے آدمی آ کر رہا کریں گے۔ تب تم یہ سارا الزام نامعلوم حملہ آوروں کے سر ڈال دینا۔ اس طرح نہ صرف تم دونوں محفوظ رہو گے بلکہ میں بھی صاف بچ جاؤں گا کیونکہ خان جی اپنی طرف سے مجھے آج شام کو پشاور روانہ کر چکا ہے۔ میری جیپ یہاں سے دو کلومیٹر دور ایک محفوظ جگہ پر پوشیدہ کھڑی ہوئی ہے۔ کام ہو جانے کے بعد میں سیدھا پشاور کی طرف نکل جاؤں گا''۔

''تمہیں اگر گاؤں سے نکلتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا تو پھر کیا ہو گا؟'' دوسرے پہریدار نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ''کہیں ہم دونوں کو مروا نہ دینا''۔

''میں نے کہا ناں! تم دونوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی''۔ شمروز خان پُر زور انداز میں بولا۔ ''پھر تم کیوں فکر مند ہوتے ہو؟''

''شمروز خان!'' پہلا پہریدار بولا۔ ''اگر بات ہم پر آئی تو شاید ہم زبان کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے''۔

''یار کیوں آئی سے پہلے مرنے لگے ہو؟'' وہ زچ ہو کر بولا۔ ''تم پر کیسے الزام آ سکتا ہے؟ کیا وہ لوگ غیب کا علم جانتے ہیں؟''

''ہمیں موسیٰ خان اور خان جی کے قہر سے ڈر لگتا ہے''۔ پہریدار نے کہا۔ ''تم تو پشاور نکل جاؤ گے اور خان جی کا سامنا ہمیں کرنا پڑے گا اور اس کے ساتھ وہ موسیٰ خان بھی ہو گا جس کی آنکھیں انسانی دماغ کو ایکسرے مشین کی طرح لمحوں میں پڑھ لیتی ہیں''۔

''تم لوگ اگر اسی طرح ڈرتے رہے تو پھر ہو چکا کام''۔ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ تم لوگ موسیٰ خان سے اس قدر خوفزدہ کیوں رہتے ہو۔ وہ بھی تمہاری طرح کا انسان ہے کوئی آسمانی مخلوق تو نہیں ہے''۔

اس کے بعد شمروز خان دیر گئے تک دونوں پہریداروں کو سمجھاتا رہا اور انہیں توقع سے زیادہ انعام دینے کا لالچ دے کر قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اسے رات کے دس بجنے کا انتظار تھا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی سوئیاں آج اُسے معمول سے بہت زیادہ سُست محسوس ہو رہی تھیں۔

✣===✣===✣

موسیٰ خان تیزی سے جیپ دوڑاتا ہوا گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ کچے راستے پر جیپ بے تحاشا اچھل رہی تھی مگر اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جہانداد نے دھمکی دے کر اسے کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جلد از جلد خان جی سے جہانداد کے متعلق کوئی مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر و تردد سے زیادہ غصے کے آثار تھے اور دماغ گوناگوں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا مگر کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے خان جی کی اجازت ضروری تھی۔

رات کے تقریباً دس بجے وہ پختہ سڑک پر پہنچ گیا اور پھر اس کے پاؤں کا دباؤ ایکسیلیٹر پر بڑھتا چلا گیا۔ طاقتور جیپ آندھی کی سی رفتار سے حویلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند منٹ کے اندر وہ اس ذیلی سڑک تک جا پہنچا جو سیدھی حویلی کی طرف جاتی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے اچانک ہی جیپ روک دی۔ چند لمحے وہ دانتوں تلے ہونٹ کچل کچل کر کچھ سوچتا رہا پھر خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ پہلے سولجر کی فیملی سے مل لیا جائے۔ سولجر نے میرا سکون غارت کیا ہے اور میں......''

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے جیپ مخالف راستے پر ڈال دی۔ چھوٹا سا گاؤں تھا وہاں سے اس گھر کا فاصلہ جہاں جہانداد کی ماں بہن رہائش پذیر تھیں جیپ پر محض چند منٹ کا تھا۔ ٹھیک دس بج کر دس منٹ پر وہ دونوں پہریداروں کے سر پر پہنچ گیا جو بیرونی دروازے پر بڑی مستعدی کے ساتھ پہرا دے رہے تھے۔ موسیٰ خان کو اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر اپنے سامنے پا کر ان دونوں کے چہروں پر زلزلے کے آثار نمودار ہو کر رہ گئے اور رائفلوں پر ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اگر رات کی تاریکی نہ ہوتی تو موسیٰ خان ان کی یہ حالت دیکھ کر چونک جاتا۔ بہرکیف پہریداروں کی حالت سے بے خبر وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''تالا کھولو۔''

''جج...... جی...... ابھی کھولتا ہوں''۔ پہریدار نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور پھر اپنی جیب ٹٹولنے لگا شاید چابی اسے نہیں مل رہی تھی۔

''کیا کر رہے ہو گدھے''۔ موسیٰ خان نے اسے ڈانٹا۔ ''جلدی کرو۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے''۔

''وہ...... وہ جناب!'' پہریدار گھگھیا کر بولا۔ ''چابی...... نہ جانے کہاں...... کھو...... گئی''



''م...... میں......''

''یہ تم پر لرزہ کیوں طاری ہو گیا ہے؟'' اچانک موسیٰ خان نے چونک کر قطع کلامی کی۔ ''بات کیا ہے کیا وہ ماں بیٹی فرار ہو گئی ہیں؟''

''نن...... نہیں...... جناب''۔ پہریدار منمنا کر رہ گیا۔

معاً گھر کے اندر سے ایک نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی اور دونوں پہریدار بھاگ کر موسیٰ خان کے قدموں سے لپٹ گئے۔ ''ہم بے گناہ ہیں موسیٰ خان! وہ...... وہ شمروز خان بڑا حرامی ہے''۔ دونوں پہریدار کانپتی ہوئی آواز میں جلدی جلدی اسے تفصیل بتانے لگے اور پھر گڑگڑا کر اپنے لیے رحم کی بھیک مانگنے لگے۔

موسیٰ خان نے ایک جھٹکے کے ساتھ کندھے سے گن اتاری اور دونوں پہریداروں کو ٹھڈوں سے ... کھتے ہوئے زہریلے انداز میں بولا۔ ''کمینوں کو معاف کر دینا شریفوں کے ساتھ ظلم ہے۔ موسیٰ خان بہت بُرا آدمی ہے لیکن عورت کی عزت کرنا جانتا ہے چاہے وہ دشمن کی ماں بہن کیوں نہ ہو۔ ...ڑے ہو جاؤ''۔

''نن...... نہیں موسیٰ خان! تمہیں اللہ کا واسطہ''۔ دونوں پہریدار ایک زبان ہو کر چلائے۔ ''ہم پر رحم کرو۔ ہم بے قصور ہیں۔ گناہ گار شمروز خان ہے۔ خدا کے لیے ہمیں......''

''معافی مجھ سے نہیں خدا سے مانگنا''۔ موسیٰ خان نے بے رحم لہجے میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا اور پھر ان کے چیخنے چلانے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گن سیدھی کر لی۔ ''مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ''۔

دونوں پہریدار حواس باختہ ہو کر چلائے اور پھر بالکل غیر متوقع طور پر اٹھ کر دوڑ پڑے مگر موت سے بھلا کون بھاگ سکا ہے۔ چشم زدن میں موسیٰ خان کی گن نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے اور دونوں پہریدار چیختے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔ ان دونوں کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پہرے داروں کی تلاشی لے کر چابی نکالنے کا وقت اس کے پاس بالکل نہیں تھا۔ اسی ...ان دوبارہ اندر سے لگاتار نسوانی چیخوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

موسیٰ خان نے بغیر وقت ضائع کیے تالے پر فائر کیا اور تالا ٹوٹ کر کنڈی سے علیحدہ ہو گیا۔ اس نے لات مار کر دروازہ کھولا اور دندناتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ بھاگ کر اس نے صحن عبور کیا اور برآمدے میں پہنچ گیا۔ دائیں ہاتھ ایک کمرے کے نیم وا دروازے سے روشنی جھلک رہی تھی اور دبی دبی رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ موسیٰ خان نے آگے بڑھ کر پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا اور داخل ہو کر جو منظر اس کی نگاہوں نے دیکھا وہ اس کے تن من میں آگ لگانے کے لیے کافی

تھا۔ شمروز خان نے ایک بستر پر کسی آکٹوپس کی طرح سکینہ کو جکڑ رکھا تھا اور وہ روتے ہوئے خود کو چھڑانے کی ناکام جدوجہد کر رہی تھی۔ غالباً شمروز خان اسے برہنہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس شیطانی کوشش میں وہ اس قدر مشغول تھا کہ نہ ہی اس کے کانوں تک فائرنگ کی آواز پہنچ پائی تھی اور نہ ہی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز۔ ہوس نے اسے اندھا اور بہرہ بنا دیا تھا۔

موسیٰ خان کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس نے گن کو بیرل کی طرف سے پکڑا اور بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر پوری قوت سے شمروز خان کی پشت پر وار کر دیا۔ وار اس قدر شدید تھا کہ شمروز خان چیختا ہوا بستر سے نیچے فرش پر لڑھک گیا۔ اس کے بعد موسیٰ خان نے جنونی انداز میں اس پر گن لاٹھی کی طرح برسانا شروع کر دی۔ پورا کمرا شمروز خان کی کربناک چیخوں سے گونج اٹھا اور وہ کمرے کے ننگے فرش پر جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ موسیٰ خان بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور غصے کی حالت میں بھی گالیاں دینے سے گریز کیا کرتا تھا مگر آج اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان ایک ساتھ چل رہی تھی۔

''کتے کی اولاد''۔ وہ گرج رہا تھا۔ ''کیا تُو موسیٰ خان کو بھول گیا تھا۔ میں تیری ایک ایک بوٹی کتوں اور چیل کوؤں کو کھلاؤں گا۔ بول تُو نے ایسا کیوں کیا۔ میں دشمن کے سامنے کون سا منہ لے کر جاؤں گا''۔

گن لگاتار برس رہی تھی۔ شمروز خان کی کئی ایک ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ چہرے پر ناک کا صرف نشان رہ گیا تھا اور دانت فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ دونوں بازوؤں کی ہڈیاں دو تین جگہوں سے ٹوٹ چکی تھیں اور اس کا پورا جسم لہولہان ہو چکا تھا۔ جلد ہی وہ بے حس و حرکت ہو گیا مگر موسیٰ خان کا جنون کم نہ ہوا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر جیب سے ایک تیز دھار چاقو نکالا اور اسے کھول کر شمروز خان کا کان کاٹ ڈالا۔ اس کے جسم میں معمولی سی حرکت پیدا ہوئی لیکن وہ چیخ نہ سکا۔

''نہیں''۔ موسیٰ خان نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے خود کلامی کی۔ ''اس طرح تو اسے تکلیف کا بالکل احساس نہیں ہوگا۔ اس کا ہوش میں آنا ضروری ہے''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر سکینہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو کمرے کے ایک کونے میں دبکی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے بدن پر بستر کی چادر لپیٹ رکھی تھی۔

موسیٰ خان چند لمحے اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر نادم انداز میں بولا۔ ''میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ کاش میں نے تم لوگوں کو حویلی میں ہی رکھا ہوتا تو آج یہ نوبت نہ آتی''۔

''اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میرے نصیب میں ہی شاید بے عزت ہونا لکھ دیا گیا ہے مگر میں پھر بھی اللہ تعالیٰ کی مشکور ہوں کہ مکمل لٹنے سے بچ گئی۔ تمہیں اگر



ذرا سی دیر اور لگ جاتی تو شاید......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''سکینہ!'' وہ تسلی آمیز انداز میں گویا ہوا۔ ''میں تمہارے بھائی کا دشمن ہوں لیکن بخدا! تم ماں بہن کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ جاؤ دوسرے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کر لو''۔ اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر دوبارہ بولا۔ ''تمہاری ماں کدھر ہے۔ وہ خیریت سے تو ہے ناں؟''

''اس کتے نے اسے باندھ کر دوسرے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ میں دیکھتی ہوں اسے''۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور موسیٰ خان ایک بار پھر فرش پر بے ہوش پڑے شمروز خان کی طرف متوجہ ہو گیا اسے ہوش میں لانے کے لیے اس نے پانی سے کام لیا۔ سرد موسم میں موسیٰ خان نے جب اس پر ٹھنڈے پانی کا جگ انڈیلا تو وہ کراہتے ہوئے ہوش میں آ گیا۔ ابھی تک اس کی دونوں ٹانگیں سلامت تھیں موسیٰ خان نے اس کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اسے کھڑا کر دیا۔ تاہم شمروز خان کے دونوں بازو بے جان انداز میں جھول رہے تھے۔ اس کا چہرہ اس کے اپنے ہی خون سے رنگین تھا۔ دونوں ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور وہ بمشکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم میں اٹھنے والا درد ناقابلِ برداشت تھا۔ چٹخی ہوئی ہڈیاں فریاد کناں تھیں اور اسے دوبارہ فرش بوس ہونے پر مجبور کر رہی تھیں مگر سامنے موت کا فرشتہ کھڑا ہوا تھا جس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی اور چہرے پر بے رحمی کے آثار منجمد تھے۔

''شمروز خان!'' اسے ایک لمحہ گھورنے کے بعد موسیٰ خان نے زبان کو جنبش دی۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم موت کی تمنا کر رہے ہو مگر ابھی نہیں۔ اس جرم کی جو سزا یہاں رائج ہے تمہیں وہی سزا ملے گی''۔

''ن......نہیں''۔ وہ اپنی پوری توانائی صرف کرتے ہوئے چلایا۔ ''تمہیں اللہ کا واسطہ ہے...... مجھے گولی مار دو۔ مجھ پر احسان کر دو۔ خدا کے لیے موسیٰ خان''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ دوبارہ فرش بوس ہو گیا۔

''شمروز خان! قبائلیوں کے قانون سے کوئی قبائلی انحراف نہیں کر سکتا۔'' موسیٰ خان نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ''نہ میں اور نہ تم''۔

''مم...... مجھ پر رحم کرو موسیٰ خان!'' وہ فرش پر گھسٹتے ہوئے موسیٰ خان کے قدموں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے فریاد کناں ہوا۔ ''مم...... مجھ پر چوری کا الزام لگا کر یہیں گولی مار دو۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی''۔

''چور کی سزا موت تو نہیں ہوتی''۔ اس نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔ ''میں تمہیں گولی مار کر خان جی کا عتاب مول لینا نہیں چاہتا اور نہ ہی ایک مجبور لڑکی سے ناانصافی کرنا چاہتا ہوں''۔

اس دوران سکینہ اپنی ماں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور موسیٰ خان ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ خدیجہ لمحہ بھر کے لیے موسیٰ خان کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر منت آمیز انداز میں بولی۔ ''میں تمہاری مشکور ہوں بیٹے! آج اگر تم نہیں آتے تو میری بیٹی جیتے جی مر جاتی۔ میں عمر بھر تمہاری احسان مند رہوں گی۔ بس ہم پر ایک اور احسان کر دے ہمیں رہا کر دے ہم اپنے گاؤں چلے جائیں گے''۔

''وہاں کیا تم لوگ محفوظ رہ سکو گے؟'' موسیٰ خان نے کہا۔ ''وہاں بھی تو ملک مراد اور نادر خان جیسے درندے بستے ہیں اس لیے بہتر ہے یہیں رہو۔ جہانداد نے یہیں واپس آنا ہے''۔

''یہاں ہمیں ڈر لگتا ہے''۔ خدیجہ بولی۔ ''یہاں شمروز خان جیسے لوگ......''

''نہیں اماں! فکر مت کرو''۔ سکینہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسے لوگوں سے نپٹنا جانتی ہوں''۔

اتنا کہہ کر اس نے بالکل غیر متوقع طور پر موسیٰ خان کے ہاتھ سے گن جھپٹ لی اور پھر شمروز خان کا نشانہ لینا چاہا تو موسیٰ خان بیچ میں آ گیا۔

''سکینہ پاگل مت بنو''۔ اس نے کہا۔ ''گولی اس کے لیے بہت آسان موت ہو گی۔ ورنہ میں اسے اب تک گولی مار چکا ہوتا۔ اسے جو سزا ملے گی اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ گن مجھے دے دو''۔

''نہیں''۔ وہ منفی انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گی''۔

''تاکہ اسے آسانی سے چھٹکارا مل جائے''۔ موسیٰ خان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بیوقوف لڑکی اس کی موت بہت دردناک ہو گی کیوں اسے آسان موت دینا چاہتی ہو؟ یہ تو خود یہی چاہتا ہے کہ اسے گولی ماری جائے تاکہ یہ ایک بھیانک موت سے بچ سکے''۔

''ہاں بیٹی! یہ ٹھیک کہتا ہے''۔ خدیجہ بھی موسیٰ خان کی تائید کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بندوق واپس کر دو اسے۔ کیوں اپنے ہاتھ اس بے غیرت کے خون سے رنگنا چاہتی ہو؟'' ماں اور موسیٰ خان کے سمجھانے پر آخر کار سکینہ نے گن واپس کر دی۔

اس کے بعد موسیٰ خان نے دونوں ماں بیٹی کو ساتھ لیا اور شمروز خان کو اپنے کندھے پر ڈال کر واپسی کے لیے روانہ ہو گیا۔ باہر نکل کر اس نے شمروز خان کو جیپ کی عقبی نشست پر پھینکا اور ان دونوں سے کہا۔ ''تم دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ ابھی چلتے ہیں''۔

وہ دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھ چکیں تو موسیٰ خان نے باری باری دونوں پہریداروں کی لاشیں اٹھا کر جیپ کی پچھلی طرف سیٹوں کے درمیان رکھ دیں۔ دونوں ماں بیٹی متحیر انداز میں لاشوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شمروز خان کے دونوں پاؤں موسیٰ خان نے سیٹ کے ساتھ ایک رسی سے باندھ دیے



تھے۔

موسیٰ خان نے ان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ان پہرے داروں کی لاشیں ہیں جنہوں نے شمروز خان کا ساتھ دیا تھا۔ یہ دونوں اس کی اس سازش میں شریک تھے''۔

''تم ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہو؟'' سکینہ نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔ ''ہمارا تو سب کچھ گھر میں رہ گیا ہے اور تالے تک نہیں لگائے گئے''۔

''فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ موسیٰ خان نے جیپ اسٹارٹ کرنے کے بعد آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں۔ میری ماں بہت اچھی ہے وہ تم دونوں کا خیال رکھے گی۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سے تم فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے''۔

''ہم یہاں سے فرار ہو کر کہاں جائیں گے؟'' خدیجہ افسردہ انداز میں بولی۔ ''ہمیں تو اپنے گاؤں کا راستہ تک معلوم نہیں ہے''۔

''تمہارا گاؤں یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے''۔ موسیٰ نے کہا۔ ''وہاں تک پہنچنا تمہارے لیے ناممکن ہے بہرکیف میرے گھر میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ وہاں کوئی لوفر لفنگا داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا''۔

''سمجھ میں نہیں آتا تمہارا شکریہ ادا کروں کہ اپنی قسمت پر ماتم کروں''۔ سکینہ نے عجیب انداز میں کہا۔ ''ایک طرف تم ہمارا محافظ بننے کا دعویٰ کر رہے ہو اور دوسری طرف جہانداد بھائی سے تمہاری دشمنی ہے''۔

''یہ دشمنی ہم دونوں کی مجبوری ہے''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''لیکن میں جہانداد کا بدلہ تم سے نہیں لوں گا''۔

''تو پھر ہمیں یرغمال بنا کر کیوں رکھا ہوا ہے؟'' سکینہ نے شکوہ کیا۔ ''آزاد کیوں نہیں کر دیتے ہیں؟''

''یہ میرے اختیار میں نہیں ہے''۔ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ''میں تو خان جی کا غلام ہوں اور اس کے حکم سے تمہیں یہاں لایا گیا ہے۔ بخدا! اگر میرے بس میں ہوتا تو ابھی تمہارے گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتا''۔

''اس خان جی کی جہانداد سے کیا دشمنی ہے؟'' سکینہ نے پوچھا۔

''یہ تو خان جی کو یا پھر جہانداد کو معلوم ہو گا''۔ اس نے جواب دیا اور پھر ایک پختہ مکان کے سامنے جیپ روک دی۔

''چلو آؤ......'' وہ جیپ سے اترتے ہوئے بولا۔ ''میں تم لوگوں کو اپنی ماں سے ملواتا ہوں''۔

دونوں جیپ سے اتر کر موسیٰ خان کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔ موسیٰ خان نے دروازے پر تین بار مخصوص انداز میں دستک دی تو چند لمحوں کے اندر بغیر استفسار کیے دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک لانبے قد کی عورت تھی۔ موسیٰ خان کے ساتھ دو اجنبی عورتوں کو دیکھ کر ایک ثانیے کے لیے تو وہ متحیر رہ گئی پھر استفساریہ انداز میں بولی۔ ''موسیٰ خان! یہ کون ہیں؟''

''یہ ہماری مہمان ہیں ماں''۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں نے غالباً ان کے متعلق ایک دن آپ کو بتایا بھی تھا''۔

''مجھے تو یاد نہیں ہے''۔ وہ بولی۔ ''تم نے کب بتایا تھا؟''

''اندر تو چلو ماں''۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''میں ابھی ان کا تعارف کرا دیتا ہوں''۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں''۔ وہ خجالت آمیز انداز میں بولی۔ ''اندر آ جاؤ''۔ اندر پہنچتے ہی موسیٰ خان نے بلاتردد اپنی ماں سے ان دونوں کو متعارف کرایا تو وہ ان دونوں سے باری باری قبائلی روایات کے مطابق بغل گیر ہو کر ملی۔

''آج سے یہ آپ کی حفاظت میں ہیں ماں''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''ان کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے''۔

''کیا اپنی ماں کو سکھاؤ گے موسیٰ خان؟'' وہ سکینہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''نہیں ماں! میں تو ایسے ہی بات کر رہا تھا''۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''میری ایسی جرأت کہاں کہ اپنی ماں کو سکھانے کی کوشش کروں۔ میں تو آدھا پٹھان ہوں جبکہ آپ تو......''

''بس بس زیادہ چاپلوسی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ ماں نے ہنستے ہوئے قطع کلامی کی۔ ''میں تمہیں خوب جانتی ہوں''۔

''اچھا ماں! میں تھوڑی دیر کے لیے اجازت چاہوں گا''۔ وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''حویلی میں خان جی میرے منتظر ہوں گے۔ پریشان نہ ہونا میں جلد ہی لوٹ آؤں گا''۔

''جاؤ جاؤ.....اب میں اکیلی تھوڑی ہوں''۔ اس نے جواب دیا اور موسیٰ خان خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔



تھوڑی دیر کے بعد موسیٰ خان کی جیپ حویلی کے صدر دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ گیراج میں پہنچ کر اس نے جیپ روک دی اور انجن بند کرنے کے لیے بعد اگنیشن سے چابی نکال کر نیچے اتر گیا۔ لاشیں اٹھوانے کے بعد اس نے شمروز خان کے پیر کھولے اور اسے بے دردی سے کھینچ



کر نیچے اتار دیا۔

''چلو......'' وہ اسے ٹھوکا دیتے ہوئے بولا۔ ''خان جی کو تمہارا دیدار کرانا ہے''۔

''موسیٰ خان! خدا کے لیے مجھ پر ایک احسان کر دو''۔ اس نے دردناک لہجے میں فریاد کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گولی مار دو۔ گولی مار دو''۔ بات ختم کرتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔

وہ جس کربناک انداز میں رو رہا تھا۔ وہ پتھروں کا دل پگھلانے کے لیے کافی تھا لیکن موسیٰ خان کے پہلو میں شاید فولاد کا دل تھا۔ اس پر شمروز خان کی فریاد معمولی سا اثر بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ اسے دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ شمروز خان گرتا پڑتا آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بدستور اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ موسیٰ خان نے بالکل چپ سادھ رکھی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ بولنا جانتا ہی نہ ہو۔ چند منٹوں کے بعد وہ خان جی کی مخصوص رہائش گاہ میں داخل ہو رہے تھے۔ دالان عبور کرتے ہوئے وہ برآمدے میں پہنچ گئے۔ خان جی کے کمرۂ خاص میں برقی لائیٹ جل رہی تھی۔ غالباً اسے موسیٰ خان کی واپسی کی خبر مل چکی تھی۔

موسیٰ خان نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اندر سے خان جی کی آواز سنائی دی۔ ''اندر آ جاؤ موسیٰ خان میں تمہارا کب سے منتظر ہوں''۔

خان جی کا حکم سن کر موسیٰ خان، شمروز خان کو کھینچتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ خان جی ایک دبیز صوفے پر براجمان غیر ملکی سگار کے کش لگا رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' اندر داخل ہوتے ہی موسیٰ خان نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' خان جی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے متحیر انداز میں شمروز خان کی طرف دیکھا اور پھر سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''اسے تو میں نے آج شام کے وقت پشاور روانہ کیا تھا۔ یہ واپس کیسے پہنچ گیا ہے؟''

''خان جی! اس کی کہانی بڑی رنگین ہے''۔ موسیٰ خان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے''۔

''تمہید مت باندھو موسیٰ خان''۔ خان جی نے ناگوار لہجے میں کہا۔ ''جو بات کرنے والی ہے وہ کرو؟''

''جیسا حکم خان جی''۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے پورا واقعہ من و عن خان جی کے گوش گزار کر دیا۔

پورا واقعہ سننے کے بعد خان جی غصے سے بھڑک اٹھا اور دل کھول کر شمروز خان کو گالیاں دینے کے بعد موسیٰ خان سے بولا۔ ''کل صبح ہی جرگہ بلاؤ اور کل صبح ہی اس کی سزا پر عمل درآمد ہوگا۔ یہ میرا حکم

ہے۔ایک مہمان لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈال کر اس نے تمام قبائلیوں کی ناک کٹوا دی ہے"۔

"جو حکم خان جی"۔ موسیٰ خان فرماں برداری سے بولا۔"میں کل صبح جرگے کا انتظام کر دوں گا"۔

"اب اسے قید خانے میں پھنکوا دو"۔ خان جی نے حکم دیا۔"اور جو جیپ یہ ویرانے میں چھوڑ آیا ہے۔اسے لانے کے لیے کوئی آدمی بھیج دو۔ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد جلدی واپس لوٹنا میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں"۔

"خان جی! میں ابھی گیا اور ابھی آیا"۔ اتنا کہنے کے بعد وہ ایک بار پھر شمروز خان کو دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا۔اس کے جانے کے بعد خان جی نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔تقریباً پندرہ منٹ کے بعد موسیٰ خان کی واپسی ہوئی تو خان جی کے اضطراب میں کچھ کمی واقع ہوگئی۔تب موسیٰ خان نے اسے جہانداد کی وارننگ کی تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔جوں جوں وہ تفصیل بتاتا جا رہا تھا خان جی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔آج تک اسے اس طرح کی وارننگ دینے کی جرأت کسی نے نہیں کی تھی۔

"ایک بھگوڑے فوجی کی اتنی جرأت؟"پوری تفصیل جاننے کے بعد وہ مشتعل ہو کر بولا۔"میں اس کا اور اس کے ہمدرد ایس پی جمشید خان کا نام و نشان مٹا دوں گا۔انہوں نے سردار فراست علی خان کو وارننگ دے کر اپنی اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔میں ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا۔وہ مجھے زندہ چاہئیں۔تم کل ہی پشاور روانہ ہو جاؤ اور اپنے تمام آدمی ان کے تعاقب میں لگا دو"۔ اتنا کہہ وہ ایک ثانیے کے رکا اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولا۔"جہانداد کی ماں اور بہن کو اس وقت میرے سامنے پیش کرو۔میں جہانداد کو ایک تحفہ بھجوانا چاہتا ہوں۔جاؤ جلدی کرو"۔

"مم......مگر......خان جی"۔ موسیٰ خان بوکھلا کر بولا۔"اس میں ان بے چاریوں کا کیا قصور؟ وہ تو ہماری پناہ میں ہیں اور قبائلی روایات کے مطابق ہم ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی......"

"خاموش"۔ خان جی نے گرج کر قطع کلامی کی۔"تم دو ٹکے کے غلام مجھے قبائلیوں کے قوانین بتاؤ گے؟ تمہیں یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"خان جی! میں نے کبھی آپ سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا"۔ موسیٰ خان ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔"لیکن آج مانگتا ہوں۔یہ میری عزت کا سوال ہے میں انہیں کسی قیمت پر آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔آپ بے شک میری جان لے لیں مگر......"

"گارڈز!"اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی خان جی نے بلند آواز سے گارڈز کو پکارا۔ایک لمحے کے اندر یونیفارم میں ملبوس چار مسلح گارڈز اندر داخل ہوئے اور موسیٰ خان کو گھیر لیا۔

موسیٰ خان بیک وقت چار گنوں کے نشانے پر تھا اور چاروں گارڈز اسے کینہ توز نگاہوں سے



گھور رہے تھے۔لمحہ بھر کے لیے موسیٰ خان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھر کر معدوم ہوگئے۔یہ صورتِ حال اس کے لیے نئی نہیں تھی ایسے حالات سے وہ بارہا گزر چکا تھا مگر یہاں معاملہ خان جی کا تھا۔اس خان جی کا جو اس کا سب سے بڑا محسن تھا۔باپ کے چھوڑ جانے کے بعد خان جی نے ہی اسے پال پوس کر جوان کیا تھا۔وہ محسن کش نہیں کہلانا چاہتا تھا۔خان جی اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔گارڈز خان جی کے اشارے کے منتظر تھے۔

"غلام جب بغاوت کرتے ہیں تو کتے کی موت مارے جاتے ہیں"۔ خان جی نے قدرے توقف سے کہا۔"تمہیں حکم عدولی کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

موسیٰ خان نے ایک نظر خان جی کی طرف دیکھا اور پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا۔"یہ غلام اپنے آقا کے ہاتھوں مارا جائے،اس سے بڑی سعادت اس کے لیے اور کیا ہوگی؟ میں آنکھیں بند کیے کھڑا ہوں خان جی،آپ اپنے ہاتھ سے مجھ کو گولی مار دیں"۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم ان ماں بیٹی کے لیے مرنے کو تیار ہو؟" خان جی نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔"اور جس نے باپ بن کر پالا ہے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے تمہاری نگاہوں میں؟"

"وقعت ہے خان جی"۔ وہ تڑپ کر بولا۔"اسی لیے تو سر جھکا کر کھڑا ہوں۔آپ مجھے گولی مار دیں۔اس کے بعد ان ماں بیٹی کے ساتھ کچھ بھی کریں۔کم از کم میں ان کی بے بسی تو نہیں دیکھ سکوں گا"۔

"مجھے تم پر فخر ہے موسیٰ خان"۔ اچانک خان جی بالکل بدلے ہوئے انداز میں بولا۔"تم نے ایک قبائلی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔اگر تم میرا کہا مان کر ان دونوں کو یہاں لے آتے تو پھر ہمیشہ کے لیے میری نگاہوں سے گر جاتے"۔

"میں جانتا تھا خان جی! کہ آپ میرا امتحان لے رہے ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔"ورنہ آج تک کبھی بھی قبائلی سردار نے عورت کو دشمنی کا نشانہ نہیں بنایا"۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو"۔ خان جی نے گارڈز کو واپس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"میں تمہارا امتحان لے رہا تھا"۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے خان جی"۔ گارڈز کے واپس جانے کے بعد موسیٰ خان نے سوال کیا۔

"رات بہت ہوگئی ہے۔اس لیے اب تم آرام کرو"۔ خان جی نے کہا۔"صبح نہ صرف جرگہ بلانا ہے بلکہ شمروز کی سزا پر فوری عمل درآمد بھی کرانا ہے"۔

"بہت بہتر خان جی"۔ اتنا کہنے کے بعد وہ سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن صبح نو بجے کے قریب ایک بڑی حویلی کے کشادہ صحن میں علاقے کے معززین اور عام لوگ جمع تھے۔ آج شمروز خان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ خان جی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مجمع کے لوگ آپس میں ہلکی آواز سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ موضوع گفتگو شمروز خان کا جرم تھا۔ وہاں کسی شخص کے چہرے پر بھی شمروز خان کے لیے ہمدردی کے آثار نہیں تھے۔ دبی دبی زبان میں وہ سب شمروز خان کو برا بھلا کہہ رہے تھے جس نے قبائلی روایات کو ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر مٹی میں ملا دیا تھا۔

قبائلیوں کو اپنی روایات اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر اپنی روایات کا سودا کسی بھی قیمت پر نہیں کرتے۔ وہ صرف غیرت کو اپنا سرمایہ تسلیم کرتے ہیں اور غیرت کے لیے ہی جیتے مرتے ہیں۔ آپس میں دشمنیوں میں وہ کبھی بھی کسی عورت پہ ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ قبائلی عورت کی سب خطائیں فراخدلی سے معاف کر دیتے ہیں سوائے جرم محبت کے۔ وہاں عورت کو پسند کی شادی کرنے کا حق بالکل حاصل نہیں ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب خان جی پہنچ گیا تو جرگے کی باقاعدگی کارروائی شروع کر دی گئی۔ سب سے پہلے مجرم شمروز خان کا بیان لیا گیا۔ شمروز خان نے اقبال جرم کرنے کے بعد جرگے کے سامنے رحم کی درخواست پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے موت کی سزا بھی قبول ہے مگر میں پھر بھی رحم کی درخواست پیش کرتا ہوں۔ امید ہے جرگے کے معزز ارکان میری درخواست پر غور کریں گے''۔

''کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' جرگے کے ایک معزز رکن نے کہا۔ ''ہمارا فیصلہ انصاف کے منافی نہیں ہوگا''۔

''معزز ارکان جرگہ! میں نے جرم کرنے کی کوشش ضرور کی ہے مگر اپنی اس کوشش میں ناکام ہوا ہوں''۔ شمروز خان نے اونچی آواز میں کہا۔ ''اس لیے میری درخواست ہے کہ مجھے یہاں کے قانون کے مطابق رائج سزا دینے کی بجائے گولی ماردی جائے''۔

شمروز خان کی بات سن کر مجمع میں تھوڑی دیر کے لیے سکوت چھا گیا اور جرگے کے اراکین ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ یہ صورت حال اراکینِ جرگہ کے لیے بالکل نئی تھی اور اب وہ مدد طلب نگاہوں سے خان جی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

خان جی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''مجرم اپنے جرم کا اقبال کر چکا ہے۔ اس نے لڑکی پر مجرمانہ حملہ جس نیت سے کیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ یہ تو لڑکی کی قسمت اچھی تھی کہ موسیٰ خان کی بروقت آمد سے مجرم کے گھناؤنے عزائم کی تکمیل نہ ہو سکی ورنہ مجرم



بدارادہ لے کر وہاں گیا تھا کیا وہ قابلِ معافی ہے؟ میں مجرم کی رحم کی درخواست رد کرتا ہوں۔ کیا جرگے کے کسی رکن کو مجھ سے اختلاف ہے؟''

خان جی کا دوٹوک فیصلہ سن کر جرگے کے ارکان ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے لگے۔ شاید انہیں خان جی کے فیصلے پر اعتراض تھا مگر وہ اس کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔ خان جی علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا جرگے کا کوئی بھی رکن اس کے فیصلے کے خلاف آواز اٹھا کر اپنی موت کو آواز نہیں دینا چاہتا تھا اور پھر ایسے معاملے میں تو بولنے کی کوئی ضرورت تھی ہی نہیں۔ شمروز خان نے جو جرم کیا تھا وہ بہت بھیانک تھا اس کی کم سے کم سزا موت ہی ہو سکتی تھی۔

خان جی چند لمحے ان کے بولنے کا منتظر رہا مگر جب ان میں سے کسی نے اس کے فیصلے پر اعتراض نہ کیا تو اس نے دوبارہ پوچھا۔ ''میں دوبارہ آپ لوگ سے پوچھ رہا ہوں کہ اگر کسی کو میرے فیصلے پر اعتراض ہے تو وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ اگر رائے قابلِ توجہ ہوئی تو اس پر ضرور غور کیا جائے گا''۔

''خان جی!'' جرگے کا ایک باریش رکن گویا ہوا۔ ''ہمیں آپ کے فیصلے پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ مجرم کو گولی مار کر سزا پر عمل درآمد کیا جائے''۔

''کیا یہ سارے ارکان کا متفقہ فیصلہ ہے؟'' خان جی نے استفسار کیا۔

جرگے کے ارکان ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ کوئی بھی خان جی کو جواب دینے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوتا۔ کوئی بھی باہوش انسان بھول کر بھی نہیں کرتا۔

خان جی نے قدرے توقف سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ باقی ارکان مجھ سے متفق ہیں؟''

''میں متفق نہیں ہوں''۔ اچانک شمروز خان چلا کر بولا۔ ''مجھے یہ سزا نامنظور ہے۔ یہ ظلم ہے بہت بڑی ناانصافی ہے۔ مجھ پر رحم کیا جائے''۔

''تم چپ رہو''۔ خان جی نے گرج کر کہا۔ ''یہ جرگے کا فیصلہ ہے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا''۔

''خدا کے لیے خان جی! مجھ پر رحم کیجیے''۔ شمروز خان رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے گولی مار دیجیے۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میں نے برسوں آپ کی خدمت کی ہے۔ کیا آسان موت میرا حق نہیں ہے''۔

''تم میرے مجرم نہیں ہو شمروز خان''۔ خان جی نے بے تاثر آواز میں کہا۔ ''اور نہ میں تمہاری سزا میں تخفیف کر سکتا ہوں۔ یہ ہمارے علاقے کا دستور ہے جسے بدلنا میرے بس میں نہیں ہے''۔

''خان جی! یہ دستور بھی تو آپ کے اجداد کا بنایا ہوا ہے''۔ شمروز خان نے کہا۔ ''آپ چاہیں تو اسے بدل سکتے ہیں۔ اس علاقے میں کون ہے آپ کو روکنے والا؟ یہ سب آپ کی رعایا ہیں''۔

''تم بے وقوف ہو''۔ خان جی بھڑک کر بولا۔ ''قبائلیوں کے قوانین تو سرکار بھی نہیں بدل سکتی۔ پھر میں کیسے بدل سکتا ہوں؟''

''خان جی! خدا کے لیے''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا مگر خان جی پر اس کی آہ و بکا کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے جرگے کے ارکان پر ایک نظر ڈالی اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ سزا پر کل صبح تک عمل درآمد ہو جانا چاہئے۔ شمروز خان چیختا چلاتا رہ گیا مگر جرگے کے کسی رکن نے اس پر توجہ نہ دی اور جرگہ برخواست کر دیا گیا۔





شمروز خان کو ایک بار پھر خان جی کے نجی قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ خان جی نے اس کے رشتے داروں کو آخری ملاقات کرنے کا پیغام بھجوا دیا تھا۔ شمروز خان کی بیوی زرتاج اسی روز سہ پہر کے وقت پہنچ گئی تھی۔ اس کے ساتھ شمروز خان کا سسر بھی تھا۔ دونوں باپ بیٹی پریشانی کے عالم میں خان جی کی حویلی میں پہنچ گئے۔ موسیٰ خان کی سفارش پر خان جی ان دونوں سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا مگر وہ اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

''خان جی!'' زرتاج نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں بے سائبان ہو جاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں''۔

''نصیب خان!'' خان جی نے زرتاج کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے باپ کو مخاطب کیا۔ ''تم نے اپنی بیٹی کو قبائلیوں کے قوانین نہیں بتائے؟ شمروز خان نے جو سنگین جرم کیا ہے کیا اس کی یہاں کے قوانین میں کوئی معافی ہے۔ جواب دو مجھے؟''

''خان جی! عورت ذات ہے''۔ نصیب خان بولا۔ ''جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسی دیوانی کی باتیں کر رہی ہے ورنہ ایسے جرم کی معافی کے بارے میں سوچنا بھی حماقت ہے۔ ہم تو صرف شمروز خان سے آخری ملاقات کرنے کے لیے آئے ہیں''۔

''ملاقات پر کوئی پابندی نہیں ہے''۔ خان جی نے جواب دیا۔ ''تم لوگ اس سے ملاقات کر سکتے ہو''۔

''بڑی مہربانی خان جی''۔ وہ سلام کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا اب ہم جائیں؟''

''نہیں''۔ زرتاج اچانک ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''میں ...... میں نہیں جاؤں گی۔ میں شمروز کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ خدا کے لیے اس کی جان بخش دو۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی''۔

''لے جاؤ اسے نصیب خان''۔ خان جی غصے سے بولا۔ ''اسے یہاں لا کر تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے''۔

''یہ ناسمجھ ہے خان جی''۔ وہ بیٹی کو بازو سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''اس شوہر کے لیے پاگل

ہو رہی ہے جس نے ہمیشہ اسے پاؤں کی جوتی بنا کر رکھا ہے''۔

''مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو''۔ وہ چلائی مگر نصیب خان نے اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

''ہوش کرو زرتاج''۔ اس نے غصے سے کہا۔ ''یہاں تماشا مت بناؤ۔ چلو میں تمہیں شمروز خان کے پاس لے چلتا ہوں۔ اس سے آخری ملاقات کر لو''۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی''۔ وہ باپ کے بازوؤں میں تڑپتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لیے میرے شمروز کو بچا لو یہ...... اسے مار ڈالیں گے۔ یہ سب قاتل ہیں درندے ہیں۔ خون پیتے ہیں بے گناہوں کا''۔

''پاگل مت بنو''۔ نصیب خان نے بے بسی کے عالم میں اسے طمانچہ رسید کر دیا۔ ''تم میری عزت خاک میں ملا رہی ہو۔ تمہارے شوہر کو اب کوئی نہیں بچا سکتا۔ اسے کرنی کا پھل مل رہا ہے۔ کاش اس نے میری نصیحتوں پر کان دھرے ہوتے تو آج یوں بے بسی کی موت نہ مرتا۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے یہی قانونِ قدرت ہے۔ نیم کے درخت پر انگور نہیں لگتے''۔

زرتاج شدتِ غم سے چلاتی رہی مگر خان جی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ یوں لاتعلق سا بیٹھا ہوا تھا جیسے زرتاج جیتے جاگتے انسان کی بجائے کوئی کھلونا ہو۔ چابی سے چلنے والا جو چند لمحے تماشا دکھانے کے بعد خود بخود رک جائے گا۔

زرتاج کے چیخنے چلانے کی پروا نہ کرتے ہوئے نصیب خان اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ خان جی کا ایک محافظ انہیں قید خانے تک لے گیا جہاں ایک سیل میں شمروز خان کسمپرسی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ ایک بھیانک موت کے تصور نے اسے وقت سے پہلے ہی موت کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا۔ یوں بھی موسیٰ خان کے تشدد نے اسے ادھ مرا تو کر دیا تھا۔

''شمروز!'' زرتاج نے سلاخیں تھامتے ہوئے اسے پکارا۔ ''یہ...... یہ تم نے کیا کر دیا ہے؟''

اس کی آواز سن کر شمروز اپنی جگہ سے بمشکل اٹھا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے سلاخوں تک پہنچ گیا۔

''مم...... مجھے...... بچا لو چاچا!'' زرتاج کے ساتھ اپنے سسر کو دیکھ کر وہ گڑگڑایا۔ ''مم...... میں...... مرنا نہیں چاہتا...... آپ کو اللہ کا واسطہ مجھے بچا لیں۔ میں آپ کی بیٹی کا سہاگ ہوں''۔

''تم نے جو بویا تھا وہی کاٹ رہے ہو شمروز خان''۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ ''تمہیں اب اللہ کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا''۔



''زرتاج...... زرتاج! تم کچھ کرو ناں''۔ وہ بیوی سے ملتجی ہوا۔ ''خان جی کے پیر پکڑ لو اس کے سامنے رو، گڑگڑا۔ شاید وہ تم پر ہی رحم کھا لے''۔

''ہم ابھی خان جی سے ہی مل کر آ رہے ہیں''۔ نصیب خان بولا۔ ''زرتاج نے اس کی بہت منتیں کی ہیں مگر وہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہے''۔

''تو...... تو کیا ایک اذیت ناک موت میرا مقدر بن چکی ہے؟'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''آپ میرے لیے نہ سہی اپنی بیٹی کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتے؟''

''کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا''۔ نصیب خان ایک آہ خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر یہاں میری سننے کے لیے کوئی ایک بھی تیار نہیں ہے۔ نہ خان جی اور نہ ہی موسیٰ خان''۔

''میں بچ گیا تو موسیٰ خان کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتاروں گا''۔ شمروز خان نے ایک دم غصے میں آ کر کہا۔ ''سب کیا دھرا اسی حرام زادے کا ہے''۔

''رسی جل گئی پر بل نہ گیا''۔ نصیب خان متاسف انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم خود چند گھڑیوں کے مہمان ہو۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنے کی بجائے انتقام کی باتیں کر رہے ہو...... تم شاید پاگل ہو چکے ہو؟''

''چاچا! مجھے پاگل کہہ کر جان مت چھڑاؤ۔ میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو کرو''۔ اس نے ایک بار پھر فریادی انداز اختیار کر لیا۔ ''میں بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ زرتاج کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''زرتاج خدا کے لیے تم کچھ کرو...... جاؤ خان جی کے پاس اور اس کے پیروں پر گر جاؤ۔ جب تک وہ تمہاری بات نہ مان لے سر نہ اٹھانا''۔

''یہ ایسا کر کے دیکھ چکی ہے''۔ نصیب خان نے کہا۔ ''مگر حاصل کچھ نہیں ہوا۔ خان جی کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ وہ کسی کی بھی سفارش نہیں سنتا''۔

اسی دوران ایک پہریدار ان کے پاس پہنچ کر بولا۔ ''ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے اب تم لوگ جاؤ''۔

''کیوں یہ کوئی جیل تو نہیں ہے؟'' زرتاج نے ناگواری سے جواب دیا۔ ''ہم نہیں جائیں گے''۔

''بی بی! یہ خان جی کا حکم ہے''۔ پہریدار نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے زبردستی پر مجبور مت کرو''۔

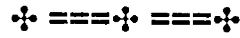
''ٹھیک ہے''۔ نصیب خان بولا۔ ''ہم جا رہے ہیں تمہیں زبردستی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ زرتاج سے مخاطب ہوا۔ ''چلو بیٹی! ہم قسمت سے نہیں لڑ سکتے''۔

زرتاج بولی۔ ''میں اپنے سر کے سائیں کو مرنے نہیں دوں گی۔ اسے بچانے کے لیے اپنی جان بھی دے دوں گی''۔

''شاید...... تم بھی پاگل ہو چکی ہو''۔ نصیب خان اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''چلو...... یہاں تماشا بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

وہ ہاتھ پاؤں مارتی رہ گئی مگر نصیب خان اسے کھینچتے ہوئے باہر لے جانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔



اسی روز شام کے وقت موسیٰ خان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت موسیٰ خان کی ماں مغرب کی نماز ادا کر رہی تھی۔ سلام پھیرنے کے بعد اس نے دعا مانگی اور پھر اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف چل دی۔ ذرا دیر کے بعد اس کی واپسی زرتاج کے ہمراہ ہوئی۔ سکینہ اور اس کی ماں کے لیے زرتاج بالکل اجنبی تھی۔ موسیٰ خان کی ماں نے دونوں سے زرتاج کا تعارف کروایا تو سکینہ بھڑک اٹھی۔

''یہ یہاں کیوں آئی ہے؟'' اس نے موسیٰ خان کی ماں سے سوال کیا۔ ''اسے تو شرم سے کہیں ڈوب مرنا چاہئے تھا۔ اس کے بے غیرت شوہر نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اسے میں مرتے دم تک نہیں بھول سکتی''۔

''میں ...... میں اس کی زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے آئی ہوں بہن''۔ زرتاج نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں اس کے بغیر در بدر ہو جاؤں گی۔ تمہیں خدا کا واسطہ اسے معاف کر دو۔ میں......''

''بس''۔ سکینہ نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ''تم اس شخص کے لیے معافی کی بھیک مانگ رہی ہو جسے شاید خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔ تمہیں ایسی بات کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی''۔

''میں تمہارے پیروں پر گرتی ہوں بہن''۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر سکینہ کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''میں جانتی ہوں کہ وہ معافی کے قابل نہیں ہے مگر میں کیا کروں، وہ...... وہ جیسا بھی ہے میرے سر کا سائیں ہے۔ تم اس پر نہیں مجھ پر رحم کرو۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔ رسول کا واسطہ''۔

اس کی فریاد سن کر ایک لمحے کے لیے سکینہ کے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھرے مگر فوراً ہی معدوم ہو گئے۔

''نہیں''۔ دوسرے ہی لمحے وہ حتمی انداز میں بولی۔ ''یہ ناممکن ہے۔ میں اس درندے کو کبھی



ہی معاف نہیں کرسکتی۔ تم معافی مانگ کر اپنی توہین مت کرو''۔ اتنا کہہ کر سکینہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

''مجھے نامراد مت لوٹاؤ''۔ زرتاج نے روتے ہوئے کہا۔ ''معاف کر دینا انتقام لینے سے بڑ ہوتا ہے''۔

''میں انسان ہوں زرتاج بی بی''۔ سکینہ بے رخی کے ساتھ بولی۔ ''نعوذ باللہ کوئی خدا نہیں ہوں کہ شمروز جیسے گناہ گار کو معاف کر دوں۔ میں خود تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے تنگ مت کرو، چلی جاؤ یہاں سے''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ بھاگتی ہوئی ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ زرتاج وہیں بیٹھی فریاد کرتی رہ گئی۔ موسیٰ خان کی ماں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''زرتاج! اللہ تعالیٰ سے صبر کی توفیق مانگو۔ سکینہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد بھی اس سے معافی کی امید رکھنا حماقت ہے۔ جاؤ چلی جاؤ''۔

''کہاں جاؤں خالہ! میں تو جیتے جی مر گئی ہوں''۔ وہ سسک کر بولی۔ ''میرے سر کا سائیں نہ رہا تو میں کہاں جاؤں گی؟ کیا لوگ مجھے جینے دیں گے۔ معاشرے میں ایک بیوہ کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے کیا میں اسے برداشت کر پاؤں گی؟''

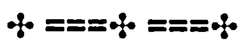
''شمروز نے جو بویا ہے وہ تو کاٹنا ہی پڑے گا''۔ موسیٰ خان کی ماں نے متاسف انداز میں کہا۔ ''تم خود کو سکینہ کی جگہ رکھ کر فیصلہ کرو۔ کیا اسے شمروز کو معاف کر دینا چاہئے؟ ایک عورت کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کی عزت ہوتی ہے اور شمروز خان نے اس کی عزت پر ڈاکا ڈالا ہے۔ اس علاقے میں جب بھی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے مجرم کو موت کی ہی سزا سنائی گئی ہے''۔

''میں جانتی ہوں خالہ! مگر میں صبر کہاں سے لاؤں؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لیے تم لوگ ہی سکینہ کو سمجھاؤ کہ وہ...... وہ شمروز کو معاف کر دے''۔

اتنا کہہ وہ آگے بڑھی اور خدیجہ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ''تمہاری تو وہ بیٹی ہے خالہ۔ کیا تمہاری بات بھی نہیں سنے گی؟ شمروز کے مرجانے سے اسے کیا ملے گا۔ مجھے بیوہ بنا کر اسے کون سا سکون مل جائے گا؟''

''زرتاج! مجھے تم سے ہمدردی ہے''۔ خدیجہ نے بے تاثر انداز میں کہا۔ ''مگر سکینہ شمروز کو معاف نہیں کرسکتی۔ وہ معافی کے قابل ہی نہیں ہے۔ خدا کے لیے ہمیں مجبور نہ کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ خان جی جانے اور شمروز''۔

اس کے بعد زرتاج دیر گئے تک منت فریاد کرتی رہی مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ آخر کار انتہائی بے بسی اور مجبوری کے عالم میں وہ رخصت ہو گئی۔



دوسرے دن ایک پتھریلے میدان میں گاؤں کے تمام چھوٹے بڑے جمع تھے۔ یہ ہجوم شمروز خان کا عبرت ناک انجام دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوا تھا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں اور تبصرے کر رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی شمروز خان کے لیے ہمدردی کے جذبات نہیں تھے۔ عورت کے متعلق چھوٹے بڑے ہر قبائلی کی سوچ ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں بھی کسی عورت کو بے عزت نہیں کرتے۔ آپس کی دشمنیاں ان کے روزمرہ کے مشاغل میں شامل ہوتی ہیں مگر عورت ان کے لیے دشمن کی بھی قابلِ احترام ہوتی ہے۔

شمروز خان نے قبائلی روایات کی نفی کر کے جو گھناؤنا قدم اٹھایا تھا وہی قدم اس کے لیے گلے کا پھندا بن گیا تھا۔ ہوس نے اسے ایک ایسے عبرت ناک انجام تک پہنچا دیا تھا جس کے متعلق سوچتے ہوئے روح کانپ جاتی ہے۔ لوگ ابھی تک چہ میگوئیوں میں معروف تھے وہ شمروز خان کی ذات پر حسبِ استطاعت تنقید کر رہے تھے کہ ایسے ہی وقت قید خانے کے پہریدار شمروز خان کو لے کر پہنچ گئے۔ وہ بمشکل پہریداروں کے سہارے چل رہا تھا۔ موسیٰ خان کی مار اور موت کے خوف نے اس کا لہو نچوڑ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور اسے یوں دیکھنے لگے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ پہریدار لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر کوئی بھی ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شمروز خان چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ لوگ اسے لعنت ملامت کر رہے تھے کچھ دل جلے اسے گالیاں بھی دے رہے تھے مگر وہ احساسات و جذبات سے یکسر عاری نظر آ رہا تھا۔ آنے والے وقت کے خوفناک تصور نے اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کر رکھا تھا۔

اچانک ایک نوجوان شخص نے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور جوش میں آ کر شمروز خان کی پیٹھ پر دے مارا۔

"سنگسار کرو اس حرام زادے کو"۔ پتھر مارنے کے بعد وہ چلا کر مجمع سے مخاطب ہوا۔ "مار ڈالو اسے تاکہ آئندہ کوئی بھی ایسا گھناؤنا کام نہ کرے"۔

"ہاں ہاں...... مارو"۔ اس کی دیکھا دیکھی چند لوگ چلائے اور دوسرے ہی لمحے انہوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھا لیے۔

"خبردار"۔ لوگوں کو حد سے تجاوز کرتے دیکھ کر تینوں پہریداروں نے رائفلیں تان لیں۔

"اب اگر کسی نے قیدی کو پتھر مارا تو ہم گولی چلا دیں گے"۔ ایک پہریدار نے لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خان جی کا حکم ہے۔ پیچھے ہٹ جاؤ"۔

"یہ ہمارا مجرم ہے خان جی کا نہیں"۔ ایک نوجوان نے چلا کر کہا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر



شمروز خان کو دے مارا۔

اس کی ہمت دیکھ کر دیگر لوگوں نے نعرے بازی شروع کر دی۔ "قیدی کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم خود اس کا فیصلہ کریں گے"۔ وہ تمام یک زبان ہو کر چلا رہے تھے۔ "ہم اسے اسلامی طریقے سے سزا دیں گے۔ ہمارے حوالے کر دو...... ہمارے حوالے کر دو"۔

ہجوم کو بے قابو ہوتے دیکھ کر تینوں پہریداروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ لوگوں کے ارادے خوفناک لگ رہے تھے۔ قیدی کی حفاظت پہریداروں کی ذمہ داری تھی۔ اگر قیدی کو کچھ ہو جاتا تو یقیناً خان جی تینوں پہریداروں کو زندہ جلا دیتا۔

آخر کار بے قابو ہجوم کو روکنے کے لیے تینوں پہریداروں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی مگر وہ قبائلی تھے لوری کی جگہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سن کر جوان ہوئے تھے۔ ہوائی فائرنگ دیکھ کر ڈرنے کی بجائے بھڑ گئے۔ اب وہ قیدی کے ساتھ ساتھ پہریداروں پر بھی پتھراؤ کر رہے تھے۔ صورت حال ایک دم ہی خطرناک ہو گئی تھی۔ تینوں پہریدار اور قیدی بپھرے ہوئے ہجوم کے درمیان گھر چکے تھے۔ ان کے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ تینوں پہریدار رائفلیں پھینک کر اپنی جانیں بچانے کے لیے مجمع میں چکراتے پھر رہے تھے۔ وہ چلا چلا کر ہجوم کو پتھراؤ روکنے کے لیے کہہ رہے تھے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ لحظہ بہ لحظہ لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ شمروز خان پتھریلی زمین پر گھسٹتا ہوا ایک چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ کسی حد تک اب وہ پتھراؤ سے محفوظ تھا تاہم تینوں پہریداروں کی بری حالت ہو چکی تھی۔ اچانک ایک پہریدار کو سر کی پچھلی جانب ایک پتھر لگا اور وہ منہ کے بل پتھریلی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ لوگوں نے اسے گرتے دیکھ کر ایک نعرہ بلند کیا اور بقیہ دو پہریداروں پر مشق آزمائی شروع کر دی۔

پھر اس سے پہلے کہ دیگر دو پہریداروں کا بھی اپنے ساتھی جیسا حشر ہوتا بالکل غیر متوقع طور پر موسیٰ خان ہجوم کو چیرتے ہوئے مجمع کے درمیان پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک خطرناک گن پکڑ رکھی تھی۔ مجمع کے درمیان میں پہنچتے ہی اس نے ہجوم کے سامنے زمین پر ایک برسٹ مارا اور لوگ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔

"قیدی تا سوک نرزوئے سنگسار کول غواڑی؟" (قیدی کو کون مرد کا بچہ سنگسار کرنا چاہتا ہے؟) موسیٰ خان نے پشتو زبان میں سوال کیا لیکن لوگوں کو سانپ سونگھ گیا انہوں نے موسیٰ کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا تب موسیٰ خان اونچی آواز میں گویا ہوا۔ "داجرگے مشرانوں فیصلہ دے" (یہ جرگے کے بڑوں کا فیصلہ ہے) تم لوگ اس فیصلے کو نہ مان کر قبائلی روایات کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہو کیا؟"

لوگ خاموش رہے۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''بولو جواب دو۔ کون یہ فیصلہ ماننے سے انکاری ہے؟ میں اس کا پیغام ابھی خان جی تک پہنچا دیتا ہوں''۔

لوگ موسیٰ خان کے تیور دیکھ کر رفتہ رفتہ تتر بتر ہونے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مجمع چھٹ گیا۔ موسیٰ خان پہریداروں اور قیدی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے پتھر کھا کر بے ہوش ہونے والے پہریدار کو چیک کیا۔ چہرے پر پانی کے چند چھینٹے کھا کر وہ ہوش میں آ گیا۔ موسیٰ خان نے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا اور خود جلدی سے چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔

شمروز خان چارپائی کے نیچے دبکا خوف سے لرز رہا تھا۔ موسیٰ خان نے چارپائی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور شمروز خان کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

''دیکھا شمروز خان''۔ موسیٰ خان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''لوگ تجھ سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ وہ تجھے سنگسار کر دینا چاہتے ہیں...... سب تجھ پر لعنت بھیج رہے ہیں''۔

''مم...... مجھے گولی مار دو''۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تت تمہیں خدا کا واسطہ مجھ پر یہ احسان کر دو موسیٰ خان''۔

''نہیں شمروز''۔ موسیٰ خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں خان جی کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے وہی سزا ہے جو طے کر دی گئی ہے اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا''۔

مجھ پر رحم کرو موسیٰ خان۔ ''اتنا کہہ کر وہ موسیٰ خان کے قدموں میں جھک گیا۔

''نہیں......'' موسیٰ خان تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جو فیصلہ جرگے نے کر دیا ہے میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا''۔

اس کے بعد موسیٰ خان نے اسے پہریداروں کے حوالے کر دیا اور خود دور کھڑی ہوئی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد موسیٰ خان کی واپسی خان جی کے ساتھ ہی ہوئی۔ ان دونوں کے پہنچتے ہی دو پہریدار گھوڑے لے کر پہنچ گئے۔ خان جی کی تشریف آوری کے ساتھ ہی لوگوں کا ہجوم ایک بار پھر اکٹھا ہو گیا۔ ایک بار پھر لوگ اپنی اپنی ہانک رہے تھے اور بہت پُر جوش نظر آ رہے تھے۔ چند نوجوانوں نے شمروز خان کے خلاف نعرہ بازی شروع کر دی۔ وہ جلد سے جلد شمروز خان کی سزا پر عمل درآمد کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

لوگوں کے شور وغل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خان جی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کی تلقین کی۔ جب لوگ خاموش ہو گئے تو وہ بارعب آواز میں بولا۔ ''گاؤں والو! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آج ہم سب لوگ یہاں کس لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ مجھ تک یہ اطلاع پہنچی ہے کہ کچھ



لوگوں کو شمروز خان کی سزا پر اعتراض ہے اور وہ اسے سنگسار کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا مطالبہ پیش کرنے والوں کو کس نے اکسایا ہے یہ میں بہت جلد معلوم کروں گا''۔ خان جی ایک ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا۔ لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی اور ان کے درمیان کھڑا ہوا مولوی نصیب اللہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

خان جی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''خاموش ہو کر سنو، میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔ میں نے کہا ہے ناں کہ میں جانتا ہوں فسادی کو۔ مگر یہ موقع اس سے نمٹنے کا نہیں ہے۔ فی الحال ہم نے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے باغی سے وقت آنے پر نمٹ لیں گے۔ کسی کو اگر شمروز خان کی سزا پر اعتراض ہے تو میں اس کی بات سننے کے لیے تیار ہوں''۔

اتنا کہہ کر خان جی ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ وہ شاید کسی کے بولنے کا منتظر تھا مگر کوئی بھی اعتراض کرنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ سب کو اپنی جان عزیز تھی وہ خان جی کی دشمنی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے جس کے پاس موسیٰ خان جیسے جان قربان کر دینے والے جان نثار تھے۔ مولوی نصیب اللہ کا چہرہ بھی متغیر ہو چکا تھا خان جی کی عدم موجودگی میں جو لوگ بڑھ چڑھ کر اس کا ساتھ دینے کی باتیں کرتے رہے تھے وہی لوگ اب اس سے نگاہیں نہیں ملا پا رہے تھے۔ چند ایک لوگوں کو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کیے مگر وہ منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ مولوی نصیب اللہ پر آہستہ آہستہ خوف اور بے بسی کا احساس طاری ہونے لگا۔ اچانک وہ مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مجمع سے باہر نکل گیا۔ اسے راہِ فرار اختیار کرتے دیکھ کر خان جی نے تین مسلح محافظوں کو مخصوص اشارہ کیا تو وہ بھی غیر محسوس انداز میں مجمع سے کھسک گئے۔

خان جی ایک بار پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''میں تم لوگوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ تم علاقائی رسم رواج اور روایات کے پاسدار ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میں تم جیسے جری لوگوں کا خدمت گار ہوں۔ آج تک میں نے تم لوگوں کی مرضی کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کیا اور نہ آئندہ ایسا کروں گا۔ کچھ شر پسند قسم کے لوگ ان قبائلی روایات کو پسند نہیں کرتے۔ ان لوگوں سے تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ دراصل یہ ہماری روایات کے نہیں بلکہ قبائلیوں کے دشمن ہیں۔ یہ لوگ دشمن قوتوں کے آلہ کار ہیں جو قبائلی علاقوں میں بدامنی اور انتشار پھیلانا چاہتے ہیں لیکن ہم بھی کمزور نہیں ہیں۔ ہم ان کے مذموم مقاصد کبھی پورے نہیں ہونے دیں گے''۔

خان جی نہ صرف یہ کہ ایک قبائلی سردار تھا بلکہ ایک کایاں سیاستدان بھی تھا۔ وہ قبائلیوں کے جذبات سے کھیلنا خوب جانتا تھا۔ انہی اَن پڑھ اور سادہ دل لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر وہ ہر بار صوبائی اسمبلی تک پہنچ جاتا تھا۔ اس کے علاقے میں آج تک کوئی بھی ترقیاتی کام نہیں ہوا تھا

مگر وہ بدستور ہردلعزیز لیڈر چلا آرہا تھا۔

آج بھی اس نے اپنی لچھے دار باتوں سے تمام لوگوں کو ذرا سی دیر میں قائل کرلیا تھا۔ وہی لوگ جو تھوڑی دیر قبل مولوی نصیب اللہ کی باتوں میں آکر شمروز خان کو سنگسار کرنے پر اصرار کر رہے تھے اب وہ مولوی نصیب اللہ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ خان جی نے ان لوگوں سے مزید چند باتیں کیں اور پھر شمروز خان کی سزا پر عمل درآمد کرنے کا حکم دے دیا۔

=== ===

خان جی کا حکم سن کر فوراً دو مسلح محافظ آگے بڑھے اور شمروز خان کو پکڑ کر اس طرف کھینچنے لگے جہاں دو شخص گھوڑوں پر سوار منتظر تھے۔ دونوں گھوڑوں کا رخ ایک دوسرے کے مخالف سمت میں تھا اور دونوں کی زین کے ساتھ ایک ایک مضبوط موٹی رسی بندھی ہوئی تھی۔ شمروز خان بے تحاشا چلا رہا تھا۔ وہ مسلح محافظوں کو واسطے دے رہا تھا۔ رو رہا تھا منت سماجت کر رہا تھا مگر اس سنگلاخ میدان میں موجود ہر شخص سماعت و بصارت سے یکسر محروم نظر آرہا تھا۔ دونوں مسلح محافظ اسے بے رحمی کے ساتھ گھسیٹ رہے تھے۔ اس کی آہ و بکا کا بھی محافظوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

''مرد بنو شمروز خان''۔ ایک محافظ اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''یہ عورتوں کی طرح بَین کیوں کر رہے ہو؟''

''مم...... میں...... مرنا نہیں...... چاہتا''۔ شمروز خان ہذیانی انداز میں چلایا۔ ''مم...... مجھے چھوڑ دو''۔

''اپنی مرضی سے کون مرنا چاہتا ہے احمق؟'' دوسرے محافظ نے بے رحمی سے کہا۔ ''موت تو اچانک ہی آکر انسان کو جکڑ لیتی ہے''۔

''میں بے گناہ ہوں''۔ شمروز خان پوری قوت سے چلایا شاید شدتِ خوف سے اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔

''لگتا ہے تُو پاگل ہو گیا ہے؟'' محافظ نے حیرت سے کہا۔ ''موت کے خوف نے تمہارا دماغ الٹ دیا ہے۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تم بے گناہ کب سے ہو گئے ہو؟''

''چھوڑ دو مجھے۔ خدا کے لیے چھوڑ دو''۔ شمروز خان نے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''بکومت''۔ پہلے محافظ نے غصے سے کہا اور پھر دونوں اسے بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے آگے لے جانے لگے۔

شمروز خان روتا چلاتا رہا مگر محافظوں نے اس کی فریاد پر بالکل کان نہ دھرے۔ لمحوں میں



اسے گھوڑوں تک لے گئے۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا لیکن دو ہٹے کٹے محافظوں کے سامنے وہ بے بس تھا۔ ویسے بھی اس کے دونوں ہاتھ ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہے تھے موسیٰ خان کے تشدد نے اس کے دونوں بازو تقریباً بیکار کر دیے تھے۔

محافظوں نے اسے گھوڑوں کے عین درمیان میں پٹخا اور پھر اس کی داہنی ٹانگ دائیں طرف والے گھوڑے کی رسی سے اور بائیں ٹانگ بائیں طرف والے گھوڑے کی رسی سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دی گئی۔ شمروز خان بدستور کربناک آواز میں روتے ہوئے فریاد کناں تھا مگر دونوں محافظ بے پرواہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کے لیے یہ معمول کی بات تھی وہ پہلے بھی کئی لوگوں کو یہ بھیانک سزا دے چکے تھے۔ تمام لوگ پندرہ بیس گز دور کھڑے ہوئے آنے والے سنسنی خیز لمحات کے منتظر تھے۔ بعض کمزور دل حضرات مجمع چھوڑ کر میدان کے کنارے پر جا کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گھوڑے جب ایک دوسرے کی مخالف سمت میں بھاگیں گے تو بدقسمت شمروز خان کا بدن ٹانگوں کے بیچ سے چیر کر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ یہ نہایت ہی بہیمانہ سزا تھی۔ وہاں کے اکثر لوگ اس سزا کے سخت خلاف تھے مگر ڈر کے مارے خان جی کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ یہ سفاکانہ سزا خان جی کے آباؤ اجداد کے زمانے سے معمول العمل چلی آرہی تھی اور اب اس سزا نے اس علاقے میں باقاعدہ قانون کی شکل اختیار کر لی تھی۔

محافظ شمروز خان کو باندھ کر ایک طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں گھڑ سوار خان جی کے اشارے کے منتظر تھے جس کے ہاتھ میں ایک سرخ رومال نظر آرہا تھا۔ مگر ابھی تک ایک رسم باقی تھی چنانچہ خان جی موسیٰ خان کو اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

''شمروز خان! تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟'' اس کے نزدیک پہنچتے ہی موسیٰ خان نے استفسار کیا۔ موسیٰ خان کا سوال سن کر وہ آہ و بکا کرتے ہوئے ایک ثانیے کے لیے چپ ہو گیا شاید کوئی آس بندھ گئی تھی۔ آخری خواہش کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''کک...... کیا...... مم...... میری خواہش پوری کی جائے گی؟'' اس نے اٹکتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''سزائے موت پانے والے ہر مجرم کی آخری خواہش پوری کی جاتی ہے''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''تم خواہش بتاؤ جلدی کرو۔ وقت کم ہے''۔

''سزائے موت...... آخری خواہش''۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں دہرایا۔

''ہاں آخری خواہش''۔ موسیٰ خان نے لفظ ''خواہش'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بولو۔

تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟''

''کوئی خواہش نہیں ہے''۔اس نے انتہائی بے چارگی کے عالم میں جواب دیا۔

''شمروز خان!'' خان جی جو چپ کھڑا ہوا تھا اونچی آواز میں بولا۔''آخری خواہش تو تمہیں بتانا ہی پڑے گی۔یہ ہماری روایات کا حصہ ہے۔جلدی بتاؤ اپنی آخری خواہش؟''

''خان جی!'' ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد شمروز خان اچانک بدلے ہوئے انداز میں بولا۔''آپ......شاید میری آخری خواہش پوری نہ کرسکیں۔بس رہنے دیں''۔شاید شمروز خان کو مایوسی اور بے بسی نے کلی طور پر سود وزیاں سے غافل کر دیا تھا ورنہ کوئی بھی عام قبائلی خان جی سے اس لہجے میں بات کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

''لگتا ہے موت کے خوف سے تمہارا دماغ اُلٹ گیا ہے''۔موسیٰ خان نے غصے سے کہا۔

''ورنہ تم خان جی سے کبھی اس انداز میں بات نہ کرتے''۔

موسیٰ خان؟''اس نے دوبارہ اسی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''ابھی کچھ دیر بعد میرا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔جب ایسی بھیانک موت ہی مقدر ٹھہرا تو پھر میں جاتے جاتے سچ کیوں نہ بول جاؤں؟''

''بکو''۔موسیٰ خان نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔''خان جی سن رہے ہیں۔کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میرے بعد اس ظالمانہ رسم کو ختم کر دیا جائے۔یہی میری آخری خواہش ہے''۔اس نے جواب دیا۔''شاید کسی کا بھلا ہو جائے''۔

''یہ ناممکن ہے''۔خان جی نے نفی میں سر ہلایا۔''ہم بزرگوں کی بنائی ہوئی اس رسم کو ختم نہیں کرسکتے تم کوئی اور خواہش بتاؤ میں پوری کر دوں گا''۔

''میں نے کہا تھا ناں خان جی! کہ آخری خواہش کو رہنے دو''۔اس نے انتہائی بے بسی کے عالم میں بھی استہزائیہ انداز میں کہا۔''اسے پوری کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے''۔

''گستاخی مت کرو''۔موسیٰ خان غصے سے چلاتا ہوا آگے بڑھا۔''ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا''۔

''رکو......موسیٰ خان!'' خان جی نے جلدی سے کہا۔''بیوقوف مت بنو۔یہی تو یہ چاہتا ہے کہ ہم غصے میں آکر اسے عبرت ناک موت سے چھٹکارا دلا دیں''۔

''تم دونوں کو بے بس دیکھ کر اس عالم میں بھی مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے''۔وہ تمام آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے بولا۔''مگر......مگر یہ خوشی میں زیادہ دیر تک محسوس نہیں کرسکوں گا''۔



''بجھنے سے پہلے آخری بار چراغ بھڑکتا ضرور ہے''۔خان جی نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔''مگر اس کا بھڑکنا کوئی نہیں دیکھتا۔تم بھی ابھی چند لمحوں کے بعد خاک و خون میں مل جاؤ گے''۔

''اب مجھے مرنے کا کوئی غم نہیں ہے''۔وہ بولا۔''تم دونوں کو اس عالم میں دیکھنا قسمت والوں کے نصیب میں ہوتا ہے''۔

''خان جی!'' موسیٰ خان بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔''اس نے بہت بول لیا۔اب اس کا قصہ تمام کرنے کا حکم دیں''۔

''موسیٰ خان! اسے اپنے دل کی تمام حسرتیں نکال لینے دو۔ہم یہی باتیں اس کی آخری خواہش سمجھ لیں گے''۔

''خان جی! میں اپنی آخری خواہش پہلے ہی بتا چکا ہوں''۔شمروز خان نے کہا۔''جو تم پوری نہیں کرسکے اور نہ ہی پوری کرسکتے ہو کیونکہ تم سب روایتوں کے پجاری ہو اور زندگی بھر ایسے ہی رہوگے۔تم نے یہاں کے لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا ہوا ہے۔لوگ تم سے ڈرتے ہیں ورنہ پیٹھ پیچھے سب تمہیں گالیاں دیتے ہیں''۔

''شاید موسیٰ خان ٹھیک کہتا ہے''۔خان جی نے اپنا رومال والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا مگر اسے رومال بلند کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔زرتاج اچانک ہی بھاگتے ہوئے مجمع سے نکلی اور اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''خان جی! آپ کو اللہ کا واسطہ......اس کے رسول کا واسطہ......مجھ پر رحم کرو''۔وہ روتے ہوئے بولی۔''شمروز خان کی زندگی بخش دو۔میرے سر کا سایہ مت چھینو......مت چھینو''۔

خان جی نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے پرے دھکیل دیا مگر وہ دوبارہ اس کے قدموں سے لپٹ کر گڑگڑانے لگی۔''خان جی! میں بے سہارا ہو جاؤں گی۔خدا کے لیے رحم کرو۔خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔مجھے بے سہارا مت کرو''۔

''زرتاج!'' شمروز خان چلا کر بولا۔''یہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔اپنی توہین مت کرو۔جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔خدا کے لیے چلی جاؤ''۔

خان جی نے ایک لمحے کے لیے دونوں گھڑسواروں کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا رومال لہرا دیا۔دوسرے ہی لمحے دونوں گھوڑے مخالف سمتوں میں دوڑنے لگے اور مجمع میں موجود لوگوں کی چیخیں نکل گئیں

دیکھتے ہی دیکھتے شمروز خان کا جسم ٹانگوں کے عین بیچ سے یوں چیرا گیا جیسے آرہ مشین پہ

لکڑی چیری جاتی ہے۔ یہ منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ مجمع میں سے کئی لوگ مارے خوف کے پلٹ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دونوں گھڑ سوار میدان میں چکرا رہے تھے اور شمروز خان کا مردہ جسم دو حصوں میں تقسیم ہو کر گھوڑوں کے عقب میں عبرت کا نشان بن کر سنگلاخ زمین پر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ لوگ چیخ رہے تھے چلا رہے تھے اور خان جی سے اپیل کر رہے تھے کہ اب گھوڑوں کو روک کر شمروز خان کی لاش اس کے وارثوں کے حوالے کر دی جائے مگر خان جی ان کی آواز پر کان دھرنے کی بجائے اس خونی منظر سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے انہماک اور دلچسپی کا یہ عالم تھا جیسے وہ کوئی من پسند فلم دیکھ رہا ہو۔

لوگوں کی منت سماجت جب شدت اختیار کرنے لگی تو چاروناچار موسیٰ خان کو لب کشائی کرنا ہی پڑی۔ ''خان جی! مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے''۔ وہ خان جی کو متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں اب لاش ورثاء کے حوالے کر دینا چاہئے''۔

''لاش نہیں۔ گوشت اور ہڈیوں کا ملغوبہ بول موسیٰ خان''۔ خان جی نے بے رحم انداز میں جواب دیا۔ ''اس ملغوبے کی تجہیز و تکفین کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چیل کوؤں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں یہیں''۔

''آپ بجا فرما رہے ہیں خان جی!'' وہ مؤدب انداز میں بولا۔ ''مگر اس کی بیوہ اور سسر یہاں موجود ہیں۔ وہ اسے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے''۔

''تو ٹھیک ہے۔ یہ ملغوبہ ان کے حوالے کر دو۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ جلدی لوٹنے کی کوشش کرنا۔ میں آج ہی تمہیں پشاور بھیجنا چاہتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر خان جی اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

نصیب خان چند قدم دور زرتاج کو پکڑے ہوئے کھڑا تھا اور زرتاج اس کے منع کرنے کے باوجود دل کھول کر خان جی کو بددعائیں دے رہی تھی۔ خان جی کو جیپ کی طرف جاتے دیکھ کر اچانک زرتاج نے رونا دھونا ترک کر دیا اور خونخوار نگاہوں سے خان جی کی پشت کو گھورنے لگی۔ نصیب خان کی نظریں بھی خان جی پر لگی ہوئی تھیں اس لیے وہ زرتاج کے تاثرات نہیں دیکھ پایا تھا۔ زرتاج نے باپ کو غافل پا کر ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کرایا اور پھر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دوڑتی ہوئی خان جی کے قریب پہنچ گئی۔ خان جی اپنے ہی خیالات میں مگن جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ موسیٰ خان سمیت دیگر لوگ بھی گھوڑوں اور شمروز خان کی لاش کی باقیات کی طرف متوجہ تھے۔ سوائے نصیب خان کے کوئی شخص بھی زرتاج کو خان جی کے پیچھے بھاگتے ہوئے نہ دیکھ پایا۔ زرتاج نے خان جی کے قریب پہنچ کر جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور چشم زدن میں تاک کر خان



جی کے سر کی عقبی جانب دے مارا۔ نصیب خان زرتاج کے پیچھے دوڑتے ہوئے چلایا مگر تب تک خان جی لہراتا ہوا زمین بوس ہو چکا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ زرتاج مزید کوئی کارروائی کرتی نصیب خان نے اسے باہوں میں جکڑ لیا۔

''چھوڑ دے بابا...... مجھے چھوڑ دے''۔ زرتاج ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''یہ میرے شمروز کا قاتل ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو''۔

''پاگل مت بنو بیوقوف عورت!'' وہ چلا کر بولا۔ ''میں دو دو جنازے نہیں اٹھا سکوں گا۔ خان جی کے محافظ تجھے گولیوں سے چھلنی کر ڈالیں گے''۔

''میں جی کر کیا کروں گی؟'' اس نے زور لگا کر خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑ دو مجھے...... ورنہ''۔

''ورنہ کیا؟'' نصیب خان نے طیش میں آ کر پوچھا۔

زرتاج نے جواب دینے کی بجائے اپنے دانت باپ کے بازو میں گاڑ دیے۔ ایک لمحے کے لیے تو نصیب خان کے چودہ طبق روشن ہو گئے مگر پھر ایک جھٹکے سے اس نے اپنا بازو چھڑایا اور زرتاج پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

''کمینی! کیوں کتے کی موت مرنا چاہتی ہے؟'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''میں...... میں تمہاری ماں کے پاس کیا منہ لے کر جاؤں گا؟''

''مار ڈال مجھے''۔ وہ روتے ہوئے چیخی۔ ''تو بھی ان درندوں کا بھائی بند ہے''۔

ان باپ بیٹی کی چیخ و پکار سن کر موسیٰ خان کے ساتھ ساتھ خان جی کے مسلح محافظ اور دیگر لوگ بھی اب ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ خان جی ابھی تک جیپ کے قریب انٹا غفیل ہوا پڑا تھا۔ جونہی موسیٰ خان کی نظر اس پر پڑی وہ فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

''خان جی کو سنبھالو''۔ موسیٰ خان نے فوراً مسلح محافظوں کو حکم دیا اور پھر آگے بڑھ کر نصیب خان کو قہر آلود نگاہوں سے گھورنے لگا۔

''میں نے مارا ہے اسے''۔ زرتاج نے نڈر انداز میں کہا۔ ''تجھے بھی نہیں چھوڑوں گی''۔

''تو عورت ذات نہ ہوتی تو میں تجھے دوسرا سانس لینے کی مہلت تک نہ دیتا''۔ موسیٰ خان نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''موسیٰ خان! یہ پاگل ہو چکی ہے''۔ نصیب خان بےبسی سے بولا۔ ''اس پر رحم کرو''۔

''قاتل سے رحم کی بھیک مت مانگ''۔ زرتاج نے چلا کر کہا۔ ''شمروز خان کے بعد زندگی میرے لیے صرف ایک بوجھ ہے۔ میں جینا نہیں چاہتی''۔

''خان جی تجھے اس بوجھ سے آزاد کر دیں گے''۔ اتنا کہہ کر موسیٰ خان مسلح محافظوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ان باپ بیٹی کو پکڑ کر حویلی لے چلو۔ ان کا فیصلہ خان جی خود کریں گے''۔

''موسیٰ خان! ہم پر ایک مہربانی کر دو''۔ نصیب خان ملتجی ہوا۔ ''ہمیں شمروز خان کے کفن دفن کا انتظام کر لینے دو۔ اس کے بعد جہاں مرضی آئے ہمیں لے چلنا''۔

''نہیں''۔ موسیٰ خان نے انکار میں گردن ہلائی۔ ''گاؤں والے اسے دفنا دیں گے۔ تم لوگ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو ورنہ ہم گھسیٹتے ہوئے لے جائیں گے''۔

''یہ ظلم ہے موسیٰ خان!'' نصیب خان چلایا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے''۔

''کون روک سکتا ہے مجھے؟'' موسیٰ خان نے جواب دیا۔ ''تم روکو گے یا گاؤں والے؟''

''ٹھیک ہے''۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ''میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری بیٹی کو مت لے جاؤ''۔

''تمہاری بیٹی خود اپنے جرم کا اقرار کر چکی ہے''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''میں اسے کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا فیصلہ خان جی کریں گے۔ اب چلو ہمارا وقت ضائع مت کرو''۔

''موسیٰ خان''۔ وہ فریادی انداز میں بولا۔ ''خدا کے لیے تم......''

''بس......'' موسیٰ خان نے گرج کر قطع کلامی کی۔ ''یہ منت ساجت خان جی کے سامنے کرنا''۔

موسیٰ خان کے تیور بدلتے دیکھ کر نصیب خان کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اور زرتاج مسلح محافظوں کے ساتھ حویلی کی طرف جا رہے تھے اور موسیٰ خان، خان جی کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا تھا۔ خان جی کو اب ہوش آ چکا تھا مگر اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ جیپ کی سیٹ سے سر ٹکائے اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔

---

ڈاکٹر کا کلینک وہاں سے کافی فاصلے پر واقع تھا اس لیے موسیٰ خان نے خان جی کو حویلی میں چھوڑنا نامناسب سمجھتے ہوئے سیدھا کلینک کا رخ کیا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر وہاں موجود تھا۔ فوراً خان جی کو ابتدائی ٹریٹمنٹ دے دی گئی اور پھر زخم کو صاف کرنے کے بعد ڈاکٹر نے مرہم پٹی بھی کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب خان جی کی طبیعت مکمل طور پر سنبھل گئی تو اس نے ڈاکٹر سے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ آپ کو یہاں اگر کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو تو حکم کرنا''۔



''نہیں خان جی! میں یہاں بہت مزے سے ہوں''۔ ڈاکٹر بولا۔ ''کسی قسم کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ وقت اچھا گزر رہا ہے''۔

''آپ شہری آدمی ہیں بھئی''۔ خان جی نے کہا۔ ''کبھی بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کبھی ایسی صورتِ حال پیش آ جائے تو بلا جھجک حویلی آ جانا۔ میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا''۔

''آپ کی مہربانی ہے خان جی''۔ وہ مشکور انداز میں بولا۔ ''کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو ضرور آپ کو زحمت دوں گا''۔

اس کے بعد ڈاکٹر نے انہیں گھر میں کھانے کے لیے کچھ میڈیسن دیں اور کھانے کے اوقات اور طریقہ بھی سمجھا دیا۔

ڈاکٹر کو خدا حافظ کہہ کر وہ کلینک سے باہر نکلے اور جیپ میں بیٹھ کر حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

''خان جی! میں شرمندہ ہوں''۔ موسیٰ خان گاڑی ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل یہ سب میری کوتاہی کا نتیجہ ہے''۔

''نہیں موسیٰ خان''۔ خان جی نے کہا۔ ''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ حادثہ میرے دشمنوں کی غفلت کا نتیجہ ہے اور میں ان سے اچھی طرح نمٹ لوں گا''۔

''خان جی! میں نے ان باپ بیٹی کو پکڑ کر حویلی بھجوا دیا ہے۔ دراصل یہ حرکت شمروز کی بیوہ کی ہے مجھے تو یہ عورت بہت خطرناک لگتی ہے۔ اگر آپ نے اس کا کوئی مناسب انتظام نہ کیا تو یہ کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتی ہے۔ بالکل پاگل عورت''۔

''مجھے تو تم پاگل لگتے ہو موسیٰ خان''۔ خان جی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ایک معمولی عورت کو اتنی اہمیت دے کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ وہ ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟''

''خان جی! وہ اگر آزاد رہی تو جگہ جگہ آپ کی بدنامی کا باعث بنتی رہے گی۔ لوگوں کو آپ کے خلاف اکساتی رہے گی۔ مولوی نصیب اللہ جیسے لوگ اس کی پشت پناہی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ بات پھیل کر میڈیا تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ آپ کے سیاسی کیریئر کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ ایسی خطرناک عورت کو آزاد چھوڑ دینا سراسر گھاٹے کا سودا ہے''۔ موسیٰ خان نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

خان جی نے ایک ثانیے کے لیے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو ہم ایک عورت کے خون سے ہاتھ رنگ دیں؟''

''میں نے یہ کب کہا ہے خان جی؟'' اس نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کا کوئی مناسب بندوبست کر دیا جائے تاکہ بعد میں وہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کر سکے۔ آپ کو اس معاملے کو سرسری نہیں لینا چاہیے جو عورت آپ پر حملہ کر سکتی ہے اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ موقع ملنے پر وہ کیا کچھ نہیں کرے گی''۔

''تو تم بتاؤ کیا کیا جائے اس کا؟'' خان جی مستفسر ہوا۔

''اسے کوئی لالچ دیا جائے''۔ وہ بولا۔ ''یا پھر اس کی کہیں شادی کرا دی جائے۔ تب ہی وہ ہمارا پیچھا چھوڑے گی ورنہ وہ خاموش رہنے والی عورت نہیں لگتی''۔

''کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟'' خان جی نے سوال کیا۔ ''میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے جو چاہے کرو''۔

''میں کوشش کر سکتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''لیکن......''

''لیکن کیا؟'' خان جی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ ''کیا ناممکن ہے یہ کام؟''

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں ہے''۔ وہ بولا۔ ''مگر ابھی اس کا غم تازہ ہے۔ اتنی جلدی وہ میری کوئی بات نہیں سنے گی تاہم اسے باپ کے ذریعے راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ میں اس کے باپ کو دولت کا لالچ دوں گا۔ ہو سکتا ہے وہ بیٹی کو منانے میں کامیاب ہو جائے۔ دولت میں بہت طاقت ہوتی ہے''۔

''میری طرف سے تمہیں کھلی چھوٹ ہے''۔ خان جی نے کہا۔ ''جتنا خرچ ہوتا ہے پرواہ مت کرو بس کس طرح ان باپ بیٹی کو خرید لو۔ میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا''۔

''بےفکر رہیں خان جی''۔ اس نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''اب میں جانوں اور میرا کام''۔

اس دوران جیپ حویلی کے صدر دروازے میں داخل ہو گئی اور ان دونوں نے موضوع گفتگو تبدیل کر دیا۔ ذرا دیر کے بعد خان جی ایک پُرآسائش کمرے میں داخل ہو رہا تھا اور موسیٰ خان جیپ کو گیراج میں ٹھہرانے کے بعد اس سیل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں نصیب خان اور زرتاج کو قید میں رکھا گیا تھا۔

===

سیل کھلوا کر موسیٰ خان نے نصیب خان کو باہر نکالا اور سیل کو دوبارہ تالا لگوا دیا۔

''کیا زرتاج تنہا یہاں رہے گی؟'' نصیب خان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''عورت ذات ہے کہیں اکیلے میں کچھ الٹا سیدھا نہ کر بیٹھے''۔

''گھبراؤ مت''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''میں اس کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہوں۔ یہاں اسے



کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اس کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب چلو میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں تمہارے اور تمہاری بیٹی کے فائدے کی ہیں۔ خان جی تمہارے دکھ کا ازالہ کرنا چاہتا ہے''۔

''ناممکن''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''خان جی سے کسی بھلائی کی امید کم از کم میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ صرف ظلم کرنا جانتے ہیں''۔

''پاگل مت بنو''۔ موسیٰ خان نے نرمی سے کہا۔ ''خان جی بہت دیالو ہیں۔ یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لو۔ وہ تمہاری ہر خواہش پوری کریں گے''۔

''اس کرم فرمائی کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ ''خان جی مفت میں تو کسی پر مہربان نہیں ہوتے''۔

''تم ایک بار چل کر میری بات سن لو''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''میں تمہاری ساری شکایات رفع کر دوں گا''۔

''چلیے''۔ وہ بادلِ نخواستہ بولا۔ ''یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں''۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے تو موسیٰ خان اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ مجھے بہت بھوک محسوس ہو رہی ہے یقیناً تم نے بھی ابھی تک نہیں کھایا ہو گا؟''

''ایسی صورتِ حال میں کھانے کو کس کا دل چاہتا ہے؟'' اس نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔ ''تم اپنے لیے منگوا لو۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ مجھے بھوک نہیں ہے''۔

''انسان اگر خالی پیٹ ہو تو بھلائی کی باتیں بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتیں''۔ موسیٰ خان نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ویسے بھی انسان کو زندہ رہنے کے لیے کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک یا دو وقت کا کھانا نہ کھا کر تم گزرے ہوئے وقت کو واپس نہیں لا سکتے تو پھر خواہ مخواہ بھوکا رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ شمروز خان پر کوئی ظلم نہیں ہوا اور نہ ہی اسے خان جی کے حکم پر موت کی سزا سنائی گئی ہے۔ یہ جرگے کا فیصلہ تھا اور قبائلیوں کے رسم و رواج سے تم لاعلم نہیں ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شمروز خان نے اپنی کرنی کا پھل بھگتا ہے''۔

وہ ایک ثانیے کے لیے سانس بحال کرنے کے لیے رکا اور پھر دوبارہ ٹوٹی ہوئی گفتگو کا سلسلہ جوڑتے ہوئے گویا ہوا۔ ''مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے بعض اوقات اپنے ضمیر کے خلاف بھی فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ تم اپنے لیے نہ سہی مگر زرتاج کے لیے تو زندہ رہنا چاہو گے۔ تمہاری یقیناً یہ بھی خواہش ہو گی کہ وہ ایک خوش و خرم زندگی

گزارے۔ تم اگر سنجیدگی سے سوچو تو ایک طرح سے یہ زرتاج کے حق میں اچھا ہی ہوا ہے۔ شمروز خان نے سوائے دکھوں اور تکلیفوں کے اسے دیا ہی کیا ہے۔ روزانہ کی مار پیٹ، بھوک اور گالیاں۔ اس کی زندگی میں تمہاری بیٹی نے کون سا سکھ دیکھا ہے؟ تم اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو تو شمروز جیسے شخص کا ماتم منانا بالکل نامناسب ہے''۔

''شمروز خان اچھا تھا یا برا بہرکیف وہ میری بیٹی کا خاوند تھا''۔ نصیب خان برا مناتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بعد میری بیٹی بے آسرا ہو گئی ہے''۔

''نصیب خان! پہلے کھانا کھا لیتے ہیں''۔ موسیٰ خان موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ ''اس موضوع پر بعد میں بات کر لیں گے۔ میں نے زرتاج کے لیے بھی کھانا بھجوا دیتا ہوں۔ وہ بھی بھوکی ہو گی''۔

''کیا خان جی نے زرتاج کو معاف کر دیا ہے؟'' نصیب خان نے پُرامید انداز میں سوال کیا۔

''وہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں اور میرا کام''۔ اتنا کہنے کے بعد موسیٰ خان کمرے سے باہر نکل گیا اور نصیب خان پریشان کن خیالات میں غرق ہو گیا۔ شمروز خان کی اندوہناک موت نے وقت سے پہلے ہی اسے عمر رسیدہ لوگوں کی صف میں شامل کر دیا تھا حالانکہ ابھی اس کی عمر پچاس برس سے بھی کم تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد موسیٰ خان کی واپسی ایک ملازم کے ساتھ ہوئی جس نے ہاتھ میں پُرتکلف کھانے کی ٹرے پکڑ رکھی تھی۔ نوکر نے ان دونوں کے سامنے کھانا چن دیا اور پھر الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

''بسم اللہ کرو نصیب خان''۔ موسیٰ خان کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا مجھ پر اعتماد کرو''۔

نصیب خان کا دل تو کھانا کھانے کو نہیں چاہتا تھا مگر چاروناچار اسے موسیٰ خان کا ساتھ دینا ہی پڑا کیونکہ وہ موسیٰ خان کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ موسیٰ خان کی سرشت سے وہ واقف تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ موسیٰ خان ایک انتہائی منتقم مزاج شخص ہے اور اپنی مرضی کے خلاف کوئی چھوٹے سے چھوٹا معاملہ بھی برداشت نہیں کرتا۔ سو اسے کھانا زہر مار کرنا ہی پڑا تھا۔

کھانے کے بعد جب نوکر کمرے میں برتن سمیٹنے کے لیے آیا تو موسیٰ خان نے اسے خوشبودار قہوہ لانے کا حکم دے دیا۔

''نصیب خان!'' نوکر کے باہر نکلنے کے بعد موسیٰ خان گویا ہوا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو



کہ خان جی نہ صرف اس پورے علاقے کے بے تاج بادشاہ ہیں بلکہ ایک مشہور و معروف سیاستدان بھی ہیں ان کی پہنچ اسلام آباد کے ایوانوں تک ہے۔ یہاں بھی وہ سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ ان کی مرضی کے خلاف ہمارے علاقے میں سرکار کی بھی نہیں چلتی۔ میرے اور تیرے جیسے لوگوں کو تو گاؤں سے باہر نکلنے کے بعد کوئی جانتا تک نہیں ہے۔ میں تجھے مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں کہ خان جی کی مرضی کے خلاف کوئی بھی قدم مت اٹھانا۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔ خان جی ہمارے مائی باپ ہیں اور ہم ان کے غلام ہیں۔ ہم نے وہی کرنا ہے جو خان جی چاہیں گے''۔ وہ چند ثانیے کے لیے خاموش ہو کر دوبارہ بولا۔ ''تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں! دراصل میں تمہیں خان جی کے عتاب سے بچانا چاہتا ہوں۔ یہ دشمنی اگر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے تو تم فائدے میں رہو گے۔ بولو کیا کہتے ہو؟''

''موسیٰ خان!'' وہ ایک آہ خارج کرتے ہوئے مایوس انداز میں بولا۔ ''میری اتنی اوقات کہاں کہ میں خان جی سے ٹکرا سکوں؟ تم بے وجہ پریشان ہو رہے ہو۔ ہمیں بس یہاں سے جانے دو، یہی تم لوگوں کا احسان ہو گا ہم پر۔ ہم آزاد رہ کر بھی خان جی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے''۔

''مجھے معلوم ہے''۔ موسیٰ خان نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''تم خان جی سے دشمنی نہیں پال سکتے مگر تمہاری بیٹی خاموش نہیں بیٹھے گی۔ خان جی کو خدشہ ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے شمروز خان کی موت کا واویلا جاری رکھے گی۔ لوگوں کی بچی کھچی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے وہ شب و روز خان جی کے پیچھے پڑی رہے گی اور خان جی عورت ذات سمجھ کر اسے نظرانداز کرتے رہیں گے مگر کب تک؟ جب پانی سر سے گزرنے لگتا ہے تو کوئی بھی انسان سود و زیاں کی نہیں سوچتا اور پھر دشمن تو دشمن ہوتا ہے چاہے مرد ہو یا کوئی عورت''۔

''میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا''۔ وہ جھٹ سے بولا۔ ''وہ کسی کے سامنے شمروز خان کی موت کا ذکر نہیں کرے گی''۔

''ذکر کرے گی نصیب خان''۔ موسیٰ خان نے زور دے کر کہا۔ ''جو عورت خان جی پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کر سکتی ہے وہ خان جی کی برائی کرنے سے کیسے باز رہ سکتی ہے؟ مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے مگر بولنے والے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی''۔

اسی دوران نوکر قہوہ لے کر کمرے میں داخل ہوا اور وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ پیالیوں میں قہوہ ڈالنے کے لیے بعد نوکر نے ان دونوں کو پیش کیا اور پھر موسیٰ خان سے اجازت طلب کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

نوکر کے جانے کے بعد موسیٰ خان نے قہوے کی ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''خان جی کو

شمروز کی موت کا افسوس ہے مگر وہ ایک مجرم تھا اس لیے خان جی نے اسے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی مگر اس کی بیوہ بے گناہ ہے اور خان جی اسے خوش دیکھنا چاہتا ہے''۔

''میں...... سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے متعجب انداز میں پوچھا۔ ''خان جی زرتاج کو کیوں خوش دیکھنا چاہتے ہیں؟''

''تا کہ اس کی عزت و جان محفوظ رہے''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''وہ خاموش رہے گی تو خود بھی فائدے میں رہے گی اور خان جی بھی خواہ مخواہ کی کوفت سے بچا رہے گا''۔

''شوہر کی موت کے بعد وہ بھلا کیسے خوش رہ سکتی ہے؟'' اس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''شمروز خان جیسا بھی تھا اس کا شوہر تھا۔ وہ اسے آسانی سے فراموش نہیں کر سکے گی''۔

''تم چاہو تو سب کچھ ممکن ہے''۔ موسیٰ خان نے جواب دیا۔ ''دراصل خان جی دوبارہ سے اس کا گھر آباد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جب اپنے گھر کی ہو جائے گی تو نہ صرف اپنا دکھ بھول جائے گی بلکہ خان جی کے لیے بھی دردِ سر نہیں بنے گی۔ اس کی شادی کے تمام انتظامات خان جی خود کریں گے۔ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس کسی طرح اسے راضی کرنے کی کوشش کرتے رہو''۔

''میں غریب اور بے بس ضرور ہوں''۔ وہ ناگوار انداز میں بولا۔ ''مگر بے غیرت نہیں ہوں۔ میری بیٹی اگر شادی کرنا چاہے گی تو میں خود بھی اس کی شادی کرنے کی سکت رکھتا ہوں۔ تمہیں اور خان جی کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہو تو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو''۔

''نصیب خان! تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو''۔ موسیٰ خان پریشان کن انداز میں بولا۔ ''میں تم باپ بیٹی کا ہمدرد ہوں اس لیے تمہیں ایک مناسب مشورہ دے رہا ہوں''۔

''مجھے تمہارے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ اس نے رکھائی سے کہا۔ ''اپنی بیٹی کا بھلا بُرا میں خود سوچ سکتا ہوں''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ نصیب خان!'' موسیٰ خان بدلے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میری بات ابھی تک مکمل نہیں ہوئی۔ پہلے سن لو بعد میں جو مرضی آئے فیصلہ کرنا۔ تمہیں اگر اپنی بھلائی مطلوب نہ ہوئی تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا''۔

''میرے خیال میں تو تمہاری بات مکمل ہو چکی ہے''۔ وہ بدستور بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کیا مزید کچھ کہنا باقی رہ گیا ہے؟''

''ہاں ابھی اصل بات تو باقی ہے''۔ موسیٰ خان دوبارہ نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''خان جی



نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم سے دو ٹوک بات کر لوں مگر میں فضول میں تمہیں سمجھانے بیٹھ گیا تھا''۔

''چلو اب کہہ دو بلا تمہید''۔ اس نے جواباً کہا۔

''اگر تم زرتاج کا کہیں بھی بیاہ کرا دو تو خان جی تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر نوازیں گے''۔ موسیٰ خان نے بلا تردد کہا۔ ''بصورت دیگر تم دونوں باپ بیٹی مرتے دم تک اسی حویلی میں نظربند رہو گے۔ تم نے حویلی کا قید خانہ تو دیکھ ہی لیا ہے۔ کسی طرح بھی سرکاری جیل سے کم نہیں ہے''۔

''آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی ناں''۔ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''میں جانتا تھا کہ تمہارے خان جی کی نوازشات بلا وجہ نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے ہمیں قید منظور ہے مگر تمہارے خان جی کے ہاتھ بکنا منظور نہیں ہے''۔

''چند دن قید میں رہو گے تو تمہاری عقل ٹھکانے آ جائے گی''۔ موسیٰ خان نے اطمینان سے کہا۔

''چلو میں تمہیں تمہارے ٹھکانے تک پہنچا دوں۔ تمہاری بیٹی تمہاری واپسی کی منتظر ہو گی''۔ اتنا کہہ کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور نصیب خان بلا چوں چرا اس کے آگے آگے چل پڑا۔

(آتش و آہن میں ڈوبی یہ داستان ابھی جاری ہے)

2

موت سے آنکھ مچولی کھیلنے والے ایک جیالے کی داستان

# مٹّی کا کھیل



رزاق شاہد کوہلر





''تو تم کوشش کے باوجود ناکام لوٹ کر واپس آ گئے ہو؟'' موسیٰ خان سے ساری بات سننے کے بعد خان جی نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''ابھی ان باپ بیٹی کے زخم تازہ ہیں خان جی''۔ وہ بولا۔ ''مگر مجھے امید ہے کہ نصیب خان بہت جلد راہِ راست پر آ جائے گا۔ ابھی کچھ دن اسے قید میں رہنے دیتے ہیں۔ عقل ٹھکانے آ جائے گی تو پھر میں دوبارہ اس سے بات کرلوں گا''۔

''اور مولوی نصیب اللہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' خان جی نے دوبارہ پوچھا۔ ''اس نے ہمارے خلاف بغاوت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ اب اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے نہایت ہی تکلیف دہ ہوگا''۔

''خان جی! مولوی نصیب اللہ کے پیچھے میں نے زرولی اور رقیب خان کو لگا دیا ہے۔ ان دونوں کو بلا کر معلوم کر لیتے ہیں''۔

''بلاؤ انہیں جلدی کرو''۔ خان جی نے حکم دیا اور موسیٰ خان سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد موسیٰ خان کی واپسی زرولی اور رقیب خان کے ساتھ ہوئی۔ وہ دونوں سہمے ہوئے تھے یوں جیسے ان پر کوئی افتاد پڑنے والی ہو۔

''مولوی نصیب اللہ کا کیا کیا ہے تم دونوں نے؟'' خان جی نے بلاتمہید ان سے استفسار کیا۔

''خان جی!'' رقیب خان گویا ہوا۔ ''ہم نے اسے اچھی خاصی پھینٹی لگائی ہے۔ آئندہ وہ ایسی حرکت''۔

''حرام زادے!'' خان جی گرج کر بولا اور رقیب خان کی بات ادھوری رہ گئی۔

''ایسے لوگ چھوٹی موٹی مار کو کب خاطر میں لاتے ہیں؟'' خان جی نے درشت انداز میں کہا۔ ''تم لوگوں نے اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا۔ کس سے ڈر گئے تھے؟''

''خا...... خان جی!'' رقیب خان سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ ''آپ کے حکم کے بغیر ہم نے یہ انتہائی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا تھا ورنہ اسے ٹھکانے لگانا کون سا مشکل تھا؟ آپ حکم کریں تو آج

ہی اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیتے ہیں''۔

''نہیں''۔ خان جی نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔''اب ہم اسے اتنی آسان موت نہیں دیں گے۔ ہم اسے آج رات حویلی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب جاؤ تم مگر اتنا یاد رکھنا کہ اگر تم ناکام لوٹے تو ہم تمہارا وہ حشر کریں گے جو تم سوچ بھی نہیں سکتے''۔

''بہت......اچھا خان جی''۔ وہ دونوں ایک ساتھ بولے اور پھر تیزی سے باہر نکل گئے۔

''نمک حرام کہیں کے!'' ان کے جانے کے بعد خان جی خود کلامی کے انداز میں بولا اور پھر موسیٰ خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''موسیٰ خان!'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔''انتخابات میں بہت تھوڑا عرصہ باقی رہ گیا ہے اور ہماری تیاری ابھی نامکمل ہے۔ علاقے میں روز بروز ہمارے نئے نئے دشمن پیدا ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف جہانداد والا دردِ سر الگ کھڑا ہو گیا ہے اور اب تو ایس پی جمشید خان بھی کھلم کھلا ہمارے مقابلے پر آ گیا ہے۔ سمجھ نہیں آتی ایسی صورتِ حال میں کیا کیا جائے؟''

''خان جی! آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں''۔ موسیٰ خان نے کہا۔''جب تک آپ کا یہ غلام زندہ ہے کوئی مائی کا لعل آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں سب سے نمٹ لوں گا۔ رہ گئی الیکشن کی بات تو افضال خٹک والا کانٹا تو ویسے بھی نکل گیا ہے۔ اب آپ کے مقابلے میں ظاہر ہے کوئی نیا شخص ہی آئے گا اور نیا شخص آپ سے بھلا کیسے جیت سکتا ہے؟''

''تم یہ سیاسی باتیں نہیں سمجھ سکتے موسیٰ خان''۔ وہ بدستور الجھے ہوئے انداز میں گویا ہوا۔''افضال خٹک مر کر بھی میرے لیے ایک مصیبت چھوڑ گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی کمال خٹک خم ٹھونک کر میدان میں آ چکا ہے۔ تم شاید آج کل اخبارات نہیں دیکھتے ورنہ تمہیں ضرور معلوم ہوتا کہ ان دنوں کمال خٹک کی بہت دھوم مچی ہوئی ہے۔ سیاسی جیوتشی ابھی سے اس کی کامیابی کی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اگر جہانداد سچ مچ میرے خلاف وعدہ معاف گواہ بن گیا تو پھر کیا ہوگا؟ کمال خٹک تو پہلے سے ہی بھائی کے قتل کو سیاسی دشمنی کا شاخسانہ قرار دے چکا ہے''۔

''خان جی!'' موسیٰ خان پُرسوچ انداز میں بولا۔''جہانداد کو پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا کہ وہ آپ کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ اس کی ماں اور بہن ہمارے قبضے میں ہیں وہ بھول کر بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتا''۔

''تم کچھ بھی کہو بہر کیف خطرہ ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اندر ہی اندر پکنے والا یہ لاوا کسی روز آتش فشاں کا روپ بھی دھار سکتا ہے''۔ اس نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔

''خان جی!'' موسیٰ خان پُرعزم انداز میں بولا۔''میں جہانداد کو بہت جلد اوپر پہنچا دوں گا۔ وہ



کب تک مجھ سے بچتا رہے گا؟ اگر آپ حکم کریں تو میں آج ہی پشاور روانہ ہو جاتا ہوں''۔

''وہ آسان شکار نہیں ہے موسیٰ خان''۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔''اور اتنی جلدی میں تجھے پشاور بھیج بھی نہیں سکتا۔ ابھی کتنے ہی کام یہاں ادھورے پڑے ہیں پہلے انہیں حل کر لو، بعد میں پشاور بھی چلے جانا''۔

''یہاں کے معاملات سنبھالنے والے اور بھی بہت سے لوگ ہیں خان جی۔ ایک میرے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہاں زرولی ہے۔ رقیب خان ہے۔ بشیر خان ہے۔ کیا یہ لوگ ایک مولوی اور نصیب خان اور اس کی بیٹی سے نہیں نمٹ سکتے؟'' موسیٰ خان نے جواب دیا اور منتظر نگاہوں سے خان جی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے''۔ خان جی نیم رضامندی سے بولا۔''تم کل چلے جانا۔ آج مولوی نصیب اللہ والا معاملہ نمٹا لیتے ہیں''۔

''خان جی! ایک عرض کروں؟'' اس نے اچانک موضوع بدل کر سوال کیا۔''بُرا لگے تو غلام سمجھ کر نظر انداز کر دینا''۔

''کہو......کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''خان جی! میں چاہتا ہوں کہ ابھی مولوی نصیب اللہ کو نہ چھیڑا جائے۔ الیکشن کے بعد میں خود اس سے نمٹ لوں گا''۔ اس نے جواب دیا اور پھر سر جھکا دیا۔

''آزاد رہ کر بھی تو وہ ہمیں نقصان پہنچاتا رہے گا''۔ خان جی نے کہا۔''پھر اسے چھوڑ دینے کا کیا فائدہ؟''

''خان جی! اگر یہ بات ہے تو اس کی موت کو حادثاتی رنگ بھی دیا جا سکتا ہے''۔ اس نے نیا نکتہ پیش کرتے ہوئے کہا۔''ایکسیڈنٹ وغیرہ یا پھر کوئی اور حادثہ؟ کسی سپیرے کی خدمات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں''۔

''کوئی بھی طریقہ کرو مگر اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے''۔ خان جی نے بیزار انداز میں کہا۔''ہم نے تجھے صرف دشمنوں سے نمٹنے کے لیے پالا ہے''۔

''ٹھیک ہے خان جی! آپ بے فکر رہیں۔ مولوی نصیب اللہ بس ایک دن کا مہمان ہے میں آج ہی کسی سپیرے کا بندوبست کرتا ہوں''۔ اس نے پُرعزم انداز میں جواب دیا۔

''او کے!'' خان جی نے کہا۔''زرولی اور رقیب خان کو پیغام بھیج دو کہ وہ منصوبے پر فی الحال عمل درآمد نہ کریں''۔

''بہت بہتر خان جی''۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔''میں ابھی انہیں منع کر دیتا ہوں''۔

"ٹھیک ہے جاؤ"۔ خان جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

موسیٰ خان جونہی دروازے تک پہنچا اچانک باہر برآمدے میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز گونجی اور موسیٰ خان ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ سامنے ہی قید خانے کا ایک پہریدار پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ موجود تھا۔ غالباً وہ دوڑتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔

"مم.....موسیٰ.....خان!" اسے دیکھتے ہی پہریدار بدحواس کے عالم میں بولا۔ "وہ.....وہ نصیب خان کی بیٹی مر.....مرگئی ہے اور.....اور نصیب خان بھی۔ بس مرنے والا ہے"۔

"باہر کون ہے موسیٰ خان؟" پہریدار کی بات ختم ہوتے ہی اندر سے خان جی نے استفسار کیا۔

"خان جی! غضب ہو گیا ہے۔ میں ابھی آتا ہوں"۔ اتنا کہنے کے بعد موسیٰ خان نے اندھا دھند قید خانے کی طرف دوڑ لگادی۔ پہریدار بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا۔

•:• ===•:• ===•:•

قید خانہ اس جیل نما حویلی کے اندر مغربی جانب واقع تھا۔ وہاں سے قید خانے کا فاصلہ پیدل پندرہ منٹوں میں طے ہو جاتا تھا، موسیٰ خان صرف پانچ منٹ میں وہاں تک پہنچ گیا۔ وہاں ایک سیل کے سامنے تمام پہرے دار جمع تھے۔ سیل کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر پختہ فرش پر نصیب خان اور زرتاج آڑی ترچھی حالت میں بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ موسیٰ خان کو دیکھتے ہی پہریداروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور انہوں نے جلدی سے راستہ چھوڑ دیا۔ موسیٰ خان پہریداروں پر توجہ دیے بغیر سیل کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے زرتاج پر توجہ دی۔ اسے ہلانے جلانے کے بعد اس نے اس کی نبض تھام لی مگر نبض خاموش تھی۔ تب وہ نصیب خان کی طرف متوجہ ہو گیا جو زرتاج سے پانچ فٹ دور پڑا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی اور چہرہ بری طرح زخمی تھا۔ بظاہر اس میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے مگر جب موسیٰ خان نے اسے چیک کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف بے ہوش ہے۔ موسیٰ خان نے چلا کر ایک آدمی کو گاڑی لانے کے لیے کہا اور پھر پہرے داروں سے مخاطب ہو کر استفہامیہ انداز میں بولا۔ "یہ حادثہ کیسے ہوا اور تم لوگ کہاں تھے؟ اتنا کچھ ہو گیا اور تم تماشا دیکھتے رہے۔ کیوں؟"

"جناب! اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہے"۔ ایک پہرے دار جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "آپ کے حکم کے مطابق میں نے زرتاج بی بی کو کھانا دیا اور سیل کو دوبارہ تالا لگا دیا۔ زرتاج بی بی نے کھانا اٹھایا اور سیل کے ایک کونے میں بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ اس دوران میں سیل کے



سامنے برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کھانا ختم کیا اور پھر وہیں لیٹ گئی۔ میں سمجھا وہ آرام کر رہی ہے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد نصیب خان پہنچ گیا۔ میں نے ایک بار پھر سیل کا تالا کھولا تاکہ نصیب خان اندر چلا جائے۔ نصیب خان اندر داخل ہو کر زرتاج کو پکارنے لگا جبکہ اس دوران میں نے کھانے والی ٹرے اٹھا کر باہر برآمدے میں رکھ دی۔ ٹرے رکھ کر جونہی میں سیل کو تالا لگانے کے لیے آگے بڑھا عین اسی وقت نصیب خان نے ایک جھٹکے سے سیل کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور جنونی انداز میں دروازے کو ٹکریں مارنے لگا۔ ہمارے سنبھلنے اور دروازہ کھولنے تک وہ گر کر بے ہوش ہو چکا تھا"۔ تمام تفصیل بتانے کے بعد پہریدار نے خاموش ہو کر سر جھکا دیا۔

"یہ سب تمہاری غفلت کا نتیجہ ہے"۔ موسیٰ خان اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا۔ پہلے نصیب خان کو بچانا ضروری ہے۔ وہ کھانے والے برتن کہاں ہیں؟ جلدی سے لے آؤ"۔

"وہ.....وہ تو جی میں نے کچن میں بھجوا دیے ہیں"۔ پہرے دار نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"احمق ہو تم"۔ موسیٰ خان نے گرج کر کہا۔ "جاہل آدمی اس کھانے میں زہر ملا ہوا تھا۔ جاؤ جلدی سے پتا کرو"۔

"ج.....جناب! میں ابھی پتا کرتا ہوں"۔ اتنا کہہ کر وہ کچن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا اور موسیٰ خان دوبارہ بے ہوش پڑے ہوئے نصیب خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تمام پہرے دار اس کے تیور دیکھ کر سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ دل ہی دل میں وہ مضطرب تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ اب موسیٰ خان کے غضب کا نشانہ نہ جانے کون بننے والا ہے۔ موسیٰ خان ان کی موجودگی سے لاتعلق ہو کر نصیب خان پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسے ہلا جلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش بھی بیکار گئی۔

اس دوران ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچ گیا اور پہرے دار کچن سے برتن اٹھا کر لے آیا تھا۔ موسیٰ خان نے دونوں باپ بیٹی کو جلدی سے گاڑی میں ڈالا، کھانے والے برتن ساتھ رکھے اور ڈرائیور سے تحکمانہ انداز میں بولا۔ "جلدی کرو۔ ڈاکٹر کہیں نکل نہ جائے"۔ ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

•:• ===•:• ===•:•

ڈاکٹر کی بروقت کوشش سے نصیب خان کی جان تو بچ گئی مگر ہوش میں آتے ہی اس نے بہکی بہکی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ پہلے تو موسیٰ خان اس کی ان باتوں کو مکاری سمجھتا رہا مگر جب ڈاکٹر نے اس کا ذہنی توازن بگڑنے کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو موسیٰ خان کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔

"ڈاکٹر!" پوری تفصیل سننے کے بعد موسیٰ خان نے استفسار کیا۔ "کیا یہ ہمیشہ کے لیے اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے یا پھر یہ صرف وقتی صدمہ ہے؟"

"بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے"۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا اس کے دماغی پرابلم کا پتا یہاں نہیں چل سکتا۔ ایک تو یہاں ہمیں مکمل سہولیات دستیاب نہیں ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ دماغی امراض کا الگ سے ایک ڈاکٹر ہوتا ہے وہی اس کی حالت کے متعلق کوئی حتمی بات کہہ سکتا ہے"۔

"کیوں..... آپ کیوں نہیں بتا سکتے؟" موسیٰ خان نے بے چین ہو کر پوچھا۔

ڈاکٹر نے ایک لمحے کے لیے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی۔

"خان جی کہتے ہیں کہ موسیٰ خان ایک تعلیم یافتہ شخص ہے"۔ ڈاکٹر نے مسکراہٹ آمیز انداز میں کہنا شروع کیا۔ "لیکن تمہارا سوال سن کر میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ کہیں خان جی نے مجھ سے مذاق تو نہیں کیا؟"

"خان جی ٹھیک کہتے ہیں"۔ وہ برا منائے بغیر بولا۔ "میں بی اے تک تعلیم حاصل کر چکا ہوں مگر وہ تو بہت پرانی بات ہے۔ تقریباً دس سال پہلے میں نے قلم اور کتاب سے رشتا توڑ کر رائفل اٹھالی تھی اور آج تک اٹھائے ہوئے پھر رہا ہوں"۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟" ڈاکٹر نے بے ساختہ سوال کیا۔

اب کی بار موسیٰ خان نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟" ڈاکٹر نے دوبارہ محتاط انداز میں پوچھا۔

موسیٰ خان نے ایک یاسیت بھری آہ کھینچی اور کہا۔ "ڈاکٹر! یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں آپ کو تفصیل تو نہیں بتا سکتا بہر حال اتنا جان لو کہ اسلحہ مجھ سے مجبوری کے عالم میں اٹھوایا گیا تھا مگر اب عادت سی ہو گئی ہے۔ چھوڑنا چاہوں بھی تو نہیں چھوڑ سکتا"۔

"خان جی سے تمہارا کوئی رشتہ ہے؟" ڈاکٹر نے متجسس ہو کر سوال کیا۔

"بس اس ٹاپک کو رہنے دیجیے"۔ وہ بیزار سے انداز میں بولا۔ "مجھے یہ بتائیے کہ اب مریض کا کیا کرنا پڑے گا؟ میں خان جی کو کیا بتاؤں گا؟"

"موسیٰ خان! ابھی اسے مزید چند روز یہاں ایڈمٹ رہنے دیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران یہ نارمل ہو جائے اور تم اسے شہر لے جانے کی پریشانی سے بچ جاؤ"۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیتے ہوئے جواب دیا۔



"نہیں....." موسیٰ خان نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا۔ مجھے خان جی سے پوچھنا پڑے گا"۔

"تمہاری مرضی میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "ویسے خان جی کو یہ مشورہ ضرور دینا ممکن ہے بات ان کی سمجھ میں آ جائے"۔

"او کے میں بات کروں گا"۔ موسیٰ خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب میں نصیب خان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ خان جی اس کے متعلق مجھ سے تمام تفصیل پوچھیں گے"۔

"مل لو اس سے"۔ ڈاکٹر اٹھتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس کی حالت بدستور وہی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو زندہ سمجھ رہا ہے حالانکہ زرتاج کو دفن ہوئے آج دو روز گزر چکے ہیں"۔

"ڈاکٹر!" موسیٰ خان اچانک کسی خیال کے تحت بولا۔ "کہیں نصیب خان پاگل پن کی اداکاری تو نہیں کر رہا ہے؟ بندہ بہت چالاک ہے"۔

"موسیٰ خان! میں ڈاکٹر ہوں۔ کم از کم وہ میرے سامنے اداکاری نہیں کر سکتا"۔ ڈاکٹر ناگوار انداز میں گویا ہوا۔ "ویسے بھی اسے یہ تماشا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ خود ساختہ پاگل بن کر وہ کون سا مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے؟"

"یہ باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی ڈاکٹر صاحب"۔ موسیٰ خان نے قدرے تمسخر سے کہا۔ "بہر کیف مجھے اس پر شک ہے کہ وہ جان بوجھ کر خود کو ابنارمل ظاہر کر رہا ہے اور......"

"پھر بھی کوئی وجہ تو ہو گی؟" ڈاکٹر نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ "ورنہ کون مفت میں خود کو پاگل بناتا ہے؟"

"وجہ کوئی بھی ہو ڈاکٹر صاحب! یہ ہمارا دردِ سر ہے"۔ موسیٰ خان بولا۔ "آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جانیں اور ہمارا کام۔ ہم معلوم کر ہی لیں گے کہ وہ اداکاری کر رہا ہے کہ سچ مچ ذہنی توازن کھو چکا ہے"۔

"او کے ..... تم لوگ جانو اور تمہارا کام"۔ ڈاکٹر نے بیزاری سے جواب دیا۔ "مجھے اس معاملے سے کیا لینا دینا؟"

ڈاکٹر اور موسیٰ خان ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ نصیب خان بیڈ پر لیٹا چھت کے پنکھے کو گھور رہا تھا۔ ایک نرس اس کے بیڈ کے قریب کرسی ڈالے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر اور موسیٰ خان کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی تاہم نصیب خان نے ان دونوں کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا اور بدستور اپنے شغل میں مصروف رہا۔ وہ چھت کے پنکھے کو یوں دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بچہ من پسند کھلونے کو دیکھتا ہے۔

''ہاں سسٹر! مریض کا کیا حال ہے؟'' ڈاکٹر نے نرس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''ویسے تو ٹھیک ہی ہے سر! مگر کبھی کبھی اوٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیتا ہے۔ جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مداری بنا ہوا تھا اور پھر بیٹھے بیٹھے عورتوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔ مجھے تو اب اس سے خوف محسوس ہونے لگا ہے''۔

''Be brave sister''۔ ڈاکٹر اس کی ہمت بندھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ پاگل تو نہیں ہے جو تم اتنا خوفزدہ ہو رہی ہو؟ بے ضرر سا مریض ہے صرف بہکی بہکی باتیں کر سکتا ہے، کسی کا نقصان نہیں کر سکتا اس لیے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مریض کا خیال رکھو''۔

''ٹھیک ہے سر''۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوں مگر پھر بھی دماغی مریض پر بھروسا تو نہیں کیا جاسکتا ناں! کسی بھی وقت وہ کچھ بھی کر سکتا ہے''۔

''یہ بلاوجہ کا اندیشہ......''

''میرا بندر کہاں ہے؟'' اچانک نصیب خان ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو کر بولا اور ڈاکٹر کی بات ادھوری رہ گئی۔

اس کا سوال سن کر ڈاکٹر نے بغور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا مگر اسے کسی قسم کی مکاری یا چالاکی کے آثار نظر نہ آئے۔ موسیٰ خان بھی دلچسپ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کون سا بندر نصیب خان؟'' ڈاکٹر نے یوں سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے سوال کیا جیسے نصیب خان نے اس سے کوئی اہم بات پوچھی لی ہو۔

''میرا بندر''۔ وہ اونچی آواز میں بولا۔ ''کیا تمہیں کم سنائی دیتا ہے؟''

''میں نے تو نہیں دیکھا''۔ ڈاکٹر نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے اسے کہاں چھوڑا تھا۔ کچھ معلوم ہے؟''

''مجھے معلوم ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا؟'' وہ استہزائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''کیا تم مجھے پاگل سمجھتے ہو یا بیوقوف؟''

''تم پاگل ہی تو ہو''۔ موسیٰ خان مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک ڈاکٹر سے اس قسم کے سوال کوئی باہوش انسان نہیں کر سکتا۔ تم سچ مچ......''

''پلیز موسیٰ خان''۔ ڈاکٹر نے قطع کلامی کی۔ ''مریض سے اس انداز میں گفتگو نہیں کی جاتی۔ براہ کرم خاموش رہو''۔

''سوری ڈاکٹر''۔ موسیٰ خان نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کی انسلٹ کر رہا تھا اس لیے مجھے بولنا پڑ گیا او کے اب نہیں بولوں گا''۔



''انسلٹ کیسی؟'' ڈاکٹر بولا۔ ''یہ مریض ہے اور میں ڈاکٹر۔ اگر ہم لوگ ان باتوں کو اپنی بے عزتی خیال کرنے لگ جائیں تو پھر ہو چکی مسیحائی؟ مریض کو صرف علاج کی ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر کے پیار اور خلوص کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اس کی حالت دیکھ رہے ہو۔ ایسی حالت میں اگر میں اس پر غصہ ہونا شروع ہو جاؤں تو اس کی حالت ٹھیک ہونے کی بجائے مزید بگڑ جائے گی اور مریض بہکی بہکی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ ملنے جلنے والوں پر حملہ کرنا بھی شروع کر دے گا''۔

''ایم رئیلی سوری ڈاکٹر صاحب!'' موسیٰ خان دوبارہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ پلیز اب آپ جانے دیجیے''۔

''اٹس او کے''۔ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر دوبارہ نصیب خان کی طرف متوجہ ہو گیا جو دبی دبی زبان میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

''نصیب خان!'' ڈاکٹر نے اسے نرم لہجے میں پکارا۔ ''تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟''

''کون نصیب خان۔ وہی جس کے نصیب پھوٹ گئے؟'' اس نے چونک کر ڈاکٹر سے پوچھا۔

''وہ میرا کچھ نہیں لگتا۔ میرا نام تو رئیس خان ہے اور میں اپنے علاقے کا سردار ہوں۔ کیا تم مجھے نہیں جانتے؟''

''بڑی اچھی طرح جانتا ہوں''۔ ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کہ تم اپنے علاقے کے سردار ہو مگر شاید تم اپنا نام بھول رہے ہو۔ تمہارا نام رئیس خان نہیں ہے بلکہ نصیب خان ہے''۔

''غلط''۔ وہ ایک دم بھڑک کر بولا۔ ''بالکل غلط۔ تم سب اس غدار اور نمک حرام سے مل چکے ہو مگر میرا نام بھی رئیس خان ہے۔ مجھے بے وقوف بنانا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں اس خبیث کا ناپاک منصوبہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتا ہے مگر میں بھی اس کا باپ ہوں۔ اسے ناکوں چنے نہ چبوا دیے تو میرا نام بدل دینا''۔

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر نے سچ مچ حیرانی سے سوال کیا۔ ''کون ہے وہ غدار جو تمہیں بیوقوف بنانا چاہتا ہے؟''

''اتنے بھولے مت بنو داور خان!'' وہ تمسخرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں اس نمک حرام قربان علی سے ملے ہوئے ہو اور مجھے بے وقوف بنا کر خزانے کا پتا معلوم کرنا چاہتے ہو۔ مگر میں اتنا احمق نہیں ہوں جو تمہاری باتوں میں آ جاؤں گا۔ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا''۔

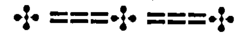
''دیکھ رہے ہو موسیٰ خان!'' ڈاکٹر موسیٰ خان کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ ''کیا اب بھی تمہارا یہی خیال ہے کہ یہ اداکاری کر رہا ہے؟ اگر واقعی یہ اداکاری ہے تو ہمیں اسے داد دینا پڑے گی۔ اتنی

اچھی اداکاری تو کوئی فلمسٹار بھی نہیں کر سکے گا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا ڈاکٹر صاحب!" وہ گومگو کے عالم میں بولا۔ "بہرکیف آپ فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ میں جا کر خان جی کو رپورٹ کرتا ہوں۔ پھر جیسے وہ حکم دیں گے۔ ہمیں وہی کرنا پڑے گا"۔

"او کے"۔ ڈاکٹر نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "بڑی خوشی کے ساتھ۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

اس کے بعد موسیٰ خان ڈاکٹر کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا اور ڈاکٹر نرس کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔ جو موجودہ صورتِ حال سے بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ نصیب خان کی ڈاکٹر کے ساتھ گفتگو سن کر نرس کو شاید مکمل یقین ہو چکا تھا کہ وہ ایک پاگل کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اس بے چاری کی نوکری کا مسئلہ نہ ہوتا تو یقیناً وہ اب تک ڈاکٹر کو انکار کر چکی ہوتی مگر مجبوریاں انسان سے بہت کچھ کروا دیتی ہیں۔ پیٹ میں آگ لگی ہو تو ڈر اور خوف اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔



چاروں طرف سناٹا تھا۔ جہاں تک نگاہیں جاتی تھیں ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔ کسی قسم کی زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ ان ویران اور سنگلاخ پہاڑوں میں کھڑا وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک ثانیے کے لیے اس کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا تھا کہ وہ راستہ بھول کر یا کسی پُراسرار عمل کی وجہ سے کسی ویران سیارے پر تو نہیں پہنچ گیا، مگر پھر اس نے خود ہی اپنے اس احمقانہ خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ اسی زمین پر تھا اور افغانستان کے اندر تک چلے جانے والے پہاڑ اپنی تمام تر ویرانیوں کے ساتھ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ گرم ہوا کے تھپیڑے چہرے سمیت اس کے تمام بدن کو ایک نادیدہ آگ میں جھلسائے جا رہے تھے۔ ہوا سے اُڑنے والی ریت سرخی مائل چٹانوں سے ٹکرا کر اس کے قدموں میں بکھری جا رہی تھی۔

وہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس کا یہ احساس لحہ بہ لحہ شدت پکڑتا جا رہا تھا کہ جیسے اس نے کندھوں پر کوئی نادیدہ بوجھ اٹھا رکھا ہو۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ نیلگوں آسمان پر ابر کا کوئی ٹکڑا تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہیں نیلگوں فضا میں کسی متحرک چیز پر مرکوز ہو گئیں، تب اسے احساس ہوا کہ وہ اس ویرانے میں تنہا نہیں ہے، ایک گِدھ بھی اس خاموش اور تپتی ہوئی فضا میں ایک محدود دائرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان گِدھوں کی تعداد پانچ ہو گئی تھی۔ گِدھ کس جانب سے آ رہے تھے کوشش کے باوجود وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ اس نے تھک کر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیں یوں جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔ اس کی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا ہوا تھا



جس کے شیشے اور فریم دہکتے ہوئے انگاروں کے مانند تپ رہے تھے اور اس تپش سے اسے آنکھوں میں شدید جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا تمام بدن پسینے میں تر بہ تر تھا، گردن کی پشت سے بہنے والے پسینے کی دھاریں کینچوؤں کی طرح رینگتی ہوئی اس کی ریڑھ کی ہڈی تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کی شرٹ کا رنگ پسینے کی زیادتی کی وجہ سے مزید گہرا ہو چکا تھا۔ وہ مسلح تھا اور اس کی جیپ ایک ٹیلے کے عقب میں موجود تھی۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا چنانچہ اسے اپنی جیپ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

پشاور شہر سے اس طرف آنے والی جس سڑک پر وہ سفر کر کے آیا تھا، اس پر ٹریفک بہت کم تھا چند کلومیٹر اس سڑک پر سفر کرنے کے بعد اس نے اپنی جیپ کا رخ اس چٹانی راستے کی طرف موڑ دیا تھا اور آخر کار اس سنسان جگہ پہنچ کر اس نے جیپ روک لی تھی اور بہت دیر سے وہ اس ویرانے میں کھڑا اِدھر اُدھر تشویش زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی نظریں ٹیلیفون کے اس کھمبے کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں جو وہاں سے کافی فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ایستادہ تھا۔

یکا یک وہ چونک اٹھا، بہت دور سے کچھ عجیب سی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ یہ آوازیں کچھ اس قسم کی تھیں جیسے لوہے کے پہیوں والی کسی بھاری چیز کو کھینچا جا رہا ہو۔ وہ آواز کی سمت متوجہ ہو گیا مگر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ آوازیں قدرے جنوب کی طرف واقع پہاڑیوں کے عقب سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ آوازیں کبھی بلند ہو جاتی تھیں اور کبھی بالکل مدھم۔ اس کی خطر پسند فطرت اسے آگے بڑھنے پر مجبور کرنے لگی مگر وہ جس مقصد کے لیے اس ویرانے میں پہنچا تھا وہ ابھی تک ادھورا تھا اس لیے اس نے آوازوں کو نظرانداز کر دیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کاش عابد خان نے اسے اس ویرانے میں نہ بلایا ہوتا تو وہ یوں پریشان اور ہلکان نہ ہو رہا ہوتا لیکن شاید معاملہ بہت اہم تھا اور عابد خان کسی قسم کا رسک لینا نہیں چاہتا تھا مجبوراً جمشید خان کو اس کی بات ماننا پڑ گئی تھی۔

"بینگ...... بینگ...... دھپ...... کریک...... کریک...... دھپ......" وہ آوازیں پھر سے سنائی دینے لگی تھیں۔

جمشید خان نے مڑ کر ایک نظر اپنی جیپ پر ڈالی اور پھر آگے بڑھنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

اس راستے پر بجری نما لاتعداد چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے جو تیز دھوپ میں شیشے کے ٹکڑوں کے مانند چمک رہے تھے۔ وہ پگڈنڈی نما راستہ تقریباً تین سو گز تک نشیب کی طرف چلا گیا تھا۔ چلتے چلتے اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر بے ساختہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ عابد خان سے ملاقات کا جو وقت طے ہوا تھا اس میں نصف گھنٹے کی تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا ہوتا مگر جب وہ راستے میں تھا تو ایک آئل ٹینکر تیزی سے اسے اوور ٹیک

کرتے ہوئے آگے نکل گیا تھا۔ آئل ٹینکر کے ڈرائیور کو شاید اپنی منزل پر پہنچنے کی بہت جلدی تھی ورنہ وہ یوں احمقانہ ڈرائیونگ کا مظاہرہ کبھی نہ کرتا۔ ہائی وے پر چلنے والی بسوں، مال بردار ٹرکوں اور آئل ٹینکروں کے ڈرائیوز کو ہمیشہ ہی اپنی منزل پہ پہنچنے کی جلدی رہتی ہے۔ مگر اس آئل ٹینکر کا ڈرائیور کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھا اور پھر یہی جلدی ہی اسے لے ڈوبی۔

وہ آئل ٹینکر پہاڑیوں میں تقریباً نصف کلومیٹر ہی آگے گیا ہوگا کہ فضا زوردار دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہ تیز رفتار آئل ٹینکر مخالف سمت سے آنے والے ایک مال بردار ٹرک سے ٹکرا گیا تھا۔

جمشید خان جس وقت وہاں پہنچا اس وقت تک دونوں سمت سے آنے والی چند ایک گاڑیاں وہاں رک چکی تھیں کیونکہ آئل ٹینکر کو آگ لگنے کی وجہ سے سڑک تقریباً بلاک ہو کر رہ گئی تھی۔ اس تصادم کے نتیجے میں آئل ٹینکر کا ڈرائیور جبکہ مال بردار ٹرک کا کلینرز اپنی جان گنوا بیٹھا تھا تاہم مال بردار ٹرک کا ڈرائیور صرف زخمی ہوا تھا۔ وہاں رکنے والے لوگ زخمیوں کی مدد کرنے سے زیادہ حادثے سے لطف اندوز ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناطے جمشید خان کو وہاں رکنا چاہیے تھا مگر وہ جس کام سے نکلا تھا اس کی اہمیت کہیں زیادہ تھی، ویسے بھی وہ اس دور دراز سڑک پر زخمیوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا، سو اس نے آگے نکل جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔

اس حادثے کی وجہ سے اسے کچھ تاخیر ہوگئی تھی اور اب وہ پریشان ہو رہا تھا۔ کوئی منصوبہ خواہ کتنی ہی ذہانت سے تیار کیا جائے ایک ایک پل اور بات کا خیال رکھا جائے اور اس کی کامیابی کا بھی سو فیصد یقین ہو لیکن پھر بھی بعض اوقات اس قسم کا کوئی اتفاقی حادثہ سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے، جیسے آج اس کے منصوبے پر پانی پھر چکا تھا۔

''بینگ...... بینگ...... دھپ...... دھپ......'' آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی اور وہ چوکنا ہو کر رک گیا۔ ریوالور پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔ کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے وہ بالکل تیار تھا۔ ذرا آگے ایک موڑ تھا، موڑ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بہت احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا کیونکہ کسی نادیدہ دشمن کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اس نے لاتعداد دشمن بنا رکھے تھے۔

موڑ گھوم کر جیسے ہی وہ دوسری طرف نکلا سامنے ہی سوکھے درختوں کا ایک جھنڈ دیکھ کر رک گیا۔ درختوں کے عین درمیان میں اسے وہ جھونپڑا نما کچے مکان بھی نظر آگئے جو ایک چھوٹے سے میدان میں دائرے کی شکل میں بنائے گئے تھے۔ میدان کے وسط میں ایک خشک تالاب بھی دکھائی دے رہا تھا۔ جمشید خان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کسی زمانے میں وہاں افغانیوں کا کوئی قبیلہ آباد رہا ہوگا اور تالاب کا پانی خشک ہوجانے کے بعد وہ کہیں اور نکل گیا ہوگا۔



''عابد خان!'' مکانوں کے نزدیک پہنچ کر اس نے ہولے سے پکارا۔ ''تم کہاں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟''

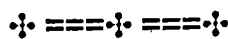
اس کے سوال کا کوئی جواب نہ ملا، لگتا تھا جیسے وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ ہو۔ مگر نہیں، آسمان پر منڈلاتے ہوئے وہ گدھ موجود تھے جن کی تعداد بڑھ کر اب چھ ہوگئی تھی۔ ویرانے میں گدھوں کی موجودگی کا سبب اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ وہاں نزدیک یقیناً کوئی جاندار موت کے اندھیرے غار میں اُترنے والا تھا اور گدھ اسے شکار کرنے کے لیے منڈلا رہے تھے۔

وہ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا کھنڈر ہوجانے والے کچے مکانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق سورج تیزی سے مغرب کی جانب بھاگ رہا تھا اور شاید تین سوا تین گھنٹوں کے بعد وہ کسی فلک بوس پہاڑ کے عقب میں غروب ہونے والا تھا۔ یہ بات بہت تشویش ناک تھی کیونکہ ابھی اسے واپس بھی جانا تھا۔ اب وہ جہانداد کو اپنے ساتھ نہ لاکر پچھتا رہا تھا۔ ایک، ایک اور دو گیارہ والی کہاوت اسے شدت سے یاد آنے لگی تھی۔

سوکھے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں ایک الگ تھلگ مکان بھی نظر آرہا تھا جو نسبتاً دوسرے مکانوں سے بڑا تھا۔ اس کی چھت اور شمالی دیوار منہدم ہوچکی تھی اور مٹی کی کچی اینٹیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ مکان کے اردگرد کچھ خشک لکڑیاں وغیرہ بھی موجود تھیں جو غالباً وہاں ایندھن وغیرہ کی ضروریات کے لیے رکھی گئی تھیں۔ جمشید خان آگے بڑھنے میں کچھ جھجک سی محسوس کر رہا تھا حالانکہ اس کے ہاتھ میں لوڈڈ ریوالور موجود تھا۔ جسے وقت پڑنے پر وہ استعمال کرسکتا تھا مگر اب یہ ریوالور بھی اسے دہکتا ہوا ایک ناگوار بوجھ لگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ریوالور پھینک کر وہیں کسی درخت کے سائے میں لیٹ جائے اور عابد خان کو اس کے حال پر چھوڑ دے، زندہ ہوگا تو خود ہی اسے ڈھونڈ لے گا ورنہ جائے جہنم میں۔

''عابد!'' اس نے ایک بار قدرے بلند آواز سے پکارا مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا، پتا نہیں اسے آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔

''عابد...... عابد...... عابد''۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ جھنجھلا کر پوری قوت کے ساتھ اسے پکارنے لگا۔ اس کی آواز لمحہ بھر کے لیے پہاڑیوں میں گونجنے کے بعد خاموش ہوگئی۔ ایک بار پھر وہی جان لیوا سکوت جمشید خان کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ تھک ہار کر وہ وہیں ایک مکان کے سائے میں بیٹھ گیا۔



جمشید خان کو یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ عابد نے اسے یہاں کس مقصد کے لیے بلایا تھا؟ ٹیلیفون پر

اس نے بہت مختصر اور عجلت میں بات کی تھی۔ عابد خان کا تعلق ایک معزز اور امیر کبیر فیملی سے تھا مگر کلثوم سے شادی کرنے کے بعد اس کے والدین اس سے قطع تعلق کر چکے تھے کیونکہ کلثوم کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا اور عابد کے والدین اسے سخت ناپسند کرتے تھے لیکن محبت ذات پات اور اُونچ نیچ کب خاطر میں لاتی ہے سو عابد اور کلثوم بھی سب کو خیر باد کہہ کر ایک ہو گئے تھے۔ دونوں کے والدین ان کی صورتیں دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے مگر ان دونوں نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کر لیا تھا۔

شادی کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ دونوں جمشید خان کے گھر میں مقیم رہے تھے لیکن پھر انہوں نے اپنا مکان خرید لیا تھا۔ عابد خان ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا وہ اگر چاہتا تو کسی بھی سرکاری محکمے میں افسری حاصل کر سکتا تھا مگر جمشید خان کو دیکھ کر اس نے بھی محکمۂ پولیس جوائن کر لیا تھا۔ اسے اعلیٰ آفیسر بننے کی بجائے ملک وقوم کی خدمت کرنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔

جمشید خان نے خوش ہو کر اس کے اس فیصلے کو نہ صرف سراہا تھا بلکہ اسے اپنے ساتھ بھی رکھ لیا تھا اور اب عابد خان انسپکٹر بن چکا تھا۔ گزشتہ چند روز سے وہ دونوں اسلحے کے سوداگروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہو چکی تھیں اور وہاں روسی اسلحہ خصوصاً کلاشنکوف عام ہو چکی تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے سے یہ روسی اسلحہ سمگل ہو کر افغانستان سے پاکستان پہنچنے لگا تھا۔ افغانی اسمگلر یہ اسلحہ صوبہ سرحد تک پہنچاتے تھے اور پھر صوبہ سرحد سے یہ چوری چھپے دیگر صوبوں میں بھی پھیلایا جا رہا تھا، پشاور میں اس روسی اسلحے کا سب سے بڑا اسمگلر ابراہیم بنگش تھا جو نہ صرف اسلحے کا سب سے بڑا بیوپاری تھا بلکہ منشیات کے دھندے میں بھی پوری طرح ملوث تھا۔

ایس پی جمشید خان نے جب ابراہیم بنگش کے خلاف دائرہ تنگ کرنا شروع کیا تو عابد خان زندگی کی پرواہ کیے بغیر اس جنگ میں اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔

پندرہ بیس منٹ آرام کرنے کے بعد جمشید خان اپنی جگہ سے اٹھا اور نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا کھنڈر نما مکان کے قریب پہنچ گیا۔ بجری نما پتھر اس کے قدموں تلے چرچرا رہے تھے۔ ہوا کا رخ بدل چکا تھا مگر گرمی کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ مکانوں کے درمیان واقع تالاب کے قریب سے ایک چھوٹا سا بگولا نمودار ہوا اور ریت کو اپنے ساتھ اُڑاتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ جمشید خان کچھ اور آگے بڑھ گیا، پہلا جھونپڑا نما مکان بالکل خالی تھا۔ دوسرے جھونپڑے کے سامنے ایک کتے کی ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا جس کی کھوپڑی بالکل سیدھی حالت میں پڑی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گڑھے بہت خوفناک نظر آ رہے تھے۔ بکھری ہوئی ہڈیوں پر گھاس پھونس اور مکڑی کے جالے لپٹے ہوئے تھے۔ تیسرے جھونپڑے کے سامنے گھریلو استعمال کی کچھ ٹوٹی پھوٹی ہوئی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ دفعتاً اس کی نگاہیں زمین پر جم کر رہ گئیں۔ اسے کار کے پہیوں کے نشانات نظر آ رہے تھے جو



درختوں کے جھنڈ میں واقع بڑے مکان کے عقبی جانب رہنمائی کر رہے تھے۔ نشانات دیکھ کر وہ رک گیا۔ ڈھلتی ہوئی دھوپ اس کی گردن پر سوئیاں چبھو رہی تھی۔ پسینے کی فراوانی کی وجہ سے اس کے چشمے کے شیشے دھندلا چکے تھے سو اس نے چشمہ اتار کر جیب میں رکھ لیا۔ ہوا ساکت ہو چکی تھی۔

وہ نشانات کے ساتھ ساتھ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ اس کی یہی احتیاط پسندی اب تک اس کی زندگی کی ضامن بنی ہوئی تھی ورنہ جس خطرناک شعبے سے وہ تعلق رکھتا تھا وہاں ذرا سی غفلت بھی بعض اوقات موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے۔ مکان کے عقبی جانب پہنچتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ مضبوط بدن کا مالک عابد خان زمین پر چت پڑا ہوا تھا اس کے ہاتھ اور پاؤں اونٹ کے بالوں سے بٹی ہوئی رسیوں سے ایک گرے ہوئے درخت کے خشک تنے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پہ لباس کے نام پر کوئی چیتھڑا تک نہیں تھا۔ وہ بالکل ساکت حالت میں پڑا ہوا تھا۔

اسے دیکھتے ہی جمشید خان کو یقین ہو گیا کہ زندگی کی ڈور اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہے چنانچہ اس نے اندھا دھند اس کے قریب پہنچنے کا رسک لینے کی بجائے وہیں کھڑا رہنا مناسب سمجھا۔ عابد خان کی لاش کے اردگرد ریت پر قدموں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لاش کے قریب جانے سے ڈر رہا تھا۔ غالباً اس کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ چکا تھا کہ لاش کے اردگرد زمین کے اندر کوئی دھماکہ خیز مواد رکھ دیا گیا ہوگا جو اس کے وہاں قدم رکھتے ہی ایک دھماکے سے پھٹے گا اور اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔

اس نے کھڑے کھڑے عابد خان کی کار کی طرف دیکھا جو وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر موجود تھی۔ یہ اگرچہ بہت پرانی کار تھی مگر عابد خان نے اس کا انجن بہترین حالت میں رکھا ہوا تھا اور کار کی دیکھ بھال پر اکثر اوقات رقم خرچ کرتا رہتا تھا۔ جمشید خان محتاط انداز میں چلتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سائیڈ والی کھڑکی کا شیشہ گرا ہوا تھا۔

اس نے جیسے ہی کھڑکی پر ہاتھ رکھا اس کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ کھڑکی کا فریم انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔ اس کی ہتھیلی جل گئی تھی۔ عابد خان کی واسکٹ ڈرائیونگ سیٹ پر پڑی ہوئی تھی مگر جمشید خان نے اسے ہاتھ لگانے کا رسک نہ لیا۔ مجرموں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ ایک عرصے سے اس کے خون کے پیاسے تھے اس لیے وہ قدم قدم پر احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا اسے ٹریننگ کے دوران یہی تربیت دی گئی تھی کہ مجرموں پر کبھی بھی اعتبار نہ کرنا ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔ کار سے توجہ ہٹا کر اس نے ایک بار پھر زمین پر پڑی ہوئی عابد خان کی لاش کی طرف دیکھا اور پھر ایک دم چونک گیا۔ وہ بہت دھیمی آواز میں کراہ رہا تھا اور اس کے جسم میں معمولی سی جنبش بھی پیدا ہوئی تھی۔ وہ تمام احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے تیزی سے عابد خان کے قریب پہنچ گیا اور بغور اس کا

جائزہ لینے لگا۔ وہ مرا نہیں تھا، اس میں زندگی کی حرارت ابھی باقی تھی تاہم اس کی حالت دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ مجرموں نے اس کے ساتھ بڑی بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک گہرا گھاؤ موجود تھا۔ جہاں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، آنکھوں کے پپوٹے کٹے ہوئے تھے اور اس کے دیدے یوں ساکت تھے جیسے وہ آسمان کو گھور رہا ہو، پورا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور منہ کھلا ہوا تھا ہونٹوں کے درمیانی خلا سے اس کے خون آلود دانت جھانک رہے تھے، وہ اس کا اپنا ہی خون تھا جو چہرے سے بہتا ہوا دانتوں تک پہنچ گیا تھا۔

''عابد!'' اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے آواز دی۔

عابد کے جسم میں معمولی سی حرکت پیدا ہوئی تھی۔ جمشید خان اس کے سینے پر جھک گیا۔ دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

''عابد...... عابد''۔ اس نے دوبارہ ذرا اونچی آواز میں پکارا۔

عابد کے ہونٹوں میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی اور پھر اس کے پھڑ پھڑاتے ہوئے ہونٹوں سے بہت ہی مدھم سی آواز برآمد ہوئی۔ ''ہا...... ں......''

جمشید خان کو یہ آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''میں...... میں آگیا ہوں عابد...... جمشید''۔ جمشید خان کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ سب کیسے ہوا۔ کس نے کیا؟ پلیز......''

''آ...... آپ...... بہت دیر سے...... آئے...... ہیں سر!'' وہ بہ دقت تمام بولا تھا۔

''مجبوری تھی عابد! ورنہ میں وقت سے پہلے پہنچ گیا ہوتا''۔ جمشید خان نے بے بسی کے عالم میں کہا۔ ''دراصل راستے میں ایک حادثہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میں لیٹ ہو گیا ہوں''۔

''مم...... مجھے...... مار ڈالو۔ بہت تکلیف...... ہو رہی...... ہے''۔ عابد نے کراہتی اور لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

جمشید خان تڑپ کر رہ گیا۔ عابد اس کا ماتحت ہی نہیں بلکہ بھائیوں جیسا دوست تھا۔ اس کی بے بسی دیکھ کر جمشید خان کی آنکھوں میں آنسو آگئے مگر یہاں ان ویران پہاڑوں میں وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

''حوصلہ رکھو دوست!'' وہ اسے جھوٹی تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک ہو جاؤ گے میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا''۔

عابد کی آواز بہت مدھم تھی اس لیے جمشید خان اس کے چہرے پر کچھ مزید جھک گیا۔ وہ اس کے لبوں سے نکلنے والی آواز سننے کی سعی کر رہا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اردگرد کے ماحول سے بھی



بے خبر نہیں تھا۔ سرسراتی ہوئی ہوا اور آسمان پر منڈلاتے ہوئے گدھ ماحول میں عجیب سی سنسنی پیدا کر رہے تھے۔

''تم کل رات سے یہاں ہو عابد''۔ وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں تو صرف نصف گھنٹا لیٹ ہوا ہوں۔ بتاؤ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے تمہارا یہ حال کر دیا؟''

''مم...... میں...... رات کو نہیں...... صبح سویرے...... یہاں پہنچا تھا''۔ اس نے جواب دیا۔

''سارا...... دن اس...... ویرانے میں...... بیٹھا رہا''۔

''تمہارے ساتھ درندگی کا یہ مظاہرہ کس نے کیا؟'' جمشید خان نے سوال کیا۔

''ہاں...... ں...... ہم......'' اس کی سانسیں اٹکنے لگیں۔

جمشید خان دوڑتا ہوا اس کی کار تک پہنچا اور پانی کی بوتل نکال لایا۔ بوتل کھول کر اس نے پانی کے چند گھونٹ اس کے حلق میں ٹپکا دیے۔ عابد کے دونوں رخسار نچے ہوئے تھے، پیٹ اور پہلوؤں سے بھی گوشت کو کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا تھا۔ پیروں کے دونوں انگوٹھے اور چند انگلیاں بھی جڑ سے کٹی ہوئی تھیں۔ اس کی پشت کے نیچے زمین پر خون جما ہوا تھا، یقیناً پشت پر بھی کوئی گہرا زخم موجود تھا۔ جمے ہوئے خون کے ساتھ عابد کا بدن زمین سے چپک گیا تھا۔

اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں متعدد بار خون ریزی کے مناظر دیکھے تھے مگر اس قدر درندگی اور سفاکی کا مظاہرہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ شاید انسان ہی نہیں تھے ورنہ اپنے جیسے ایک انسان کے ساتھ ایسا انسانیت سوز سلوک کبھی نہ کرتے۔

''بنگش''۔ جمشید خان دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''میں تیرے ساتھ وہ سلوک کروں گا جو آج تک کسی نے کسی کے ساتھ نہ کیا ہو گا۔ تیرا قتل مجھ پر واجب ہو چکا ہے''۔

''ہا...... ں...... ہا''۔ عابد خان تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔

جمشید خان ایک بار اس پر جھک گیا۔ ''یہ جو کچھ بھی ہوا اس کا ذمہ دار میں ہوں مگر تم تو یہاں اسلحہ کے اسمگلروں کی نگرانی کرنے کے لیے آئے تھے تاکہ ان کے ذریعے ان کے سرغنہ بنگش کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ سکو لیکن...... یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ تم ان کے ہاتھ کیسے لگ گئے؟''

''میں نے انہیں...... دیکھ لیا تھا''۔ عابد نے پوری توانائی صرف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''ان کا ٹرک اسلحے سے بھرا ہوا تھا۔ مگر بدقسمتی سے میں بھی ان کی...... نگاہوں سے...... پوشیدہ نہ رہ سکا...... ٹرک تو چلا گیا...... مگر ٹرک سے اترنے والے...... تین آدمی...... میرے تعاقب میں...... یہاں آگئے''۔ بمشکل وہ یہاں تک بتا پایا تھا کہ ایک بار پھر اس کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ جمشید خان نے

دوبارہ بوتل کھول کر اس کے حلق میں پانی ٹپکانا شروع کر دیا۔ پانی پینے سے اس کی طبیعت معمولی سی سنبھل گئی۔ تب جمشید خان کو وہ آگے کی روداد سنانے لگا۔

''دھوکے...... سے مم...... میں ان کے ہاتھ آ گیا۔ وہ مجھ سے...... میرے دوسرے ساتھیوں کے متعلق پوچھ...... رہے تھے...... ان کے خیال میں...... ہم نے تمام راستوں...... کی ناکابندی کر رکھی تھی...... مم...... میں نے انہیں...... کچھ بھی نہیں بتایا...... مم...... مگر یہ ضرور کہا تھا...... کہ تم لوگ...... جمشید خان کے ہاتھوں...... سے بچ نہیں پاؤ گے...... وہ قیامت تک...... تم لوگوں کا...... پیچھا نہیں چھوڑے گا''۔

''اوہ......'' جمشید خان تاسف سے سر ہلانے لگا۔ ''تم پر یہ تشدد کب کیا گیا تھا اور کیا تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟''

''ص...... صبح''۔ عابد خان بولا۔ ''مم...... مگر میں ان...... لوگوں کو...... پہچان نہ سکا، پر...... پر مجھے یقین ہے...... کہ وہ لوگ بنگش کے...... ہی آدمی تھے''۔

''مجھے فون پر پیغام تم نے ہی دیا تھا ناں؟'' جمشید خان نے الجھن آمیز انداز میں سوال کیا، کیونکہ اسے پیغام دوپہر سے کچھ دیر قبل ملا تھا اور عابد خان تو صبح سے ہی اسی حالت میں تھا۔

''نن...... نہیں''۔ اس نے کراہ کر جواب دیا۔

عابد خان کا جواب اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ اسے پہلے سے ہی یقین تھا کہ پیغام دینے والا کوئی اور تھا اور اس نے عابد کے لہجے کی بڑی بہترین نقالی کی تھی۔ مطلب اسے کسی خاص مقصد کے لیے دھوکے سے یہاں بلایا گیا تھا اور بلانے والے یقیناً بنگش یا اس کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔ اب لازمی طور پر وہ اس کی تاک میں ہوں گے۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ اپنی حماقت پر جھنجھلا اٹھا مگر پھر جلد ہی سنبھل گیا کیونکہ جھنجھلاہٹ ایسی تشویشناک صورتِ حال میں خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ ایک زیرک پولیس آفیسر تھا مگر اکیلا تھا اور سونے پر سہاگا یہ کہ اسلحے کے نام پر اس کے پاس صرف ایک ریوالور ہی تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ کچھ اور بھی چوکنا ہو گیا۔

''اسلحے والا ٹرک کس طرف گیا تھا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''وہ ٹرک شمالی پہاڑیوں میں رُوپوش ہو گیا تھا...... میں...... میں اس کا تعاقب ضرور کرتا لل...... لیکن......'' ایک بار پھر اس نے نڈھال ہو کر خاموشی اختیار کر لی۔ جمشید خان نے اسے تیسری بار پانی پلایا تھا۔

''مم...... مجھے...... بہت تکلیف ہو رہی ہے''۔ وہ بہ دقت تمام گویا ہوا۔ ''پلیز...... مم...... مجھے زندگی سے...... نجات دلا دو......'' اس کی آواز اب بالکل کمزور ہو چکی تھی۔



''نہیں......'' جمشید خان نے سر کو دائیں بائیں نفی کے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ ان شاء اللہ تم بہت جلد ٹھیک......''

''نہیں پلیز نہیں......'' وہ کراہ کر بولا۔ ''مجھے مت ہلانا۔ بہت درد ہوتا ہے''۔

اسے انتہائی بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں دیکھ کر جمشید خان کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے مگر یہ موقع آنسو بہانے کا نہیں تھا۔ دفعتاً سڑک کی جانب سے کسی ٹرک کی آواز سنائی دی اور جمشید خان چونک کر سیدھا ہو گیا۔

✣===✣===✣

ٹرک کی تلاش میں اس نے سڑک کی جانب نگاہیں دوڑائیں مگر سڑک وہاں سے بہت دور تھی۔ اسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

''آ...... آپ...... واپس چلے جائیں سر!'' عابد خان کے لبوں سے کانپتی سسکتی ہوئی آواز نکلی اور وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بمشکل کہہ رہا تھا۔ ''آپ...... بنگش کو کبھی مت چھوڑنا''۔

''میں...... میں وعدہ کرتا ہوں دوست''۔ وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولا۔ ''میں ایک روز اسے اپنے ہاتھوں سے موت کے گڑھے میں اتاروں گا۔ مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اس اسلحے والے ٹرک کو راستے والی پولیس چوکی میں کیوں نہیں روکا گیا۔ وہاں سے وہ کس طرح نکل آیا؟''

''غد...... غدار...... کک...... کالی بھیڑیں''۔ اس کے لبوں سے نحیف سی آواز نکلی۔

''میں تمہیں بے بسی کی موت نہیں مرنے دوں گا''۔ جمشید خان تڑپ کر بولا۔ ''ہر قیمت پر تجھے......''

''پلیز...... سر......'' وہ پوری توانائی صرف کرتے ہوئے انتہائی کمزور آواز میں بولا۔ ''مجھے مت ہلانا۔ بس یونہی رہنے دو۔ میں بس لمحوں کا مہمان ہوں...... کل...... کلثوم کو میرا سلام کہنا...... مگر اسے...... یہ مت بتانا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا''۔ جمشید خان تڑپ کر بولا۔ ''میں تجھے......''

''بس...... وقت...... آ گیا...... ہا...... ہے......'' یکایک عابد خان کی آواز ڈوب گئی اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی اب وہ تکلیف اور درد سے آزاد ہو چکا تھا۔

ایس پی جمشید خان اور انسپکٹر عابد خان کا ساتھ زیادہ پرانا نہیں تھا۔ تقریباً تین ماہ قبل ہی انہوں نے ابراہیم بنگش کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر کے سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا تھا مگر بنگش کے ہاتھ بہت لمبے تھے نہ صرف شہر کے کچھ معززین اس کے پشت پناہ تھے بلکہ محکمۂ پولیس کے چند غدار آفیسرز بھی اس کے ساتھ ملے ہوئے تھے جنہوں نے عدالتی کارروائی کے دوران بھرپور طریقے سے بنگش کا ساتھ دیا

تھا۔ بنگش دوسری ہی پیشی پر باعزت بری ہو کر باہر آ گیا تھا۔

اس دوران جمشید خان موسیٰ خان اور جہانداد والے معاملے میں الجھ کر رہ گیا تھا مگر عابد خان بدستور بنگش اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے پڑا رہا۔ دو دن قبل ہی جمشید خان کو یہ اطلاع ملی تھی کہ بنگش کا اسلحے سے بھرا ہوا ایک ٹرک پشاور کی طرف آ رہا ہے۔ یہ خفیہ اطلاع ملتے ہی جمشید خان نے انسپکٹر عابد خان کو بلا کر منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ محکمے کے دیگر اہلکاروں کو انہوں نے اس معاملے کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ اس کی وجہ غالباً محکمۂ پولیس کی وہ کالی بھیڑیں تھیں جو کھاتی سرکار کا تھیں مگر گاتی بنگش کا تھیں۔

ان کا منصوبہ یہ تھا کہ اسلحے والے ٹرک کی نگرانی کر کے بنگش کے خفیہ ٹھکانے کا سراغ لگایا جائے اور بعد میں اس خفیہ اڈے پر باقاعدہ ریڈ کر دیا جائے اور بنگش سمیت اس کے سب ساتھیوں کو پولیس مقابلے کے نام پر جہنم رسید کر دیا جائے۔ ٹرک کی نگرانی کی ذمہ داری عابد خان نے اپنے ذمہ لے لی تھی اور اس طرح اس کا جو انجام ہوا تھا وہ جمشید خان کے سامنے تھا۔ موت کے ان تاجروں کی رسائی شاید اسمبلیوں تک تھی ورنہ وہ اس قدر درندگی کا مظاہرہ کرنے سے قبل کئی بار سوچتے۔

چند لمحے وہ گھٹنوں کے بل عابد خان کی لاش کے قریب بیٹھا رہا مگر پھر اٹھ کر عابد خان کی کار کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے واسکٹ اور کار کے کاغذات باہر نکالے اور کھڑکیاں لاک کرنے کے بعد بلندی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک ٹیلے کے عقب میں اس کی جیپ موجود تھی۔ عابد خان کی لاش کو اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

سورج اگرچہ مغرب کی جانب جھک رہا تھا لیکن دھوپ کی تمازت میں ابھی تک شدت موجود تھی۔ چٹانیں تپ رہی تھیں، ہوا ساکت تھی جس کی وجہ سے ماحول میں گھٹن کا احساس رچ گیا تھا۔ وہ سُرعت کے ساتھ چلتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ گرمی اور چڑھائی کی وجہ سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ گردن سے بہنے والی پسینے کی دھاریں اس کے پورے بدن پر رینگنے لگی تھیں۔ ریوالور کو اس نے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

چند قدم مزید آگے کی طرف چلنے کے بعد وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ ٹیلے کے عقب میں کھڑی ہوئی اسے اپنی جیپ کی چھت نظر آ رہی تھی لیکن اس کے چونکنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کی جیپ کے عین پیچھے ایک گاڑی موجود تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ جب وہ نشیب میں تھا تو اس نے کسی گاڑی کی آواز سنی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد ہی اس کی سماعتوں سے ایک مردانہ آواز ٹکرائی۔ پھر دوسری مردانہ آواز اور اسی کے بعد فوراً ہی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔



اس نے اندازہ لگایا کہ ان کی تعداد تین ہے۔ ایک عورت اور دو مرد۔ وہ عام سی گفتگو کر رہے تھے اس لیے اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس نہ ہوا۔

''ممکن ہے یہ لوگ میری جیپ دیکھ کر اس طرف آ نکلے ہوں''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''شاید انہوں نے سوچا ہو گا کہ مجھے کسی مدد وغیرہ کی ضرورت ہو گی''۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ چٹانوں کی آڑ لیتا، دبے پاؤں چلتا ہوا وہ ان کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہ دو مرد اور ایک جوان لڑکی تھی۔ بظاہر وہ تینوں غیر مسلح نظر آ رہے تھے۔ تینوں باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی جیپ کی تلاشی لینے میں مصروف تھے اور بے ضرر سے لوگ لگتے تھے۔ وہ اس کی موجودگی سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے پیٹرول کا فاضل جیری کین، پانی کی بوتل اور دیگر چھوٹا موٹا سامان اٹھا کر اپنی وین میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے دونوں مرد سگریٹ پی رہے تھے مگر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے بو اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ دونوں مردوں میں سے ایک بھاری بھرکم جبکہ دوسرا بہت اسمارٹ اور ہیرو ٹائپ لگتا تھا۔

بھاری بھرکم مرد جیپ کے ڈیش بورڈ والے خانے سے جیسے ہی جیپ کے کاغذات نکال کر پلٹا۔ اچانک اس کی نظر جمشید خان پر پڑی اور اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پھیلتے چلے گئے۔

''اے...... دیکھو کون ہے؟'' اس نے اپنے ساتھیوں کو پکارا۔

وہ دونوں بھی پلٹ کر جمشید خان کی طرف دیکھنے لگے۔ تینوں کے چہروں پر شرمندگی جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی اور شاید اس بات کا افسوس بھی تھا کہ اب لوٹ کا مال ان سے واپس لے لیا جائے گا۔

لمبے قد والا جو ہیرو ٹائپ لگتا تھا۔ شکل سے کافی خطرناک نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے پتلون کی بیلٹ میں پھنسائے ہوئے کھڑا تھا۔ تینوں کے لباس اور جوتے ریت اور گرد میں اَٹے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے مہینوں سے انہوں نے پانی کی شکل تک نہ دیکھی ہو اور نہ ہی کبھی لباس دھونے کی زحمت گوارا کی ہے۔ لڑکی بھرے بھرے جسم کی مالک ہونے کے باوجود قدرے اونچے قد کی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ میلی کچیلی ہونے کے باوجود حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں حیرت اور شرارت کی ملی جلی کیفیت تھی۔

ایک ثانیہ جمشید خان کی طرف دیکھنے کے بعد وہ مسکرا دی۔ موٹے آدمی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ جیپ سے نکالے گئے کاغذات ابھی تک اس کے ہاتھوں موجود تھے۔

جمشید خان ان تینوں کو دلچسپی اور حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

''کیا یہ جیپ تمہاری ہے؟'' آخر کار لڑکی نے لب کشائی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''تو اور کیا......'' جمشید خان استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''کیا تم لوگوں نے ایسے لاوارث سمجھ لیا تھا؟''

''لو جی......اب یہ کھیل ختم ہی سمجھو''۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بولی۔ ''جیپ کا مالک آ گیا ہے اور کافی غصے میں دکھائی دیتا ہے''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ ایک بار پھر جمشید خان کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''اے مسٹر......'' وہ بالکل فلمی اسٹائل میں بولی۔ ''تمہاری جیپ اس ویرانے میں لاوارث کھڑی تھی۔ ہم سمجھے شاید تم کسی خرابی کی وجہ سے اسے یہاں چھوڑ کر جا چکے ہو''۔

''میڈم......'' وہ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ذرا نیچے تک گیا تھا اور تم لوگوں نے جیپ کو مالِ غنیمت سمجھ کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ویری سیڈ''۔

''ایم سوری مسٹر''۔ لڑکی نے نادم ہو کر کہا اور جمشید خان کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

لڑکی سے نظر ہٹا کر اس نے لمبے قد والے آدمی کی طرف دیکھا تو وہ بہت برہم نظر آ رہا تھا۔ وہ جمشید خان کو کینہ توز نگاہوں سے گھور رہا تھا شاید اسے لڑکی کا اظہارِ ندامت پسند نہیں آیا تھا تبھی وہ لڑکی سے اکھڑے ہوئے انداز میں مخاطب ہوا۔ ''کیوں بکواس کر رہی ہو ماریہ؟''

لڑکی کو ڈانٹ کر وہ جمشید خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''تم کون ہو مسٹر؟'' اس نے بدتمیزی سے پوچھا۔ ''اور یہاں اس ویرانے میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''یہی سوال میں تم لوگوں سے بھی پوچھ سکتا ہوں؟ بہر کیف میں ایک انسان ہوں بالکل تمہاری طرح کا''۔ جمشید خان نے جواب دیا تاہم اس نے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ ایک پولیس آفیسر بھی ہے۔

''ہم سمجھے تھے کہ شاید یہ جیپ لاوارث ہے''۔ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''بس یہی سوچ کر ہم یہ قدم اٹھا بیٹھے''۔

''اوکے......اب تو وارث پہنچ گیا ہے ناں؟'' وہ بولا۔ ''اس لیے تمام سامان دوبارہ جیپ کے اندر رکھ دو''۔

''ٹھیک ہے''۔ ماریہ نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی رکھ دیتے ہیں، لیکن غصہ مت کرو''۔

اتنا کہہ کر وہ لمبے قد والے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''عامر...... یہ تو بہت کڑک آدمی معلوم ہوتا ہے''۔

عامر نے کوئی جواب نہ دیا تاہم اس دوران اس کے موٹے ساتھی نے جیپ سے نکالا گیا



سامان نہایت بے دردی کے ساتھ دوبارہ جیپ کے اندر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ لڑکی نے کندھے اچکا کر ایک نظر جمشید خان پر ڈالی اور پھر لاتعلق سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

عامر نام کا شخص بدستور جمشید خان کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''وہاں نیچے کیا ہے؟'' چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس نے جمشید خان سے استفسار کیا۔

''ٹوٹے پھوٹے چند جھونپڑا نما مکان ہیں''۔ ایک ثانیہ کے وقفے کے بعد اس نے پوچھا۔

''کیا عامر تمہارا پورا نام ہے؟''

''عامر کمال ہے......مگر کیوں؟'' اس نے بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''بس......ایسے ہی''۔ جمشید خان نے اسی کے انداز میں کہا۔ ''کیا...... کچھ کرنے کا ارادہ ہے؟ مطلب ہیرو وغیرہ بننے کا کوئی پروگرام ہے تو یہ ناچیز حاضر ہے''۔

عامر کمال نے ایک نظر اس کے بیلٹ میں اڑسے ہوئے ریوالور پر ڈالی اور پھر قدرے خفیف انداز میں کہا۔ ''نہیں......تم غلط سوچ رہے ہو۔ میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے''۔

''گڈ......'' جمشید خان مسکرا دیا۔

ان تینوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد جمشید خان نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ امیر خاندانوں کے بگڑے ہوئے رئیس زادے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے بڑی بڑی ڈگریاں بھی حاصل کر رکھی ہوں اور شاید نشے کے بھی عادی ہوں۔ کیونکہ وطنِ عزیز میں ایسے مادر پدر آزاد خاندانوں کے چشم و چراغ اکثر سیر گاہوں اور ویرانوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

ماریہ نامی ان کی ساتھی لڑکی بھی جمشید خان کو اتنی معصوم نہیں لگ رہی تھی۔ جمشید خان کو یہ اندازہ قائم کرتے ہوئے بھی دیر نہیں لگی تھی کہ عامر کمال ہی ان کا لیڈر ہے۔ اس کے موٹے ساتھی نے سگریٹ زمین پر پھینکا اور اسے پاؤں سے مسلنے کے بعد ناک کھجانے لگا۔ ماریہ ایک بار پھر مسکراتی ہوئی نگاہوں سے جمشید خان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے سیاہ جینز کے اوپر ایک ڈھیلی سی گلابی شرٹ پہن رکھی تھی۔

''تم لوگ کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟'' آخر کار طاری سکوت کو توڑتے ہوئے جمشید خان نے سوال کیا۔

''ہم لاہور کے رہنے والے ہیں۔ یہاں پشاور میں رشتہ داروں کے ہاں آئے ہوئے ہیں''۔ موٹے نے بتانا شروع کیا۔ ''دراصل گھر سے ہم پکنک منانے کے لیے نکلے تھے مگر ماریہ کی غلطی کی وجہ سے راستہ بھول کر اس طرف آ نکلے''۔

''تمہارا نام؟'' جمشید خان نے پوچھا۔

''سعید اختر''۔اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں؟''ماریہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

جمشید خان کے پاس اگر سرکاری جیپ ہوتی تو یقیناً انہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت نہ پڑتی مگر آج وہ جس جیپ پر سوار ہو کر اس ویرانے میں پہنچا تھا وہ ایک عام سی جیپ تھی جو اس نے کچھ عرصہ قبل ہی خریدی تھی۔

''میں......'' ماریہ کو جواب دیتے ہوئے وہ بھی مسکرا دیا۔''میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور یہاں......''

ابھی اس کا جملہ نامکمل ہی تھا کہ اچانک عامر کمال نے اس پر چھلانگ لگا دی اور پھر چشم زدن میں اس کی بیلٹ سے ریوالور کھینچنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جمشید خان کو اس سے اس پھرتی کی توقع ہی نہیں تھی اور دوسری بات شاید یہ تھی کہ وہ انہیں عام سے لوگ سمجھنے کی غلطی کر چکا تھا۔

جمشید خان نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی تو عامر کمال ریوالور سیدھا کرتے ہوئے سرد لہجے میں غرایا۔''ایس پی جمشید خان! زیادہ چالاک بننے کی کوشش کی تو کھوپڑی اُڑا دوں گا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو، شاباش اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ''۔

جمشید خان نے اٹھنے میں ذرا سُستی کا مظاہرہ کیا تو سعید اختر نے آگے بڑھ کر اسے پاؤں کی ایک ٹھوکر رسید کر دی۔

''اٹھو......اور خاموشی سے اس نشیب کی طرف چلنا شروع کر دو۔ جہاں تمہارے ایک ساتھی کی لاش پڑی ہوئی ہے''۔ سعید اختر اسے دوسری ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بے رحمی سے بولا۔''چلو جلدی کرو ورنہ سینے میں گولی اتار دیں گے۔ اس ویرانے میں گِدھ اور جنگلی جانور تمہاری ضیافت اُڑائیں گے''۔

جمشید خان خون خوار نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر ریوالور کی زد میں ہونے کی وجہ سے چپ رہا۔

''چلو......'' عامر کمال نے ریوالور لہراتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی چالاکی دکھانے کے بارے میں سوچنا بھی مت ورنہ تمہاری بے گور و کفن لاش ان پہاڑوں میں پڑی گلتی سڑتی رہے گی''۔

جمشید خان چپ چاپ ان کے آگے آگے چل دیا۔ اس کے عقب میں عامر کمال تھا جس نے اسے ریوالور کی زد پر لے رکھا تھا۔ عامر کمال کے پیچھے ماریہ اور آخر میں سعید اختر روڈ رولر کی طرح سُست روی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔



وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے تنگ سی پگڈنڈی سے نشیب میں اُترنے لگے۔ کھنڈرات وہاں سے تین سوفٹ نیچے نشیب میں تھے۔ وہاں تک جانے کا یہی ایک راستہ تھا جس وہ اس وقت روانہ تھے۔ پگڈنڈی کے بائیں طرف عمودی ڈھلانیں تھیں اور دائیں جانب چٹان سی اٹھی ہوئی تھی۔ نیچے جانے کے لیے ایک اور بھی راستہ تھا مگر وہ بائیں جانب تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ وہ راستہ قدرے کشادہ تھا۔ جمشید خان کو یقین تھا کہ عابد اسی راستے سے کار لے کر نیچے نشیب میں پہنچا ہوگا۔ وہ افغانستان سے آنے والے اسلحہ سے بھرے ہوئے ایک ٹرک کا سراغ لگانے کے لیے اس طرف آ نکلا تھا مگر بدقسمتی سے بنگش کے آدمیوں کی نگاہوں میں آ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ وہ جمشید خان کو مرنے سے پہلے یہ بتا گیا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنانے والے تین لوگ تھے مگر اس نے کسی لڑکی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے اس وقت لڑکی اس کے سامنے نہ آئی ہو، کہیں چھپی رہی ہو تاہم جمشید خان کو کامل یقین تھا کہ عابد خان کے قاتل یہی لوگ ہیں، اگر یہ لوگ وہ نہیں تھے تو پھر انہیں یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی تھی کہ نیچے کھنڈرات میں میرے کسی ساتھی کی لاش پڑی ہوئی ہے

وہ سب نیچے اُتر کر کھنڈرات تک پہنچ گئے۔ چند قدم آگے بڑھ کر جمشید خان رک گیا۔ اس کا دماغ تیزی سے موجودہ صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ اسے کسی نہ کسی طرح ان لوگوں پر قابو پانا تھا۔ ایک تو یہ لوگ عابد خان کے مبینہ قاتل تھے اور دوسرا بنگش تک پہنچنے کے لیے بہترین مہرے ثابت ہو سکتے تھے۔

''آگے بڑھو''۔ اسے رکتے دیکھ کر سعید اختر اسے آگے کی طرف دھکے دیتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔''جہاں تمہارے بہادر ساتھی کی لاش پڑی ہوئی تمہارا انتظار کر رہی ہے''۔

وہ بغیر کوئی ردِعمل ظاہر کیے پھر آگے بڑھنے لگا۔ منہدم جھونپڑا نما مکانوں کے اوپر سے چکر کاٹتے ہوئے وہ مطلوبہ مقام تک پہنچ گئے جہاں عابد خان کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔

''جمشید خان!'' لاش کے قریب پہنچتے ہی عامر کمال پُر غرور انداز میں بولا۔''اپنے ساتھی کا انجام دیکھ لو۔ یہ سب بنگش سے پنگا لینے کا نتیجہ ہے، اب تم بھی بہت جلد اس کے پاس پہنچنے والے ہو۔ محکمۂ پولیس لاکھ سر پٹختا رہے اسے کبھی یہ معلوم نہیں ہوگا کہ دو مایہ ناز پولیس آفیسر کہاں غائب ہو گئے ہیں''۔

''اوہ......تو عابد خان کو تم لوگوں نے قتل کیا ہے؟''اس نے متاسف انداز میں سوال کیا۔

''تو اور کیا؟ کیا کوئی دوسرا شخص یہ جرأت کر سکتا ہے؟'' عامر کمال کندھے اچکا کر طنزیہ انداز

میں بولا۔ ''یہ نیک کام ہم لوگوں کے ذریعے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ کیا تمہیں بُرا لگا؟ سوری..... مگر ہمارا یہی اسٹائل ہے، گولی مار دینے سے کوئی خاص لطف نہیں آتا۔ مرنے والا فوراً مر جاتا ہے، نہ چیختا ہے نہ تڑپتا ہے اور نہ ہی کوئی فریاد کرتا ہے۔ قاتل کو ذرا بھی لطف نہیں آتا''۔

''تو تم لوگ بنگش کے ہی آدمی ہو؟'' جمشید خان نے نڈر انداز میں دوسرا سوال کیا اور پھر قہر آلود نگاہوں سے ان تینوں کو گھورنے لگا۔

''گڈ..... تم کافی ذہین لگتے ہو اور بہادر بھی''۔ عامر کمال مکروہ سی ہنسی ہنستے ہوئے زہریلے انداز میں بولا۔ ''تم لوگ بنگش کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچنا چاہتے تھے ناں؟ اب اوپر جا کر اس کا ٹھکانہ تلاش کر لینا۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہیں یہ اطلاع کیسے مل گئی کہ بنگش کا ٹرک مال لے کر آ رہا ہے۔ تمہارا یہ ساتھی اس ٹرک کا تعاقب کر کے بنگش کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچنا چاہتا تھا مگر مجھے افسوس ہے کہ یہ بے چارہ اڈے تک پہنچنے کی بجائے اوپر پہنچ گیا۔ بنگش کو یہ سن کر بہت زیادہ خوشی ہوگی کہ اس کے دو سب سے بڑے دشمن عدم آباد پہنچ چکے ہیں''۔

''تم جاگتے میں خواب دیکھ رہے ہو مسٹر عامر کمال''۔ جمشید خان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ذرا نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھو۔ موت تم لوگوں کے سروں پر پہنچ چکی ہے۔ تم لوگ پولیس کے گھیرے میں آ چکے ہو''۔

ان تینوں نے بیک وقت پلٹ کر اوپر گھاٹی کی طرف دیکھا تھا۔ جمشید خان کے لیے یہ وقت کم نہیں تھا۔ پلک جھپکنے کی دیر میں اس نے چیتے کی طرح اپنی جگہ سے جست لگائی اور عامر کمال کے ہاتھ سے ریوالور اچکتے ہوئے دوسری طرف نکل گیا۔

لمحہ بھر کے لیے تو عامر کمال اور اس کے ساتھی بھونچکا رہ گئے مگر پھر سعید اختر نے سب سے پہلے حرکت کی تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکال کر فائر جھونک دیا۔ گولی جمشید خان کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ جمشید خان تڑپ کر سیدھا ہوا اور فائر کرتے ہوئے کسی طاقتور اسپرنگ کے مانند اچھلتا ہوا ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار کی آڑ میں چلا گیا۔

وہ تینوں بھی کھنڈر کی ایک دیوار کے پیچھے چھلانگ لگا چکے تھے۔ جمشید خان کی چلائی ہوئی گولی سے وہ تینوں محفوظ رہے تھے۔ جمشید خان والا ریوالور چھننے کے بعد عامر کمال نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا تاہم ان کی ساتھی لڑکی ماریہ خالی ہاتھ تھی اس لیے وہ کھنڈروں کی آڑ لیتی ہوئی وہاں سے دور ہٹنے لگی۔

دوسرے ہی لمحے ویران پہاڑ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھے۔ عامر کمال اور اس کا ساتھی بے تحاشا گولیاں چلا رہے تھے، بکہ جمشید خان محتاط انداز میں فائر کر رہا تھا، وہ اپنی گولیاں ضائع نہیں کر



چاہتا تھا۔

ماریہ تیزی سے کھنڈروں کی آڑ لیتی ہوئی اپنے ساتھیوں سے دور ہٹ رہی تھی تاکہ فائرنگ کی زد سے محفوظ رہ سکے۔ دوسری طرف جمشید خان بھی کھنڈروں کی آڑ لیتا ہوا اوپر گھاٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شام کا اندھیرا چاروں طرف اپنے پر پھیلا چکا تھا۔ جمشید خان ایک دیوار کی آڑ میں لیٹا سینے کے بل آگے کی طرف رینگ رہا تھا۔ دیوار کے اختتام پر وہ رک گیا۔ اگلا کھنڈر وہاں سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ ہمت اور جرأت کی ضرورت تھی، ذرا سی غلطی اسے موت کے اندھیروں میں دھکیل سکتی تھی۔ تمام احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے سیکنڈوں میں حتمی فیصلہ کیا اور پھر دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر ریس میں دوڑنے والے کھلاڑیوں کی طرح پوزیشن لے لی اور پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑتے ہوئے دوڑ پڑا۔ ابھی اس نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ سعید اختر کی چلائی ہوئی گولی زناٹے کی آواز پیدا کرتے ہوئے اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ بال بال بچا تھا۔ دوسرا فائر ہونے سے قبل ہی وہ کھنڈر کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ دوسری گولی دیوار کے کونے پر لگی تھی۔ جمشید خان نے بھی سنبھل کر ان کی طرف فائر کر دیا مگر کسی قسم کا کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا یقیناً اس کی چلائی ہوئی گولی بھی ضائع گئی تھی۔

اب ایک بار پھر وہ ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ جمشید خان نے اِدھر اُدھر دیکھا، تاریکی مکمل طور پر پھیل چکی تھی۔ وہ جس راستے سے اس نشیب میں اُترے تھے وہ ان کھنڈرات سے ساٹھ ستر میٹر کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں چند چھوٹے بڑے ٹیلے تھے۔ نزدیک ترین ٹیلا بھی تقریباً پندرہ میٹر کی دوری پر تھا۔ جمشید خان کا دماغ برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ صورتِ حال بہت سنگین ہو چکی تھی۔ اس کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔ ریوالور میں صرف چار گولیاں باقی تھیں۔

''میں اگر ان سے پہلے کسی طرح اوپر پہنچ جاؤں تو بچ سکتا ہوں''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس وقت مکمل سکوت تھا اور یہ سناٹا یقیناً کسی طوفان کا پیش خیمہ تھا مگر جمشید خان اپنی زندگی داؤ پر لگانے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ ساٹھ ستر میٹر کا یہ فاصلہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر عبور کرنا ہی تھا۔ زندگی اس سے ستر میٹر کے فاصلے پر اس کی منتظر تھی لیکن درمیان میں ایک ایک قدم پر موت اپنے خونی جبڑوں کے ساتھ موجود تھی۔ وہی موت جو بڑے بڑے شہ زوروں کو چاروں شانے چت کر دیتی ہے۔

عامر کمال اور سعید اختر بھی اس کی نیت بھانپ چکے تھے۔ اس لیے وہ اس کا راستہ روکنے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ فضا پر ایک جان لیوا سکوت طاری تھا۔ جمشید خان ٹوٹی ہوئی دیوار کے عقب میں

دبکا خود کو پیش آئند حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ شام کے بعد کے ملگجے اندھیرے میں اسے اپنے دل کی دھک دھک واضح سنائی دے رہی تھی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے حصے میں کیا آنے والا ہے زندگی یا پھر موت؟

اس نے چند لمحے مزید انتظار کیا اور پھر ایک دیوار کی آڑ سے نکل کر قریبی ٹیلے کی طرف دوڑ لگا دی۔ فضا ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولیاں اس کے دائیں بائیں سے گزر رہی تھیں مگر وہ بھاگتا چلا گیا۔ ٹیلے کے نزدیک پہنچتے ہی اس نے جست لگائی اور دشمن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ وہ پورے قد کے ساتھ اس کے عقب میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر وہ یہ رسک لیتا تو دشمن باآسانی اسے نشانہ بنا سکتے تھے۔ چنانچہ وہ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

اس کے اوجھل ہوتے ہی فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ یوں ہی کرالنگ کے انداز میں آگے کی طرف رینگتے ہوئے وہ ٹیلے کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا۔ ریوالور کو اس نے احتیاط کے ساتھ داہنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ دوسرا ٹیلہ آٹھ دس میٹر کی دوری پر تھا مگر دشمن گھات میں تھے، انہیں معلوم تھا کہ اب وہ دوسرے ٹیلے کی آڑ لینے کی کوشش کرے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی موت کی یہ آنکھ مچولی نہ جانے کتنی دیر تک چلتی رہے گی؟ کسی کو تو آخر کار زندگی سے ہاتھ دھونا ہی پڑیں گے۔ دشمنوں کو یا پھر...... اس سے آگے کا سوچتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے تو وہ لرز کر رہ گیا۔ عابد خان کا عبرت ناک انجام وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ یہ بے ضرر سے نظر آنے والے لوگ کس قدر ظالم اور درندہ صفت تھے، اس کا اندازہ اسے اچھی طرح تھا۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ لڑتے ہوئے مارا جائے یا پھر انہیں جہنم رسید کر دے۔

اس نے لمحوں میں یہ حتمی فیصلہ کیا اور پھر اٹھ کر دوسرے ٹیلے کی طرف دوڑ لگا دی ایک بار پھر گولیاں اس کے دائیں بائیں اور سر کے اوپر سے گزر گئیں مگر وہ بحفاظت ٹیلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے اس بار بھی کوئی گولی اسے نہیں چھو سکی تھی۔ یہ ٹیلہ نسبتاً پہلے ٹیلے سے اونچا تھا اور اس کے عقب میں وہ بالکل محفوظ تھا مگر ایسا ہمیشہ کے لیے تو وہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کسی نہ کسی طرح اوپر اپنی جیپ تک پہنچنا ہی تھا۔ درمیان میں صرف ایک ٹیلہ حائل تھا اس کے بعد وہ باآسانی اوپر اپنی جیپ تک پہنچ سکتا تھا۔ فاصلہ صرف تیس چالیس گز کا تھا لیکن دشمن بھی اس کی تاک میں تھے۔ وہ حتی الوسع اس کے فرار کی راہیں مسدود کر رہے تھے۔

اچانک اسے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے اچک کر ٹیلے کے اوپر



سے دیکھا تو ان دونوں میں سے ایک بھاگتا ہوا اوپر گھاٹی والے راستے کی طرف جا رہا تھا۔ جمشید خان نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے اس پر فائر جھونک دیا مگر گولی خطا گئی تھی۔ اس نے دوبارہ ٹرائیگر دبایا تو صرف ''ٹرچ'' کی آواز سن کر اپنی جگہ پر سن ہو کر رہ گیا۔ ریوالور خالی ہو چکا تھا اور پریشان کن بات یہ تھی کہ اس کے پاس نہ تو فاضل گولیاں تھیں اور نہ ہی کوئی دوسرا ہتھیار۔ ایک عبرت ناک موت کے تصور نے وقتی طور پر اس کے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ صورتِ حال اس کی توقع سے کہیں زیادہ خطرناک ہو چکی تھی تاہم زندگی بچانے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

اس نے جلدی سے خالی ریوالور بیلٹ میں اڑس لیا اور پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ٹیلے سے چند قدم دور ایک خندق نما کھڈ سا بنا ہوا تھا اور یہ کھڈ بھی اوپر گھاٹی والے راستے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اس کھڈ میں چھپتے چھپاتے اوپر پہنچ سکتا تھا مگر وہ کھڈ بھی دشمنوں کی نگاہوں میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس نے سوچا کہ خود کو ان کے حوالے کر دے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ محض اسے اغوا کرنے پر ہی اکتفا کر لیں مگر پھر فوراً ہی اس نے اپنا یہ بزدلانہ فیصلہ منسوخ کر دیا۔ قانون کا محافظ ہو کر مجرموں کے سامنے سرنڈر کرنا اسے زیب نہیں دیتا تھا۔ اس نے ایک بار اچک کر ٹیلے کے اوپر سے گھاٹی والے راستے کی جانب دیکھا تو راستے کے عین درمیان میں عامر کمال کو موجود پایا۔ اسے اس کے قد کاٹھ کی وجہ سے وہ باآسانی پہچان گیا تھا۔

اب کھڈ میں کودنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھا اور عین اسی لمحے ٹیلے کے اوپر سے ایک ہیولا سا نمودار ہوا۔

''خبردار!'' فضا میں سعید اختر کی مکروہ آواز گونجی۔ ''ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا ورنہ میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔ ہمیں معلوم ہے تمہارا ریوالور خالی ہو چکا ہے۔ بس اب تمہارے ڈرامے کا The End ہونے والا ہے''۔

جمشید خان نے کوئی جواب دینے کی بجائے کھڈ کی طرف چھلانگ لگا دی اور سعید اختر نے ریوالور کا ٹرائیگر دبا دیا۔

===•===•

اس روز دوپہر کا کھانا جہانداد اور جمشید خان نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ جمشید خان نہ صرف کھانے سے قبل متفکر نظر آ رہا تھا بلکہ کھانے کے دوران بھی وہ چپ چپ رہا تھا۔ اس سے قبل ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی جہانداد نے کبھی اسے اس قدر متفکر پایا تھا۔ اس کی یہی سنجیدگی جہانداد کو کھٹک گئی اور وہ چپ نہ رہ سکا۔

''میں کافی دیر سے یہ بات نوٹ کر رہا ہوں''۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''آپ بہت زیادہ فکر مند نظر آ رہے ہیں۔ کیا کوئی مسئلہ ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے''۔ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم کھانا کھا کر آرام کرو۔ میری واپسی تک گھر سے مت نکلنا، ہوسکتا ہے میں آج رات واپس نہ لوٹ سکوں''۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔

''ہاں۔ میں ابھی کھانا کھا کر روانہ ہو جاؤں گا''۔

''کہاں؟''

''یہ بتانا میں غیر ضروری سمجھتا ہوں''۔ وہ بدستور سنجیدگی سے بولا۔ ''میرا تعلق محکمۂ پولیس کی کرائم برانچ سے ہے۔ کسی بھی وقت کہیں بھی میری ضرورت پڑ سکتی ہے''۔

''ایک بات کہوں؟'' اس نے اجازت طلب انداز میں پوچھا۔

''کہو'' مختصر سا جواب ملا۔

''مجھے بھی ساتھ لے جائیں''۔

''کیوں؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔ ''تم کیا کرو گے میرے ساتھ چل کر۔ میں کوئی سیر و تفریح کے لیے تو نہیں جا رہا ہوں''۔

''اسی لیے تو میں آپ کا ساتھ دینا چاہتا ہوں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''ورنہ سیر و تفریح کے لیے تو میں خود بھی جا سکتا ہوں''۔

''سوری جہانداد!'' وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک سیکرٹ مشن پر جا رہا ہوں، تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ ہمیں سرکاری رازوں کی حفاظت کرنا پڑتی ہے اور یہ معاملہ تو ویسے بھی بہت زیادہ سیکرٹ ہے، اسی لیے تو میں اکیلا جا رہا ہوں ورنہ کسی پولیس کے آدمی کو ساتھ لے جاتا''۔

''آپ کو کسی عابد خان نامی پولیس انسپکٹر نے بلایا ہے ناں؟'' جہانداد نے برا منائے بغیر استفسار کیا۔

''کیا تمہیں الہام ہوا ہے؟'' وہ قدرے سخت انداز میں بولا۔ ''کون ہے انسپکٹر عابد خان میں تو یہ نام پہلی مرتبہ سن رہا ہوں''۔

''اس نے فون کیا تھا''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''وہ پشاور سے دور کسی غیر آباد پہاڑی علاقے میں آپ کا منتظر ہے''۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس احمق نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا؟''

''ہاں''۔ اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر ایسا شاید غلط فہمی کی بنا پر ہوا؟ دراصل میری ''ہیلو'' سنتے ہی وہ بغیر کچھ پوچھے ہی شروع ہو گیا تھا''۔



''تو پھر اسے میرے آفس میں فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' جمشید خان نے استفسار کیا۔

''میں نے اسے بتا دیا تھا کہ آپ گھر میں نہیں ہیں''۔ جہانداد نے بتایا۔ ''یہی وجہ ہے کہ اس نے آپ کے آفس میں فون کر دیا ہوگا''۔

''عابد خان جو حماقت کر چکا ہے، سو کر چکا ہے''۔ وہ حتمی انداز میں بولا۔ ''مگر میں ایسی حماقت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس معاملے کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا''۔

''تعلق تو بہت گہرا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''ابراہیم بنگش، سردار فراست علی خان کا ہی آدمی ہے، اس کے ایما پر وہ یہ مذموم تجارت کر رہا ہے''۔

''ہوسکتا ہے تمہارا اندازہ درست ہو''۔ جمشید خان بولا۔ ''مگر یہ قانون اور جرم کی جنگ ہے۔ تم کیوں مفت میں اپنی جان گنوانا چاہتے ہو؟''

''یہ اندازہ نہیں ہے''۔ وہ اصرار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''بلکہ میں موسیٰ خان کی زبانی کئی بار ابراہیم بنگش کے متعلق سن چکا ہوں۔ وہ تو مجھے اس سے ملوانے والا تھا مگر اس سے پہلے ہی میں نے ان سے قطع تعلق کر لیا''۔

''سوری''۔ وہ حتمی انداز میں بولا۔ ''تمہاری سب باتیں میں سچی مان سکتا ہوں مگر تمہیں کسی بھی قیمت پر ساتھ نہیں لے جا سکتا''۔

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جمشید خان فوراً جیپ لے کر روانہ ہو گیا تھا۔

جہانداد اس کی موجودگی میں ہی ایک حتمی فیصلہ کر چکا تھا چنانچہ اس کے نکلنے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ جونہی جمشید خان کی جیپ کوٹھی کے صدر دروازے سے باہر نکلی جہانداد لپک کر اپنی جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ جمشید خان کے تعاقب میں روانہ ہو چکا تھا۔

وہ بڑے محتاط انداز میں جمشید خان کا تعاقب کر رہا تھا۔ شہر کی مصروف شاہراہوں سے گزرتے ہوئے جمشید خان ایک بڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ یہ سڑک سیدھی مغرب کی جانب رہنمائی کر رہی تھی۔ غیر مصروف شاہراہ ہونے کی وجہ سے جہانداد نے جیپ کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے درمیانی فاصلہ بڑھا دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جمشید خان اپنے تعاقب سے آگاہ ہو جائے۔ دونوں جیپوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ سڑک پر ٹریفک بہت کم تھا تاہم اکا دکا بڑی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ جن میں زیادہ تر مال بردار ٹرک اور آئل ٹینکر تھے۔

جہانداد برابر اس کی جیپ پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ اچانک اسے عقب سے ہارن سنائی دیا

اور پھر ایک آئل ٹینکر ''زن'' کی آواز سے اسے کراس کرتے ہوئے گزر گیا۔ جہانداد نے خود کلامی کے انداز میں آئل ٹینکر کے ڈرائیور کو برا بھلا کہا اور پھر دوبارہ اپنی توجہ سڑک پر مرکوز کر دی۔ درمیان میں آئل ٹینکر آجانے کی وجہ سے اب جمشید خان کی گاڑی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد آئل ٹینکر جمشید خان والی گاڑی کو اوور ٹیک کرتے ہوئے ایک موڑ گھوم گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے جمشید خان کی جیپ بھی موڑ مڑتے ہوئے غائب ہو گئی۔ جہانداد کے سامنے اب موڑ تک سڑک بالکل سنسنان پڑی ہوئی تھی۔ اس نے جیپ کی رفتار کچھ اور کم کر دی تھی، ایسا اس نے احتیاطاً کیا تھا تاکہ جمشید خان کو اپنے تعاقب کا شک نہ ہو سکے۔

جس وقت وہ موڑ کے قریب پہنچا عین اسی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس نے میکانکی انداز میں جیپ کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ جیپ سے اتر کر وہ بھاگتا ہوا موڑ کے دوسری جانب پہنچ گیا۔ سامنے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر آئل ٹینکر اور ایک مال بردار ٹرک متصادم حالت میں نظر آگئے۔ آئل ٹینکر سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ مخالف سمت سے آنے والی چند چھوٹی گاڑیاں بھی رکی ہوئی تھیں اور لوگ آئل ٹینکر اور ٹرک کے عملے کی مدد کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر دلچسپی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ سڑک تقریباً بلاک ہو چکی تھی۔ وقتی طور پر وہ جمشید خان کے تعاقب کو فراموش کر بیٹھا تھا اور یہی اس کی غلطی تھی جب اچانک اسے وہاں جمشید خان کی گاڑی نظر نہ آئی تو وہ الٹے قدموں اپنی جیپ کی طرف بھاگا۔

جیپ کو اسٹارٹ کرنے کے بعد وہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جائے حادثہ تک پہنچ گیا۔ اس وقت تک راستہ بالکل بلاک ہو چکا تھا۔ تھوڑی بہت کوشش اور لوگوں کی منت سماجت کر کے اس نے نکلنے کا راستہ تو بنا لیا مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ جمشید خان کی گاڑی کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا حالانکہ آگے میلوں تک سڑک بالکل ایک ہی سیدھ میں جا رہی تھی، کہیں کوئی موڑ وغیرہ نہیں تھا۔

یہ بات اس کے لیے پریشان کن تھی اس لیے گاڑی کے ایکسلیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ تقریباً پندرہ بیس کلومیٹر آگے جا کر سڑک ویران اور سنگلاخ پہاڑوں میں داخل ہو گئی۔ وہ اردگرد دیکھتا جا رہا تھا کہ شاید کہیں جمشید خان کی جیپ نظر آجائے مگر شاید اسے زمین کھا گئی تھی یا پھر آسمان نگل چکا تھا۔ ایک کلومیٹر آگے جا کر اس نے بائیں ہاتھ گاڑی کو ایک پتھریلے راستے پر اتار دیا۔ فون کرنے والے نے اسے کچھ ایسا ہی پیغام دیا تھا کہ وہ کہیں پہاڑوں کے دامن میں موجود ہے۔ گو کہ وہ فون جمشید خان کے لیے کیا گیا تھا مگر اتفاقاً اس نے سن لیا تھا۔ نشانی کے طور پر پیغام دینے والے نے فون کے ایک کھمبے کے متعلق بھی بتایا تھا مگر وہاں اسے دور دور تک فون کا کوئی کھمبا نظر نہیں آ رہا



تھا۔ جیپ کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ پہاڑوں کے اندر گھستا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آگے راستہ مسدود ہو گیا۔

اس نے جیپ کو وہیں ایک چٹان کی آڑ میں روکا اور انجن آف کرنے کے بعد نیچے اُتر گیا۔ اس کے پاس لوڈر یوالور موجود تھا مگر احتیاطاً اس نے وہ روسی کلاشنکوف بھی جیپ کی عقبی سیٹ کے نیچے سے نکال لی تھی جو چند روز پہلے اس نے چور بازار سے خریدی تھی۔ وہاں سے تین پگڈنڈی نما راستے نکل رہے تھے۔ ایک راستہ سیدھا آگے، دوسرا دائیں ہاتھ اور تیسرا بائیں جانب جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا اور پھر سیدھا آگے بڑھ گیا۔ اس وقت قہر کی گرمی تھی۔ سورج جیسے آگ برسا رہا تھا اور اوپر سے لُو بھی چل رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد وہ پسینہ پسینہ ہو گیا مگر ایسے حالات کا وہ عادی تھا اپنی عسکری زندگی میں وہ اس سے کہیں زیادہ کڑے موسم سے گزر چکا تھا۔ وہ گرمی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

جمشید خان کا سراغ ڈھونڈنے کے لیے کبھی کبھار وہ آس پاس کی چٹانوں پر بھی چڑھ کر دیکھ لیتا تھا مگر دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھول بھلیوں جیسے پہاڑ تھے، اگر وہ سمت کا اندازہ نہ رکھتا تو اس کے بھٹک جانے کا خطرہ تھا۔ آخر کار ڈیڑھ گھنٹے کی ناکام کوشش کے بعد وہ واپس اپنی جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ جیپ سے بوتل نکال کر اس نے پانی پیا اور چند لمحے ستانے کے بعد دائیں طرف جانے والے راستے پر چل پڑا۔ یہ راستہ قدرے دشوار گزار تھا اردگرد کانٹے دار پودے اور جھاڑیاں اس کے لباس کے ساتھ الجھ رہی تھیں مگر وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ سورج اس وقت تک مغرب کی جانب جھک چکا تھا مگر دھوپ کی تمازت بدستور موجود تھی اس کی گردن سے بہنے والا پسینہ رینگتا ہوا اس کی ریڑھ کی ہڈی تک پہنچ رہا تھا۔ جھاڑیوں سے بچتے الجھتے ہوئے وہ ایک کھلی نشیبی جگہ پر پہنچ گیا، زمین ریتلی تھی، کہیں کہیں درخت بھی موجود تھے۔ جگہ تقریباً وادی نما تھی اردگرد جنگلی گھاس کے قطعات بھی تھے۔ وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

چلتے چلتے وہ ایک ٹیلے کے قریب پہنچ گیا۔ دفعتاً اس کی سماعتوں سے ایک ایسی آواز ٹکرائی جیسے کوئی چرواہا ریوڑ کو ہانکتے ہوئے نکالتا ہے۔ ''ہاؤ...... ہش...... چھا......'' کی یہ آوازیں سن کر وہ تیزی سے ٹیلے کے اوپر پہنچ گیا۔ تقریباً تیس چالیس گز دور اسے ایک چرواہا نظر آگیا جو بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے مخالف سمت جا رہا تھا۔

''اے سنو!'' جہانداد نے تیزی سے نیچے اترتے ہوئے اسے بلند آواز میں پکارا۔

اپنے عقب میں آواز سن کر چرواہا پیچھے کو پلٹا اور پھر متحیر انداز میں جہانداد کی طرف دیکھنے لگا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے کندھے سے رائفل اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی (صوبہ سرحد میں چرواہے

عموماً مسلح رہتے ہیں۔)

جہانداد بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔اس کے سانسیں چڑھی ہوئی تھیں اور چرواہا بدستور اسے حیرانی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

''تم نے یہاں آس پاس کچھ لوگوں کو دیکھا ہے کیا؟'' جہانداد نے بلاتمہید اس سے سوال کیا۔

''نہیں دیکا''۔ چرواہے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔اس کی وضع قطع اور بولنے کے انداز سے جہانداد کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ افغانی ہے۔

''تمہاری بستی کدھر ہے؟'' جہانداد نے دوبارہ پوچھا۔

''وہ اُدر پہاڑوں کے پیچھے''۔اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔''تم کدر سے آیا اے؟''

''میں پشاور سے آیا ہوں''۔ جہانداد بولا۔''دراصل میں وہ راستہ ڈھونڈنا چاہتا ہوں جو ان پہاڑوں سے ہو کر تمہارے وطن کی طرف جاتا ہے۔میرا بھائی ٹرک ڈرائیور ہے اور اسی راستے پر اس کا ٹرک کہیں رکا ہوا ہے۔کیا تم مجھے وہ راستہ بتا سکتے ہو؟''

''اوہ......خدائی خوار!'' چرواہا تاسف کے انداز میں بولا۔''وہ تو اُدر سے بوہت دور ہے...... تمارا پاس گاڑی ماڑی اے؟''

''ہاں ہے''۔ جہانداد نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔''اوپر کھڑی ہے''۔

''پھر تو ٹیک اے''۔ وہ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔''گاڑی میں سیدھا پکا سڑک پر پہنچ جاؤ اور پھر آگے کی طرف سفر کرو۔ جہاں راستے میں پھون کا کھمبا نظر آئے ،بس وہیں سے بایاں طرف اندر کو راستہ جاتا ہوگا۔تم کو پھون کا کھمبا اور بھی نظر آئے گا مگر وہ کھمبا ایک اونچے ٹیلے پر لگا ہوگا''۔

''شکریہ''۔ کہہ کر جہانداد واپس پلٹنے لگا تو اس نے دوبارہ آواز دی۔

''پانی پیے گا؟'' اس نے پُرخلوص انداز میں پوچھا اور جہانداد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چرواہے نے کندھے سے چمڑے کا مشکیزہ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ جہانداد نے سیر ہو کر پانی پیا اور ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی جیپ کی طرف روانہ ہو گیا۔اوپر پہنچ کر اس نے جیپ کو اسٹارٹ کیا اور واپس پختہ سڑک کی طرف رخ کر لیا۔

پختہ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے گاڑی کا ایکسیلیٹر دبا دیا۔طاقتور جیپ چنگھاڑتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ جس وقت وہ مطلوبہ فون کے کھمبے تک پہنچا اس وقت سورج بس لمحوں کا مہمان رہ گیا تھا۔ کھمبے کے ساتھ ہی بائیں جانب ایک کشادہ پتھریلا راستہ پہاڑوں کے اندر جا رہا تھا۔ وہ اسی راستے پر جیپ آگے بڑھاتا چلا گیا۔تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد اسے ایک ٹیلے کی آڑ میں



ایک کی بجائے دو گاڑیاں کھڑی نظر آ گئیں۔ان میں سے ایک گاڑی کو تو اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا وہ جمشید خان کی جیپ تھی جبکہ دوسری گاڑی ایک سفید رنگ کی بند وین تھی۔

دونوں گاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر اس نے جیپ روک دی اور کلاشنکوف اٹھا کر نیچے اتر گیا۔ ابھی وہ ارد گرد کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دور سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے اس لیے گونجتی ہوئی فائرنگ کی آواز سے صحیح سمت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بہرکیف اندازے سے وہ ایک سمت منتخب کر کے آگے بڑھنے لگا۔ جب وہ ڈھلانی پگڈنڈی تک پہنچا تو ایک بار پھر فائرنگ شروع ہو گئی، اب کہ فائرنگ کی آواز بالکل واضح تھی۔اس کی سمت بھی معلوم ہو گئی تھی، وہ نیچے نشیبی علاقے سے آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے نیچے اترنے لگا، اس وقت تک سورج غروب ہو چکا تھا اور چاروں طرف ملگجا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا تاہم ابھی تک اتنی روشنی موجود تھی کہ آدمی پہچانا جا سکتا تھا اور جمشید خان کو تو اس کے قدوقامت کی وجہ سے وہ بیسیوں لوگوں کے مجمع میں شناخت کر سکتا تھا۔

نیچے نشیب میں اترتے ہی وہ بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ چٹانوں اور ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں آگے بڑھنے لگا، یہاں تک کہ وہ ان کھنڈرات کے نزدیک پہنچ گیا جہاں عامر کمال اور سعید اختر، جمشید خان سے زندگی اور موت کی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کمانڈو انداز میں آگے کی طرف سرک رہا تھا تاہم اس کی نگاہیں بڑی باریک بینی کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات اور ان کے ارد گرد موجود ٹیلوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

پھر دفعتاً اسے ایک شخص تیزی سے بھاگتا ہوا نظر آ گیا۔ جو ایک ٹیلے کے عقب سے نکل کر دوسرے ٹیلے کے پیچھے روپوش ہو گیا تھا۔ کھنڈرات کی آڑ سے اس پر فائرنگ بھی کی گئی تھی مگر شاید چلائی گئی گولیاں خطا ہو گئی تھیں۔ فائرنگ کے فوراً بعد اسے ایک قدآور شخص دکھائی دیا جو بھاگتا ہوا اوپر کی جانب جا رہا تھا۔

''شاید یہ گھاٹی والے راستے پر گھات لگانے کے لیے جا رہا ہے''۔ جہانداد نے دل ہی دل میں اندازہ قائم کیا اور دوبارہ اس ٹیلے کی جانب متوجہ ہو گیا جس کے عقب میں اس کے خیال کے مطابق جمشید خان روپوش ہو گیا تھا، پھر اچانک اسے ایک بھاری بھرکم شخص نظر آ گیا جو بے پاؤں اسی ٹیلے کی جانب بڑھ رہا تھا جس کے عقب میں جمشید خان غائب ہوا تھا۔ جہانداد کو ان کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں تھا تاہم اتنا اسے معلوم تھا کہ جمشید خان کے ساتھ صرف عابد خان نامی ایک ہی انسپکٹر ہے، گو کہ عابد خان اس کے لیے اجنبی تھا مگر رسک لیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ وہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر غیر محسوس انداز میں موٹے شخص کے پیچھے چل پڑا۔ ٹیلے کے نزدیک پہنچتے ہی موٹے نے چند لمحوں کے

لیے توقف کیا اور پھر تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹیلے کے اوپر پہنچ گیا۔ اس کا جوش وخروش دیکھ کر جہانداد نے فوراً کلاشنکوف کو سنگل پوزیشن پر کرنے کے بعد اس کی ٹانگوں کا نشانہ باندھ لیا۔

''خبردار!'' اچانک موٹے کی مکروہ آواز گونجی۔ ''ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا ورنہ میں بے دریغ گولی چلا دوں گا، ہمیں معلوم ہے تمہارا ریوالر خالی ہو چکا ہے۔ بس اب تمہارے ڈرامے کا The End ہونے والا ہے''۔

اتنا کہنے کے بعد موٹے نے فوراً ریوالور والا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کے بعد ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے تھے۔ موٹا چیختا ہوا ٹیلے کے دوسری جانب لڑھک گیا اور جہانداد بھاگتا ہوا ٹیلے کے اوپر پہنچ گیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی موٹے کی داہنی ٹانگ میں لگی تھی، وہ ٹانگ کو پکڑے کراہ رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی جہانداد پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو ورنہ بھون ڈالوں گا۔ تمہارے سب ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں''۔

سعید اختر کی چلائی ہوئی گولی جمشید خان کے کان کے قریب سے گزر گئی تھی۔ کھڈ میں گرتے ہی اس کی سماعتوں سے سعید اختر کی چیخ ٹکرائی تھی تاہم اس نے فوراً کھڈ سے باہر آنے کا رسک نہ لیا مگر جب اسے جہانداد کی آواز سنائی دی تو وہ میکانکی انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر کھڈ سے باہر آ گیا۔ اس وقت تک جہانداد سعید اختر کا ریوالور اپنے قبضے میں کر چکا تھا۔ سعید اختر بدستور کراہ رہا تھا۔ اس کے نزدیک پہنچتے ہی جمشید خان نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ شاید عابد خان کے دردناک انجام نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس ویرانے میں چاروں طرف سعید اختر کی چیخیں گونجنے لگیں مگر جمشید خان کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا شاید وہ اسے جان سے مار ڈالنا چاہتا تھا۔

''پلیز سر!'' آخر کار جہانداد کو مداخلت کرنا پڑی۔ ''اس کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں سوچیں۔ ایک تو میں نے دیکھا بھی ہے وہ اوپر گھاٹی کی طرف بھاگ رہا تھا''۔

''ہاں وہی ایک حرام زادہ رہ گیا ہے''۔ جمشید خان ہانپتے ہوئے بولا۔ ''اس کے ساتھ صرف ایک لونڈیا ہے مگر وہ خالی ہاتھ ہے۔ آج میں ان تینوں کو یہاں زندہ دفنا کر جاؤں گا''۔

''اسے میں دیکھتا ہوں۔ آپ اسے سنبھالیں''۔ جہانداد نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''بہتر ہوگا اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیں''۔

''او کے...... تم جاؤ، میں اسے اُدھر کھنڈروں کے عقب میں لے جا رہا ہوں۔ وہاں رسی موجود ہے''۔ جمشید خان نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے''۔ جہانداد بولا۔ ''آپ یہ ریوالور رکھ لیں۔ یہ اسی کا ہے''۔

''ریوالور سے زیادہ مجھے خنجر کی ضرورت پڑے گی''۔ اس نے زہریلے انداز میں کہا۔ ''مجھے پتا ہے تمہاری پنڈلی کے ساتھ خنجر بندھا ہوا ہے''۔



جہانداد نے فوراً جھک کر پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا خنجر نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''او کے...... اب تم جاؤ''۔ جمشید خان بولا۔ ''میں تمہیں اُدھر کھنڈروں کے عقب میں ملوں گا۔ کوشش کرنا ان دونوں کو زندہ پکڑنے کی۔ وہ دونوں بنگش کے اہم مہرے ہیں۔ لڑکی کا نام ماریہ ہے جبکہ مرد کا نام عامر کمال ہے لیکن یہ نام فرضی بھی ہو سکتے ہیں اور خیال رکھنا وہ دونوں لومڑی سے بھی زیادہ چالاک ہیں کسی قسم کا رسک مت لینا۔ اگر زندہ ہاتھ نہ لگیں تو بے شک گولیوں سے اُڑا دینا''۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں''۔ وہ پُرعزم انداز میں بولا۔ ''میں انہیں فرار ہونے کا موقع نہیں دوں گا''۔

اس کے بعد جہانداد دبے پاؤں اوپر گھاٹی کی طرف بڑھ گیا اور جمشید خان، سعید اختر کو کھینچتے ہوئے کھنڈروں کے جانب روانہ ہو گیا۔

عامر کمال اس ٹیلے سے بہت دور اُوپر گھاٹی والے راستے پر گھات لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس تک فائرنگ کی آواز ضرور پہنچی تھی لیکن شاید وہ اپنے ساتھی کی چیخوں کی آواز نہیں سن سکا تھا ورنہ اب تک راہِ فرار اختیار کر چکا ہوتا۔ ماریہ کا کوئی پتا نہیں تھا کہ کس کونے میں جا چھپی ہے۔ عامر کمال نہ صرف راستے پر نظریں جمائے ہوئے تھا بلکہ وہ ماریہ کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ ان دونوں کی آپس میں اچھی خاصی دوستی تھی اور اکثر ایک دوسرے کی رفاقت سے راتوں کو رنگین بناتے رہتے تھے۔

جہانداد بہت محتاط انداز میں اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں اس نے عامر کمال کو چھپتے ہوئے دیکھا تھا۔ کلاشنکوف کو اس نے فائرنگ پوزیشن میں پکڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا مگر اتنی دیر تاریکی میں رہنے کی وجہ سے جہانداد کو کافی فاصلہ تک دکھائی دے رہا تھا۔ چڑھائی کے قریب پہنچتے ہی اس نے سیدھا آگے جانے کی بجائے ایک لمبا چکر کاٹا اور پھر راستے کے دائیں جانب سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ یہ بہت دشوار گزار کام تھا مگر وہ ایک تربیت یافتہ سولجر تھا، بارہا ایسی صورتِ حال سے گزر چکا تھا۔ بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ حتی الوسع وہ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بچ کر چل رہا تھا۔ اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے نیچے گرنے والا کوئی بھی پتھر اوپر چھپے ہوئے دشمن کو ہوشیار کر سکتا تھا۔ دن والی گرمی اب نہیں رہی تھی موسم بڑی حد تک خوشگوار ہو چکا تھا مگر اوپر پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں نہا گیا۔

ایک بڑے پتھر کی آڑ لے کر وہ بالکل راستے کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا مگر وہاں سے عامر کمال نظر نہیں آتا تھا۔ شاید وہ بھی کسی آڑ کے پیچھے تھا۔ جہانداد کا دماغ تیزی سے موجودہ صورتِ حال پر غور

کر رہا تھا۔ دشمن کو سامنے لانے کے لیے کسی چال کی ضرورت تھی۔ اندھا دھند اوپر جانے میں جان کا خطرہ تھا کیونکہ دشمن کی طرح وہ بھی مکمل اندھیرے میں تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کونے میں چھپا بیٹھا ہے؟

اِک ذرا توقف کے بعد اس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا لیا۔ غالباً وہ پتھر پھینک کر دشمن کو سامنے لانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے پتھر پھینکنے کے لیے ہاتھ اٹھا لیا مگر عین اسی لمحے اوپر سے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور اس نے اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے آہستگی سے پتھر اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

''شاید وہ فرار ہو رہا ہے''۔ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر پھر ایک دم چونک پڑا کوئی راستے کے عین درمیان میں بھاگتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔ اس کے پاس سوچنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ وہ تیزی سے پتھر کی آڑ سے نکلا اور بھاگتے ہوئے شخص کے نچلے دھڑ پر فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور بھاگتا ہوا شخص چیخ مار کر زمین بوس ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ زخمی شخص کو سنبھلنے کا موقع ملتا۔ جہانداد بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''خبردار!'' جہانداد اس کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے خونخوار انداز میں بولا۔ ''تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو''۔

''تت ...... تم ......'' اتنا کہہ کر اس نے کراہنا شروع کر دیا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے داہنے کولہے کو ٹٹول رہا تھا غالباً جہانداد کی چلائی گئی گولی نے بہت غلط مقام منتخب کیا تھا اور دوسرا ہاتھ خالی تھا۔ اس کا ریوالور کہیں گر چکا تھا۔

''میں خدائی فوجدار ہوں''۔ اس کی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے جہانداد نے کہا۔ ''چلو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ بدن میں لاتعداد سوراخ کر دوں گا''۔

''مم ...... میں ...... نہیں ...... اُٹھ ...... سکتا''۔ وہ بدستور کراہ کر بولا۔ ''مم ...... میری مدد کرو''۔

''ٹھیک ہے مسٹر عامر کمال! مگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ آنکھ قبر میں جا کر کھلے گی''۔ اتنا کہنے کے بعد جہانداد اسے سہارا دینے کے لیے اس پر جھک گیا اور یہی اس کی غلطی تھی۔

عامر کمال نے اتنی پھرتی سے اس کی کلاشنکوف پر ہاتھ ڈالا تھا کہ جہانداد کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اِدھر جہانداد جھٹکا کھا کر منہ کے بل گرا اور اِدھر عامر کمال کلاشنکوف تھام کر چشم زدن میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ ہے عامر کمال کا کمال''۔ وہ پُرغرور انداز میں بولا۔ ''فوراً اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ



کلاشنکوف کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا''۔

''میں داد دیتا ہوں تمہاری ہوشیاری کی''۔ جہانداد تیزی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک......'' اس سے آگے کی بات عامر کمال نہیں سن سکا تھا۔ جہانداد کے ہاتھ سے گولی کی سی تیزی سے نکلنے والا پتھر سیدھا اس کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔ جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ وہ سنبھل نہ سکا اور پشت کے بل گر پڑا، کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ زخمی چہرے پر رکھ لیے تھے۔

جہانداد نے برق رفتاری سے آگے بڑھ کر کلاشنکوف اٹھا لی اور پھر عامر کمال کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ راستہ ڈھلانی تھا اس لیے اس کی ہر ٹھوکر کے ساتھ عامر کمال نشیب کی طرف لڑھکتا جا رہا تھا۔ اس ویرانے میں اس کی گونجنے والی چیخیں دور دور تک جا رہی تھیں مگر جہانداد کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی وہ بدستور اسے تواتر سے ٹھوکریں لگاتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ یونہی لڑھکتے ہوئے عامر کمال نیچے ہموار زمین تک پہنچ گیا۔ جہانداد نے اسے گدی سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور پھر سرد انداز میں کہا۔ ''بلا چوں چراں کھنڈروں کی طرف چلنا شروع کر دو۔ جہاں بھی تمہارے قدم رکے وہیں تمہاری سانسیں بھی رک جائیں گی''۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق عامر کمال اس کے آگے آگے چل پڑا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں کھنڈرات کے عقب میں پہنچ گئے جہاں جمشید خان نے سعید اختر کو اسی درخت کے تنے سے باندھ رکھا تھا جس کے ساتھ انہوں نے عابد خان کو باندھا تھا۔ عابد خان کی لاش چند قدم دور رکھی ہوئی تھی جبکہ سعید اختر اس کا تشدد برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش ہو چکا تھا۔ جمشید خان کے ہاتھوں میں لہولہان خنجر موجود تھا۔ عامر کمال کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور پھر پلک جھپکنے کی دیر میں اس نے خنجر عامر کمال کے بازو میں گھونپ دیا۔ ویران و سنگلاخ پہاڑ اس کی کربناک چیخ سے گونج اٹھے مگر جمشید خان نے کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے خنجر ایک جھٹکے سے واپس کھینچا اور پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

''مجھے تم جیسے درندوں پر بالکل رحم نہیں آتا۔ بول تم نے عابد خان کو کس طرح مارا تھا؟'' جمشید خان اس کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے غرایا۔ ''بول ورنہ اس خنجر سے ایک ایک کر کے تیری آنکھیں نکال دوں گا۔ یہاں اس ویرانے میں تجھے چھڑانے کے لیے تیرا باپ بنگش نہیں پہنچ سکتا''۔

''تت ...... تم ...... تم''۔ عامر کمال درد کی شدت سے کراہ کر بولا۔ ''بنگش کے انتقام سے کبھی بھی نہیں بچ سکو گے۔ وہ تمہیں تمہارے گھر میں گھس کر کتے کی موت مار ڈالے گا''۔

''فی الحال تو تم خود کتے کی موت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ''۔ جمشید خان زہریلے انداز میں بولا۔ ''اس کے بعد بنگش کی باری بھی آ جائے گی''۔

''تم...... بہت پچھتاؤ گے''۔ وہ وارننگ کے سے انداز میں بولا۔ ''بنگش کی پہنچ''۔

''اسلام آباد کے ایوانوں تک ہے''۔ جمشید خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں، دیکھ سکتا ہوں۔ سوچ سکتا ہوں مگر گولی اندھی بہری اور گونگی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اس کا رخ جس کے سینے کی طرف ہے اس کی پہنچ اقتدار کے ایوانوں تک ہے۔ بس ایک دفعہ میں بنگش تک پہنچ جاؤں پھر اسے وہاں تک پہنچا دوں گا جہاں سے آج تک کوئی بھی لوٹ کر واپس نہیں آیا''۔

''بھ...... بھول...... ہے تمہاری''۔ عامر کمال، ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جا...... گے ہوئے خواب دیکھ رہے ہو''۔

''میں اکثر سچے خواب دیکھتا ہوں''۔ جمشید خان نے اسے گریبان سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب میں اس خنجر سے تمہارے اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کروں گا جیسے قصائی ذبح کیے ہوئے بکرے کے کرتا ہے''۔

''شوق سے کرو''۔ وہ اس عالم میں بھی استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''بنگش کے ٹھکانے سے صرف میں واقف ہوں۔ میری مدد کے بغیر تم اسے قیامت تک نہیں ڈھونڈ سکتے''۔

''تم اپنی خیر مناؤ''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''تم پر ابھی قیامت ٹوٹنے والی ہے''۔

اتنا کہہ کر اس نے عامر کمال کے دوسرے بازو میں خنجر گھونپ دیا۔ شدتِ تکلیف سے وہ حلق کے بل دھاڑا، اس کی چیخ بہت طویل تھی دیر تک پہاڑوں میں گونجتی رہی۔

''میرے خیال میں تو ہم یہاں وقت ضائع کر رہے ہیں''۔ جہانداد نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ساتھی لڑکی شاید فرار ہو گئی ہے اوپر سے میں نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بنگش کے غنڈوں کی فوج لے کر یہاں پہنچ جائے''۔

''یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔

''آپ ان کے ساتھ مصروف تھے تو میں نے سوچا کہ چپ رہوں، آپ کو غصہ اتارنے دوں''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''مگر اب دیر ہوتے دیکھ کر بولنا پڑ گیا''۔

''میرا غصہ بے جا نہیں ہے''۔ وہ افسردہ ہو گیا اور انسپکٹر عابد خان کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو ان درندوں نے عابد کے ساتھ کیا کیا؟ کتنی بے رحمی کے ساتھ اسے اذیت پہنچا کر انہوں نے قتل کیا ہے۔ زمانۂ جہالت تو کیا پتھر کے دور میں بھی لوگ اس قدر درندگی کا مظاہرہ نہیں کیا کرتے تھے''۔



''تھانے پہنچ کر بھی ان کے ساتھ نمٹا جا سکتا ہے''۔ جہانداد بولا۔ ''یہاں اس ویرانے میں زیادہ دیر ہمارے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی ہے''۔

''نہیں''۔ جمشید خان نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں انہیں تھانے لے جانے والی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ ان کے ناجائز باپ بنگش کی پہنچ بہت اوپر تک ہے، وہ انہیں با آسانی چھڑا لے گا۔ اس بار میں بنگش سے لڑنے کے لیے قانون کا سہارا نہیں لوں گا۔ بلکہ اب یہ میری اور بنگش کی ذاتی لڑائی بن چکی ہے۔ بنگش کو ان کی گرفتاری سے لاعلم رکھنا ہے''۔

''کیا ان کی ساتھی لڑکی بنگش کو بتا نہیں دے گی کہ اس کے ساتھیوں کو ایس پی جمشید خان نے پکڑ لیا ہے؟'' جہانداد نے سوال کیا۔

''شوق سے بتاتی رہے''۔ وہ اطمینان سے بولا۔ ''بنگش کے بندے جب تھانے میں نہیں ہوں گے تو وہ میرے خلاف اوپر سے کوئی بھی مدد حاصل نہیں کر سکے گا اور نہ ہی کوئی اعلیٰ سرکاری اہلکار مجھے مجبور کر سکے گا۔ میرے پاس جواز ہو گا کہ بندے تھانے میں نہیں ہیں''۔

''ایسی صورتِ حال میں انہیں کہاں رکھیں گے؟'' جہانداد نے پھر سوال کیا۔ ''کون ان پر پہرہ دے گا؟''

''شہر میں میرا ایک فلیٹ خالی پڑا ہوا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''ان دونوں کو وہیں رکھیں گے اور تم ان کے ساتھ رہو گے۔ اس طرح تم قانون کی مدد کر کے رعایت حاصل کر سکو گے''۔

''مجھے انکار نہیں ہے''۔ وہ بولا۔ ''مگر میں ماں اور بہن کو چھڑانے کے لیے واپس جانے کا تہیہ کر چکا ہوں''۔

''او کے...... اس موضوع پر بعد میں بات کر لیں گے۔ فی الحال یہاں سے نکلنے کی تیاری کرتے ہیں''۔ جمشید خان نے جواب دیا اور جہانداد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔



دوسرے دن جمشید خان کو تھانے پہنچے ابھی ڈیڑھ گھنٹا ہی گزرا تھا کہ ٹیبل پر پڑے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس وقت وہ ایک فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا لہٰذا اس نے فون کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ فائل ابراہیم بنگش کے سیاہ کارناموں پر مشتمل تھی جسے اس نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ اس فائل میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی تھے جو اقتدار کی بلند و بالا مسندوں پر براجمان تھے اور عوام میں بے حد مقبول تھے۔ ان کے خلاف ایکشن لینا بظاہر ناممکن تھا مگر جمشید خان ایک سر پھرا پولیس آفیسر تھا۔ اس لیے تو اس نے آج تک شادی بھی نہیں کی تھی حالانکہ پورے چالیس برس کا ہو گیا تھا۔ دراصل وہ بیوی بچوں کو انسانی کمزوریوں میں شمار کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ مجرم ان کے ذریعے سے اسے

بلیک میل کر سکیں۔ وہ تو اپنی ماں اور گونگی بہن میمونہ کو بھی کڑی نگرانی میں رکھتا تھا تاکہ مجرم کوئی مذ قدم نہ اٹھا سکیں۔

بنگش اور اس کے ان آقاؤں کو انجام تک پہنچانا اس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا۔ ا جنگ میں انسپکٹر عابد خان اس کا بہترین اور جان نثار ساتھی رہا تھا مگر اب تو وہ بھی نہیں رہا تھا۔ مجرم نے اسے بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا تھا۔ اب ایک بار پھر وہ اس جنگ میں تنہا رہ گیا تھا۔ گو وقتی طور پر اسے جہانداد کا سہارا تھا مگر جہانداد خود ایک مجرم تھا اس کے ہاتھ کئی لوگوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ شاید وقت آنے پر وہ کوشش کے باوجود جہانداد کو قانون کی گرفت سے نہیں بچا سک تھا تاہم وہ جہانداد کو سبز باغ دکھا کر استعمال ضرور کر سکتا تھا۔ اس سے جھوٹے وعدہ کر سکتا تھا کہ قانو کی مدد کرنے کے صلے میں اس کے سارے جرائم معاف ہو جائیں گے۔ مگر وہ ایک سچا اور باضم پولیس آفیسر تھا اس لیے جہانداد کو طفل تسلیاں دے کر استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا البتہ دل ہی دل میں ا یہ تہیہ کر چکا تھا کہ بنگش اور اس کے حواریوں کو عبرت ناک انجام تک پہنچانے کے بعد جہانداد کی مد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد فون ایک بار پھر گنگنا اٹھا۔ اس نے فائل سے نظریں اٹھا کر فون کو گھورا ا پھر برا سا منہ بناتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔

''یس''۔ ریسیور کو کان سے لگا کر اس نے بیزاری سے کہا۔

''خان صاحب! اب ایسی بھی کیا مصروفیت کہ بندہ فون بھی نہ سن سکے''۔ دوسری طرف سے اسے ایک جانی پہچانی آواز سنائی اور وہ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ پیرزادہ فضل شاہ تھا، صوبائی اسمب کا ممبر بلکہ جب سے اس نے سیاست میں قدم رکھا تھا بدستور اسمبلی کا رکن ہی چلا آ رہا تھا۔ اس نے آ تک الیکشن نہیں ہارا تھا۔ پیر ہونے کی وجہ سے اس کے ہزاروں اندھے عقیدت مند صوبہ بھر میں پھیلے ہوئے تھے جو ہر بار اسے کندھوں پر بٹھا کر اقتدار کے اونچے ایوانوں تک پہنچا دیتے تھے۔

''خان صاحب! نصیب دشمناں کہیں آپ کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے؟'' اس کی سماعتوں سے دوبارہ پیرزادہ فضل شاہ کی آواز ٹکرائی تو وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

''کیسے یاد فرمایا تھا شاہ صاحب؟'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی لہجے میں عقیدت سمو ہوئے پوچھا۔

''بھئی آپ جیسے آفیسروں کو یاد تو رکھنا پڑتا ہے''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ورنہ ہمار سیاست کو کون پوچھے گا؟''

''حکم کریں شاہ صاحب؟'' وہ شاندار اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ناچیز آ



کے لیے کیا خدمت سرانجام دے سکتا ہے؟''

''خان صاحب! خدمت کہاں کی؟'' اس نے مکاری سے جواب دیا۔ ''بس ایک گزارش کرنا تھی اگر مزاج پر گراں نہ گزرے تو عرض کر دوں؟''

''توبہ توبہ شاہ جی''۔ وہ عقیدت بھرے انداز میں بولا۔ ''قبلہ! آپ کیوں اس گناہ گار کو مزید گناہ گار کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا ناں! حکم کریں۔ میں بھلا انکار کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟''

''وہ خان صاحب!'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ جمشید خان کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی سے ہدایت لے رہا ہو، ریسیور سے واضح آواز کی بجائے ہلکی ہلکی سمجھ میں نہ آنے والی سرگوشیاں اُبھر رہی تھیں۔

''فرمایئے شاہ صاحب! میں سن رہا ہوں''۔ ایک لمحہ توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''بلکہ ہمہ تن گوش ہوں''۔

''خان صاحب! کل رات آپ نے جو دو شریف انسان گرفتار کیے ہیں۔ میں انہی کے متعلق عرض کرنا چاہ رہا تھا''۔ آخر کار وہ مطلب کی بات پر آ ہی گیا۔

''شاہ صاحب! کیا آپ میری زبان پر اعتبار کریں گے؟'' جواب دینے کی بجائے اس نے الٹا سوال کر دیا۔

''کیسے نہیں کریں گے خان صاحب؟'' وہ بولا۔ ''آپ بتائیں تو سہی؟''

''کل رات میں بخار میں پھنکتا رہا ہوں۔ ایک پل کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکلا''۔ وہ جواز پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''اس بات کی آپ چاہیں تو میرے ڈاکٹر سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اس کا فون نمبر دے سکتا ہوں''۔

تھوڑی دیر کے لیے دوسری طرف بالکل خاموشی چھا گئی۔ جیسے وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے ہکا بکا رہ گیا ہو۔ ریسیور سے کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔

''کیا فون نمبر بتا دوں شاہ صاحب؟'' آخر کار اسے خود ہی استفسار کرنا پڑا۔ ''میرا فیملی ڈاکٹر آپ کو بتا دے گا کہ کل رات میری''۔

''نہیں...... نہیں خان صاحب!'' وہ جلدی سے قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے آپ کی زبان پر اعتبار ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں؟''

''بندہ پروری ہے آپ کی شاہ جی''۔ وہ عقیدت سے مرعوب انداز میں بولا۔ ''کبھی مشکل پیش آئی تو آپ کے در پر ہی حاضری دوں گا۔ میں تو ویسے بھی برسوں سے سرکار کا عقیدت مند چلا آ رہا

ہوں''۔

جمشید خان نے اپنی فطرت کے خلاف خوشامدی انداز اپنا کر اسے بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیا تھا۔ اس سے اسے دہرا فائدہ حاصل ہوا تھا، اب محکمہ پولیس کا کوئی اعلیٰ عہدے دار بھی اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس یہ جواز کافی تھا کہ بندے اگر میں نے گرفتار کیے ہوتے تو کیا پیرزادہ فضل شاہ جیسی ہستی کو میں انکار کرنے کی جرأت کر سکتا تھا؟

''میں حاضر ہوں خان صاحب!'' اس کی عقیدت کے پیشِ نظر شاہ جی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''پلیز میرے لائق کوئی خدمت ہے تو ابھی بتا دیں؟''

''نہیں شاہ جی! بس رہنے دیں۔ آپ کہاں تکلیف کرتے پھریں گے؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو اور بھی بہت سے کام کرنا پڑتے ہیں''۔

''خان صاحب!'' وہ شکایتی انداز میں بولا۔ ''یہ غیروں والی باتیں تو نہ کریں ناں؟ ہم نے آپ کو کبھی انکار کیا ہے؟ پلیز کام بتائیں؟''

وہ بڑے پُرخلوص انداز میں پوچھ رہا تھا لہٰذا جمشید خان نے موقع سے فائدہ اٹھانا ضروری خیال کرتے ہوئے کہہ دیا۔

''شاہ جی! جیسے کہ آپ کو معلوم ہے بندے میرے پاس نہیں ہیں۔ میں نے اگر انہیں گرفتار کیا ہوتا تو میں پیرومرشد کو کبھی بھی انکار نہ کرتا''۔ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا تو شاہ جی نے فوراً کہہ دیا۔

''بلا جھجک بولیے میں سن رہا ہوں''۔

''بس شاہ جی! میں اتنا چاہتا ہوں کہ اوپر سے مجھ پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے۔ جو کام میں نے کیا ہی نہیں''۔

''میں سمجھ گیا ہوں خان صاحب!'' وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''آپ بے فکر رہیں میرے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی پریشان نہیں کرے گا''۔

''بہت بہت شکریہ شاہ جی''۔ وہ احسان مندانہ انداز میں بولا۔ ''میں آپ کی یہ مہربانی ہمیشہ یاد رکھوں گا''۔

''کوئی بات نہیں خان صاحب!'' اس نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''اچھا خدا حافظ''۔ جمشید خان نے بھی خدا حافظ کہتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔



اُدھر علاقہ غیر میں موسیٰ خان اور خان جی کے لیے نصیب خان دردِ سر بنا ہوا تھا۔ اب ان دونوں کو اس کے پاگل پن کا یقین آ چکا تھا مگر پھر بھی وہ اسے اس کے حال پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں



تھے اور نہ ہی حویلی میں رکھ سکتے تھے۔ ہسپتال سے واپسی کے بعد موسیٰ خان نے اسے حویلی کے قید خانے میں بند کر دیا تھا لیکن اسی روز سہ پہر کے وقت اس نے فولادی دروازے کو ٹکر مار کر خود کو زخمی کر لیا تھا۔ پہرے دار اگر بروقت دروازہ کھول کر اسے باہر نہ نکالتے تو شاید وہ خود کو مار ہی ڈالتا۔

اس واقعے کے بعد خان جی کے حکم پر اسے حویلی میں آزاد پھرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا مگر وہ ہر دوسرے روز خود کو یا کسی دوسرے کو زخمی کر دیا کرتا تھا۔ وہ اسے مار بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ شمروز خان اور زرتاج والے واقعے کے بعد علاقے میں خان جی اور موسیٰ خان کے لیے نفرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ لوگ انہیں پیٹھ پیچھے ظالم اور سنگدل پکارنے لگے تھے۔

یہ صورتِ حال موسیٰ خان کے لیے بالعموم اور خان جی کے لیے بالخصوص پریشان کن تھی۔ علاقے کے لوگوں کی یہ ڈھکی چھپی نفرت اس کے سیاسی کیریئر کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ انہی لوگوں کے کندھوں پر بیٹھ کر وہ ہر دفعہ اسمبلی تک پہنچ جایا کرتا تھا اور انہی لوگوں کی نفرت اس سے اقتدار کی کرسی چھین سکتی تھی۔

موسیٰ خان اس کا دستِ راست تھا۔ خان جی بارہا اس سے اس موضوع پر بات کر چکا تھا لیکن موسیٰ خان الگ طبیعت کا انسان تھا وہ ہر مسئلے کا حل طاقت کے ذریعے نکالتا تھا۔ اس لیے خان جی کو مشورہ بھی ویسا ہی دیتا تھا یعنی تنگ کرنے والے کسی بھی انسان کو زمین کے اوپر نہ رہنے دیا جائے اور دشمن زمین کے اوپر نہیں بلکہ زیرِ زمین خاک کی ڈھیری کی صورت میں اچھا لگتا ہے۔ خان جی سیاسی دماغ رکھنے کے باعث اس کے ایسے مشوروں کو رد کر دیا کرتا تھا۔

اس روز بھی صبح کے دس بجے کے لگ بھگ باہر گارڈن میں خان جی اور موسیٰ خان اسی موضوع پر بات چیت کر رہے تھے۔ روز بروز بگڑنے والے حالات کی وجہ سے خان جی بے حد پریشان تھا اور موسیٰ خان اسے وہی من پسند مشورے دے رہا تھا۔

''خان جی!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہاں کے لوگ باقی دنیا سے الگ مزاج رکھتے ہیں، یہ صرف طاقت کی زبان سمجھنے والے لوگ ہیں۔ مجھے حکم کریں آج شام تک ایسے سب لوگوں کا قصہ پاک کر دوں گا۔ آپ بلا وجہ کی پریشانی کیوں مول لیتے ہیں؟ آپ کی اسی ڈھیل اور مصالحت پسندی کی وجہ سے علاقے کے لوگوں کے دلوں سے آپ کا ڈر اور خوف رفتہ رفتہ رخصت ہو رہا ہے، وہ پیٹھ پیچھے نہ جانے آپ کو کیا کیا کہتے پھر رہے ہیں؟ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں دیکھا جاتا، میری قوتِ برداشت اب جواب دیتی جا رہی ہے۔ کسی بھی وقت میرے سینے میں پکنے والا لاوا پھٹ سکتا ہے''۔ وہ ایک ثانیے کے لیے دم لینے کو رکا اور پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ''لوگوں کی اس نفرت کے پسِ پردہ جس شخص کا ہاتھ ہے، اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کمینہ علاقے کا کرتا دھرتا بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر آپ

نے اس کی سرگرمیوں کا نوٹس نہ لیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ کسی دن علاقے کے لوگوں کے جمِ غفیر کے ساتھ حویلی کے دروازے تک پہنچ جائے گا اور پھر شاید حالات ہمارے قابو میں نہ رہیں''۔

''تم شاید مولوی نصیب اللہ کی بات کر رہے ہو؟'' خان جی نے پوچھا۔ ''لیکن اس کے بارے میں تو پہلے تم مجھے کوئی اور مشورہ دے چکے ہو۔ کیا بھول گئے ہو؟''

''اچھی طرح یاد ہے''۔ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''مگر مولوی نصیب اللہ جیسے لوگ رعایت دیے جانے کا غلط مطلب نکالتے ہیں۔ اس وقت میں نے یہ سوچ کر اسے رعایت دینے کی بات کی تھی کہ شاید وہ راہِ راست پر آجائے گا لیکن اب حالات کچھ اور ہیں۔ ہماری خاموشی کو شاید ہماری بزدلی پر محمول کر رہا ہے۔ اب اسے ٹھکانے لگانا نہایت ضروری ہو گیا ہے ورنہ حالات مزید خراب ہوتے جائیں گے''۔

خان جی نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں مگر فی الحال اس بات کے حق میں نہیں ہوں۔ اس وقت مجھے ایک اور پریشانی کا سامنا ہے''۔

''کون سی پریشانی خان جی؟'' اس نے چونک کر استفسار کیا۔

''ابراہیم بنگش کی طرف سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں بھی حالات خراب ہو چکے ہیں۔ ایس جمشید خان ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جہانداد بھی اس جنگ میں بھرپور طریقے سے اس کی مدد کر رہا ہے۔ جمشید خان کی وجہ سے اب افغانستان کے راستے اسلحہ لانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ جمشید خان نے بنگش کے دو اہم آدمی بھی گرفتار کیے ہیں مگر انہیں تھانے میں رکھنے کی بجائے کسی خفیہ مقام پر رکھا ہوا ہے۔ میں نے پیرزادہ فضل شاہ کے ذریعے ان بندوں کی رہائی کے لیے کوشش کی ہے لیکن جمشید خان لومڑی کی طرح چالاک نکلا، نہ جانے اس نے شاہ جی کو کیسی پٹی پڑھائی کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ بنگش کے آدمی جمشید خان نے گرفتار ہی نہیں کیے، بنگش خواہ مخواہ اس پر الزام لگا رہا ہے''۔ خان جی نے جواب دیا۔

''خان جی!'' پوری تفصیل سننے کے بعد موسیٰ خان بولا۔ ''یہ سب مسائل مصالحت سے ہونے والے نہیں ہیں۔ ہمیں طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ یہاں بھی اور پشاور میں بھی۔ ورنہ حالات بہت بگڑ جائیں گے''۔

''میں طاقت کا استعمال کرنا جانتا ہوں''۔ خان جی نے کہا۔ ''مگر اپنا سیاسی مستقبل داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں ہوں''۔

''خان جی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا نام کسی بھی معاملے میں نہیں آئے گا''۔ پُرزور انداز میں بولا۔ ''آپ کی سیاسی زندگی ذرا بھی متاثر نہیں ہوگی۔ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ میں



......''

''نہیں موسیٰ خان!'' اس نے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے قطع کلامی کی۔ ''تمہیں لوگ میرے حوالے سے جانتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ تم میرے لیے کام کرتے ہو۔ تم جو کچھ بھی کرو گے نام میرا لیا جائے گا''۔

''تو خان جی! پھر آپ ہی بتائیں میں کیا کر سکتا ہوں؟'' موسیٰ خان نے متاسف انداز میں سوال کیا۔

''فی الحال تو تم پشاور جانے کی تیاری کرو''۔ وہ بولا۔ ''بنگش بہت پریشان ہے۔ اس کی ڈھارس بندھاؤ، یہ نہ ہو کہ اس کی بزدلی کی وجہ سے ہمارا لاکھوں، کروڑوں کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ میں تمہیں شاہ جی کے نام ایک خط بھی لکھ دیتا ہوں اور اسے فون پر بھی تمہارے متعلق سب کچھ بتا دوں گا، وہ ہر ممکن تمہاری مدد کرے گا۔ یہاں کے فرائض زرولی سنبھال سکتا ہے اور پھر میں بھی تو یہاں ہوں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے خان جی...... لیکن......''

''لیکن...... کیا!'' اس نے درشت انداز میں پوچھا۔

''یہاں کے حالات بہت ابتر ہیں خان جی''۔ وہ بولا۔ ''مجھے اس مولوی نصیب اللہ کا کوئی مناسب بندوبست کر کے ہی جانا ہوگا''۔

''احمقانہ باتیں مت کرو موسیٰ خان!'' اس نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''وہ دو ٹکے کا مولوی میرا کیا بگاڑ لے گا؟ میں اسے آج یا کل حویلی میں بلوا کر اس سے بات کروں گا۔ اگر سیدھے طریقے سے نہ مانا تو......''

عین اسی لمحے حویلی کے صدر دروازے پر لوگوں کا شور سنائی دیا اور خان جی کی بات ادھوری رہ گئی۔

''دیکھو...... یہ باہر کیسا شور ہے؟'' اس نے موسیٰ خان کو حکم دیا اور موسیٰ خان عجلت میں اٹھ کر حویلی کے صدر دروازے کی طرف روانہ ہو گیا۔

---

حویلی کے صدر دروازے پر کوئی ڈھائی تین سو لوگ موجود تھے ان میں سے اکثر مسلح تھے اور وہ سب خان جی اور موسیٰ خان کے خلاف نعرہ بازی کر رہے تھے۔ موسیٰ خان کو دروازے سے باہر آتے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے وہ چپ ہو گئے مگر پھر فوراً نعرہ بازی شروع کر دی۔ ''زرتاج کا قاتل...... موسیٰ خان، زرتاج کا قاتل...... موسیٰ خان...... ہمیں انصاف چاہیے...... ہمیں انصاف چاہیے''۔

ہجوم کے پُر جوش نعرے دور دور تک جا رہے تھے۔ موسیٰ خان چند لمحے تو انہیں قہر آلود نگاہوں سے گھورتا رہا مگر ہجوم بہت زیادہ تھا یہاں اس کا رعب نہیں چلنے والا تھا اس لیے وہ گزارشانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''دیکھو تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، زرتاج کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس نے خودکشی کی ہے۔ تم لوگ اس کی تصدیق ہسپتال جا کر ڈاکٹر سے کر سکتے ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ جواب طلب نگاہوں سے ہجوم کی طرف دیکھنے لگا۔

''ڈاکٹر بھی تم لوگوں کا چمچہ ہے۔'' ہجوم کے آگے کھڑے ہوئے مولوی نصیب اللہ نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''وہ وہی کرے گا جو تم لوگ چاہو گے۔''

''مولوی صاحب! ڈاکٹر سرکاری ملازم ہے۔'' وہ بولا۔ ''کوئی خان جی کی حویلی میں کام کرنے والا ملازم نہیں ہے؟ آپ کیوں خواہ مخواہ ایک ایماندار اور شریف انسان پر الزام لگا رہے ہیں؟ کیا آپ کو اپنی عاقبت کی کوئی فکر نہیں ہے؟''

''عاقبت کی فکر تم لوگوں کو نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہجوم کی طرف پلٹا۔ ''کیوں بھائیو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔'' ہجوم میں سے کئی لوگوں نے آواز بلند کی اور مولوی نصیب اللہ دوبارہ موسیٰ خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم لوگ کب تک خدا کی زمین پر خدا کے بندوں کا لہو بہاتے رہو گے؟'' وہ خطابت کے سے انداز میں بولا۔ ''خدا کے قہر سے ڈرو، جس دن اس کی لاٹھی حرکت میں آ گئی اس زمین پر تم لوگوں کو کہیں بھی امان نہیں ملے گی۔ جو سلوک شمروز خان کے ساتھ کیا گیا ہے، مہذب دنیا میں اس کی مثال کہیں بھی نہیں ملے گی۔ پھر اس کی بیوہ کو بھی مار دیا گیا اور اب بے چارہ نصیب خان بھی تم لوگوں کے رحم و کرم پر ہے۔ بچے گا وہ بھی نہیں۔ مگر اب ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم آزاد پیدا کیے گئے ہیں کوئی ہمیں غلام بنا کر نہیں رکھ سکتا۔''

اتنا کہہ کر اس نے ایک بار پھر ہجوم کی طرف رخ کر لیا۔ ''کیوں بھائیو! میں نے ٹھیک کہا ہے ناں؟'' اس نے جواب طلب انداز میں پوچھا۔ ''کیا ہم غلام ہیں ان کے؟''

''ہم آزاد ہیں۔'' بہت سے لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''اور اپنے فیصلے خود کریں گے۔''

''اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے ساتھ ہے۔'' مولوی نے خوش ہو کر کہا۔ ''ظالموں کے خلاف علم جہاد بلند کرنا کار عظیم ہے، اللہ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ حق کبھی مانگنے سے نہیں ملتا بلکہ چھین کر لینا پڑتا ہے۔''

''ہم لڑیں گے اپنے حق کی خاطر۔'' لوگوں نے پُر جوش آواز میں کہا۔ ''ہم زرتاج کے قاتل



سے بدلہ لیں گے۔''

صورت حال موسیٰ خان کے لیے ایک دم ناقابل برداشت ہو گئی تھی مگر اس جم غفیر کے سامنے وہ کوئی بھی ایسی کارروائی نہیں کر سکتا تھا جس سے ہجوم کو مزید مشتعل ہونے کا موقع ملتا لہٰذا وہ مصلحانہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

''مولوی صاحب!'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آپ کو اگر خان جی سے کچھ شکایت ہے تو آپ اس سے مل کر اسے بتا سکتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علاقے اور علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لیے خان جی کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہ تو اپنے بزرگوں کے وقت سے ان لوگوں کے خدمت گار چلے آ رہے ہیں۔ اسمبلی میں بیٹھ کر بھی وہ انہی لوگوں کے حقوق کے لیے کاوشیں کرتے رہتے ہیں۔'' ایک ثانیہ خاموش رہنے اور لوگوں کا ردِعمل دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''چلیے...... میں ابھی خان جی سے آپ کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔ آپ ان کے سامنے اپنے مطالبات یا تحفظات پیش کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کی سنیں گے اور سن کر مانیں گے۔''

''نہیں۔'' مولوی نصیب اللہ نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں کوئی پاگل نہیں ہوں کہ شیر کی کچھار میں گھس جاؤں؟''

''واہ مولوی صاحب واہ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ ان لوگوں کے سامنے جہاد کے فضائل بیان کر رہے تھے اور اب آپ کو جہاد کی بجائے اپنی جان عزیز ہو گئی ہے؟ یہ معصوم لوگ جو آپ کو ایک عالم اور مجاہد سمجھتے ہیں، آپ کی امامت میں نمازیں ادا کرتے ہیں۔ آپ ان کے سامنے ہی اپنی کی گئی تقریر سے انحراف کر رہے ہیں؟ اس دوغلے پن کا یہ لوگ کیا مطلب لیں گے مولوی صاحب! کیا آپ کو خدا کی بے آواز لاٹھی سے ڈر نہیں لگتا؟ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ، کیا اسی کو مسلمانی کہتے ہیں؟'' موسیٰ خان باتیں کرنے میں ماہر تھا۔ لمحوں میں اس نے بازی الٹا دی تھی۔

مولوی کا حمایتی ہجوم اب خاموشی کے ساتھ مولوی کی طرف دیکھ رہا تھا اور مولوی گومگو کی کیفیت کا شکار تھا، موسیٰ خان نے اس کے لیے کوئی جائے فرار نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اگر حویلی کے اندر جاتا تو اسے یقین تھا کہ زندہ واپس نہیں لوٹے گا۔ اندر جانے سے انکار کرتا تو لوگوں کی حمایت سے محروم ہو جاتا۔

''کیا سوچنے لگے ہو مولوی صاحب؟'' موسیٰ خان نے اسے سوچوں میں غرق دیکھ کر سوال کیا۔

''خان جی سے ملاقات کر لو۔ آپ کے سارے گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ مجھے زندہ لوٹنے دیا جائے گا؟'' آخر کار اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

''مولوی صاحب! اگر موت سے اتنا ہی ڈرتے ہو تو پھر جہاد کا نام کیوں لیتے ہو؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''امامت کرو، بچوں کو قرآن مجید پڑھاؤ اور اپنے گھر کی سوچو۔ ان فضول کے بکھیڑوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟''

مولوی کو اس کے حال پر چھوڑ کر موسیٰ خان ہجوم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اکثر لوگ اب مولوی صاحب کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''دیکھا بھائیو!'' موسیٰ خان اونچی آواز میں بولا۔ ''ابھی ذرا دیر پہلے یہ پورے جوش و خروش کے ساتھ جہاد کے موضوع پر تقریر فرما رہے تھے اور افضل ترین جہاد ظالم کے سامنے کلمۂ حق کہنا بتا رہے تھے مگر اب یہ خود اپنے قول سے پھر رہے ہیں۔ بقول ان کے اگر خان جی ظالم ہیں تو یہ ان کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے کس لیے گھبرا رہے ہیں؟ حویلی کے دروازے پر سینکڑوں لوگ موجود ہیں مگر یہ پھر بھی ڈرتے ہیں کیا حق کی خاطر لڑنے والے لوگ بزدل ہوتے ہیں؟ موت سے ڈرتے ہیں؟''

موسیٰ خان کی گفتگو سن کر ہجوم تھوڑی دیر کے لیے بالکل چپ ہو گیا مگر پھر آہستہ آہستہ لوگ احتجاج کرنے لگے۔ وہ مولوی صاحب کو اندر جانے کی ترغیب دینے لگے مگر مولوی صاحب کو شاید سانپ سونگھ چکا تھا۔ نہ وہ اقرار کر رہا تھا اور نہ ہی انکار۔

''جائیے مولوی صاحب''۔ لوگوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ''اندر جائیے ہمارے ہوتے ہوئے کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں''۔

وہ سب اپنے اپنے طور پر اس کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔ ایسے عالم میں اس کے لیے اب وہاں کھڑے رہنا دوبھر ہو چکا تھا۔ جلد ہی اسے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ عزت کی موت یا ذلت کی زندگی۔ وہ صاحب ایمان تھا لیکن بشری کمزوریوں سے مبرا نہیں تھا۔ انسان کا ضمیر مردہ ہونے میں برسوں لگتے ہیں مگر ضمیر کو جاگنے کے لیے صرف ایک لمحہ درکار ہوتا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کو پکارا اور پھر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ موسیٰ خان سے مخاطب ہوا۔ ''چلو میں خان جی سے ملنے کے لیے تیار ہوں''۔

لوگوں نے خوش ہو کر مولوی صاحب کے لیے نعرۂ تحسین بلند کیا اور وہ پُر وقار انداز میں موسیٰ خان کی معیت میں چلتا ہو حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔

===

جمشید خان نے جہانداد کو ان دونوں قیدیوں کے ساتھ جس مکان میں رکھا ہوا تھا، وہ کافی وسیع و عریض تھا۔ چار کمروں پر مشتمل وہ مکان شہر کی ایک معروف کالونی میں واقع تھا۔ دونوں قیدیوں کا علاج اور دیکھ بھال کرنے کے لیے جمشید خان نے ڈاکٹر شہناز کو بھی جہانداد کے ساتھ بھیج دیا تھا۔



جمشید خان دن کے وقت اس طرف کا رخ بالکل نہیں کرتا تھا تاہم رات کے وقت انتہائی راز داری کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا۔ اس کی تفتیش جاری تھی مگر ابھی تک ان دونوں میں سے کسی نے بھی زبان نہیں کھولی تھی۔ دونوں انتہائی ڈھیٹ واقع ہوئے تھے۔ آسانی کے ساتھ تشدد برداشت کر لیتے تھے لیکن جمشید خان بھی ہمت ہارنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ وہ پُر امید تھا اور برابر ان کی زبان کھلوانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

جمشید خان اکثر نصف شب سے تھوڑی دیر قبل ہی اُدھر کا رخ کیا کرتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بنگش کے آدمی اس خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جائیں اور پھر اپنے ساتھیوں کو چھڑا لے جائیں۔ جہانداد کی صلاحیتوں پر بھی اسے مکمل بھروسہ تھا لیکن احتیاط ضروری تھی۔ یہ جہانداد اور شہناز کے تحفظ کا بھی تقاضا تھا کہ احتیاط برتی جائے۔

اس رات حسب معمول جب جمشید خان اپنی کوٹھی سے نکلا تو آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں اسٹریٹ لائٹس نہیں تھیں وہاں تاریکی اتنی دبیز تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی کار کی ہیڈ لائٹس اندھیرے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ ایسے میں ایک سیاہ رنگ کی کار اندھیرے کا حصہ بنی انتہائی احتیاط کے ساتھ اس کے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ تعاقب کرنے والی کار کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں اور اس میں چار آدمی سوار تھے۔ وہ چاروں پوری طرح مسلح تھے۔

جمشید خان اپنے تعاقب سے بے خبر مختلف شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اس خفیہ مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ تعاقب کرنے والی گاڑی بھی ایک مخصوص فاصلے پر رک گئی اور انہوں نے فوراً گاڑی کا انجن آف کر دیا۔ چاروں برق رفتاری کے ساتھ گاڑی سے باہر نکلے اور دبے پاؤں جمشید خان کی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ ان چاروں کے ہاتھ میں خوفناک ریوالور تھے اور وہ ایک خطرناک ارادے سے آگے بڑھ رہے تھے۔

جمشید خان ان چاروں کی پیش قدمی سے بے خبر دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔ اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے اس نے تین بار مخصوص ہارن دے دیا تھا مگر ابھی تک دروازے کے عقب میں بالکل خاموشی تھی شاید ہارن کی آواز جہانداد اور ڈاکٹر شہناز کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ پھر اس سے قبل کہ وہ دوبارہ ہارن دیتا اچانک بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجا۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں اس گلی کی جانب اٹھ گئیں جدھر سے وہ چاروں محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ بجلی زیادہ سے زیادہ دو

سیکنڈ کے لیے چمکی تھی مگر ان چاروں کو آشکارا کر گئی تھی۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی جمشید خان نے تیزی سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور غیر محسوس انداز میں کار کی کھڑکی کھول کر نیچے اتر گیا۔ کار کی آڑ لیتے ہوئے وہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ وہاں سے چند قدم آگے مخالف سمت میں پھولوں اور پودوں کی ایک نرسری تھی جس کی چار دیواری چار فٹ اونچی تھی۔ جمشید خان متعدد بار اس نرسری میں پھولوں اور پودوں کی خریداری کے لیے جا چکا تھا۔ رات کے وقت وہاں صرف ایک چوکیدار ہوا کرتا تھا۔ نرسری اس کے لیے بہترین مورچہ ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ جھکے جھکے انداز میں تیزی سے نرسری کی طرف بھاگا، بجلی دوبارہ چمکی بادل گرجے اور آسمان سے بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں مگر اس وقت تک وہ چار فٹ کی پختہ دیوار پھاند کر نرسری کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ بوندیں پڑنے کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی سی بارش شروع ہو گئی تھی، بجلی وقفے وقفے سے چمک رہی تھی۔ نرسری کی دیوار کے ساتھ ہی پختہ ستونوں پر چادر کے شٹر ڈال کر چھپر سا بنایا گیا جو غالباً نازک پودوں اور پھولوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے سائبان کا کام دیتا تھا۔ خود کو بھیگنے سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ سائبان کے نیچے چلا گیا۔

دیوار سے لگ کر اس نے ان چاروں پر نظر ڈالی۔ اس دوران وہ اس کی کار تک پہنچ چکے تھے اور کار کو خالی پا کر اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔ کار کے نیچے بھی انہوں نے جھانک لیا تھا۔ ابھی تک ان چاروں میں سے کسی کا خیال بھی نرسری کی طرف نہیں گیا تھا۔ وہ چاروں اسے غائب پا کر پریشان لگ رہے تھے۔

درمیانی فاصلہ اگرچہ کم تھا مگر رات کا وقت ہونے کی وجہ سے جمشید خان ان کے پریشان چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ ان کی باتیں اس کی سماعتوں تک صاف پہنچ رہی تھیں جنہیں سن کر اسے ان کی پریشانی اور الجھن کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ ''وہ اسی مکان کے اندر ہے احمقو!'' ان میں سے ایک باقی تینوں سے بارعب انداز میں کہہ رہا تھا، شاید وہ ان کا باس تھا اسی لیے اکڑ کر بول رہا تھا، ''تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔ وہ اپنی گاڑی چھوڑ کر اور کہاں جا سکتا ہے؟''

''باس! وہ اپنی گاڑی اندر بھی تو لے جا سکتا تھا ناں؟'' جمشید خان کی سماعتوں سے ایک اور آواز ٹکرائی۔

''شاید وہ جلدی میں ہو گا''۔ پہلی آواز نے کہا۔ ''اس لیے گاڑی باہر چھوڑ گیا ہے''۔

''تو کیوں ناں اس کے نکلنے کا انتظار کیا جائے؟'' تیسری آواز نے مشورہ دیا۔ ''یوں اندھا دھند اندر گھسنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم مارے جائیں گے''۔



''ناکام لوٹ گئے تو کیا موت سے بچ جائیں گے؟'' باس کی جھنجلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''کیا بنگش ہمیں زندہ چھوڑ دے گا؟ تم سب جانتے ہو کہ انسان کی اس کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں ہے وہ ہم جیسے لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتا ہے''۔

جمشید خان ریوالور کو فائرنگ پوزیشن میں پکڑے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ باس انہیں اندر داخل ہونے کا مشورہ دے رہا تھا جبکہ وہ تینوں اندر جانے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ وہیں باہر چھپ کر جمشید خان کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ باس پر جھنجلاہٹ سوار تھی۔ ایک تو جمشید خان نے غائب ہو کر اسے پریشان کر دیا تھا اور رہی سہی کسر بارش نے پوری کر دی تھی۔ وہ چاروں بالکل کھلی جگہ پر کھڑے ہوئے تھے، بارش سے بچنے کے لیے وہاں ان کے لیے کوئی آڑ نہیں تھی۔

''جلدی کرو گدھے کے بچو!'' باس ایک بار پھر جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''جو بھی فیصلہ کرنا ہے فوراً کرو''۔

''ڈور بیل بجاتے ہیں، کوئی نہ کوئی تو دروازہ کھولے گا''۔ ایک نے مشورہ دیا۔

''اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو''۔ باس نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''احمق آدمی! کیا ہم ان سے عید ملنے آئے ہیں؟ کوئی اور حل سوچو؟''

''باس! ہم اگر یونہی صلاح مشورے کرتے رہے تو صبح ہو جائے گی''۔ دوسرے کی آواز سنائی دی۔ ''ہمیں فوراً ایکشن لینا ہو گا''۔

''ٹھیک ہے تو پھر دیوار پھاند کر اندر گھس جاؤ''۔ باس نے جواباً کہا۔ ''میں یہاں باہر نظر رکھتا ہوں، جاؤ جلدی کرو''۔

صورتِ حال کو بگڑتے دیکھ کر جمشید خان نے فوراً ان سے ٹکرا جانے کا فیصلہ کر لیا۔

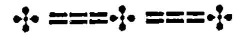
باس کا حکم سنتے ہی وہ تینوں دیوار پھاندنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ وقفے وقفے سے چمکنے والی بجلی انہیں جمشید خان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہی تھی۔ اُدھر وہ تینوں دیوار کی طرف بڑھے اور اِدھر جمشید خان نے باس کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی باس کی چیخ سنائی دی تھی۔ گولی چلنے کی آواز اور باس کی چیخ سن کر وہ تینوں ریوالور لہراتے ہوئے واپس پلٹے۔ جمشید خان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دو مزید فائر کر دیے۔ ایک اور چیخ گونجی اور پھر ایک دم ان میں کھلبلی مچ گئی۔ اچانک ٹوٹنے والی اس افتاد نے ان کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ تین فائر کرنے کے بعد جمشید خان دیوار کے پیچھے دبک گیا تھا۔

اب وہ جمشید خان کی نگاہوں سے اوجھل تھے مگر ان کی آوازیں اُس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ نادیدہ دشمن کو ننگی ننگی گالیاں بک رہے تھے اور سامنے آنے کا چیلنج دے رہے تھے۔ جمشید

خان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید جذبات میں آ کر ان کے سامنے چلا جاتا مگر جمشید خان نہایت ہی ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا، ان کے سامنے جانے کا رسک وہ کسی بھی صورت میں لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس کی پوزیشن سے لاعلم تھے اور جمشید خان انہیں لاعلم ہی رکھنا چاہتا تھا۔

تقریباً دس منٹ تک وہ دیوار کے عقب میں دبکا رہا مگر جب ان کی آوازیں معدوم ہو گئیں تو وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دیوار سے جھانک کر اس نے دیکھا تو وہ چاروں غائب تھے۔ بارش تقریباً تھم چکی تھی اس لیے بجلی کا چمکنا بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا تھا، ماحول پر ایک بار پھر تاریکی چھانے لگی تھی۔ طویل وقفے کے بعد جب بجلی چمکتی تھی تو اسے دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی اپنی کار نظر آنے لگتی تھی اس کے بعد پھر تاریکی چھا جاتی تھی۔ وہ چاروں اسے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے یا تو وہ واپس جا چکے تھے یا پھر اس کی گھات میں چھپ کر کہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان چاروں کی طرح وہ بھی اب مکمل اندھیرے میں تھا، ایسے عالم میں اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ ساری رات نہیں کاٹ سکتا تھا اسے کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی، صورتِ حال نہایت ہی خراب ہو چکی تھی۔ اس نے انتظار سے اکتا کر کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی تو گھنٹوں والی سوئی دو کے ہندسے کو چھو رہی تھی، ریڈیم ڈائل کی چمکتی ہوئی سوئیاں لحہ بہ لحہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ اچانک ایک خیال برق کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اور دوسرے ہی لمحے اس نے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ آنے والے لمحات کا ڈر اس کے دماغ سے نکل چکا تھا۔





موسیٰ خان مولوی نصیب اللہ کی اس کایا پلٹ پر متحیر تھا مگر اس نے مولوی سے کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مولوی بڑے مطمئن انداز میں اس کے ساتھ چل رہا تھا، اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے معمولی سے آثار بھی نہیں تھے، وہ اس درویش کی طرح پُر اعتماد نظر آ رہا تھا جو تصوف کی منازل طے کرتا ہوا معرفت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ جاتا ہے، جسے صرف خوفِ الٰہی ہوتا ہے اور فانی انسان اس کے ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ اس وقت موسیٰ خان کو وہ آسمان سے اترا ہوا کوئی نورانی فرشتہ نظر آ رہا تھا، اس کی چال میں ایک وقار اور خود اعتمادی تھی، چہرے پر سکون اور اطمینان تھا۔ اس کا یہ نیا انداز دیکھ کر موسیٰ خان مرعوب نظر آنے لگا تھا مگر وہ موسیٰ خان سے قطعی لاتعلق ہو کر یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے اس حویلی میں اسے کسی پُرتکلف دعوت پر بلایا گیا ہو، جاگے ہوئے ضمیر نے ایک لمحے میں مولوی نصیب اللہ کے دل کی دنیا بدل کر رکھ دی تھی، اس سے قبل خان جی کا نام سن کر اس کی ٹانگیں لرزنے لگتی تھیں اور زبان پر قفل پڑ جاتے تھے لیکن آج اپنی اس بدلی ہوئی کیفیت پر خود حیران تھا، وہ تو کبھی اس شاندار حویلی کے نزدیک سے بھی نہیں گزرا تھا کجا یہ کہ اس کے اندر داخل ہوتا، یہ کیسا انقلاب تھا کہ وہ بے سروسامان اور نہتا ہونے کے باوجود معمولی سا بھی خائف نہیں تھا۔

''نصیب اللہ!'' اس کے دل سے آواز اٹھی۔ ''تیری یہ کایا پلٹ اوپر والے کی مہربانی کی وجہ سے ہوئی ہے، کیا تم نہیں جانتے؟ یاد کرو...... تم خود ہی تو لوگوں کے سامنے وعظ کیا کرتے تھے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ ہر کسی سے ڈرتا ہے۔ آج تم پہلی بار اللہ تعالیٰ سے ڈرے ہو، انعام میں اس نے تجھے ہر خوف سے آزاد کر دیا ہے۔ سوچو یہ کتنا بڑا انعام ہے، ایسا انعام تو تقدیر والوں کو ملتا ہے''۔

دل کی یہ آواز سن کر اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت دوڑتے ہوئے محسوس کی اور بے اختیار اس کے لبوں سے ''حق اللہ'' کا نعرہ بلند ہو گیا۔

موسیٰ خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر وہ اس کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر اسی پُر وقار انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ موسیٰ خان کی موجودگی اس کے نزدیک نہ ہونے کے برابر تھی۔

جس وقت وہ دونوں چلتے ہوئے گارڈن میں داخل ہوئے اس وقت خان جی کرسی سے اُٹھ کر مضطربانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔ موسیٰ خان کے ساتھ مولوی نصیب اللہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مخصوص چمک لہرائی اور پھر بے اختیار اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اب حقارت اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں مولوی کو دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم"۔ نزدیک پہنچتے ہی مولوی نصیب اللہ نے بلند آواز میں کہا۔ "فرمایئے میں حاضر ہو گیا ہوں۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس کی آواز میں ہلکی سی مرعوبیت کا بھی شائبہ نہیں تھا بلکہ ایک رعب تھا جیسے وہ کسی عام شخص سے مخاطب ہو۔

خان جی نے اسے یوں چونک کر دیکھا جیسے اچانک ہی مولوی کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں اسے مولوی کے الفاظ پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"تم نشے میں تو نہیں ہو مولوی؟" ایک لمحہ اسے گھورنے کے بعد خان جی نے سخت لہجے میں سوال کیا۔ "یا پھر باہر کھڑے ہوئے لوگوں کے بل بوتے پر اترا رہے ہو؟"

"خدا کے فضل و کرم سے میں مسلمان ہوں اور نشہ اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے"۔ وہ اسی تمکنت کے ساتھ بولا۔ "اور لوگوں کے بل بوتے پر وہ اتراتے ہیں جنہیں خدا پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ مجھے الحمدللہ اس کی ذات پر بھروسہ ہے، زندگی اور موت کا مالک وہی ہے جو رات قبر میں آنی ہے وہ آ کر رہے گی۔ میرے مالک نے موت کا ایک دن متعین کر دیا ہے اور وہ دن اپنے مقررہ وقت پر ہی آئے گا، اس دن کسی کو ایک سانس بھی مستعار نہیں ملتا چاہے وہ تمام عالم کا بادشاہ کیوں نہ ہو؟"

"ہم نے تمہیں یہاں وعظ کرنے کے لیے نہیں بلایا"۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اور نہ ہی ہم وعظ سننے کے شوقین ہیں"۔

"میں نے تمہارے سوال کا جواب دیا ہے"۔ وہ بغیر مرعوب ہوئے بولا۔ "تم نے اسے وعظ سمجھ لیا ہے تو یہ تمہاری غلطی ہے"۔

مولوی کے اس جواب نے جلتی پر تیل کا کام کیا، خان جی مارے طیش کے زخمی درندے کی طرح دھاڑا۔ "مولوی! اپنی اوقات میں رہو، اس حویلی میں اونچا بولنے والوں کو زندہ گاڑ دیا جاتا ہے، تم نے شاید ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے، حویلی کے دروازے پر کھڑے ہوئے تمہارے حمایتی ہماری نگاہوں میں چیونٹیوں سے بھی زیادہ حقیر ہیں"۔

"سب انسان برابر ہیں"۔ مولوی نے پُرسکون انداز میں کہا۔ "انسان ہو کر انسانوں کو حقیر سمجھنے والے تم سے بھی بڑے بڑے فرعون خاک کا رزق بن چکے ہیں، تمہاری تو اوقات ہی کچھ نہیں



ہے، تم اگر......"

"موسیٰ خان!" مولوی کی بات پوری ہونے سے قبل ہی خان جی چلا کر بولا۔ "دیکھ کیا رہے ہو اس بدزبان کو اس کے اللہ کے پاس بھیج دو۔ یہ شاید زندگی سے تنگ آ چکا ہے"۔

"خان جی!" موسیٰ خان کمزور سی آواز میں بولا۔ "یہ اگر واپس نہ گیا تو باہر دروازے پر کھڑا ہوا لوگوں کا ہجوم حویلی پر دھاوا بول دے گا۔ اسے میں نے مصالحت کی پیش کش کر کے اندر بلایا ہے، ایسے حالات میں اس پر ہاتھ اٹھانا ہمارے لیے ناممکن ہے"۔

خان جی نے یقین نہ آنے والی نظروں سے موسیٰ خان کی طرف دیکھا اور پھر یکدم گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر بولا۔ "موسیٰ خان! تم بھی نرے احمق ہی ہو۔ ہم ایک عالم دین کو قتل کرنے کا حکم کیسے دے سکتے ہیں؟ ہم تو مولانا صاحب کا امتحان لے رہے تھے کہ یہ کھرا انسان ہے یا کھوٹا؟ اس سے گفتگو کر کے ہمیں یقین آ گیا ہے کہ مولانا صاحب واقعی ایک دیندار اور بااصول شخص ہے، عوام کا سچا خیر خواہ ہے۔ ایسے لوگوں کی تو ہمیں ہر وقت ضرورت رہتی ہے"۔

اتنا کہنے کے بعد وہ مولوی صاحب سے مخاطب ہوا۔ "معاف کرنا مولانا صاحب ہم نے دانستہ آپ کی شان میں گستاخی کی ہے لیکن خدا شاہد ہے کہ ایسا ہم نے کسی دشمنی کی بناء پر نہیں کیا بلکہ ہم آپ کو آزما رہے تھے"۔

چند لمحوں کے لیے تو مولوی پریشان ہو کر رہ گیا، خان جی کا بدلا ہوا انداز دیکھ کر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادہ سا انسان تھا خان جی جیسے ابن الوقت لوگوں سے اس کا واسطہ کبھی بھی نہیں پڑا تھا۔ اس کی حیرت اور پریشانی بجا تھی تاہم جب خان جی نے اسے مہذب انداز میں مخاطب کیا تو جواب میں اس نے بھی طرزِ تخاطب تبدیل کر لیا۔

"کیسی آزمائش خان جی؟" آخر کار متحیر انداز میں اس نے سوال کیا۔

"آپ تشریف تو رکھیں قبلہ!" خان جی مسکرا کر بولا۔ "آپ کی پریشانی ابھی دور کیے دیتے ہیں"۔

اس کا اشارہ پا کر وہ چار و ناچار ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ خان جی بھی اس کے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں مولانا صاحب!" خان جی مسکراتے ہوئے بولا۔ "باتیں کرنے سے قبل میرے خیال میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر لیا جائے۔ آپ پہلی بار حویلی میں تشریف لائے ہیں اس لیے مہمان نوازی تو ہم کریں گے اور بخدا انکار بھی نہیں سنیں گے"۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے موسیٰ خان کو حکم دیا کہ کسی نوکر سے کھانے پینے کا بندوبست کرنے

کے لیے کہہ دے۔

موسیٰ خان اثبات میں سرہلاتا ہوا رخصت ہوگیا اور خان جی دوبارہ مولوی صاحب کی طرف
متوجہ ہوگیا۔ ''مولانا صاحب!'' وہ چہرے پر سیاسی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم آپ
کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتے ہیں، ہمیں برسوں سے آپ جیسے کسی جی دار اور حق پرست
انسان کی تلاش......''

''قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں سردار صاحب!'' مولوی صاحب نے اس کی بات کاٹتے
ہوئے کہا۔ ''میں کسی ایسے شخص کی طرف دوستی کا ہاتھ کیسے بڑھا سکتا ہوں جس کی زندگی کا مقصد
غریب لوگوں کو اذیت و تکلیف پہنچانا ہو۔''

''غالباً آپ ابھی تک شمروز خان والے واقعے کو نہیں بھولے''۔ اس نے برا منائے بغیر
جواب دیا۔ ''مولانا صاحب! ہم مانتے ہیں کہ وہ ایک ظالمانہ فعل تھا مگر اسے انجام دینے کے لیے
ہم مجبور تھے، ہم اپنے باپ دادا کا بنایا ہوا قانون نہیں توڑ سکتے اور پھر جس شخص کو سزا دی گئی وہ کون سا
بے گناہ تھا؟''

''اسے شرعی سزا بھی تو دی جاسکتی تھی''۔ وہ پُرزور انداز میں بولا۔ ''علاقے میں اگر شرعی
نظام نافذ ہوجائے تو یہاں کا ہر باسی سکھ چین کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ آپ ہر بار اسمبلی تک پہنچتے
ہیں، لیکن آپ نے کبھی اس بارے میں غور نہیں فرمایا''۔

مولوی صاحب کو خود بخود پٹڑی پر آتے دیکھ کر خان جی مسکرادیا مگر مولوی صاحب اپنی دُھن
میں بولتا چلا گیا۔

''سردار صاحب!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہاں کے غریب لوگ آپ کی رعایا ہیں ان کی فلاح
و بہبود کے متعلق آپ نہیں سوچیں گے تو اور کون سوچے گا؟ آپ اگر چاہیں تو اس علاقے میں شرعی
نظام نافذ کیا جاسکتا ہے۔ آپ صوبائی اسمبلی کے رکن ہیں آپ کو تو گورنمنٹ کی حمایت بھی حاصل
ہے اور اس بار تو سنا ہے کہ آپ قومی اسمبلی کی نشست پر لڑنے کی تیاری کررہے ہیں''۔

''مولانا صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''آپ بجا فرمارہے ہیں کہ اس علاقے میں
شرعی نظام نافذ ہونا چاہیے، ہم آپ کی اس سوچ سے سو فیصد متفق ہیں۔ مگر ایسا سوچنا آسان ہے لیکن
عملی طور پر یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے، راہ میں سو طرح کی رکاوٹیں آئیں گی۔ ہم کس کس سے
لڑتے رہیں گے؟ درندوں کی سی زندگی بسر کرنے والے یہ لوگ ہماری بات کبھی نہیں سنیں گے
انہیں تو بس قتل و غارت گری میں ہی لطف ملتا ہے، بھلائی کی بات سننے کے یہ لوگ عادی نہیں ہیں
بہتر ہوگا آپ ان کے لیے اپنا قیمتی وقت برباد نہ کریں''۔



''سردار صاحب! آپ کوشش کریں تو اس ناممکن کام کو ممکن بنایا جاسکتا ہے''۔ اس نے
جواب دیا۔ ''آپ ایک بار اپنے اختیارات کا استعمال کرکے تو دیکھیں، میں آپ کی ہر ممکن حمایت
کروں گا۔ علاقے کے لوگوں کو آپ کا ساتھ دینے کی ترغیب دوں گا''۔

''ہم آپ سے دلی طور پر متفق ہیں مولانا صاحب''۔ وہ خندہ پیشانی سے بولا۔ ''مگر ایک
مسئلہ ہے۔ فی الحال سرکاری سطح پر ہمارے اختیارات نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم ہم آپ سے یہ وعدہ
کرتے ہیں کہ اگر آنے والے الیکشن جیت کر ہم قومی اسمبلی میں پہنچ گئے تو اس علاقے میں شرعی نظام
کا نفاذ ہماری پہلی ترجیح ہوگا''۔

''سردار صاحب! یہ وعدہ بھی سیاسی وعدہ ثابت ہوگا، اسمبلی میں پہنچ کر آپ کو نہ علاقہ یاد
رہے گا اور نہ علاقے کے لوگ''۔ مولوی صاحب نے اپنے خدشات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔
''آپ کا زیادہ وقت سرکاری ایوانوں میں گزرے گا، یہاں تو آپ لوگوں کو میسر بھی نہیں ہوں
گے''۔

اس دوران ایک نوکر نے ان کے سامنے رکھی ہوئی میز پر کھانے پینے کے لوازمات سجادیے
تھے، اس لیے خان جی نے وقتی طور پر گفتگو کا سلسلہ منقطع کردیا تھا، اب وہ دونوں کھانے پینے کی
طرف متوجہ ہوچکے تھے۔

نرسری کے احاطے سے باہر نکلنے کا حتمی فیصلہ کرنے کے بعد جمشید خان اچھل کر پختہ دیوار پر
بیٹھ گیا۔ چاروں طرف دبیز تاریکی چھائی تھی چند قدم سے آگے دکھائی نہیں دیتا تھا مگر اس کی آنکھیں
سرچ لائیٹ کی طرح چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ جس خیال نے اسے باہر نکلنے پر مجبور کردیا تھا وہ
اس کے ذہن سے چپک کررہ گیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ کہیں وہ چاروں غنڈے فلیٹ کے عقبی جانب
سے اندر داخل نہ ہوچکے ہوں۔ وہ دیوار سے نیچے کودنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک معمولی سا
کھٹکا ہوا اور وہ غیر ارادی طور پر پلٹ کر دوبارہ اندر کود گیا۔ عین اسی لمحے بیک وقت دو دھماکے
ہوئے اور گولیاں اس کے اوپر سے گزرتی ہوئی چادر کے شٹر سے جاٹکرائیں، وہ بال بال بچا تھا۔
چند لمحے پہلے والا اس کا خیال غلط ثابت ہوچکا تھا۔ چاروں غنڈے باہر کہیں آس پاس اس کی تاک
میں چھپے ہوئے تھے۔

صورت حال ایک مرتبہ پھر بگڑ چکی تھی۔ وہ چاروں اس کی توقع سے بڑھ کر چالاک ثابت
ہوئے تھے اور اب تو وہ اس کی پوزیشن سے بھی آگاہ ہوچکے تھے۔ کسی وقت بھی وہ اپنی جانیں ہتھیلی
پر رکھ کر نرسری کے اندر گھس سکتے تھے۔ اس کا دماغ برق رفتاری سے مصروف عمل تھا، نرسری سے نکلنا

اب ناگزیر ہو چکا تھا۔ گولیاں چلنے کے بعد فضا پر ایک مرتبہ پھر سکوت طاری تھا۔ اسے باہر کی کر نہیں تھی تاہم اسے یقین تھا کہ غنڈوں کی نظریں نرسری کی طرف ہی لگی ہوں گی۔

تھوڑی دیر تک وہ دیوار کے پیچھے دبکا رہا اور ان کے ردِعمل کا انتظار کرتا رہا مگر جب طویل ثابت ہوتا چلا گیا تو وہ آہستہ آہستہ نرسری کے جنگلا نما گیٹ کی طرف سرکنے لگا۔ اِ صورت میں یہاں سے نکل کر فلیٹ تک پہنچنا تھا کیونکہ اب وہ فلیٹ محفوظ نہیں رہا تھا بنگش کے اسے دیکھ چکے تھے اور کسی بھی وقت اس فلیٹ پر منظم دھاوا بول سکتے تھے۔

آہستہ آہستہ بغیر آہٹ پیدا کیے سرکتا ہوا وہ دیوار کے اختتام تک پہنچ گیا۔ اس سے آ جنگلا نما دروازہ شروع ہو رہا تھا۔ اس نے دیوار کی آڑ سے معمولی سا سر نکال کر جنگلے سے باہر مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ باہر مکمل خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ چند لمحے اس نے وہیں ٹھہر کر انتظا اور پھر تیزی سے دروازے کے سامنے سے سرکتا ہوا دوسری طرف والی دیوار کی آڑ میں جا پہنچا۔

ردِعمل کے طور پر جب کچھ بھی ظاہر نہ ہوا تو وہ ایک بار جنگلے میں سے باہر جھانکنے لگا۔ معاً ٹارچ روشن ہوئی مگر اس کا رخ چادر کے شٹر والے سائبان کی طرف تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے وہ ایک فیصلے پر پہنچا اور پھر روشنی کی طرف اندازے سے فائر جھونک دیا دھماکے کی آواز کے ساتھ ایک چیخ بلند ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ٹارچ بجھ گئی انہیں شاید اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا۔ جلا کر انہوں نے غلطی سے خود کو عیاں کر دیا تھا جس کا فائدہ جمشید خان نے اٹھا لیا تھا۔ جمشید خا چلائی ہوئی تین گولیاں نشانے پر لگی تھیں مگر اس بات سے وہ لاعلم تھا کہ کوئی گولی جان لیوا بھی ہو سکی ہے یا نہیں؟

فضا پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔ چند لمحے وہ جنگلے میں سے باہر جھانکتا رہا مگر پھر کی کوفت سے اکتا کر نرسری کے احاطے میں واقع اکلوتے کمرے کی طرف جھکے جھکے انداز میں پڑا۔ انہوں نے دوبارہ ٹارچ جلانے کی کوشش نہیں کی تھی تاہم وہ ان کی طرف سے غافل نہیں تھ

وہ کمرے سے چند قدم دور ہی تھا جب اچانک اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پڑ ایک پل کے لیے تو وہ اپنی جگہ پر سن ہو کر رہ گیا مگر پھر بھاگ کر روشنی کی زد سے نکل گیا۔

''اے کون ہو...... ادھر کیا کر رہے ہو؟'' کسی نے بارعب آواز میں پوچھا اور دوبارہ کی روشنی اس پر مرکوز کر دی۔

''ٹارچ بجھا دو احمق آدمی''۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ورنہ میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے''۔

اس کی بات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ٹارچ فوراً بجھ گئی۔



''شکریہ''۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں پولیس کا آدمی ہوں اور میرے پیچھے غنڈے پڑے ہوئے ہیں''۔

''غ...... غ...... غنڈے......'' اس نے دہشت زدہ انداز میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''کک......''

''شش'' جمشید خان نے سرگوشی کے انداز میں قطع کلامی کی۔ ''خاموش رہو وہ نرسری کے باہر گلی میں موجود ہیں، کیا تھوڑی دیر پہلے تم نے فائرنگ کی آوازیں نہیں سنی تھیں؟''

''نن...... نہیں...... میں اندر سویا ہوا تھا''۔ وہ بدستور خوفزدہ انداز میں بول رہا تھا۔ ''ابھی...... چند لمحے پہلے ہی آنکھ کھلی ہے''۔

''تم شاید چوکیدار ہو یہاں کے؟'' جمشید خان نے سوال کیا۔

''ج...... جی ہاں''۔ وہ ہکلایا۔ ''م...... میں بہت غریب آدمی ہوں۔ مجھ سے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا''۔

''ایڈیٹ! میں ڈاکو نہیں ہوں''۔ جمشید خان نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''ایک پولیس آفیسر ہوں، مجھ سے ڈرو مت بلکہ مجھ سے تعاون کرو''۔

''اچھا جی''۔ چوکیدار نے بمشکل کہا۔

''یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی محفوظ راستہ ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ ''سامنے والا راستہ تو غنڈوں کی نگاہ میں ہے''۔

''راستہ تو کوئی نہیں ہے لیکن کمرے کی چھت سے دوسری طرف کود کر نکلا جا سکتا ہے''۔ چوکیدار نے جان چھڑانے والے اندز میں جلدی سے بتایا۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ اطمینان سے بولا۔ ''چھت پر پہنچنے کے لیے سیڑھی ہے کیا؟''

''کمرے کی دیوار کے ساتھ کونے میں مٹی کا ڈھیر پڑا ہوا ہے، اس ڈھیر پر چڑھ کر آسانی سے کمرے کی چھت تک پہنچا جا سکتا ہے''۔ چوکیدار نے مسئلے کا حل پیش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کون سے کونے میں؟''

''دائیں طرف والا''۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا اور جمشید خان اثبات میں سر ہلاتا ہوا تیزی سے مطلوبہ کونے کی طرف بڑھ گیا۔

===

جہانداد کافی دیر سے فائرنگ کی آوازیں سن رہا تھا مگر بارش کی وجہ سے باہر نکلنے سے احتراز کر رہا تھا۔ بارش رکنے کے بعد جب وہ باہر نکلنے کے ارادے سے اٹھا تو ڈاکٹر شہناز اسے منع کرتے

ہوئے بولی۔ ''مت جاؤ باہر۔ نہ جانے کون لوگ ہوں گے، تمہیں کیا ضرورت ہے پرائے معا میں ٹانگ اڑانے کی؟ ویسے بھی ایس پی صاحب نے ہم دونوں کو باہر نکلنے سے منع کر رکھا ہے، ایسا ویسا ہو گیا تو اسے کیا جواب دیں گے؟''

''تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے محترمہ''۔ وہ بے رخی سے بولا۔ ''میں ا پی صاحب کا ملازم تو نہیں ہوں، اپنی مرضی کا مالک ہوں''۔

''لیکن میں پھر بھی تجھے باہر نہیں جانے دوں گی''۔ اس نے برا مانے بغیر جواب دیا۔

''کیوں..... کس لیے؟'' وہ تاؤ کھا کر بولا۔ ''تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟ کیا لگتی میری؟''

''ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک روز میں تمہاری کچھ نہ کچھ ضرور لگوں گی''۔ شہناز نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا تمہیں یقین نہیں آتا؟''

''پلیز شہناز صاحبہ!'' وہ عاجزانہ انداز میں بولا۔ ''میرا پیچھا.....''

''صرف شہناز''۔ اس نے قطع کلامی کی۔ ''صاحبہ میں مریضوں کے لیے ہوں، تمہار لیے شہناز ڈارلنگ، جان اور جانِ من ہوں''۔

''بے حیائی کی باتیں مت کرو''۔ اسے غصہ آ گیا۔ ''اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، تمہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں''۔

''یہ بے حیائی کی باتیں نہیں ہیں''۔ وہ بولی۔ ''میں تم سے محبت کرتی ہوں اور محبت کرنا گ جرم نہیں ہے۔ میں تمہاری شرافت سے بہت متاثر ہوئی ہوں جہانداد، اس لیے ہمیشہ کے لیے پانا چاہتی ہوں۔ تمہیں آخر لفظ محبت سے اتنی چڑ کیوں ہے؟''

''دیکھو شہناز صاحبہ!'' وہ قدرے نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھے کئی بار چکا ہوں کہ میرے جیسے لوگوں کو محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ موت میرے تعاقب میں ہے جانے کس لمحے کس اندھی گولی کا نشانہ بن جاؤں۔ پلیز میرے بجائے کوئی شریف اور پڑھا انسان ڈھونڈ لو جو تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر خوش رکھ سکے''۔

''محبت اندھی ہوتی ہے جہانداد''۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اچھا برا دیکھنے قاصر ہوتی ہے، جس سے بھی ہو جائے.....''

''بس''۔ جہانداد نے غصے سے قطع کلامی کی۔ ''میرے پاس ایسی فضول باتیں سننے کے وقت نہیں ہے۔ میں باہر جا رہا ہوں کمرے کا دروازہ بند کر لو''۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے گن ا اور دروازے کی طرف لپکا۔



''نہیں''۔ وہ آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئی بولی۔ ''آج تجھے میری بات سننا ہی پڑے گی ورنہ میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی''۔

''بے شک مر جاؤ''۔ اس نے بے رحمی سے کہا اور پھر اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر شہناز گزشتہ کچھ روز سے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ کئی بار اس نے یہ معاملہ جمشید خان کے گوش گزار کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر ہر بار کچھ سوچ کر رہ گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر شہناز کی دل سے عزت کرتا تھا اس لیے جمشید خان کے سامنے اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر شہناز اس کے کئی بار کے سمجھانے کے باوجود پیچھے نہیں ہٹ رہی تھی۔ وہ خوبصورت تھی پڑھی لکھی اور برسرِ روزگار تھی اسے جہانداد سے کہیں بہتر جیون ساتھی مل سکتا تھا، یہ بات جہانداد بھی بخوبی جانتا تھا اس لیے وہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دراصل اسے اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں تھا اور دوسرا زینب کے مرنے کے بعد محبت کے معاملے میں اس کا دل ہی مُردہ ہو چکا تھا حالانکہ شہناز کی خوبصورتی اور شرافت میں کوئی کلام نہیں تھا، وہ لاکھوں میں نہ سہی مگر ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔

وہ انہی سوچوں میں غلطاں بیرونی دروازے کی طرف روانہ تھا جب اچانک پھر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا، لیکن اچانک شروع ہونے والی فائرنگ فوراً رک گئی تھی۔ اس نے احتیاط کے ساتھ دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر باہر کا جائزہ لیا تو دروازے کے عین سامنے جمشید خان کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ پریشان ہو کر رہ گیا۔ جمشید خان کی گاڑی اور فائرنگ کی آوازیں یونہی بے سبب نہیں ہو سکتی تھیں۔ یقیناً جمشید خان کسی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

''یہ لازماً بنگش کے آدمی ہوں گے''۔ اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا اور آنکھ دوبارہ دروازے کی جھری پر رکھ دی۔ کار کے علاوہ اسے دروازے کے سامنے اور کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وہ جمشید خان کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا مگر یوں اندھا دھند باہر نکلنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ بے احتیاطی اس کی جان بھی لے سکتی تھی۔ باہر کتنے لوگ تھے اس کی اسے کوئی خبر نہیں تھی۔

وہ دروازے سے ہٹ کر دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گیا۔ چند دن قبل اسے دیوار کے ساتھ ایک فولادی سیڑھی پڑی ہوئی نظر آئی تھی۔ سیڑھی کو اب بھی وہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ جس دن سے وہ لوگ یہاں شفٹ ہوئے تھے اس کے بعد سوائے جمشید خان کے وہاں کوئی بھی آتا جاتا نہیں تھا اور جمشید خان کو وہاں سے سیڑھی ہٹانے کی ضرورت پیش آ ہی نہیں سکتی تھی۔

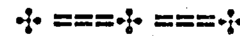
سیڑھی ڈھونڈنے میں اسے چند لمحے ہی لگے تھے، وہ وہیں دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھی لیکن بارش نے اسے گیلا کر دیا تھا۔ گن کندھے پر لٹکانے کے بعد وہ سیڑھی اٹھانے کے لیے جھک گیا۔ عین اسی وقت ایک فائر ہوا اور فوراً ہی کسی کی چیخ سنائی دی۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر سیڑھی اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگائی اور جلدی سے اوپر چڑھنے لگا۔ گن کو کندھے سے نکال کر دوبارہ اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اوپر پہنچ کر پہلے اس نے سر نکال کر باہر کا جائزہ لیا مگر بات بن سکی تب وہ تھوڑا اور اوپر چلا گیا یہاں تک کہ دیوار کی اونچائی اس کے پیٹ کے مقابل آ گئی۔ اب وہ بخوبی گلی میں جھانک سکتا تھا۔

اس نے دونوں طرف گلی میں نگاہ دوڑائی، کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اگرچہ تاریکی بے حد گہری تھی لیکن کچھ فاصلے تک دیکھا جا سکتا تھا۔ ''کہاں جا سکتے ہیں؟'' ابھی اس نے ایک پاؤں اٹھا کر نچلی سیڑھی پر رکھا ہی تھا کہ معاً اس کی سماعتوں سے ایک دبی دبی آواز ٹکرائی۔ ''وہ ہمارا ایک آدمی ختم کر چکا ہے اور دو کو زخمی کر چکا ہے۔ اب ہم بنگش کے سامنے کس منہ سے جائیں گے؟''

''میں کہتا ہوں وہ نرسری کے اندر ہے'' دوسری آواز آئی۔ ''ہمیں نرسری کے گیٹ کے نزدیک رہنا چاہیے، جلد یا بدیر وہ ضرور باہر نکلے گا''۔

''ارے احمق آدمی! اس کا ہمیں کیا کرنا ہے؟'' پہلی آواز نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو آؤ انجام کی پرواہ کیے بغیر فلیٹ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں ہر صورت میں عامر کمال اور سعید اختر کو چھڑانا ہے یا پھر اوپر پہنچانا ہے''۔

جہانداد ان کا منصوبہ سن کر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ ان تینوں کے دھندلے دھندلے سے ہیولے اسے گلی کی مخالف سمت میں بائیں ہاتھ کھڑے ہوئے نظر آئے تھے، اس نے احتیاط کے ساتھ گن کو سیدھا کیا اور پھر ایک شخص کے سینے کا نشانہ لے لیا۔ مگر گولی چلانے سے قبل ہی اس نے نشانہ بدل دیا۔ اب اندازاً اس نے ٹانگوں کا نشانہ لے رکھا تھا۔ ایک سیکنڈ میں اس کی انگلی نے ٹرائیگر دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا اور ان تینوں میں سے ایک شخص زمین بوس ہو گیا جبکہ باقی دو بوکھلا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔



جمشید خان مٹی کے ڈھیر پر سے ہوتا ہوا کمرے کی چھت تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف گلی کی بجائے ایک مکان کا صحن نظر آ رہا تھا۔ بارش لائیٹ کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی اس لیے مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا البتہ صرف ایک کمرے کی کھڑکی میں مدقوق سی روشنی نظر آ رہی تھی غالباً اس کمرے میں کوئی لیمپ جل رہا تھا۔ ایک ثانیہ رک کر اس نے نیچے دیکھ کر صحن کا جائزہ لیا اور پھر ہاتھ



میں پکڑا ہوا ریوالور بیلٹ میں اڑس لیا۔

دوسرے ہی لمحے چھت کی منڈیر پکڑ کر وہ نیچے لٹک گیا۔ عین اسی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا اور غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھوں سے منڈیر چھوٹ گئی۔ وہ دھپ کی آواز سے زمین پر گرا اور بیلٹ سے ریوالور نکالتے ہوئے تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک لمحہ کے لیے اس نے نگاہیں اِدھر اُدھر گھما کر جائزہ لیا اور پھر اندازے سے ایک طرف بڑھ گیا۔ اسے بیرونی دروازے کی تلاش تھی۔ پورے گھر میں بدستور خاموشی چھائی ہوئی تھی کسی قسم کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ ذرا سی کوشش کے بعد اس نے بیرونی دروازہ تلاش کر لیا مگر یہ دیکھ کر کہ دروازہ ڈیوڑھی نما ہے اور دروازے کو اندر سے تالا بھی لگا ہوا ہے، اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وقتی طور پر وہ گھر میں پھنس کر رہ گیا۔ گھر کا بیرونی دروازہ بند گلی میں بھی واقع ہو سکتا تھا، اس صورت میں وہ صرف ڈیوڑھی کی چھت سے ہو کر گلی میں اتر سکتا تھا، دیوار پھاندنے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا تھا کیونکہ دوسری طرف پھر کسی مکان کا احاطہ ہو سکتا تھا۔

چند لمحے وہ اس چھوٹی سی ڈیوڑھی میں رکا رہا۔ پھر باہر نکل کر ڈیوڑھی کی بلندی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سیڑھی کی مدد کے بغیر کسی طرح بھی چھت تک نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔ اس کا دماغ برق رفتاری سے موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کا حل سوچ رہا تھا۔ اسے اپنے فلیٹ تک پہنچنے کی جلدی تھی، گو کہ اسے جہانداد کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا مگر اس کی ذمہ داری پر دو قیدیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شہناز بھی تھی، ایسی صورتِ حال میں بنگش کے آدمی اس پر بھاری پڑ سکتے تھے۔ جہانداد اور ڈاکٹر شہناز کی جان بھی جا سکتی تھی۔

''کیا کرنا چاہیے مجھے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''گھر کے مکینوں کی مدد حاصل کرو'' دماغ نے مشورہ دیا۔ ''تم ایک ذمہ دار پولیس آفیسر ہو کوئی چور اچکے یا ڈاکو نہیں ہو؟''

دماغ کا مشورہ اسے قابل قبول لگا لہٰذا وہ گھر کے رہائشی کمروں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جس کی کھڑکی سے اس نے روشنی دیکھی تھی۔ احتیاط سے دبے پاؤں چلتا ہوا وہ اس ایل نما کاریڈور میں پہنچ گیا۔ روشنی والی کھڑکی کاریڈور میں ہی کھلتی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اچانک اس کی سماعتوں سے ایک سرگوشی نما آواز ٹکرائی اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سرگوشی کی آواز ادھ کھلی کھڑکی سے ہی آ رہی تھی۔ غالباً دو تین لوگ کمرے میں جاگ رہے تھے۔ فطری تجسس اور پیشہ ورانہ عادت نے اسے ان لوگوں کی گفتگو سننے پر مجبور کر دیا۔

دیوار سے لگ کر وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف سرکنے لگا۔ لائیٹ کی عدم موجودگی نے اس کا یہ

کام آسان بنا دیا تھا ورنہ وہ یوں بے دھڑک کاریڈور تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ دیوار کے ساتھ سرک وہ کھڑکی کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ اب وہ جب چاہتا اندر موجود لوگوں کی نظریں بچا کر کھڑکی جھانک سکتا تھا۔ اندر سے آنے والی آوازیں بھی اب اسے صاف سنائی دینے لگی تھیں۔

''صفیہ رحمان! میں تمہارا سگا انکل ہوں، تمہارا برا میں کیسے سوچ سکتا ہوں؟ شاباش کاغذات پر سائن کر دو''۔ اس کی سماعتوں سے ایک بے رحم مردانہ آواز ٹکرائی۔

''انکل! میں نے کہا ہے ناں کہ کر دوں گی مگر ابھی نہیں''۔ جواب میں ایک سہمی ہوئی نس آواز سنائی دی۔

''کیسے نہیں کرو گی؟'' ایک اور کرخت نسوانی آواز گونجی۔ ''بلاؤں آصف کو۔ منہ دکھا کے لائق نہیں چھوڑے گا''۔

''پلیز آنٹی!'' پہلی نسوانی آواز نے منت کے انداز میں کہا۔ ''آپ لوگوں کے سوا دنیا میرا کوئی نہیں ہے۔ خدا سے ڈرو، ایک بے سہارا اور یتیم بھتیجی کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک م کرو''۔

''تم اگر ہمیں اپنا سمجھتیں تو پھر آصف سے شادی نہ کر لیتیں؟ ایک ہی تو بیٹا ہے ہمارا''۔ نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''اس سے شادی کرنے سے تو کہیں بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں''۔ لڑکی ہمت کا مظا کرتے ہوئے بولی۔ ''ایسی کون سی برائی ہے جو اس میں نہیں ہے؟''

''کلموہی...... بدکار!'' جواب میں آنٹی چلائی۔ ''بکواس کرتی ہے میرے بیٹے کے بار میں۔ میں ابھی اسے بلاتی ہوں اور ابھی وہ میری آنکھوں کے سامنے تمہارے ساتھ سہاگ را منائے گا اور وہ بھی بغیر شادی کے۔ بڑی آئی نیک پروین کہیں کی؟''

''بکواس مت کرو زرینہ!'' مرد نے غصیلی آواز میں اسے ڈانٹا۔ ''صفیہ ہماری بھتیجی ہے آصف کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے اس کا بیاہ رچائیں گے اور اپنے مرحوم بھائی رحمان کی رو کو خوش کریں گے۔ وہ اگر آج زندہ ہوتے تو صفیہ کب کی ہماری بہو بن چکی ہوتی''۔

''ٹھیک ہے''۔ زرینہ نامی عورت نے نخوت سے جواب دیا۔ ''میں آصف کو نہیں بلاتی مگر کاغذات سائن کر دے بصورت دیگر مجھے آصف سے ابھی بات کرنا پڑے گی''۔

ان کی گفتگو سن کر جمشید خان فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ گو کہ اس وقت وہ خود مصیب میں گرفتار تھا مگر صفیہ رحمان نامی اس یتیم لڑکی کو یوں بے آسرا چھوڑ جانا، اس کا ضمیر گوارہ نہیں کر تھا۔ اسے بہر صورت لڑکی کو ان بے رحم رشتہ داروں کے چنگل سے چھڑانا ہی تھا۔ پہلے تو اس



سوچا کہ اس معاملے کو کل پر چھوڑ کر چپ چاپ کسی نہ کسی طرح باہر نکل جائے۔ مگران لوگوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ آج رات لڑکی کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے اور کاغذات پر اس کے سائن لے کر ہی رہیں گے۔ سائن نہ کرنے کی صورت میں لڑکی اپنی عزت گنوانے کے ساتھ ساتھ جان سے بھی جا سکتی تھی۔ اس کے چچا چچی کی سنگدلی جمشید خان پر واضح ہو چکی تھی۔ وہ دونوں مال و دولت کے لالچ میں ہر حد تک جا سکتے تھے۔

ادھر جمشید خان سوچوں میں مستغرق تھا اور ادھر کمرے میں دونوں میاں بیوی صفیہ رحمان کو کاغذات پر سائن کرنے کے لیے مجبور کر رہے تھے، صفیہ کا انکار بدستور جاری تھا۔ جوں جوں اس کا انکار بڑھتا گیا دونوں میاں بیوی کا طیش بھی بڑھتا گیا۔ پھر اچانک ایک تھپڑ کی آواز گونجی اور مرد چلا کر بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''جاؤ زرینہ آصف کو بلا کر لاؤ۔ یہ شرافت سے نہیں ماننے لگی۔ اسے شاید اپنی عزت کی کوئی پرواہ نہیں ہے''۔

''میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا''۔ زرینہ بولی۔ ''مگر اس وقت تو تمہیں اس کلموہی پر پیار آ رہا تھا''۔ اس کے بعد قدموں کی چاپ ابھری اور جمشید خان تیزی کے ساتھ کاریڈور سے باہر نکل گیا۔ اب وہ آصف کی آمد کا منتظر تھا۔ آنے والے لمحات کافی سنسنی خیز ثابت ہو سکتے تھے تاہم وہ مطمئن تھا یہ عام سے لوگ تھے کوئی عادی مجرم نہیں تھے کہ اس کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا۔ انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے تو اس کا پولیس آفیسر ہونا ہی کافی تھا۔ وہ کمرے کی سائیڈ میں کھڑا ہوا تھا البتہ کبھی کبھی سر نکال کر کاریڈور میں جھانک لیتا تھا۔



گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے جہانداد سیڑھی سے نیچے اترا اور پھر بیرونی دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ جھری سے آنکھ لگا کر اس نے باہر کا جائزہ لیا۔ سوائے کار کے گلی میں کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں غنڈے یا تو موقع سے فرار ہو چکے تھے یا پھر کہیں چھپے ہوئے تھے۔ اب گلی میں نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ رسک لیے بغیر وہ جمشید خان کو نہیں ڈھونڈ سکتا تھا۔ باہر نکلنے کا حتمی فیصلہ کرنے کے بعد اس نے انتہائی احتیاط سے بغیر کسی قسم کا کھٹکا پیدا کیے دروازہ کھول دیا۔ جمشید خان کی کار بالکل دروازے کے ساتھ چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

وہ دبے پاؤں چلتا ہوا باہر نکلا اور اس شخص کے پاس پہنچ گیا جو اس کی گولی کھا کر زخمی ہوا تھا۔ وہ شخص بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ غالباً بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کا ریوالور پڑا ہوا تھا۔ جہانداد نے جھک کر اس کا ریوالور اٹھا لیا اور پھر سیدھا ہونے کے بعد ادھر اُدھر کا جائزہ لینا

شروع کر دیا۔ گلی دونوں جانب سے سنسان پڑی ہوئی تھی۔ دونوں غنڈے غائب ہو چکے تھے۔ جہانداد کا وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ فرار ہونے والے غنڈے کسی بھی وقت واپس آ کر فلیٹ پر دھاوا بول سکتے تھے۔ چنانچہ اس نے تیزی سے جھک کر بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو کندھے پر ڈالا اور بھاگنے کے سے انداز میں فلیٹ کے اندر لے گیا۔ اسے برآمدے میں ڈالنے کے بعد وہ واپس پلٹا اور دوڑتا ہوا جمشید خان کی کار تک پہنچ گیا۔ ہینڈل پر ہاتھ ڈال کر اس نے کھڑکی کھولی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ خوش قسمتی سے کار کے اگنیشن میں چابی موجود تھی۔ افراتفری کے عالم میں شاید جمشید خان چابی نکالنا بھول گیا تھا، اسی طرح کھڑکیاں لاک کرنے کی بھی اس فرصت نہیں مل سکی تھی۔ کار اسٹارٹ کرنے کے بعد وہ اسے سیدھا اندر لے گیا۔ برآمدے کے سامنے کار روکنے کے بعد وہ تیزی سے نیچے اترا اور بھاگتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی ڈاکٹر شہناز کمرے کے فرش پر بیٹھی ہچکیوں مین رو رہی تھی، غالباً اسے جہانداد کی بے رخی کا قلق تھا اور دوسرا جہانداد نے کمرے سے نکلتے وقت اسے نہایت ہی بے دردی کے ساتھ دھکا دیا تھا۔

''کیوں رو رہی ہو؟'' اس کے قریب پہنچ کر جہانداد نے درشت انداز میں سوال کیا۔ ''کیا مر گیا ہے تیرا؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا تب جہانداد اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''پلیز شہناز! یہ رونے دھونے کا وقت نہیں ہے، بنگش کے آدمیوں نے ہمارا یہ خفیہ ٹھکانا دیکھ لیا ہے جلد یا بدیر وہ یہاں تک پہنچ ہی جائیں گے اس لیے ہمیں فی الفور یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ان قیدیوں کی زندگی جمشید خان کے لیے بہت ضروری ہے۔ چلو جلدی سے اٹھ جاؤ''۔

''پہلے سوری کرو''۔ اس نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''ورنہ میں اس کمرے سے ایک قدم باہر نہیں نکالوں گی''۔

''ٹھیک ہے میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں''۔ جہانداد نے نرم انداز میں کہا۔ ''اب اٹھو ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے''۔

''سوری تو تم نے بولا ہی نہیں''۔ وہ اٹھ کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ایسے کیسے معاف کر دوں؟''

''اچھا سوری''۔ اس نے بلاتردد کہا۔ ''اب نکلنے کی تیاری کرو، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے جلدی کرو، قیدیوں کو بھی ساتھ لے جانا ہے''۔

''جائیں گے کہاں؟'' اس نے استفسار کیا۔



''پہلے یہاں سے تو نکلیں''۔ وہ بولا۔ ''کوئی نہ کوئی جگہ ڈھونڈ ہی لیں گے''۔

''ہمارے جانے کے بعد اگر جمشید صاحب یہاں پہنچ گئے تو کیا وہ پریشان نہیں ہو جائیں گے۔ ہمیں ان کا انتظار کرنا چاہئے''۔ وہ تشویش زدہ انداز میں بولی۔ ''انہوں نے آج آنا تھا یہاں''

''تم وقت ضائع کر رہی ہو شہناز''۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں''۔

''او کے...... ایم سوری''۔ وہ قدرے شرمندگی کے ساتھ بولی۔ ''میں تیار ہوں، چلئے''۔

دس منٹ کے بعد وہ جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ دونوں قیدیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے تیسرے زخمی شخص کو بھی گاڑی کی عقبی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔ زخمی شخص کے ساتھ ساتھ دونوں قیدیوں کو بھی شہناز نے انجکشن لگا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ کچھ ضروری سامان بھی انہوں نے گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیا تھا۔ اس ساری کارروائی کے دوران شہناز حیرت انگیز طور پر خاموش رہی تھی، حالانکہ اس کے دماغ میں کئی سوال کلبلا رہے تھے شاید جہانداد کے تیور دیکھ کر وہ چپ رہی تھی۔

گاڑی کو باہر نکال کر جہانداد نے فلیٹ کے بیرونی دروازے کو تالا لگایا اور دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسٹیرنگ سنبھالنے کے بعد اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شہناز تھوڑی دیر تو چپ بیٹھی رہی مگر جب وہ کھلی سڑک پر پہنچے تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''معلوم نہیں''۔ جہانداد نے مختصر سا جواب دیا اور وہ منہ بنا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''شہناز!'' چند لمحوں کے بعد جہانداد نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا تمہارا فلیٹ محفوظ ہے؟''

''ہاں...... مگر وہ کرایے کا ہے''۔ اس نے روٹھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں''۔ وہ بولا۔ ''ہم صرف وقتی طور پر وہاں پناہ لیں گے۔ اس کے بعد جمشید خان کوئی اور انتظام کر لے گا''۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا؟'' اس نے شکوہ کیا۔ ''ہم وہاں زندگی بھر رہ سکتے ہیں اگر تم پسند کرو تو؟''

''کس حیثیت سے؟'' جہاندد کو بھی دل لگی سوجھی اور اس نے مسکرا کر استفسار کیا۔

یہ ذو معنی جملہ سن کر شہناز کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی مگر رات کا وقت ہونے کی وجہ سے جہانداد یہ منظر نہ دیکھ سکا۔ تاہم اس کے اس ذو معنی جملے نے شہناز کی ناراضی دور کر دی تھی۔

✣ ===✣ ===✣

جمشید خان کو کمرے کی سائیڈ میں ٹھہرے ہوئے ابھی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ زر ایک مرد کے ساتھ کاریڈور میں داخل ہوئی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے جمشید خان انہیں اچھی طر دیکھ نہیں پایا تھا دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ جمشید خان احتیاط سے د پاؤں چلتا ہوا دوبارہ کھڑکی تک پہنچ گیا۔

''کاغذات پر سائن کر دو جانِ من''۔ کھڑکی کے قریب پہنچتے ہی جمشید خان کو ایک نئی مردا آواز سنائی۔ یقیناً وہ ان میاں بیوی کے سپوت آصف کی ہی آواز ہو سکتی تھی اور وہ صفیہ رحمان نا لڑکی سے ہی مخاطب تھا۔ ''ورنہ اپنی عزت گنوا بیٹھو گی''۔

''شرم کرو...... میں تمہاری بہن ہوں''۔ صفیہ کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔ ''کیا تجھے خوف خ نہیں رہا؟''

جمشید خان نے ذرا سا آگے ہو کر کھڑکی سے اندر جھانکا تو اس نے ایک مکروہ شکل نوجوان ہاتھ میں کاغذات پکڑے ہوئے پایا۔ نوجوان کے دائیں بائیں زرینہ نامی عورت اور ایک پچا سالہ موٹا سا بھدا مرد کھڑا ہوا تھا۔ بظاہر وہ تینوں خالی ہاتھ ہی نظر آ رہے تھے مگر ان کے پاس اسلح موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صفیہ رحمان نامی لڑکی اسے نظر نہیں آ رہی تھیں شاید وہ بیٹ ہوئی تھی۔

آصف نامی اس نوجوان نے صفیہ کی بات سن کر ایک قہقہہ لگایا اور پھر اوباشانہ انداز م کہا۔ ''میں تجھے جانِ من کہہ رہا ہوں اور تُو مجھے بھائی بنانے پر تُل گئی ہے۔ کیا تجھے عملی طور پر جا من بنا دوں، پھر کاغذات پر سائن کرو گی؟''

صفیہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

''بول ناں کلموہی!'' زرینہ نیچے جھکتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولی۔ ''اب سانپ کیا سونگھ گیا ہے؟''

دوسرے لمحے صفیہ کی ایک کراہ سنائی دی غالباً زرینہ نے اس کے بال پکڑ کر کھینچے تھے۔

''یہ ایسے نہیں مانے گی ممی''۔ آصف نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات ایک طرف پھینک ہوئے کہا۔ ''یہ اپنا منہ کالا کرا کر رہے گی''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ جمشید خان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

''میرے قریب مت آنا کمینے!'' صفیہ کی کمزور سی آواز سنائی۔ ''میں...... میں......''

اس کی بقیہ بات آصف کے مکروہ قہقہوں میں دب کر رہ گئی۔ اِدھر جمشید خان کا خون رگو میں کھولنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اتنے بے رحم اور کمینے لوگ دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی ذرا سی



بھی صفیہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور نیم وا دروازے کو پاؤں کی ٹھوکر لگاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

''اپنے اپنے ہاتھ اوپر کر لو''۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ گرج کر بولا۔ ''ورنہ گولیوں سے بھون ڈالوں گا''۔

اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد نے ان تینوں کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ صفیہ رحمان نامی لڑکی بھی جمشید خان کو خوفزدہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ شاید ان سب کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ جمشید خان یوں اچانک کیسے اور کیونکر ٹپک پڑا؟

''تت...... تم......'' چند لمحوں کے بعد آصف نے سنبھلتے ہوئے زبان کھولی۔ ''کک......''

''خاموش''۔ جمشید خان نے اسے ریوالور کے نشانے پر رکھتے ہوئے قطع کلامی کی۔ ''لڑکی سے دور ہو جاؤ ورنہ تمہارا بھیجا سامنے والی دیوار پر چپکا ہو گا''۔

زرینہ اور اس کا شوہر بدستور پھٹی پھٹی نگاہوں سے جمشید خان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ غالباً وہ اسے ڈاکو سمجھ رہے تھے۔

جمشید خان کا حکم سن کر آصف یوں تیزی کے ساتھ صفیہ سے دور ہوا جیسے اگر اسے لمحہ بھر کی دیر ہو گئی تو جمشید خان بلا دریغ گولی چلا دے گا۔

''تت...... تت...... تم...... شش...... شاید...... ڈا...... کو...... ہو؟'' اس بار زرینہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لل...... لیکن......''

''چپ خرانٹ بڑھیا!'' جمشید خان نے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ''میں بے شک ڈاکو ہوں لیکن غیروں کو لوٹتا ہوں۔ تم جیسے کمینے اور لالچی لوگ تو خونی رشتوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ یہ لڑکی تم میاں بیوی کی بھتیجی ہے ناں؟''

''ہاں...... ہاں جی''۔ موٹا اور بھدا شخص جلدی سے بولا۔ ''یہ...... میری...... یتیم......''

''شٹ اَپ''۔ جمشید خان نے اسے بات پوری کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ''لعنت ہو تم جیسے چچا پر...... کیا نام ہے تمہارا؟''

''شش...... شوکت حسین جی!'' خوف کے مارے وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ لڑکی...... میری ہونے والی...... بہو بھی ہے جی''۔

''بکواس مت کرو گھٹیا انسان''۔ جمشید خان بولا۔ ''میں تم لوگوں کی ساری باتیں سن چکا ہوں اور یہ بھی دیکھ چکا ہوں کہ تم اپنی یتیم بھتیجی سے کتنا پیار کرتے ہو؟ تم جیسے لعنتی انسان کو تو کسی گندے نالے میں ڈوب مرنا چاہئے''۔

''تم...... میرے ڈیڈی کی توہین کر رہے ہو؟'' آصف کو نہ جانے کیسے طیش آ گیا ا
میکانیکی انداز میں بول پڑا۔ ''یہ مجھ سے برداشت......

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جمشید خان نے ریوالور والا ہاتھ سیدھا کیا اور گو
کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی عقبی دیوار میں جا لگی۔ آصف چلاتا ہوا باپ کے پیچھے چھپ گیا۔

'' سامنے آؤ ہیرو کی اولاد!'' جمشید خان نے دوبارہ ریوالور سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم ایک کمزور لڑکی کے سامنے شیر بن رہے تھے اور اب بھیگی
طرح چھپ کیوں رہے ہو؟''

''تت...... تمہیں کیا چاہیے؟'' شوکت حسین نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ''ہمار
سے تمہیں چند ہزار روپے ہی ملیں گے''۔

''وہ کاغذات اٹھا کر اِدھر لے آؤ''۔ جمشید خان نے اشارے سے اسے فرش کی طرف
کرتے ہوئے حکمیہ انداز میں کہا۔ ''جلدی کرو ورنہ اس بار گولی تمہارے بیٹے کے سر میں
گا''۔

''یہ...... یہ کاغذات، یہ تو جی......''

''میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں''۔ جمشید خان نے اسے سرد لہجے میں ٹوکا۔ ''شا
آگے بڑھو ورنہ میں گولی چلانے لگا ہوں''۔

اب تردد کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی چنانچہ شوکت حسین آگے بڑھا اور کاغذات اٹھا
جمشید خان کے حوالے کر دیے۔ اب تک کی اس ساری کارروائی کے دوران صفیہ بالکل خا
رہی تھی تاہم وہ گاہے گاہے مشکور انداز میں جمشید خان کی طرف دیکھ لیتی تھی جو عین وقت پر
اس کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

جمشید خان نے کاغذات دیکھنے کی بجائے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیے اور پھر صفیہ کی طر
متوجہ ہو گیا۔ وہ اٹھارہ بیس برس کی خوبصورت دوشیزہ تھی تاہم اس وقت اس کے حسین و جمیل چہ
پر حزن و ملال کے سائے منڈلا رہے تھے۔ سوگوار حسن کا وہ شاہکار پہلی ہی نظر میں جمشید خان کو ا
لگا تھا۔

''اِدھر آؤ''۔ جمشید خان نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا۔ ''
مت...... میں تمہارے چچا سے بڑا ڈاکو نہیں ہوں''۔

ایک لمحے کے لیے وہ ہچکچائی اور پھر سہمے ہوئے انداز میں چلتے ہوئے اس کے قریب
گئی۔



''صفیہ رحمان...... یہی نام ہے ناں تمہارا؟'' اس نے نرم انداز میں استفسار کیا اور صفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا چاہتی ہو، تمہارے ان لالچی اور ذلیل رشتہ داروں کو گولی مار دوں؟'' جمشید خان نے سوال کیا۔

''ن...... نہیں''۔ وہ بمشکل بولی۔

''کیوں؟'' اس نے متحیر انداز میں پوچھا۔ ''کیا یہ تمہارے دشمن نہیں ہیں؟''

''ہیں...... لیکن......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''لیکن...... تم انہیں دشمن نہیں سمجھتی ہو؟'' جمشید خان بولا۔ ''میں ٹھیک کہہ ہوں ناں؟''

صفیہ نے جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''دیکھا سے''۔ جمشید خان طنزیہ انداز میں ان تینوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''ایسی ہوتی ہے خون کی تاثیر...... تم لوگ مال و دولت کے لالچ میں آ کر اس کی عزت و جان کے دشمن بنے ہوئے تھے مگر پھر بھی اسے تم لوگوں کی سلامتی کی فکر ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ سوچو اگر تم لوگوں کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہے تو؟''

وہ تینوں نادم انداز میں سر جھکا کر کھڑے رہے، جمشید خان نے کہا۔ ''میں چاہوں تو ابھی تم تینوں کا قصہ تمام کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا کروں گا نہیں''۔

اتنا کہہ کر وہ ایک بار پھر صفیہ کی پلٹا''۔ چلو میرے ساتھ''۔

''م...... میں...... کیوں؟'' اس نے اٹکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ''آ...... آپ ک...... کون ہیں؟''

''کم از کم تمہارا دشمن نہیں ہوں''۔ وہ بولا۔ ''اور نہ ہی کوئی چور لیٹرا ہوں۔ اگر تم ان عزت و جان کے دشمنوں سے محفوظ رہنا چاہتی ہو تو میرے ساتھ چلو''۔

''تم میری بھتیجی کو ورغلا رہے ہو''۔ اچانک شوکت حسین جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ شاید تمہاری نظر اس کی دولت پر......''

''میں تمہاری طرح حرام خور نہیں ہوں''۔ جمشید خان نے قطع کلامی کی۔ ''جو یتیموں اور مسکینوں کا مال کھاتے ہیں اور نہ ہی میں زبردستی صفیہ کو یہاں سے لے جاؤں گا، اس کی مرضی نہیں ہو گی تو اسے یہیں چھوڑ جاؤں گا''۔

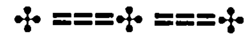
''یہ نہیں جائیں گی''۔ باپ کی دیکھا دیکھی آصف نے بھی ہمت کی۔ ''کسی ڈاکو کے ساتھ جا کر مرنا ہے کیا اس نے؟''

''میں جاؤں گی''۔ صفیہ نے جھٹ سے کہا، شاید یہ اس کی آصف سے شدید نفرت کا نتیجہ جو اس نے بلا سوچے سمجھے جمشید خان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

''تو پھر چلو''۔ جمشید خان بولا۔ ''دیر مت کرو، ابھی تھوڑی دیر کے بعد صبح ہو جائے گی''۔

''آپ ان پر نگاہ رکھیں۔ میں ابھی دس منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں''۔ اس نے خود اعتماد سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد صفیہ اور جمشید خان ان تینوں کو ایک کمرے میں بند کرنے کے بعد باہر نکل گئے۔ صفیہ نے ہاتھ میں ایک بڑا سا لیدر کا اٹیچی کیس اٹھا رکھا تھا۔ باہر گلی میں نکلتے ہی جمشید خان نے اس سے اٹیچی کیس لے لیا تھا۔



اس دن خان جی نے مولوی نصیب اللہ کو کسی نہ کسی طرح قائل تو کر لیا تھا مگر وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس نے نصیب خان کو آزاد کر دینے کی گزارش بھی کی تھی۔ جو خان جی کو کسی طرح بھی قبول نہیں تھی تاہم مصلحت کے پیشِ نظر اس وقت اس نے مولوی نصیب اللہ سے وعدہ کر لیا کہ چند روز کے اندر ہی نصیب خان کو آزاد کو دیا جائے گا۔ اب خان جی مسلسل مولوی نصیب اللہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مذہب کا سہارا لے کر اٹھنے والی یہ نئی طاقت آگے چل کر اس کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن سکتی تھی۔ آنے والے چیلنج سے بچنے کے لیے ابھی سے اس نئی قوت کا سر کچلنا ضروری تھا۔ آج اس کے ساتھ دو تین سو لوگ تھے مگر کل اس کے حامیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ سکتی تھی۔

پہلے تو خان جی نے سوچا تھا کہ اسے لالچ دے کر اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے گا مگر مولوی نصیب اللہ اس کی توقع سے بڑھ کر باضمیر ثابت ہوا تھا، اب اس سے نجات حاصل کرنا اشد ضروری ہو گیا تھا۔ موسیٰ خان کو وہ پشاور بھیج چکا تھا، حویلی میں اس وقت گل شیر خان اور زرولی ہی اس کام کے لیے موزوں آدمی تھے۔ چنانچہ خان جی نے سرِ شام ہی ان دونوں کو اپنے سامنے طلب کر لیا تھا۔

جس وقت وہ دونوں خان جی کے مخصوص کمرے میں داخل ہوئے اس وقت خان جی بے چینی سے ٹہلتے ہوئے سگار کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے۔ ان دونوں نے مؤدب انداز میں خان جی کو سلام کیا اور پھر جواب طلب انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ خان جی ٹہلتا ہوا صوفے کے قریب پہنچا اور پھر بیٹھنے کے بعد ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم دونوں مولوی نصیب اللہ کو جانتے ہو ناں؟'' اس نے استفسار کیا۔



''بہت اچھی طرح خان جی''۔ گل شیر خان نے ادب سے جواب دیا۔ ''آپ حکم کریں؟''

''آج کل وہ ہمارے لیے سخت دردِ سر بنا ہوا ہے''۔ خان جی اک ذرا توقف سے بولا۔ ''ہم نے اسے راہِ راست پر لانے کی بہت کوشش کی ہے مگر اس پر ایمانداری کا بھوت سوار ہے، اسے اپنے نفع نقصان کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ اس علاقے میں شرعی نظام لانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ ہمیں عام لوگوں کی صف میں کھڑا کرنا چاہتا ہے''۔

''اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیں خان جی؟'' زرولی نے بے رحمی سے سوال کیا۔

''ہاتھ پاؤں توڑنے سے کام نہیں چلے گا''۔ خان جی نے کہا۔ ''اسے سیدھا اوپر بھیجنا ہے مگر یہ کام انتہائی رازداری کا متقاضی ہے۔ ہمارا نام کسی صورت میں نہیں آنا چاہئے۔ بلکہ اس کے قتل کا الزام اس طرح کسی اور کے سر جانا چاہیے کہ علاقے کے لوگ قائل ہو جائیں، ان کے پاس کسی شک و شبے کی گنجائش نہ رہے''۔

''میں سمجھ گیا خان جی''۔ گل شیر خان پُر جوش آواز میں بولا۔ ''یہ کام تو بہت ہی آسان ہے۔ آج رات ہی ہو سکتا ہے۔ آپ پر معمولی سا الزام بھی نہیں آئے گا بلکہ صبح ہونے سے قبل ہی لوگ قاتل کو پکڑ چکے ہوں گے''۔

''کیسے گل شیر خان؟'' خان جی فرطِ جذبات سے دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ''بتاؤ کیسے انجام دو گے یہ کام؟''

''زرولی!'' گل شیر خان، خان جی کی بات کا جواب دینے کی بجائے زرولی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''تم جا کر کہیں سے گل رحمان کو ڈھونڈ لاؤ لیکن دھیان رکھنا اسے چھپا کر حویلی میں لانا۔ گاؤں کے کسی آدمی کی نظر تم دونوں پر نہیں پڑنی چاہئے''۔

''اس چرسی کا کیا کرنا ہے تم نے؟'' زرولی نے سوال کیا۔ ''وہ تو پڑا ہو گا کہیں نشے میں دھت ہو کر''۔

''تم اسے لے کر تو آؤ''۔ وہ بولا۔ ''باقی کام میرا ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ زرولی اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا اور گل شیر خان سوچا ہوا منصوبہ خان جی کے گوش گزار کرنے لگا۔

''ویل ڈن گل شیر خان''۔ پورا منصوبہ سنتے ہی خان جی کی باچھیں کھلتی چلی گئیں اور چہرے پر ایک بے رحم مسکراہٹ طاری ہو گئی۔



جمشید خان صفیہ رحمان کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مختلف گلیوں سے گزرتا، ایک کشادہ

سڑک پر پہنچ گیا۔ صفیہ کی موجودگی میں اس نے فلیٹ کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ صفیہ کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا ضروری تھا اور وہ محفوظ جگہ اس کے گھر کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا کھلی سڑک پر پہنچتے ہی اس نے کسی ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

صفیہ رحمان ایک بڑی سی چادر میں لپٹی خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی ابھی تک جمشید خان نے اسے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور نہ ہی صفیہ نے اس سے کسی قسم کا استفسار کیا تھا۔ شاید اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ چلتے چلتے دونوں ایک چوک تک پہنچ گئے۔

''میرے خیال میں یہیں رک کر کسی سواری کا انتظار کرتے ہیں''۔ جمشید خان ہاتھ میں پکڑا ہوا اٹیچی کیس فٹ پاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر کے بعد صبح تو ہونے ہی والی ہے، کوئی نہ کوئی سواری مل ہی جائے گی''۔

''جیسے...... آپ کی مرضی''۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟''

''ڈرو مت''۔ جمشید خان بولا۔ ''میں کوئی ڈاکو نہیں ہوں بلکہ ایک شریف اور ذمہ دار......''

معاً ایک گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس ان پر پڑی اور جمشید خان کی بات نامکمل رہ گئی۔

چند لمحوں کے بعد گاڑی ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ وہ ایک پولیس موبائل تھی۔ جمشید خان مطمئن انداز میں گاڑی کی طرف بڑھا مگر اس سے قبل ہی گاڑی کی فرنٹ سیٹ سے ایک فربہ اندام باوردی حوالدار اترا اور توند پر بیلٹ درست کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''لو جی ایک عاشقوں کی جوڑی مل گئی۔ چلو گاڑی میں بیٹھو تھانے چل کر بات ہو گی اور تم دونوں کا بیاہ رچائیں گے''۔

''شٹ اَپ یو نان سینس!'' جمشید خان اس کی بکواس سن کر چلایا۔ ''جانتے ہو تم کس سے بات کر رہے ہو؟ میں ایس پی جمشید خان ہوں فرام کرائم برانچ!''

''بلے بھئی بلے''۔ حوالدار ٹوپی اتار کر اپنی گنجی کھوپڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایس پی صاحب ذرا سروس کارڈ تو دکھاؤ تا کہ تمہیں کوئی سلوٹ شلوٹ ماریں''۔

جمشید خان نے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورا اور پھر کارڈ نکالنے کے لیے ہاتھ جیب میں ڈال دیا، مگر کارڈ ندارد تھا۔ گھبرا کر اس نے تمام جیبیں کھنگال ڈالیں لیکن کارڈ ہوتا تو ملتا؟...... وہ پریشانی کے عالم میں اس موٹے حوالدار کی جانب دیکھ رہا تھا جو اس کی حالت پر استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔



''بولو کرائم برانچ کے ایس پی صاحب! کدھر ہے تمہارا سروس کارڈ؟'' حوالدار نے مذاق اُڑانے والے انداز میں پوچھا۔ ''پینٹ شرٹ کی جیبیں ٹٹولو شاید کسی کونے کھدرے سے برآمد ہو جائے''۔

''حوالدار! تم بہت پچھتاؤ گے''۔ جمشید خان تنبیہی انداز میں بولا۔ ''میرا نام جمشید خان ہے اور میں واقعی کرائم برانچ کا ایس پی ہی ہوں''۔

''اوئے ایس پی کے مامے!'' حوالدار نے پولیس والوں کا روایتی انداز اپناتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک جوان کڑی کو گھر سے بھگا کر لے جا رہے ہو اور اوپر سے قانون کو تڑی لگاتے ہو؟ حوالدار جبرالدین جابر کو آنکھیں دکھاتے ہو۔ تیرے جیسے کئی غنڈے موالی میں نے سیدھے کیے ہیں۔ چلو کڑی کو ساتھ لے کر گاڑی میں بیٹھو ورنہ اِدھر سڑک پر ہی لمبا کر دوں گا''۔

''ٹھیک ہے جبرالدین!'' جمشید خان چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔ ''بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں؟ چلو میں تیار ہوں تھانے چلنے کے لیے''۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر فٹ پاتھ پر رکھا ہوا اٹیچی کیس اٹھایا اور صفیہ سے بولا۔ ''چلو گاڑی میں بیٹھو''۔

''مم...... میں...... نہیں بیٹھوں گی''۔ وہ بدحواس ہو کر بولی، پولیس کی گاڑی دیکھ کر پہلے ہی اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں''۔ مم...... میں...... اپنے گھر...... جانا چاہتی ہوں''۔

''کیسے نہیں بیٹھو گے سوہنیو!'' حوالدار جبرالدین نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''یہ تو تمہیں گھر سے نکلتے وقت سوچنا چاہیے تھا۔ ویسے اس لبو میں تمہیں کیا نظر آیا تھا جو تم اس کے ساتھ بھاگ نکلیں؟''

''حوالدار! اپنی اوقات میں رہو''۔ جمشید خان نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ''تم بدتمیزی کر رہے ہو یاد رکھنا یہ بدتمیزی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی''۔

''بلے بھئی بلے''۔ حوالدار نے بھونڈے انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کون سی فلم کا ڈائیلاگ تھا؟ مجھے یاد نہیں آ رہا اس وقت، کوئی بھلا سا نام تھا''۔

''جب تیری وردی اُتر جائے گی تو نام بھی یاد آ جائے گا''۔ اس نے زہر خند سے جواب دیا۔ ''ابھی تو تم بہت چہک رہے ہو مگر جب مرغا بن کر ٹانگیں دینا پڑیں گی تو پھر تم سے پوچھوں گا''۔

''واہ کیا انداز ہے''۔ حوالدار بدستور مذاق اُڑانے والے انداز میں بولا۔ ''بالکل ایک اینگری ینگ مین والا۔ پر ایسے ڈائیلاگ حوالدار جبرالدین جابر نے بہت دفعہ سنے ہوئے ہیں۔ یہ اسٹائل اب پرانا ہو چکا ہے، چلو گاڑی میں بیٹھو ورنہ اِدھر ہی مرغا بنا کر تیری اس مرغی''......

"شٹ اَپ یو باسٹرڈ"۔ جمشید خان نے چلا کر قطع کلامی کی اور پھر اٹیچی کیس پھینک کر کی سی پھرتی سے حوالدار پر چھلانگ لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ریوالور کی سرد نال حوالدا کنپٹی سے لگ چکی تھی۔

"اب بول جبر الدین جابر کی اولاد!" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "کر دوں کھوپڑی میں سو دکھا دوں تجھے اینگری ینگ مین بن کر؟"

موبائل گاڑی سے چند کانسٹیبل چھلانگیں لگاتے ہوئے اُترے اور رائفلیں سیدھی کر ہوئے جمشید خان کی طرف بڑھے۔

"وہیں رک جاؤ"۔ جمشید خان نے انہیں وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں جبر الدین جابر کے سر میں دو تین سوراخ کر دوں گا"۔

کانسٹیبل اس کی وارننگ سن کر چند قدم دور رک گئے۔ اب وہ بے بسی کے عالم میں ا حوالدار کو جمشید خان کے نرغے میں پھنسا دیکھ رہے تھے۔ جمشید خان نے بایاں ہاتھ اس کی گر میں ڈال رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں موجود ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا رکھا تھا۔

"اپنے سپاہیوں سے بول یہاں سے بھاگ جائیں"۔ جمشید خان نے حوالدار کو حکم د ہوئے سخت انداز میں کہا۔ "ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا"۔

"تت...... تم ...... قانون ...... کو ہاتھ میں"۔ حوالدار کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز ہوئی مگر جمشید خان نے اسے بات کرنے کا موقع نہ دیا۔

"جو میں نے کہا ہے کہ وہ کرو"۔ جمشید خان اس کی گردن کے گرد بازو کستے ہوئے "نہیں تو میں ٹریگر دبانے لگا ہوں"۔ اس دوران جمشید خان حوالدار کے ہولسٹر سے ریوالور تھا۔

"دیکھتے کیا ہو اُلو کے پٹھو!" حوالدار سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "دور بھاگ جاؤ سے۔ اس کے سر پر خون سوار ہے"۔

حوالدار کا حکم سنتے ہی سپاہی چاروں ناچار واپس پلٹے اور پھر تیزی سے ایک طرف گئے۔ سپاہی جب نظروں سے اوجھل ہو گئے تو جمشید خان نے دوبارہ حوالدار کو حکم دیا۔ "اٹیچی اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔ اگر کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو نتیجہ برا ہوگا، پولیس والوں بالکل رحم نہیں آتا"۔ اتنا کہہ اس نے حوالدار کی گردن آزاد کر دی۔

حوالدار جبر الدین جابر کی ساری اکڑ خانی ہوا ہو چکی تھی۔ جمشید خان کو وہ کوئی عام سا گرد سمجھا تھا مگر اب وہ اسے کوئی عادی مجرم نظر آ رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ مرے



قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور فٹ پاتھ پر پڑا ہوا اٹیچی کیس اٹھا کر گاڑی کے اندر رکھ دیا۔

اس کے بعد جمشید خان نے صفیہ رحمان کو گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھا دیا اور دوبارہ حوالدار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تمہارا تعلق صدر تھانے سے ہے ناں؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں......مم......مگر"۔ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"گاڑی تھانے پہنچا دی جائے گی"۔ جمشید خان اس کی طرف ریوالور سیدھا کرتے ہوئے بولا۔ "اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں بلا تردد تجھے گولی مار دوں گا"۔

اس کا حکم سنتے ہی حوالدار پلٹا اور گاڑی سے دور ہوتا چلا گیا۔

حوالدار کی طرف سے جب جمشید خان کو مکمل اطمینان ہو گیا تو اس نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ صفیہ رحمان سہمے ہوئے انداز میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور کن اکھیوں سے کبھی کبھار اس کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ جمشید خان کے بارے میں ابھی تک وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ کسی طرح بھی اسے ڈاکو نہیں لگتا تھا اور نہ ہی اس کا انداز پولیس والوں کی طرح تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" چند لمحوں کے بعد جمشید خان نے خاموشی کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔

"کک......کچھ نہیں"۔ اس نے خوفزدہ سی آواز میں جواب دیا۔

"تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟" وہ گردن گھما کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا مجھے ڈاکو سمجھ رہی ہو یا کوئی چور اچکا؟"

"کک......کیا آپ سچ مچ کرائم برانچ میں ایس پی ہی ہیں؟" صفیہ رحمان نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ "دیکھئے مم...... میں آپ پر شک نہیں کر رہی، صرف اپنا......"

"پلیز مس صفیہ رحمان"۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم محفوظ ہاتھوں میں ہو۔ اب تمہارا اچھا تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا مجھ پر بھروسہ رکھو اور رہ گئی میری بات کہ میں کون ہوں تو ڈونٹ وری۔ میں سچ مچ پولیس والا ہی ہوں"۔

"لل...... لیکن...... وہ پولیس والے تو آپ کو نہیں پہچان رہے تھے؟" صفیہ نے دوبارہ مشکوک انداز میں سوال کیا۔

"اس شہر میں نہ جانے کتنے پولیس والے ہوں گے، وہ سب ایک دوسرے کو پہچانتے تو نہیں ہیں ناں؟ اور میں تو ویسے بھی کرائم برانچ میں ہوں عام پولیس والوں سے ہمارا سابقہ کم ہی پڑتا ہے"۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کے پاس سروس آئی ڈی کارڈ بھی تو نہیں تھا؟" وہ بدستور مشکوک انداز میں بولی۔ "ایسے میں کوئی بھی آپ کا اعتبار نہیں کرے گا"۔

''تم کیا کہتی ہو؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''تمہیں کیا میں پولیس والا نہیں لگتا؟''

''نن...... نہیں''۔ وہ گھبرا کر بولی۔ ''میں نے یہ تو نہیں کہا''۔

''شک تو کر رہی ہوناں؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہ...... وہ...... دراصل...... میں''۔

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے''۔ جمشید خان نے قطع کلامی کی۔ ''میں تمہاری پرابلم ہوں۔ تم ایک حادثے سے گزر کر آ رہی ہو اور ویسے بھی تمہارے اپنے تمہاری نگاہوں میں نامعتبر چکے ہیں۔ ایسے میں ایک غیر پر اعتماد کرنا تمہارے لیے مشکل ہے، بہرکیف میں وہ نہیں ہوں جو تم رہی ہو؟''

''سوری''۔ اس نے نادم انداز میں کہا۔ ''انسانوں پر سے اگر میرا اعتبار اٹھ چکا ہے تو میں میرا کوئی قصور نہیں ہے''۔

''میں سمجھتا ہوں''۔ وہ بولا۔ ''بہرحال تم مطمئن رہو۔ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ تمہیں تمہارا حق دلا کر رہوں گا''۔

اس کے بعد وہ جمشید خان کی کوٹھی پر پہنچنے تک خاموش رہے تھے۔

===

شہناز کے فلیٹ پر پہنچنے کے بعد جہانداد نے بنگش کے تینوں آدمیوں کو باندھ کر ایک کمرے میں ڈال دیا۔ شہناز نے زخمی آدمی کی مرہم پٹی کر دی تھی مگر ان تینوں کو ہوش میں لانے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ جہانداد کو جمشید خان سے بات کرنے کی جلدی تھی مگر شہناز کے فلیٹ پر فون کی سہولت موجود نہیں تھی، اس نے جب شہناز سے اس سلسلے میں بات کی تو وہ بولی۔ ''ابھی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد صبح ہونے والی ہے۔ تھوڑی دیر آرام کرلو، صبح ناشتہ کرنے کے بعد کسی قریبی پی سی او سے جمشید خان کو فون کر لینا''۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو''۔ جہانداد بولا۔ ''مگر میں جمشید خان کی سلامتی کے متعلق فکر مند ہوں نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟''

''وہ کوئی بچہ نہیں ہے''۔ شہناز نے کہا۔ ''ایک پولیس آفیسر ہے، اپنی حفاظت کرنا جانتا ہے تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ سو جاؤ''۔

''نہیں''۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''سو کر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اگر چائے مل جائے تو میں تازہ دم ہو سکتا ہوں''۔

''یہ کون سی مشکل بات ہے؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''کچن میں سب کچھ موجود ہے۔ میں



ناشتے کا انتظام کرتی ہوں، تب تک تم آرام کرو''۔

''نہیں''۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں اس دوران قیدیوں کو چیک کر لیتا ہوں۔ ہوش میں آنے کے بعد انہیں بھی تو ناشتہ دیا جائے گا''۔

''میں بنالوں گی بے فکر رہو''۔ اتنا کہہ کر شہناز کچن کی طرف چل پڑی جبکہ جہانداد قیدیوں والے کمرے کی طرف چل پڑا۔

کمرے کا تالا کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو تینوں قیدی بدستور بے ہوشی کے عالم میں فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ عامر کمال اور سعید اختر کو چھوڑ کر جہانداد نئے قیدی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے داہنی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ ڈاکٹر شہناز نے اس کی زخمی ٹانگ کی بینڈیج کر دی تھی۔ وہ انجکشن کے زیر اثر بے ہوش تھا مگر جہانداد نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش جاری رکھی۔ آخر کار جب اس کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالا گیا تو تھوڑی ہی دیر میں اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔

''مم...... میں...... کہاں ہوں؟'' پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد اس نے کراہ کر سوال کیا۔

''اپنی سسرال میں ہو''۔ جہانداد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''مزا آ رہا ہے ناں؟''

''تت...... تم کون ہو؟'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔ ''اور مجھے باندھ کیوں رکھا ہے؟''

''میں خدائی فوجدار ہوں''۔ وہ دل لگی کے انداز میں بولا۔ ''تم ایک گلی میں زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے اور بے ہوش تھے۔ جذبۂ رحم سے مجبور ہو کر میں تمہیں یہاں اٹھا لایا تاکہ تمہارا علاج کروا سکوں''۔

''مم...... مگر...... تم نے مجھے باندھ کیوں رکھ ہے؟'' اس نے الجھن آمیز انداز میں سوال کیا۔

''عجیب بیوقوف آدمی ہو تم''۔ جہانداد نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ زخمیوں کو باندھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ ہاتھ پاؤں چلا کر ڈاکٹر کو ڈسٹرب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے زخم کو بھی مزید خراب کر دیتے ہیں''۔

''پر اب تو میں ٹھیک ہوں، پلیز مجھے کھول دو''۔ اس نے استدعا کی۔ ابھی تک اس کی نگاہ عامر کمال اور سعید اختر پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ جہانداد کے مذاق کو اب تک سمجھ چکا ہوتا۔

''مطمئن رہو، کھول دوں گا''۔ جہانداد بولا۔ ''مگر پہلے کچھ باتیں کر لیتے ہیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم کون ہو۔ کیا کرتے ہو اور تمہیں زخمی کس نے کیا تھا؟''

''یہ تم پولیس والوں کے انداز میں کیوں سوال کر رہے ہو؟'' اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''یار تم تو خواہ مخواہ شک کر رہے ہو؟'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں تو محض رسماً ہی دریافت کر رہا تھا، تم اگر نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ''۔

اس نے ایک نظر الجھن آمیز انداز میں جہانداد کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''میں ڈاکوؤں کے ہاتھ چڑھ گیا تھا، وہ میری گاڑی چھین کر لے گئے ہیں اور ایک بریف کیس بھی لے گئے ہیں جس میں بیس ہزار روپے کی رقم اور چند ضروری کاغذات تھے''۔

''تمہیں تو جھوٹ گھڑنا بھی نہیں آتا''۔ جہانداد نے بدلے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ اسٹوری تو اب تک متعدد فلموں اور ڈراموں میں دہرائی جا چکی ہے۔ کیا ابراہیم بنگش نے تمہیں جھوٹ بولنے کی تربیت نہیں دی ہے؟''

''تت...... تم کون ہو؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا پولیس والے ہو؟''

''میں تمہارا باپ ہوں''۔ جہانداد نے ریوالور نکالتے ہوئے جواب دیا۔ ''بتاؤ ایس پی جمشید خان کے ساتھ تم لوگوں نے کیا کیا؟ ورنہ گولی مار دوں گا''۔

''کک...... کون ایس پی جمشید خان؟'' اس نے گھبرا کر سوال کیا۔ ''میں کسی ایس پی جمشید خان کو نہیں جانتا''۔

''گردن گھما کر پیچھے دیکھو''۔ جہانداد اسے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے باپ بنگش کے دو اور بیٹے بھی یہاں موجود ہیں۔ انہی کو تم لوگ قتل کرنے کے لیے آئے تھے ناں؟''

جہانداد کے اشارے پر اس نے گردن گھما کر اپنے عقب میں دیکھا تو فرش پر عامر کمال اور سعید اختر کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے متحیر رہ گیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔ ''میں انہیں نہیں جانتا اور نہ ہی بنگش سے میرا کوئی تعلق ہے''۔

''تم بتاؤ گے اور ضرور بتاؤ گے''۔ جہانداد اس کی پیشانی پر ریوالور رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں دس تک گنوں گا، اگر تم نے گنتی مکمل ہونے تک زبان نہ کھولی تو میں ٹریگر دبا دوں گا، ایک...... دو...... تین...... چار...... پانچ...... چھ...... سات...... آٹھ''۔

''یہ گنتی کیوں شروع کر رکھی ہے؟'' اچانک شہناز کی آواز جہانداد کی سماعتوں سے ٹکرائی اور اس کی گنتی ادھوری رہ گئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا تو شہناز دروازے میں کھڑی ہوئی تھی اور متحیر انداز میں جہانداد کی طرف دیکھ رہی تھی۔



''یہ...... یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اس نئے قیدی کو ذرا گنتی یاد کروا رہا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''تم جاؤ...... میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں''۔

''پہلے ناشتہ کرلو''۔ وہ بولی۔ ''بعد میں جو دل چاہے کرتے رہنا۔ چلو اٹھو''۔

''ناشتہ میں ذرا دیر کے بعد کروں گا''۔ وہ بولا۔ ''پہلے ذرا اس کا انٹرویو لے لوں''۔

''پلیز جہانداد!'' اس نے لہجے میں مٹھاس سموتے ہوئے کہا۔ ''ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں نے بڑی محنت کے ساتھ تیار کیا ہے''۔

''اچھا چلو...... اب تمہیں انکار تو نہیں کیا جا سکتا ناں؟'' جہانداد نے اٹھتے ہوئے جواب دیا اور شہناز کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے۔ اتنے عرصے کے بعد پہلی بار جہانداد نے اس کی بات مانی تھی۔

===

زرولی اس روز آدھے گھنٹے کے اندر ہی گل رحمان کو ڈھونڈ لایا تھا وہ اسے ایک چھپر کے نیچے نشے کی حالت میں پڑا ہوا مل گیا تھا۔ زرولی نے جاتے ہی جب اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ تو چند لمحے تو وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو تب زرولی نے اس کے سر کے بال پکڑ کر کھینچے تو وہ کراہ کر بمشکل اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوا مگر آنکھیں اس نے بدستور بند کر رکھی تھیں۔

''گل رحمان!'' زرولی اس کا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آنکھیں کھولو بدبخت''۔

''ابھی صبح نہیں ہوئی''۔ وہ غنودگی کے عالم میں بولا۔ ''مجھے سونے دو۔ کیا کرتے ہو؟''

''احمق آدمی! میری بات تو سنو''۔ زرولی نے دوبارہ زور سے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں تمہاری من پسند چیز دوں گا، اٹھو میرے ساتھ چلو''۔

''مت ہلاؤ مجھے...... میں جہاز سے گر جاؤں گا''۔ اس نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''الو کے پٹھے! تم ایک جھلنگا سی چارپائی پر پڑے ہوئے ہو''۔ اس بار زرولی نے اسے پکڑ کر چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اٹھو میں تمہیں بہت ساری چرس دوں گا۔ وہاں حویلی میں میرے پاس بہت سی چرس پڑی ہوئی ہے''۔

چرس کا نام سنتے ہی گل رحمان کا نشہ ایک پل میں ہرن ہو گیا اور اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ ''تم...... تم سچ کہہ رہے ہو کیا؟'' اس نے خوشی کے عالم میں پوچھا۔

''تو اور کیا؟'' زرولی نے کہا۔ ''میں بھلا تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟''

''نہیں تم پہلے قسم کھاؤ''۔ وہ اصرار کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تم پر اعتبار نہیں ہے، وہاں جو جا کر تم اپنی بات سے مکر بھی سکتے ہو؟''

''ٹھیک ہے''۔ زرولی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں قسم کھاتا ہوں کہ اپنی بات سے نہیں مکروں گا''۔

''اوں...... ہوں''۔ وہ سر کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''یوں نہیں۔ اللہ پاک کی قسم کھا کر کہو تم اپنی بات سے نہیں مکرو گے؟''

''تمہیں اس عالم میں بھی خدا یاد ہے؟'' زرولی نے حیرت سے پوچھا۔ ''یقین نہیں آتا؟''

''مجھے تمہارے یقین کی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ بولا۔ ''اللہ جانتا ہے کہ میں اسے کبھی نہیں بھولا''۔

نشے میں ہوتے ہوئے بھی اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی مگر زرولی جیسے احمق شخص کی سمجھ سے باہر تھی یہ بات۔ زرولی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم نے کبھی مسجد کی شکل دیکھی ہے؟''

''نہیں''۔ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''مسجد میں مجھے مولوی نصیب اللہ نہیں گھسنے دیتا''۔

''کیوں؟'' زرولی نے استفسار کیا۔ ''مسجد تو خدا کا گھر ہے۔ مولوی نصیب اللہ کے باپ کا تو نہیں ہے کہ وہ تمہیں روکتا ہے؟''

''میں نشے میں ہوتا ہوں ناں؟'' وہ بولا۔ ''اس لیے مولوی مجھے مسجد کے اندر قدم رکھنے سے روک دیتا ہے''۔

''وہ تمہارے ساتھ زیادتی کرتا ہے''۔ زرولی نے کہا۔ ''تم اس سے پوچھتے کیوں نہیں؟ احمق آدمی تمہیں مسجد میں جا کر خدا سے گناہوں کی معافی طلب کرنی چاہیے۔ مولوی تمہارا دشمن ہے وہ نہیں چاہتا کہ تمہاری حالت سدھرے''۔

زرولی اس قسم کی باتیں کرتا ہوا ورغلا کر اسے حویلی میں لے آیا۔ گل شیر خان اور زرولی نے جب اسے خان جی کے سامنے پیش تو اس وقت تک گل رحمان پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں آ چکا تھا اور مولوی نصیب اللہ کے خلاف اس کے دل و دماغ میں نفرت کی آگ پوری شدت کے ساتھ بھڑک رہی تھی۔ یہ سارا کام گل شیر خان اور زرولی نے مل کر انجام دیا تھا۔

انہوں نے گل رحمان کو نہ صرف بہت ساری چرس دینے کا وعدہ کیا تھا بلکہ خان جی سے ایک موٹی رقم دلانے کا بھی یقین دلایا تھا۔ گل رحمان مولوی نصیب اللہ کے خلاف کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔



خان جی نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے گل رحمان پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی اور پھر واسکٹ کی اندرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالتے ہوئے اپنے سامنے رکھی ہوئی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''گل رحمان! یہ سارے نوٹ تمہارے ہو سکتے ہیں مگر انہیں حاصل کرنے کے لیے تمہیں آج ہی مولوی نصیب اللہ کی پٹائی کرنا پڑے گی اور اسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں بھی دینا ہوں گی۔ کیا تم یہ کام کر لو گے؟''

''کیوں نہیں خان جی؟'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''میں کوئی مولوی سے ڈرتا تو نہیں ہوں۔ وہ کم بخت تو ویسے بھی میرا دشمن ہے۔ آج تو میں اسے سچ مچ جان سے مار دوں گا۔ مگر وہ مجھے اکیلا ملے گا کہاں؟ ابھی تو وہ شاید مسجد میں مغرب کی نماز پڑھانے کے لیے جا چکا ہوگا۔ وہاں بہت سے لوگوں کی موجودگی میں یہ کام شاید نہ ہو سکے''۔

''اسے جان سے نہیں مارنا ہے''۔ خان جی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ تھوڑی بہت پٹائی کر کے دھمکانا ہے تاکہ وہ آئندہ تمہیں مسجد میں داخل ہونے سے نہ روک سکے۔ یہ کام تم لوگوں کے سامنے بھی کر سکتے ہو۔ انہیں بھی معلوم ہونا چاہیے ناں کہ قصوروار مولوی ہے''۔

''بالکل بالکل خان جی''۔ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مولوی قصوروار ہے اور میرے ساتھ زیادتی کرتا ہے''۔

''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا''۔ خان جی نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''اس معاملے میں کہیں بھی ہمارا نام نہیں آنا چاہیے اور نہ ہی گل شیر خان اور زرولی کا ورنہ ہم تجھے بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیں گے۔ سمجھ گئے ناں؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا خان جی''۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔ ''اب میں جاؤں کیا؟''

''ہاں جاؤ''۔ خان جی نے کہا۔ ''یہ پیسے رات کے وقت زرولی تم تک پہنچا دے گا''۔

''اور چرس بھی خان جی''۔ وہ یاد دلانے والے انداز میں بولا۔ ''ورنہ میری رات مشکل سے کٹے گی۔ میں چرس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں نکال سکتا تھا''۔

''تمہاری ضرورت سے زیادہ ملے گی''۔ خان جی نے کہا۔ ''اب جاؤ۔ دیر ہو گئی تو مولوی مسجد سے نکل کر گھر پہنچ جائے گا''۔

''مجھ سے بچ کر کیسے جا سکتا ہے؟'' وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ ''آج تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا''۔

نوٹوں کی گڈی اور اس کے ساتھ بہت ساری چرس کی پیش کش نے گل رحمان کے جسم میں خون کی گردش تیزی کر دی تھی۔ چند لمحوں کے بعد زرولی اسے محتاط انداز میں حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکال رہا تھا۔

=== === ===

خان جی سے ملاقات کرنے کے بعد اگرچہ مولوی نصیب اللہ مطمئن ہو گیا تھا مگر چند مخلص لوگوں کے مشورے پر اس نے دو محافظ رکھ لیے تھے۔ دونوں محافظ نوجوان تھے، ان کا تعلق علاقے سے ہی تھا اور انہوں نے یہ ڈیوٹی بلا معاوضہ سنبھال رکھی تھی۔ وہ دونوں خفیہ انداز میں مولوی صاحب کی محافظت سرانجام دے رہے تھے۔ ایسا وہ مولوی صاحب کے مشورے پر کر رہے تھے کیونکہ مولوی صاحب نہیں چاہتا تھا کہ اس بات کا چرچا ہو۔ ویسے بھی جب سے اس کے دل میں خوفِ الٰہی پیدا ہوا تھا وہ زندگی اور موت سے بے پروا ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے دل میں کسی قسم کا ڈر نہیں رہا تھا۔

دونوں محافظوں کے پاس ہر وقت لوڈ ریوالور رہتے تھے اور وہ اکثر اوقات مولوی کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ ان کی اصلیت مولوی صاحب کے صرف قابلِ اعتماد قریبی ساتھیوں کو ہی معلوم تھی۔ گاؤں کے دیگر لوگوں کو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، محافظوں کے نام ناصر خان اور خائستہ گل تھے۔ پانچوں وقت کی نماز وہ مولوی صاحب کی امامت میں ہی ادا کرتے تھے۔

اس دن مغرب کی نماز پڑھ کر ناصر خان اور خائستہ گل اجتماعی دعا سے قبل ہی باہر نکل آئے جبکہ مولوی صاحب اجتماعی دعا میں مصروف تھے۔ ناصر خان اور خائستہ گل مسجد سے باہر نکل کر سیڑھیوں کے قریب ٹھہر کر دنیاوی باتوں میں لگ گئے۔ باتوں کا تو بس بہانہ تھا دراصل وہ مولوی صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک انہیں دور سے گل رحمان تقریباً بھاگنے کے انداز میں مسجد کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ دونوں لمحہ بھر تو اسے متحیر انداز میں دیکھتے رہے پھر ناصر خان بولا۔ ''دیکھو آج یہ نشئی بڑا چاق و چوبند نظر آ رہا ہے؟''

''مجھے تو یہ بے چین نظر آ رہا ہے۔'' خائستہ گل نے کہا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے آج اسے چرس نہ ملی ہو۔ ایک سگریٹ سے تو اس کم بخت کا دل ہی نہیں بھرتا جب تک اکٹھی پانچ چھ نہ پھونک ڈالے اسے نشہ ہی نہیں چڑھتا''۔

''بے ضرر سا انسان ہے یار''۔ ناصر خان ہمدردانہ انداز میں بولا۔ ''اپنی دنیا میں مست رہتا ہے کسی کا نقصان تو نہیں کرتا''۔

''ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے''۔ خائستہ گل نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''مگر نشئی کا کیا اعتبار کب



بھی اس کی ذہنی رو بہک سکتی ہے، ایسے میں وہ اپنا یا کسی دوسرے کا نقصان کر سکتا ہے''۔

''چھوڑو یار''۔ ناصر خان نے بیزاری سے کہا۔ ''ہمارا کون سا چاچا ماما لگتا ہے؟''

اسی دوران مسجد کے دروازے سے نمازی نکلنے لگے اور گل رحمان بھی بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ دروازے سے نکلنے والے لوگ اپنے اپنے راستوں پر بکھرتے گئے۔ مولوی صاحب سب سے آخر میں ایک بزرگ قسم کے شخص کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے۔ گل رحمان کو اسی موقع کا انتظار تھا مولوی صاحب جونہی سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے، گل رحمان کسی باز کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔

''آج تجھے نہیں چھوڑوں گا مولوی''۔ اسے گریبان سے پکڑ کر گل رحمان ایک جھٹکا دیتے ہوئے چلایا۔ ''تم نے مسجد کو اپنے باپ کا گھر سمجھ رکھا ہے۔ مجھے مسجد میں داخل ہی نہیں ہونے دیتے''۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے نہایت سُرعت کے ساتھ مولوی صاحب کو دو تین تھپڑ گھونسے جڑ دیے۔ مولوی صاحب جسمانی صحت میں اس سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا مگر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے گل رحمان کے خلاف جوابی کارروائی کرنے سے گریز کیا۔ یہ ساری کارروائی گل رحمان نے محض چند سیکنڈوں میں ہی انجام دے ڈالی تھی حالانکہ مولوی صاحب کے دونوں محافظ چند قدموں کے فاصلے پر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں محافظوں کے معاملے کو سمجھنے اور سنبھلنے تک گل رحمان مولوی صاحب کا گریبان تار تار کر چکا تھا۔

سب سے پہلے ناصر خان نے ہی گل رحمان کو کھینچ کر مولوی صاحب سے الگ کیا اور خائستہ گل نے جوش میں آ کر اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ وہ نہایت بے دردی کے ساتھ گل رحمان کی پٹائی کر رہا تھا۔

''حرام خور...... نشئی کے بچے! تیری تو میں''۔ اس سے آگے کے جملے جو خائستہ گل کے منہ سے پھولوں کی طرح جھڑ رہے تھے وہ ناقابل اشاعت ہیں تاہم وہ گل رحمان کے شجرۂ نسب میں جو ترمیم کر رہا تھا اس پر کوئی بھی شریف انسان یقین نہ کرتا۔ وہ گل رحمان کی ماں بہن کا تعلق بہت ہی مکروہ، حرام اور ناپاک قسم کے جانوروں سے جوڑ رہا تھا۔

دوسری طرف ناصر خان بزرگ شخص کے ساتھ مل کر مولوی صاحب کو حلیہ درست کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ جب مولوی صاحب کی حالت کچھ درست ہوگئی تو اس نے فوراً ناصر خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''خائستہ گل کو روکو۔ اسے نہ مارے، وہ بے قصور ہے''۔

''مولانا صاحب! آپ کیسی بات کرتے ہیں؟'' ناصر خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس حرام زادے نے آپ پر سرِ عام حملہ کیا ہے اور آپ کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دی

ہیں۔ پھر بھی آپ اسے بے قصور سمجھ کر اس کی طرف داری کر رہے ہیں؟''

''جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے''۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔''یہ کام گل رحمان سے کروایا گیا ہے اس نے اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ اسے جانے دو''۔

''ٹھیک ہے مولانا صاحب''۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔''آپ گھر جائیں۔ میں خائستہ گل کو سمجھا دیتا ہوں، بالکل بے فکر رہیں گل رحمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا''۔

''اللہ تعالیٰ تجھے اس کا اجر دے گا''۔ مولوی صاحب نے دعائیہ انداز میں جواب دیا اور پھر اپنے ساتھی بزرگ کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان دونوں کے جاتے ہی ناصر خان نے آگے بڑھ کر خائستہ گل کو روک دیا۔''بس خائستہ گل!'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔''اس کے لیے اتنا ہی سبق کافی ہے، آئندہ یہ ایسی غلطی بھول کر بھی نہیں کرے گا، اب اسے چھوڑ دو''۔

''ناصر خان! اسے غلطی نہیں کہتے''۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔''جرم کہتے ہیں اور جرم کی بہت کڑی سزا دی جاتی ہے۔ کیا تم قبائلیوں کے رسم ورواج سے ناواقف ہو؟'' اتنا کہنے کے بعد اس نے دوبارہ گل رحمان کی ٹھکائی کرنا شروع کر دی۔

''احمق آدمی! تم وقت ضائع کر رہے ہو''۔ ناصر خان نے چلا کر کہا۔''گل رحمان صرف مہرہ ہے، اصل کام کسی اور کا ہے جو مولانا صاحب کے خلاف کوئی سازش وغیرہ کرنا چاہتا ہے''۔

خائستہ گل اس کی بات سن کر میکانکی انداز میں رک گیا۔''یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے متحیر لہجے میں پوچھا۔''مولانا صاحب کے خلاف سازش؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟''

''سمجھنے کے لیے انسان کی کھوپڑی میں دماغ کا ہونا ضروری ہے''۔ ناصر خان نے طنزیہ انداز میں کہا۔''جو بدقسمتی سے تمہاری کھوپڑی میں نہیں ہے''۔

''تو اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے برا ماننے بغیر استفسار کیا۔''کیا چھوڑ دیں گے اسے؟''

''کیوں چھوڑ دیں گے؟'' ناصر خان بولا۔''اس سے تفتیش کریں گے کہ اس نے مولانا صاحب پر ہاتھ کیوں اٹھایا اور کس کے ایما پر اٹھایا۔ اسے امین خان کے حجرے میں لے چلتے ہیں۔ وہیں اس سے پوچھ تاچھ کریں گے۔ ایک تو وہ جگہ محفوظ ہے اور دوسرا امین خان مولانا صاحب کے قابلِ اعتبار ساتھیوں میں سے ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ اس نے تائیدی انداز میں کہا۔''لیے چلتے ہیں''۔

چند لمحوں کے بعد وہ دونوں گل رحمان کی حالت درست کرنے کے بعد اسے ایک محفوظ



راستے سے امین خان کے حجرے کی طرف لے جا رہے تھے۔

===== ===== =====

جمشید خان نے اپنی کوٹھی پر پہنچنے کے بعد صفیہ رحمان کو ماں کے حوالے کر دیا جو اس وقت صبح کی نماز سے فارغ ہو کر کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ ماں کے استفسار پر اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ میں ابھی واپس آ کر بتاتا ہوں۔

اس کے بعد اس نے کمرے میں جا کر فوراً صدر تھانے کے ایس ایچ او کو فون پر موبائل گاڑی اور حوالدار جبر الدین جابر کے متعلق مناسب ہدایات دے دیں۔

ایس ایچ او موبائل گاڑی کی گمشدگی کی وجہ سے بہت پریشان تھا لہٰذا جب اُسے ایس پی جمشید خان کی زبانی موبائل گاڑی کے متعلق معلوم ہوا تو وہ جمشید خان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔''سر! آپ کی بہت بہت مہربانی۔ میں موبائل گاڑی چھن جانے کی وجہ سے بہت پریشان تھا، مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اطلاع ملی ہے، آپ فکر نہ کریں میں ابھی گاڑی منگوانے کے لیے ڈرائیور کو بھیجتا ہوں اور حوالدار جبر الدین جابر کی بھی طبیعت درست کرتا ہوں اس اُلّو کے پٹھے کی معلومات اتنی ناقص ہیں کہ وہ ایس پی جمشید خان کی شخصیت سے بھی ناواقف ہے''۔

''نہیں''۔ جمشید خان نے قدرے سخت انداز میں کہا۔''حوالدار کو کچھ مت کہنا۔ میں خود اس سے بات کروں گا''۔

''ٹھیک ہے سر''۔ ایس ایچ او بولا۔''جیسے آپ کی مرضی اور کوئی حکم؟''

''No Thanks آپ اپنا کام کریں''۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر اپنے ماتحت تھانے کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو''۔ رابطہ ملتے ہی وہ بولا۔''ایس پی جمشید خان بات کر رہا ہوں''۔

''حکم سر''۔ ڈیوٹی پر موجود اے ایس آئی کامران کی آواز سنائی دی۔''اتنی صبح سویرے کیسے یاد فرمایا؟''

''کامران! ایک پتہ نوٹ کرو''۔ وہ حکمیہ انداز میں بولا۔

''لکھوائیں سر''۔ کامران کی آواز آئی۔

''زریاب کالونی اسٹریٹ نمبر A/09 شوکت منزل''۔ اس نے ایڈریس لکھوا دیا۔

''لکھ لیا ہے سر''۔ فوراً ہی کامران کی آواز سنائی دی۔

''او کے''۔ وہ بولا۔''اب ایسا کرو کہ فوراً اس پتے پر پہنچو، گھر میں تمہیں تین افراد ملیں گے، شوکت حسین، اس کی بیوی زرینہ اور آصف نامی ان کا بیٹا۔ تینوں کو گرفتار کرو اور حوالات میں بند کر

دو۔ کسی کا بھی فون آئے پرواہ مت کرنا۔ کہہ دینا یہ ایس پی صاحب کا حکم ہے۔ سمجھ گئے ناں؟''

''اچھی طرح سر''۔ کامران نے کہا۔ ''آپ بے فکر رہیں، میں ابھی عملے کے ساتھ ہوں''۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ بولا۔ ''جب انہیں لے آؤ تو مجھے فون کر دینا''۔

''بہت بہتر سر''۔ کامران نے مؤدب انداز میں جواب دیا اور جمشید خان نے ایک بار رابطہ منقطع کرنے کے بعد ڈاکٹر شہناز اور جہانداد کے فلیٹ کا نمبر ڈائل کر دیا۔ گھنٹی بجتی رہی ریسیور کسی نے نہ اٹھایا۔ اس نے دو بار مزید ٹرائی کیا مگر نتیجہ وہی صفر رہا۔ وہاں کوئی ہوتا تو فون ریسیو کرتا۔

تھک کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور پھر وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ رات بھر بھاگ دوڑ اور نیند نہ کرنے کی وجہ سے اس کے جسمانی اعضاء مضمحل ہو رہے تھے اور سر بوجھل تھا یہ وقت آرام کرنے کا نہیں تھا۔ آج تو اسے بہت سارے کام سرانجام دینا تھے، سب سے بڑی پریشانی اسے جہانداد اور ڈاکٹر شہناز کی طرف سے تھی، ان کا فون ریسیو نہ کرنا کسی بہت بڑی گڑبڑ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ابراہیم بنگش کے آدمیوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا چنانچہ دس پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد وہ اٹھا اور اٹیچ باتھ روم میں گھس گیا۔ ایک بھرپور شاور لینے کے بعد اس کی طبیعت کی کسل مندی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔ اس نے صاف ستھرا لباس پہنا اور کمرے سے باہر جانے ہی لگا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ہیلو''۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''جمشید خان اسپیکنگ''۔

''میں جہانداد بات کر رہا ہوں جناب''۔ دوسری طرف سے جہانداد کی آواز سنائی دی۔ ''آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں؟ میں آپ کے متعلق بہت پریشان تھا''۔

''کہاں سے بات کر رہے ہو؟'' اس نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔

''پی سی او سے''۔ جہانداد بولا۔ ''کیوں؟''

''آس پاس تمہاری آواز تو کوئی نہیں سن رہا ہے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''میں سمجھتا ہوں جناب''۔ جہانداد نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں''۔

''او کے''۔ اس نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''اب بتاؤ کیا ہوا تھا اور قیدیوں کا کیا بنا؟''

''سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے جناب''۔ اتنا کہنے کے بعد جہانداد نے اسے پیش آنے والے تمام واقعات سنا دیے۔ تیسرے ہاتھ لگنے والے قیدی اور جمشید خان کی کار کے متعلق بھی اس نے جمشید خان کو بتا دیا تھا۔



''ٹھیک ہے''۔ ساری بات سننے کے بعد جمشید خان نے کہا۔ ''فی الحال تم قیدیوں کے ساتھ ڈاکٹر شہناز کے فلیٹ پر ہی رہو۔ کھانے پینے کا سامان وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ چند روز میں بہت مصروف رہوں گا۔ ڈاکٹر شہناز اور تینوں قیدیوں کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے''۔

''میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا جناب''۔ وہ بولا۔ ''مگر یہ جگہ غیر محفوظ ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے''۔

''معلوم ہے مجھے''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''چند روز تک کوئی مناسب بندوبست ہو جائے گا''۔

''ٹھیک ہے جناب''۔ وہ بولا۔ ''اور کوئی حکم؟''

''نہیں بس چوکنا اور ہوشیار رہنا''۔ اس نے کہا۔ ''بنگش کے معلومات کے ذرائع بہت تیز ہیں اس لیے فلیٹ سے انتہائی ضرورت کے وقت ہی باہر نکلنا''۔

''میں سمجھ گیا جناب! آپ فکر نہ کریں''۔ جہانداد نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے خدا حافظ''۔ جمشید خان نے اتنا کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمشید خان ناشتے کی ٹیبل پر اپنی ماں اور بہن میمونہ کو صفیہ رحمان کی کہانی سنا رہا تھا اور صفیہ رحمان خاموشی سے ناشتہ کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

===

امین خان کے حجرے میں جا کر جب ناصر خان اور خائستہ گل نے گل رحمان سے پوچھ تاچھ شروع کی تو اس نے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔

''مجھے کسی نے بھی اس کام پر نہیں اکسایا ہے''۔ وہ پُرزور انداز میں بولا۔ ''مولوی مجھے مسجد میں داخل نہیں ہونے دیتا تھا اس لیے میں نے اسے مارا ہے''۔

''خنزیر کے بچے!'' خائستہ گل اسے گریبان سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ ورنہ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا''۔

''یہ کیا حماقت کر رہے ہو خائستہ گل؟'' ناصر خان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے آرام کے ساتھ بھی تو پوچھا جا سکتا ہے۔ چھوڑ دو اسے''۔

''یہ آرام سے ماننے والا نہیں ہے''۔ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ''جب تک اس کی اچھی طرح دھلائی نہیں ہو جاتی یہ زبان نہیں کھولے گا''۔

''یہ دھلائی تم اس کی پہلے بھی کر چکے ہو''۔ ناصر خان نے کہا۔ ''مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں خود اس سے معلوم کرتا ہوں''۔

خائستہ گل نے چاروناچار گل رحمان کا گریبان چھوڑ دیا اور عورتوں کی طرح منہ پھلا چارپائی پر جابیٹھا۔

''سگریٹ پیو گے گل رحمان؟'' ناصر خان اس کے سامنے اکڑوں حالت میں بیٹھ استفسار کرنے لگا۔ ''میرے پاس خالص درہ آدم خیل والی چرس ہے، ایک کش میں آدمی کی طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے''۔

''جھوٹ مت بولو۔'' گل رحمان نے کہا۔ ''تم تو پیتے ہی نہیں ہو۔ مجھے معلوم ہے''۔

''کبھی کبھار چوری چھپے پی لیتا ہوں یار''۔ وہ قائل کرنے والے انداز میں بولا۔ ''واسکٹ کی جیب میں اب بھی موجود ہے۔ دکھاؤں کیا؟''

اس کی بات سن کر گل رحمان کی آنکھوں میں مخصوص چمک لہرانے لگی تھی مگر وہ خاموش تاہم وہ بدستور ناصر خان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناصر خان نے یہاں پہنچتے ہی امین خان کے نوکر سے تھوڑی سی چرس مانگ لی تھی، جو اس کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ خان کا وہ نوکر کبھی کبھار موج میں آکر پی لیا کرتا تھا اور سگریٹ تو ویسے بھی ناصر خان باقاعدہ ساتھ پیتا تھا لہٰذا اس وقت بھی اس کی جیب میں سگریٹ کی ڈبیا موجود تھا۔

''تمہیں شاید میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے؟'' ناصر خان نے اسے خاموش استفساریہ انداز میں کہا اور پھر جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور کاغذ کے پرزے میں لپٹی ہوئی نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا، وہ جونہی سگریٹ کی ڈبیا اور چرس کو دائیں سے لہراتا، گل رحمان کی آنکھیں بھی ویسے ہی گھومنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں نشے کی بڑھنے لگی۔ ناصر خان نے اسے اس قدر للچایا کہ آخر کار اسے مجبور ہو کر بولنا ہی پڑا۔

''سگریٹ بھرو ناں؟'' اس نے پُرشوق انداز میں کہا۔ ''کس کا انتظار کر رہے ہو؟''

''کیوں بھروں؟'' ناصر خان بے رخی سے بولا۔ ''یہ کوئی مفت میں ملتی ہے، درہ آدم مال ہے بہت مہنگی ہے''۔

اتنا کہہ کر دوبارہ اس نے گل رحمان کی آنکھوں کے سامنے سگریٹ کی ڈبیا اور چرس شروع کر دیا۔

''تم وقت ضائع کر رہے ہو؟'' خائستہ گل ناگواری سے بولا۔ ''اسے دو چار''۔

''خاموش رہو''۔ ناصر خان نے کہا۔ ''اگر خاموش نہیں بیٹھ سکتے تو جاؤ امین خان سے قہوے کا کہہ دو۔ بڑی طلب محسوس ہو رہی ہے''۔

''جاتا ہوں خان صاحب''۔ خائستہ گل نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا اور پھر ان



پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

''مم...... میرا بدن...... ٹوٹ رہا ہے''۔ خائستہ گل کے باہر نکلتے ہی گل رحمان نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہیں، بس...... سگریٹ...... بھرو ناں...... جل...... جلدی سے''۔

''مجھے تو تمہارے جسم پر کوئی چیونٹیاں رینگتی ہوئی نظر نہیں آ رہی ہیں''۔ ناصر خان اسے تنگ کرتے ہوئے بولا۔ ''دکھاؤ کہاں ہیں چیونٹیاں؟''

''بس...... سگریٹ بھرو''۔ اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔ ''تت تمہیں۔ خدا کا واسطہ''۔

گل رحمان کی مدافعت لحہ بہ لحہ دم توڑتی جا رہی تھی اور یہ بات ناصر خان کے حق میں جا رہی تھی۔ نشے کی طلب شدید ہو کر اسے سچ بولنے پر مجبور کر سکتی تھی چنانچہ ناصر خان بدستور اس کے سامنے چرس کی پڑیا اور سگریٹ کی ڈبیا لہراتا رہا اور گل رحمان کی حالت بگڑتی چلی گئی کبھی وہ ناصر خان کی منتیں کرنے لگتا تو کبھی جھنجھلا کر اسے گالیاں دینے لگتا تھا۔

ناصر خان نے یہ کھیل تھوڑی دیر تک جاری رکھا مگر جب گل رحمان اپنے بازوؤں پر کاٹنے لگا تو ناصر خان سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں اگر تم نے سچ سچ بتایا تو میں یہ ساری چرس اور سگریٹ تجھے دے دوں گا۔ پھر جی بھر کر پینا''۔

''پپ...... پوچھو......؟'' اس نے بمشکل کہا اور پھر حریص نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مولانا صاحب پر تم نے کس کے کہنے پر ہاتھ اٹھایا تھا؟'' ناصر خان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بتاؤ۔ ورنہ چرس نہیں ملے گی''۔

''مم...... میں...... نہیں بتا سکتا''۔ وہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''وہ...... مجھے مم...... مار ڈالیں گے''۔

''ٹھیک ہے مت بتاؤ''۔ ناصر خان نے سگریٹ کی ڈبیا اور چرس کی پڑیا جیب میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے بھلا تمہاری منتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

گل رحمان چند لمحے تو اس کی طرف دیکھتا رہا مگر جب ناصر خان نے اسے کا کوئی نوٹس نہ لیا تو اسے مجبور ہو کر بولنا ہی پڑا۔ ''تم...... سگریٹ بھرو...... مم...... میں بتاتا ہوں''۔

ناصر خان نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اسے ہتھیلی پر خالی کرنے لگا۔ گل رحمان للچائی ہوئی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

جب سگریٹ سے تمباکو نکل گیا تو ناصر خان نے پڑیا سے تھوڑی سی چرس نکال کر دیا سلائی

کے ذریعے گرم کرنا شروع کر دی۔ چرس کو گرم کرنے کے بعد اس نے ہتھیلی پر پڑے ہوئے میں مسل کر ملانا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے اندر ہی وہ خالی سگریٹ کو دوبارہ بھر چکا تھا۔

''ہاں اب بتاؤ؟'' ناصر خان سگریٹ کو سلگا کر ایک کش لگاتے ہوئے بولا۔ ''کس نے مولانا صاحب پر ہاتھ اٹھانے کے لیے کہا تھا؟''

''پپ...... پہلے سگریٹ دو''۔ اس نے للچائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''پھ...... پھر بتاؤں گا''۔

''ایک کی جگہ چار چار سگریٹ ملیں گے''۔ ناصر خان بولا۔ ''شاباش بتاؤ۔ کون ہے وہ؟''

''زر...... زرولی اور...... گل شیر خان''۔ چرس کے لالچ میں آ کر وہ راز اگلتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے مجھے...... بہت ساری چرس اور رقم دینے کا وعدہ کیا ہے''۔

''کیا خان جی کو معلوم ہے یہ بات؟'' ناصر خان نے سوال کیا۔

''ہاں...... مم...... معلوم ہے''۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''اب سگریٹ دے دو...... م میرا دم نکل جائے گا''۔

''دیتا ہوں''۔ ناصر خان بولا۔ ''یہ بتاؤ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ مولانا صاحب کے وہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''خد...... خدا...... کی قسم...... میں نہیں جانتا''۔ وہ بولا۔ ''انہوں نے میرے سامنے اس کا ذکر نہیں کیا تھا''۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو؟'' ناصر خان نے سخت لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ ورنہ سگریٹ نہیں ملے گا''۔

''کوئی سی...... قسم لے لو۔ میں سچ کہتا ہوں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ اب تو سگریٹ دے دو''۔

''یہ سچ ہی کہہ رہا ہوگا''۔ اچانک عقب سے امین خان کی آواز سنائی دی۔ ''اسے سگریٹ دے دو''۔

ناصر خان نے پلٹ کر دیکھا تو امین خان اور خائستہ گل موجود تھے۔ خائستہ گل کے چہرے پر ابھی تک بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ غالباً وہ دونوں دبے پاؤں ہی اندر داخل ہوئے تھے جبکہ ناصر خان ان کی آمد سے لاعلم رہا تھا۔

سگریٹ گل رحمان کے حوالے کرنے کے بعد ناصر خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا جبکہ گل رحمان ندیدے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے سگریٹ کے کش پر کش لگانے لگا۔ یہ دیکھ کر ناصر خان



سگریٹ کی ڈبیا اور بقیہ چرس بھی اس کے سامنے پھینک دی جو اس نے جھپٹ کر اٹھا لی۔

اس کے بعد امین خان سے مشورہ کرنے کے بعد ناصر خان اور خائستہ گل مولوی نصیب اللہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تا کہ اسے مع اہلِ خانہ امین خان کے گھر لا سکیں۔

===

ابراہیم بنگش زخمی شیر کی طرح کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایک طرف تین آدمی کھڑے ملتجی نگاہوں سے بنگش کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ موسیٰ خان آرام دہ حالت میں ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بنگش ٹہلتے ٹہلتے ان تینوں کے سامنے رکا اور پھر غضب ناک نگاہوں سے ان تینوں کو گھورنے کے بعد بولا۔ ''ایس پی اکیلا تھا اور تم پانچ تھے۔ پھر بھی وہ تم پر بھاری پڑا...... کیوں؟''

''ہم...... چچ...... چار تھے جناب''۔ تینوں میں سے ایک گھگھیا کر بولا۔ ''سلیم یہیں رہ گیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں گیا تھا''۔

''کیوں؟ کیا پرابلم تھا اسے؟'' بنگش نے گرج کر پوچھا ''بلاؤ اسے''۔

''وہ...... وہ تو جناب...... چند روز کی رخصت پر ہے۔ دراصل اس کی بیوی بیمار ہے''۔ اس بار بھی وہی آدمی بولا تھا غالباً وہ باقی دونوں کا سرغنہ تھا۔

''کس سے پوچھ کر گیا ہے؟'' بنگش نے استفسار کیا۔ ''مجھے بتایا کیوں نہیں گیا؟''

''ہم...... ہمیں کیا پتا جناب!'' وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہم...... تو نوکر...... لوگ ہیں''۔

''اوکے مان لیا''۔ بنگش بولا۔ ''تم چار تھے۔ پھر ناکام کس لیے لوٹے؟''

''نف...... فلیٹ کے اندر سے کسی نے ہم پر حملہ کر دیا تھا''۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''ورنہ ہم بس کامیاب ہو چکے تھے''

''بہانے مت تراشو کتے کے بچے!'' بنگش نے چلا کر کہا اور پھر الٹا ہاتھ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ ''میں تم لوگوں پر ہزاروں خرچ کرتا ہوں۔ تمہیں تھانوں اور کچہریوں سے بچا کر لاتا ہوں مگر تم لوگ جب بھی کسی کام کے لیے جاتے ہو، دُم دبا کر بھاگ آتے ہو۔ کیوں؟''

تینوں چپ رہے۔ کسی نے بھی وضاحت کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس وقت ان کا بولنا بنگش کو مزید مشتعل کر سکتا تھا لہٰذا چپ میں ہی انہیں اپنی عافیت نظر آ رہی تھی۔

''بولتے کیوں نہیں ہو؟'' بنگش زور سے چلایا۔ ''کیا تم سب کی ماں مر گئی ہے؟''

''کول ڈاؤن بنگش''۔ موسیٰ خان مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ''ایس پی جمشید خان اور سولجر ان لوگوں کے بس سے باہر ہیں۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟''

''یہ سولجر کون ہے؟'' بنگش نے چونک کر پوچھا۔ ''میں یہ نام پہلی مرتبہ سن رہا ہوں''۔

''انہیں جانے دو۔ پھر بتاتا ہوں''۔ موسیٰ خان نے جواب دیا اور بنگش نے ان تینوں کو رخصت ہونے کا حکم دے دیا۔

ہاں اب بتاؤ؟'' ان تینوں کے جانے کے بعد بنگش موسیٰ خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کون ہے یہ سولجر؟''

''بہت اونچی شے ہے''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''اس کا اصل نام جہانداد ہے مگر میں اسے سولجر کہتا ہوں کیونکہ وہ چند سال ملٹری کی سروس میں رہ چکا ہے۔ تمہیں افضال خٹک کا مرڈر تو یاد ہے ناں؟''

''ہاں...... مگر......''

''افضال خٹک کا مرڈر سولجر نے ہی کیا تھا''۔ موسیٰ خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں اس جیسا جی دار آدمی نہیں دیکھا''۔

''ارے ایسے بندے کو تو ہاتھ میں کرنا چاہئے''۔ بنگش پُرشوق انداز میں بولا۔ ''کیا میری اس سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''آرام سے بنگش صاحب''۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''زیادہ اونچا اُڑنے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ بہت اونچی شے ہے''۔

اونچی چیز کے اونچے دام''۔ بنگش مسکرایا۔ ''کیا خیال ہے، پٹا لوگے اسے؟''

''تیری عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے''۔ موسیٰ خان نے تپ کر کہا۔ ''وہ خان جی جیسے شخص کے قابو میں نہیں آسکا تو تم کیا چیز ہو؟''

''اگر یہ بات ہے تو پھر وہ زندہ کیوں پھر رہا ہے؟'' بنگش نے بُرا مانے بغیر سوال کیا۔

''ہمت ہے تو پھر رہا ہے''۔ وہ بولا۔ ''بہر حال میں اس سلسلے میں ہی یہاں آیا ہوں۔ خان جی نے ایس پی جمشید خان اور سولجر سے ہی نمٹنے کے لیے یہاں بھیجا ہے''۔

''تو پھر کچھ کرو۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے کس لیے ہو؟'' بنگش نے کہا۔ ''ایس پی دن بدن میرے گرد گھیرا تنگ کرتا جا رہا ہے۔ اس نے میرے دو انتہائی قابلِ بھروسہ آدمی کہیں غائب کر دیے ہیں اگر وہ دونوں آدمی میرے خلاف بیان دینے کے لیے تیار ہو گئے تو بہت جلد قانون کے ہاتھ میری گردن ناپنے کے لیے آجائیں گے اور تم جانتے ہو اگر میں گرفتار ہو گیا تو خان جی کے خلاف بھی یقیناً کارروائی ہو گی''۔

''صبر کرو''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''جلد بازی کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ ایس پی کی کسی



رگ پر ہاتھ رکھنا پڑے گا تب ہی وہ تمہارے آدمیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوگا''۔

''تم شاید خلیل بھائی چاقو والا کا انجام بھول گئے ہو؟'' بنگش نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اس نے بھی ایس پی کی دکھتی رگ کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی اور انجام کار کتے کی موت مارا گیا تھا''۔

''مجھے یاد ہے''۔ وہ بولا۔ ''لیکن تم یہ بھول رہے ہو کہ میں خلیل بھائی نہیں ہوں، موسیٰ خان ہوں، جس کی دہشت سے بڑے بڑے سورما کانپتے ہیں۔ جس دن بھی میں نے ایس پی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ لیا اس دن اسے دن میں تارے نظر آجائیں گے''۔

''ہاتھ رکھ دو نا بھئی''۔ بنگش نے کہا۔ ''تمہیں کس نے روکا ہے؟ ایس پی کی بوڑھی ماں کو اغوا کرو گے یا گونگی بہن کو۔ جسے خلیل بھائی چاقو والا نے بھی اغوا کیا تھا''۔

''میں نے کہا ہے ناں''۔ وہ بولا۔ ''میں کوئی کام بلا سوچے سمجھے نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے میں ایس پی کا قصہ ہی پاک کر دوں؟''

''اگر ایسا ہو گیا تو میں تجھے دولت سے تول دوں گا''۔ بنگش نے پُرمسرت انداز میں کہا۔ ''جتنا روپیہ چاہو گے ملے گا''۔

''موسیٰ خان کو خریدنا ممکن نہیں ہے بنگش''۔ وہ ناگوار لہجے میں بولا۔ ''میں صرف خان جی کا غلام ہوں۔ وہ جو حکم دیں گے وہی کروں گا''۔

''تو کیا خان جی نہیں چاہتے کہ ان کے راستے کا سب سے بڑا کانٹا نکل جائے؟'' بنگش نے استفسار کیا۔

''کیوں نہیں چاہتے''۔ وہ بولا۔ ''اصل میں خان جی کو اپنے سیاسی مستقبل کی بہت فکر رہتی ہے ورنہ اب تک تو ایس پی جمشید خان کی ہڈیاں تک قبر میں گل چکی ہوتیں''۔

''میں بات کروں خان جی سے؟'' بنگش نے پُرامید انداز میں پوچھا۔ ''ہو سکتا ہے میں انہیں کسی طرح قائل کر ہی لوں''۔

''شوق سے کرو۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' موسیٰ خان نے جواب دیا اور بنگش کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا یوں جیسے اس نے ایس پی جمشید خان کی موت کے پروانے پر دستخط کروا لیے ہوں۔

-:- ===-:- ===-:-

ایس پی جمشید خان اُس روز گیارہ بجے کے لگ بھگ آفس پہنچا تھا۔ ابھی اسے سیٹ سنبھالے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اردلی نے اسے اے ایس آئی کامران کی آمد کی اطلاع دی۔

''اسے اندر بھیج دو''۔ اس نے اردلی سے کہا اور پھر ٹیبل پر پڑی ہوئی ایک فائل کی طرف

متوجہ ہو گیا۔

''السلام علیکم سر''۔ اے ایس آئی کامران نے اندر داخل ہونے کے بعد سیلوٹ کر ہوئے کہا۔ ''آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے سر! شوکت حسین بیوی اور بیٹے سمیت اس حوالات میں موجود ہے''۔

''گڈ''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''کوئی مسئلہ تو نہیں بنا ناں؟''

''نو سر!'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''مگر شوکت حسین بار بار خطرناک نتائج کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس کی زبان برابر چل رہی ہے''۔

''کوئی بات نہیں ہے''۔ جمشید خان نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''دھمکیوں کے سوا وہ کر بھی سکتا ہے؟ ایسا کرو ان تینوں کو یہاں لے آؤ''۔

''بہتر سر''۔ کامران نے جواب دیا اور تیز تیز چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

جمشید خان نے فائل کھول کر پڑھنا شروع کر دی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد اے ایس کامران ان تینوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ جمشید خان کا سر فائل کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے جھکا تھا تاہم وہ ان کی آمد سے باخبر تھا۔

''سر! ملزمان حاضر ہیں''۔ کامران نے اسے متوجہ کرنے کے لیے کہا۔

''ملزمان نہیں۔ مجرم کہو''۔ سیدھا ہو کر وہ سیٹ سے پشت ٹکاتے ہوئے بولا۔ ''اور ان جرم کا عینی شاہد میں ہوں۔ ملزم تو وہ ہوتا ہے جس پر صرف الزام ہوتا ہے''۔

ان تینوں نے جب گزشتہ رات والے ڈکیت کو ایس پی کی وردی میں دیکھا تو تینوں کی ہو گئی اور آنکھیں مارے خوف کے پھیلتی چلی گئیں۔ یہ تو ان تینوں کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ان چنگل سے صفیہ رحمان کو بچا کر لے جانے والا شخص پولیس کا کوئی اعلیٰ عہدے دار ہو گا، وہ تو صفیہ رحمان کا کوئی بوائے فرینڈ قسم کی چیز سمجھ رہے تھے۔

''مسٹر شوکت حسین!'' انہیں لمحہ بھر گھورنے کے بعد جمشید خان بولا۔ ''میں تم باپ بیٹے مس صفیہ رحمان کی جان اور عزت پر مجرمانہ حملہ کرنے کے جرم میں لمبی مدت کے لیے جیل بھ چاہتا ہوں تم لوگ کیا اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''حض...... حضور!'' شوکت حسین خوشامدی انداز میں بولا۔ ''سارا قصور ان ماں بیٹے کا انہوں نے ہی مجھے اپنی سگی بھتیجی پر ہاتھ اٹھانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ میں تو......''

''ابا! ایس پی صاحب کے سامنے جھوٹ تو مت بولو''۔ آصف نے قطع کلامی کرتے ہو کہا۔ ''ہم نے کب تجھے ایسا کہا ہے؟''



''بکواس مت کر و گدھے کے بچے!'' شوکت حسین چلا کر بولا۔ ''تم ماں بیٹا ہی میری بھتیجی کے اصل دشمن ہو۔ اس معصوم لڑکی کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تم لوگوں نے؟''

''شرم کرا ابا!'' آصف نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''سارا پلان تو تمہارا اپنا تھا۔ الزام ہم پر لگاتے ہو؟ تم تو چچا رحمان کے بھی خلاف تھے۔ جس دن چچا ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوئے تھے اس روز تم......''

''چپ کر جاؤ حرام زادے!'' شوکت حسین نے بیٹے کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے قطع کلامی کی۔ ''ہوش میں آؤ۔ اپنے باپ کے خلاف بولتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی''۔

جمشید خان اور اے ایس آئی کامران نہایت انہماک کے ساتھ باپ بیٹے کی بکواس سن رہے تھے۔ ایک بار کامران نے انہیں روکنے کا ارادہ بھی کیا تھا مگر جمشید خان نے اسے اشارہ سے روک دیا تھا۔

باپ بیٹا ایک دوسرے کو گناہگار ثابت کرنے کی کوشش میں بعض ایسے انکشافات بھی کر گئے تھے جن کے بارے میں شاید جمشید خان کا کبھی خیال ہی نہ جاتا۔ اب جمشید خان یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ صفیہ رحمان کا باپ شاید حادثاتی موت نہ مرا ہو بلکہ اسے کسی سازش کے تحت ایکسیڈنٹ کے ذریعے مروایا گیا ہو۔

''کیوں...... میں کیوں چپ کر جاؤں؟'' آصف باپ کے بندھے ہاتھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''تم بھی تو مجھ پر اور میری ماں پر الزام لگا چکے ہو؟ تمہیں شرم کیوں نہ آئی؟''

''میں تمہارا باپ ہوں کہ تم میرے باپ ہو؟'' شوکت حسین نے چلا کر پوچھا۔

''باپ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ تم اپنے گناہ میرے سر تھوپ ڈالو''۔ اس نے بدتمیزی سے جواب دیا۔ ''جرم ہم تینوں نے کیا ہے اور سزا میں اکیلا بھگتوں؟ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''جج...... جناب!'' شوکت حسین کو اچانک ہی غلطی کا احساس ہوا تھا اس لیے وہ جمشید خان کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ میں ایک عرصے سے اس کا علاج کروا رہا ہوں مگر کوئی خاص افاقہ ابھی تک نظر نہیں آیا۔ ایسے دورے اسے روزانہ پڑتے رہتے ہیں''۔

جمشید خان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ غور سے آصف کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا جو لمحہ بہ لمحہ بدل رہے تھے۔ شاید اسے بھی اب اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا تبھی تو اس نے چپ سادھ رکھی تھی۔

''کون سا جرم آصف؟'' جمشید خان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''بتاؤ مجھے۔ اگر تم بے گناہ نکلے تو میں تمہاری مدد کروں گا''۔

''وہ......وہ تو جناب! میں نے یونہی کہا تھا''۔ وہ صاف مکرتے ہوئے بولا۔ ''کسی جرم سے ہمارا بھلا کیا واسطہ؟''

''اوئے سچ سچ بتا؟'' اے ایس آئی کامران نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ورنہ زبان کھلوانے کے ہمیں ایسے ایسے گُر آتے ہیں کہ تم جنم دینے والی ماں کو بھی بھول جاؤ گے''۔

''میں کچھ نہیں جانتا''۔ وہ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی سی قسم اٹھوالو۔ میں تیار ہوں''۔

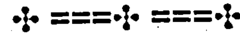
''یہ پولیس اسٹیشن ہے مسٹر آصف!'' جمشید خان بولا۔ ''یہاں مجرموں سے قسمیں نہیں اٹھوائی جاتیں۔ یہاں تو سچ جھوٹ معلوم کرنے کا کوئی اور ہی طریقہ ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہمیں وہ طریقہ آزمانے پر مجبور نہ کرو ورنہ بہت پچھتاؤ گے؟''

''میں...... سچ کہتا ہوں جناب''۔ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم بس صفیہ رحمان کی جائیداد ہتھیانے کے چکر میں تھے مگر اب تو وہ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے''۔

''یہ ایسے نہیں مانے گا سر!'' اے ایس آئی نے کہا۔ ''اسے ایک دن کے لیے میرے حوالے کر دیں۔ ان شاءاللہ کل صبح یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنا شروع کر دے گا''۔

''او کے''۔ جمشید خان بولا۔ ''لے جاؤ انہیں۔ کوئی بھی سفارشی آئے تو فون پر میری بات کرا دینا''۔

''یس سر!'' کہہ کر کامران نے سیلوٹ مارا اور ان تینوں کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔



عشاء کی نماز سے تھوڑی دیر قبل زرولی اور گل شیر خان، خان جی کی خدمت میں حاضر تھے۔ زرولی کے چہرے سے یوں جوش وخروش کا اظہار ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی معرکہ سر کر کے آیا ہو۔ خان جی نے ان دونوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر صوفے پر بیٹھنے کے بعد سگار سلگاتے ہوئے زرولی سے مخاطب ہوا۔ ''تمہارے چہرے کا اطمینان یہ ظاہر کر رہا ہے کہ منصوبے کا پہلا حصہ کامیابی سے ہمکنار ہو چکا ہے؟''

''بالکل خان جی''۔ وہ پُرجوش آواز میں بولا۔ ''اس نشئی نے تو کمال کر دیا۔ ایک لمحے میں اس نے مولوی کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا اگر بروقت دو نوجوان مولوی کو اس کے چنگل سے نہ چھڑاتے تو شاید وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتا۔ بہرکیف ہمارا مسئلہ تو پھر بھی حل ہو گیا ہے۔ اب مولوی کی موت



کا الزام گل رحمان کے ہی سر جائے گا''۔

''مولوی کو چھڑانے والے نوجوان کون تھے؟'' خان جی نے قدرے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''ناصر خان اور خائستہ گل تھے خان جی''۔ اس نے جواب دیا۔ ''بس مولوی کی قسمت اچھی تھی ورنہ آج کل پرائی آگ میں کون کودتا ہے؟ کاش ہم نے گل رحمان کو ایک ریوالور بھی دے دیا ہوتا تو اب تک مولوی کی روح جسم کی قید سے آزاد ہو چکی ہوتی''۔

''گدھے ہو تم''۔ خان جی نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''مولوی کو اس کے ہاتھوں سے مروانا بہت بڑی حماقت ہوتی۔ وہ نشئی ہے اور نشئی بہت کمزور اعصاب کے مالک ہوتے ہیں معمولی سی پوچھ تاچھ کے دوران ہی سچ بک دیتے ہیں''۔

''بالکل بالکل خان جی''۔ زرولی نے فوراً تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نشئی بالکل ایسے ہی ہوتے ہیں''۔

''گل رحمان اب کہاں ہے؟'' خان جی نے سوال کیا۔

''کیوں خان جی! اب کیا ہم نے اس کا اچار ڈالنا ہے؟'' زرولی تحیر خیز انداز میں بولا۔ ''پڑا ہو گا کہیں نشے میں دُھت ہو کر''۔

''ہم نے منصوبہ تھوڑا تبدیل کر دیا ہے''۔ خان جی نے کہا۔ ''اب گل رحمان کا بھی تمہارے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ دراصل ہم چاہتے ہیں کہ گل رحمان کو لوگ موقع پر ہی مولوی کے قتل کے جرم میں مار ڈالیں''۔

''پر خان جی! یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''وہ اگر ہمارے ساتھ ہو گا تو پھر تو ہمارے خلاف چشم دید گواہ بن جائے گا''۔

''تمہاری موٹی عقل میں یہ بات نہیں آئے گی۔'' خان جی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جاؤ پہلے گل رحمان کو ڈھونڈ لاؤ پھر میں تم دونوں کو نئے منصوبے سے آگاہ کروں گا''۔

''خان جی!'' گل شیر خان گویا ہوا۔ ''گل رحمان کے متعلق زید خان کو معلوم ہو گا۔ اس کی میں نے ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ گل رحمان پر نگاہ رکھے''۔

''یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟'' خان جی نے غصے سے پوچھا۔

''آپ نے پوچھا جو نہیں خان جی! ورنہ''۔

''اچھا اب بکواس مت کرو اور زید خان کو فوراً بلا لاؤ''۔ خان نے اس کی بات ٹوکتے ہوئے حکم سنایا اور گل شیر خان بھاگنے کے انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

دس منٹ کے بعد جب گل شیر خان دوبارہ اندر داخل ہوا تو زید خان اس کے ساتھ تھا۔

''سلام خان جی''۔ اندر داخل ہوتے ہی زید خان نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے خان جی کو سلام کیا۔

''ہاں زید خان! بتاؤ اس وقت گل رحمان کہاں ملے گا؟'' خان جی نے بلاتردد سوال کیا۔

''اسے تو خان جی! ناصر خان اور خائستہ گل ورغلا کر امین خان کے حجرے میں لے گئے ہیں''۔ زید خان نے جواب دیا۔

''کیا بک رہے ہو؟'' خان جی اضطراری حالت میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''وہ اسے کیوں لے گئے ہیں؟''

''یہ تو خان جی مجھے نہیں معلوم''۔ وہ بے بسی کے عالم میں بولا۔ ''میں نے تو صرف گل رحمان کو ان دونوں کے ساتھ حجرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے''۔

''گدھے ہو تم سب''۔ خان جی گرج کر بولا۔ ''وہ اسے وہاں پوچھ تاچھ کے لیے لے گئے ہیں۔ جاؤ جا کر اس کا پتا کرو۔ ہو سکتا ہے اب تک وہ سارا راز اُگل چکا ہو۔ جاؤ جلدی کرو''۔

خان جی کا حکم سن کر وہ تینوں بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

===

کمرے سے باہر نکلتے ہی زرولی، گل شیر خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم اور زید خان دوسرے بندوں کو لے کر صدر دروازے پر پہنچو۔ میں گیراج سے جیپ نکال کر وہیں پہنچتا ہوں کیونکہ امین خان کا حجرہ گاؤں کے آخری سرے پر واقع ہے اور ہمیں جلد وہاں تک پہنچنا ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ گل شیر خان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم وہاں موجود ہوں گے تم جلدی پہنچنے کی کوشش کرنا''۔

''اسلحہ وغیرہ ضرور ساتھ رکھ لینا''۔ زرولی نے آگے بڑھتے ہوئے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''امین خان آدمی سرپھرا ہے، ہمیں اسلحے کی ضرورت پڑ سکتی ہے''۔

''تم فکر نہ کرو مجھے معلوم ہے''۔ گل شیر نے جواب دیا اور پھر زید خان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد ایک کھلی چھت کی جیپ حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ جیپ میں زرولی سمیت چھ آدمی سوار تھے اور سب کے سب مسلح تھے۔ ڈرائیونگ زرولی کر رہا تھا، گل شیر خان اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ بقیہ چار لوگ جیپ کے عقبی حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب یوں پُرجوش نظر آ رہے تھے جیسے کسی انعام کی رقم وصول کرنے کے لیے جا رہے ہوں۔



''اگر امین خان نے گل رحمان کو ہمارے حوالے نہ کیا تو؟'' گل شیر خان نے خاموشی کو توڑتے ہوئے زرولی سے سوال کیا۔

''ہمیں ہر صورت میں گل رحمان کو وہاں سے نکالنا ہے''۔ زرولی بولا۔ ''چاہے اس کے لیے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑے۔ خان جی صرف گل رحمان کو اپنے سامنے دیکھ کر ہی مطمئن ہو سکتے ہیں''۔

''بات خون خرابے تک پہنچ سکتی ہے''۔ گل شیر خان نے کہا۔ ''امین خان آسانی سے اسے ہمارے حوالے کبھی بھی نہیں کرے گا''۔

''میں جانتا ہوں''۔ اس نے جواب دیا۔ ''اسی لیے تو میں نے تم لوگوں کو مسلح کرایا ہے ورنہ تو میں اکیلا جا کر بھی گل رحمان کو لا سکتا تھا''۔

''یہ ناصر خان اور خائستہ گل، کیا امین خان کے لیے کام کرتے ہیں؟'' گل شیر خان نے پوچھا۔

''بظاہر تو یہی لگتا ہے''۔ وہ بولا۔ ''تاہم حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بہر کیف امین خان کے حجرے پر پہنچ کر صورتحال واضح ہو جائے گی، اگر ان دونوں نے امین خان کا ساتھ دیا تو پھر بات صاف ہے کہ وہ اسی کے لیے کام کرتے ہیں''۔

''خان جی نے علاقے میں دشمن بہت پیدا کر لیے ہیں''۔ گل شیر خان بولا۔ ''اب مولوی نصیب اللہ والا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ یقیناً وہ ہوشیار ہو چکا ہوگا''۔

''ہم حکم کے غلام ہیں گل شیر خان''۔ وہ اسٹیئرنگ پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے ہوتے بولا۔ ''ہم نے وہی کرنا ہے جو خان جی چاہیں گے۔ ہمارے گھر کے چولہے اسی کی مہربانی سے جلتے ہیں ورنہ ان سنگلاخ پہاڑوں میں کیا رکھا ہے؟ یہاں کے لوگ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لیے محتاج رہتے ہیں۔ ہمیں اگر خان جی کا سہارا حاصل نہ ہو تو ہمارے بال بچے بھوکوں مرنے لگیں''۔

''ہاں یہ بات تو ہے''۔ گل شیر خان نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''خان جی ہم پر بہت مہربان ہیں ہماری سب ضرورتیں بن مانگے ہی پوری کر دیتے ہیں''۔

زرولی اور گل شیر خان باپ دادا کے زمانے سے ہی ان قبائلی خوانین کے غلام چلے آ رہے تھے۔ وہ دونوں آزادی کی زندگی کی لذتوں سے ناواقف تھے۔ غلامی ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ وہ خواب میں بھی خان جی کی حکم عدولی کے متعلق نہیں سوچ سکتے تھے۔ انہی باتوں کے دوران وہ امین خان کے حجرے تک پہنچ گئے۔ جیپ انہوں نے حجرے سے کافی فاصلے پر ایک گلی میں روک دی تھی۔ ویسے بھی رات کا وقت تھا اس لیے راستے میں انہیں کوئی بھی نہیں ٹکرایا تھا۔ جیپ کا انجن بند کرنے کے بعد زرولی نے ایک آدمی کو جیپ کی رکھوالی کے لیے وہیں چھوڑا اور بقیہ چار

لوگوں کے ساتھ حجرے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ پانچوں حجرے کے صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور حجرے کے اندر حویلی میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ یہ حجرہ امین خان کی رہائشی حویلی سے متصل تھا تاہم حجرے کی چار دیواری الگ تھی البتہ رہائشی حویلی اور حجرے کی درمیان دیوار میں ایک کشادہ گزرگاہ موجود تھی جو رہائشی حویلی اور حجرے کے درمیان بطور رابطہ استعمال ہوتی تھی۔

''دروازہ تو اندر سے بند ہے''۔ گل شیر خان نے دروازے پر دباؤ ڈالنے کے بعد کہا۔ ''دستک دے دوں؟''

''ہاں دستک تو دینا ہی پڑے گی''۔ زرولی بولا۔ ''پہلے امین خان سے بات کریں گے اگر اس نے گل رحمان کو کسی تردد کے بغیر ہمارے حوالے کر دیا تو ٹھیک ورنہ زبردستی لے جانے کی کوشش کریں گے''۔

''ٹھیک ہے''۔ گل شیر خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی تائید کی اور پھر دروازے پر لگاتار تین بار دستک دے ڈالی۔

چند لمحے انہوں نے انتظار کیا مگر جب کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا تو زرولی نے خود آگے بڑھ کر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی امین خان کو اونچی آواز میں پکارا۔ ''امین خان! دروازہ کھولو۔ جلدی کرو''۔

دو تین منٹ کے بعد دروازے کے عقب میں قدموں کی چاپ ابھری اور پھر کسی نے کرخت انداز میں استفسار کیا۔ ''کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''امین خان کو بلاؤ''۔ زرولی نے نخوت سے کہا۔ ''ہم اس سے بات کرنے آئے ہیں''۔

''اپنا اتا پتا بتاؤ تم کون ہو؟'' اندر سے بھی اسی انداز میں پوچھا گیا۔ ''امین خان اس وقت گھر میں آرام کر رہا ہے''۔

''میں زرولی ہوں''۔ اس نے جواب دیا۔ ''مجھے خان جی نے بھیجا ہے۔ جا کر امین خان کو بتاؤ کہ اس سے خان جی کے آدمی بات کرنا چاہتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے انتظار کرو۔ میں امین خان کو جا کر بتاتا ہوں''۔ اس بار اندر والے نے قدرے نرم انداز میں کہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس چلا گیا۔

''تم لوگ تیار رہنا''۔ زرولی اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''امین خان نے اگر بات نہ مانی تو میں بزور اسلحہ اسے بات ماننے کے لیے مجبور کروں گا''۔



''فکر مت کرو ہم ہوشیار رہیں گے''۔ گل شیر خان نے کہا۔ ''لیکن تم بھی حتی الوسع تصادم سے بچنے کی کوشش کرنا، امین خان بہت کایاں شخص ہے آسانی سے ہاتھ آنے والوں میں سے نہیں ہے ویسے بھی تمہارا نام سن کر وہ خالی ہاتھ دروازے پر نہیں آئے گا''۔

''میں سمجھتا ہوں''۔ زرولی بولا۔ ''تم لوگ بھی چوکنا رہنا، باقی میں جانوں اور میرا کام''۔

اسی دوران دوبارہ دروازے کے عقب میں قدموں کی چاپ ابھری اور وہ سب چوکنا انداز میں دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

✣ === ✣ === ✣

اس روز ایک بجے کے قریب جمشید خان آفس سے نکلا اور بغیر ڈرائیور کے جیپ لے کر صدر تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت وہ حوالدار جبرالدین جابر کے متعلق ہی سوچ رہا تھا جس کی وجہ سے اسے گزشتہ رات سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور مجبوری کے عالم میں اسے ایک غیر قانونی قدم بھی اٹھانا پڑا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ صفیہ رحمان نہ ہوتی تو شاید وہ حوالدار جبرالدین جابر کے ساتھ تھانے بھی چلا جاتا مگر صفیہ رحمان کی موجودگی اور جبرالدین جابر کی بدتمیزی نے اسے وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد اس کی جیپ صدر تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی اور تھانے کے گیراج میں جا کر رک گئی۔ انجن آف کرنے کے بعد وہ نیچے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایس ایچ او کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت وہ ایس پی کے یونیفارم میں تھا اس لیے اسے دیکھتے ہی تھانے میں کھلبلی مچ گئی۔ کوئی اسے دیکھ کر توند پر بیلٹ درست کر رہا تھا تو کوئی ٹوپی کو صحیح طرح سے سر پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بغیر کسی سے باز پُرس کیے ان کے الٹے سیدھے سیلوٹوں کے جواب دیتا ہوا ایس ایچ او کے آفس میں گھس گیا۔

ایس ایچ او اکرم خان اسے دیکھتے ہی یکدم اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ویلکم سر''۔ اکرم خان نے سر پر ٹوپی رکھتے ہوئے کہا اور پھر فوراً سیلوٹ مار دیا۔

اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے سیلوٹ کا جواب دیا اور پھر تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''بلاؤ حوالدار جبرالدین جابر کو''۔

''آپ...... آپ تشریف تو رکھیں سر''۔ اکرم خان اسے اپنی سیٹ پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی اسے بلواتا ہوں''۔

اتنا کہہ کر ایس ایچ او اکرم خان آفس سے باہر نکل گیا اور جمشید خان سیٹ سنبھالنے کے بعد ناقدانہ انداز میں آفس کا جائزہ لینے لگا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد جب اکرم خان دوبارہ آفس میں داخل ہوا تو حوالدار جبرا... جابر اس کے ساتھ تھا۔ جمشید خان پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں... ایس ایچ او اکرم خان نے اسے جمشید خان کی آمد سے بے خبر رکھا تھا۔ حوالدار جبرالدین خوف اور ندامت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ ایک ٹک جمشید خان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے یہ... تک کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ وہ اچانک لگنے والے شاک سے سنبھل ہی نہیں پا رہا تھا۔ گزشتہ رات... شخص ایس پی کے یونیفارم میں اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اپنی کی ہوئی بکواس کسی ہتھوڑ... طرح اس کے دماغ پر برس رہی تھی اور آنے والے لمحات کے خوف سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''گدھے، ایس پی صاحب کو سیلوٹ کرو''۔ ایس ایچ او اکرم خان اسے ذمہ داری کا اح... دلاتے ہوئے بولا۔ ''احمقوں کی طرح ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہے ہو؟''

ایس ایچ او کی آواز نے اس پر جادو کا سا اثر کیا اور اس نے ایک پل میں سنبھل کر جمشید... کو سیلوٹ مار دیا۔

''حوالدار جبرالدین جابر''۔ جمشید خان سر تا پا اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''... تجھے اپنا سروس کارڈ دکھانے کے لیے یہاں آیا ہوں''۔

اتنا کہہ کر اس نے جیب سے کارڈ نکال کر سامنے پڑی ہوئی ٹیبل پر پھینک دیا۔

''لو اچھی طرح چیک کر لو''۔ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''ہو سکتا ہے کارڈ جعلی نکلے''۔

''سس...... سس...... سر! مم...... میں...... اپنے کیے پر...... شرمندہ ہوں''۔ حوال... جبرالدین جابر کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مم...... مجھے...... معاف کر دیں سر''۔

''کارڈ چیک کرو''۔ اس نے حکمیہ انداز میں کہا۔ ''اٹھاؤ۔ جلدی کرو''۔

''مم...... میں...... یہ گستاخی نہیں کر سکتا سر''۔ وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ ''آپ مائی باپ ہیں اور مم...... میں ایک ادنیٰ سا اہلکار ہوں''۔

اس وقت حوالدار جبرالدین جابر کے چہرے پر یتیمی برس رہی تھی اور اس کی مونچھیں چوہے کی دُم کی طرح لٹک رہی تھیں۔ جمشید خان اسے اس وقت کوئی جلاد نظر آ رہا تھا۔ اس نے... لمحے کے لیے امداد طلب نگاہوں سے ایس ایچ او اکرم خان کی طرف دیکھا مگر وہ معاملے سے لاتعلق نظر آ رہا تھا۔

''کارڈ اٹھاؤ''۔ اچانک جمشید خان نے گرج کر کہا۔ ''ورنہ کھڑے کھڑے معطل کر... گا''۔

یہ دھمکی آمیز حکم سن کر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل پر پڑا ہوا کارڈ...



...مگر اسے چیک کرنے کی ہمت اس نے پھر بھی نہ کی۔ اب وہ رحم طلب نگاہوں سے جمشید خان کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن جمشید خان کا چہرہ بے تاثر تھا ہر قسم کے جذبات سے عاری بالکل سپاٹ۔

''کارڈ چیک کرو''۔ اس نے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔ ''کیا یہ اصلی ہے کہ جعلی؟''

''با...... بالکل...... اصلی ہے سر''۔ اس نے کارڈ دیکھے بغیر میکانکی انداز میں جواب دیا۔

''کیا تجھے الہام ہوا ہے؟'' جمشید خان نے غصے سے استفسار کیا۔ ''کارڈ چیک کیے بغیر تم کیسے اسے اصلی کہہ سکتے ہو؟ پہلے کارڈ کو غور سے دیکھو۔ اس کے مندرجات پڑھو اور پھر بتاؤ؟''

''مم...... میں انگلش نہیں پڑھ سکتا سر''۔ وہ فریادی انداز میں بولا۔ ''لل...... لیکن کارڈ اصلی ہی ہوگا''۔

''بیٹھ جاؤ''۔ جمشید خان نے حکمیہ انداز میں کہا۔

''نن...... نہیں سر! میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا''۔

''تم میری حکم عدولی کر رہے ہو؟'' وہ ڈانٹنے کے سے انداز میں بولا۔ ''بیٹھ جاؤ ورنہ؟''

''پپ...... پلیز سر''۔ وہ گھگھیا کر بولا۔ ''معاف کر دیں۔ مم...... میں اپنے کیے پر سخت نادم ہوں۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ میں''۔

''میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ''۔ جمشید خان نے گرج کر قطع کلامی کی اور وہ سہمے سہمے انداز میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے بیٹھنے کے بعد جمشید خان نے فوراً وہ مخصوص رجسٹر منگوا لیا جس میں تھانے کے عملے یا کسی اہلکار کے متعلق سفارشات یا شکایات کا اندراج کیا جاتا تھا۔ رجسٹر میں وہ دس منٹ تک کچھ لکھتا رہا۔ اس دوران حوالدار جبرالدین جابر اور ایس ایچ او اکرم خان چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے رہے تھے۔

جمشید خان اِدھر رجسٹر سے فارغ ہوا اور اُدھر اکرم خان کا اردلی چائے کے لوازمات لے کر آفس میں داخل ہو گیا۔ جمشید خان نے ایس ایچ او کے اصرار پر چائے کی آدھی پیالی پی اور پھر عجلت میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد اکرم خان نے جب رجسٹر کھول کر چیک کیا تو اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پھیلتے چلے گئے۔

''مبارک ہو جبرالدین''۔ وہ رجسٹر بند کرتے ہوئے بولا۔ ''ایس پی صاحب نے نہ صرف تمہاری تعریف و توصیف کی ہے بلکہ اعلیٰ حکام سے تمہاری ترقی کی سفارش بھی کی ہے''۔

''اب آپ تو میرا مذاق نہ اُڑائیں سر''۔ وہ فریادی انداز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ایس

پی صاحب نے میری معطلی کے متعلق......''

''لوخود ہی پڑھ لو''۔اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے رجسٹر اس کی طرف کھسکا دیا۔

جبرالدین جابر نے رجسٹر کھول کر جب پڑھنا شروع کیا تو اس کے چہرے کی کھوئی رونق تیزی سے بحال ہوتی چلی گئی۔ایس پی صاحب نے واقعی اس کی تعریف کی تھی اور ز سفارش بھی کی تھی۔

===·===·

قدموں کی چاپ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی اور پھر دروازہ بے آواز انداز چلا گیا۔امین خان تین مسلح محافظوں کے ساتھ نمودار ہوا اور پھر زرولی اور اس کے ساتھیوں کا جا لینے لگا۔اس کے تینوں محافظوں نے فائرنگ پوزیشن میں رائفلیں تھام رکھی تھیں اور ایک اشار کے منتظر نظر آرہے تھے۔زرولی کو اس سے اس قدر احتیاط کی توقع نہیں تھی۔

''بولو کیا کام ہے؟''ان کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد امین خان نے سوال کیا۔''اِد کیسے زحمت فرمائی ہے؟''

''ہم گل رحمان کا پتہ کرنے کے لیے آئے ہیں''۔زرولی بولا۔''کیا وہ یہاں آیا ہے؟''

''کون گل رحمان؟''اس نے استفسار کیا۔

''انجان مت بنو امین خان''۔زرولی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔''میں گل رحمان کی بات کر رہا ہوں۔وہ اسی طرف آیا ہے''۔

''شاید آیا ہوگا''۔وہ بدستور انجان بنتے ہوئے بولا۔''ادھر سے گزر رہا ہوگا۔ہو سکتا ہے نے میرے حجرے میں جھانکا بھی ہو مگر مجھے کچھ معلوم نہیں ہے''۔

''جھوٹ مت بولو امین خان''۔زرولی نے ناگوار انداز میں کہا۔''گل رحمان کو تمہا حجرے میں داخل ہوتے ہوئے زید خان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ناصر خان اور خا بھی اس کے ساتھ تھے۔مہربانی فرما کر گل رحمان کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ بات بگڑ جائے گی''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''اس نے بگڑ کر پوچھا۔''میں کیا گل رحمان کا اچار ڈالوں وہ اگر یہاں ہوتا تو مجھے اسے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''امین خان!''وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔''گل رحمان نے خان جی کی حویلی میں کی ہے اسے ہمارے حوالے کر دو۔اسے پناہ دے کر تم خان جی سے مفت کی دشمنی کیوں مول رہو؟''

''مجھے کیا اب قسم اٹھا کر تم لوگوں کو یقین دلانا پڑے گا کہ گل رحمان یہاں نہیں ہے؟''



خان نے جواب دیا۔

''ہم حجرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں''۔زرولی بولا۔''تم سے قسم اٹھوانے کا ہمیں کوئی شوق نہیں ہے''۔

''اگر میں اجازت نہ دوں تو؟''اس نے بگڑے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''تو ہم خان جی کو جا کر پوری بات بتا دیں گے''۔زرولی نے کہا۔''کیا تم خان جی سے بگاڑ کر اس علاقے میں امن سے رہ سکتے ہو؟خان جی پورے علاقے کی اہم سیاسی شخصیت ہیں اس کی پہنچ اسلام آباد کے ایوانوں تک ہے،وہ یہاں کے بے تاج بادشاہ ہیں''۔

''حق نمک ادا کرنا خوب آتا ہے تمہیں''۔امین خان نے طنز سے کہا۔''لیکن اس علاقے میں کچھ لوگ ایسے بھی رہتے ہیں جو خان جی کی بجائے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔میں تم لوگوں کو حجرے کی تلاشی دینے کے لیے تیار رہوں مگر خان جی کے ڈر کی وجہ سے نہیں محض اپنی صداقت ثابت کرنے کے لیے۔آجاؤ''۔

اتنا کہنے کے بعد امین خان نے زرولی اور اس کے ساتھیوں کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔وہ سب دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور حجرے کے کمروں کی پولیس والوں کی طرح تلاشی لینا شروع کر دی۔انہوں نے کونوں کھدروں میں جھانکا،چارپائیوں کے نیچے دیکھا۔تہہ کیے ہوئے رضائی لحافوں کو الٹ پلٹ دیا،باتھ روم کو چیک کیا مگر گل رحمان انہیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔صورت حال کے پیش نظر اب زرولی اور اس کے ساتھی پریشان نظر آرہے تھے تاہم امین خان اب بڑی حد تک مطمئن تھا اور زرولی کو طنزیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

''کیا اب تسلی ہو گئی ہے کہ گل رحمان یہاں نہیں آیا؟''امین خان زرولی سے مخاطب ہو کر بولا۔''میری بات پر تو تم لوگوں کو یقین نہیں آرہا تھا''۔

''مجھے اب بھی تم پر یقین نہیں آرہا''۔زرولی نے مشکوک انداز میں کہا۔''تم نے اسے کسی خفیہ راستے سے نکال دیا ہوگا یا پھر......''وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''یا پھر کیا؟''امین خان نے بھڑک کر سوال کیا۔''کیا میں نے اسے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے؟''

''یہ ناممکن تو نہیں ہے''۔زرولی بولا۔''ہماری آمد کی اطلاع پا کر ممکن ہے تم نے اسے گھر میں چھپا رکھا ہوا اور اب''۔

''بکواس مت کرو''۔امین خان نے گرج کر قطع کلامی کی۔''میرے گھر کی طرف تم میں سے اگر کسی نے قدم اٹھایا تو لاشیں گر جائیں گی۔کیا تم لوگوں نے مجھے بے غیرت سمجھ رکھا ہے یا تم

قبائیلیوں کی روایات سے ناواقف ہو؟ عجب خان آفریدی اور انگریز بہادر والا قصہ کیا تم لوگ
گئے ہو؟ انگریز بہادر نے بھی طاقت کے نشے میں آ کر عجب خان آفریدی کے گھر کی تلاشی لی تھ
پھر"۔

"ہم یہاں تم سے کہانیاں سننے کے لیے نہیں آئے"۔ زرولی اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔"
تمہارے گھر کی بھی تلاشی لیں گے"۔

"ہمت ہے تو قدم بڑھا کر دکھاؤ"۔ امین خان چیلنج کے سے انداز میں بولا۔"دوسرے
پر ہی تمہاری لاش گر جائے گی"۔

"ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں"۔ زرولی نے طیش میں آ کر جواب دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گروپوں نے رائفلیں تان لیں۔

===

ناصر خان اور رخائستہ گل جس وقت مولوی نصیب اللہ کے گھر پہنچے تب تک وہ سو چکا
انہوں نے اسے جگا کر جب پورا واقعہ سنایا تو خلافِ توقع وہ بالکل پریشان نہ ہوا۔

"مجھے خان جی کی طرف سے اس اقدام کی پہلے سے توقع تھی"۔ وہ پورے اطمینان
ساتھ بولا۔"مگر وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ زندگی اور موت میرے پاک پروردگار کے ہاتھ
ہے، اس کی منشا کے خلاف نہ کوئی کسی کو مار سکتا ہے اور نہ ہی زندگی دے سکتا ہے۔ تم لوگوں نے
کے اس وقت خواہ مخواہ تکلیف کی، یہ بات مجھے کل صبح بھی بتائی جا سکتی تھی"۔

"مولانا صاحب!" ناصر خان نے کہا۔"ہمیں آپ کی ہمت و بہادری سے انکار نہیں
لیکن معاملہ بہت سنگین صورت اختیار کر چکا ہے، امین خان کا خیال ہے کہ آج رات ہی خان
آدمی آپ کے گھر پر شب خون مار سکتے ہیں۔ انہوں نے آپ کو اہلِ خانہ سمیت اپنی حویلی م
ہے"۔

"امین خان بہت اچھا اور نیک انسان ہے"۔ وہ بدستور مطمئن انداز میں بولا۔"مگر
ایک ظالم کے خوف سے اپنا گھر بار نہیں چھوڑ سکتا۔ موت نے اگر آج آنا ہی ہے تو کیا امین خان
حویلی کی دیواریں اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں؟"

"نہیں"۔ ناصر خان نے جواب دیا۔

"تو پھر میں وہاں کس لیے جاؤں؟" وہ استفساریہ انداز میں بولا۔"مرنا ہی ہوگا تو ا
میں تو مروں گا"۔

"مولانا صاحب!" خائستہ گل مداخلت کرتے ہوئے بولا۔"اگر اجازت ہو تو کچھ



کروں؟"

"شوق سے کرو بھئی"۔ وہ خوشدلی سے بولا۔"میں نے کوئی تم لوگوں پر پابندی تو نہیں لگا رکھی؟"

"آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس لیے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی اور وہ بھی بالکل اسی طرح رات کے اندھیرے میں؟ نعوذ باللہ کیا کوئی مسلمان یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ آپؐ دشمنوں سے ڈر گئے تھے"۔ خائستہ گل نے عالمانہ انداز میں جواب دیا۔

نصیب اللہ اور ناصر خان نے ایک ساتھ چونک کر خائستہ گل کی طرف دیکھا تھا۔ اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ کم از کم مولوی نصیب اللہ کو اس سے اس قدر ذہانت کی توقع نہیں تھی اور ناصر خان کے لیے تو وہ ویسے بھی کند ذہن اور احمق تھا۔

"خائستہ گل!" چند لمحوں کے توقف کے بعد مولوی صاحب گویا ہوا۔"اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، تم نے ناخواندہ ہو کر بھی مجھے وہ راستہ دکھا دیا ہے جس پر میرے آقاؐ نے آج سے صدیوں پہلے اپنے قدم مبارک رکھتے ہوئے شب کی سیاہی میں مکہ سے مدینہ منورہ تک سفر طے فرمایا تھا۔ آج مجھ ناچیز کو بھی آقاؐ کی طرح ہجرت کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ سب میرے پاک پروردگار کا کرم ہے ورنہ کہاں پیارے آقاؐ اور کہاں میں ناچیز گناہگار انسان؟ مجھے تو ان سے صرف اتنی ہی نسبت ہے کہ میں ان کا اُمتی ہوں"۔

مولانا صاحب اچانک ہی جذباتی ہو گئے تھے پھر اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتے ناصر خان بولا۔"آپ اگر رضامند ہو ہی گئے ہیں تو پھر جلدی سے تیاری کیجئے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے دشمن کسی بھی وقت نازل ہو سکتا ہے"۔

"تیاری کیسی بھئی؟" اس نے بدستور جذباتی کیفیت میں کہا۔"ہمارے آقا کون سا مال و دولت ساتھ لے کر نکلے تھے؟ میں آپؐ کا اُمتی ہوں اور آپؐ کی تقلید کرتے ہوئے خالی ہاتھ ہی گھر سے نکلوں گا"۔

"پھر بھی مولانا صاحب! نقدی اور زیور وغیرہ تو ساتھ لے لیں"۔ ناصر خان بولا۔"خدا نے انسان کے ساتھ پیٹ بھی تو لگایا ہے ناں؟"

"نقدی تو کوئی خاص نہیں ہے"۔ اس نے کہا۔"البتہ دونوں بیٹیوں کے لیے چند گہنے بنا کر رکھے ہوئے ہیں"۔

"جو کچھ بھی ہے بس فوراً اٹھائیں اور چلنے کی تیاری کریں"۔ خائستہ گل بولا۔"خان جی کے

آدمی پہنچ گئے تو خون خرابا ہو جائے گا‘‘۔

’’ٹھیک ہے‘‘۔مولانا صاحب نے تائیدی انداز میں کہا۔’’تم لوگ یہاں بیٹھو میں اہل کے ساتھ تیار ہو کر آتا ہوں‘‘۔اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

پندرہ منٹ کے بعد ناصر خان اور خائستہ گل مولانا نصیب اللہ اور اس کی فیملی کو ساتھ امین خان کی حویلی کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔خائستہ گل نے ہاتھوں میں ایک درمیانے اٹیچی کیس اٹھا رکھا تھا۔مولانا صاحب کی بیوی اور دونوں نوجوان بیٹیاں خوفزدہ انداز میں ان ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

✣ === ✣ === ✣

امین خان کے تینوں محافظوں کی رائفلوں کا رخ زرولی کی طرف تھا جبکہ زرولی اور اس ساتھیوں نے امین خان کو نشانے پر لے رکھا تھا۔دونوں گروپ ایک اشارے کے منتظر تھے اور دوسرے کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔اچانک امین خان اپنے آدمیوں سے مخاطب ’’میری فکر بالکل مت کرنا، ان میں سے کوئی بھی حویلی کی طرف قدم بڑھائے تو بھون ڈالنا گو سے‘‘۔

’’بچو گے تم بھی نہیں امین خان‘‘۔زرولی بولا۔’’تمہارے جسم میں بھی بے شمار سورا جائیں گے‘‘۔

’’جانتا ہوں‘‘۔امین خان نے بے دھڑک کہا۔’’ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ہ موت عزت کی موت ہو گی اور تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی موت کیسی ہو گی؟ یہ تم لوگ طرح جانتے ہو۔میرے آدمی تب تک گولی نہیں چلائیں گے جب تک تم میں سے کوئی حو طرف نہیں بڑھتا۔فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔اگر خون کی ہولی کھیلنے کا شوق ہے تو حویلی کی قدم بڑھاؤ ورنہ واپس لوٹ جاؤ‘‘۔

امین خان کے حتمی فیصلے نے زرولی اور اس کے ساتھیوں کو وقتی طور پر کشمکش میں مبتلا کر ان کے لیے پیچھے ہٹنا بزدلی تھی اور آگے بڑھنا صریحاً موت سے بغلگیر ہونا تھا۔امین خان اور کے محافظوں کی فیصلہ کن نگاہیں برابر ان کے چہروں کا طواف کر رہی تھیں۔دونوں طرف کی را بدستور فائرنگ پوزیشن میں اٹھی ہوئی تھیں۔سب کی انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں مگر پہل کی ہمت کوئی نہیں کر رہا تھا۔

اچانک حجرے کے دروازے سے ناصر خان اور خائستہ گل نمودار ہوئے تو دونوں گروہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔امین خان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے پریشانی کے آثار نمودار



معدوم ہو گئے۔کیونکہ ناصر خان اور خائستہ گل کے ساتھ مولوی نصیب اللہ موجود نہیں تھا۔تاہم ان دونوں کو دیکھ کر زرولی کا شک کچھ اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔

ناصر خان اور خائستہ گل ان کے قریب پہنچ کر رک گئے۔وہ دونوں بھی مسلح تھے۔اب امین خان کا پلڑا زرولی سے بھاری ہو چکا تھا۔چنانچہ اب وہ پہلے کی نسبت زیادہ پُراعتماد نظر آنے لگا تھا۔

’’امین خان!‘‘ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد زرولی بولا۔’’انہی دونوں کے ساتھ گل رحمان کو دیکھا گیا ہے۔کیا اب بھی تم مکرو گے کہ گل رحمان تمہارے حجرے میں داخل نہیں ہوا تھا؟‘‘

’’تم میرے حجرے کی تلاشی لے چکے ہو‘‘۔امین خان نے کہا۔’’تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤ ورنہ نتیجہ بہت بھیانک نکلے گا‘‘۔

’’تم خان جی سے دشمنی مول لے رہے ہو‘‘۔اس نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔’’خان جی کے مجرم کو پناہ دے کر تم بہت نقصان اٹھاؤ گے‘‘۔

’’یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا‘‘۔امین خان نے ترکی بہ ترکی کہا۔’’میں خان جی کا دیا نہیں کھاتا‘‘۔

’’چلو زرولی!‘‘ گل شیر خان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔’’واپس چلتے ہیں۔خان جی خود ہی ان سے نمٹ لیں گے‘‘۔

’’یہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا‘‘۔امین خان بولا۔’’ورنہ میرے آدمی مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہیں مگر پہل ہم نہیں کریں گے‘‘۔

’’ہم پھر آئیں گے‘‘۔زرولی نے دھمکی دی۔

’’میں تمہیں یہیں ملوں گا‘‘۔امین خان نے جواب دیا۔

’’چلو‘‘۔زرولی نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور پھر وہ تمام حجرے کے احاطے سے باہر نکل گئے۔

’’مولانا صاحب کہاں ہے؟‘‘ ان لوگوں کے جانے کے بعد امین خان نے ناصر خان سے استفسار کیا۔

’’وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ حویلی کے دروازے پر موجود ہے‘‘۔ناصر خان بولا۔’’ہم اگر بروقت زرولی کی آواز نہ سن لیتے تو سیدھے ادھر ہی آتے‘‘۔

’’اچھا کیا ہے تم لوگوں نے‘‘۔امین خان نے مطمئن انداز میں کہا۔’’ورنہ مولانا صاحب کو دیکھ کر زرولی آسانی سے واپس نہیں جاتا‘‘۔

’’یہ لوگ گل رحمان کا پتہ کرنے کے لیے آئے تھے کیا؟‘‘ ناصر خان نے پوچھا۔

''ہاں''۔ اس نے جواب دیا۔ ''بڑی مشکل سے ہم لوگوں نے اسے چھپایا ہے، زرولی اس کے ساتھیوں نے پولیس والوں کی طرح حجرے کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا مگر گل رحمان کو تلاش نہ کر سکے''۔

''کیا آپ نے اسے حویلی میں چھپا رکھا ہے؟'' ناصر خان نے سوال کیا۔

''نہیں''۔ امین خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ یہیں حجرے میں ہے''۔

''کہاں؟''

''اوپر چھت پر بندھا پڑا ہے''۔ امین خان نے کہا۔ ''اس کے منہ میں ہم نے کپڑے کا گولا بنا کر ٹھونس رکھا ہے''۔

''اسے اتارنا چاہیے''۔ ناصر خان تشویش سے بولا۔ ''کہیں مر ہی نہ جائے''۔

''تم لوگ گل رحمان کو نیچے اتارو۔ میں مولانا صاحب کی طرف جا رہا ہوں''۔ اتنا کہہ کر امین خان تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

⁂ === ⁂ === ⁂

دو دنوں کے بعد جب اے ایس آئی کامران نے شوکت حسین اور اس کے نوجوان بیٹے آصف کو دوبارہ جمشید خان کی خدمت میں پیش کیا تو ان باپ بیٹے کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ دونوں کا لباس میلا ہو چکا تھا، بال بکھرے ہوئے تھے اور نیند نہ کرنے کی وجہ سے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ آصف سے زیادہ بری حالت شوکت حسین کی تھی۔ جمشید خان چند لمحے دونوں کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیتا رہا۔ پھر کامران کی طرف رخ موڑتے ہوئے بولا۔ ''کچھ بتایا ہے انہوں نے؟''

''آپ سوال کر کے دیکھیں سر''۔ وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ''ابھی کرکٹ کمنٹری شروع ہو جائے گی۔ میں نے دونوں باپ بیٹے کو مخصوص ڈوز دے کر چارج کر دیا ہے''۔

''کوئی سفارش وغیرہ آئی تھی ان کے لیے؟'' جمشید خان نے دوبارہ استفسار کیا۔

''جی سر''۔ اس نے جواب دیا۔ ''ان کے محلے کا ایک سیاستدان آیا تھا۔ بلدیاتی الیکشن لڑتا رہتا ہے۔ نام عظیم خان ہے مگر میں نے اسے ٹرخا دیا۔ ملاقات نہیں کرنے دی۔ شاید آج پھر آئے گا، آپ سے ملنے کا خواہش مند تھا''۔

''او کے۔ آئے گا تو دیکھ لوں گا''۔

اتنا کہہ کر وہ شوکت حسین اور اس کے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''کیوں شوکت میاں! کیا کہتے ہو صفیہ رحمان کے باپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیسے مرا تھا وہ؟''



جمشید خان کا سوال سن کر چند لمحے وہ خلا میں گھورتا رہا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں ہی اس کا قاتل ہوں صاحب! وہ تو بہت ہی اچھا اور نیک انسان تھا، مجھ سے چھوٹا تھا مگر میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ میری ذرا سی تکلیف پر وہ تڑپ اٹھتا تھا۔ میرے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا؟ مگر مگر...... میں ایک آوارہ اور بدچلن عورت کے بہکاوے میں آ کر بہت بڑا گناہ کر بیٹھا۔ مجھے پھانسی پر چڑھا دو صاحب۔ مجھے پھانسی پر چڑھا دو''۔ ایک دم خاموش ہو کر اس نے رونا شروع کر دیا۔

جمشید خان غور سے اس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بار بار اس کا سابقہ چالاک اور عیار مجرموں سے پڑتا رہتا تھا جو چالیں چل کر قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ قانون کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے من گھڑت کہانیاں سنانا شروع کر دیتے تھے۔ مگر آج کوشش کے باوجود اسے شوکت حسین کے چہرے اور آنکھوں میں کوئی مکر و فریب نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کا سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھا تھا یا پھر یہ اے ایس آئی کامران کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شوکت حسین اقبال جرم کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔

''شوکت حسین!'' چند لمحوں کے توقف کے بعد جمشید خان نرم لہجے میں بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے پوری کہانی سننا چاہتا ہوں''۔

''نہیں صاحب!'' وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بیٹھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ آپ میرا بیان قلم بند کروائیں''۔

''اس کا بندوبست بھی میں کر دیتا ہوں۔ تم بیٹھو تو سہی''۔ جمشید خان نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر اے ایس آئی کامران کو بھی مخصوص اشارہ کر دیا۔

جب شوکت حسین بیٹھ گیا تو اے ایس آئی کامران نے ٹیبل کی دراز سے ایک چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈر نکال کر کرسی کھینچی اور شوکت حسین کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

''ہاں اب سناؤ شوکت حسین!'' جمشید خان نے کہا۔ ''تمہارا بیان ریکارڈ کرنے کا بندوبست ہو گیا ہے''۔

''صاحب! میری کہانی بہت لمبی ہے''۔ وہ بولا۔ ''آپ کا قیمتی وقت ضائع ہو جائے گا۔ صرف میرا اعتراف جرم سن لو اور''۔

''تم میرے وقت کی فکر مت کرو''۔ جمشید خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم شروع سے لے کر آخر تک مجھے پوری داستان سنا دو۔ ہو سکتا ہے تم سے زیادہ کوئی اور قصوروار نکلے۔ اس صورت میں میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا''۔

''اور کوئی کیوں قصور وار نکلے گا صاحب!'' آصف نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔'' جب آپ کے سامنے خود اپنے جرم کا اعتراف کر رہا ہے تو......''

''چپ رہو حرام زادے''۔شوکت حسین نے چلا کر قطع کلامی کی۔''نہ جانے کس کمینے کے نطفے سے تم نے جنم لیا ہے۔ایک طوائف کے گناہ کو میں برسوں سے بھگت رہا ہوں''۔

شوکت حسین کے اس انکشاف نے ان سب کو لمحہ بھر کے لیے متحیر کر دیا۔سب سے قابلِ رحم حالت آصف کی تھی وہ باپ کی طرف نا قابل یقین نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔اس کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی کہ وہ کسی کی نا جائز اولاد ہے۔اس کی حالت بالکل اس شخص کی سی نظر آرہی تھی جسے سرِ بازار ننگا کر دیا گیا ہو۔

وہ چند لمحے باپ کو نا قابلِ یقین نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر سنبھلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔''صاحب! آپ اس کی بات کا قطعی اعتبار نہ کریں۔یہ...... یہ اپنی جان بچانے کے لیے کوئی چال چل رہا ہے۔میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔یہی میرا باپ ہے۔یہ اتنا گر جائے گا یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔یہ تو اپنے سگے بھائی کا بھی نہ ہو سکا تو پھر بھلا اپنی اولاد کا......''

''یہ بکواس کر رہا ہے ایس پی صاحب''۔شوکت حسین نے چلا کر قطع کلامی کی۔''میں اس کا باپ نہیں ہوں، میرے پاس نا قابلِ تردید ثبوت ہیں اس سچائی کے۔یہ...... یہ کسی کی ناجائز اولاد ہے۔اس کی ماں......''

''بڈھے! بھونکو مت کتے کی طرح''۔آصف نے چیخ کر اس کی بات کاٹی اور پھر چیل کی طرح جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔شوکت حسین کرسی سمیت فرش پر الٹ گیا۔

''میں...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کمینے انسان''۔وہ ہذیانی انداز میں چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ شوکت حسین کا گلا دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جمشید خان یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اے ایس آئی کامران آگے بڑھ کر شوکت حسین کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔آصف کسی آکٹوپس کی طرح شوکت حسین سے لپٹا ہوا تھا۔اے ایس آئی کامران کوشش کے باوجود اسے آزاد نہیں کرا پا رہا تھا۔دم گھٹنے کی وجہ سے شوکت حسین کے گلے میں پھنسی پھنسی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔

کامران کو بے بس دیکھ کر جمشید خان تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ٹیبل کے پہلو سے گھوم کر وہ ان کے سر پر پہنچا اور عقب سے آصف کی گردن کو پکڑ لیا۔دوسرے ہی لمحے آصف مردہ چھپکلی کی طرح فرش پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔غالباً جمشید خان نے اس کی کوئی مخصوص نس پکڑ کر دبا دی تھی۔کامران نے تیزی سے جھک کر شوکت حسین کو چیک کیا۔وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا تاہم دم گھٹنے کی وجہ سے اب وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔



دس منٹ کے بعد شوکت حسین دوبارہ کرسی پر بیٹھا پانی پی رہا تھا اور دو کانسٹیبل آصف کو ڈنڈا ڈولی کیے حوالات کی طرف لے جا رہے تھے۔

❖ === ❖ === ❖

زرولی اور اس کے ساتھی جب ناکام ہو کر واپس حویلی میں پہنچے تو تب تک خان جی سو چکا تھا۔ان میں سے کوئی بھی اسے جگانے کی ہمت نہ کر سکا تاہم خان جی کے ذاتی کام سرانجام دینے والے ایک ملازم کو زرولی نے پیغام دے دیا تھا کہ خان جی اگر جاگ کر ان کے متعلق پوچھیں تو انہیں ہماری واپسی کی اطلاع دے دی جائے۔

اس کے بعد زرولی اور اس کے ساتھی ساری رات خان جی کے پیغام کے منتظر رہے تھے مگر انہیں بلانے کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔صبح ہونے سے تھوڑی دیر قبل ہی ان کی آنکھ لگی تھی۔دن چڑھے خان جی کا ملازم خاص ان کے سر پر پہنچ گیا۔

''جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ وغیرہ کر لو''۔انہیں جگانے کے بعد ملازم نے انہیں خان جی کا حکم سناتے ہوئے کہا۔''خان جی بے چینی سے تم لوگوں کے منتظر ہیں''۔

''ہم ابھی آتے ہیں''۔زرولی نے آنکھیں مسلتے ہوئے جواب دیا۔''تم باورچی سے ہمارے ناشتے کا کہتے جانا''۔

''ٹھیک ہے کہہ دوں گا''۔وہ جاتے جاتے بولا۔''لیکن جلدی کرنا۔خان جی نے کہیں جانا ہے''۔

بیس منٹ کے بعد زرولی اور اس کے ساتھی ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔تھوڑی دیر کے بعد وہ خان جی کی مخصوص نشست گاہ میں اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔خان جی ایک صوفے پر براجمان ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے غیر ملکی سگار کے کش لگا رہا تھا۔

زرولی، گل شیر خان اور زید خان سر جھکائے اس کے حکم کے منتظر تھے۔خان جی نے ایک بھرپور کش لگانے کے بعد گھور کر ان تینوں کی طرف باری باری دیکھا اور پھر زرولی کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے گویا ہوا۔''تم لوگ کس وقت آئے تھے؟''

''رات کے بارہ بجے خان جی''۔اس نے جواب دیا۔''اس وقت آپ آرام کر رہے تھے''۔

''اس وقت ہمیں اطلاع کیوں نہیں کی تم نے؟'' خان جی نے بگڑ کر پوچھا۔

''خان جی!'' وہ سہم کر بولا۔''آپ سوئے ہوئے تھے اس لیے میں نے آپ کو بے آرام

کرنا مناسب نہیں سمجھا، تاہم میں نے......''

''ہم سوئے ہوئے تھے، مر تو نہیں گئے تھے؟'' خان جی نے بھڑک کر کہا۔ ''ہمیں جگا تو جا سکتا تھا؟ تمہاری کھوپڑی میں دماغ ہے کہ نہیں۔ اتنا اہم معاملہ ہے اور تمہارا یہ حال ساتھیوں سمیت دن چڑھے تک سوتے رہتے ہو''۔

''وہ......وہ......ہم...... میں نے...... خان جی''۔

''خاموش''۔ خان جی نے گرج کر کہا اور زرولی میکانکی انداز میں چپ ہو گیا، اس چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

''گل رحمان کو لے آئے ہو؟'' خان جی نے بدستور بگڑے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''خان جی!'' وہ خوفزدہ انداز میں بولا۔ ''امین خان نے اسے کہیں رُوپوش کر دیا ہے۔ ا کے حجرے کی تلاشی اچھی طرح لی تھی مگر جب ہم نے اس کی حویلی کی تلاشی لینے کی بات کی تو ا خان مرنے مارنے پر تل گیا جی''۔

''پوری بات بتاؤ؟'' خان جی نے حکم دیا۔

''جج...... جی...... خان جی بتاتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر اس نے بلاکم و کاست پوری سرگزشت خان جی کے گزش گزار کر دی۔

''تم سب کتے کے بچے ہو''۔ پوری بات سن کر خان جی ایک مرتبہ پھر بھپر اٹھا۔ ''وہ نا خان اور خائستہ گل۔ تمہاری ماں کے یار، گل رحمان کو کسی خفیہ مقام پر منتقل کر چکے ہوں گے اور اب اسے ہمارے خلاف استعمال کرنے کا پلان بنا رہے ہوں گے''۔

''خا...... خان جی...... ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے''۔ زرولی بولا۔ ''وہ اتنی جلدی گاؤں باہر کیسے جا سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے امین خان نے اسے اپنی حویلی میں چھپا رکھا ہوگا''۔

اس کا جواب سن کر خان جی ایک لمحے کے لیے سوچ میں گم ہو گیا اور زرولی اور اس کے ساتھی دل ہی دل میں اپنی خیریت کی دعا مانگنے لگے۔

''سنو''۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد خان جی بولا۔ ''میرا قیاس کہتا ہے کہ ناصر خان او خائستہ گل یا تو مولوی نصیب اللہ کو خبردار کرنے کے لیے گئے تھے یا پھر گل رحمان کو کسی پوشیدہ مقا پر منتقل کرنے کے لیے گئے تھے''۔

''ہو سکتا ہے خان جی! آپ کا قیاس درست ہو''۔ زرولی نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''بہرکیف وہ دونوں یہیں موجود ہیں۔ ہم انہیں اغوا کر کے پوچھ تاچھ کر سکتے ہیں۔ سارا معاملہ واضح ہو جائے گا''۔



''پہلی بار تم نے کوئی عقل کی بات کی ہے''۔ خان جی نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''ناصر خان اور خائستہ گل سے پوچھ تاچھ کرنا ہی پڑے گی مگر پہلے کسی آدمی کو مولوی کا پتہ کرنے کے لیے بھیج دو''۔

''وہ کس لیے خان جی؟'' زرولی قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے مولوی کو بھی وہ دونوں کسی اور جگہ منتقل کر چکے ہوں''۔ خان جی نے جواب دیا۔ ''ہم اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ ناصر خان اور خائستہ گل ضرورت سے زیادہ ذہین لگتے ہیں اور ذہین لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ تم کسی آدمی کو پتا کرنے کے لیے بھیج دو''۔

''میں جاتا ہوں خان جی''۔ زید خان نے لب کشائی کی۔ ''ابھی پتا کر کے واپس آ جاؤں گا''۔

''ٹھیک ہے جاؤ''۔ خان جی نے جواب دیا اور زید خان تیزی سے باہر نکل گیا۔

''ہمیں ایک ہی خدشہ ہے''۔ زید خان کے جانے کے بعد خان جی نے صوفے سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''امین خان اور اس کے حامی پولیٹیکل ایجنٹ کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے''۔

(ٹرائبل ایریا میں محکمۂ پولیس کی جگہ خاصہ دار فورس ہوتی ہے جو پی اے یعنی پولیٹیکل ایجنٹ کی ماتحت ہوتی ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ (پی اے) کہلاتا ہے اور اس کا اسسٹنٹ (اے پی اے) کہلاتا ہے دونوں بالترتیب ایس پی اور ڈی ایس پی رینک کے برابر ہوتے ہیں)۔

''خان جی! ہم انہیں وہاں تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے''۔ زرولی نے جوشیلے انداز میں کہا۔ ''اس سے پہلے ہی ناصر خان اور خائستہ گل کو اغوا کر لیں گے''۔

''تم لوگوں کی کارکردگی بہت ہی ناقص ہوتی جا رہی ہے''۔ خان جی بولا۔ ''موسیٰ خان یہاں ہوتا تو ہمیں کوئی پریشانی نہ ہوتی، وہ اکیلا سب کچھ سنبھال لیتا''۔

''آپ فکر نہ کریں خان جی''۔ زرولی نے کہا۔ ''ہم آج رات ہی ناصر خان اور خائستہ گل کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گے''۔

''کوشش نہیں زرولی!'' خان جی نے پُرزور انداز میں کہا۔ ''ہمیں سو فیصد کامیابی چاہیے ہم آج رات ہی ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں''۔

''ایسا ہی ہوگا خان جی''۔ اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اب تم لوگ جاؤ''۔ خان جی نے حکم سنایا۔ ''جب زید خان واپس آ جائے گا تو بات کریں گے''۔

وہ دونوں خاموشی سے باہر نکل گئے اور خان جی دوبارہ صوفے پر بیٹھ کر سوچوں میں مستغرق

ہو گیا۔

ذرا دیر کے بعد اس کا ملازم خاص اندر داخل ہوا اور مؤدب انداز میں بولا ''خان جی! پ
سے بنگش کا آدمی آیا ہے اور آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے''۔

''ٹھیک ہے اسے بھیج دو اور چائے بھی بھجوا دینا''۔ خان جی نے جواب دیا اور ملازم ا
قدموں باہر نکل گیا۔







جب شوکت حسین کی حالت اچھی طرح سنبھل گئی تو اس کے سامنے دوبارہ کیسٹ ریکارڈر رکھ دیا گیا اور ایس پی جمشید خان نے اسے ساری سرگزشت سنانے کے لیے کہہ دیا۔

شوکت حسین چند لمحے بالکل خاموش بیٹھا رہا شاید وہ گزرے ہوئے واقعات کو ذہن میں ترتیب دے رہا تھا۔ اے ایس آئی کامران کی انگلی کیسٹ ریکارڈر کے بٹن پر رکھی ہوئی تھی۔ جونہی شوکت حسین نے لب کھولے اس نے ریکارڈنگ بٹن پریس کر دیا۔

''صاحب جی! ہم دو ہی بھائی تھے، میں بڑا تھا اور رحمان مجھ سے چھوٹا تھا۔ بہن کوئی نہیں تھی۔ آج سے کوئی بیس برس قبل جب ہمارا باپ فوت ہوا تو ہم دونوں بھائیوں کے حصے میں اچھا خاصہ ترکہ آیا تھا۔ پانچ پانچ لاکھ روپیہ ہمیں نقد ملا تھا اور اس کے علاوہ وراثت میں ہمیں ایک جنرل اسٹور بھی ملا تھا جو شہر کی ایک معروف مارکیٹ میں واقع تھا اور خوب چلتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی روزانہ کی سیل ہزاروں میں تھی۔ ہم دونوں بھائیوں کی زندگی بہت سہل تھی اور عیش وعشرت میں بسر ہو رہی تھی۔ رحمان بہت محنتی اور ایماندار شخص تھا، جنرل اسٹور پر بھی وہی بیٹھتا تھا جبکہ میں بڑا ہونے کے ناطے آزاد تھا اس لیے سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا تھا اور نکھے نکھٹو قسم کے دوستوں کے ساتھ رات دن گھومتا رہتا تھا۔ جنرل اسٹور سے حاصل ہونے والی آمدنی کا حصہ میری آوارہ گردی اور عیاشی کی نذر ہو جاتا تھا تاہم میرے حصے کا پانچ لاکھ روپیہ بدستور ہم دونوں بھائیوں کے مشترکہ اکاؤنٹ میں پڑا ہوا تھا۔ یہ دس لاکھ روپیہ ہم بھائیوں نے اپنی اپنی شادی کے اخراجات کے لیے رکھا ہوا تھا کیونکہ ہم دونوں غیر شادی شدہ تھے۔ گھریلو کام کاج کے لیے ہم نے ایک خاتون ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو بڑی سگھڑ اور سلیقہ مند تھی اور ہم بھائیوں کا ہر کام بروقت کر دیا کرتی تھی، استری شدہ کپڑے، پالش کیے ہوئے جوتے، ناشتہ اور لنچ ڈنر وغیرہ غرض سبھی کچھ ٹائم پر ہمیں میسر ہو جاتا تھا۔ ہم ہر طرح سے خوشحال اور آسودہ زندگی گزار رہے تھے نہ کوئی پریشانی تھی اور نہ کوئی فکروفاقہ تاہم رحمان چھوٹا ہونے کے باوجود اکثر مجھے فضول خرچی اور عیاش دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے سے منع کرتا رہتا تھا۔ بڑا ہونے کی وجہ سے میں نے کبھی اس کی نصیحت پر کان نہیں دھرے تھے بلکہ

اکثر اوقات اسے نصیحت کرنے پر خوب کھری کھری سنا دیا کرتا تھا۔ وہ ایسا فرمانبردار انسان کبھی میری کسی بکواس کا برا نہیں مناتا تھا محض اتنا کہنے پر اکتفا کیا کرتا تھا کہ ''بھائی میں بھلائی لیے کہہ رہا تھا''۔ یہ مخصوص فقرہ جیسے اس کا تکیہ کلام تھا۔ ہمارے دن اسی طرح بسر ہو تھے، باپ کو گزرے چھ ماہ ہو چکے تھے، اس دوران رحمان نے ہمارے مشترکہ اکاؤنٹ میں مزید جمع کرا دیے تھے اور یہ دو لاکھ روپیہ جنرل اسٹور سے حاصل ہونے والی اس کی حلال کی حصہ تھا جبکہ میں اپنے حصے کی آمدنی عیاش دوستوں پر اُڑا دیا کرتا تھا۔

ایک دن ڈنر سے فارغ ہو کر ہم دونوں بھائی حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے کہ کہنے لگا۔ ''بھائی جان، اب ہمارے اکاؤنٹ میں بارہ لاکھ جمع ہو چکے ہیں''۔

''بارہ لاکھ؟'' میں نے چونک کر پوچھا کیونکہ اس وقت تک میں اس بات سے بے خبر ''مگر کیسے؟''

''میں اپنے حصے کی آمدنی باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ جمع کرواتا رہا ہوں''۔ وہ پُر مسرت میں بولا۔ ''آج جب میں نے بنک میں جا کر اکاؤنٹ میں پانچ ہزار روپیہ جمع کروایا تو پتا چ ٹوٹل رقم بارہ لاکھ روپے ہو چکی ہے''۔

''ارے یار! تم تو چھپے رستم نکلے''۔ میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی ط محنت کرتے رہے تو بہت آگے تک جاؤ گے''۔

''ہاں یہ بات تو ہے''۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر یک لخت سنجیدگی اختیار کر ہوئے بولا۔ ''بھائی جان! اگر آپ نے بھی اپنی آمدنی باقاعدگی کے ساتھ اکاؤنٹ میں جمع کر ہوئی تو آج بارہ لاکھ کی بجائے ہمارے اکاؤنٹ میں چودہ لاکھ روپے کی رقم جمع ہوتی''۔

''تم کراتے رہتے ہو ناں! پھر میری کیا ضرورت ہے؟'' میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ '' بھی اکاؤنٹ تو ہم دونوں کا مشترکہ ہی ہے''۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھائی جان!'' وہ بدستور سنجیدہ انداز میں بولا۔ ''مگر یہ بھی تو سوچو کہ ایک ہوتا ہے اور دو گیارہ۔ اگر آپ اپنی موجودہ روش ترک کر دیں تو کچھ عرصہ کے بعد ہم ایک چھوٹی موٹی فیکٹری کے مالک ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے میں نے شہر کے ایک م علاقے میں ایک پلاٹ بھی دیکھ رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے آج کل میں، پلاٹ کے مالک اور درمیان سودا بھی طے پا جائے''۔

''احمقانہ باتیں مت کرو''۔ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پاس اللہ کا د کچھ ہے، یہ کارخانے فیکٹریاں ہم جیسے لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہیں، جمع پونجی گنوا بیٹھو گے''۔



''کیوں گنوا بیٹھیں گے بھائی جان؟'' وہ پُر جوش انداز میں بولا۔ ''کیا کارخانے داروں کے چار چار ہاتھ ہوتے ہیں یا انہیں سرخاب کے پَر لگے ہوتے ہیں؟ وہ بھی ہماری طرح کے انسان ہی ہوتے ہیں اور اسی دنیا کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ کسی سیارے سے زمین پر نہیں اترتے''۔

''بے وقوف، ان کی بیک مضبوط ہوتی ہے''۔ میں نے بھڑک کر کہا۔ ''وہ لوگ جدی پشتی جاگیردار ہوتے ہیں، ان کی زمینوں کی آمدنی ہی لاکھوں میں ہوتی ہے۔ ہماری طرح ان کے پاس صرف ایک جنرل اسٹور اور گھر نہیں ہوتا، سمجھے تم؟''

''میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا''۔ زندگی میں پہلی بار میرے سامنے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمارا ان پڑھ باپ اگر ایک جنرل اسٹور کا مالک بن سکتا ہے، لاکھوں کما سکتا ہے تو ہم پڑھے لکھے ہو کر فیکٹری کے مالک کیوں نہیں بن سکتے؟ پلیز بھائی جان! کچھ عرصے کے لیے آپ اپنے معمولات ترک کر دیں۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں، مجھے فیکٹری لگانے کا بہت شوق''۔

''بکواس مت کرو''۔ میں نے چلا کر کہا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''تم مجھے سکھاؤ گے؟'' میں نے طنز اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔ ''اپنے بڑے بھائی کو۔ کیا تم مجھ سے زیادہ عقل مند ہو؟ یا پھر مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو۔ بولو جواب دو؟''

''میں آپ کو سکھا نہیں رہا ہوں''۔ وہ بولا۔ ''بلکہ مشورہ دے رہا ہوں کہ ہمیں......''

''مجھے تمہارے مشورے کی قطعی ضرورت نہیں ہے''۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم نے دو لاکھ کیا جمع کروا دیا، میرے باپ ہی بن گئے ہو؟''

''پلیز بھائی جان! ایسا تو نہ کہیں''۔ اس نے التجا کی۔ ''آپ میرے لیے باپ برابر ہیں۔ میں بھلا ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں؟''

''تم سوچ چکے ہو''۔ میں نے زہریلے انداز میں کہا۔ ''تمہارا رویہ بتا رہا ہے۔ بس اب میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ ہم کل ہی اپنا اپنا اکاؤنٹ الگ کر لیں گے۔ پھر تم چاہے فیکٹری لگاؤ اور موج اڑاؤ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ رہ گیا گھر اور جنرل اسٹور وہ بعد میں تقسیم کر لیں گے''۔

میرا جواب سن کر چند لمحوں کے لیے وہ سکتے میں آگیا۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا، تاہم چند لمحوں کے بعد جب وہ بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''بھائی جان!'' وہ گلوگیر انداز میں بولا۔ ''آپ نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے، مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے آپ کے بھلے کے لیے کہا ہے۔ میرے دل میں اگر کوئی کھوٹ ہوتا یا کسی قسم کا لالچ ہوتا تو میں کبھی کا بٹوارا کر چکا ہوتا''۔

''تمہارے دل میں کسی قسم کا لالچ ہے یا نہیں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، ہمیں ایک دن الگ ہونا ہی ہے۔ جتنی جلدی ہم یہ کام کریں گے اتنا ہی ہمارے حق میں اچھا، بعد میں جب ہماری شادیاں ہوں گی تو یہ جھگڑے بڑھ جائیں گے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں بٹوارے والا کام ابھی ہو جائے تاکہ بعد میں ہم دونوں میں سے کسی کو بھی پریشانی کا سامنا پڑے۔ ہم بے شک سگے بھائی سہی مگر ہماری بیویاں آپس میں بہنیں تو نہیں ہوں گی''۔ میں انداز میں جواب دیا اور وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔ شاید اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اور میں زرینہ کے خوابوں میں کھو گیا۔

✣ ===✣ ===✣

بولتے بولتے شوکت حسین کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ دم لینے کے لیے خاموش ہو کامران نے کیسٹ ریکارڈر آف کر دیا۔ شوکت حسین کی داستانِ حیات نہ صرف دلچسپ کافی سنسنی خیز بھی معلوم ہو رہی تھی اس سے ایس پی جمشید خان ذرا سا بھی نہیں اکتایا تھا۔ تھوڑے کے وقفے اور پانی پی لینے کے بعد شوکت حسین دوبارہ شروع ہو گیا۔

''صاحب جی!'' وہ گویا ہوا۔ ''انہی دنوں میری زرینہ نامی لڑکی سے نئی نئی آشنائی ہوئی اپنے بھائی سے بٹوارے والی بات کے پیچھے زرینہ ہی کی محبت کارفرما تھی۔ اس نے مجھے کہا میں اگر بھائی سے بٹوارا کر لوں تو وہ مجھ سے شادی کر لے گی ورنہ نہیں۔ زرینہ کا باپ فرید خان سے بھی زیادہ چالاک اور عیار تھا۔ گاہے گاہے مجھ سے چھوٹی موٹی رقمیں وصول کرتا رہتا تھا زرینہ کی جھوٹی محبت میں آ کر اسے انکار نہیں کرتا تھا۔ دراصل زرینہ کے حسن و جمال اور اطوار نے میری عقل خبط کر رکھی تھی۔ وہ آئے دن مجھ سے قسم قسم کی فرمائشیں کرتی رہتی تھی مگر سے فاصلے پر رہتی تھی۔ اپنا بدن تو کجا وہ میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ تک نہیں دیتی تھی۔ شاید وہ میری آتشِ شوق کو بھڑکاتی رہتی تھی مگر اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں احتراز کو اس کی شرم و حیا اور پاکیزگی پر محمول کرتا تھا جبکہ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے جال میں پھنسا رہی تھی۔ چنانچہ زرینہ کی باتوں میں آ کر میں نے دوسرے ہی دن اپنے بھائی بنک اکاؤنٹ الگ کرا لیا۔ میرے حصے کے پانچ لاکھ بنتے تھے مگر اس نے چپ چاپ بارہ برابر حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، یوں مجھے ایک لاکھ روپے کی رقم مفت میں مل گئی۔ اب میں روپے کا بلاشراکت غیرے مالک تھا۔ زرینہ تک یہ خوشخبری میں نے اسی روز پہنچا دی تھی باپ بیٹی یہ خبر سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ اس دن زرینہ نے مجھ سے خوب گپ شپ لگا فرید خان نے کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر ہمیں تنہائی کا موقع فراہم کر دیا تھا مگر زرینہ مجھ



دور ہی رہی تھی۔

میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے قریب ہونے کی کوشش کی تو وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''شوکت ڈیئر! میرے دل میں تمہارا بڑا بلند مقام ہے، پلیز نفسانی خواہشات کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو میری نگاہوں سے مت گراؤ۔ جہاں اتنا عرصہ صبر کیا ہے وہاں کچھ روز اور سہی، جلد ہی ہم ایک ہو جائیں گے۔ میں نے ابا سے بات کر لی ہے وہ ہم دونوں کی شادی کے لیے تقریباً راضی ہی ہیں مگر انہیں آج کل کسی پریشانی نے گھیر رکھا ہے''۔

''کیسی پریشانی جان؟'' میں نے کسی خدشے کے تحت سوال کیا۔

''میں نے ان سے کئی بار پوچھا ہے''۔ وہ بولی۔ ''مگر مجھے نہیں بتاتے''۔

''کیوں نہیں بتاتے؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔ ''اس سے معلوم کرو۔ میں ہوں ناں پریشانی کا حل ڈھونڈ لوں گا''۔

''ابا کے سامنے میں نے تمہارا ابھی ذکر کیا تھا''۔ اس نے کہا۔ ''مگر ابا نے سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ شوکت کے کانوں تک یہ بات کسی طرح نہیں پہنچنی چاہئے''۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ مجھے غیر سمجھتے ہو؟'' میں نے شاکی انداز میں کہا۔

''نہیں تم غلط سوچ رہے ہو''۔ وہ بولی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ابا تجھے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں''۔

''بیٹا سمجھتے تو مجھ سے اپنی پریشانی کیوں چھپاتے؟'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''نہیں زرینہ جی! وہ مجھے غیر ہی سمجھتے ہیں''۔

''اچھا اب منہ مت بسورو''۔ اس نے اٹھلا کر کہا۔ ''میں ابا سے معلوم کر کے تجھے بتا دوں گی''۔

''لیکن جلدی''۔ میں نے اصرار کیا۔ ''کہیں اپنی پریشانی میں وہ ہماری شادی ہی لیٹ نہ کر دیں؟ اب میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا''۔

''ندیدے کہیں کے''۔ اس نے مسکرا کر مجھ پر طنز کیا۔ ''ذرا سا بھی صبر نہیں کر سکتے''۔

اس کے بعد زرینہ نے مجھے چائے وغیرہ پلا کر رخصت کر دیا تاہم رخصت کرنے سے پہلے اس نے مجھے دوبارہ ملنے کا وقت دے دیا تھا، وقت دو دن بعد کا تھا۔

ٹھیک دو دن کے بعد وعدے کے مطابق میں زرینہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ باپ بیٹی دو کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں فلیٹ کے بیرونی دروازے کے سامنے کھڑا ہوا تھا مگر اس روز خلاف توقع فلیٹ کا بیرونی دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔

یہ بات میرے لیے پریشان کن تھی کیونکہ ایسا اتفاق پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں دھڑکتے ہو[illegible] کے ساتھ اندر داخل ہو گیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا ایک کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ کمرے کا [illegible] نیم وا تھا اور اندر سے دو افراد کے جھگڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دونوں آوازیں مردانہ [illegible] فرید خان کے ساتھ کوئی پٹھان جھگڑ رہا تھا۔ میں اندر جانے کی بجائے وہیں دروازے پر رک [illegible]

"پھر ید خان!" پٹھان کی کرخت آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ "ام کو آ[illegible] کوشش نئیں کرو۔ ام نے تمارا بوہت اعتبار کیا۔ بس ابی امارا رقم پورا کرو، ام آج ادر سے نئیں [illegible] گا"۔

"دیکھو خان صاحب!" فرید خان کی التجائیہ آواز سنائی دی۔ "میں تمہاری منت کرتا [illegible] مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دو، میں تمہاری پائی پائی ادا کر دوں گا۔ صرف اتنی مہلت دے [illegible] میں بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں، پھر تمہارا قرض چکانے کے لیے میں اپنا یہ فلیٹ [illegible] گا"۔

"ہاہاہا...... ہی ہی ہی"۔ پٹھان کی مکروہ ہنسی گونجی اور پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "[illegible] خان! اس کباڑ خانے کو تم فلیٹ بولتا اے؟ اس کو کون خانہ خراب کا بچہ خریدے گی؟ دیکھو ام [illegible] وقوف نئیں بناؤ، امارا نام دلبر خان کابلی ہے، نکالو بس امارا پیسہ نکالو، ام تمارا کوئی بات نئیں [illegible] چاہتا"۔

"میں تمہیں شخصی ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں خان"۔ فرید خان نے پیش کش کر[illegible] ہوئے کہا۔ "وہ تمہیں لکھ کر ضمانت دے گا"۔

"وہ بھی تماری طرح کوئی خانہ خراب ہو گا"۔ دلبر خان نے جواب دیا۔ "بعد میں کدر [illegible] جائے گا"۔

"تو ایسی صورت حال میں اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟" فرید خان نے پریشان[illegible] میں سوال کیا۔ "اس وقت تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے اور معاملہ تین لاکھ [illegible] ہے"۔

"تم اپنی بیٹی کا شادی کس کے ساتھ بنا رہا اے؟" دلبر خان نے بھی الٹا سوال کر دیا۔

"میرا بھتیجا ہے۔ شوکت حسین"۔ فرید خان نے جواب دیا اور میرے بدن میں پھلجھ[illegible] چھوٹنے لگیں۔

"تو اس خانہ خراب سے اُدار مانگو"۔ دلبر خان بولا۔ "امارا ملک میں تو شادی بنا[illegible] جوان چار چار لاک روپیہ بی دولن کے باپ کو دیتا اے"۔



"اس کے پاس اتنی رقم کہاں ہو گی؟" فرید خان نے بے بسی سے کہا۔ "اور ویسے بھی ہمارے ہاں کے لوگ دامادوں کو دیتے ہیں ان سے لیتے نہیں ہیں۔ یہاں دامادوں سے کچھ مانگنا ہتک تصور کیا جاتا ہے"۔

"خو تم کو مانگنا پڑے گا"۔ دلبر خان نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "ورنہ ام کچ اور سوچے گا"۔

"کیا؟" فرید خان کی خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔ "کیا تم خون خرابا......"

"نئیں ام کوئی پاگل نئیں اے جو ایسا کرے گا"۔ دلبر خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے؟" فرید خان نے بدستور پریشانی سے پوچھا۔

"دیکھ پھرید خان لالہ!" دلبر خان کا لہجہ یکدم تبدیل ہو گیا تھا اور اب وہ بڑے رسان کے ساتھ بول رہا تھا۔ "ام تم سے ایک بات بولتا اے۔ اگر تم کو پسند آوے تو ٹیک ورنہ امارے کو صاپھ صاپھ بول دینا۔ امارا تم پر کوئی زور نئیں اے"۔

"بولو...... کیا بات ہے؟" فرید خان نے قدرے متحیر انداز میں سوال کیا۔

"تم اپنا بیٹی کا شادی ام سے بنا دو"۔ دلبر خان نے بلا تردد کہا۔ "اس کے بدلے ام تم کو تین لاک کا رقم ماپھ کر دے گا اور ایک لاک ابی نقد بی دے گا۔ بولو کیا بولتا اے؟"

دلبر خان کی مکرہ آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتر گئی میں غصے سے کھولتا ہوا آگے بڑھا اور نیم وا دروازے کو پاؤں کی ٹھوکر لگاتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں اور سر پر خون سوار تھا۔ میں کسی قیمت پر اس سود خور پٹھان کو زندہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"میری اچانک آمد سے وہ دونوں بوکھلا اُٹھے"۔ شوکت حسین بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں چند لمحے اس کیم شحیم سود خور پٹھان کو گھورتا رہا جو بڑے آرام سے ایک کرسی پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا اور کمرے میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جو اس خبیث کے سر کو پھاڑ سکتی"۔

"تم...... اور اس وقت؟" فرید خان نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہی مجھ سے استفسار کیا۔ "کیا گھر سے آ رہے ہو؟"

"انکل!" میں اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "اس سود خور کو یہاں سے باہر نکالو ورنہ میں اس کا خون کر دوں گا۔ اس نے میری زرینہ کا نام لینے کی ہمت کیسے کی؟"

"ام کوئی خیرات مانگنے کا واسطے نئیں آیا بابو صیب"۔ دلبر خان نے نڈر انداز میں کہا۔ "اپنا

قرض مانگنے آیا اے''۔

''تم نکلتے ہو یہاں سے یا پھر میں بلاؤں پولیس کو؟'' میں نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا ''سیدھا جیل جاؤ گے''۔

''اوئے طرم خان کا بچہ!'' اس نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے کہا اور پھرتی سے واسکٹ کی اندرونی جیب سے ایک خوفناک ریوالور نکال لیا۔

''ام کو پولیس کا دھمکی دیتا اے؟'' وہ مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا ''دلبر خان کابلی کو۔ خبیث کا بچہ! مرغی کا چوزے جتنا آدمی اے تم، ایک تپڑ مارا تو دیوار پہ چپک جائے گا۔ باگ جا اِدر سے''۔

اپنی محبوبہ کے باپ کے سامنے میں اپنی بے عزتی کہاں برداشت کرسکتا تھا؟ سو میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''دلبر خان! یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔ میں ان کھلونوں سے نہیں ڈرتا۔ میرے تعلقات پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں سے ہیں، کوئی بھی غلط حرکت کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا۔ یہ نہ ہو کہ ساری عمر جیل میں گزارنا پڑے''۔

''ام پولیس مولیس سے نہیں ڈرتا''۔ وہ اکڑ کر بولا۔ ''یا تو ام کو امارا پیسہ ابی دو۔ نہیں تو ام زبردستی اس کا بیٹی سے شادی بنائے گا''۔

''بکواس مت کرو سود خور کی اولاد''۔ میں نے بھڑک کر کہا اور پھر آستینیں چڑھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

''اُدر ای رک جا''۔ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں تو کھوپڑی اُڑا دے گا''۔

''اڑا دو''۔ میں اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا۔ ''زرینہ کی خاطر جان چلی بھی جائے تو کوئی غم نہیں ہے''۔

''نہیں شوکت بیٹے! خدا کے لیے رک جاؤ''۔ فرید خان چیختا ہوا ہم دونوں کے درمیان آگیا اور بازو پھیلا کر بولا۔ ''تم میری بیٹی کے ہونے والے شوہر ہو، میں اپنی آنکھوں کے سامنے اس کے سہاگ کو اجڑنے نہیں دوں گا۔ میں یہ فلیٹ بیچ کر اس کا قرض اتار دوں گا لیکن تمہیں نہیں مرنے دوں گا، یہ پٹھان لوگ انسانی جانوں سے کھیلنا مشغلہ سمجھتے ہیں''۔

''ابا ٹھیک کہتے ہیں''۔ اچانک بغلی دروازے سے زرینہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہم کسی کرائے کے مکان میں رہ لیں گے، مکان نہ ملا تو کسی پارک، فٹ پاتھ پر ڈیرہ ڈال لیں گے مگر اس سود خور کا قرض آج ہی چکتا کر دیں گے''۔

صورتِ حال ایک دم جذباتی ہوگئی تھی دونوں باپ بیٹی میرے آگے ہاتھ جوڑ رہے تھے



منت سماجت کر رہے تھے، زرینہ کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے جنہیں دیکھ کر میرے اندر بھڑکنے والی آگ سرد ہوگئی تھی اور اب میں دوسرے پہلو پر سوچ رہا تھا۔ میرے بنک اکاؤنٹ میں پورے چھ لاکھ پڑے ہوئے، میں باآسانی دلبر خان کا قرض اتار سکتا تھا۔

غصہ سرد ہوتے ہی میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دلبر خان بھی ریوالور واسکٹ کی جیب میں ڈال کر بیٹھ چکا تھا اور اب ہوسناک نگاہوں سے زرینہ کو گھور رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ دوبارہ میرا دماغ گھومتا میں نے زرینہ کو اندر بھیج دیا اور دلبر خان کی طرف رخ موڑتے ہوئے پوچھا۔ ''کتنی رقم ہے تمہاری سود سمیت بتاؤ؟''

''تین لاک بنتی اے''۔ رقم کا سن کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے''۔ میں حتمی انداز میں بولا۔ ''یہ رقم تمہیں آج ہی مل جائے گی لیکن وصولی کی رسید لکھ کر دینا پڑے گی''۔

''ام پکا کاغذ پہ لک کے دے گا''۔ وہ پُرمسرت انداز میں بولا۔ ''امارا رقم لاؤ ام ابی لک دے گا اور انگشت بی لگا دے گا''۔

اس کے بعد میں نے اسی روز بنک سے تین لاکھ روپے کی رقم نکلوائی اور دلبر خان سے اسٹامپ پیپر پر اقرار نامہ لکھوا کر رقم اس کے حوالے کر دی۔ میرے اس عمل سے فرید خان کو بہت خوشی ہوئی اور اس نے چند روز کے اندر میری اور زرینہ کی باقاعدہ منگنی کر دی۔ ایک ماہ کے بعد میری اور زرینہ کی شادی ہوگئی۔ شادی پر میں نے دل کھول کر خرچ کیا تھا چنانچہ اب بنک میں میرے نام پر پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہی تھی مگر میں پھر بھی زرینہ کی قربت میں بہت خوش و خرم تھا۔ جنرل اسٹور سے مجھے ہر ماہ اتنی آمدنی حاصل ہو جاتی تھی کہ گھر کا خرچہ باآسانی چل جاتا تھا۔ چھوٹے بھائی رحمان سے اب میری بات چیت بالکل بند تھی۔ ہم نے گھر کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا تاہم جنرل اسٹور ابھی تک ہم دونوں کی مشترکہ ملکیت چلا آ رہا تھا۔

شادی کے بعد چند ماہ نہایت ہی پُرمسرت گزرے اس کے بعد زرینہ نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ وہ نہایت ہی فضول خرچ اور نمود و نمائش کی دلدادہ عورت تھی اور میں بھی اس کے ناز و ادا کا دیوانہ ہو کر اس کے احکامات کی بجا آوری میں لگ گیا۔ ہماری شادی کے ساتویں ماہ آصف پیدا ہوگیا۔ میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں شک کا اظہار کیا تو زرینہ اور اس کے باپ فرید خان نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ بعض اوقات بچہ سات ماہ میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اس دوران میرے چھوٹے بھائی رحمان نے بھی ایک شریف اور غریب خاندان کی لڑکی

سے شادی کرلی تھی تاہم دونوں خاندانوں کے درمیان بول چال بند تھی۔ رحمان نے کئی بار
منانے کی کوشش کی تھی مگر زرینہ کی باتوں میں آ کر میں اسے دھتکارتا رہا۔ دراصل میں رحمان
کی موت تک اپنی بیوی زرینہ کی عیاریوں اور بے وفائی سے آگاہ نہ ہو سکا''۔

کہانی بیان کرتے کرتے شوکت حسین ایک بار پھر تھک کر خاموش ہو گیا اور اے ایس آئی
کامران نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ ریکارڈر آف کر دیا۔

ایس پی جمشید خان نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر ایک گہرا سانس خارج کیا اور پھر شوکت
حسین سے بولا۔ ''تمہارا بیان کافی لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ اسے مختصر کر کے اصل واقعات بیان کرو''۔

''بہت بہتر جناب''۔ شوکت حسین نے جواب دیا۔ ''میں کہانی کو مختصر کر کے بیان کرتا
ہوں، اس کے بعد جناب......''

معاً ٹیبل پر پڑے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی اور شوکت حسین نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
ایس پی جمشید خان نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا دیا۔ ''ہیلو ایس پی جمشید خان''۔

''میں تمہاری ماں بول رہی ہوں بیٹے''۔ دوسری طرف سے اسے ماں کی پہچانی آواز سنائی
دی۔

''ہاں بولو ماں! میں سن رہا ہوں''۔ وہ تشویش زدہ انداز میں بولا۔ ''کیا بات ہے؟''

''بیٹے! ابھی تھوڑی دیر قبل ایک شخص آیا تھا اور ایک سربہ مہر پارسل دے گیا ہے۔ یہ پارسل
تمہارے......''

''ماں! پلیز وہ پارسل کھولنا مت''۔ اس نے یکدم اٹھتے ہوئے قطع کلامی کی مگر دوسری طرف
سے اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کال اچانک ہی کٹ گئی تھی۔

پریشانی کے عالم میں اس نے جلدی جلدی گھر کا نمبر ڈائل کر دیا۔ مگر بیل ہی نہیں جا رہی تھی۔
اس نے غصے سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

''کیا بات ہے سر؟'' اے ایس آئی کامران نے اسے پریشان دیکھ کر استفسار کیا۔ ''کیا
میں کوئی......''

''تم اس کا بیان ریکارڈ کرو''۔ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے گھر تک جانا ہے۔ اگر دیر
ہو جائے تو میرا انتظار مت کرنا''۔ اتنا کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ آفس سے باہر نکل گیا۔



ڈاکٹر شہناز برآمدے سے باہر دھوپ میں کرسی ڈالے اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ جہانداد
قیدیوں کے کمرے سے باہر نکلا اور کمرے کو تالا لگانے کے بعد عجلت میں چلتا ہوا شہناز کے پاس



گیا، مگر شہناز نے اس کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا، وہ بدستور اخبار میں کھوئی ہوئی تھی۔ جہانداد
نے کھنکار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ بولی۔ ''ہو چکی تمہاری تفتیش۔ گھڑی بھر کے لیے
میرے پاس بھی بیٹھ جایا کرو''۔

''مس شہناز! میرے پاس ٹائم......''

''صرف شہناز''۔ وہ جہانداد کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔ ''بلکہ چاہو تو شنو
بھی کہہ سکتے ہو اب ہم اجنبی تو نہیں رہے ناں۔ کب تک غیریت برتو گے مجھ سے؟''

''جب تک میرے دشمن زندہ ہیں''۔ وہ بولا۔ ''تم جانتی ہو کہ میرے شب و روز موت کے
ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گزر رہے ہیں، تو پھر کیوں اس موضوع کو چھیڑتی ہو؟ کیا خبر کس گولی پہ
میرا نام لکھا ہے؟ میں آج ہوں اور کل ہو سکتا ہے میں......''

''پلیز ایسی باتیں مت کرو''۔ اس نے تڑپ کر قطع کلامی کی۔ ''میرے دل کو کچھ ہونے لگتا
ہے''۔

''کیوں؟'' جہانداد نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا موت سے ڈر لگتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم''۔ وہ بولی۔ ''لیکن میرے سامنے مرنے کی باتیں مت کیا کرو۔ میں ایسی
باتیں نہیں سن سکتی۔ جوانی میں موت کی باتیں مایوس لوگ کرتے ہیں''۔

''غلط''۔ جہانداد بولا۔ ''موت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ موت کی
آرزو نہیں کرنی چاہیے اور میں موت کو یاد رکھتا ہوں اس کی آرزو نہیں کرتا''۔

''میرا مسئلہ تو بیچ میں ہی رہ گیا''۔ وہ موضوع بدل کر بولی۔ ''بات ہو رہی تھی میرے ساتھ
بیٹھنے کی اور تم گھما پھرا کر بات کو کہاں سے کہاں لے گئے ہو''۔

''ابھی تو میں باہر جا رہا ہوں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''وقت پر واپس آ گیا تو ضرور بیٹھوں گا''۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے چونک کر استفسار کیا۔

''گھومنے پھرنے کے لیے''۔ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''یہاں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا ہوں،
بدن دکھنے لگا ہے، ذرا کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں''۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' اس نے ناگوار انداز میں کہا۔ ''میں قیدیوں کے ساتھ کیا
اکیلی رہوں گی؟''

''میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا''۔ جہانداد نے جواب دیا۔ ''تمہیں قیدیوں سے
ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کمرے میں بند ہیں باہر کیسے نکل سکتے ہیں؟''

''اور اگر تمہاری عدم موجودگی میں بنگش کے آدمی یہاں پہنچ گئے تو پھر کیا ہوگا؟'' اس نے

پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''عجیب احمق لڑکی ہو''۔ وہ غصے سے بولا۔ ''بنگش کے آدمیوں کو کیا الہام ہوگا؟ انہیں کیا معلوم کہ ان کے آدمی اس فلیٹ میں قید ہیں؟''

''نہ بابا نہ''۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''میں ایسے خطرناک لوگوں کے اکیلی بالکل نہیں رہوں گی۔ اگر جانا ہی ہے تو مجھے بھی ساتھ لے جاؤ''۔

''یہ قطعی ناممکن ہے''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر مت جاؤ''۔ وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''یہاں بیٹھ کر میرے ساتھ گپ شپ کرو۔ دونوں کا ٹائم بھی پاس ہو جائے گا اور ایک دوسرے کا دکھ سکھ بھی بانٹ لیں گے''۔

''نہیں، میرا جانا بہت ضروری ہے''۔ وہ مصر ہوا۔

''پر کیوں...... کس لیے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''یونہی ذرا سا گھوم پھر کر واپس آ جاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ، دو گھنٹے لگیں گے''۔

''نہیں''۔ وہ حتمی انداز میں بولی۔ ''تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ جاؤ گے تو مجھے ساتھ لے کر جاؤ گے ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''کیوں؟'' جہانداد نے چلا کر کہا۔ ''تمہیں کس لیے ساتھ لے کر جاؤں گا؟ کون لگتی ہو میری؟ ہے کوئی رشتہ تو بتاؤ ورنہ اپنی اوقات میں رہو۔ اگر ایک حادثے نے ہم دونوں کو کچھ دنوں کے لیے ایک چھت کے نیچے اکٹھا کر دیا ہے تو اس کا غلط فائدہ مت اٹھاؤ، میری دنیا، تمہاری دنیا سے الگ ہے''۔

اس نے ایک نظر جہانداد کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ جہانداد کے لہجے کی اجنبیت نے شاید اسے بولنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ کسی مورتی کی طرح ساکن بیٹھی ہوئی تھی۔ جہانداد چند ثانیے اس کے بولنے کا منتظر رہا مگر جب وہ بدستور خاموش رہی تو جہانداد قدرے نادم انداز میں اس کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''سوری شہناز''۔ وہ نرم انداز میں بولا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل اس فلیٹ میں بیٹھے بیٹھے میں کچھ سستی سی محسوس کرنے لگا ہوں اس لیے......''

''جاؤ''۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر قطع کلامی کی۔

اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ جہانداد پہلی بار اس کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کر رہا تھا۔ ایک لمحے میں اس کی شرمندگی دوچند ہو گئی، اسے اپنے رویے پر



افسوس ہونے لگا مگر اظہار افسوس کے لیے اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے کوشش کے باوجود وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ''شہناز! میں اپنے رویے پر سخت شرمندہ ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں''۔

''نہیں''۔ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''معافی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاؤ۔ ہم دونوں میں جب کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو پھر ایسی باتیں کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''میں نے کہا ناں کہ میں تم سے شرمندہ ہوں''۔ وہ بولا۔ ''پلیز شنو! معاف کر دو۔ آئندہ تمہارا دل دکھانے والی ایسی کوئی بات نہیں کروں گا''۔

جہانداد کے منہ سے ''شنو'' کا لفظ سن کر وہ اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگی۔

''پتھر پگھل رہا ہے''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''شاید میری محبت رنگ لانے والی ہے، مجھے اس کی یہ چھوٹی سی بات مان لینی چاہیے''۔

''ٹھیک ہے جاؤ''۔ وہ خوشی خوشی اجازت دیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن جلدی لوٹنے کی کوشش کرنا''۔

''تمہاری توقع سے بھی پہلے واپس آ جاؤں گا''۔ جہانداد نے کہا۔ ''ویسے بھی میں کار لے کر جا رہا ہوں۔ یوں گیا اور یوں واپس آیا۔ تمہارے لیے کچھ لانا ہے تو بتاؤ؟''

''ہاں کچھ چیزیں لانی تو ہیں''۔ وہ بولی۔ ''اوکے تم ٹھہرو میں لسٹ بنا کر لاتی ہوں''۔

اتنا کہہ کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی جبکہ جہانداد نے اخبار اٹھا لیا۔

چند لمحوں کے بعد ہی وہ لسٹ لے کر پہنچ گئی جس پر چند زنانہ استعمال کی چیزوں کے نام درج تھے۔ جہانداد نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کی وہ پرچی لے کر اس پر نظر دوڑانے کے بعد مسکرا کر کہا۔

''اس پر تم نے کھانے والی کوئی چیز تو لکھی ہی نہیں ہے؟''

''وہ تم اپنی مرضی سے لے آنا''۔ وہ بولی۔ ''لیکن میٹھی چیز نہیں ہونی چاہیے ورنہ میں نہیں کھاؤں گی''۔

''فکر مت کرو''۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہاری من پسند چیز لاؤں گا''۔

تھوڑی دیر کے بعد جہانداد کی کار مین گیٹ سے نکل رہی تھی۔ احتیاطاً اس نے اپنی گن اور ریوالور بھی ساتھ رکھ لیے تھے کیونکہ برا وقت کبھی بتا کر نہیں آتا۔ کھلی شاہراہ پر پہنچتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔



ایک معروف شاپنگ پلازہ میں جا کر اس نے کار پارک کر دی۔ ریوالور اٹھا کر کوٹ کی

اندرونی جیب میں ڈالنے کے بعد وہ کھڑکی کھول کر کار سے باہر آ گیا۔ کھڑکیوں کو لاک کیا اور اس طائرانہ سی نظر ڈالتے ہوئے ایک جنرل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔ جنرل اسٹور میں داخل ہو کر نے لسٹ سیلز مین کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی۔ اس وقت جنرل اسٹور میں اس کے علاوہ صرف گاہک موجود تھے جو مختلف چیزوں کا جائزہ لیتے گھوم رہے تھے۔ سیلز مین نے بغیر وقت ضائع جہانداد کی مطلوبہ اشیاء نکال کر ایک شاپنگ بیگ میں ڈال دیں اور بل بنا کر جہانداد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پانچ سو بیس روپے جناب''۔

جہانداد نے بل پر ایک سرسری سے نظر ڈالی اور پھر اسے شاپنگ بیگ میں ڈال دیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا کر جونہی اس نے پرس نکالنے کی کوشش کی اسے اپنے عقب میں کسی موجودگی کا احساس ہوا۔ پر اس سے پہلے کہ وہ پیچھے پلٹتا اس کی پشت میں کچھ چبھنے لگا۔

''ہاتھ اوپر کر لو اور چپ چاپ یہاں سے باہر نکلو''۔ ایک سرد سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ''اگر ہیرو بننے کی کوشش کی تو آنکھ جہنم میں جا کر کھلے گی''۔

آواز اس کے لیے قطعی اجنبی تھی تاہم اسے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ یقیناً کنگز ہی کوئی گرگا ہو سکتا تھا۔ سیلز مین اس دوران کاؤنٹر کے پیچھے دبک چکا تھا، اسے بل وصول کرنا یاد نہیں رہا تھا۔

جہاداد کا دایاں ہاتھ ابھی جیب میں ہی تھا اور ریوالور بھی کوٹ کی اسی جیب میں رکھا تھا اسے گن پوائنٹ پر رکھنے والا اس بات سے لاعلم تھا۔ جہانداد نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بایاں ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

''دوسرا ہاتھ بھی اوپر اٹھاؤ''۔ عقب والا غرایا۔ ''ورنہ گولی مار دوں گا۔ جلدی کرو''۔

''دو...... دو...... دوسرا ہاتھ...... تو زخمی...... ہے''۔ صورت حال کے مطابق اس نے خوفزدہ نظر آنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''اور...... اور میرے کندھے کا جوڑ بھی اترا ہوا ہے پپ...... پلیز!''

''بکواس مت کرو''۔ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''تم گاڑی ڈرائیور کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو''۔

''وہ...... وہ...... ڈرائیور ساتھ تھا''۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ کار پارکنگ میں موجود ہے۔ مم...... میرا یقین کرو میں سچ کہہ رہا ہوں''۔

''اوکے...... چلو مگر غلط حرکت کرنے کی کوئی کوشش مت کرنا''۔ وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔ ''جنرل اسٹور سے باہر موسیٰ خان اپنے آدمیوں کے ساتھ موجود ہے''۔



''سا...... سامان...... اٹھا لوں؟'' جہانداد نے گزارشانہ انداز میں پوچھا۔ ''بی...... بیوی کا ہے''۔

''گولی مارو سامان کو''۔ وہ بگڑ کر بولا۔ ''چلو...... جلدی کرو''۔

''ٹھ...... ٹھیک ہے چلتا ہوں''۔ جہانداد نے سہم کر کہا۔ ''گو...... گولی...... مت چلانا''۔

اب جہانداد کے پاس سوچنے کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ باہر موسیٰ خان موت کے فرشتے کی صورت میں اس کا منتظر تھا اور موسیٰ خان کے ہاتھ چڑھنے سے کہیں بہتر تھا کہ وہ یہیں جنرل اسٹور کے اندر ہی اس آدمی سے نمٹ لیتا۔ اپنی پشت پر وہ بدستور ریوالور کا دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کیا اور پھر نتائج کی پرواہ کیے بغیر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

کوٹ کی جیب کے اندر سے اس نے اندازے سے ریوالور کا رخ بدلا اور پھر ایک سیکنڈ کے اندر ہی اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور اسے اغوا کرنے والے کی چیخ سنائی دی۔ جنرل اسٹور میں موجود گاہک اور سیلز مین ایک ساتھ چلاتے ہوئے باہر کی طرف لپکے۔ جہانداد نے تیزی سے حرکت میں آتے ہوئے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکالا اور جنرل اسٹور کے عقبی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کاؤنٹر پر پڑے ہوئے سامان کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ سیلز مین کو اس نے بل کی ادائیگی ہی نہیں کی تھی۔ زخمی ہو کر گرنے والے شخص کی اس نے محض ایک جھلک ہی دیکھی تھی اسے بائیں پہلو میں گولی لگی تھی۔

وہ ایک مصروف و معروف شاپنگ پلازہ تھا۔ وہاں لوگوں کا سارا دن بہت رش رہتا تھا۔ گولی کی آواز نے آس پاس کے چند جنرل اسٹوروں میں کھلبلی سی مچا دی تھی۔ جہانداد دوڑتا ہوا جنرل اسٹور کے عقبی دروازے سے نکلا اور سیدھا جانے کی بجائے دائیں ہاتھ گھوم گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر لوگ متعجب اور خوفزدہ انداز میں اس کے راستے سے دائیں بائیں ہٹتے جا رہے تھے۔ گلی تنگ تھی اور دائیں بائیں دکانوں کی طویل قطاریں تھیں۔

وہ اندھا دھند دوڑتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ معاً بائیں ہاتھ موجود ایک دکان سے ایک پولیس والا نکلا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''ہتھیار پھینک کر خود کو میرے حوالے کر دو''۔ پولیس والا بارعب انداز میں بولا۔ ''یوں پبلک پلیس پر ہتھیار لے کر گھومنا......''

''ہٹ جاؤ احمق''۔ جہانداد نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ''میں بھی پولیس والا ہوں۔ کرائم برانچ سے تعلق ہے میرا۔ یہاں ایک جنرل اسٹور میں قتل ہو گیا ہے اور میں قاتل کا تعاقب کر رہا

ہوں ہٹو میرے راستے سے ورنہ پٹی اتر جائے گی‘‘۔

’’کیا میں تمہیں گدھا نظر آتا ہوں‘‘۔ پولیس والے نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے دیا۔’’قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہونا چاہتے ہو...... ریوالور پھینک......‘‘

اچانک عقب سے فائرنگ کی آواز گونجی اور پولیس والے کی بات نامکمل رہ گئی۔ دکان سے کسی جن کی طرح اچانک ہی نمودار ہوا تھا دوبارہ اس دکان کے اندر جست لگا کر غر چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو جہانداد اس کی پھرتی پر حیران رہ گیا، جان پر بنتی دیکھ کر وہ قانون پشت ڈال کر منظر سے یوں غائب ہو گیا تھا جیسے اس نے ملک الموت کو دیکھ لیا ہو۔

فائرنگ کی آواز سن کر آس پاس موجود لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جہانداد نے متوحش میں سامنے کی طرف دیکھا مگر وہ تنگ سی گلی دور تک سنسان پڑی ہوئی تھی دونوں طرف دکانوں کے شٹر تیزی سے گرائے جا رہے تھے۔ گولی چلانے والے جہانداد کو کوشش کے باوجود نہیں آ رہے تھے مگر اب اندھادھند آگے بڑھنے میں رسک تھا، وہ کسی بھی اندھی گولی کا شکار تھا۔

ابھی وہ اسی شش و پنج کے عالم میں تھا کہ معاً اسے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں آواز سنائی دی۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا تو اسے دو آدمی دوڑتے ہو نظر آئے، دونوں مسلح تھے۔ جہانداد انہیں با آسانی نشانہ بنا سکتا تھا لیکن نہ جانے کیا سوچ کر دوبارہ آگے کی طرف دوڑ پڑا۔

’’وہ جا رہا ہے‘‘۔ پیچھے سے کسی نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

جہانداد بھاگتے بھاگتے یکدم جھک گیا، عین اسی لمحے فائرنگ کی آواز گونجی اور گولیاں کے اوپر سے گزر گئیں۔ دوبارہ فائرنگ ہونے سے پہلے ہی اس نے ایک جست لگائی اور گلی کا مڑ گیا، آگے شاپنگ پلازے کا کھلا احاطہ تھا اور اسی احاطے کے اختتام پر مین گیٹ کے ساتھ پارکنگ واقع تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے محتاط انداز میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر اطراف میں جب اسے کسی قسم کی نقل و حرکت نظر نہ آئی تو وہ تیز رفتاری کا ریکارڈ توڑتے ہوئے کار پارکنگ کی جانب بھاگ کھڑا ہوا، احتیاطاً وہ زگ زیگ کے انداز میں دوڑ رہا تھا۔ کار پارکنگ کے قریب پہنچتے ہی وہ جست لگا کر ایک گاڑی کی آڑ میں دبک گیا اور یہی جست اسے زندگی کا پیام دے اسے اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو عقب سے برسٹ کی صورت میں آنے والی گولیاں چاٹ چکی ہوتیں۔

گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا وہ سیکنڈوں میں اپنی کار تک پہنچ گیا، چابی وہ پہلے ہی جیب سے



چکا تھا چنانچہ اسے لاک کھولنے میں معمولی سا وقت بھی نہیں لگا تھا۔ ریوالور کو کوٹ کی جیب میں ڈال کر اس نے کار کی سیٹ کے نیچے سے خودکار گن نکال لی تھی۔ سیفٹی کیچ ہٹا کر اس نے گن کو برسٹ پر رکھا۔ کار کے اگنیشن میں چابی لگا کر اسے اسٹارٹ کیا اور پھر کھڑکی کھلی چھوڑ کر مین گیٹ کی مخالفت سمت میں آگے بڑھنے لگا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا وہ تیزی سے پارکنگ کے آخری کونے میں جا پہنچا۔

کار کو اس نے باقاعدہ منصوبے کے تحت اسٹارٹ حالت میں چھوڑا تھا، اپنے پیچھے پڑے ہوئے غنڈوں کو وہ دھوکے میں رکھ کر شکار کرنا چاہتا تھا۔ اب مین گیٹ اور اس کی طرف جانے والا راستہ اس کی نگاہوں میں تھا اور اپنی کار اس سے چالیس گز کی دوری پر تھی۔ پھر عین اس کی توقع کے مطابق تین غنڈے پارکنگ کی مخالفت سمت میں کھڑی ہوئی ایک خاکستری رنگ کی جیپ کی آڑ سے دوڑتے ہوئے نکلے، ان کا رخ پارکنگ کے اس حصے کی طرف تھا جہاں اس کی کار اسٹارٹ حالت میں کھڑی ہوئی تھی۔ جہانداد نے بغیر وقت ضائع کیے خودکار گن کا ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی دو غنڈے چلاتے ہوئے زمین بوس ہو گئے جبکہ ان کا تیسرا ساتھی حواس باختہ ہو کر واپس اپنی جیپ کی طرف بھاگ گیا۔

جہانداد نے ایک برسٹ انؐ کی جیپ کی طرف مارا اور نتیجہ دیکھے بغیر اپنی کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ عین اسی لمحے فضا میں سائرن کی آواز گونجی اور پھر کسی نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’بھاگو پولیس پہنچ گئی ہے‘‘۔ اس آواز کے ساتھ ہی خاکستری جیپ ایک لمحے میں اسٹارٹ ہو کر مین گیٹ کراس کر گئی۔ پولیس کی آمد کی اطلاع سنتے ہی جہانداد نے گن دوبارہ سیٹ کے نیچے چھپا دی تھی تاہم کوٹ کی جیب میں موجود ریوالور کو اس نے چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بظاہر اب خطرہ ٹل چکا تھا۔ مگر وہ موسیٰ خان جیسے کایاں دشمن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ مین گیٹ سے باہر وہ گھات لگا کر بیٹھ سکتا تھا۔ کار بدستور اسٹارٹ حالت میں تھی، سائرن کی آواز جیسے ہی بالکل نزدیک پہنچی اس نے کار آگے بڑھا کر مین گیٹ سے چند قدموں کے فاصلے پر روک دی۔

جونہی پولیس وین گیٹ سے اندر داخل ہوئی جہانداد نے اپنی کار تیزی سے آگے بڑھا دی، گیٹ کراس کرتے ہی اس نے کار کی اسپیڈ ایک دم بڑھا دی۔ سڑک اگرچہ تنگ تھی مگر وہ مہارت سے ڈرائیونگ کرتا ہوا کھلی شاہراہ پر پہنچ گیا۔ اب فلیٹ کی طرف واپس جانا خطرے سے خالی نہیں تھا چنانچہ وہ ایس پی جمشید خان کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی نگاہیں گاڑی کے بیک ویو مرر پر جمی ہوئی تھیں مگر ابھی تک اسے خاکستری رنگ کی وہ جیپ نظر نہیں آئی تھی، شاید تعاقب کرنے والے کسی اور طرف نکل گئے تھے۔

تھانے کے مرکزی دروازے پر ہی اسے ایس پی جمشید خان ٹکرا گیا تھا۔ جہانداد کو سامنے پا کر وہ لمحہ بھر کے لیے تو متحیر رہ گیا مگر پھر تیزی کے ساتھ گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آ گیا۔ جہانداد ابھی تک کار کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" جمشید خان نے کار کی کھڑکی پر جھکتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔ "تم اس وقت یہاں کیسے پہنچ گئے؟ میں نے تو تمہیں باہر نکلنے سے منع کیا تھا"۔

"ڈاکٹر شہناز کی کچھ ضروری چیزیں لینے کے لیے نکلا تھا"۔ جہانداد بولا۔ "لیکن شاپنگ سنٹر میں بنگش کے آدمیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ تین کو تو پھڑکا آیا ہوں مگر حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا کہ زندہ بچ گئے ہیں یا کہ جہنم واصل ہو چکے ہیں؟"

"بہت غلط کیا ہے تم نے جہانداد"۔ وہ بولا۔ "تمہیں ڈاکٹر شہناز کو یوں اکیلا چھوڑ کر فلیٹ سے باہر قدم نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ قیدیوں سے زیادہ ڈاکٹر شہناز کی زندگی اہم ہے"۔

"میں عورتوں کی طرح ایک مکان میں بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتا"۔ جہانداد نے صاف گوئی سے کہا۔ "آپ ان قیدیوں کا جلدی سے کوئی بندوبست کریں"۔

"ہو جائے گا بندوبست بھی"۔ جمشید خان نے کہا۔ "بس چند روز صبر کرو۔ میں ایک کیس میں الجھا ہوا ہوں، اگر صفیہ رحمان کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید اب تک میں ان قیدیوں سے نمٹ چکا ہوتا"۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ بولا۔ "میں چند روز اور اس فلیٹ میں گزار لوں گا"۔

"اوکے......" جمشید خان عجلت آمیز انداز میں بولا۔ "تم فوراً فلیٹ کی طرف جاؤ، اس سلسلے پر پھر بات کریں گے فی الحال میں بہت جلدی میں ہوں"۔

"کیوں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ "گھر میں تو سب خیریت ہے ناں؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا"۔ وہ بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر سے امی کا فون آیا تھا مگر بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کال کٹ گئی۔ امی صرف اتنا بتا سکیں کہ کوئی شخص سربہ مہر پارسل دے گیا ہے۔ میں نے امی کو پارسل نہ کھولنے کی تاکید کر دی تھی مگر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میری بات انہوں نے سن لی تھی یا نہیں کیونکہ لائن اچانک ہی کٹ گئی تھی"۔

"یہ موسیٰ خان کی کارستانی لگتی ہے"۔ جہانداد نے پُر جوش انداز میں کہا۔ "وہی اس قسم کی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ بہت عیار انسان ہے اس سے کسی بھی کارروائی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پارسل میں کوئی چونکا دینے والی چیز ہوگی"۔

"میرے گھر کے کسی بھی فرد کو اس پارسل کی وجہ سے کوئی نقصان پہنچا تو میں موسیٰ خان کو زندہ



زمین میں گاڑ دوں گا"۔ اتنا کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چل رہا ہوں"۔ جہانداد نے اسے عقب سے آواز دی۔

"کیوں؟" اس نے پلٹ کر استفسار کیا۔ "کس لیے؟...... میں کیا موسیٰ خان سے ڈرتا ہوں؟"

"یہ بات نہیں ہے"۔ وہ بولا۔ "دراصل میں احتیاط کرنا چاہتا ہوں۔ بنگش کے آدمی مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے، میرے تعاقب میں اگر وہ فلیٹ تک پہنچ گئے تو کیا ہوگا؟"

"اوکے...... آ جاؤ تم بھی پارسل دیکھ لینا"۔ جمشید خان نے جواب دیا اور پھر اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔

آدھے گھنٹے کے اندر ہی وہ دونوں گھر تک پہنچ گئے، راستے میں کوئی بھی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ دونوں گاڑیاں پورچ میں رکنے کے بعد وہ اترے اور ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے برآمدے کی طرف چل پڑے۔ ڈرائنگ روم میں ہی انہیں ایس پی جمشید خان کی ماں ایک صوفے پر براجمان مل گئی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد جمشید خان نے بے تابی سے پارسل کے متعلق استفسار کیا تو ماں نے بتایا۔ "وہ تو میں نے اسی وقت تمہارے کمرے میں رکھ دیا تھا"۔

"میمونہ کہاں ہے؟" اس نے کسی خیال کے تحت دوبارہ سوال کیا۔

"اپنے کمرے میں ہوگی"۔ وہ الجھن آمیز انداز میں بولی۔ "صفیہ بھی وہیں ہوگی لیکن تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو، خیر تو ہے؟"

"نہیں سب ٹھیک ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ جہانداد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "آؤ میرے کمرے میں چلتے ہیں"۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی جمشید خان کا کمرہ تھا، وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل کر اس کمرے میں پہنچ گئے۔ بستر کے ساتھ ٹیبل پر وہ پارسل رکھا ہوا تھا۔ جمشید خان نے آگے بڑھ کر وہ پارسل اٹھا لیا اور اسے الٹ پلٹ کر چیک کرنے لگا۔

"ہلکا پھلکا سا ہے"۔ وہ پارسل کو ہاتھوں میں تولتے ہوئے بولا۔ "اندر کسی مہلک چیز کا امکان تو نہیں لگتا لیکن دشمن پر اعتبار بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ کیا کریں؟"

"اللہ کا نام لے کر کھول دیں"۔ جہانداد نے کہا۔ "جو کچھ ہوگا سامنے آ جائے گا"۔

وہ پارسل کو ہاتھ میں لیے چند لمحے سوچتا رہا، یوں جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جہانداد بغور اس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔

"سوچیں مت...... کھول دیں پارسل"۔ جہانداد بولا۔ "اس میں کوئی ایسی چیز ہوگی جو یقیناً ہم دونوں کے تصور سے باہر ہی ہوگی"۔

''کھولتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''دراصل میں کسی مہلک چیز کے امکان پر غور کر رہا تھا''۔

''ایسی کوئی چیز نہیں ہوگی اس میں۔ لاؤ مجھے دو''۔ جہانداد نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں کھول دیتا ہوں''۔

''نہیں''۔ وہ منفی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں خود ہی کھولوں گا''۔

اتنا کہہ کر اس نے پارسل پر لپٹا ہوا رنگین کاغذ پھاڑ کر الگ کر دیا۔ رنگین کاغذ کے نیچے گتے کا بنا ہوا ایک عام سا چوکور ڈبہ تھا۔ اس نے بلا سوچے سمجھے ایک دم ڈبہ کھول دیا، دوسرے ہی لمحے ڈبہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا اور وہ خود کود کر ایک طرف ہو گیا۔ ڈبے کے اندر سے ایک چھوٹا سا سانپ اچھل کر نکلا تھا جو اس کے دائیں ہاتھ سے ٹکراتا ہوا دور جا گرا تھا۔

چشم زدن میں اس نے آگے بڑھ کر سانپ پر اپنا بوٹ رکھ کر مسلنا شروع کر دیا۔

''نقلی ہے جناب''۔ جہانداد نے اسے پریشان دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور پھر آگے بڑھ کر فرش پر پڑا ہوا ڈبہ اٹھا لیا۔ ڈبے سے برآمد ہونے والی دوسری چیز سفید رنگ کا کپڑا تھا اور ایک خط تھا۔ جہانداد نے وہ تہہ شدہ کپڑا ٹیبل پر رکھ دیا اور خط جمشید خان کے حوالے کر دیا جو اس دوران نقلی سانپ کو چھوڑ کر اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

جمشید خان نے تہہ شدہ کاغذ کو کھول کر اس پر نظر دوڑائی اور پھر جہانداد کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے خط پڑھنا شروع کر دیا۔ موسیٰ خان نے خط میں لکھا تھا۔

ایس پی جمشید خان!

پارسل میں نقلی سانپ کو پا کر یقیناً تمہیں ایک جھٹکا لگا ہوگا، میں چاہتا تو نقلی کی جگہ اصلی سانپ بھی پارسل کر سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں بہادر دشمن کی ہمیشہ قدر کرتا ہوں۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسے دشمن کو اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کروں۔ پارسل میں، میں نے تمہارے لیے کفن کا کپڑا بھیج دیا ہے اسے سنبھال کر رکھنا اور آج سے اپنی زندگی کے دن گننا شروع کر دو۔ میں بہت جلد تجھے قبر کے اندھیروں کے حوالے کر دوں گا۔ یہ میرا چیلنج ہے۔

(موسیٰ خان)

خط پڑھنے کے بعد جمشید خان نے اسے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور پھر جہانداد کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''آدمی جی دار لگتا ہے مگر اس کی یہ جی داری خوش فہمی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ ملا تو میں اسے بہت بری موت ماروں گا''۔

''یہ اس کی نفسیاتی چال ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''دراصل وہ آپ کو گھر کی طرف سے



میں رکھنا چاہتا ہے''۔

''کیا مطلب...... میں کچھ سمجھا نہیں؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کس غفلت کی بات کر رہے ہو؟''

''اس خط میں اس نے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ آپ کی جان کا دشمن ہے''۔ جہانداد بولا۔ ''مگر یہ اس کی ایک چال ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح آپ اپنی حفاظت کے چکر میں پڑ کر گھر کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔ اس کا اصل پلان کچھ اور ہی ہوگا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس جیسا عیار شخص نہیں دیکھا''۔

''او کے...... اگر یہ بات ہے تو گھر پر میں گارڈ تعینات کر دوں گا''۔ اس نے کہا۔ ''اور اپنی حفاظت میں اچھی طرح کر سکتا ہوں، ایسی گیدڑ بھبکیوں سے میں ڈرنے والا نہیں ہوں''۔

''گارڈ اس کا راستہ نہیں روک سکتے''۔ جہانداد بولا۔ ''وہ ان کی نگاہوں میں یوں دھول جھونکے گا کہ آپ بھی حیران رہ جائیں گے''۔

''تو تمہارا کیا مطلب ہے کہ میں خود ہاتھ میں گن لے کر گھر کے صدر دروازے پر پہرہ دینا شروع کر دوں؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں''۔ جہانداد بولا۔ ''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ دشمن کے وار کرنے سے پہلے ہی ہمیں ان پر چڑھ دوڑنا چاہیے''۔

''ایسے اندھا دھند بغیر کسی ثبوت کے قانون ایسے مجرموں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا''۔ اس نے جواب دیا۔ ''اس بار میں مکمل ثبوتوں کے ساتھ بنگش پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں۔ عدالت میں اس کے خلاف اس کے ہی کسی آدمی کو گواہ کے کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہتا ہوں''۔

''آپ اس کے خلاف گواہ ڈھونڈتے رہیں گے اور وہ اس دوران کوئی وار کر جائے گا''۔ جہانداد نے کہا۔ ''اِدھر اُدھر وقت ضائع کرنے کی بجائے ان تینوں قیدیوں کو ٹارچر کر کے اپنا مقصد حاصل کیوں نہیں کرتے؟''

''ٹھیک ہے''۔ جمشید خان بولا۔ ''اب تم واپس جاؤ۔ میں آج رات وہاں پہنچ جاؤں گا اور پھر......''

اسی دوران جمشید خان کی ماں اندر داخل ہوئی اور وہ بات کو نامکمل چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کھانا لگوا دیا ہے میں نے''۔ وہ بلا تمہید بولی۔ ''جلدی سے آجاؤ ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا''۔

''چلو جہانداد''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''کھانا کھا کر چلے جانا''۔

''آپ نہ بھی کہتے تو بھی میں نے کھانا کھا کر ہی جانا تھا''۔ جہانداد نے مسکرا کر … پھر جمشید خان کی ماں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیوں ماں جی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟''

''بالکل بجا فرمایا ہے''۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

===

جہانداد دو بجے کے قریب کھانا کھا کر ایس پی جمشید خان کے گھر سے نکلا اور کار ڈرائیو … سوا دو بجے سے پہلے ڈاکٹر شہناز کے فلیٹ تک پہنچ گیا۔ دروازے کے عین سامنے کار روک … نیچے اترا اور آگے بڑھ کر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ متواتر تین بار کال بیل کا بٹن پریس … کے بعد وہ انگلی ہٹا کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے وہ دروازہ کھلنے کا منتظر رہا مگر … دروازہ نہ کھلا تو اس نے دوبارہ کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

دو تین منٹ اس نے مزید انتظار کیا لیکن دروازہ بدستور بند رہا۔ یہ صورتِ حال اس کے … تشویش ناک تھی، شہناز کا اب تک برآمد نہ ہونا کسی خطرے کی نشان دہی کر رہا تھا۔ اس نے … بے خیالی کے عالم میں دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل دھک … رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بلا سوچے سمجھے بھاگتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

اس وقت وہ اس قدر پریشان تھا کہ اسے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکالنا بھی یاد نہیں رہا … دوڑتا ہوا وہ برآمدے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر شہناز والا کمرہ چوپٹ کھلا ہوا تھا، وہ آندھی کی … کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کا سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا اور وہاں ہاتھا پائی … آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر شہناز کی ایک جوتی الٹی حالت میں دروازے کے ساتھ … ہوئی تھی۔ جوتی کو دیکھ کر اسے اندازہ لگانے میں بالکل دیر نہ لگی کہ ڈاکٹر شہناز دن دیہاڑے … چکی ہے۔

کمرے کی تلاشی بھی لے گئی تھی، دونوں الماریاں کھلی ہوئی حالت میں تھیں، یہی حال … کے دراز کا تھا۔ کچھ کاغذات بھی کمرے کے فرش پر بکھرے ہوئے تھے، ایک لمحہ کمرے میں … کے بعد وہ کسی خیال کے تحت کمرے سے باہر نکلا اور دوڑتا ہوا قیدیوں والے کمرے کے سامنے … گیا، یہ کمرہ بھی چوپٹ کھلا ہوا تھا اور تینوں قیدی خون میں لت پت کمرے کے فرش پر پڑے … تھے۔ تینوں کو انتہائی بے دردی کے ساتھ سر اور سینے میں گولیاں ماری گئی تھیں۔

جہانداد کو ان کی حالت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے رحم آیا مگر پھر ڈاکٹر شہناز کو یاد کر … دوبارہ پہلے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اس کی حالت بالکل اس جواری کی سی تھی جو … میں اپنی زندگی ہار چکا ہو۔ ڈاکٹر شہناز کے لیے وہ پہلی بار وہی تڑپ محسوس کر رہا تھا جو اس نے عرصہ پہلے زینب کے لیے محسوس کی تھی۔ پھر یکدم اسے پچھتاوے کی آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، اسے ڈاکٹر شہناز کی باتیں یاد آنے لگیں، اس بے چاری نے کس کس طرح اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کیسی ڈری اور سہمی ہوئی تھی اور پھر جب غصے میں آ کر اس نے ڈاکٹر شہناز کو بری طرح جھڑک دیا تھا تو وہ رو پڑی تھی۔ اس کی شفاف آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی دیکھ کر بھی اس کا دل نہیں پسیجا تھا۔ ڈاکٹر شہناز نے نہ جانے کس طرح مجبور ہو کر اسے جانے کی اجازت دی تھی، اس وقت اس کے دل پر کیا گزری ہو گی جب وہ فلیٹ سے نکل رہا تھا۔ جوں جوں وہ ڈاکٹر شہناز کے متعلق سوچتا گیا اس کی پشیمانی بڑھتی گئی۔

''میں تیرا مجرم ہوں شہناز''۔ دوبارہ شہناز والے کمرے میں پہنچ کر وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''میں اگر تجھے یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاتا تو آج تم میرے سامنے ہوتیں''۔

شہناز کی یادیں اسے رہ رہ کر کچوکے لگا رہی تھیں اور وہ پریشانی کے عالم میں کمرے کی ایک ایک چیز کو سنبھالتا پھر رہا تھا۔ معاً اس کی نظر کاغذ کی ایک پرچی پر پڑی جو میز پر رکھے ہوئے لیٹر پیڈ کے اوپر پڑی ہوئی تھی۔

اس نے جھپٹ کر پرچی اٹھا لی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

''سولجر! تمہاری محبوبہ دلنواز میرے قبضے میں ہے، فکر مت کرنا میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا بلکہ اسے تمہاری امانت سمجھ کر رکھوں گا''۔

موسیٰ خان۔

''بہت برا کیا ہے تم نے موسیٰ خان''۔ پرچی پڑھنے کے بعد اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ اب جو کرنے والا ہوں، وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے''۔

پرچی کو اس نے لپیٹ کر جیب میں رکھ دیا اور پھر شہناز والے کمرے کو تالا لگانے کے بعد فلیٹ کے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی کار دوبارہ جمشید خان کے گھر کی طرف اُڑی چلی جا رہی تھی۔

===

خان جی نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بنگش کے آدمی کو رخصت کیا تھا کہ زرولی اپنے دونوں ساتھیوں سمیت اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ تینوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور سر احساسِ ندامت و خوف کی وجہ سے جھکے ہوئے تھے۔ خان جی چند لمحے ان تینوں کو گھورتا رہا، ان میں سے کوئی بھی سر اٹھانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

''تمہارے چہروں پر چھائی نحوست دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے زید خان کوئی اچھی خبر نہ لایا

ہو؟'' خان جی نے بارعب انداز میں سوال کیا۔

''وہ خان جی! مو...... مولوی بھی...... کہیں رُوپوش ہو چکا ہے''۔ زرولی نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ ''اس کے مکان کو بھی...... تالا لگا ہوا ہے''۔

''تم سب نمک حرام ہو''۔ وہ گرج کر بولا۔ ''یہ تم لوگوں کا ہی بنایا ہوا منصوبہ تھا نا کیوں ناکام ہو گیا؟ کیوں نکل گیا مولوی تم لوگوں کے ہاتھ سے؟''

''خان جی! ہمیں...... کیا معلوم تھا کہ مولوی نے بھی غنڈے پال رکھے ہیں''۔ زرولی اور دیگر ساتھیوں کی صفائی دیتے ہوئے بولا۔ ''اس میں ہم لوگوں کا کیا دوش ہے۔ ہمارا منصو بس کامیاب ہونے ہی والا تھا کہ درمیان میں ناصر خان اور خائستہ گل کود پڑے''۔

''اپنی کوتاہی اور بزدلی پر پردے ڈالنے کے لیے دوسروں کو موردِ الزام مت ٹھہراؤ''۔ جی بھڑک کر بولا۔ ''ہمیں کام چاہئے اور وہ بھی فی الفور اگر وہ لوگ پولیٹیکل صاحب کے پاس پہنچ تو حالات بگڑ جائیں گے''۔

''مگر خان جی! امین خان ہمیں گھر میں گھسنے دے تو تب ہی کوئی بات بن سکتی ہے نا زرولی نے جواب دیا۔ ''آپ اسے حویلی میں بلوا کر دوٹوک بات......''

''گدھے ہو تم''۔ خان جی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم امین خان پر براہ راس زور نہیں ڈال سکتے اور نہ ہی اسے مروانا چاہتے ہیں۔ ورنہ یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ بس ہمیں ا سیاسی مستقبل کی فکر رہتی ہے۔ ہم امین خان پر ہاتھ ڈال کر اس کے قبیلے کے سینکڑوں ووٹوں محروم نہیں ہونا چاہتے''۔

''آپ کی بات سو فیصد درست ہے خان جی''۔ وہ بولا۔ ''مگر ہم بھی تو مجبور ہیں ناں؟ ا خان کے گھر میں گھس کر کوئی کارروائی کریں گے تو نام تو آپ کا ہی لیا جائے گا ناں؟ ایسی صور حال میں ہمیں تو کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی''۔

''راہیں تلاش کرنا پڑتی ہیں''۔ خان جی نے کہا۔ ''تم لوگ مولوی کو اغوا کر کے ہمارے والے فارم ہاؤس پر پہنچا دو باقی کام ہم خود سنبھال لیں گے''۔

''ٹھیک ہے خان جی! ہم لوگ کوشش......''

''پھر کوشش''۔ خان جی نے چلا کر زرولی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہڈ حرامی کی بھی کوئی ہوتی ہے، کوشش کا نام بھی دوبارہ مت لینا ورنہ کھال اتار کر بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیں گے

''غلطی ہو گئی خان جی''۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''ہم مولوی کو ہر قیمت اغوا کر کے فارم ہاؤس تک پہنچا دیں گے''۔



''ہم اس بار ناکامی کا لفظ نہیں سنیں گے''۔ خان جی تنبیہی انداز میں بولا۔ ''اور نہ ہی ناکام ہو کر حویلی کا رخ کرنا۔ بہتر ہو گا کسی پہاڑی سے کود کر تم لوگ خودکشی کر لینا کیونکہ حویلی میں تم لوگوں کے ساتھ وہ سلوک ہو گا کہ تم چلا چلا کر ہم سے موت کی بھیک مانگو گے مگر بھیک میں موت سے بدتر زندگی ملے گی''۔

''اس بار ہم ناکام نہیں ہوں گے خان جی''۔ زرولی نے پُرعزم انداز میں جواب دیا۔ ''ہم مولوی کو شہر والے فارم ہاؤس پر پہنچا کر ہی حویلی کا رخ کریں گے''۔

''یہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا''۔ خان جی نے قدرے نرم انداز میں کہا۔ ''اب جاؤ اور امین خان کے گھر کی خفیہ نگرانی شروع کر دو۔ مولوی کبھی نہ کبھی تو گھر سے نکلتا ہی ہو گا''۔

''بہت بہتر خان جی''۔ وہ تینوں یک زبان ہو کر بولے اور پھر الٹے قدموں چلتے ہوئے نشست گاہ سے باہر نکل گئے۔

===

جہانداد پندرہ منٹ کے اندر ہی دوبارہ جمشید خان کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت جمشید خان اپنے ڈرائنگ روم میں ماں، بہن اور صفیہ رحمان کے ساتھ موجود انہیں صفیہ رحمان کے چچا شوکت حسین کی سرگزشت سنا رہا تھا۔ جہانداد کو دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے تو حیران رہ گیا اور پھر پریشانی کے عالم میں بولا۔ ''خیر تو ہے تم دوبارہ کس لیے آ گئے؟''

''خیر ہی تو نہیں ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''ورنہ میں یہاں کیوں آتا؟''

''ہوا کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر شہناز تو ٹھیک ہے ناں؟''

''یہاں نہیں''۔ وہ کھڑے کھڑے بولا۔ ''آپ کے کمرے میں چلتے ہیں، وہیں بات کریں گے''۔

''ایسی کون سی بات ہے بیٹے!'' جمشید خان کی ماں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''جو تم ہمارے سامنے نہیں بتا سکتے''۔

میمونہ اور صفیہ رحمان بھی قدرے پریشان انداز میں جہانداد کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ماں جی''۔ جہانداد اپنے پریشان حال چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں، میں بس ذرا تنہائی میں ایس پی صاحب سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے آؤ''۔ جمشید خان اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور جہانداد اس کے ساتھ چل پڑا۔

"ہاں بولو کیا بات ہے؟" دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہی جمشید خان نے
سوال کیا۔ "تم پر کون سی افتاد ٹوٹ پڑی ہے؟"

جہانداد نے جواب دینے کی بجائے جیب سے موسیٰ خان والا رقعہ نکال کر اس کے
کر دیا۔

"ہوں......" رقعہ پڑھنے کے بعد اس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے
"اس کا مطلب ہے کہ موسیٰ خان اب کھل کر مقابلے پر آ گیا ہے"۔

"جاتے جاتے وہ تینوں قیدیوں کو بھی گولی مار کر گیا ہے"۔ جہانداد نے بتایا۔ "وہ تینوں
تک فلیٹ کے کمرے میں ہی پڑے ہوئے ہیں"۔

"اسے یہ جرأت بہت مہنگی پڑے گی"۔ جمشید خان مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ "میں آ
آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں"۔

"آپ بے شک بات کریں"۔ جہانداد نے کہا۔ "مگر اب میں اپنی جنگ خود لڑوں گا۔
اجازت دیں"۔

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔ "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں موسیٰ خان کے ساتھ وہی کرنا چاہتا ہوں جو اس نے میرے ساتھ کیا ہے"۔ جہانداد
نے جواب دیا۔ "وہ اگر اس حد تک جا سکتا ہے تو میں کیوں نہیں جا سکتا"۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا"۔ وہ بدستور متحیر انداز میں جہانداد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"تم کہنا کیا چاہتے ہو اور کون سا سلوک......"

"موسیٰ خان کا کوئی تو ہوگا"۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر شہناز کی رہا
کے لیے میں یہ قدم ضرور اٹھاؤں گا"۔

"مجھے تمہاری اس سوچ پر افسوس ہو رہا ہے"۔ وہ متاسف انداز میں بولا۔ "مردوں کی جنگ
میں عورتوں کو ڈھال بنانے والے مرد نہیں کہلاتے"۔

"جانتا ہوں"۔ اس نے کہا۔ "مگر ڈاکٹر شہناز کی بازیابی کے لیے میں یہ انتہائی قدم اٹھا
پر مجبور ہو گیا ہوں۔ موسیٰ خان جیسے ذلیل دشمنوں سے نمٹنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے ورنہ اگر اسی
طرح اس کے حوصلے بڑھتے رہے تو کل کلاں کو وہ آپ کے ساتھ بھی ایسا کچھ کر سکتا ہے۔ میں اسے
سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ مردوں کی جنگ میں عورتوں کا استعمال کرنے والے......"

"تم یہ کیوں نہیں سوچتے"۔ جمشید خان اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "کہ تمہارا یہ قد
ڈاکٹر شہناز کے ساتھ ساتھ تمہاری ماں اور بہن کے لیے بھی نقصان ثابت ہو سکتا ہے"۔



"معاملہ اب میری برداشت سے باہر ہو چکا ہے"۔ وہ بولا۔ "اور آپ بھی قانونی جنگ چھوڑ
کر ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں۔ یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا"۔

"احمقانہ باتیں مت کرو"۔ جمشید خان نے جھنجھلا کر کہا۔ "میری ان لوگوں سے کوئی ذاتی
دشمنی تو نہیں ہے۔ میں قانون کا محافظ ہوں اور وہ مجرم ہیں۔ میں بھلا......"

"میری دشمنی تو ہے ناں؟" جہانداد نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر میں کیوں اور کس
لیے ایسے لوگوں سے قانونی جنگ لڑتا پھروں؟ نہیں ایس پی صاحب نہیں......اب میں آپ کی کوئی
دلیل نہیں سنوں گا۔ میں آج ہی یہاں سے جا رہا ہوں، آپ بے شک ان لوگوں سے قانونی جنگ
لڑتے رہیں"۔

"دیکھو جہانداد!" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم انداز میں بولا۔ "میں تمہارا
دشمن نہیں ہوں بلکہ تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ میمونہ کی زندگی اور عزت بچا کر تم نے جو احسان
مجھ پر کیا تھا اسے میں بھولا نہیں ہوں اور نہ ہی مرتے دم تک بھلاؤں گا۔ تم ٹھنڈے دل سے میری
باتیں سنو اور ان پر غور کرو۔ میں تمہارے دشمنوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں ایک محفوظ اور
خوشحال زندگی دینا چاہتا ہوں۔ تم اکیلے ان سب کو ختم نہیں کر سکتے، ان کے پاس بے شمار وسائل
ہیں، دولت ہے، کرائے کے غنڈے ہیں، اسمبلیوں میں اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے غدارِ وطن
ان کی پشت پر ہیں، ان سے لڑنے کے لیے صرف طاقت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ قانونی
ہتھکنڈوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ میں تجھے قانونی تحفظ دوں گا لیکن تم اگر قانون توڑنے کی
بات کرو گے تو پھر تمہارا دفاع میرے لیے ناممکن ہو جائے گا، میں تجھے ڈاکٹر شہناز کی زندگی کی
ضمانت تو نہیں دے سکتا تاہم اسے برآمد کرانے کی پوری کوشش کروں گا اور اس مسئلے پر آج ہی حکامِ
اعلیٰ سے بات کروں گا"۔

"مجھے آپ کے خلوص پر اعتماد ہے"۔ جہانداد نے کہا۔ "آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا
ہے اور اب بھی کریں گے لیکن ڈاکٹر شہناز کو قانونی طریقے سے برآمد نہیں کروایا جا سکتا۔ ان کے
خلاف ہمارے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جو ہم قانون کے سامنے پیش کر سکیں"۔

"مجھے آئی جی صاحب سے بات تو کرنے دو"۔ وہ بولا۔ "اس کے بعد میں تجھے نہیں روکوں
گا"۔

"مجھے کتنے دنوں کے لیے رکنا ہوگا؟" اس نے سوال کیا۔

"صرف تین دنوں کے لیے"۔ جمشید خان بولا۔ "اس کے بعد تم آزاد ہو گے بلکہ میں بھی
تمہارا ساتھ دوں گا"۔

"مجھے منظور ہے"۔ وہ اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں تین دنوں کے لیے جاتا ہوں، آپ نے اگر اس دوران شہناز کو برآمد کروالیا تو ٹھیک ورنہ چوتھے دن میں اس شہر... باد کہہ دوں گا"۔

"چوتھے دن میں خود تجھے رخصت کروں گا"۔ جمشید خان نے جواب دیا۔

===

کچھ روز تو امین خان نے مولوی نصیب اللہ کو اپنی حویلی سے باہر کہیں بھی جانے نہ دیا۔ جب مولوی صاحب تنگ آ گیا تو اسے نماز کے اوقات میں مسجد تک جانے کی اجازت دے دی گئی۔ دو دن خیریت کے ساتھ گزر گئے۔ مولوی صاحب عشاء کی نماز حویلی کے حجرے میں ہی پڑھ لیتے تھے کیونکہ امین خان نے اسے رات کے وقت نکلنے سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا۔ تیسرے دن امین خان کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر چلا گیا تاہم جاتے وقت وہ ناصر خان اور خائستہ گل کو ہوشیار رہنے کی تاکید کر گیا تھا اور ساتھ ساتھ انہیں ہمہ وقت مولوی صاحب کے ارد گرد رہنے کی بھی ہدایت کر گیا تھا۔

اس روز امین خان کی عدم موجودگی میں مولوی صاحب ناصر خان اور خائستہ گل کے ساتھ حجرے میں بیٹھا ان دونوں سے اپنے گھر واپس جانے کی باتیں کر رہا تھا مگر وہ دونوں کسی طرح مولوی صاحب کی تائید نہیں کر رہے تھے اور برابر انکار میں سر ہلائے جا رہے تھے۔ تنگ آ کر مولوی صاحب جھنجھلا کر بولا۔ "میں کب تک امین خان کی حویلی میں بند ہو کر بیٹھا رہوں گا اور وہ بھی موت کے خوف سے؟"

"مولانا صاحب! ہم آپ کے دشمن تو نہیں ہیں"۔ ناصر خان نے کہا۔ "پھر آپ کیوں دل چھوٹا کرتے ہیں۔ کیا یہاں آپ کو کوئی تکلیف یا پریشانی ہے؟"

"بھلے آدمی! تم میری بات کو سمجھے ہی نہیں ہو"۔ مولوی صاحب بولا۔ "میں نے کب کہا کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف ہے؟ ہاں پریشانی ضرور ہے"۔

"کیا پریشانی ہے؟" خائستہ گل نے پوچھا۔ "مجھے حکم کریں"۔

"تم چپ رہو بیوقوف آدمی"۔ اس نے جل کر جواب دیا۔ "تمہاری موٹی عقل میں کوئی بات آتی ہی کب ہے؟ سوچنے سے پہلے بولنا شروع کر دیتے ہو"۔

"بالکل بجا فرمایا ہے آپ نے"۔ ناصر خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اور خائستہ گل ... کر رہ گیا۔

"دیکھو ناصر خان!" لمحہ بھر کے توقف کے بعد مولوی صاحب بولا۔ "میں تم دونوں کو بیٹا



کی طرح سمجھتا ہوں، تم دونوں نے میرے لیے جو کچھ بھی کیا ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا اور نہ ہی تمہارا احسان اتار سکتا ہوں لیکن اب میں اس حویلی میں بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گیا ہوں۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ حویلی چھوڑ کر دوبارہ اپنے گھر میں منتقل ہو جاؤں۔ اپنے گاؤں اور لوگوں سے کٹ کر میں نہیں جی سکتا، مجھے وہ چھوٹے چھوٹے معصوم سے بچے شدت سے یاد آتے ہیں جنہیں میں روزانہ صبح کے وقت مسجد کے صحن میں قرآن پاک پڑھایا کرتا تھا۔ یہاں تو میں بالکل قید ہو کر رہ گیا ہوں اور تو اور اپنی مرضی سے مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے بھی نہیں جا سکتا"۔

"کس نے منع کیا ہے آپ کو؟" ناصر خان نے استفسار کیا۔ "آپ شوق سے جائیں مسجد میں"۔

اسی دوران مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز آنے لگی اور کچھ دیر کے لیے ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جونہی اذان ختم ہوئی مولوی صاحب وضو کرنے کے لیے چل دیا۔ دس منٹ کے بعد وہ وضو کر کے لوٹا اور ان دونوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں مسجد میں جا رہا ہوں، بہت دن ہو گئے ہیں میں نے عشاء کی نماز باجماعت نہیں پڑھی، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ عشاء کے وقت امامت کون کرتا ہے؟"

"مولانا صاحب! امین خان نے آپ کو رات کے وقت نکلنے سے منع کیا ہے"۔ ناصر خان نے کہا۔ "آپ یہیں حجرے میں نماز پڑھ لیں"۔

"ابھی چند لمحے پہلے تم کیا کہہ رہے تھے؟" مولوی صاحب نے بھڑک کر پوچھا۔ "کہ میں مسجد میں نماز کے لیے جا سکتا ہوں۔ تو اب کیا ہو گیا ہے؟ کیا امین خان سے......"

"مولانا صاحب!" ناصر خان نے مؤدبانہ انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "ہم مجبور ہیں امین خان کا یہی حکم ہے کہ آپ کو رات کے وقت حویلی سے نہ نکلنے دیا جائے اور یہ حکم انہوں نے آپ کی سلامتی کو مدِنظر رکھتے ہوئے دیا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی کتنی عزت کرتے ہیں"۔

"نہیں"۔ مولوی صاحب نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "آج میں ہر قیمت پر مسجد میں جاؤں گا اور وہاں امامت کراؤں گا"۔

"آپ ادھر بھی تو امامت کرا سکتے ہیں"۔ خائستہ گل مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اور ناصر خان ہیں ناں مقتدی بننے کے لیے"۔

"تم گدھے کے گدھے ہی رہو گے"۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "میرے مقتدی بننے کے لیے کیا نماز پڑھنا چاہتے ہو؟ نماز تو ہر مسلمان مرد پر پانچوں ٹائم باجماعت ادا کرنا فرض کی گئی ہے، تم

نے صبح سے لے کر اب تک کتنی نمازیں پڑھی ہیں؟''

''اور نمازوں کی بات چھوڑو مولانا صاحب!'' خائستہ گل بولا۔ ''وہ میرا اور اللہ کا م
ہے۔ ابھی ہم دونوں آپ کی امامت میں نماز پڑھنا چاہتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے وضو کرو اور میرے ساتھ مسجد چلو وہیں چل کر باجماعت نماز ادا کریں گے''
اس نے جواب دیا۔

''مولانا صاحب!'' ناصر خان اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ
سامنے التجا کرتا ہوں خدا کے لیے اپنی یہ ضد ترک کر دیں۔ کل امین خان واپس آ رہا ہے اس
آنے تک صبر کر لیں پھر آپ جو کہیں گے ہم مانیں گے لیکن آج......''

''میں جا رہا ہوں''۔ مولوی صاحب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لوگوں
مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں اپنی جان دے دوں گا''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ کمرے سے باہر
گیا۔

''رکیے مولانا صاحب!'' ناصر خان نے چلا کر عقب سے آواز دی۔ ''ہم بھی آپ
ساتھ آتے ہیں''۔

لیکن مولوی صاحب سنی اَن سنی کرتا ہوا حجرے کے بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔

''رائفل اٹھاؤ خائستہ گل''۔ ناصر خان نے چلا کر کہا اور پھر جھپٹ کر اپنی رائفل اٹھا
دونوں بھاگتے ہوئے بیرونی دروازے تک پہنچے لیکن مولوی صاحب دروازے کو باہر سے کنڈی
گئے تھے۔

ناصر خان نے زور زور سے دروازے کو دھڑ دھڑایا اور پھر چیخ کر کہا۔ ''مولانا صاحب
کنڈی کھولیے۔ ہم آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں''۔

لیکن باہر کوئی ہوتا تو انہیں جواب ملتا۔ ناصر خان نے دوبارہ، سہ بارہ آواز دی مگر جو
ندارد۔

''خائستہ گل! جلدی کرو سیڑھی اٹھا کر لے آؤ''۔ ناصر خان نے چلا کر کہا۔ ''ہم دیوار
سیڑھی کے نہیں پھاند سکتے''۔

''ابھی لاتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر خائستہ گل بھاگتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہو گیا اور ناصر
وہیں بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا

تین منٹ کے اندر ہی خائستہ گل سیڑھی لے کر پہنچ گیا۔ انہوں نے جلدی سے سیڑھی کو
کے ساتھ لگا دیا۔ معاً اسی لمحے باہر گلی میں فائرنگ کی آواز گونجی اور ان دونوں کے دل دھک



گئے۔

''جلدی کرو خائستہ گل''۔ ناصر خان چلا کر بولا اور کندھے سے رائفل اتار کر تیزی سے سیڑھی چڑھتا ہوا دیوار کے اوپر پہنچ کر گلی میں کود گیا۔ خائستہ گل نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ دونوں مسجد کی طرف بھاگے، ناصر خان آگے آگے تھا، طویل گلی بالکل سنسان پڑی ہوئی تھی اور ماحول پر بھی مکمل سکوت طاری تھا حالانکہ ابھی عشاء کا ہی وقت تھا۔ ابتدائی تاریخوں کے چاند کی ملگجی سی روشنی میں انہیں اپنے اطراف میں کسی قسم کی کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ طویل گلی آگے جا کر دو گلیوں میں تقسیم ہو گئی تھی، ایک مسجد کی طرف جا رہی تھی جبکہ دوسری گلی مخالف سمت میں۔ اس دیوار پر پہنچ کر ناصر خان لمحہ بھر کے لیے رک گیا، اس دوران خائستہ گل بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ سرپٹ بھاگنے کی وجہ سے دونوں کے سانس پھولے ہوئے تھے تاہم قدرے فربہ بدن ہونے کے باعث خائستہ گل تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا۔

''رک کیوں گئے ہو؟'' خائستہ گل نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان سوال کیا۔

''فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں''۔ ناصر خان بولا۔ ''مسجد کی طرف جانا چاہیے یا دوسری طرف؟''

''یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے''۔ خائستہ گل نے کہا۔ ''میں مسجد والی گلی میں جاتا ہوں اور تم دوسری گلی میں نکل جاؤ''۔

''ٹھیک ہے''۔ ناصر خان نے جواب دیا اور بائیں ہاتھ والی گلی میں مڑ گیا جبکہ خائستہ گل مسجد کی طرف جانے والی گلی میں بھاگ کھڑا ہوا۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی ناصر خان کے دل میں جس خدشے نے سر اُٹھایا تھا وہ اب سچ ہوتا نظر آ رہا تھا، مولوی صاحب یقیناً اغوا ہو چکا تھا اور یہ کام بلاشک وشبہ زرولی اور اس کے ساتھیوں نے انجام دیا تھا اور جس کے ایما پر انجام دیا گیا تھا وہ بھی ناصر خان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ پورے علاقے میں ایک ہی شخص تو مولوی صاحب کا دشمن تھا۔

گلی کا اختتام ایک کھلی جگہ پر ہوا، ناصر خان دوڑتا ہوا کھلی جگہ پر پہنچ گیا۔ عین اسی لمحے اس کی سماعتوں سے ''غوں غاں'' کی مدہم سی آوازیں ٹکرائیں اور وہ چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ چاند کی ملگجی روشنی میں جلد ہی اسے میدان کے آخری سرے پر چند لوگ متحرک نظر آ گئے۔ ان کی رفتار بہت سُست تھی مگر وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ناصر خان نے پہلے تو انہیں للکارنے کا ارادہ کر لیا لیکن پھر کچھ سوچ کر یہ ارادہ رد کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں دائیں ہاتھ موجود ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار کی طرف بڑھ گیا۔

رائفل کو اس نے فائرنگ پوزیشن میں پکڑ رکھا تھا۔ دیوار کے نزدیک پہنچ کر وہ وقتی طور پر چاند کی روشنی سے محفوظ ہو گیا اور ان لوگوں کے بھی قدرے قریب پہنچ گیا۔

"زرولی!" معاً ناصر خان کے کانوں تک ایک جھنجھلائی ہوئی آواز پہنچی۔ "تم نے گاڑی چھوڑ کر غلطی کی ہے۔ اس ڈھائی من کی لاش کے ساتھ وہاں جاتے جاتے تو ہمیں صبح ہو جائے گی"۔

یہ آواز گل شیر خان کی تھی اور ناصر خان کے لیے جانی پہچانی تھی۔

"اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں"۔ زرولی کی آواز سنائی دی۔

"تم اُٹھا سکتے ہو تو اُٹھا لو"۔ گل شیر خان بولا۔ "میں اس کا بوجھ اُٹھانے سے قاصر ہوں"۔

ان کی آوازیں سن کر ناصر خان پتھروں کی اس ٹوٹی پھوٹی دیوار کے سائے میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ تقریباً پندرہ گز آگے جا کر دیوار جنوبی طرف گھوم گئی۔ اب اگر وہ آگے بڑھتا تو اسے آڑ میسر نہیں تھی۔ وہ زرولی اور اس کے ساتھیوں کی نگاہوں میں آ سکتا تھا کیونکہ اب ان کا درمیانی فاصلہ مزید کم ہو گیا تھا۔

گولی چلانے کا رسک بھی وہ نہیں لے سکتا تھا۔ نشانہ خطا ہو کر گولی مولوی صاحب کو بھی لگ سکتی تھی۔ اسی طرح ان کا تعاقب بھی جاری نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ آخر کار انہوں نے گاڑی تک پہنچ ہی جانا تھا اور ناصر خان پیدل تھا، اس کے لیے گاڑی کا تعاقب کرنا ناممکن تھا۔ وہ اسی کش مکش کا شکار ابھی تک دیوار کے سائے میں تھا۔ اس دوران زرولی اور اس کے ساتھی مولوی صاحب کو کھینچتے ہوئے میدان کراس کرنے کے بعد ایک گلی تک پہنچنے والے تھے۔

اب ناصر خان کے پاس سوچنے کے لیے بالکل وقت نہیں رہا تھا، اسے جو کچھ بھی کرنا تھا ان لمحوں میں ہی کر گزرنا تھا۔ اللہ کا نام لے کر اس نے رائفل کو سیدھا کیا اور ایک آدمی کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔

-:- ===-:- ===-:-

دوسرے ہی دن ایس پی جمشید خان آئی جی صاحب کے آفس میں موجود ابراہیم بنگش والا معاملہ ڈسکس کر رہا تھا۔ آئی جی صاحب تحمل اور نہایت غور کے ساتھ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سر! بنگش نے پورے شہر میں لاقانونیت کا بازار گرم کر رکھا ہے، کون سا جرم ہے جو اس نے نہیں کیا۔ سر عام ڈاکے، قتل وغارت، اغوا برائے تاوان، اسمگلنگ اسلحے کی، منشیات کی...... اور وہ بھی پڑوسی ملک افغانستان سے۔ اس شہر کے عام لوگ جنہوں نے پہلے کبھی کلاشنکوف کا نام تک نہیں سنا تھا وہ بھی اس بنگش کی کرم فرمائی سے ہاتھوں میں روسی ساخت کی کلاشنکوفیں لے کر گھومنے لگے ہیں۔ منشیات کو اتنا عام کر دیا گیا ہے کہ سکول اور کالج کے طلباء بھی اس زہر کو اپنی رگوں میں اتارنے لگے



ہیں"۔ وہ ایک ثانیے کے لیے رکا اور پھر دوبارہ بولا۔ "سر! اس بنگش کو اب بھی نہ روکا گیا تو پورے شہر میں جنگل کا قانون نافذ ہو جائے گا اور تو اور بنگش کے حوصلے اب اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ مجھے بھی اب دھمکانے لگ گیا ہے"۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" آئی جی صاحب نے چونک کر پوچھا۔ "آپ کو کس قسم کی دھمکیاں ملی ہیں؟"

جمشید خان نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا اور آئی جی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"پہلے آپ یہ خط پڑھ لیں جناب! بعد میں تفصیل بھی بتا دوں گا"۔

آئی جی صاحب نے اس کے ہاتھ سے خط لے کر اس پر نگاہیں جما دیں۔ یہ وہی خط تھا جو موسیٰ خان نے ایس پی جمشید خان کو لکھا تھا۔

"یہ موسیٰ خان کون ہے؟" خط پڑھنے کے بعد آئی جی نے دوبارہ استفسار کیا۔

"یہ قبائلی ہے جناب"۔ جمشید خان بولا۔ "سردار فراست علی خان کا خاص آدمی ہے اور اس نے یہاں بھیجا ہے اسے۔ دراصل بنگش اور فراست علی خان آپس میں بزنس پارٹنر ہیں۔ فراست علی خان نے اپنا یہ آدمی بنگش کی مدد کرنے کے لیے بھیجا ہے"۔

"کیا آپ نے موسیٰ خان کو دیکھا ہوا ہے؟" آئی جی نے سوال کیا۔

"نہیں سر"۔ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مگر میرے پاس ایک ایسا نوجوان ہے جو موسیٰ خان کو نہ صرف اچھی طرح جانتا ہے بلکہ متعدد بار اس کا موسیٰ خان سے ٹکراؤ بھی ہو چکا ہے۔ بہت باصلاحیت اور تربیت یافتہ نوجوان ہے اسے پولیس فورس میں ہونا چاہئے تھا لیکن......" جمشید خان نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"لیکن کیا؟" آئی جی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس نوجوان کا تعلق کسی مجرم تنظیم سے ہے یا وہ پولیس فورس جوائن نہیں کرنا چاہتا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب"۔ وہ بولا۔ "وہ ایک شریف نوجوان ہے۔ کچھ عرصہ آرمی میں سروس بھی کر چکا ہے۔ دراصل کسی گھریلو مجبوری کی بناء پر اس نے آرمی کی سروس کو خیر باد کہہ دیا تھا"۔

"کیا وہ پولیس فورس جوائن کرنے کے لیے تیار ہے؟" آئی جی نے سوال کیا۔

"سر! پہلے آپ اس کی پوری سرگزشت سن لیں"۔ وہ بولا۔ "اس کے بعد جو آپ کا حکم ہو گا میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا"۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے بلا کم و کاست جہانداد کی داستانِ حیات آئی جی کے گوش گزار کی تاہم وہ افضال خٹک قتل کیس کو گول کر گیا تھا۔

پوری کہانی سننے کے بعد آئی جی نے کہا۔ ''اگر آپ اس نوجوان کی ضمانت دینے کے لیے تیار ہیں تو میں اسے پولیس فورس میں بھرتی کر سکتا ہوں''۔

''وہ اپنی مرضی کا مالک ہے سر''۔ جمشید خان بولا۔ ''کیا خبر وہ پولیس فورس جوائن کرنا بھی چاہتا ہے یا نہیں۔ البتہ یہ دوسری بات ہے، وہ دل و جان سے پولیس فورس کی مدد کر سکتا ہے، اگر آپ فرمائیں تو میں اسے اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں''۔

''ایسی صورتِ حال میں کوئی اُونچ نیچ ہوگئی تو کون جواب دہ ہوگا؟'' آئی جی نے سوال کیا۔ ''کسی چھاپے کے دوران وہ اگر مجرموں کی گولی کا نشانہ بن گیا تو کیا ہوگا؟ آپ کی اپنی جان بھی جا سکتی ہے''۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا جناب''۔ وہ بولا۔ ''اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو بھی گیا تو میں سارے معاملے کو خود فیس کروں گا''۔

''سوچ لو جمشید خان''۔ آئی جی نے کہا۔ ''یہ نہ ہو کہ بعد میں پچھتانا پڑے''۔

''مجھے خدا پر بھروسہ ہے سر''۔ وہ پُرعزم انداز میں بولا۔ ''آپ بس حکم صادر فرما دیں''۔

''اوکے......'' آئی جی نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر بہتر ہوگا کہ آپ اسے پولیس فورس جوائن کرنے پر آمادہ کریں۔ اگر وہ نہ مانا تو تب ہم اسے فری لانسر کی حیثیت سے پولیس فورس میں رکھ لیں گے''۔

''تھینک یو سر''۔ وہ ممنون انداز میں بولا۔ ''اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں بنگش پر فوری ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں؟''

''آپ فوری کارروائی کریں ان لوگوں کے خلاف''۔ آئی جی نے کہا۔ ''اسپیشل پولیس فورس کے کچھ نوجوان بھی ساتھ رکھ لیں۔ میں آج ہی احکامات صادر کر دیتا ہوں''۔

''بہت بہت شکریہ سر''۔ وہ پُرمسرت انداز میں بولا۔ ''میں آج سے ہی ان لوگوں کے پیچھے لگ جاتا ہوں''۔

''اوکے...... وِش یو گُڈ لک''۔ آئی جی نے اسے اٹھتے دیکھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور جمشید خان خدا حافظ کہتا ہوا آفس سے باہر نکل آیا۔

***

ناصر خان بس ٹریگر دبانے ہی والا تھا کہ اچانک اسے اپنے عقب میں بالکل نزدیک



قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ سانپ کی طرح بل کھا کر پیچھے کی طرف پلٹا اور پھر ایک لمحے میں اس کے کشیدہ اعصاب ڈھیلے پڑتے گئے۔ اس کے عقب میں خائستہ گل پہنچ چکا تھا۔

''مسجد کی طرف تو کوئی بھی نہیں ہے''۔ خائستہ گل نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا کیونکہ وہ بھاگتا ہوا آرہا تھا۔

''انہیں میں نے ڈھونڈ لیا ہے''۔ ناصر خان نے جواب دیا اور پھر سامنے والی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ اس گلی میں جا رہے ہیں۔ تم ان کا پیچھا کرو، میں حویلی سے گھوڑا لے کر ابھی چند منٹوں میں پہنچتا ہوں''۔

''گھوڑے کی کیا ضرورت ہے؟'' خائستہ گل نے الجھن آمیز انداز میں سوال کیا۔

''سوال مت کرو احمق آدمی''۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''ان کے پیچھے جاؤ مگر محتاط رہنا انہیں شک نہیں پڑنا چاہیے''۔

خائستہ گل جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور ناصر خان دوبارہ حجرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

حجرے میں داخل ہونے کے بعد اسے گھوڑا کھولنے اور زین وغیرہ کسنے میں آٹھ دس منٹ ہی لگے تھے۔ حجرے کے بیرونی دروازے سے نکل کر وہ عجلت میں گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سرپٹ چھوڑ دیا۔ پتھریلی زمین پر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ناصر خان کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے میں گھوڑے کی لگام کو اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

لمحوں میں وہ اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں اس نے خائستہ گل کو چھوڑا تھا، وہاں رکنے کی بجائے وہ اس گلی کی طرف بڑھتا چلا گیا جس میں زرولی اور اس کے ساتھی غائب ہو گئے تھے۔ گلی کافی طویل تھی اور خان جی کی حویلی کے عقب سے ہوتی ہوئی گاؤں سے باہر نکلتی تھی۔ یہ راستہ گاؤں سے تھوڑی دور جا کر ایک نیم پختہ سڑک سے جا ملتا تھا جو آگے تقریباً چار، پانچ کلومیٹر کے بعد شہر جانے والی پختہ سڑک سے جا ملتی تھی۔

ناصر خان گھوڑا بھگاتا ہوا گاؤں سے باہر نکل گیا، ابھی تک نہ ہی اسے خائستہ گل نظر آیا تھا اور نہ زرولی اور اس کے ساتھی۔ چاند کی روشنی میں وہ اردگرد دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ گاؤں سے باہر نکلنے کے بعد اس نے لمحہ بھر کے لیے گھوڑا روک لیا۔ زرولی اور اس کے ساتھیوں کا غائب ہو جانا تو کسی حد تک اس کی سمجھ میں آرہا تھا مگر خائستہ گل کی گمشدگی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے حجرے میں جا کر گھوڑا تعاقب کرنے اور یہاں تک پہنچنے میں بہت کم وقت لگایا تھا، اس کے اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ

بیس منٹ ہی صرف ہوئے تھے، اتنے کم وقت میں خائستہ گل زیادہ دور تک نہیں جا سکتا تھا۔

''کہاں جا سکتا ہے''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر ایک دم چونک اٹھا، دور... رنگ کی بتی جلتی ہوئی نظر آنے لگی تھی جو تیزی سے آگے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور کسی گاڑی... لائٹ کے مانند لگتی تھی۔ اس نے گھوڑے کو ایک بار پھر سرپٹ چھوڑ دیا۔ وہ اگر واقعی گاڑی تھی... لازمی طور پر زررولی اور اس کے ساتھیوں کی ہی ہو سکتی تھی۔

تقریباً ایک فرلانگ آگے جا کر اسے پھر گھوڑا روکنا پڑ گیا۔ کچے راستے کے بیچوں... شخص اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے سے چھلانگ لگا کر اترا اور بھاگتا ہوا گرے ہوئے... کے قریب پہنچ گیا، دوسرے ہی لمحے وہ جھکا اور گرے ہوئے شخص کو سیدھا کر دیا۔ وہ خائستہ... اور ہوش وخرد سے بیگانہ تھا۔ ناصر خان نے اسے جھنجھوڑ کر ہوش میں لانے کی کوشش شروع کی... اس کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی، تب اس نے خائستہ گل کی نبض چیک کی تو اسے معلوم ہوا... بہت سُست چل رہی ہے۔ دائیں کندھے سے لے کر سینے اور پیٹ تک خائستہ گل کا لباس... آلود تھا۔

چاند کی ملگجی روشنی میں اسے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ خائستہ گل کا بدن کس جگہ سے گھائل... سوچنے اور غور کرنے کا وقت نہیں تھا، خائستہ گل کو وہ اس حالت میں چھوڑ کر آگے نہیں جا... چنانچہ اس نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خائستہ گل کو اٹھا کر گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالا اور پھر... اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے گھوڑا واپس گاؤں کی طرف سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

===·===·===

آئی جی صاحب سے بنگش کے خلاف ایکشن لینے کا پروانہ ملتے ہی جمشید خان نے جہ... ساری بات بتا کر اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ جہانداد ڈاکٹر شہناز کو بازیاب کرانے کے لیے بہ حیثیت... لانسر پولیس کے لیے کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اب وہ قانونی طور پر اپنے دشمنوں اور... کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

یہ دوسرے روز کا ذکر ہے ایس پی جمشید خان اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا، جہانداد بھی موجود تھا اور وہ دونوں بنگش پر ہاتھ ڈالنے کے لیے منصوبہ ترتیب دے رہے تھے کہ معاً... کامران دوڑتا ہوا آفس میں داخل ہوا اور سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! ایمرجنسی سٹر... ابھی وائرلیس پر پیغام ملا ہے کہ خان پلازہ میں نامعلوم دہشت گرد فائرنگ کر رہے ہیں اور ان... ساتھی بزورِ اسلحہ دکانداروں سے بھتہ وصول کر رہے ہیں''۔

''اوہ''۔ جمشید خان اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''ان دہشت گردوں کا تعلق لازمی طور پر بنگش...



گا، فوراً موبائل وین تیار کرو، ہمیں لائن آف ایکشن مل گئی ہے''۔

جہانداد بولا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بنگش اور موسیٰ خان مچھلی کو کانٹے میں پھنسانے کے لیے چارہ ڈال رہے ہوں؟''

''کیا مطلب؟'' جمشید خان نے چونک کر استفسار کیا۔

''مطلب یہ کہ یہ موسیٰ خان کے عیار دماغ کا تیار کیا ہوا پلان بھی تو ہو سکتا ہے؟ آپ کو شکار کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ تفصیل میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ موسیٰ خان، خان جی کا انتہائی وفادار غلام ہے۔ خان جی کی خوشی کے لیے وہ اپنی سگی ماں کو بھی ذبح کر سکتا ہے''۔ جہانداد نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''ہو سکتا ہے تمہارا قیاس درست ہو''۔ جمشید خان بولا۔ ''مگر شہر کا امن وامان قائم رکھنا میری ذمہ داری ہے، میں اپنی جان کے خوف سے عام شہریوں کو ان بے رحم قاتلوں کے رحم وکرم پر کیسے چھوڑ دوں؟''

''میں نے یہ کب کہا ہے؟'' جہانداد بولا۔ ''آپ ہمیں جانے دیں۔ ویسے بھی ہمارے ساتھ اسپیشل فورس کے آدمی ہوں گے، ہم باآسانی ان دہشت گردوں سے نمٹ لیں گے''۔

''نہیں جہانداد''۔ اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا جذبہ قابلِ ستائش ہے مگر میں ایسا نہیں کر سکتا مجھ سے زیادہ تمہاری جان قیمتی ہے۔ تم بلامعاوضہ پولیس کے لیے کام کر رہے ہو جبکہ میں اسی کام کی محکمے سے ایک معقول تنخواہ لیتا ہوں''۔

اتنا کہہ کر وہ دوبارہ اے ایس آئی کامران کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''تم ابھی تک گئے نہیں؟ جلدی کرو، موبائل وین میں اسپیشل فورس کے جوان بھی بٹھا دینا۔ فوراً مین گیٹ پر پہنچو ہم اُدھر ہی جا رہے ہیں''۔

''چلو''۔ اے ایس آئی کے جانے کے بعد وہ جہانداد سے بولا۔ ''تمہارا قیاس اگر درست نکلا تو آج اس موسیٰ خان کے بھی دیدار ہو جائیں گے''۔

''بہتر ہو گا کہ آپ ہمیں ہی جانے دیں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''کامران صاحب ہے ناں ہمارے.....''

''فضول بحث مت کرو''۔ وہ باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آجاؤ۔ ٹائم ضائع نہ کرو''۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے تھانے کے صدر دروازے تک پہنچ گئے۔ گیٹ کے باہر ایک موبائل وین کھڑی ہوئی تھی۔ وین کے ساتھ ایک جیپ بھی موجود تھی، موبائل وین میں اے ایس آئی کامران، انسپکٹر اصغر اور اسپیشل پولیس فورس کے چھ مسلح نوجوان بیٹھے ہوئے تھے، اسٹیرنگ ایک

ہیڈ کانسٹیبل نے سنبھال رکھا تھا۔

جمشید خان اور جہانداد جیپ میں سوار ہو گئے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی خان [پلازہ] کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جیپ کو ایک کانسٹیبل ڈرائیو کر رہا تھا۔

موبائل وین کا ریڈیو آن تھا اور ایمرجنسی سنٹر سے بار بار ایک ہی پیغام نشر ہو رہا تھا کہ تھانے کا عملہ فوراً موقعۂ واردات پر پہنچے۔ انسپکٹر اصغر نے مائیک اٹھا کر اپنی روانگی کی اطلاع دی اور مائیک رکھ دیا۔

وہ ابھی خان پلازہ سے دور تھے جب انہیں فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جمشید نے ڈرائیور کو رفتار بڑھانے کے لیے کہہ دیا اور عقب میں آتی ہوئی موبائل وین کے ڈرائیور نے کی پیروی کی۔ چند لمحوں میں وہ فائرنگ کے مرکز تک پہنچ گئے۔ یہ فائرنگ کھیل کے ایک میدان میں ہو رہی تھی، یہ میدان خان پلازہ کے عقب میں واقع تھا، میدان سے متصل ایک دینی درس گاہ تھی، اس سے کے طلباء اور محلے کے بہت سے لڑکے وہاں ہاکی کا میچ کھیل رہے تھے کہ اچانک ہی ایک تنگ گلی سے ایک سفید رنگ کی کار نکل کر کھیل کے میدان میں پہنچ گئی جس میں چھ دہشت گرد سوار تھے۔ دہشت گردوں نے آناً فاناً میدان میں کھیلتے ہوئے لڑکوں پر اندھا دھند فائرنگ کر دی تھی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں چار طالب علم شہید اور متعدد بچے زخمی ہوئے تھے۔ فائرنگ سے بچ نکلنے والے چھوٹے بڑے بچے بدحواسی کے عالم میں چیختے چلاتے ہوئے اِدھر اُدھر کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں دوڑ رہے تھے اور ان پر بدستور فائرنگ ہو رہی تھی۔

موبائل وین اور جیپ جونہی میدان میں داخل ہوئیں۔ پولیس کے مسلح جوان کود کر اترے اور پوزیشنیں سنبھال کر سفید کار پر فائرنگ شروع کر دی۔ دہشت گردوں نے بھی کار کی آڑ لیتے ہوئے پولیس پر جوابی فائرنگ شروع کر دی مگر ان کا سابقہ ایس پی جمشید خان، جہانداد اور اسپیشل پولیس کے جوانوں سے تھا۔ چند لمحوں میں ہی وہ پسپا ہو کر قریبی گلی کی طرف کھسکنے لگے۔ ان کے دو [ساتھی] پولیس کے پہلے ہی حملے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ دونوں اسپیشل فورس کے جوانوں کی فائرنگ کا [نشانہ] بنے تھے۔

بچ جانے والوں کو گلی کی طرف فرار ہوتے دیکھ کر جمشید خان نے کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ [ہاتھ] میں پکڑی ہوئی رائفل سے وہ دہشت گردوں پر فائرنگ بھی کر رہا تھا۔ جہانداد بھی اس کے پیچھے [تھا]۔ گلی میں فرار ہونے والے دہشت گردوں نے پلٹ کر جمشید خان پر فائرنگ شروع کر دی۔ قریب پہنچتے ہی اس نے جست لگائی اور کار کی آڑ لے کر دہشت گردوں پر فائر کھول دیا۔ اس [سے پہلے] دہشت گردوں کا ایک ساتھی جہانداد کی گولی کا شکار ہو کر گلی میں ڈھیر ہو چکا تھا۔



اسے گرتے دیکھ کر جمشید خان چلا کر جہانداد سے بولا۔ ''باقی تین کو زندہ پکڑنا ہے''۔

''فکر مت کریں''۔ جہانداد نے جواب دیا اور کار کے نزدیک سے نکلتا ہوا گلی کی طرف لپکا۔ اس دوران دونوں دہشت گرد گلی میں غائب ہو چکے تھے۔

''احتیاط سے''۔ جہانداد کو گلی کی طرف دوڑتا دیکھ کر جمشید خان نے عقب سے آواز لگائی مگر وہ ان سنی کرتا ہوا دہشت گردوں کے پیچھے گلی میں غائب ہو گیا۔

جمشید خان کار کی آڑ سے نکلا اور دائیں ہاتھ موجود ایک دوسری گلی کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ شاید فرار ہونے والے دہشت گردوں کا راستہ کاٹنا چاہتا تھا۔ اسپیشل فورس کے آدمی اور دیگر عملہ ہلاک ہو جانے والے دہشت گردوں کو سنبھالنے لگے۔

تینوں دہشت گرد اندھا دھند گلی میں دوڑ رہے تھے، انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔ جہانداد بھی ان کے تعاقب میں پوری طاقت کے ساتھ دوڑ رہا تھا، جونہی ان کا درمیانی فاصلہ تھوڑا کم ہوا جہانداد نے گلی میں کھڑی ہوئی ایک گاڑی کی آڑ لیتے ہوئے ان پر فائر کھول دیا۔ دو دہشت گرد پشت کی جانب سے گولیاں کھا کر زمین پر گرے اور تڑپتے ہوئے گلی کی نالی میں جا گرے، جبکہ ان کا تیسرا ساتھی ایک موڑ مڑتا ہوا جہانداد کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، اب اس کے پیچھے جانا بیکار تھا۔ جہاندار گاڑی کی آڑ سے نکلا اور دوڑتا ہوا نالی میں گرے ہوئے دہشت گردوں کے سر پر پہنچ گیا۔ دونوں کو گھسیٹ کر اس نے نالی سے باہر نکالا مگر تب تک وہ دونوں ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

ذرا دیر کے بعد پولیس کے جوان بھی وہاں پہنچ گئے اور دہشت گردوں کی لاشیں اٹھا کر واپس روانہ ہو گئے۔

آخری بچ جانے والے دہشت گرد کو موڑ مڑتے ہی جمشید خان ٹکرا گیا، پھر اس سے پہلے کہ دہشت گرد سنبھلتا جمشید خان نے اس کی ٹانگ میں گولی مار دی، وہ چیخ مار کر گر پڑا، جمشید خان دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''خبردار''۔ اسے گری ہوئی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر جمشید خان غرایا۔ ''ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا''۔

اس کی دھمکی سن کر دہشت گرد نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ اس دوران جہانداد اور پولیس کے دیگر لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ زخمی دہشت گرد کی تلاشی لے کر برآمد ہونے والی ساری چیزیں پولیس نے قبضے میں لے لیں۔ اس کے بعد دو جوانوں نے اسے ڈنڈا ڈولی کیا اور وہ تمام واپس روانہ ہو گئے۔ میدان میں ہلاک ہونے والے پانچوں دہشت گردوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں ان سب کی عمریں بیس پچیس سال کے لگ بھگ تھیں، سب نے جینز اور شرٹیں پہن رکھی تھیں۔ ریڈیو پر اس

کامیاب آپریشن کی اطلاع دے دی گئی تھی۔

آدھے گھنٹے کے اندر ہی وہاں تین ایمبولینس گاڑیاں اور پولیس کی دو اور موبائلز پہنچ گئیں۔ بچ اور زخمی ہو جانے والے طلباء کو فوراً ایمبولینس میں ڈال کر پولیس کی نگرانی میں فی الفور ہسپ دیا گیا۔ ایس پی جمشید خان جہانداد اور اے ایس آئی کامران کو ساتھ لے کر جیپ میں ہی ایمبولینس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ جبکہ انسپکٹر اصغر دیگر عملے کے ساتھ جائے واردات پر ہی ر تھا۔ ایک ایمبولینس میں دہشت گردوں کی لاشیں بھی لدی ہوئی تھیں۔

زخمیوں میں سے چار کی حالت تشویشناک تھی، انہیں فوراً ہسپتال میں ایڈمٹ کر دیا گیا جبکہ زخمیوں کو مرہم پٹی وغیرہ کرنے کے بعد فارغ کر دیا گیا۔ زخمی دہشت گرد کو ہسپتال کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔ آپریشن کے ذریعے اس کی ٹانگ سے گولی نکال دی گئی تھی تاہم وہ ابھی بے ہوش تھا، کمرے کے سامنے دو مسلح پولیس والے موجود تھے۔

ایس پی جمشید خان، جہانداد اور اے ایس آئی کامران میڈیکولیگل آفیسر کے کمرے میں بیٹھے زخمی دہشت گرد کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ بے چین جہانداد آ رہا تھا۔ ڈاکٹر شہناز کے اغوا کو چار دن گزر چکے تھے مگر ابھی تک اسے موسیٰ خان اور بنگش میں سے کا بھی سراغ نہیں ملا تھا۔ جہانداد کو ایک امید سی بندھی ہوئی تھی کہ زخمی دہشت گرد کو موسیٰ خان یا کے ٹھکانے کا پتہ ہوگا۔

دہشت گرد کو شام سے تھوڑی دیر قبل ہوش آگیا اور دس منٹ کے بعد وہ بیان دینے کے قابل ہو گیا۔ ایس پی جمشید خان کو فوراً مطلع کیا گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت دہشت گرد والے کمرے میں پہنچ گیا۔ دہشت گرد کا نام آصف تھا اور وہ مقامی کالج میں تھرڈ ائیر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اے ایس آئی کامران نے جب اس سے بیان لینے کی کوشش کی تو وہ پُرغرور انداز میں بولا۔ ''میں تم لوگوں کی وردیاں اتروا دوں گا، بہتر ہوگا کہ مجھے رہا کر دو۔''

''بیان تو تمہیں دینا ہی پڑے گا''۔ ایس پی جمشید خان نے کہا۔ ''بھلے ہماری وردیاں اتر جائیں مگر ہم بیان لیے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے''۔

''تو لو ناں!'' آصف نامی دہشت گرد تمسخرانہ انداز میں بولا۔ ''کس نے منع کیا ہے تمہیں''

''کس کے لیے کام کرتے ہو؟'' جمشید خان نے اس کے تمسخر کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے لیے کرتا ہوں''۔ وہ بدستور تمسخرانہ انداز میں بولا۔ ''میں کسی کا ملازم تو نہیں ہوں نہ ہی گورنمنٹ کا پالتو......''

''شٹ اپ''۔ اے ایس آئی کامران نے چلا کر اسے ٹوک دیا۔ ''تیرا تو میں وہ حال

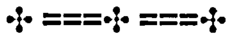


کہ آئندہ کوئی حرام کا جنا ہتھیار اُٹھانے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا مگر جمشید خان نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روک دیا۔

''نہیں کامران''۔ وہ بولا۔ ''تم نے دیکھا تھا ان لوگوں نے کیسی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معصوم اور بے گناہ بچوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ خوشیوں میں کھیلتے ہوئے ان معصوموں کا کیا گناہ تھا کہ انہیں خاک وخون میں لٹا دیا گیا؟ اس کی اپنی عمر ابھی پڑھنے اور کھیلنے کودنے کی ہے مگر یہ کس مہارت سے آٹھ میٹک رائفل چلا رہا تھا۔ کیا اس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ انہیں دہشت گردی کی مکمل تربیت دے کر میدان میں اتارا گیا تھا؟ یہ اس طرح زبان نہیں کھولے گا، اس کی زبان کھلوانے کے لیے ہمیں بھی خاص طریقہ استعمال کرنا پڑے گا اور وہ طریقہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آج اسے ہسپتال کے اس آرام دہ بستر پر آرام کرنے دو، اس کی کہانی کل سنیں گے۔ کل یہ بولے گا اور ضرور بولے گا''۔

وہ تھانے واپس آگئے۔ ہسپتال کے اس کمرے کے گرد سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ دو مسلح کانسٹیبل کمرے کے اندر بھی موجود تھے۔ ان تمام کو سختی سے تاکید کر دی گئی تھی کہ اس کمرے میں کسی کو جانے نہ دیا جائے چاہے وہ کسی بھی حیثیت کا حامل ہو۔



دوسرے دن ایس پی جمشید خان اور جہانداد آفس میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دو آدمی تھانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ڈیوٹی پر موجود سنتری سے استفسار کیا اور پھر ایس ایچ او کے دفتر کی طرف بڑھ گئے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا نوجوان جس کی عمر چھبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ دونوں باپ بیٹا تھے اور ان کا لباس بتا رہا تھا کہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ ادھیڑ عمر آدمی کے ہاتھ میں اس دن کا تازہ اخبار بھی تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایس ایچ او اصغر کے دفتر میں داخل ہو گئے۔

''جی فرمائیے کیسے آنا ہوا؟'' انسپکٹر اصغر نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ان سے استفسار کیا۔

''یہ خبر......اور یہ تصویر''......ادھیڑ عمر آدمی نے اخبار اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ایک ہلاک شدہ دہشت گرد کی تصویر کے گرد سرخ بال پین سے دائرہ لگا ہوا تھا۔

''آپ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''یہ...... یہ میرا بیٹا ہے''۔ اس نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ نے

کس جرم میں اسے گولی کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ کیسے کہہ دیا ہے کہ وہ دہشت گرد تھا؟ وہ تو ابھی زیر تعلیم اور کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ آپ لوگوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس معصوم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا...... کیوں؟"

"آپ نے اس کی لاش دیکھی ہے؟" انسپکٹر نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں...... ہم پہلے ہسپتال گئے تھے۔ میڈیکولیگل آفیسر نے ہمیں یہاں بھیجا ہے"۔ وہ بولا۔ "میں اپنی آنکھوں سے اس کی لاش دیکھ کر آرہا ہوں۔ کس بے رحمی سے اسے مارا گیا ہے"۔

"آپ کرتے کیا ہیں؟" انسپکٹر نے دوبارہ سوال کیا۔

"میں ایک پرائیویٹ ادارے میں اسٹینو ٹائپسٹ ہوں، میرا نام عبدالباقی ہے اور یہ میرا بھائی عبدالسلام ایک کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی میں کام کرتا ہے"۔ اس نے جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"ٹھیک ہے"۔ انسپکٹر نے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ چلو"۔

"کہاں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ایس پی صاحب کے آفس میں"۔ انسپکٹر نے جواب دیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ دونوں جمشید خان کے سامنے موجود تھے۔ انسپکٹر نے بلا تردد ان کی آمد کا مقصد بتایا اور پھر وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہوں......" جمشید خان ایک لمبی "ہوں" کے بعد گویا ہوا۔ "آپ کے اس بیٹے کا نام کیا ہے؟"

اس کی انگلی ہلاک ہونے والے دہشت گرد کی تصویر پر رکھی ہوئی تھی۔

"ذیشان"۔ عبدالباقی نے بتایا۔

"بقول آپ کے یہ کالج میں پڑھ رہا تھا"۔ جمشید خان بولا۔ "کیا آپ نے کبھی اس کی سرگرمیوں کا نوٹس لیا تھا؟ کبھی اس سے یہ باز پرس کی تھی کہ اس کی جیبوں میں بھرے ہوئے ہزار ہزار روپے کے نوٹ کہاں سے آتے تھے؟ آپ بتا چکے ہیں کہ آپ ایک پرائیویٹ ادارے میں معمولی سے ٹائپسٹ ہیں۔ آپ کی اتنی اوقات ہی نہیں ہے کہ بیٹے کو جیب خرچ کے لیے اتنی بڑی رقم فراہم کر سکیں۔ تو پھر یہ رقم کہاں سے آتی تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم جناب"۔ وہ بولا۔ "میں نے اسے کبھی بڑی رقم نہیں دی تھی۔ دس روپے، زیادہ سے زیادہ پچاس روپے۔ اس سے بڑی رقم اس کے پاس ہو ہی نہیں سکتی"۔

"ہیڈ کانسٹیبل محرر کو اس پوٹلی سمیت یہاں بلا لو"۔ جمشید خان نے انسپکٹر کو حکم دیا۔



انسپکٹر "یس سر" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے اندر انسپکٹر ہیڈ محرر کے ساتھ دوبارہ اندر داخل ہوا، ہیڈ محرر کے ہاتھوں میں ایک پوٹلی موجود تھی جو اس نے کھول کر جمشید خان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔

"دیکھو"۔ جمشید خان عبدالباقی سے مخاطب ہوا۔ "یہ چیزیں آپ کے بیٹے کی جیبوں سے برآمد ہوئی ہیں۔ یہ ویلٹ جس میں ہزار ہزار روپے کے سات نوٹ اور چند نوٹ سو، پچاس والے بھی ہیں۔ سونے کی یہ چین جو کم سے کم دو ڈھائی تولے کی ضرور ہوگی۔ گولڈ لیف کے سگریٹ، ویلٹ سے برآمد ہونے والی یہ تصویر...... دیکھو اور بتاؤ کیا یہ تصویر آپ کے بیٹے کی نہیں ہے؟ اور پھر یہ بتاؤ کہ اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا تھا؟ آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی وہ کالج سے آنے کے بعد کہاں جاتا تھا؟ کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا؟ اس کے دوست کیسے لوگ تھے وہ کالج جاتا بھی تھا یا نہیں؟"

"نہیں...... نہیں...... یہ جھوٹ ہے"۔ عبدالباقی چیخا۔

"چلایئے مت"۔ جمشید خان بولا۔ "خان پلازہ کے عقب میں موجود کھیل کے میدان میں جا کر لوگوں سے پوچھیں کہ آپ کا بیٹا کون تھا اور کس طرح میدان میں کھیلتے ہوئے معصوم لڑکوں پر گولیاں برسا رہا تھا؟ آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ وہ بہت معصوم تھا، بے گناہ تھا۔ آپ اس کی صفائی پیش کرنے کے لیے آئے ہیں، اس لیے کہ وہ آپ کا بیٹا تھا۔ ان گھروں میں جا کر پوچھیے جن کو آپ کا بیٹا اجاڑ چکا ہے۔ آپ کا وہ معصوم اور بے گناہ بیٹا موت کا فرشتہ تھا۔ اب آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں، اگر آپ باعزت آدمی ہیں تو آپ کو یہ چاہیے تھا کہ اس کی پہچان سے ہی مکر جاتے، اسے اپنا بیٹا ہی تسلیم نہ کرتے۔ وہ دہشت گرد بن کر نہ صرف بے گناہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا تھا بلکہ قومی سلامتی کے لیے بھی خطرہ بنا ہوا تھا۔ اس نے آپ کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ آپ لوگ کے سامنے کس طرح کہہ سکیں گے کہ وہ دہشت گرد جو کل کھیل کے میدان میں معصوم لڑکوں کی زندگیوں سے کھیل رہا تھا اور انہیں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار رہا تھا، وہ آپ کا بیٹا تھا"۔

"میں...... میں اس کی لاش لینے کے لیے آیا ہوں صاحب"۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ "ہماری بے خبری میں اس نے جو کچھ کیا، وہ ہمیں بے عزت و رسوا کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں...... میں اس کی لاش اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارنا چاہتا ہوں۔ وہ جو کچھ بھی تھا، پر تھا تو میرا بیٹا۔ کیا مجھے اتنا حق بھی حاصل نہیں ہے کہ اس کی آخری رسومات ادا کرسکوں"۔

"تو یوں کہو ناں کہ آپ اس کی لاش لینے کے لیے آئے ہیں"۔ جمشید خان اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "یہ سامنے ایس ایچ او صاحب بیٹھے ہیں ان سے بات کریں"۔

''آپ لاش کو تحویل میں لینے کے لیے ایک درخواست لکھیں''۔ ایس ایچ او نے
''درخواست میں دہشت گرد سے اپنا رشتہ واضح طور پر تحریر کریں اور اپنے قومی شناختی کارڈ کی فوٹو
لگا کر موجودہ رہائشی پتہ بھی لکھیں۔ یہ درخواست آگے فارورڈ کی جائے گی، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ
گا''۔

''بہتر جناب''۔ عبدالباقی نے جواب دیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے نکل کر ہیڈ محرر کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

✣ ==== ✣ ==== ✣

اس رات زخمی دہشت گرد آصف کو ہسپتال سے تھانے میں شفٹ کر دیا گیا۔ جمشید خان اور جہانداد جب انٹروگیشن سیل میں داخل ہوئے تو وہ دیوار سے پشت لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ زخمی ٹانگ اس نے سامنے فرش پر لمبا کیا ہوا تھا۔ سیل میں تین خالی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک کرسی پر آصف کو بٹھا دیا اور دوسری کرسیوں پر خود بیٹھ گئے۔ مجرم آصف کینہ توز نگاہوں سے ان دونوں کو گھور رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ان دونوں پر جھپٹ پڑے گا۔

''میرا طریقۂ تفتیش ذرا مختلف قسم کا ہے''۔ جمشید خان اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اور میں خود بھی عام پولیس افسروں سے ذرا مختلف واقع ہوا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ پیار محبت اور افہام و تفہیم سے معاملہ نمٹ جائے لیکن اگر کام نہ بنے تو مجھے زبان کھلوانے کے ایسے ایسے طریقے آتے ہیں کہ پتھروں کو بھی قوت گویائی مل جاتی ہے۔ تم میری نگاہوں میں معمولی سے رحم کے بھی مستحق نہیں ہو۔ On the spot شوٹ کر دینے کے قابل ہو مگر میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ اب تک کتنے معصوموں کی زندگیوں سے کھیل چکے ہو اور یہ سب کچھ کس کے اشارے پر کیا جا رہا ہے؟ تمہارے اور ساتھی کون ہیں ان کے نام اور پتے بتاؤ؟''

''اپنا بھی یہی اسٹائل ہے''۔ وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔ ''میں بھی دوسروں سے مختلف واقع ہوں۔ تم تو کیا تمہارے فرشتے بھی میری زبان نہیں کھلوا سکتے۔ یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لو''۔

''سنو آصف!'' جمشید خان غصے میں آنے کی بجائے نرم انداز میں بولا۔ ''تم ابھی نوجوان ہو اور کالج میں زیر تعلیم ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے جو کچھ بھی کیا ہے کسی لالچ میں آ کر کیا ہے لیکن ساری زندگی تمہارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔ یہ زندگی دہشت گردی، ڈاکہ زنی اور قتل و غارت میں نہیں گزاری جا سکتی۔ عزت دار لوگوں کی طرح سینہ تان کر اور سر اٹھا کر جینا سیکھو کہ کوئی تمہاری طرف انگلی نہ اٹھا سکے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے جو تم جی رہے ہو، ہر لمحہ موت کا خوف، دن رات منہ چھپائے پھرو، آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے ترستے رہو۔ دل و دماغ پر ہر وقت ایک ہی خوف سوار ہو کہ



پکڑے جاؤ گے۔ تمہارے شریف باپ نے تمہارے لیے کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے، وہ تمہیں انجینئر، ڈاکٹر، پروفیسر یا کوئی بڑا افسر بنانا چاہتے ہوں گے تا کہ فخر کے ساتھ لوگوں کو بتا سکیں کہ ان کا بیٹا بڑا آدمی ہے مگر انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ان کا بیٹا ایک دہشت گرد ہے اور کئی بے گناہ لوگوں کا قاتل ہے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی، کیا وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہیں گے؟ کیا ان کی ساری عزت و ناموس خاک میں نہیں مل جائے گی؟'' وہ سانس درست کرنے کے لیے لمحہ بھر متوقف ہو کر دوبارہ بولا۔ ''میں تمہیں صرف ایک موقع دے رہا ہوں، پولیس والوں کے پاس کئی طریقے ہوتے ہیں، وہ راہ چلتے کسی بھی شریف آدمی کو پکڑ کر قاتل ثابت کر سکتے ہیں اور قاتل کو معصوم ثابت کرنا بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ تم اگر قانون سے تعاون کرو گے تو قانون بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم ایک باعزت زندگی گزار سکو گے۔ کسی کی جان لینا کوئی کارنامہ نہیں ہے بلکہ دوسروں کے لیے جینا بڑی بات ہے۔ خون دے کر کسی مرتے ہوئے انسان کی زندگی بچانا کارنامہ ہوتا ہے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے پانچ منٹ دیتا ہوں، اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم کس راستے کا انتخاب کرتے ہو؟''

''ویل ڈن ایس پی''۔ وہ طنز کرتے ہوئے بولا۔ ''تقریر اچھی کر لیتے ہو، تمہیں تو کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہونا چاہیے تھا۔ پولیس کی نوکری میں کیا رکھا ہے؟''

''میں ٹھیک پانچ منٹ کے بعد آؤں گا''۔ اس نے جواب دیا اور پھر جہانداد کے ساتھ باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ کے بعد جب وہ دوبارہ انٹروگیشن سیل میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ جہانداد کے علاوہ اے ایس آئی کامران بھی تھا۔

''ہاں تو مسٹر آصف! کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟'' اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''میرا فیصلہ پتھر پر لکیر ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنے دوستوں سے غداری نہیں کر سکتا''۔

''لیکن اس سرزمین سے غداری کر سکتے ہو، جس نے تمہیں جنم دیا، جس کی گود میں پل کر تم جوان ہوئے ہو؟'' جمشید خان نے طیش کے عالم میں کہا۔ ''تیس سیکنڈ دے رہا ہوں تمہیں۔ اس کے بعد......''

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے گھڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ سیکنڈوں والی سوئی نے جیسے ہی نصف گردش پوری کی، وہ دوبارہ آصف کی طرف متوجہ ہو گیا جس کا چہرہ بدستور سپاٹ تھا۔

''اب تک کس کس کو موت کی نیند سلا چکے ہو۔ تمہارے ساتھی کون ہیں اور تمہارا پس پردہ باپ کون ہے جس کے اشارے پر تم بندر کی طرح ناچتے ہو؟'' جمشید خان نے ایک ہی سانس میں استفسار

کیا۔

"میں کچھ نہیں جانتا"۔ اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

جمشید خان ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چند لمحے وہ آصف کو گھورتا رہا اور پھر اس کا فولادی گھونسا آصف کے جبڑے پر پوری قوت سے لگا اور وہ کراہتا ہوا کرسی سمیت جمشید خان نے پاؤں کی ٹھوکر سے کرسی کو ایک طرف پھینک دیا۔

"میں نے تجھے ایک موقع دیا تھا"۔ وہ سرد لہجے میں بولا۔ "مگر تم نے اس سے کوئی اٹھایا۔ تمہارا شاید اب تک پولیس سے واسطہ ہی نہیں پڑا، میں دیکھتا ہوں کہ تم کتنے سخت جان دیر تک اپنی زبان بند رکھتے ہو؟"

جمشید خان نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ہر ٹھوکر پر وہ بلبلا اٹھتا تھا۔

"ان بے گناہوں کی تکلیف کا احساس کرو جنہیں تم گولیوں سے بھونتے رہے ہو"۔ جمشید غرایا۔ "یہ تکلیف تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تیرے جیسے انسان نما درندے کسی قابل نہیں ہوتے"۔

جمشید خان کے چہرے پر درندگی کے تاثرات ابھر آئے تھے اور اب اس کی ٹھوکریں آ پسلیوں پر پڑ رہی تھیں اور آصف جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا، سیل اس کی کربناک چیخوں گونج رہا تھا اور وہ ننگے فرش پر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے خود کو بچانے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔

"جب تک زبان نہیں کھولو گے میرے پاؤں یونہی چلتے رہیں گے"۔ جمشید خان نے ا چہرے کو ٹھوکروں کا نشانہ بناتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم جیسے لوگوں پر بالکل رحم نہیں آتا۔ بولو ورنہ نقشہ بگاڑ کر رکھ دوں گا"۔

آصف جواب دینے کی بجائے چلا رہا تھا۔

"جہانداد، کامران"۔ وہ ان کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ "ترکیب نمبر سات استعمال دیکھتے ہیں یہ کتنی دیر تک زبان بند رکھتا ہے"۔

"زاویہ کون سا کھینچنا ہے سر؟" اے ایس آئی کامران نے شوخی سے پوچھا۔

"کوئی سا بھی کھینچو...... قائمہ، حادہ، منفرجہ، بس اس کی زبان کھلنی چاہئے"۔ جمشید خ جواب دیا۔

ترکیب نمبر سات جمشید خان کی ایک خاص ٹیکنیک تھی جو آصف جیسے ڈھیٹ مجرموں پر کی جاتی تھی۔ تھانے کا پورا عملہ اس کی اس نرالی ترکیب سے آگاہ تھا۔ مارشل آرٹس میں اس اسٹریکنگ کہا جاتا تھا مگر جمشید خان نے اسے ترکیب نمبر سات کا نام دے رکھا تھا اور جیومیٹر



زاویوں کے نام پر اس کے مرحلے بھی ترتیب دے رکھے تھے۔

جہانداد اور کامران آگے بڑھے اور آصف کا ایک ایک پیر پکڑ لیا۔

"کھینچو"۔ جمشید خان کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "منفرجہ زاویہ 140 درجے۔ کوئی رعایت نہیں کرنی"۔

دونوں نے زور لگایا اور آصف کی ٹانگیں مخالف سمت میں پھیلتی چلی گئیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور پھر انتہائی کرب کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگے۔ ایک دم اس نے جبڑے بھینچ لیے۔ جہانداد اور کامران اس کی ٹانگیں چیرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ بے تحاشا چیخنے لگا۔ جمشید خان نے انہیں اشارہ کیا اور انہوں نے آصف کی ٹانگیں وہیں روک لیں۔

کرسی سے اٹھ کر وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

"اب کیا خیال ہے؟" وہ اس کے سر کے بال مٹھی میں پکڑتے ہوئے بولا۔ "ترکیب نمبر سات ابھی رستے میں ہے۔ اسے منفرجہ زاویہ کہتے ہیں، آخری حد تک پہنچا کر اسے خطِ مستقیم میں بھی بدلا جا سکتا ہے پھر تم زندگی بھر کے لیے اپنی ٹانگوں سے مفلوج ہو جاؤ گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اگلی نسل پیدا کرنے کے قابل نہ رہو اور تمہیں کسی چوراہے پر بھیک اکٹھی کرنے کے لیے پھینک دیا جائے"۔

"نہیں......" وہ چیخا۔

جمشید خان اس کی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا، اس کے دونوں پیر آصف کی رانوں کے جوڑ پر تھے۔

"اب کیا کہتے ہو؟" اس نے بے رحمی سے پوچھا۔

"مار ڈالو مجھے"۔ آصف چلایا۔ "میں...... کچھ نہیں بتاؤں گا"۔

"خطِ مستقیم"۔ وہ اس کی ٹانگوں سے اترتے ہوئے بولا۔ "رحم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔

جہانداد اور اے ایس آئی کامران نے زور لگایا۔ آصف ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح بلبلانے لگا۔

"تیری چیخیں تیرے ناجائز باپ کے کانوں تک پہنچنے والی نہیں ہیں"۔ جمشید خان نے کہا۔ "اور مجھے تم پر رحم نہیں آئے گا۔ میں تمہارے جسم کا جوڑ جوڑ الگ کر دوں گا"۔

اس کے اشارے پر وہ دونوں زور لگا کر اس کی ٹانگوں کو مزید کھینچتے چلے گئے اور آصف کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔

ایسے ہی وقت تھانے کے باہر سے لگاتار فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں اور وہاں بھگدڑ مچ گئی۔

"لگتا ہے اس کے باپ پہنچ گئے ہیں"۔ جہانداد اس کے پاؤں چھوڑتے ہوئے بولا۔ "بہت

پیار کرتے ہیں اس حرامی سے"۔

"باہر چلو"۔ جمشید خان نے حکم دیا اور وہ تینوں بھاگتے ہوئے انٹروگیشن روم سے باہر نکل گئے۔

باہر سے تھانے پر زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ تھانے کے عملے نے بھی ہتھیار سنبھال دہشت گردوں پر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔

وہ چھ سات دہشت گردوں پر مشتمل ایک گروپ تھا اور اپنے ساتھی کو چھڑانے کے لیے انہوں نے تھانے پر راتوں رات دھاوا بول دیا تھا۔ ان کی اچانک فائرنگ سے دو کانسٹیبل زخمی ہو چکے تھے جن میں سے ایک شدید زخمی ہوا تھا۔ جمشید خان اور جہانداد نے بھی آٹومیٹک رائفلیں سنبھال کر دیوار کی آڑ لیتے ہوئے دہشت گردوں پر فائرنگ شروع کر دی۔

دہشت گرد تھانے کے سامنے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھالے فائرنگ کر رہے تھے۔ جہانداد اور جمشید خان قریب قریب تھے۔ دہشت گردوں کی دیدہ دلیری دیکھتے ہوئے جہانداد بولا "ان کے حوصلے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انہیں موسیٰ خان لیڈ کر رہا ہو...... کاش ان میں سے کوئی ہمارے ہاتھ لگ جائے"۔

"تم اُوپر چھت پر پہنچنے کی کوشش کرو"۔ جمشید خان نے کہا۔ "میں عقبی طرف سے دیوار پھاند کر گلی میں نکلتا ہوں"۔

جہانداد جھکی ہوئی حالت میں چھت پر جانے والے زینے کی طرف دوڑ پڑا اور جمشید خان تھانے کی عقبی دیوار پھاند کر گلی میں اُتر گیا۔ جہانداد چھت پر پہنچ کر فائرنگ کرنے لگا جبکہ جمشید خان دوڑتا ہوا دیوار کے کارنر تک پہنچ گیا اور آڑ لے کر دہشت گردوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ معاً اس نے ایک دہشت گرد کو کوئی چیز تھانے کے اندر اچھالتے ہوئے دیکھا۔ وہ دستی بم تھا جو دیوار کے اُوپر سے ہوتا ہوا تھانے کے اندر گرا اور ایک زوردار دھماکے سے بلاسٹ ہو گیا، اس کے ساتھ ہی چیخوں کی آوازیں سنائی دیں اور جمشید خان کے دماغ میں بارود بھر گیا۔ اس نے شدت سے فائرنگ شروع کر دی۔ چھت کے اوپر سے جہانداد بھی لگاتار فائرنگ کر رہا تھا۔ اب تک دہشت گردوں کا کوئی آدمی گولی کا نشانہ نہیں بنا تھا۔ فائرنگ شدت سے جاری تھی کہ اچانک ایک موبائل سائرن بجاتی ہوئی گلی سے نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر دہشت گرد چند گز دور گلی میں کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف بھاگے۔ جمشید خان اور جہانداد کے لیے یہ سنہری موقع تھا، انہوں نے نشانہ لے کر فائرنگ شروع کر دیا۔

دوڑتے ہوئے دہشت گردوں کے دو ساتھی جہانداد اور جمشید خان کی گولیوں کا نشانہ بن گئے جبکہ باقی اندھا دھند دوڑتے ہوئے کار تک پہنچ گئے اور پھر عجلت میں سوار ہونے لگے، ان کا ایک ساتھی



پہلے سے اسٹیئرنگ کے سامنے موجود تھا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی کار ہوا ہوئی مگر جلد بازی میں وہ اپنے ایک ساتھی کو سڑک پر دوڑتا ہوا چھوڑ گئے تھے، غالباً وہ زخمی تھا اور چلاتا ہوا کار کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

جمشید خان دیوار کی آڑ سے نکلا اور دوڑتے ہوئے کار پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس کی ایک گولی کار کے پیچھے بھاگتے ہوئے دہشت گرد کی پشت میں لگی۔ وہ گرا اور دوبارہ اٹھا مگر اب کی بار اپنے ساتھیوں کی طرف سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ وہ چھلنی ہو کر سڑک کے عین درمیان میں گر گیا۔ جمشید خان دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا اور رائفل کی نال اس کی کھوپڑی پر رکھ دی مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ دہشت گرد ختم ہو چکا تھا۔

اسی دوران پولیس موبائل وہاں پہنچ کر ایک لمحے کے لیے رک گئی۔

"کار کا پیچھا کرو"۔ جمشید خان نے چیخ کر کہا اور موبائل حرکت میں آ گئی لیکن اس دوران دہشت گردوں کی کار کافی دور نکل گئی تھی۔

جمشید خان دوڑتا ہوا واپس تھانے پہنچ گیا۔ جہانداد بھی چھت سے اتر کر نیچے آ چکا تھا۔ ایک کانسٹیبل جاں بحق ہوا اور دوسرا شدید زخمی ہوا تھا، اس کے پہلو میں گولی لگی تھی۔ ایس ایچ او اصغر کے بازو میں دستی بم کا کوئی ٹکڑا لگا تھا جو گوشت کو چیرتا ہوا نکل گیا تھا۔

دہشت گردوں کی اس کارروائی کی اطلاع پا کر آدھے گھنٹے کے اندر ڈی آئی جی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ زخمیوں اور لاشوں کو ایمبولینس میں ڈال کر فی الفور ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔

دہشت گردوں نے جس طرح تھانے پر حملہ کیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور وہاں موجود ہر جاندار کو ملیامیٹ کر دیں گے لیکن تھانے کے مختصر عملے نے جس طرح ان کا مقابلہ کر کے انہیں راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ قابلِ تعریف تھا۔ ڈی آئی جی صاحب نے تمام عملے کی کارکردگی کو بے حد سراہا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جمشید خان، جہانداد کے ساتھ ایک بار پھر انٹروگیشن روم میں داخل ہو رہا تھا۔ دہشت گرد آصف ابھی تک فرش پر پڑا ہوا تھا۔ جمشید خان کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"تمہارے ناجائز باپ تمہیں چھڑانے کے لیے آئے تھے، ان کے تین ساتھی بیچ سڑک کے کتے کی موت مارے گئے اور باقی دُم دبا کر فرار ہو گئے۔ ہمارا ایک آدمی بھی شہید ہوا ہے۔ اب بھی اگر تم نے زبان نہ کھولی تو......"

فقرہ ادھورا چھوڑ کر جمشید خان نے ایک جھٹکے سے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور اسے بالوں

سے پکڑ کر ریوالور کی نالی اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔

''بولو...... ورنہ گولی حلق کے پار ہو جائے گی''۔ وہ سرد لہجے میں غرایا۔ ''اس بار ایک مہلت بھی نہیں دوں گا''۔

شدتِ خوف سے آصف کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''ب......ب بتاتا ہوں گو...... گولی...... مت چلانا''۔

''بولتے رہو''۔ جمشید خان نے وارننگ کے سے انداز میں کہا۔ ''تمہاری زبان رکی تو چل جائے گی۔ بتاؤ کس کے لیے کام کرتے ہو؟''

''بنگ...... بنگش کے لیے''۔ اس نے ہکلا کر بتایا اور پھر فر فر بولنے لگا۔

جمشید خان سوال کرتا گیا اور وہ بلاتردد جواب دیتا گیا۔ ذرا دیر کے بعد وہ اپنا سارا کچا جمشید کے سامنے کھول چکا تھا۔ جن ساتھیوں کو وہ جانتا تھا ان کے نام و پتے بھی بتا دیے اور بنگش چند ٹھکانوں کی نشاندہی بھی کر دی۔

''بنگش کے پاس ان دنوں کوئی موسیٰ خان نامی شخص بھی آیا ہوا ہے۔ اس سے ملے ہو کیا؟'' جمشید خان نے اس کے خاموش ہوتے ہی سوال کیا۔

''صرف ایک دو بار''۔ وہ بولا۔ ''اکثر موسیٰ خان غائب رہتا ہے یا پھر بنگش کے ساتھ ایک ٹھکانے پر رہتا ہے۔ اس ٹھکانے کے بارے میں ہم جیسے عام کارندے کچھ نہیں جانتے''۔

''چند روز قبل موسیٰ خان نے شہناز نامی ایک لڑکی کو اغوا کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟ اسے کہاں رکھا گیا ہے؟''

''نہیں''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ اسے تو علاقہ غیر کی طرف بھیج دیا گیا ہوگا یا پھر بنگش کے اسی خفیہ ٹھکانے پر رکھا گیا ہوگا''۔

''ٹھیک ہے تعاون کرنے کا شکریہ''۔ جمشید خان بولا۔ ''میری کوشش ہوگی کہ تمہیں کم سزا ہو مگر اس کے لیے تمہیں ہمت سے کام لیتے ہوئے عدالت میں بنگش کے خلاف بیان دینا ہو گا۔ عدالت تم سے ضرور رعایت کرے گی''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ جہانداد کے ساتھ باہر نکل گیا۔

✣ === ✣ === ✣

وہ دونوں آفس میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ جمشید خان نے وال کلاک پر نظر ڈالی تو رات کے دس والے تھے۔ وہ بہت تھکن محسوس کر رہا تھا اور اب گھر جانا چاہتا تھا جبکہ جہانداد ڈاکٹر شہناز کی رہائی لیے ابھی سے ایکشن میں آنا چاہتا تھا اور جمشید خان کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔



''جہانداد! اتنی جلد بازی اچھی نہیں ہوتی''۔ وہ بولا۔ ''ہم کوئی نقصان بھی اٹھا سکتے ہیں ویسے بھی اس وقت میں بے حد تھکن محسوس کر رہا ہوں اور گھر جانا چاہتا ہوں۔ کل ان شاء اللہ بنگش کے تمام ٹھکانوں پر ریڈ کریں گے''۔

''ٹھیک ہے آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''مگر آپ کا اس وقت گھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ بنگش کے غنڈے آپ کی تاک میں ہوں گے''۔

''میں ٹیکسی میں جاؤں گا''۔ وہ بولا۔ ''بنگش کے غنڈوں کی نظر میری گاڑی پر ہوگی''۔

''رات کے دو بجے ٹیکسی کہاں ملے گی؟'' جہانداد بولا۔ ''بہتر ہوگا آپ آج رات......''

''نہیں''۔ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں ابھی جاؤں گا۔ ہسپتال کے سامنے سے ٹیکسی مل جاتی ہے، چند قدموں کا تو فاصلہ ہے۔ تم بس قیدی کا خیال رکھنا اور انٹروگیشن روم کے دروازے پر تعینات گارڈز کو چیک کرتے رہنا۔ اگر اس کے ساتھی دوبارہ اسے چھڑانے کے لیے آئیں تو اسے بلاتردد گولی مار دینا۔ ہمیں جو کچھ اس سے معلوم کرنا تھا وہ ہم کر چکے ہیں''۔

''او کے فکر نہ کریں۔ مجھ سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی''۔

جہانداد نے جواب دیا اور جمشید خان اسے خدا حافظ کہتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

وہ جب تھانے سے نکلا تو رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ قریب ہی ایک پرائیویٹ ہسپتال تھا جو رات بھر کھلا رہتا تھا اور وہاں سے باآسانی ٹیکسی وغیرہ مل جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہاں ایک خالی ٹیکسی موجود تھی۔ جمشید خان ٹیکسی کی کھڑکی کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے اس سے منزل کا پتہ پوچھ کر ابھی انجن اسٹارٹ کیا ہی تھا کہ اچانک تاریکی سے دو نوجوان نمودار ہوئے اور دوڑتے ہوئے ٹیکسی کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ ٹیکسی کی عقبی کھڑکیاں کھولیں اور پلک جھپکنے کی دیر میں جمشید خان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ دوسرے ہی لمحے دو ریوالور جمشید خان کے پہلوؤں میں چبھ رہے تھے۔

''گاڑی چلاؤ''۔ ایک نے غرا کر ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیا اور پھر جمشید خان کے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا۔

جمشید خان کے منہ سے بے اختیار ایک گہرا سانس خارج ہو گیا تاہم اس نے دونوں سے کچھ بھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ٹیکسی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ایک بڑی شاہراہ پر پہنچ گئی۔ جمشید خان ان کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا۔ ان دونوں کے ریوالور بدستور جمشید خان کے پہلوؤں میں چبھ رہے تھے۔ اس وقت گو کہ رات کے ڈھائی بج رہے تھے مگر شاہراہ پر متعدد گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ اس طرف

ایئر پورٹ ہونے کی وجہ سے یہ شاہراہ شب و روز مصروف رہتی تھی بڑی شاہراہ سے ٹیکسی ایک سڑک کی طرف گھوم گئی۔ ایک نوجوان ٹیکسی ڈرائیور کو برابر ہدایات دے رہا تھا۔ ٹیکسی نے ابھی تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ سامنے پولیس کی ایک موبائل کھڑی ہوئی نظر آنے لگی۔ دو پولیس والے کے بیچ کھڑے آنے جانے والی گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔

''موبائل کے قریب گاڑی روک دینا''۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیور کو حکم دیا اور پھر خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ پولیس والے یقیناً تمہیں جانتے ہوں گے، ہماری چیکنگ صورت میں نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہی تم نے انہیں کوئی مخصوص اشارہ کرنے کی کوشش کرنی ہے ایسا کچھ ہوا تو ہم اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر تمہیں گولی ماردیں گے''۔

ٹیکسی کی رفتار کم ہوئی اور پھر وہ موبائل کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ دو کانسٹیبل رائفلیں ہوئے کھڑے تھے۔ موبائل کا انچارج ایک اے ایس آئی تھا اور جمشید خان کو اچھی طرح پہچانتا اس کی ماتحتی میں وہ کچھ عرصہ بھی گزار چکا تھا۔

جمشید خان کو دیکھ کر پہلے تو اے ایس آئی چونک سا گیا، پھر ٹیکسی کی کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولا

''سر! آپ اور اس وقت، وہ بھی ٹیکسی میں...... خیر تو ہے کہاں......''

''ایک ضروری کام سے جارہا ہوں''۔ وہ اے ایس آئی کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی ورکشاپ میں ٹھیک ہونے کے لیے گئی ہے''۔

دائیں طرف والے نوجوان کی جیب میں رکھے ہوئے ریوالور کی نال جمشید خان کے پہلو رہی تھی۔ یہ ایک خاموشی وارننگ تھی۔

اے ایس آئی دوبارہ بولا۔ ''سر اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو......''

''نو''۔ جمشید خان نے دوبارہ اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ہوں۔ چلو ڈرائیور''۔ آخری الفاظ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہے تھے۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ جمشید خان چاہتا تو اس وقت بڑی آسانی سے اے ایس آئی کو اشارہ کر سکتا تھا۔ ٹیکسی کے دونوں طرف پولیس والے رائفلیں تانے ہوئے کھڑے ہوئے ظاہر ہے اس کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے نوجوانوں کو بھی اپنی زندگی پیاری تھی۔ وہ اسے شوٹ کر اپنی جان کبھی نہ گنواتے لیکن جمشید خان جان بوجھ کر اغوا ہو رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد یا بدیر موسیٰ خان دونوں میں سے کسی ایک تک پہنچ جائے گا۔

''کافی عقل مند لگتے ہو''۔ ٹیکسی جب پولیس موبائل سے دور نکل گئی تو دائیں طرف نوجوان طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم نے تو انہیں معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی''۔



''مجھے اپنی زندگی پیاری ہے''۔ وہ بولا۔ ''لیکن تم لوگ کون ہو اور مجھے کہاں لے کر جارہے ہو؟''

''ابھی سب معلوم ہو جائے گا، تھوڑا صبر کرو''۔ اس نے جواب دیا اور پھر اپنے ساتھی سے بولا۔ ''اشرف! اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو''۔

اشرف نے جیب سے رومال نکال کر جمشید خان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ ٹیکسی کچھ دور جانے کے لیے بعد بائیں طرف موڑ کاٹتی ہوئی ریلوے لائن عبور کر گئی۔ وہ جگہ عام طور پر پرانا پھاٹک کے نام سے مشہور تھی۔

''ٹیکسی روک دو''۔ دائیں طرف والے نوجوان نے ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیا۔

ٹیکسی رک گئی۔ تقریباً ایک سو میٹر آگے مکانات تھے مگر ریلوے لائن کے قریب جہاں ٹیکسی رکی تھی وہ جگہ ویران تھی۔

''نیچے اترو''۔ اس نوجوان نے دوبارہ ڈرائیور کو حکم دیا۔ ''اور بھاگ جاؤ، گھر جا کر شکرانے کے نوافل ضرور ادا کرنا کہ جان بچ گئی''۔

ٹیکسی ڈرائیور اس کا حکم سن کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔

پچھلی سیٹ پر جمشید خان کے ساتھ اب ایک نوجوان رہ گیا تھا، اس کا دوسرا ساتھی اسٹیرنگ سنبھال چکا تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھی اور کئی موڑ گھومتی ہوئی ایک کوٹھی نما مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے ہارن بجانے کی بجائے چند بار ہیڈ لائٹس کو آن آف کیا تو کوٹھی کا گیٹ کھلتا چلا گیا۔ وہ ٹیکسی کو اندر لے گیا۔ ٹیکسی رکتے ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے کھڑکی کھولی اور جمشید خان کا بازو پکڑ کر اسے نیچے اتار دیا۔ ڈرائیونگ سیٹ والا بھی اس دوران نیچے اتر چکا تھا۔ جبکہ گیٹ کھولنے والا گیٹ کو بند کرنے کے بعد ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں روسی ساخت کی ایک کلاشنکوف تھی۔

تینوں اسے پکڑ کر اندر لے گئے۔ ایک جگہ زینے اترتے ہوئے جمشید خان کو اندازہ ہو گیا کہ اسے کسی تہہ خانے میں لے جایا جارہا ہے۔ نیچے پہنچ کر اس کی آنکھوں سے پٹی اُتار دی گئی۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ تہہ خانہ ہی تھا بلکہ اسے عقوبت گاہ کہنا زیادہ مناسب تھا، دیواروں کے ساتھ آہنی کڑے اور موٹی موٹی فولادی زنجیریں لٹک رہی تھیں، کچھ دیگر چیزیں بھی تھیں جو اذیت رسانی کے کام آتی تھیں۔

جمشید خان کا سروس ریوالور تو ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ان لوگوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ ایک آدمی اس پر کلاشنکوف تانے کھڑا رہا جبکہ دوسرا اس کی تلاشی لینے لگا لیکن اس کی جیبوں سے کوئی خاص چیز برآمد نہ ہو سکی۔ تاہم سروس کارڈ اور پیسے وغیرہ انہوں نے اس کی جیبوں میں ہی رہنے دیے تھے۔

اشرف نامی نوجوان کے حکم پر جمشید خان کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا اور پھر اس کے آہنی کڑوں میں جکڑ دیے گئے۔ اب جمشید خان کے چہرے پر ہلکے ہلکے خوف کے تاثرات نمودار ہونے لگے تھے۔ وہ تینوں اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

''اس کا ایک ایک عضو کاٹنا شروع کر دو''۔ تہہ خانے میں اشرف نامی نوجوان کی بے رحم آواز گونجی اور جمشید خان کے پورے وجود میں خوف کی ایک سرد لہر سرایت کر گئی۔

اشرف کا حکم سنتے ہی اس کے دونوں ساتھی آگے بڑھے اور خنجر اٹھانے کے بعد جمشید خان کے سامنے پہنچ گئے۔ انہوں نے اس کا ایک ایک کان پکڑ لیا مگر خنجر بلند کرنے سے پہلے ہی انہیں اشرف نے اشارہ کر کے روک دیا۔

''رکو''۔ وہ بولا۔ ''پہلے مجھے اس سے بات کرنے دو، پھر یہ شوق بھی پورا کر لینا''۔

اتنا کہہ کر وہ جمشید خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''سنا ہے بہت دبدبہ ہے تمہارا؟'' وہ طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔ ''بڑے بڑے پھنے خان غنڈے تمہارا نام سن کر کانپتے ہیں اور تو اور تمہارے محکمے کے لوگ بھی تمہارے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کرتے لیکن دیکھو ہم تمہیں کس آسانی سے اُٹھا لائے ہیں''۔

''میں جان بوجھ کر اغوا ہوا ہوں احمق!'' جمشید خان نڈر انداز میں بولا۔ ''ورنہ تم جیسے کل کے لونڈے مجھے یہاں نہیں لا سکتے تھے''۔

''ویل ڈن بھئی ویل ڈن''۔ وہ ستائشی انداز میں بولا۔ ''جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا ہے۔ اب تم بُرے پھنسے ہو''۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' اس نے استفسار کیا۔

اشرف نے کلاشنکوف والے کو اشارہ کیا۔ وہ ٹیلی فون اٹھا کر لے آیا۔

''صاحب کے پاس لے جاؤ''۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا اور کلاشنکوف والے نے تعمیل کی۔

''تم نے ہمارے ایک ساتھی کو پکڑ رکھا ہے''۔ اشرف بولا۔ ''اس کے علاوہ تمہاری وجہ سے ہمارے بہت سے ساتھی مارے گئے ہیں۔ مرنے والوں کو تو ہم بھول سکتے ہیں مگر جو زندہ ہے اسے نہیں بھول سکتے۔ اپنے تھانے کو فون کر کے انہیں ہدایت دو کہ ہمارے ساتھی آصف کو فی الفور رہا کر دیں ورنہ ہم تمہارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے گٹر میں بہا دیں گے''۔

''اوہ...... آئی سی''۔ بے اختیار جمشید خان کے منہ سے نکلا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تھانے پر حملہ بھی تم لوگوں نے کیا تھا، غالباً اپنے اس ساتھی کو چھڑانے کے لیے۔ مگر تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ پولیس ابھی اتنی بے بس نہیں ہوئی ہے کہ غنڈوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دے''۔



''بے بس''۔ اشرف نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''یہ بھی خوب کہا ہے مگر ہمارے ''بس'' کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ اتنے ہنگامے کے باوجود بھی ہم تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں''۔

''خوش فہمی ہے تمہاری''۔ وہ بولا۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں جان بوجھ کر اغوا ہوا ہوں''۔

''میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں''۔ اشرف بدستور طنزیہ انداز میں بول رہا تھا۔ ''مگر اب یہ جرأت تمہیں مہنگی پڑنے والی ہے۔ میں تمہارا ایک ہاتھ کھلوا دیتا ہوں اور تھانے کا نمبر بھی ڈائل کر دیتا ہوں۔ اپنے عملے سے کہو کہ وہ ہمارے ساتھی کو چھوڑ دیں بصورت دیگر تمہیں ٹکڑوں کی صورت میں پولیس اسٹیشن پارسل کر دیا جائے گا''۔

''نہیں کبھی نہیں''۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''میں ایسا نہیں کروں گا''۔

''ایسا نہ کرنے کا انجام جانتے ہو؟'' اشرف نے دھمکی آمیز انداز میں پوچھا۔

''زیادہ سے زیادہ مجھے قتل کر دو گے ناں''۔ وہ بولا۔ ''بے شک، کر دو۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے''۔

''نہیں''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے بلکہ زندہ رکھیں گے مگر وہ زندگی موت سے بھی بدتر ہو گی۔ تم موت کی دعا کرو گے، بھیک میں ہم سے موت مانگو گے لیکن موت پھر بھی نہیں ملے گی۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے تین منٹ دیتا ہوں''۔

اتنا کہنے کے بعد اشرف نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''مجھے کسی مہلت کی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ نڈر انداز میں بولا۔ ''تم لوگوں کو جو کچھ بھی کرنا ہے، شروع کر دو۔ میں......''

اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی اشرف نے آگے بڑھ کر اس کے جبڑے پر ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ جمشید خان کے منہ سے ہلکی سے کراہ نکلی اور اس کا سر عقبی دیوار سے جا ٹکرایا۔

''تمہاری آہ و بکا یہاں سے باہر نہیں جا سکتی''۔ اشرف غرا کر بولا۔ ''جتنا چیخ سکتے ہو چیخو''۔

اس کے بعد اس نے جمشید خان پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ وہ منہ ناک دیکھے بغیر اندھا دھند گھونسے برسا رہا تھا۔ جمشید خان نے جبڑے بھینچ لیے مگر کب تک؟ وہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہی تھا آخر کار درد کی شدت نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا مگر اشرف اس وقت بالکل درندہ بنا ہوا تھا، اسے ذرا سا بھی جمشید خان پر رحم نہیں آ رہا تھا۔

''اب کیا کہتے ہو؟'' چند لمحوں کے بعد اشرف ہاتھ روکتے ہوئے بولا۔ ''ہاں یا ناں؟''

''نہیں''۔ جمشید خان نے چلا کر کہا اور پھر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ ''مار ڈالو مجھے ورنہ پچھتاؤ گے۔ میں زندہ بچ گیا تو تم سب کو قبر کے اندھیروں کے حوالے کر دوں گا''۔

غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشرف نے آستین سے چہرہ صاف کیا اور بولا۔ ''تم بولو گے ایس پی! میں دیکھتا ہوں تم کب تک برداشت کرتے ہو''۔

اس نے آہنی کڑوں سے جمشید خان کے ہاتھ آزاد کر دیے اور پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے اوندھے منہ فرش پر لٹا دیا۔ دو آدمی اس کے بازوؤں پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے جبکہ اشرف نے بے رحمانہ انداز میں اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس کی اکثر ٹھوکریں جمشید خان کے پہلو میں پڑ رہی تھیں۔

''بولو...... ہمارے ساتھی کو چھوڑو گے یا نہیں؟'' ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے سوال کیا۔

''یہ بچکانہ حرکتیں کر کے تم کیا سمجھتے ہو کہ ایس پی جمشید خان کو مجبور کر دو گے؟ نہیں نہیں''۔ وہ بولا۔ ''جو کچھ کر سکتے ہو کرو''۔

اشرف نے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے جمشید خان کے بازو مضبوطی سے پکڑ لیے۔ اشرف نے آگے بڑھ کر پلاس اٹھایا اور پھر جمشید خان کے قریب بیٹھ گیا۔

''اب بھی وقت ہے، مان جاؤ ایس پی!'' وہ سرد انداز میں بولا۔ ''ورنہ درد کی شدت سے تمہاری جان نکل جائے گی''۔

''کوئی پرواہ نہیں''۔ اس نے کہا۔ ''جان نکل گئی تو شہید کہلاؤں گا اور اگر زندہ بچ گیا تو تمہارے ناجائز باپ کتے کی موت مارے جائیں گے''۔

''تم سے پہلے بھی کئی آفیسر یہ خواب دیکھتے ہوئے دنیا سے کوچ فرما گئے ہیں''۔ اس نے استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور آج تمہاری باری ہے''۔

''تو پھر انتظار کس کا ہے؟'' وہ بولا۔ ''میں مرنے کے لیے تیار ہوں''۔

''تمہاری موت بہت عبرت ناک ہوگی ایس پی''۔ اتنا کہہ کر اس نے جمشید خان کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا اور پھر انگوٹھے کا ناخن پلاس میں جکڑ لیا۔ جمشید خان کا بازو پہلے ہی سے اس کے ساتھی کی گرفت میں تھا۔ اشرف پلاس کو جھٹکے دینے لگا۔

جمشید خان ناقابل بیان کرب سے گزر رہا تھا۔ چیخوں کو دبانے کے لیے اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ اشرف کے چہرے پر درندگی کے تاثرات تھے۔ اگرچہ اس کی عمر جمشید سے کم ہی تھی مگر وہ بے حد سنگدل اور سفاک انسان تھا۔ وہ پلاس کو کسی جلاد کی طرح جھٹکے دے رہا تھا۔ درد کی لہریں جمشید خان کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھیں مگر شاید اس نے نہ چیخنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کا یہ اطمینان اشرف کے غصے کو مزید بھڑکا رہا تھا۔ اشرف نے آخری جھٹکا دیا اور جمشید کا ناخن جڑ سے اکھڑ گیا۔ ہونٹ بھینچے ہونے کے باوجود اس کے منہ سے ایک ہلکی سی کراہ خارج ہوئی۔ انگوٹھے سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ جمشید خان کا ہاتھ رنگین ہو گیا اور خون ہاتھ سے فرش پر ٹپکنے لگا۔



اشرف کے ہاتھ میں اب جمشید خان کے اسی ہاتھ کی ایک اور انگلی تھی۔ اس نے دوبارہ پلاس کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں کر دو ایس پی ورنہ ایک ایک کر کے سارے ناخن اکھاڑ دوں گا، ہاتھوں کے بعد پیروں کی باری آئے گی۔ پھر خنجر کی نوک سے باری باری تیری دونوں آنکھیں نکال دوں گا۔ تیرے ایک ایک اعضاء کے ساتھ یہی سلوک کروں گا اور آخر میں تجھے نامرد بنا کر سڑک پر پھینک دوں گا۔ نامرد کا مطلب سمجھتے ہو ناں؟ مجھے معلوم ہے تم ابھی تک کنوارے ہو اور تمہاری آئندہ نسل کا دارومدار تم پر ہے۔ تم اگر نامرد بن گئے تو......''

''فون لاؤ''۔ غیر متوقع طور پر جمشید خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا اور اشرف کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''جلدی سے فون لے کر آؤ''۔ اشرف نے فوراً اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا۔

وہ آگے بڑھا اور فون اٹھا کر جمشید خان کے سامنے رکھ دیا۔ اشرف نے اس کا پکڑا ہوا ہاتھ آزاد کر دیا۔ جمشید خان نے دائیں ہاتھ سے پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا اور پھر اشرف سے بولا۔ ''تم لوگ مجھ سے ذرا دور چلے جاؤ۔ فون سننے والے کو اگر کسی قسم کا شک ہو گیا تو وہ تمہارے ساتھی کو رہا نہیں کریں گے''۔

بات سمجھ میں آنے والی تھی، اشرف اپنے دونوں ساتھیوں سمیت ذرا فاصلے پر چلا گیا۔

تیسری بیل پر دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ اس کے ہیلو کہنے سے قبل ہی جمشید خان تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''میں ایس پی جمشید خان بات کر رہا ہوں۔ جہانداد کہاں ہے؟''

''وہ تو سر! ابھی ابھی باہر نکلا ہے''۔ دوسری طرف سے ہیڈ محرر جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''حکم کریں سر! میں......''

''جہانداد کو بلاؤ...... فوراً''۔ جمشید خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''او کے سر! ذرا ہولڈ کریں''۔

اشرف اور اس کے دونوں ساتھیوں کی نگاہیں جمشید خان پر لگی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد ریسیور سے جہانداد کی آواز ابھری۔

''حکم کیجیے جناب! میں جہانداد بول رہا ہوں؟''

''قیدی کس حال میں ہے؟'' جمشید خان نے سوال کیا۔

''فی الحال ٹھیک ٹھاک ہے جناب!''۔ جہانداد نے کہا۔ ''مگر آپ اس وقت کہاں سے بول رہے ہیں؟''

جہانداد کا سوال سن کر جمشید خان نے کن اکھیوں سے اشرف کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''میں

آصف کے ساتھیوں کی قید میں ہوں۔ وہ تب تک مجھے نہیں چھوڑیں گے جب تک تم لوگ ان
ساتھی کو آزاد نہیں کر دیتے''۔

''حکم کیجئے جناب!'' جہانداد نے پوچھا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

''سنو!'' جمشید خان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میں ایس پی جمشید خان تمہیں حکم دیتا ہوں
آصف صاحب کو دومنٹ کے اندر شایانِ شان طریقے سے آخرت کے سفر پر روانہ کر دو۔ کسی سوال
گنجائش نہیں ہے۔ حکم پر فوراً عمل کرو''۔ اتنا کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اشرف اور اس کے دونوں ساتھی متحیر انداز میں جمشید خان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان
وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جمشید خان اپنے ماتحت کو ایسا کوئی حکم دے گا۔

''دیکھ لیا ناں تم نے؟'' جمشید خان اشرف کو متحیر دیکھ کر بولا۔ ''میں نے کس طرح تمہارے
سے تمہارے ساتھی کو کتے کی موت مروا ڈالا ہے''۔

''وہاں، وہ وہاں کتے کی موت مرنے والا ہے اور تم یہاں میرے ہاتھوں کتے کی موت مر
لگے ہو''۔ اتنا کہہ کر اشرف نے ریوالور نکالا اور جمشید خان پر تان لیا۔

•:• ===•:• ===•:•

جمشید خان کا حکم سن کر جہانداد چند لمحے تو ہکا بکا رہ گیا اور پھر ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے
نکل گیا۔ تیزی تیز قدم اٹھاتا ہوا اور وہ انٹروگیشن سیل میں داخل ہو گیا، وہاں اے ایس آئی کامران
موجود تھا جو دہشت گرد آصف سے سوال و جواب کرنے میں مصروف تھا۔

''کیا بات ہے؟'' جہانداد کو الجھے ہوئے انداز میں دیکھ کر کامران نے سوال کیا۔

''ایس پی صاحب اس کے ساتھیوں کی قید میں ہے''۔ جہانداد نے بتایا۔ ''ابھی فون پر
سے میری بات ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے اسے رہا کرانے کے لیے شاید ایس پی صاحب پر تشدد کیا
ہے''۔

''اور کچھ کہا ہے ایس پی صاحب نے؟'' کامران نے پوچھا۔

''ہاں''۔ جہانداد بولا۔ ''اس نے کہا ہے کہ اس کا فی الفور اِن کاؤنٹر کر دیں''۔

''کیا......؟'' کامران نے چونک کر سوال کیا۔ ''کیا ایسا کہا ہے ایس پی صاحب نے؟''

آصف متوحش انداز میں ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ اس کے اِن کاؤنٹر کی بات
اطمینان کے ساتھ کر رہے تھے جیسے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کر رہے ہوں۔

''ہاں ایسا کہا ہے اس نے''۔ جہانداد بولا۔ ''بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ اس کا حتمی فیصلہ ہے۔ اس
مجھے حکمیہ انداز میں کہا ہے کہ میں فی الفور اس کے فیصلے پر عمل درآمد کروں''۔



''او کے''۔ کامران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایس پی صاحب کا حکم تو اب ماننا ہی پڑے گا
لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''لیکن کیا؟'' جہانداد نے استفسار کیا۔

''بعد میں کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو جواب دہی تمہیں کرنا پڑے گی''۔ اس نے جواب دیا۔

''بے فکر رہو''۔ وہ بولا۔ ''جو کچھ بھی ہوگا میں اپنے سر لے لوں گا''۔

''تت......تم لوگ...... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' آصف نے خوفزدہ انداز میں مداخلت
کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مم...... مجھے سزا دینے کا اختیار عدالت کے پاس ہے۔ قانون کو ہاتھ میں لینے
کی کوشش مت کرو''۔

''ہمیں یہ سب کچھ کرنے پر تمہارے ساتھیوں نے مجبور کیا ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''انہوں
نے ایس پی صاحب کو اغوا کر لیا ہے''۔

''مم......میری بات کراؤ ان سے''۔ وہ بولا۔ ''وہ ایس پی صاحب کو رہا کر دیں گے''۔

''کیا تم اغوا کاروں کو جانتے ہو؟'' جہانداد نے سوال کیا۔

''نہیں''۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر معلوم کر لوں گا''۔

''کیا خیال ہے؟'' جہانداد اے ایس آئی کامران کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''فون پر بات کرا دیں
اس کی؟ ہو سکتا ہے وہ لوگ اس کی بات مان لیں''۔

''ٹھیک ہے کرا دیتے ہیں بات''۔ اس نے جواب دیا اور آصف کے چہرے سے قدرے
اطمینان جھلکنے لگا۔

ایس ایچ او اصغر کے زخمی ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر اے ایس آئی کامران کو ہی تھانہ انچارج
بنایا گیا تھا اور وہ ان آفیسرز میں سے تھا جو کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے زیادہ سوچ و بچار نہیں کرتے،
جو بھی کرنا ہوتا ہے فوراً کر ڈالتے ہیں۔

انہوں نے آصف کو سیل سے باہر نکالا اور اسے آفس میں لے گئے۔ وہاں فون موجود تھا۔
آصف نے ایک نمبر ڈائل کیا مگر دوسری طرف سے کنکشن منقطع ہونے کا پیغام ملا۔ اس نے دوسرا نمبر
ڈائل کیا، تیسری بیل پر رابطہ ہو گیا لیکن فون اٹینڈ کرنے والے نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔
ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ پریشان نگاہوں سے جہانداد اور کامران کی طرف دیکھنے لگا۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو؟'' جہانداد بولا۔ ''جرم کی دنیا کے یہی اصول ہوتے ہیں۔ وقت
پڑنے پر سگے بھائی بھی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کوئی اور نمبر رہ گیا ہے تو وہ بھی ٹرائی کر لو''۔

''میرے پاس دو نمبرز تھے''۔ وہ بولا۔ ''جو میں نے ٹرائی کر لیے ہیں''۔

"ٹھیک ہے"۔ اے ایس آئی کامران نے کہا۔ "ہم تمہیں بھاگنے کا موقع دیتے ہیں اگر تم
رفتار گولی سے تیز ہوئی تو جان بچ جائے گی ورنہ موت تو کہیں نہیں گئی ناں؟"

"مجھے مار کر کیا تم لوگ بنگش کے انتقام سے بچ جاؤ گے؟" آصف نے بدلے ہوئے انداز
جواب دیا۔ "وہ پورے تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا"۔

"آدمی پہ جب برا وقت آتا ہے تو وہ ایسے ہی الٹی سیدھی ہانکنے لگتا ہے"۔ جہانداد
استہزائیہ انداز میں کہا۔ "بنگش کے پاس تیرے جیسے کئی کرائے کے قاتل موجود ہوں گے، تیرا
کوئی اور لے لے گا۔ اسے مفت میں خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"چلو بھاگو"۔ کامران نے سروس ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ "تھانے کی حدود کے اندر ہم
تم پر گولی نہیں چلائیں گے"۔

"مم...... میں نہیں بھاگوں گا"۔ وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے واپس سیل میں
دو، یہی تم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا"۔

"بھاگو"۔ جہانداد نے آٹومیٹک رائفل سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں گولی چلا
ہوں"۔

"نہیں"۔ وہ چلایا۔ "میں نہیں بھاگوں گا۔ خد...... خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو"۔

جہانداد نے جواب دینے کی بجائے فائر کر دیا۔ گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے قریب
گزر گئی اور وہ چلاتا ہوا باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ جہانداد اور کامران بھی اس کے تعاقب میں باہر کی طر
لپکے۔ آصف صحن عبور کرتا ہوا صدر دروازے کے نزدیک پہنچ گیا، وہ پوری توانائی کے ساتھ دوڑ رہا

جہانداد اور اے ایس آئی کامران ابھی صحن کے وسط میں ہی تھے جب معاً صدر دروازے
عین سامنے پہنچ کر ایک سفید رنگ کی کار ایک لمحے کے لیے رکی اور فضا فائرنگ کی آواز سے گونج ا
نشانہ آصف کو بنایا گیا تھا جو اس وقت بس صدر دروازہ کراس کرنے ہی والا تھا۔ بیک وقت چھ
سات گولیاں کھا کر آصف چیختا ہوا زمین پر گر پڑا۔

جہانداد اور کامران کو معاملہ سمجھنے میں ایک لمحے کی دیر لگی تھی مگر اس دوران کار آگے بڑھ
تھی۔ ان دونوں نے پیچھے سے کار پر فائرنگ کی تھی مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ کار فائرنگ کی رینج سے
چکی تھی۔ اس کے بعد دونوں بھاگتے ہوئے آصف کے پاس پہنچ گئے جو زندگی کے آخری سانس لے ر
تھا۔



اشرف کے چہرے پر درندگی کے تاثرات تھے اور اس کی قہر آلود نگاہیں جمشید خان کے چہر



پڑی ہوئی تھیں۔

"گولی چلاؤ"۔ جمشید خان نے نڈر انداز میں کہا۔ "تمہارا ساتھی اب تک زندگی کی قید سے
بھاگ چکا ہوگا۔ تم لوگوں سے غلطی ہوئی، مجھے فون پر بات نہیں کرانی تھی"۔

"میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا ایس پی"۔ اشرف غرایا۔ "تم نے ہمارے ساتھی کی موت کا حکم
دے کر بہت برا کیا ہے۔ بہت برا۔ میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ......"

اچانک جمشید خان کے سامنے پڑا ہوا فون بج اٹھا اور اشرف کی بات ادھوری رہ گئی، اس نے
ایک ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ فون اٹھا کر لے آیا۔ اشرف نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا دیا۔ دوسری
طرف سے کچھ سننے کے بعد وہ بولا۔ "دو منٹ ہولڈ کریں جناب"۔

اتنا کہنے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اس کا خیال رکھنا، میں باس کی بات
سن کر ابھی واپس آتا ہوں۔ اگر کوئی بھی غلط حرکت کرنے کی کوشش کرے تو بلاتردد گولیوں سے بھون
دینا"۔

دونوں ساتھیوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور اشرف فون سمیت سیڑھیوں کی طرف
بڑھ گیا۔

اب جمشید خان ان دو کلاشنکوف برداروں کے رحم و کرم پر تھا۔ دونوں اسے عجیب استہزائیہ انداز
میں گھور رہے تھے۔ جمشید خان کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا، اسے کسی نہ کسی طرح ان دونوں پر قابو
پانا تھا اور وہ بھی صرف چند لمحوں میں ورنہ اشرف کی واپسی کے بعد وہ اپنے اس ارادے پر عمل نہیں کر
سکتا تھا۔ اشرف نہ صرف یہ کہ انتہائی بے رحم تھا بلکہ ضرورت سے زیادہ چالاک بھی تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور جمشید خان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر کار تھک کر اس
نے ان دونوں سے ایک غیر متعلق سا سوال کر دیا۔ "ٹائم کیا ہوگا اس وقت؟"

"ٹائم پوچھ کر کیا کرو گے ایس پی؟" ان میں سے ایک نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تم تو اب
ایسے بھی گھڑی بھر کے مہمان ہو۔ ابھی ہمارا ساتھی واپس آئے گا تو تمہارا قصہ ختم"۔

اچانک ایک خیال برق کے کوندے کی طرح جمشید خان کے دماغ میں لپکا اور اس نے دونوں
ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر تڑپنا شروع کر دیا۔ چہرے پر اس نے ایک ناقابل بیان اذیت کے تاثرات
طاری کر لیے تھے۔ دونوں کلاشنکوف بردار متحیر انداز میں اسے تڑپتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

"پپ...... پانی"۔ بدقت تمام اس کی زبان سے نکلا اور پھر اس کا جسم اینٹھتا چلا گیا، منہ سے
جھاگ نکل رہا تھا اور آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

"اسے شاید مرگی کا دورہ پڑ گیا ہے"۔ جمشید خان کی سماعتوں سے ایک کی آواز ٹکرائی۔ "پانی

پلاتے ہیں اسے یہ نہ ہو کہ......''

''ہو سکتا ہے یہ بہانہ کر رہا ہو''۔ دوسرے نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو... گا''۔

''بزدلی کی باتیں مت کرو''۔ پہلے نے جواب دیا۔ ''ہم مسلح ہیں اور وہ نہتا ہے، ایک تو زخمی ہے اس کا''۔

''ٹھیک ہے پانی پلا دو اسے''۔ دوسرے نے کہا۔ ''مگر خیال رکھنا، یہ پولیس والے چالاک ہوتے ہیں''۔

''فکر نہ کرو یار! کچھ نہیں ہوگا''۔ پہلے نے جواباً کہا اور پھر جمشید خان کی ساعتوں سے قدموں کی چاپ ٹکرانے لگی۔ اس نے موندی آنکھوں سے دیکھا تو ایک کلاشنکوف بردار تہہ خانے کے کونے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں پانی رکھا ہوا تھا۔

اس نے گلاس میں پانی لیا اور پلٹ کر جمشید خان کی طرف آنے لگا۔ جمشید خان بدستور موندی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں گلاس اور دائیں میں کلاشنکوف پکڑ رکھی تھی آنے والے لمحات کا سوچ کر جمشید خان کے بدن میں سنسنی کی ایک تیز لہر سرایت کر گئی۔ وقوع پذیر ہونے والی سچویشن میں اس کے لیے موت اور زندگی کے چانس ففٹی ففٹی تھے مگر وہ یہ رسک لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اشرف کے تیور وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ اسے کسی بھی صورت میں زندہ چھوڑنے والا نہیں تھا۔

پانی لانے والا اس کے قریب پہنچ کر اکڑوں انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں جمشید خان کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جمشید خان موندی آنکھوں سے اس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ جونہی اس نے گلاس والا ہاتھ جمشید خان کے لبوں کی طرف بڑھایا، جمشید خان نے برق رفتاری سے کلاشنکوف پر جھپٹا مارا اور چشم زدن میں اس سے کلاشنکوف چھین لی۔

جھٹکا لگنے سے کلاشنکوف بردار اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل پختہ فرش پر گرا۔ کلاشنکوف ہاتھ میں آتے ہی جمشید خان نے بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے دوسرے کلاشنکوف بردار پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا گرا اور تڑپنے لگا، کلاشنکوف کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

اسی اثنا میں پانی لانے والے نے سنبھل کر عقب سے جمشید خان پر چھلانگ لگا دی۔ اچانک افتاد سے جمشید خان سنبھل نہ سکا اور جھٹکا لگنے کی وجہ سے کلاشنکوف اس کے ہاتھوں سے پختہ فرش پر گھسٹتی چلی گئی اور تہہ خانے کی نچلی سیڑھی سے ٹکراتی ہوئی رک گئی۔ حملہ آور نے جمشید خان



چھوڑ کر کلاشنکوف کی طرف چھلانگ لگا دی، جمشید خان نے بھی برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔

حملہ آور سیدھا کلاشنکوف کے اوپر جا کر گرا مگر اس سے پہلے کہ وہ کلاشنکوف اٹھا کر سنبھالتا، جمشید خان اس کے اوپر سوار ہو چکا تھا۔ عقب سے اس کی گردن پکڑ کر جمشید خان نے اس کا سر پختہ فرش پر دے مارا۔ حملہ آور کے منہ سے کراہ نکلی اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور خون بہہ نکلا جمشید خان کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا زخمی تھا، اس دھینگا مشتی سے ایک بار پھر اس کے انگوٹھے سے خون بہہ نکلا مگر اس نے زخمی انگوٹھے کی پروا نہ کی، اس کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی اور یہاں سے نکلنے کا یہ اس کے لیے آخری موقع تھا۔ اشرف کسی بھی وقت واپس آ سکتا تھا اور اس کے علاوہ نامعلوم اور بھی کتنے لوگ تھے وہاں؟

حملہ آور بہت سخت جان ثابت ہو رہا تھا، پیشانی زخمی ہونے کے باوجود اس نے ایک جھٹکے سے گردن آزاد کروالی اور پھر جمشید خان کے منہ پر ایک گھونسہ مارنا چاہا۔ جمشید خان نے اس کا وار کلائی پر روکا اور اس کے ساتھ ہی اٹھ کر اس کے پہلو میں زوردار ٹھوکر مار دی۔ وہ شخص کراہتا ہوا الٹ گیا اور جمشید خان نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

وہ شخص فرش پر لڑھکتا ہوا اپنے مُردہ ساتھی والی کلاشنکوف تک پہنچ گیا، جیسے ہی اس کے ہاتھوں نے کلاشنکوف کو چھوا جمشید خان نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ شخص سینے کے بل فرش پر پڑا ہوا تھا جبکہ جمشید خان اس کے اوپر تھا۔ دونوں کے ہاتھ کلاشنکوف پر تھے اور دونوں ایک دوسرے سے کلاشنکوف چھیننے کے لیے زور آزمائی کر رہے تھے۔ اس شخص کی انگلی کلاشنکوف کے ٹریگر پر تھی اور وہ کلاشنکوف کی نال جمشید خان کے سر کی طرف لانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

دونوں کی اسی جدوجہد کے درمیان ٹریگر دب گیا۔ گولیاں تڑاتڑ کلاشنکوف کی نال سے نکلیں اور گولیوں کی اس تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی تہہ خانہ ایک انسانی چیخ سے گونج اٹھا۔

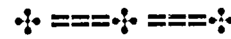
وہ اشرف تھا جو باس سے بات کرنے کے بعد واپس تہہ خانے میں آ رہا تھا۔ وہ ابھی دوسری سیڑھی پر تھا کہ کلاشنکوف سے نکلنے والی گولیوں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا اور وہ چیختا ہوا سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔

اشرف کی چیخ سن کر ایک لمحے کے لیے جمشید خان کی توجہ بٹ گئی۔ اس شخص نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور پوری طاقت سے جمشید خان کو اپنے اوپر سے دھکیل دیا۔ وہ اٹھ کر کلاشنکوف سیدھی کرنا ہی چاہتا تھا کہ جمشید خان نے لیٹے ہی لیٹے لوٹ لگا کر اس کے ہاتھ پر پاؤں کی ٹھوکر لگا دی۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل کر دوبارہ زمین بوس ہو گئی جبکہ اس شخص نے اٹھ کر

سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ جمشید خان بھی سرعت سے اٹھتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے آخری سیڑھی پر پہنچتے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی مگر جمشید خان بروقت اوپر پہنچ گیا اور اپنا زخمی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ بند ہوتے ہوئے دروازے میں دب گیا۔ وہ شخص پوری طاقت سے دروازے کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جمشید خان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی مشین میں دب گیا ہو تاہم اس نے سختی سے اپنے دانت بھینچ لیے اور پھر دوسرا ہاتھ دروازے میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

وہ شخص باہر کی طرف جبکہ جمشید خان اندر کی طرف زور لگا رہا تھا۔ اچانک اس شخص نے دروازہ چھوڑ دیا اور جمشید خان اچانک جھٹکا لگنے کی وجہ سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ پشت کے بل سیڑھیوں پر گرا اور لڑھکتا ہوا اشرف کی لاش پر جا گرا۔ وہ شخص دروازہ کھلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جمشید خان تیزی سے اٹھا اور دوبارہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ عجلت میں اسے کلاشنکوف اٹھانا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ سامنے ایک مختصر سا برآمدہ تھا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دوسرے دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

ایسے ہی وقت باہر سے کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور جمشید خان پلٹ کر بنگلے کے صحن کی طرف بھاگا۔ بنگلے کا مین گیٹ کھلا ہوا تھا اور ایک ٹیکسی بڑی تیزی سے ریورس میں گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ گیٹ کی طرف دوڑا، ٹیکسی گیٹ سے نکل کر سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد بائیں طرف مڑی اور ٹائروں سے چرچراہٹ کی آواز پیدا کرتے ہوئے فل اسپیڈ سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ وہ پاگلوں کی طرح ٹیکسی کے پیچھے دوڑا مگر ٹیکسی دیکھتے ہی دیکھتے ایک موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔



آصف کے نزدیک پہنچتے ہی جہانداد جلدی سے اس پر جھک گیا۔ وہ اس وقت اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا اور گھڑی بھر کا مہمان نظر آتا تھا۔ جہانداد نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا اور گزارشانہ انداز میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے، تم ساری زندگی لوگوں کے جان و مال سے کھیلتے رہے ہو مگر مرنے سے پہلے نیکی کا ایک کام تو کرتے جاؤ شاید یہی ایک نیکی آخرت میں تمہارے کام آجائے۔ پلیز اگر تم جانتے ہو تو مجھے بتا دو موسیٰ خان نے ڈاکٹر شہناز کو کہاں رکھا ہوا ہے؟''

''پپ...... پپ...... پا...... نی''۔ بدقت تمام وہ بولا اور دوبارہ اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگا۔



''کامران پلیز''۔ جہانداد اپنے ساتھی سے بولا۔ ''اگر مائنڈ نہ کرو تو جلدی سے پانی لے آؤ''۔

کامران اثبات میں سر ہلاتا ہوا پانی لانے کے لیے دوڑا پڑا جبکہ جہانداد دوبارہ آصف کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''میرا ساتھی پانی لا رہا ہے''۔ وہ بولا۔ ''اب بتا دو ڈاکٹر شہناز کو انہوں نے کس جگہ رکھا ہوا ہے؟''

آصف چپ رہا جہانداد نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو وہ انتہائی نقاہت آمیز انداز میں بولا۔

''نی...... لی...... کو...... ٹھی''۔

اس کے بعد اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ کامران پانی لے آیا مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے سنتری کو بلایا اور آصف کی لاش اٹھوا کر ایک چارپائی پر رکھوا دی۔ سنتری کو انہوں نے لاش کے قریب رہنے کی تاکید کر دی تھی، آفس میں پہنچ کر اے ایس آئی کامران نے سب سے پہلے بذریعہ فون ایمبولینس کا کہہ دیا اور پھر جہانداد کی طرف متوجہ ہو کر استفسار کیا۔

''کچھ بتایا تھا اس نے؟''

''نیلی کوٹھی''۔ جہانداد بولا۔ ''موت نے اسے یہی دو الفاظ ادا کرنے کی مہلت دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہ بتا سکا''۔

''نیلی کوٹھی''۔ کامران نے الجھ کر پوچھا۔ ''یہ کیسا نام ہے؟ میں تو پہلی مرتبہ سن رہا ہوں''۔

''کاش اسے کچھ بتانے کی مہلت مل جاتی''۔ جہانداد ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''نہ جانے ڈاکٹر شہناز کس حال میں ہوگی؟''

''فکر مت کرو دوست!'' کامران نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''ہم نیلی کوٹھی ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے اور خدا نے چاہا تو ڈاکٹر شہناز ہمیں مل جائے گی''۔

''اس شہر میں نہ جانے کتنی نیلی کوٹھیاں ہوں گی''۔ جہانداد بولا۔ ''ہم کہاں کہاں تلاش کرتے پھریں گے اور پھر یہ بھی تو ضروری نہیں ہے کہ نیلی کوٹھی واقعی کسی کوٹھی یا بنگلے ہی کا نام ہو؟''

''ڈھونڈنے والوں کو تو خدا بھی مل جاتا ہے''۔ وہ بولا۔ ''یہ تو نیلی کوٹھی ہے اور اسی زمین پر، اسی شہر میں کہیں واقع ہے''۔

''خالی نیلی کوٹھی سے کچھ بھی واضح ہونے والا نہیں ہے''۔ جہانداد بدستور مایوس انداز میں بول رہا تھا۔ ''کیا خبر وہ کیا بتانا چاہتا تھا؟ نیلی کوٹھی کسی دور دراز اور غیر معروف جگہ کا بھی تو نام ہو سکتا ہے''۔

"کچھ بھی ہو"۔ وہ بولا۔ "بہر کیف ہمارے ہاتھ ایک کلیو تو لگ گیا۔ بھلے نیلی کوٹھی کی جگہ غیر معروف جگہ کا نام کیوں نہ ہو ہم ڈھونڈ نکالیں گے"۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد ایمبولینس وہاں پہنچ گئی۔ انہوں نے آصف کی لاش ایمبولینس میں رکھوا کر ہسپتال روانہ کر دی۔ ایک کانسٹیبل بھی انہوں نے لاش کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ دونوں دوبارہ آفس میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب ان کا موضوعِ گفتگو ایس پی جمشید خان کی ذات تھی۔ وہ اسے رہا کروانے کے لیے آصف کے بتائے گئے ٹھکانوں پر ریڈ کرنا چاہتے تھے۔ اے ایس آئی کامران نے فون پر ایس ایچ او اصغر سے بھی بات کر لی تھی۔ ایس ایچ او نے انہیں فوری طور پر ایکشن لینے کا حکم دیا تھا۔

آصف نے انہیں دو اہم ٹھکانوں کے نام بتائے تھے اس لیے انہوں نے چھاپہ مارنے کے لیے دو پارٹیاں ترتیب دی تھیں۔ ایک پارٹی کو اے ایس آئی کامران نے جبکہ دوسری کو جہانداد نے لیڈ کرنا تھا۔

جب انہوں نے تمام پروگرام ترتیب دے دیا تو جہانداد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ایس پی صاحب کے گھر تک جانا چاہتا ہوں، آدھے گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا۔ اس دوران تم لوگ تیاری وغیرہ کر لو گے۔ کیا اجازت ہے؟"

"تم فری لانسر ہو دوست"۔ وہ بولا۔ "اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ بس ذرا احتیاط سے جانا، یہ نہ ہو ایس پی صاحب کی طرح تم بھی دہشت گردوں کے ہاتھ لگ جاؤ"۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا بے فکر رہو"۔ اتنا کہہ کر وہ آفس سے باہر نکل گیا۔



جمشید خان ٹیکسی کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی رک گیا تھا۔ تنفس درست کرنے کے لیے وہیں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت تک صبح کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے مگر وہ جگہ ویران پڑی ہوئی تھی۔ شاید وہ کوئی غیر معروف علاقہ تھا۔ تاریکی ابھی پوری طرح چاک نہیں ہوئی تھی اس لیے جمشید خان کو علاقہ پہچاننے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

اس لڑائی بھڑائی میں اسے خاصی چوٹیں آئیں تھیں۔ ناک، ہونٹوں اور ہاتھ سے بہنے والے خون سے اس کی وردی تر ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا جب صبح کا اجالا اچھی طرح پھیلا تو اس نے با آسانی وہ علاقہ پہچان لیا، وہ اس کے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا۔ بنگلے کے تہہ خانے میں دو دہشت گردوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ قانونی کارروائی پوری کرنے کے لیے اسے تھانے تک اس واقعے کی اطلاع پہنچانا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ واپس بنگلے کی طرف چل پڑا۔ اندر



جانے کے بعد اسے ایک کمرے میں ٹیلی فون مل گیا، اس نے ریسور اٹھا کر متعلقہ تھانے کا نمبر ملایا اور اپنی شناخت کرانے کے بعد فوراً موقع پر پہنچنے کے احکامات سنا دیے۔ اس کے بعد اس نے اپنے تھانے اور گھر میں بھی فون کر کے اپنی خیریت کے متعلق بتا دیا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی مگر کوئی قابلِ ذکر چیز نہ آئی۔ اس کمرے سے نکل کر وہ دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ کسی کا بیڈروم تھا۔ بستر کے ساتھ لگی ہوئی سائیڈ ٹیبل کی درازیں وغیرہ چیک کرنے کے بعد اس نے اکلوتی الماری کو کھنگالنا شروع کر دیا مگر وہ لوگ بہت چالاک تھے انہوں نے وہاں اپنا معمولی سا سراغ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ تمام کوشش کے باوجود جمشید خان کے ہاتھ کوئی کارآمد سراغ نہ لگ سکا۔

تھک کر وہ دوبارہ ٹیلی فون والے کمرے کی طرف چل پڑا، ابھی وہ کمرے سے باہر ہی تھا کہ اندر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور ریسیو اٹھا کر کان سے لگا دیا۔

"اشرف!" ایک بھاری آواز سنائی دی اور جمشید خان کے پورے وجود میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اس آواز کو وہ ہزاروں آوازوں میں بھی شناخت کر سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ ابراہیم بنگش کی ہی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ایس پی کو ساتھ لے کر فوراً نیلی کوٹھی پہنچ جاؤ، یہ جگہ پولیس کی نگاہوں میں آ چکی ہے"۔

اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ بنگش نے اس سے جواب طلب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ ریسیور ہاتھ میں لیے وہ ہکا بکا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی سماعتوں میں نیلی کوٹھی کے الفاظ گونج رہے تھے مگر نیلی کوٹھی کا نام اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ یہ عجیب و غریب نام سن رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے۔" "نیلی کوٹھی" مجرموں نے کوڈ ورڈز میں اپنے کسی خفیہ ٹھکانے کا نام رکھ دیا ہو"۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر تیزی سے اپنے تھانے کا نمبر ڈائل کر دیا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کال ریسیو کرنے والے کو حکم سنایا۔ "فوراً جہانداد کو بلاؤ میں ایس پی جمشید خان بول رہا ہوں، جلدی کرو"۔

"وہ تو سر! تھانے میں نہیں ہے"۔ دوسری طرف سے جواب ملا۔ "میں ہیڈ محرر......"

"اے ایس آئی کامران کو بلاؤ"۔ جمشید خان اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "جلدی کرو"۔

"ایک منٹ سر!" ہیڈ محرر نے جواب دیا اور پھر کسی کانسٹیبل کو پکارنے لگا۔

دو منٹ کے بعد ریسیور سے اے ایس آئی کامران کی آواز ابھری۔ "حکم سر! میں کامران بات کر رہا ہوں، ہم تو آپ کے متعلق بہت پریشان......"

''میں بالکل ٹھیک ہوں''۔ جمشید خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ ز
نامی دہشت گرد کا کیا بنا؟ میں نے جہانداد کو حکم دیا تھا کہ اسے گولی مار دے۔ کیا جہانداد نے میرے
پر عمل کر دیا ہے یا آصف ابھی تک زندہ ہے؟''

''سر! آصف کی ڈیڈ باڈی تو اب تک ہسپتال بھی پہنچ چکی ہوگی''۔ کامران نے جواب
''لیکن وہ ہمارے ہاتھ سے نہیں مرا''۔

''تو پھر کس طرح مرا ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

اس کے استفسار پر اے ایس آئی کامران نے تمام واقعات سنا دیے۔

''بہت برا ہوا کامران''۔ وہ مایوس انداز میں بولا۔ ''کاش آصف زندہ ہوتا تو ہم آج
تک پہنچ سکتے تھے۔ وہ یقیناً نیلی کوٹھی کے متعلق ہمیں بتا سکتا تھا''۔

نیلی کوٹھی کا نام سن کر اے ایس آئی کامران چونک اٹھا اور پھر کہا۔ ''سر! آصف نے بھی
سے پہلے کسی نیلی کوٹھی کا نام لیا تھا''۔

''اوکے''۔ جمشید خان بولا۔ ''یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں تھانے پہنچ جاؤں گا
بات کریں گے''۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مقامی تھانے کا عملہ وہاں پہنچ گیا، جمشید خان نے انہیں صورت حال
آگاہ کیا اور پھر وہاں سے رخصت ہو گیا۔



مولوی نصیب اللہ گزشتہ دو روز سے ایک کمرے میں بند تھا۔ زرولی اور اس کے ساتھی اسے فارم ہاؤس پر چھوڑنے کے بعد واپس چلے گئے تھے۔ تاہم فارم ہاؤس پر تین مسلح محافظ چوبیس گھنٹے موجود رہتے تھے۔ وہ نہ صرف مولوی کو بروقت کھانا پینا مہیا کرتے تھے بلکہ اس کی کڑی نگرانی بھی کرتے تھے۔ تینوں محافظوں کو مولوی سے بدتمیزی نہ کرنے کی سختی سے تاکید کر دی گئی تھی۔

پہلے دن تو مولوی بے حد خوفزدہ رہا تھا مگر جب محافظوں نے اسے یہ اطمینان دلایا کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے تو اس کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ کمرے میں دو کھڑکیاں اور ایک روشندان بھی موجود تھا جو اکثر اوقات کھلے رہتے تھے مگر ان میں گرل لگی ہوئی تھیں۔ فارم ہاؤس آبادی سے کافی دور واقع تھا اس لیے محافظ کھلی کھڑکیوں کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مولوی اکثر محافظوں سے سوالات کرتا رہتا تھا کہ اسے کس مقصد کے لیے قید کیا گیا ہے؟ مگر وہ جواب میں لاعلمی کا اظہار کرتے تھے۔

تیسرے دن جب ایک مسلح محافظ اس کے لیے صبح کا ناشتہ لے کر آیا تو مولوی نے جھٹ سے کہا۔ ''میں خان جی سے ملنا چاہتا ہوں، وہ کب آئے گا؟''

''ہم نوکر ہیں مولوی صاحب!'' محافظ بولا۔ ''خان جی کے معمولات کے بارے میں ہمیں کیا معلوم؟ بہرکیف اسے معلوم ہے کہ آپ فارم ہاؤس پر موجود ہیں، کسی وقت بھی وہ یہاں پہنچ سکتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے''۔ مولوی نے کہا۔ ''یہ ناشتہ لے جاؤ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے''۔

''ہم حکم کے غلام ہیں''۔ وہ بولا۔ ''اور ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ آپ کے کھانے پینے کا خیال رکھیں''۔

''میں کہتا ہوں اسے لے جاؤ یہاں سے''۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''اب میں کچھ کھاؤں گا اور نہ پیوں گا''۔

''مطلب آپ سیاستدانوں کی طرح بھوک ہڑتال کرنا چاہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''مگر

مولوی صاحب! شاید آپ نہیں جانتے کہ ہمارے ملک کے سیاستدان نہایت ہی دوغلے ہیں۔ ہڑتال کے تو محض ڈرامے رچاتے ہیں یہ لوگ ورنہ تو بہت کچھ اپنے دوزخ نما پیٹ میں ٹھونس کر بیٹھے ہیں یہ ہڑتالی کیمپوں میں''۔

''خان جی تک میرا پیغام پہنچا دو''۔ اس نے حتمی انداز میں کہا۔ ''وہ جب تک مجھ سے آ کر ملے گا، میں کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ میں دیکھتا ہوں وہ کب تک مجھے یہاں قید رکھ سکتا ہے۔''

''ناشتہ یہیں پڑا رہے گا مولوی صاحب''۔ محافظ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''بھوک لگے تو کھا لینا ورنہ کھڑکی سے باہر پھینک دینا''۔

اتنا کہہ کر محافظ واپس پلٹا اور دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا۔

مولوی صاحب چند لمحے ناشتے کو گھورتا رہا پھر اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اسے ناصر خان خائستہ گل کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ جنہوں نے اسے رات کے وقت نکلنے سے منع کیا تھا مگر اس نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی بات نہیں مانی تھی۔ وہ پشیمان نظر آرہا تھا لیکن یہ پشیمانی اس کے کسی کام کی نہیں تھی۔ سانپ گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے والا معاملہ تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے اسے دو گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران اس نے ایک بار بھی ناشتے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ تاہم اسے بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر وہ نفس کی طلب کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ فارم ہاؤس کی چاردیواری کھڑکی سے کافی دور تھی۔ احاطے میں مختلف قسم کی سبزیاں اور پھلدار درخت لگے ہوئے تھے۔ منظر بڑا دلکش اور روح پرور تھا مگر اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا، البتہ وہ اگر قید نہ ہوتا تو یقیناً اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا۔

اس وقت وہ کھڑکی کی سلاخیں تھامے ہوئے کھڑا تھا جب اچانک اس کی سماعتوں سے گاڑی کی آوازیں ٹکرانے لگیں۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ قریب آتی گئیں اور پھر گاڑی فارم ہاؤس کے احاطے میں آکر رک گئی۔ اس کی نگاہیں اب کمرے کے دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ فارم ہاؤس میں کسی گاڑی کی آمد بلاوجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ آنے والا خان جی یا اس کا کوئی کارندہ ہی ہو سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازے کے ساتھ قدموں کی چاپ ابھری، کسی نے تالے میں چابی گھمائی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ خان جی اپنے خاص کارندے زرولی کے ساتھ اندر داخل ہوا، اس کے ایک ہاتھ میں غیر ملکی سگار سلگ رہا تھا۔ جبکہ زرولی کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ خان جی چند لمحے تو مولوی صاحب کو گھورتا رہا اور پھر انتہائی نخوت کے ساتھ بولا۔ ''مولوی صاحب! تم پر یہ مصیبت تمہاری ہی وجہ سے آئی ہے نہ تم امامت چھوڑ کر سیاستدان بننے کے خواب دیکھتے اور نہ تم پر یہ مصیبت نازل ہوتی''۔



''مجھے یہاں کیوں قید رکھا گیا ہے؟'' مولوی صاحب نے اس کی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہارے فائدہ کے لیے''۔ وہ بولا۔ ''تمہارا آزاد رہنا نہ صرف ہمارے لیے بلکہ تمہارے لیے بھی نقصان کا باعث بن سکتا ہے''۔

''تمہاری پہنچ تو اسلام آباد کے ایوانوں تک ہے''۔ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''پھر بھی ایک عام مولوی سے خطرہ محسوس کرتے ہو؟''

''ہم چاہیں تو ابھی تمہیں گولی مار سکتے ہیں لیکن......''

''مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکتے''۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈرتے ہو کہ کہیں انتخابات میں شکست نہ ہو جائے''۔

''مولوی! منہ سنبھال کر بات کرو''۔ زرولی رائفل سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ گولیوں سے بھون ڈالوں گا''۔

''تم چپ رہو غلام زادے!'' مولوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''تم تو اپنی مرضی سے پانی تک نہیں پی سکتے گولی چلانا تو دور کی بات ہے''۔

''خان جی!'' زرولی نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''یہ مجھے طعنہ دے رہا ہے، میں اسے نہیں......''

''نہیں زرولی!'' خان جی نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔ ''اسے زندہ رکھنا ہماری مجبوری ہے۔ اب یہ عام آدمی نہیں رہا، ہم نے اگر اسے مار دیا تو علاقے میں ہماری سیاسی ساکھ تباہ و برباد ہو جائے گی اور ہمارے سیاسی مخالفین کا مقصد پورا ہو جائے، وہ تو چاہتے یہی ہیں کہ ہم اسے مار ڈالیں تاکہ وہ اس واقعے کو سیاسی ایشو بنا کر ہمیں شکست سے دوچار کر دیں''۔

''شکست تو اب تمہارا مقدر بن چکی ہے''۔ مولوی بولا۔ ''تمہاری اصلیت اب لوگوں کے سامنے آچکی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ مجھے یہاں قید رکھ کر الیکشن جیت جاؤ گے؟''

''الیکشن کو چھوڑو مولوی''۔ وہ ذومعنی انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''اپنے بارے میں سوچو کہ تمہارا کیا بنے گا؟ بیوقوف انسان! تم چند ماہ کے مہمان ہو، الیکشن کے بعد ہم تمہیں اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتاریں گے۔ چاہے ہم الیکشن جیت جائیں یا ہار جائیں مگر تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے''۔

''مجھے اگر موت کا خوف ہوتا تو میں تمہارے خلاف آواز ہی نہ اٹھاتا''۔ اس نے بے خوف لہجے میں کہا۔ ''اور یہ تمہاری بھول ہے کہ تم مجھے الیکشن ہونے تک قید میں رکھو گے؟ میرے اغوا کی خبر اب تک پولیٹیکل صاحب کے کانوں تک پہنچ چکی ہوگی''۔

"یہاں سب بکاؤ ہیں مولوی"۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "جتنے بھی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں ان کی ایک قیمت ہے اور ہم وہ قیمت ادا کر سکتے ہیں۔ تمہیں شاید پیسے کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے، ظالم ایمان تک خرید لیتا ہے"۔

"بکنے والوں کے پاس ایمان کہاں ہوتا ہے نادان!" وہ بولا۔ "جن کے پاس ایمان ہوتا ہے انہیں تم کسی بھی قیمت پر نہیں خرید سکتے"۔

"وقت بتائے گا کہ کون کیسے بکتا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

"بہتر ہوگا مجھے رہا کر دو"۔ مولوی نے کہا۔ "ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے"۔

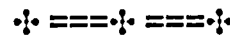
"ہم نے پچھتانا سیکھا ہی نہیں ہے"۔ وہ بولا۔ "البتہ مرنے سے پہلے تم ضرور پچھتاؤ گے"۔

اسی دوران ایک محافظ کھانے کی ٹرے لیے کر اندر داخل ہوا اور مولوی صاحب کے سامنے رکھ دی۔

خان جی نے کہا۔ "ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم نے آج صبح کا ناشتہ بھی نہیں کیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اس طرح ہمیں جھکا لو گے؟"

"جھکنا کوئی بُری بات تو نہیں ہے"۔ وہ ذو معنی انداز میں بولا۔ "نہیں جھکو گے تو ٹوٹ جاؤ گے"۔

"چلو زرولی!" خان جی اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "بہت جلد اس کا دماغ درست ہو جائے گا"۔ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ کمرے کو ایک بار پھر باہر سے تالا لگا دیا۔



خائستہ گل کی جان بچ گئی تھی تاہم وہ اب بھی امین خان کے حجرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔ دوست ہونے کے ناطے ناصر خان دل و جان سے اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔ امین خان دوسرے روز ہی واپس آ گیا تھا، جب اسے مولوی صاحب کے اغوا کے متعلق بتایا گیا تو اس نے ناصر خان اور خائستہ گل کو خوب لتاڑا۔

"ناصر خان!" امین خان کہہ رہا تھا۔ "تم نے بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا صاحب کو کسی بھی قیمت پر نہیں نکلنے دینا تھا۔ اب ہم اسے کیسے ڈھونڈیں گے؟ نہ جانے اسے کہاں لے گیا ہوگا، وہ زندہ بھی ہوگا یا مر چکا ہوگا؟"

"خان صاحب! ہم نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی"۔ ناصر خان بولا۔ "مگر وہ بات بالکل نہیں سن رہا تھا۔ اس وقت اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ ہمیں حجرے میں بند کر نکل گیا تھا۔ اس نے بیرونی دروازے کو باہر سے کنڈی سے لگا دی تھی"۔



"تم دو تھے اور وہ اکیلا تھا"۔ امین خان نے بدستور ناراض انداز میں کہا۔ "پھر وہ کیسے تم لوگوں کو بند کر کے نکل گیا؟"

"بس ہم سے یہی ایک غلطی ہوئی کہ ہم نے اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی"۔ ناصر خان بولا۔ "ورنہ وہ یہاں سے نکل کر نہیں جا سکتا تھا"۔

"ٹھیک ہے"۔ امین خان ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ اسے کیسے تلاش کیا جائے؟"

"ہم بھی خان جی کا کوئی بندہ اغوا کر لیں گے"۔ بستر پر پڑے ہوئے خائستہ گل نے مداخلت کی۔ "اور خان جی سے مولانا صاحب کی رہائی کی بات کریں گے"۔

"ہونہہ...... خان جی سے رہائی کی بات کریں گے"۔ امین خان اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ اتنا آسان ہے؟"

"مشکل سہی، پر ناممکن نہیں ہے"۔ ناصر خان نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "ہم زرولی کو اغوا کریں گے اور اس سے بزور طاقت اُگلوائیں گے کہ انہوں نے مولانا صاحب کے ساتھ کیا کیا ہے؟ اسے مار دیا ہے یا کہیں قید کر رکھا ہے؟"

"نہیں ناصر خان!" امین خان نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس طرح بات بگڑ جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ میں پولیٹیکل صاحب کے پاس چلا جاؤں"۔

"پولیٹیکل صاحب بھی اگر خان جی کا وفادار نکلا تو پھر کیا ہوگا؟" ناصر خان نے پوچھا۔ "الٹا ہم پر کیس بن جائے گا"۔

"ہاں یہ بات بھی سوچنے والی ہے"۔ امین خان متفکر ہو گیا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟" "تم دونوں کی ذرا سی غلطی نے سارا معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے، یہ سیاسی مہم چلانے کا وقت ہے اور ہم اپنا اہم بندہ کھو بیٹھے ہیں"۔

"آپ فکر نہ کریں خان صاحب!" وہ پُر امید انداز میں بولا۔ "مولانا صاحب اگر زندہ ہیں تو میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں جلد ہی اسے بازیاب کرا لوں گا"۔

"جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کرو"۔ اس نے کہا۔ "مولانا صاحب کے بغیر ہماری سیاسی مہم ادھوری ہے، علاقے کے لوگ اس کی بات سنتے اور مانتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے خان صاحب!" وہ بولا۔ "میں آج سے زرولی کے پیچھے لگ جاتا ہوں اور موقع ملتے ہی اسے بزور اسلحہ اغوا کرنے کی کوشش کروں گا"۔

"یہ بہت ضروری ہے ناصر خان"۔ اس نے کہا۔ "میں جمال خٹک کو زبان دے چکا ہوں،

اس بار تمام حلقوں میں اس کی پوزیشن بہت ہی اچھی ہے۔ اسے اگر خدشہ ہے تو صرف اپنے حلقے سے کیونکہ یہاں خان جی کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ اگر ہمارے حلقے سے جمال خٹک اپنے جیت گیا تو پھر ہمارے مطالبات سمجھو پورے ہو گئے۔ میں اس پسماندہ علاقے کو ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں بھی سکول کھلیں گے جن میں غریب لوگوں کے بچے پڑھیں گے، گھر گھر بجلی پہنچے گی، ہسپتال بنیں گے۔ لوگوں میں شعور آئے گا تو خان جی جیسے لوگ اپنی موت آپ مر جائیں گے"۔

"خان صاحب!" ناصر خان پُرعزم انداز میں بولا۔ "بھلے میری جان چلی جائے لیکن میں مولانا صاحب کو ضرور رہا کراؤں گا"۔

"اور میں بھی آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا خان صاحب"۔ خائستہ گل نے پُرجوش انداز میں اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور پھر کراہ کر دوبارہ لیٹ گیا۔

"خدا غارت کرے تم کو زرولی"۔ وہ کوسنے کے انداز میں بولا اور ناصر خان قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

٭ === ٭ === ٭

ڈاکٹر شہناز کو اغوا کرنے کے بعد دو دن تو وہیں پشاور شہر میں رکھا گیا مگر پھر اسے رات کی تاریکی میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ ان دو دنوں میں اس کے ساتھ کسی قسم کا ناروا سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ اسے دیکھ کر بنگش کے آدمیوں کی رال ٹپکتی رہتی تھی مگر موسیٰ خان کے خوف کی وجہ سے کوئی بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔

موسیٰ خان ایک بار پہلے بھی اسے اُٹھا کر لے گیا تھا جب جہانداد زخمی ہوا تھا۔ ڈاکٹر شہناز اس کی عورت بیزار طبیعت سے آگاہ تھی مگر وہاں موسیٰ خان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ رہتے تھے جن کی ہوس ناک نگاہیں اسے گھورتی رہتی تھیں۔ دل ہی دل میں وہ خوفزدہ رہتی تھی مگر مجبوری تھی، وہاں سے کسی طرح بھی فرار نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ نئی جگہ ایک وسیع و عریض حویلی تھی جو لگ بھگ دس کنال پر محیط تھی۔ حویلی کے صدر دروازے پر چوبیس گھنٹے مسلح پہریدار تعینات رہتے تھے جن کی نگاہوں سے بچ کر بلی کا کوئی بچہ بھی اندر نہیں گھس سکتا تھا۔ ڈاکٹر شہناز مکھی، مچھر یا ہوا بن کر ہی وہاں سے فرار ہو سکتی تھی مگر ایسا ہونا ناممکن تھا سو وہ جیسے تیسے وقت کاٹ رہی تھی۔

موسیٰ خان نے اسے واشگاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اس کی ڈاکٹر شہناز کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے اگر جہانداد خود کو اس کے حوالے کر دے تو وہ ڈاکٹر شہناز کو رہا کرنے کے لیے تیار ہے اور اس کے آدمیوں کو بھی موسیٰ خان نے تاکید کر دی تھی کہ ڈاکٹر شہناز کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی کوئی اس پر بُری نگاہ ڈالنے کی جرأت کرے گا۔



موسیٰ خان کبھی کبھار وہاں چکر لگاتا رہتا تھا۔ وہ جب بھی وہاں آتا تھا ڈاکٹر شہناز کی خیریت دریافت کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اس سے مل کر ڈاکٹر شہناز کو اکثر افسوس ہوتا تھا کہ اس جیسا شخص نہ جانے کیسے اس برے دھندے میں آ گیا۔

ایک روز حویلی کے صدر دروازے پر ایک نئی چمچماتی ہوئی کار آ کر رکی اور پہریداروں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھ کر فوراً گیٹ کھول دیا۔ نوجوان پہریداروں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کار کو بھگاتا ہوا اندر لے گیا۔ پورچ میں گاڑی روکنے کے بعد اس نے انجن آف کیا۔ گاڑی سے نیچے اُترا اور انگلی پر "کی رنگ" کو گھماتا ہوا ایک طویل کاریڈور کی طرف بڑھ گیا۔ آنکھوں پر اس نے سنہری فریم والا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

اس کے سامنے آنے والا ہر شخص اسے سلام کرنے کے بعد اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتا تھا۔ وہ شانِ بے نیازی سے چلتا ہوا گنگناتا جا رہا تھا۔ آگے جا کر وہ برآمدہ دائیں ہاتھ گھومتا تھا۔ جونہی اس نے موڑ گھوما ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ چند لمحے تو اسے اپنی نگاہوں پر یقین ہی نہ آیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی لڑکی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے؟

وہ ڈاکٹر شہناز تھی جو برآمدے میں کرسی ڈالے اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ وہ پڑھنے میں کچھ اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے، نوجون دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا مگر ڈاکٹر شہناز اس کی آمد سے بے خبر رہی یا پھر جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہی تھی۔

نوجوان چند لمحے اسے دیکھتا رہا مگر جب ڈاکٹر شہناز نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا تو وہ عامیانہ انداز میں بولا۔ "ہائے بیوٹی فل! میٹ ٹو می آئی ایم فہیم بنگش"۔

اتنا کہہ کر اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا مگر ڈاکٹر شہناز نے اس پر ایک نگاہ ڈالنا بھی گوارہ نہ کیا۔ اس کے اس رویے نے نوجوان کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ جرم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ابراہیم بنگش کا چھوٹا بھائی تھا بلکہ اس کا جانشین تھا کیونکہ ابراہیم بنگش کی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لیے وہ اپنے چھوٹے بھائی کو اولاد کی طرح چاہتا تھا۔

آج تک کسی بھی موقع پر اس کی اتنی بے عزتی نے نہیں ہوئی تھی۔ وہ تپ کر بولا۔ "تم شاید یہاں نئی نئی آئی ہو ورنہ فہیم بنگش کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو ٹھکرانے کی ہمت نہ کرتیں"۔

ڈاکٹر شہناز نے کوئی جواب نہ دیا، غصے کے مارے فہیم بنگش کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا اچانک ایک کمرے سے ابراہیم بنگش برآمد ہوا اور مسکراتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔

"فہیم! تم اور یوں اچانک بغیر اطلاع دیئے"۔ وہ حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں بولا۔ "کم از کم فون ہی کر دیتے تا کہ ہم تمہارا شایانِ شان استقبال کرتے"۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" بھائی کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس نے الٹا سوال کر دیا۔ "اس نے میری انسلٹ کی ہے، میں...... میں اسے چھوڑوں گا نہیں، سالی فہیم بنگش کے سامنے......"

"نہ فہیم نہ"۔ وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔ "تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گے۔ یہ موسیٰ خان کی بہو ہے"۔

"کون موسیٰ خان؟" فہیم نے بھڑک کر پوچھا۔

"تم چلو میرے ساتھ"۔ وہ اس کا بازو تھامتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا موسیٰ خان......"

"نہیں"۔ اس نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑاتے ہوئے قطع کلامی کی۔ "جب تک یہ مجھ سے معافی نہیں مانگ لیتی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا"۔

"تماشا مت بناؤ بیٹے"۔ وہ زچ ہو کر بولا۔ "تم نہیں جانتے کہ موسیٰ خان کس بلا کا نام ہے؟ لڑکی اس کے کسی دشمن کی منگیتر ہے، اسے اگر کوئی نقصان پہنچا تو موسیٰ خان حویلی میں خون کی ندی بہا دے گا"۔

"اوہ"۔ اس نے طنزیہ انداز میں ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "تو آپ موسیٰ خان سے خائف ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میرا بھائی زمین پر بسنے والی مخلوق میں سے کسی سے بھی نہیں ڈرتا مگر آج میری یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی۔ آپ بھی ایک عام انسان نکلے"۔

"تم بات کو غلط انداز میں سوچ رہے ہو"۔ وہ ناراض انداز میں بولا۔ "میں ڈرتا کسی سے بھی نہیں ہوں مگر موقع محل دیکھنا پڑتا ہے...... چلو میرے ساتھ"۔

اتنا کہہ کر وہ اسے کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فہیم بنگش نے پلٹ کر ڈاکٹر شہناز کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔ یاد رکھنا"۔

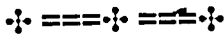
"اب چلو بھی"۔ ابراہیم بنگش نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لئے لڑکیوں کی کمی ہے؟ ایک سے ایک بڑھ کر مل جائے گی"۔

"نہیں، میں نے اسی کا غرور خاک میں ملانا ہے"۔ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ "میں کسی موسیٰ خان سے نہیں ڈرتا"۔

"ٹھیک ہے میں کچھ سوچتا ہوں"۔ ابراہیم بنگش ہتھیار ڈالنے والے انداز میں بولا۔ "تم نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا۔ میں کچھ ایسا کروں گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"۔



"اوکے مجھے منظور ہے"۔ وہ خوشی سے باچھیں پھیلاتا ہوا بھائی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔



وہ ایک ہیوی موٹر بائیک پر سوار تھا۔ اس نے جینز کے اوپر براؤن کلر کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کے بازوؤں کی مچھلیاں کسی ریسلر کی طرح نمایاں ہو رہی تھیں۔ آنکھوں پہ رنگین چشمہ تھا گلے میں غنڈوں کی طرح سرخ رنگ کا رومال بندھا ہوا تھا۔ وہ موٹر بائیک کو یوں دوڑا رہا تھا جیسے بہت زیادہ عجلت میں ہو۔ کلین شیو چہرے سے وہ کوئی بگڑا ہوا رئیس زادہ لگتا تھا۔

مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا وہ ان تنگ و تاریک اور بدنام گلیوں میں پہنچ گیا جہاں شرفا رات کی تاریکی میں بھی جاتے ہوئے گھبراتے تھے مگر اس کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے۔ تنگ گلیوں میں سے گزرتا ہوا وہ ایک قدرے کھلی جگہ پر پہنچ گیا۔ سامنے ہی کسی بار کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ باہر پارکنگ میں اس نے موٹر بائیک روکی اور اگنیشن سے چابی نکالنے کے بعد بار کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

بار کا وسیع و عریض ہال زیرِ زمین تھا جبکہ اوپر مارکیٹ تھی جس میں مختلف تھوک کی دکانیں تھیں نوجوان سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے اترا اور بار کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ جونہی دروازہ کھول کر اس نے ہال کے اندر قدم رکھا ایک مسلح پہریدار نے اسے روک دیا۔

"اے اے منہ اٹھا کر کدھر جا رہے ہو؟" پہریدار نے طنزیہ انداز میں سوال کیا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

نوجوان نے شانِ بے نیازی سے چشمہ اتارا، پھونک مار کر شیشے صاف کیے اور چشمے کو بیلٹ میں اٹکانے کے بعد بولا۔ "تم مجھے نہیں جانتے؟ مطلب بادشاہ کو نہیں جانتے۔ افسوس ہوا یہ سن کر"۔

"کون بادشاہ بھئی؟" پہریدار نے بدستور مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ "اس ملک میں جمہوریت چلتی ہے یا پھر مارشل لاء...... تم کہاں کے بادشاہ ہو، ذرا اپنی شناخت تو کراؤ تا کہ......"

"یہ ہے میری پہچان"۔ پہریدار کی بات پوری ہونے سے قبل ہی نوجوان کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کا فولادی گھونسہ سیدھا پہریدار کے چہرے پر پڑا۔

پہریدار چیختا ہوا پشت کے بل پختہ فرش پر گر پڑا۔ نوجوان نے ایک جھٹکے سے بیلٹ کی پشت میں اڑسا ہوا پسٹول نکالا اور پہریدار پر تانتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں ہو گئی ناں پہچان یا پھر دوبارہ سے کراؤں؟"

بار کے ہال میں مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ متحیر انداز میں نوجوان اور پہریدار کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ لمحاتی طور پر انہوں نے پینا پلانا اور پتے پھینکنا روک دیا تھا۔ اچانک کاؤنٹر

کے عقب سے چند مسلح غنڈے نمودار ہوئے اور دندناتے ہوئے نوجوان کے سر پر پہنچ گئے۔ انہوں نے کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوئے تھے اور ان کی رائفلوں کے دہانے نوجوان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ ان کی انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں اور وہ ایک اشارے کے منتظر تھے۔

''رائفلیں نیچی''۔ نوجوان نے حکمیہ انداز میں کہا۔ ''اور بار کے مالک بابو بھائی کو بلاؤ۔ بولو تیرا باپ آیا ہوا ہے ملنے کے واسطے''۔

''ارباب صاحب بول''۔ ایک غنڈے نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس ایریا بادشاہ ہے، کوئی گلی کا غنڈہ نہیں ہے''۔

''ہر بادشاہ کے اوپر ایک اور بادشاہ ہوتا ہے''۔ نوجوان نے شانِ بے نیازی سے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کو گھمانا شروع کر دیا۔ ''آج سے اس ایریے کا بادشاہ میں ہوں، جاؤ بھائی سے جا کر بولو کہ اس کے بار میں بادشاہ آیا ہے، ہمارے استقبال کی تیاری کرے''۔

''تم شاید مرنے کے لیے اِدھر آ گئے ہو، ٹھیک ہے میں تمہاری یہ خواہش......''

غنڈے کی بات پوری ہونے سے قبل ہی نوجوان نے کسی چھلاوے کی طرح جست لگائی غنڈے کے ہاتھ سے رائفل نکل کر فرش پر گر پڑی۔ پلک جھپکنے کی دیر میں نوجوان کا پستول غنڈے کنپٹی کو چھو رہا تھا۔

''تجھے بتایا تھا ناں! کہ میں بادشاہ ہوں''۔ نوجوان سرد لہجے میں غرایا۔ ''لیکن شاید تم مولیٰ کے مالک ہو اور مفت میں اپنے بچوں کو یتیم کرانا چاہتے ہو''۔

اتنا کہہ کر نوجوان باقی غنڈوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''کوئی بھی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ خمیازہ تمہارے ساتھی کو بھگتنا پڑ جائے گا۔ اگر اس کی زندگی چاہتے ہو تو جا کر بابو بھائی بول دو کہ بادشاہ آ چکا ہے''۔

تینوں غنڈے کشمکش کے عالم میں اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگے جو بری طرح نوجوان شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

''تمہارے ساتھی تمہارے اشارے کے منتظر ہیں''۔ نوجوان نے اس کی کنپٹی پر پستول کا دباتے ہوئے کہا۔ ''بولو ورنہ ہمیشہ کے لیے بولتی بند ہو جائے گی''۔

''ب...... با...... ارباب بھائی سے جا کر بولو...... کک...... کہ باد...... شاہ اُس چاہتا ہے''۔ اس نے اٹکتے ہوئے لہجے میں اپنے ساتھیوں کو حکم سنایا۔

''ارباب بھائی اس سے ملیں گے؟'' ایک غنڈے نے نخوت سے کہا۔ ''کنپٹی پر پستول کیا تمہارا دماغ''۔



''بادشاہ کو فوراً میرے پاس لے آؤ''۔ ہال میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر سے ایک تحکمانہ آواز ابھری اور نوجوان کے لبوں پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

''اب تو پتہ چل گیا ہے ناں کہ بادشاہ کون ہے؟'' نوجوان غنڈے کی کنپٹی سے پستول ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ تمہارا بابو بھائی مجھے بادشاہ کہہ کر نہ بلواتا۔ اب اگر تمہیں تکلیف محسوس نہ ہو تو مجھے بابو بھائی کے پاس لے چلو''۔

''آئیے جناب!'' وہی غنڈہ بولا جس کی کنپٹی پر پستول رکھا گیا تھا۔ ''معاف کرنا ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ ارباب بھائی کے مہمان ہیں ورنہ ہم سے یہ گستاخی کبھی نہ ہوتی''۔

''او کے کوئی بات نہیں''۔ نوجوان نے جواب دیا اور پھر اس غنڈے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گیا۔ دونوں ہال کے ایک دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک راہداری تھی جو دور تک چلی گئی تھی، راہداری کے دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد غنڈہ دائیں ہاتھ موجود ایک کمرے کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازے پر ایک نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر بار کے مالک ارباب خان کا نام لکھا ہوا تھا۔ غنڈے نے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ ''یس کم اِن، دروازہ کھلا ہے''۔

''تشریف لے چلیے جناب''۔ غنڈہ، نوجوان سے بولا۔ ''باس آپ کے منتظر ہیں''۔

نوجوان نے سر کو اثباتی جنبش دی، دروازہ کھولا اور خود اعتمادی سے چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اندر سے کمرے کو دفتری انداز میں سجایا گیا تھا، ساگوان کی ایک بھاری اور نفیس میز کے پیچھے ایک آرام دہ سیٹ پر ارباب خان بیٹھا تھا۔ ارباب کی عمر پینتالیس اور پچاس برس کے درمیان نظر آ رہی تھی وہ ایک صحت مند اور گورا چٹا شخص تھا۔ روایتی پٹھانوں کی طرح اس نے کافی موٹی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ اس نے سیٹ سے اٹھ کر نوجوان سے ہاتھ ملایا اور پھر صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''تشریف رکھیے جناب! میں اپنے آدمیوں کی طرف سے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، دراصل مجھے بھی تھوڑی دیر قبل ہی آپ کی آمد کے بارے میں بتایا گیا ہے ورنہ میں بار کے صدر دروازے پر آپ کا استقبال کرتا''۔

''فون پر کچھ احکامات بھی آپ کو سنائے گئے ہوں گے''۔ نوجوان صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ وہ احکامات مجھے بتانا پسند فرمائیں گے''۔

''کیوں نہیں جناب!'' وہ خوشگوار انداز میں بولا۔ ''مجھے آپ سے ہر قسم کا تعاون کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور آپ کے متعلق سب کچھ بتا دیا گیا ہے، آپ کتنا عرصہ یہاں قیام فرمائیں گے؟''

''عرصے کا تعین ابھی تک نہیں کیا گیا''۔ نوجوان نے کہا۔ ''بہر حال مشن کی تکمیل تک تو میرا

قیام یہیں رہے گا، اس میں چند دن بھی لگ سکتے ہیں اور یہ قیام طویل بھی ہوسکتا ہے''۔

''ٹھیک ہے جناب''۔ ارباب خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی آج سے اس بار میں کام کرنے والے تمام لوگ آپ کے نوکر ہیں۔ آپ کا جب تک جی چاہے یہاں قیام کریں''۔ اتنا کہنے کے بعد ارباب خان نے انٹرکام پر کولڈ ڈرنک لانے کا حکم دے دیا۔

''آپ کو یقیناً یہ بھی تاکید کر دی گئی ہوگی کہ میری اصلیت مخفی رہنی چاہیے''۔ جونہی ارباب خان نے انٹرکام کا ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھا نوجوان نے کہا۔ ''آپ کے علاوہ یہاں کسی کو بھی میری اصلیت معلوم نہیں ہے، اس لیے نہایت محتاط رہنا ورنہ نقصان کے ذمہ دار تم خود ہوگے''۔

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب''۔ وہ بولا۔ ''میں سب سمجھتا ہوں، بھولے سے بھی آپ کی اصلیت میں کسی کے سامنے ظاہر نہیں کروں گا''۔

''او کے''۔ نوجوان نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''بار کے جتنے بھی ملازمین ہیں ان کے سامنے بادشاہ کے نام سے میرا تعارف کروا دیں''۔

''آج ہی کروا دوں گا جناب''۔ وہ بولا۔ ''ویسے بار کے گیٹ پر کھڑے ہوئے پہریدار کو تو آپ نے اپنا تعارف اچھی طرح کروا دیا ہے''۔

''یہ ضروری تھا بابو بھائی''۔ نوجوان نے ہنس کر کہا۔ ''میں اس وقت بادشاہ نامی غنڈے کے بہروپ میں ہوں جو بہت ہتھ چھٹ ہے اور کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا حتیٰ کہ قانون بھی اس سے کترا کر گزر جاتا ہے، اب اس بار میں ایسے واقعات ہوتے رہیں گے کیونکہ یہ ہمارے پلان کا حصہ ہیں لیکن آپ بے فکر رہیں آپ کا جو بھی نقصان ہوگا وہ پورا کر دیا جائے گا''۔

''نقصان کی پرواہ کون کرتا ہے جناب''۔ وہ بولا۔ ''بے شک آپ اس بار کو آگ لگا دیں، میں اُف تک نہیں کروں گا۔ آپ ہی لوگوں کی مہربانی سے تو میرا دھندا چل رہا ہے''۔

''اگر آپ نے تعاون جاری رکھا تو ان مہربانیوں میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ صاحب نے کچھ سوچ کر ہی آپ کے بار کا انتخاب کیا ہے ورنہ شہر میں اور بھی تو ایسی جگہیں ہیں جہاں ہمارا کام چل سکتا تھا''۔ نوجوان نے جواب دیا اور ارباب خان اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

اسی دوران ایک ملازم کولڈ ڈرنک اٹھائے اندر داخل ہوا اور انہوں نے وقتی طور پر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ملازم نے دونوں کو کولڈ ڈرنک پیش کیا اور اُلٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

''صاحب نے فون کرنے کا بتایا تھا کیا؟'' ملازم کے باہر نکلتے ہی نوجوان نے استفسار کیا۔



''بتایا تھا جناب''۔ وہ بولا۔ ''ابھی کچھ ہی دیر پہلے میری ان سے بات ہوئی ہے، ان کا فون بس آنے ہی والا ہوگا۔ آپ کولڈ ڈرنک......''

معاً فون کی بیل بجنے لگی اور ارباب خان کی بات ادھوری رہ گئی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا دیا۔ ''ہیلو...... جی جی بابو بھائی بول رہا ہوں''۔

لمحہ بھر کے لیے وہ دوسری طرف کی آواز سنتا رہا اور پھر ریسیور نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بات کریں جناب! صاحب لائن پر ہیں''۔

''ہیلو'' نوجوان نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''بادشاہ بول رہا ہوں سر''۔

''ہاں سناؤ''۔ دوسری طرف سے ایک بارعب آواز سنائی دی۔ ''کیسا لگا ایک غنڈے کا بہروپ؟ کسی قسم کی کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی ناں؟''

''نہیں سر! کوئی پریشانی نہیں ہے''۔ وہ بولا۔ ''اور یہ روپ بھی اچھا لگ رہا ہے''۔

''بابو بھائی تعاون تو کر رہا ہے ناں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ''میں نے اسے تاکید کر دی ہے کہ بادشاہ کا ہر طرح سے خیال رکھنا ہے''۔

''جی جناب! بابو بھائی بہت اچھا انسان ہے اور دل و جان سے تعاون کر رہا ہے''۔ نوجوان نے جواب دیا۔

''او کے پھر آج سے ہی پلان کے مطابق کام شروع کر دو۔ میں فون پر صورتِ حال معلوم کرتا رہوں گا''۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔

''بہت بہتر سر''۔ وہ بولا۔ ''میں آج سے ہی منصوبے پر عمل شروع کر دیتا ہوں، آپ بے فکر رہیں''۔

''خدا حافظ''۔ دوسری طرف سے اجازت طلب انداز میں کہا گیا اور نوجوان نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''کیا کہہ رہے تھے صاحب؟'' اس کے ریسیور رکھتے ہی بابو بھائی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بابو بھائی! صاحب آپ سے خوش ہیں آپ کی تعریف کر رہے تھے''۔ نوجوان نے جواب دیا اور بابو بھائی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

•|• ===•|• ===•|•

نعیم بنگش چند روز سے انگاروں پر لوٹ رہا تھا، ڈاکٹر شہناز نے جس طرح اسے نظر انداز کیا تھا وہ اسے بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے ہاں دولت کی فراوانی دیکھتا آ رہا تھا اس لیے

عام مادی چیزوں سمیت انسان کو بھی بکاؤ مال سمجھتا تھا مگر ڈاکٹر شہناز سے ٹکرا کر اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ انسانوں کے لیے آسائشوں سے زیادہ خودداری اور عزتِ نفس زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ابراہیم بنگش اسے بار بار صبر کرنے کی تاکید کر رہا تھا مگر وہ بڑے بھائی کی کوئی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا شمار دراصل لوگوں کی اس قسم میں ہوتا تھا جو گرم گرم کھا کر اپنا منہ جلا بیٹھتے ہیں، ٹھنڈا کر کے کھانے کی انہیں عادت ہی نہیں ہوتی۔

پچھلے ایک گھنٹے سے وہ برابر ابراہیم بنگش کا دماغ چاٹ رہا تھا۔ وہ اگر اس کا چھوٹا بھائی نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ اسے گولی مار چکا ہوتا مگر بیٹوں جیسے بھائی کے بارے میں وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے اسے ناصحانہ انداز میں سمجھانے پر اکتفا کر رہا تھا۔

"دیکھو فہیم!" ابراہیم بنگش ملتجی انداز میں گویا ہوا۔ "تم یہ بے جا ضد چھوڑ دو، میں تمہارے باپ کی جگہ ہو کر تم سے گزارش کر رہا ہوں، پلیز میری بات مان لو اور ڈاکٹر شہناز کا خیال دل سے نکال دو۔ یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر رہے گا۔"

"میں اپنی انسلٹ کیسے بھول جاؤں؟" وہ زہر خند انداز میں بولا۔ "وہ مجھ سے بیاہ کر لیتی تو کیا اس کی شان گھٹ جاتی؟ اب تو میں اس کی نظریں جھکا کر ہی دم لوں گا۔"

"چاہے اس کی نظریں جھکاتے جھکاتے تمہاری زندگی کیوں نہ داؤ پر لگ جائے۔" بنگش نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ہر لڑکی کو بکاؤ کیوں سمجھتے ہو؟"

"میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے اس کا غرور خاک میں ملانا ہے۔" اس نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ موسیٰ خان کی مہمان ہے اور میں موسیٰ خان سے مفت کی دشمنی مول لینا......"

"مہمان نہیں قیدی ہے وہ موسیٰ خان کی۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "ایک قیدی کی خاطر موسیٰ خان آپ سے تعلقات خراب نہیں کرے گا اور پھر کون سا موسیٰ خان ہر وقت اس کے پہرے پر ہوتا ہے؟ حویلی میں اور لوگ بھی تو ہیں کسی پر بھی یہ الزام تھوپا جا سکتا ہے؟"

"کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔" بنگش نے طنز سے کہا۔ "وہ تمہیں دیکھ چکی ہے اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ وہ کوئی نابینا نہیں ہے کہ کسی اور پر الزام لگ جائے، اس کا پیچھا چھوڑ دو، اس شہر میں بکنے والیوں کی کمی نہیں ہے تم کہیں بھی جا کر منہ کالا کر سکتے ہو۔"

"میرے پورے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔" وہ غصے سے چلا کر بولا۔ "آج تک مجھے اس قدر بے عزت کسی نے نہیں کیا جتنا اس دو ٹکے کی ڈاکٹر نے کیا ہے۔ میں کیسے فراموش کر دوں اس بے عزتی کو؟ آپ کو موسیٰ خان کی دوستی کا تو بہت خیال ہے لیکن میری بے عزتی آپ کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی اُلٹا آپ مجھے کسی بکنے والی کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟"



"اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں؟" بنگش نے زچ ہو کر دانت پیستے ہوئے کہا۔ "مجھے موسیٰ خان کی دوستی کا خیال کیسے نہیں ہوگا؟ اسی کی مہربانیوں سے تو آج میں اس مقام پر ہوں۔ اسے دشمن بنا لیا تو چند روز میں محل سے فٹ پاتھ پر آ جاؤں گا۔ یہ ساری شان و شوکت جو تم دیکھ رہے ہو اسی خان کی مرہونِ منت ہے، خدارا! باز آ جاؤ اس ارادے سے کیوں کہ اس کا انجام بہت ہی برا ہو گا۔"

"انجام کی پروا بزدل کرتے ہیں۔" وہ بپھر کر بولا۔ "اور میں بزدل نہیں ہوں، آپ بے شک میرا ساتھ نہ دیں۔ میں خود اپنا انتقام لے سکتا ہوں۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" اس نے بھڑک کر کہا۔ "اور نہ ہی حویلی کے اس حصے کی طرف جاؤ گے جہاں ڈاکٹر شہناز کا قیام ہے، یہ میرا حکم ہے، اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔"

"واہ بھائی جان واہ۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنس کر بولا۔ "آج آپ کی محبت کا بھی پول کھل گیا۔ آپ کو اپنا اسٹیٹس مجھ سے زیادہ عزیز ہے ورنہ آپ میرا درد ضرور محسوس کرتے۔ اس لڑکی نے یہاں چوٹ پہنچائی ہے یہاں۔" دایاں ہاتھ دل پر رکھتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی۔ "مگر آپ کو اس کی کیا پروا؟ دل تو میرا دکھا ہے ناں، ظاہر ہے دکھ بھی مجھے ہی پہنچے گا، لیکن میں اس دکھ کا مداوا کرنا جانتا ہوں، مجھے آپ کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہاں سے ابھی واپس جا رہا ہوں اور کبھی واپس نہیں لوٹوں گا۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"رکو فہیم!" بنگش نے چلا کر آواز دی۔ "تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو، میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں اور تمہیں سلامت دیکھنا چاہتا ہوں۔ پلیز میری بات سنو۔"

بنگش آوازیں دیتا رہ گیا مگر وہ واپس نہیں پلٹا۔

=== ===

بابو بھائی کا بار شہر کے چھٹے ہوئے غنڈوں کی آماجگاہ تھا، وہاں منشیات اور جوئے کا کاروبار ہوتا تھا۔ قانون کے محافظوں کو بابو بھائی ہر ہفتے معقول بھتہ دیتا تھا اس لیے اس کا یہ کاروبار غیر قانونی ہوتے ہوئے بھی قانونی تھا۔ ویسے بھی بابو بھائی کا بار شہر کے جس علاقے میں تھا وہ پورے شہر کا بدنام علاقہ تھا، شرفاء انتہائی مجبوری کے عالم میں بھی اس علاقے کی طرف نہیں پھٹکتے تھے۔

بابو بھائی بے شک ایک نامی گرامی غنڈہ تھا مگر تھا بڑا با اصول شخص۔ آج تک اس نے کسی بھی

شریف یا غریب شخص کو نہیں چھیڑا تھا تاہم غنڈوں بدمعاشوں کو معاف کرنے کا بالکل قائل نہ
بادشاہ نامی نوجوان کو اس نے اس قدر اہمیت شہر کی ایک بڑی ہستی کے کہنے پر دے رکھی تھی
جس طریقے سے بار کے اندر داخل ہوا تھا، اس نے بابو بھائی کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی ورنہ
عین اسی وقت اس بڑی ہستی کا فون آ گیا تھا اور بابو بھائی کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا، نہیں تو اس
بادشاہ کا قصہ تمام کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

بادشاہ نے اسی روز اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا تھا۔ بڑے صاحب نے اس کے ذمے
کام لگایا تھا وہ کام بہرکیف اسے کسی نہ کسی طرح سرانجام دینا ہی تھا

اس روز بھی منصوبے کے مطابق بادشاہ جوئے کی محفل سجائے ہوئے بیٹھا تھا۔ دیگر میزوں پر
بھی جوا ہو رہا تھا۔ بابو بھائی کے مسلح غنڈے پورے ہال میں چوکنا انداز میں گھوم رہے تھے۔ جو
بھی کھیل میں تھوڑی سی بے ایمانی کا مرتکب ہوتا، مسلح غنڈے اسے اٹھا کر ہال سے باہر پھینکنے میں
نہیں لگاتے تھے۔

بادشاہ کی میز پر اس وقت دو قبائلی بیٹھے ہوئے تھے، دونوں روایتی لباس میں ملبوس تھے
بڑی پگڑیاں، کھلی شلوار قمیص اور واسکٹ، یہ لباس انہیں پورے ہال میں نمایاں کر رہا تھا اور گاہے بگاہے
کوئی نہ کوئی جواری انہیں متعجب نگاہوں سے دیکھ لیتا تھا۔ اب تک وہ تین بازیاں کھیل چکے تھے
تینوں کی تینوں بادشاہ نے جیتی تھیں۔ چوتھی بازی شروع کرنے سے قبل ایک قبائلی ذرا سخت لہجے میں
بادشاہ سے مخاطب ہوا۔ ''اس بار پتے ام پینٹے گا، تم ٹھیک سے نئیں پینٹا''۔

''خان صاحب! جوئے کے کچھ اصول ہوتے ہیں''۔ بادشاہ تاش کی گڈی کی طرف
بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پتے پھینٹنا اور بانٹنا جیتنے والے کا حق ہوتا ہے۔ مجھے بے اصولی پسند نہیں
ہے''۔

''توم سمجا نئیں اماری بات''۔ قبائلی بولا۔ ''ام نے پتے بانٹنے کی نئیں پینٹنے کا بات کی اے''
''پھینٹوں گا بھی میں اور بانٹوں گا بھی میں''۔ بادشاہ نے اکھڑ انداز میں جواب دیا اور
گڈی اٹھالی۔

قبائلی نے نتھنے پھلاتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا اور بادشاہ کی کلائی پکڑ لی''۔ توم
اے''۔ وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔ ''امارا نام رحم دِل خان اے پر آم بوہت ظالم اے۔ ام جو کہتا
کرتا بی اے''۔

''اور میں کہنے سے پہلے کر دیتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر بادشاہ نے زور سے اپنی کلائی کو جھٹکا
قبائلی کا توازن بگڑا اور وہ کرسی سمیت فرش پر الٹ گیا، اس کی پگڑی فرش پر کھلتی چلی گئی تھی۔



بادشاہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گرنے والے قبائلی کا دوسرا ساتھی بھی اپنی کرسی کو پیچھے
دھکیلتے ہوئے برق رفتاری سے اٹھا تھا جبکہ گرا ہوا قبائلی بادشاہ کی شان میں قصیدہ گوئی کرتے ہوئے
کھڑا ہو چکا تھا۔ اس دوران ہال میں گھومنے والے غنڈے اور دیگر جواری لوگ بھی معاملے جاننے کی
غرض سے ان کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔

''خنزیر کا بچہ!'' گرنے والے قبائلی نے لال لال آنکھوں سے بادشاہ کو گھورتے ہوئے کہا۔
''تم نے رحم دِل خان پر ہاتھ اٹھا کر اچا نئیں کیا، ام ابی تمارا پیٹ پھاڑ دے گا''۔

''ادھر دادا گیری نہیں چلتی خان صاحب''۔ بادشاہ کی بجائے غنڈوں کے لیڈر نے کہا۔ ''یہاں
لڑنے کی اجازت نہیں ہے، جو بھی معاملہ ہے تم لوگ باہر جا کر نمٹا سکتے ہو''۔

''امارا بیچ بولنے والا تم کون اوتا اے؟'' رحم دل خان نے گرج کر کہا۔ ''ام اِدر ہی اس خنزیر کے
ٹکڑے کرے گا''۔

اتنا کہہ کر اس نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کمانی دار چاقو نکال کر کھولنے
لگا جبکہ اس کے دوسرے ساتھی کے ہاتھ میں ایک خوفناک ریوالور نظر آ رہا تھا۔

اِدھر رحم دل خان کا چاقو کڑکڑاتی ہوئی آواز کے ساتھ کھلا اور ادھر بادشاہ کے ہاتھ میں بھی
پستول نظر آنے لگا تھا۔

''اپنے اپنے ہتھیار جیب میں رکھ لو''۔ غنڈہ لیڈر نے گن سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ ہم
گولی چلانے پر مجبور ہو جائیں گے''۔

''نہیں''۔ بادشاہ سرد لہجے میں بولا۔ ''یہ میرا اور رحم دل خان کا معاملہ ہے کسی کو بھی بیچ میں آنے
کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ صرف تماشا دیکھو''۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے رحم دل خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا سمجھتے
ہو میں صرف تاش کھیلنا جانتا ہوں، لڑنا نہیں جانتا؟ ہمت ہے تو آگے بڑھو''۔

''ہتھیار ہاتھ میں ہو تو بزدل بھی شیر بن جاتا ہے''۔ رحم دل خان کا ساتھی پہلی بار گویا ہوا، قبائلی
ہونے کے باوجود اسے اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔

''ہتھیار پہلے تم لوگوں نے نکالا تھا''۔ بادشاہ بولا۔ ''ورنہ میں تو خالی ہاتھ بھی لڑنے کے لیے
تیار ہوں، تم دونوں میں سے اپنی طاقت پر جسے گھمنڈ ہے وہ ہتھیار پھینک کر آگے آ جائے، میں اسے نا
مرد نہیں کروں گا''۔

''ٹیک اے''۔ رحم دل خان پُر جوش انداز میں بولا۔ ''ام خالی ہات لڑنے کو تیار اے''۔
اتنا کہہ کر اس نے چاقو بند کیا اور پھر اپنے ساتھی کو تھما دیا۔ غنڈہ لیڈر نے آگے بڑھ کر پہلے

بادشاہ سے پستول لیا اور اس کے بعد رحم دل خان کے ساتھی سے ریوالور اور چاقو سنبھال لیا۔

چند لمحوں کے بعد بادشاہ اور رحم دل خان ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے نظروں نظروں میں ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ ہال کے اس کونے سے غنڈوں نے کرسیاں میز ہٹا کر جگہ کو کھلا کر دیا تھا۔ تماشا دیکھنے والے ایک دائرے کی صورت میں ان دونوں کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ رحم دل خان ڈیل ڈول میں بادشاہ سے دوگنا نظر آ رہا تھا تاہم بادشاہ اس کے مقابلے میں چھریرے بدن کا مالک تھا۔

دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے پر چھلانگ لگائی، ایک دھماکے سے ٹکرائے اور کم وزن ہونے کی وجہ سے بادشاہ پشت کے بل فرش سے جا ٹکرایا۔ رحمدل خان کا جسم بھی پیچھے کی جانب لڑکھڑایا مگر وہ سنبھل گیا تھا۔ بادشاہ کے گرتے ہی اس نے جست لگا کر اسے دبوچنے کی کوشش کی تھی مگر بادشاہ تڑپ کر کروٹ بدل گیا۔ رحم دل خان اپنے ہی جوش میں زور سے فرش سے جا ٹکرایا، اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی تھی۔ ایک غلیظ گالی بکتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پشت کی جانب پڑنے والی لات نے اسے دوبارہ زمین بوس کر دیا تھا۔ بادشاہ نے کسی ماہر فائٹر کی طرح برق رفتاری سے اٹھ کر اسے لات رسید کی تھی۔ تماشا دیکھنے والے جواریوں نے نعرہ لگا کر بادشاہ کو داد دی تھی۔

تماشائیوں کے نعرے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ رحم دل خان اس قدر تیزی کا مظاہرہ کر کے اٹھا کہ ایک لمحے کے لیے تو بادشاہ متحیر رہ گیا، پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، رحم دل خان تقریباً اڑ کر اس سے ٹکرایا اور اسے ساتھ لیتا ہوا تیسری مرتبہ فرش بوس ہو گیا۔ رحم دل خان کے دونوں ہاتھ کسی شکنجے کی طرح اس کی گردن کے گرد کسے ہوئے تھے۔ بادشاہ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس نے پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ رحم دل خان کسی عفریت کی طرح اس کے ساتھ لپٹا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ لمحہ بہ لمحہ اس کی گردن کو کستے جا رہے تھے۔ ”دست بدست لڑائی جیتنے کے لیے دشمن کے نازک مقام پر وار کرو“۔ معاً برسوں پہلے کہے گئے یہ الفاظ بادشاہ کی سماعتوں سے ٹکرائے اور دوسرے ہی لمحے رحم دل خان کے منہ سے ”اوئی“ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ بادشاہ نے لیٹے لیٹے ہی اپنا دایاں گھٹنا پوری طاقت کے ساتھ رحم دل خان کی دونوں ٹانگوں کے بیچ نازک مقام پر رسید کر دیا تھا۔

”اوئی“۔ کی آواز کے ساتھ ہی رحم دل خان کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ بادشاہ نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن آزاد کرائی اور پھر پلک جھپکنے کی دیر میں دائیں ہاتھ کا مکا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ رحم دل خان ابھی پہلی چوٹ سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ ناک پر پڑنے والے مکے نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔ بلبلاتے ہوئے اس نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا، بادشاہ کے سنبھلنے کے لیے



کافی تھا۔ رحم دل خان کو دھکیل کر وہ برق رفتاری سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ کچھ اس طرح تیزی سے پیر چلا رہا تھا کہ رحم دل خان کو اٹھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

تماشائی اب کھلے دل سے بادشاہ کو داد دے رہے تھے جبکہ رحم دل خان ہال کے پختہ فرش پر رینگتے ہوئے بادشاہ کو پشتو زبان میں گالیاں دیے جا رہا تھا۔ بادشاہ گالیوں کی پرواہ کیے بغیر اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کر رہا تھا جیسے کوئی احمق دیہاتی کھلاڑی فٹ بال کے ساتھ کرتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد رحم دل خان ہال کے پختہ فرش پر بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت بالکل اس پرانے کمبل کی سی ہو گئی تھی جس کے ساتھ رات بھر کتے کھیلتے رہے ہوں۔

اس کے بے ہوش ہوتے ہی بادشاہ نے اسے چھوڑ دیا۔ اس چند منٹوں کی لڑائی نے اسے پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔ اس نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور چہرہ صاف کرتے ہوئے رحم دل خان کے ساتھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تمہیں بھی اگر قوت آزمانے کا شوق ہے تو آ جاؤ، دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ اگر تم جیت گئے تو میرا وعدہ ہے میں جیتی ہوئی رقم تم لوگوں کو واپس کر دوں گا“۔

”نہیں“۔ وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھا اور فرش پر بے ہوش پڑے ہوئے رحمدل خان پر جھک گیا۔

بادشاہ نے غنڈہ لیڈر سے اپنا پستول لیا، اس کے بعد جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر بے ہوش پڑے ہوئے رحم دل خان پر پھینکتے ہوئے اس کے ساتھی سے بولا۔ ”ڈاکٹر سے اس کی پٹی کرا لینا“۔

اتنا کہہ کر وہ پلٹا، چند قدم آگے بڑھا مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ ”اور ہاں“۔ وہ رحم دل خان کے ساتھی سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”مجھ سے اگر بدلہ لینے کے لیے طبیعت مچلے تو دوبارہ اسی بار میں آ جانا، میں تم لوگوں کو یہیں ملوں گا۔ یہ میرا مستقل ٹھکانہ ہے“۔

اس کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہال کے اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کے دوسری طرف راہداری واقع تھی۔



خائستہ گل کے صحت یاب ہوتے ہی ناصر خان اور وہ امین خان سے اجازت لے کر حجرے سے رخصت ہو گئے۔ اب وہ دونوں مسلسل زرولی کے معمولات پر نظریں لگائے ہوئے تھے۔ انہیں کسی ایسے موقع کی تلاش تھی جب زرولی اکیلا ہو اور کسی ویران مقام پر ہوتا کہ اسے گن پوائنٹ پر آسانی اغوا کیا جا سکے مگر گزشتہ تین روز سے انہیں ایسا کوئی موقع میسر نہیں آیا تھا۔ زرولی اکیلا نکلتا ہی نہیں تھا، وہ یا گل شیر خان اور زید خان اس کے ساتھ ہوتے تھے یا پھر کبھی کبھار خان جی بھی اس کے

ساتھ نظر آ جایا کرتے تھے۔

جوں جوں دن گزرتے گئے ناصر خان اور خائستہ گل کی پریشانی بڑھتی گئی۔ امین خان تقریباً دوسرے دن انہیں بلا کر صورتِ حال کے متعلق استفسار کرتا رہتا تھا مگر ان دونوں کا جواب ہمیشہ نفی میں ہوتا تھا جس سے امین خان کی پریشانی اور بڑھ جایا کرتی تھی۔ دراصل جمال خٹک کو زبان دیئے کے بعد امین خان کی نگاہوں میں مولوی نصیب اللہ کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ مولوی صاحب نہ صرف فنِ تقریر میں ماہر تھے بلکہ علاقے کے سچے خیر خواہ اور ایماندار شخص تھے اس لیے لوگ ان کی باتوں سے حقیقتاً متاثر ہوتے تھے۔ مولوی صاحب کی عدم دستیابی سے امین خان کی انتخابی مہم متاثر ہو سکتی تھی، تبھی وہ انہیں بازیاب کرانے کے لیے مسلسل بے چین تھا۔

اس روز بھی امین خان نے صبح سویرے ناصر خان اور خائستہ گل کو حجرے میں طلب کر رکھا تھا اور بات چیت مولوی صاحب کی بازیابی کے متعلق ہی کی جارہی تھی۔ ان دونوں کو اچھی طرح انتخابی مہم کے متعلق بتانے کے بعد امین خان نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''اگر مولوی صاحب کو ہم نے چند روز کے اندر بازیاب نہ کرایا تو ہماری انتخابی مہم غیر مؤثر ہو کر رہ جائے گی۔ خان جی اپنے اوچھے ہتھ کنڈوں سے دوبارہ لوگوں کو ورغلانے میں کامیاب ہو جائے گا اور اگر وہ اس بار بھی الیکشن جیت گیا تو پھر اس علاقے کا سویا ہوا مقدر حشر تک نہیں جاگ سکے گا۔ تم دونوں کی کارکردگی بالکل ناقص ہو چکی ہے، آج کتنے روز گزر چکے ہیں مگر تم لوگ ابھی تک زرولی کو ہی اغوا نہیں کر سکے ہو مولوی صاحب کی بازیابی تو بعد کی بات ہے''۔

''زرولی ہمیں اکیلا ملا ہی کہاں ہے؟'' ناصر خان بولا۔ ''ہمیشہ کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا ہے ایسی صورتِ حال میں ہم اس پر کیسے ہاتھ ڈال سکتے ہیں؟''

''تو کیا تم لوگ اس کے اکیلا ہونے کا انتظار ہی کرتے رہو گے؟'' امین خان نے قدرے ناگوار انداز میں پوچھا۔ ''کب تک یہ انتظار چلتا رہے گا؟ خان جی کی انتخابی مہم شروع ہوئے ہفتہ ہونے کو آیا ہے جب کہ ہم ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوئے ہیں''۔

''خان صاحب!'' ناصر خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم زرولی کو لوگوں اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی میں بھی آسانی سے اغوا کر سکتے ہیں مگر اس طرح ہمارا منصوبہ کلی طور پر ناکام ہو جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اس اقدام کا نقصان مولانا صاحب کو پہنچے''۔

''تم لوگ زرولی کی نگرانی کیسے کرتے ہو؟'' امین خان نے کچھ سوچ کر استفسار کیا۔

''میرا چچا زاد بھائی گلریز اس کی نگرانی کرتا ہے، وہ صبح شام ہمیں رپورٹ دیتا ہے''۔ خائستہ گل نے جواب دیتے ہوئے بتایا۔



''اس وقت گلریز کہاں ملے گا؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہیں کہیں خان جی کی حویلی کے آس پاس ہوگا''۔ خائستہ گل بولا۔ ''مگر آپ...... کیا اس سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں''۔ امین خان نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسا آدمی ہے؟ ہوشیار ہے کہ سست؟''

''ٹھیک ہے، میں اسے بلا کر لے آتا ہوں''۔ خائستہ گل اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ اس سے مل کر تسلی کر لینا۔ ہمیں تو وہ بہت تیز آدمی......''

معاً حجرے کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور خائستہ گل کی بات ادھوری رہ گئی۔

''جاؤ دیکھو دروازے پر کون ہے؟'' امین خان نے اسے حکم دیا اور خائستہ گل تیزی سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے بعد جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو گلریز اس کے ساتھ تھا، خائستہ گل نے امین خان سے اس کا تعارف کرایا اور پھر قدرے پُرجوش انداز میں بولا۔ ''خان صاحب! گلریز بہت اہم کی خبر لے کر آیا ہے۔ زرولی آج اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کے لیے جا چکا ہے، اسے اغوا کرنے کا ایسا سنہری موقع ہمیں دوبارہ نہیں مل سکتا''۔

''اس کے ساتھ اور کون کون تھا؟'' امین خان نے فوراً سوال کیا، اس کی آواز سے جوش جھلک رہا تھا۔

''گل شیر خان اور زید خان تھے خان جی''۔ گلریز نے جھٹ سے جواب دیا۔

''جیپ لے کر گئے ہیں یا گھوڑوں پر؟'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔

''جیپ لے کر گئے ہیں جناب''۔ گلریز بولا۔ ''شکاری کتوں کی بھی ایک جوڑی ساتھ لے کر گئے ہیں''۔

''تم نے یہ دیکھا تھا کہ وہ کس جانب گئے ہیں؟'' امین خان نے پوچھا۔

''جی ہاں''۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ سیدھے مغرب کی جانب جا رہے تھے''۔

گلریز کا جواب سن کر امین خان نے سر کو اثباتی جنبش دی اور پھر سوچوں میں ڈوب گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو خان جی؟'' اُسے سوچوں میں غرق دیکھ کر ناصر خان نے سوال کیا۔

''سوچ رہا ہوں کیا وہ سچ مچ شکار کھیلنے کے لیے ہی گئے ہیں؟'' اس نے ذو معنی انداز میں کہا تو ناصر خان اور خائستہ گل الجھن آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

تمہاری الجھن بجا ہے‘‘۔ امین خان بولا۔ ’’مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے زرولی اور اس کے ساتھی شکار کی آڑ میں کوئی اور کھیل کھیلنے کے لیے گئے ہوں‘‘۔

’’کوئی اور کھیل؟‘‘ ناصر خان کی الجھن مزید بڑھ گئی اور وہ بات پوری کیے بغیر امین خان کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

’’ہاں کوئی اور کھیل‘‘۔ امین خان پُرسوچ انداز میں گویا ہوا۔ ’’شکار کا بہانہ بنا کر وہ سرحد سے منشیات یا پھر اسلحے کا سودا طے کرنے کے لیے گئے ہوں گے‘‘۔

’’آپ کا مطلب ہے کہ افغانستان کی سرحد سے......‘‘

’’تو مغرب کی طرف اور کون سی سرحد ہے؟‘‘ امین خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ضرور افغان اسمگلروں سے ملاقات کرنے کے لیے گئے ہوں گے‘‘۔

’’تو پھر اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟‘‘ ناصر خان نے پوچھا۔

’’تم لوگوں کو ضرور جانا چاہئے‘‘۔ وہ بولا۔ ’’میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ کیا پتہ وہ سچ شکار کھیلنے کے لیے ہی گئے ہوں۔ بعد میں پچھتانے سے یہ بہتر نہیں ہے کہ انسان پہلے ہی کوشش کر لے، کامیابی بتا کر تو نہیں آتی‘‘۔

’’ٹھیک ہے خان صاحب‘‘۔ ناصر خان بولا۔ ’’ہم تیاری کرتے ہیں جانے کی مگر‘‘۔

’’مگر کیا؟‘‘ اس نے استفسار کیا۔

’’زرولی اگر ہمارے ہاتھ لگ جائے تو اسے کہاں لے کر جانا ہے؟‘‘ ناصر خان نے سوال کیا۔

’’یہیں حجرے میں لے کر آنا‘‘۔ وہ بولا۔ ’’مگر خیال رہے دن کے وقت نہیں لانا، رات کا وقت ٹھیک رہے گا۔ بعد میں اسے کہیں اور منتقل کر دیں گے‘‘۔

’’ٹھیک ہے خان صاحب! ہم ابھی جانے کی تیاری کرتے ہیں‘‘۔ یہ کہہ کر ناصر خان، خائستہ گل کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ناصر خان اور خائستہ گل گھوڑوں پر سوار حجرے سے باہر نکل رہے تھے، دونوں پوری طرح مسلح تھے اور سامانِ خوردونوش بھی ان کے پاس تھا۔



فہیم بنگش اس روز اپنے منصوبے کے مطابق نیلی کوٹھی سے نکلا تھا۔ بڑے بھائی سے رخصت ہو کر وہاں سے رخصت ہونا اس کے منصوبے کا ایک اہم حصہ تھا۔ ’’نیلی کوٹھی‘‘ اس حویلی کا کوڈ نام تھا جو ابراہیم بنگش سے جڑے ہوئے صرف چند قابلِ اعتماد لوگوں کو ہی معلوم تھا۔ فہیم بنگش نے پیسوں کا لالچ دے کر حویلی کے ایک پہرے دار کو ساتھ ملا لیا تھا۔ دراصل وہ بڑے بھائی کی غیر موجودگی میں



ڈاکٹر شہناز پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے حویلی ہی کے کسی قابلِ اعتماد آدمی کو ساتھ ملانا ضروری تھا جو اسے رازداری کے ساتھ بڑے بھائی کی عدم موجودگی کی اطلاع دیتا۔

تیسرے دن تقریباً دن کے دو بجے فہیم بنگش کو بذریعہ فون حویلی کے اسی پہریدار کی جانب سے پیغام موصول ہوا کہ آج رات ابراہیم بنگش حویلی میں موجود نہیں ہوگا، لہٰذا آپ رات کے آٹھ بجے حویلی کے صدر دروازے پر پہنچ جانا، اس وقت دروازے پر میری ہی ڈیوٹی ہوگی۔

پہریدار کی جانب سے ملنے والے اس پیغام نے اس کے تن بدن میں مسرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ اٹھ کر اس نے فوراً جانے کی تیاری شروع کر دی، نیلی کوٹھی وہاں سے بہت دور تھی، جاتے جاتے پانچ چھ گھنٹے لگ جانے تھے۔ اس لیے اس نے فوراً نکل جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔

اس کی نئے ماڈل کی کار فراٹے بھرتی ہوئی تیزی سے منزل کی جانب اُڑی جا رہی تھی۔ وہ اسٹیرنگ وہیل ہاتھ میں پکڑے ڈاکٹر شہناز کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ کبھی وہ اس تصور سے محظوظ ہونے لگتا تھا اور کبھی اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہونے لگتے تھے۔ دراصل ڈاکٹر شہناز کا وہ پُرغرور رویہ اسے بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ وہ فطرتی طور پر انتہائی منتقم مزاج انسان تھا اس لیے تصور ہی تصور میں ڈاکٹر شہناز کے نازک بدن کو خونخوار درندوں کے مانند نوچ کھسوٹ رہا تھا۔

’’اوکے مس شہناز! آج رات تیرے ساتھ جو ہونے والا ہے، اس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو‘‘۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا اور پھر گاڑی کی رفتار یکدم بڑھا دی، اس کے چہرے پر درندگی کے تاثرات پھیل چکے تھے۔

شام سات بجے کے قریب وہ نیلی کوٹھی کے ایک قریبی علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے نیلی کوٹھی کا فاصلہ محض چند کلومیٹر ہی تھا۔ اس علاقے میں اس کے ایک کالج کے زمانے کے دوست کا گھر تھا۔

اس نے آگے جانے کی بجائے کار کا رخ دوست کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی وہ دوست اسے گھر میں ہی مل گیا۔

’’اوہ بنگش صاحب!‘‘ اسے دیکھتے ہی اس کا دوست ساجد آفریدی کھل اٹھا۔ ’’ارے آج کیسے ادھر آ گئے ہو بھول کے؟ بڑے بے مروت ہو یار سالوں میں ایک آدھ بار ہی شکل دکھاتے ہو‘‘۔

’’فرصت ہی نہیں ملتی دوست‘‘۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔ ’’آج بھی بس اتفاق سے ادھر نکل آیا ہوں ورنہ جا تو کہیں اور رہا تھا‘‘۔

’’نو بنگش صاحب‘‘۔ ساجد نے مسکرا کر کہا۔ ’’آج میں تمہیں کہیں بھی نہیں جانے دوں گا بلکہ کم از کم ہفتہ دس دن تمہیں میرے غریب خانے کو رونق بخشنا ہوگی‘‘۔

"صرف ایک رات"۔ وہ بولا۔ "اور وہ بھی اس صورت میں اگر میں فارغ ہو کر جلد واپس
تو تب"۔

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں"۔ ساجد نے چونک کر پوچھا۔

"تھوڑی ہی دیر میں، میں یہاں سے جانے والا ہوں"۔ اس نے کہا۔ "مجھے کچھ ضروری
نمٹانے ہیں، چار پانچ گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے، بقیہ رات آپ کے ہاں بسر کروں گا"۔

"چار پانچ گھنٹے"۔ وہ وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مطلب رات کے ایک بجے کے لگ بھگ جناب تشریف لائیں گے؟ مگر جانا کہاں ہے؟"

"ادھر نزدیک ہی جانا ہے"۔ اس نے کہا۔ "دراصل کام بھائی جان کا ہے مگر انہیں فرصت
ملی تو انہوں نے مجھے بھیج دیا۔ بہر کیف تم فکر نہ کرو میں واپس ضرور آؤں گا کیونکہ میری گاڑی یہ
رہے گی"۔

"او کے پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں"۔ ساجد بولا۔ "تمہیں بوریت نہیں ہوگی، گپ شپ لگی رہے گی اور میری آؤٹنگ بھی ہو جائے گی"۔

"ابے عقل کے اندھے! رات کو کون سی آؤٹنگ ہوئی ہے؟" وہ بات کو ہنسی میں اُڑاتے ہو
بولا۔ "میں کوئی گھومنے کے لیے تو نہیں جا رہا ہوں۔ کچھ کاروباری کام ہیں۔ کہاں میرے ساتھ
ہوتے پھرو گے؟ آؤٹنگ کے لیے کل جائیں گے"۔

"ٹھیک ہے"۔ ساجد سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر کل چل
گے"۔

تھوڑی دیر کے بعد فہیم بنگش چائے وغیرہ پینے کے بعد اس سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ پیدل چلتے ہوئے وہ ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچا اور پھر بذریعہ ٹیکسی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹھیک آٹھ بج کر دس منٹ پر وہ نیلی کوٹھی کے صدر دروازے پر موجود تھا۔ اس وقت آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی تھی۔ اس نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ یہ موسم اس کے گندے ارادے کی تکمیل کے لیے بہت ہی موافق تھا، حویلی میں رہنے والوں کو پتا بھی نہ چلتا اور وہ اپنا کام سرانجام دینے کے بعد نکل جاتا۔

وہ آگے بڑھا اور پھر صدر دروازے کی ذیلی کھڑکی پر مخصوص دستک دینے کے بعد کھڑکی کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔



ناصر خان اور خائستہ گل کو دوپہر کے بعد ہی زرولی اور اس کے ساتھی نظر آ گئے تھے، اس وقت



تینوں واقعی شکار ہی کھیل رہے تھے۔ وہ ایک وادی نما جگہ تھی اور وہاں سے افغانستان کی سرحد نزدیک تھی۔ ان کی جیپ ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑی ہوئی تھی جبکہ وہ تینوں کتوں کو ساتھ لیے وادی میں شکار کی تلاش میں بھاگتے پھر رہے تھے۔

ان پر پہلی نظر ناصر خان کی ہی پڑی تھی ورنہ خائستہ گل تو اندھا دھند گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا، اگر ناصر خان اسے آواز دے کر نہ روکتا تو وہ سیدھا زرولی اور ان کے ساتھیوں کے سامنے ہی جا رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ناصر خان نے اپنا گھوڑا ایک ٹیکری کی آڑ میں روک کر خائستہ گل کو آگے بڑھنے سے منع کر دیا۔ دونوں گھوڑوں کو اسی ٹیکری کے عقب میں الگ الگ جھاڑی کے ساتھ باندھنے کے بعد وہ وہیں رک کر مشورہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ خائستہ گل کا ارادہ یہ تھا کہ فوراً ان پر حملہ کر دیا جائے مگر ناصر خان کبھی اس کے احمقانہ مشوروں پر غور نہیں کیا کرتا تھا۔

"تم یہ معاملہ طاقت کے ذریعے ہی حل کرنا کیوں ضروری سمجھتے ہو؟" اس کا مشورہ سننے کے بعد ناصر خان نے منہ بنا کر پوچھا۔ "کیا یہ ایک احمقانہ قدم نہیں ہوگا؟ یہ کام وہاں گاؤں میں بھی تو سرانجام دے سکتے تھے؟"

"میں نے مشورہ دیا تھا"۔ خائستہ گل نے چڑ کر کہا۔ "اس پر عمل کرنے کا تو نہیں کہا ہے؟"

"تم زندگی بھر احمق کے احمق ہی رہو گے، خائستہ گل"۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "مشورہ تو دیا ہی عمل کرنے کے لیے جاتا ہے بیوقوف"۔

"اچھا اچھا اب جو کرنا ہے کرو، وقت ضائع ہو رہا ہے"۔ خائستہ گل نے حسبِ معمول منہ بسور کر جواب دیا اور ناصر خان فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

"ہمیں چھپ چھپ کر ان پر نگاہ رکھنا ہوگی"۔ ناصر خان قدرے توقف کے بعد بولا۔ "جونہی زرولی اپنے ساتھیوں سے ذرا دور ہوگا ہم اس پر جھپٹ پڑیں گے اور اسے بے ہوش کرنے کے بعد اٹھا کر لے چلیں گے"۔

"وہ اگر اپنے ساتھیوں سے الگ نہ ہوا تو کیا ہم سارا دن یہ آنکھ مچولی ہی کھیلتے رہیں گے"۔ خائستہ گل نے جل کر جواب دیا۔

"وہ یہاں شکار کھیلنے کے لیے آئے ہیں"۔ وہ بولا۔ "شہری بابوؤں والی پکنک منانے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ زرولی ان سے کسی نہ کسی موقع پر الگ ضرور ہوگا"۔

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور خائستہ گل کو اس کی تقلید کرنا پڑی۔

جھاڑیوں اور ٹیکریوں کی آڑ سے وہ دونوں انہیں دیکھتے رہے مگر کافی دیر گزر جانے کے باوجود زرولی اپنے ساتھیوں سے الگ نہ ہوا تو ناصر خان کی پریشانی بڑھ گئی۔ اس دوران زرولی اور اس کے

ساتھی تین چار خرگوش بھی شکار کر چکے تھے، جنہیں انہوں نے ذبح کرنے کے بعد جیپ میں رکھ دیا تھا۔

اب وہ تینوں اس جیپ والے درخت کے نیچے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، جبکہ ناصر خان اور خائستہ گل ان سے تھوڑی دور ایک ٹیکری کی آڑ میں موجود تھے، دونوں کی نگاہیں زرولی پر ٹکی ہوئی تھیں جو بڑے مزے سے کھانا کھاتے ہوئے ساتھیوں سے گپ شپ لگا رہا تھا۔

''یہ تو یہاں سے اٹھنے والے نہیں لگتے''۔ خائستہ گل انہیں آرام کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر ناصر خان سے بولا۔ ''چلو واپس چلتے ہیں''۔

''آہستہ بولو''۔ ناصر خان تنبیہی انداز میں بولا۔ ''ہم ان سے پہلے واپس نہیں جائیں گے''۔

''ٹھیک ہے''۔ خائستہ گل اکتا کر بولا۔ ''تم شوق سے کرتے رہو یہ نظارا، میں تو اب تھک گیا ہوں''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ وہیں ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب اس کا رخ مخالف سمت میں تھا جبکہ ناصر خان کی نگاہیں بدستور ان لوگوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو زرولی اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا، وہ دونوں ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا مگر درمیانی فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی آواز ناصر خان کی سماعتوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ساتھیوں سے کچھ کہہ کر زرولی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ناصر خان کے اعصاب تن گئے۔

''اے خائستہ گل!'' وہ پلٹے بغیر بولا۔ ''وہ دیکھو زرولی کہیں جا رہا ہے''۔

''کیا سچ مچ جا رہا ہے؟'' خائستہ گل نے پُرشوق انداز میں سوال کیا اور فوراً اٹھ کر اس کے نزدیک پہنچ گیا مگر تب تک زرولی ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر فطرت کی پکار پر لبیک کہہ رہا تھا۔

''یہ کتے کا بچہ تو زمین گندی کر رہا ہے''۔ اسے دیکھ کر خائستہ گل نے جل کر کہا۔ ''جی چاہتا ہے گولی سے اُڑا دوں حرام زادے کو کتنے گھنٹوں سے ہمیں خوار کر رہا ہے''۔

''کامیابی آسانی سے نہیں ملتی بچے!'' ناصر خان اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے بولا۔ ''کامیابی حاصل کرنے کے لیے جان مارنا پڑتی ہے''۔

''صبح سے اب تک ہم جان ہی تو مار رہے ہیں''۔ وہ جل کر بولا۔ ''جب کہ یہ حرام زادے چھاؤں میں بیٹھ کر مزے کر رہے ہیں۔ یہ سب مولانا صاحب کا کیا دھرا ہے۔ اگر وہ.....''

''یہ عورتیں کی طرح ہر وقت شکایات کے دفتر کھول کر نہ بیٹھ جایا کرو''۔ ناصر خان نے قطع کلامی



کرتے ہوئے کہا۔ ''اوپر والے نے تجھے مرد بنایا ہے تو مردانگی دکھاؤ''۔

''ٹھیک ہے مردانگی دکھاتا ہوں''۔ اتنا کہہ اس نے ایک دم رائفل سیدھی کر لی۔

''گدھے! رائفل نیچی کرو''۔ ناصر خان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''بنا بنایا کھیل بگاڑ دو گے، ہم زندہ پکڑنے کے لیے آئے ہیں''۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا اور دوبارہ اسی پتھر سے لگا کر بیٹھ گیا۔ ''مجھ سے بلی کا کھیل نہیں کھیلا جاتا۔ جب زرولی کہیں جانے لگے تو مجھے بتا دینا''۔ اتنا کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد زرولی جھاڑی کی آڑ سے نکل کر دوبارہ اپنے ساتھیوں کی طرف چل پڑا۔ ناصر خان کی نظریں بدستور ان لوگوں پر لگی ہوئی تھیں، وہ تینوں اب پھر باتوں میں مشغول تھے۔ یہ گھنٹوں پر محیط انتظار کی کوفت ناصر خان کو اب بری طرح کھلنے لگی تھی۔ گزشتہ تین گھنٹوں سے وہ کبھی جھاڑی کی آڑ سے تو کبھی کسی ٹیکری کے پیچھے سے وہ جھانک جھانک کر بری طرح نڈھال ہو چکا تھا۔

قریب تھا کہ خائستہ گل کی طرح وہ بھی اس بے مقصد انتظار سے اکتا کر واپس چلنے کی سوچتا کہ اچانک زرولی اپنے ساتھیوں سے اس طرح ہاتھ ملانے لگا جیسے ان سے رخصت ہو کر کہیں جانے والا ہو۔ دونوں ساتھیوں سے ہاتھ ملا کر وہ جیپ کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ناصر خان نے خائستہ گل کو آواز دے کو صورت حال بتائی تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''کھیا..... کہہ رہے ہو زرولی اکیلا ہے اور جیپ مغرب کی طرف جا رہی ہے۔ ادھر تو افغانستان کا سرحد ہے''۔ خائستہ گل نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ گدھے کا بچہ ادھر کیا لینے جا رہا ہے۔ اسے تو مشرق کی طرف جانا چاہیے تھا؟''

''اس بحث کو چھوڑو، ہمیں ایسا موقع دوبارہ نہیں ملے گے''۔ ناصر خان نے عجلت آمیز انداز میں جواب دیا اور اس ٹیکری کی طرف بھاگنے لگا، جس کے عقب میں ان کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ آن کی آن میں وہ دونوں وہاں پہنچے، گھوڑے کھولے اور زرولی کے تعاقب میں سرپٹ چھوڑ دیے۔



اس روز سرِ شام ہی آسمان پر بادل چھانے لگے تھے، موسم دیکھتے ہی دیکھتے نہایت خوشگوار ہو گیا تھا۔ ایسے غضب کے موسم میں ڈاکٹر شہناز کو جہانداد کی یاد بُری طرح آنے لگی تھی۔ کمرے کی ایک کھلی کھڑکی کے سامنے وہ کرسی ڈالے بیٹھی ہوئی تھی۔ حویلی کی ایک ملازمہ اسے کمرے میں ہی ضرورت کی

ہر چیز فراہم کردیا کرتی تھی۔ آج موسم کے تیور دیکھ کر وہ ادھیڑ عمر کی ملازمہ ڈاکٹر شہناز کے لیے کھانا قبل از وقت ہی لے کر آگئی تھی۔

''بی بی! آج آپ بہت پریشان دکھائی دیتی ہیں''۔ کھانا میز پر لگانے کے بعد وہ ڈاکٹر شہ... خیالات میں مستغرق دیکھ کر ہمدردانہ انداز میں بولی۔ ''کیا اپنے لوگ یاد آرہے ہیں یا کوئی اور ہے تو مجھے حکم کریں آپ کے کام آکر مجھے بہت خوشی ہوگی''۔

''تم ہمیشہ مجھے ایسے ہی جھوٹے دلاسے دیتی رہتی ہو''۔ ڈاکٹر شہناز نے شکایتی انداز میں ''میں جب بھی کوئی کام کی بات کرتی ہوں تم اَن سنی کرتے ہوئے کمرے سے ہی نکل جاتی ہو... صورت حال میں کیا فائدہ ہوگا تجھے اپنی پریشانی بتا کر؟''

''بی بی! میں آپ کو بتا چکی ہوں ناں''۔ ملازمہ بولی۔ ''آپ کو یہاں سے فرار کرانا میرے... سے باہر ہے، مجھے تو ہفتے میں محض دوبار ہی اس حویلی سے باہر نکلنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور وہ بھی بن باپ کے...... آپ تو ان لوگوں کو جانتی ہی ہیں... ظالم ہیں، انہیں اگر بھنک بھی پڑ گئی کہ میں آپ سے اس قسم کی گفتگو کرتی ہوں تو یقین کریں... میرے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے''۔

''تم بلاوجہ ان لوگوں سے خائف رہتی ہو''۔ وہ بولی۔ ''حالانکہ میں نے تم سے محض اس علا... کا نام و پتہ ہی تو پوچھا تھا، یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں ہے اور ویسے بھی میں یہاں سے کوئی بھا... نہیں لگی ہوں جو تم اس قدر ڈر رہی ہو؟''

''علاقے کا نام پوچھ کر پھر آپ مجھ سے کاغذ قلم منگوانے کی گزارش کریں گی''۔ ملازمہ... وہ ڈاکٹر شہناز کی توقع سے بڑھ کر ہوشیار عورت ثابت ہو رہی تھی۔

''پھر آپ خط لکھیں گی''۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کے بعد آپ آنسو بہا... اپنی مجبوری کا رونا رو کر مجھ سے یہ التجا کریں گی کہ میں وہ خط ڈاک کے حوالے کردوں، نہیں بی بی... میں آپ کے لیے اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی۔ میں اپنے معصوم بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے... ہوا نہیں دیکھ سکتی اور ویسے بھی یہاں سے کوئی چیز باہر لے جانا ناممکن ہے۔ گیٹ پر آتے جاتے سخت چیکنگ ہوتی ہے۔ میں پکڑی جاؤں گی''۔

ڈاکٹر شہناز نے اس کا جواب سن کر دل ہی دل میں اس اَن پڑھ عورت کی ذہانت کو داد دی... پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''میرے کہنے پر عمل کروگی تو یقین کرو کوئی تمہیں نہیں پکڑ سکے گا... میں کون سا تمہیں مفت میں یہ کام کرنے کو کہہ رہی ہوں؟''

''آپ کے پاس مجھے دینے کے لیے ہے ہی کیا؟'' انعام کی بات سن کر ملازمہ دلچسپی لے...



...ہوئی تھی۔ اس نے بلاتردد وہ سوال کر ڈالا جس کی ڈاکٹر شہناز کو پہلے سے ہی توقع تھی۔

''تم کام کرنے کی حامی تو بھرو''۔ اسے لائن پر آتے دیکھ کر ڈاکٹر شہناز نے اپنے جذبات ...پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس تمہیں انعام میں دینے کے لیے دو نہایت قیمتی چیزیں ہیں''۔

''مجھے بنائیں مت بی بی جی!'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ یہاں آپ کے پاس مجھے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ پھر میں کیوں خطرہ مول لوں آپ کے لیے بغیر کسی توقع کے؟''

''اِدھر دیکھو بیوقوف!'' ڈاکٹر شہناز اسے گلے میں پہنا نیکلس اور کانوں کے بُندے دکھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ دونوں چیزیں اصلی سونے کی ہیں۔ ان کی بازاری قیمت اس وقت بھی ہزاروں میں ہوگی۔ اگر تم نے میرا کام کردیا تو میں یہ دونوں چیزیں تمہیں انعام میں دے دوں گی''۔

نیکلس اور بُندے دیکھ کر ملازمہ کی آنکھیں چمک اٹھیں مگر وہ خاموش رہی، شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ ایک طرف ابراہیم بنگش کا خوف تھا تو دوسری طرف عورت کی ازلی کمزوری سونا تھا جیسے دیکھ کر آج کی عورت بکنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ سونے کی کشش عورت کو یوں اپنی طرف کھینچتی ہے جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔

''کیا بات ہے تم یوں گم صم کیوں ہوگئی ہو؟'' اس کا کھویا کھویا انداز دیکھ کر ڈاکٹر شہناز نے پوچھا۔ ''کیا یہ انعام معمولی ہے یا پھر تجھے مجھ پر اعتماد نہیں ہے کہ کہیں بعد میں، میں اپنے وعدے سے مکر نہ جاؤں''۔

''نن...... نہیں، یہ بات نہیں ہے''۔ وہ چونک کر بولی۔ ''دراصل مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے''۔

''وقت ہی تو نہیں ہے میرے پاس''۔ اس نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔ ''یہاں میری عزت و جان کو سخت خطرہ ہے، پلیز میری مدد کریں میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں''۔

اتنا کہنے کے بعد واقعی ڈاکٹر شہناز نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''یہ دیکھو!'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''مجھے اپنی بیٹی یا پھر چھوٹی بہن سمجھ کر ہی میری مدد کرو، پلیز......''

''آپ کو کس سے عزت اور جان کا خطرہ ہے؟'' ملازمہ نے استفسار کیا۔ ''کیا وہ حویلی کا کوئی ...سردار یا ملازمہ ہے یا پھر......''

''یا پھر حویلی کے مالکوں میں سے کوئی ہے''۔ معاً فہیم بنگش اندر داخل ہو کر بولا، وہ نہ جانے

کب سے دروازے کی آڑ میں کھڑا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

اسے یوں اچانک اپنے سامنے پا کر ڈاکٹر شہناز کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے فہیم بنگش کی طرف دیکھنے لگی۔ خوف سے اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ فہیم کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی ہوس اسے صاف نظر آ رہی تھی۔ ملازمہ الگ سے سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔

فہیم بنگش نے شہناز کے چہرے سے نگاہیں ہٹ کر ایک قہر آلود نگاہ ملازمہ پر ڈالی اور پھر گرج کر بولا۔ ''تم بھاگ جاؤ یہاں سے ...... تم سے میں بعد میں نمٹ لوں گا غدار، نمک حرام عورت! اپنے مالکوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپ رہی تھی''۔

ملازمہ کانپتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور فہیم بنگش دوبارہ ڈاکٹر شہناز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیوں حسن کی سرکار!'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا ناں! کہ میں اپنی انسلٹ کبھی نہیں بھولتا اور انسلٹ کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ آؤ خود چل کر میری باہوں میں آ جاؤ ورنہ بہت بُرا حشر کروں گا۔ کم آن بے بی کم آن''۔

''نن ...... نہیں''۔ ڈاکٹر شہناز ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو ...... مجھے رسوا کر کے تمہارے ہاتھ کیا آئے گا؟ پلیز مجھے معاف کر دو ...... پلیز ......''

اچانک زور سے بجلی چمکی، بادل گرجا اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بادلوں کی گرج میں ڈاکٹر شہناز کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔

''آ جاؤ!'' بنگش دوبارہ گرج کر بولا، مگر کانپتی لرزتی ڈاکٹر شہناز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''او کے ...... اگر تم اپنا بدن نچوانا ہی چاہتی ہو تو پھر یونہی سہی''۔

اتنا کہہ کر فہیم بنگش نے کسی خونخوار چیتے کی طرح اس پر جست لگا دی۔ ڈاکٹر شہناز حلق کے بل چلائی مگر بادلوں کی گھن گرج میں اس کی چیخ معدوم ہو کر رہ گئی۔

فہیم بنگش کو یہ بلا سوچے سمجھے جست لگانا مہنگا پڑا تھا کیونکہ ڈاکٹر شہناز نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ وہ سیدھا اس کرسی پر جا کر گرا تھا جو ڈاکٹر شہناز کے عقب میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے اچھی خاصی چوٹ لگی تھی مگر اس وقت جوش انتقام اور ہوس نے اسے اندھا کر رکھا تھا۔ چوٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر شہناز کو ایک فحش گالی دی اور تیزی سے اٹھ کر دوبارہ اس کی طرف لپکا۔ ڈاکٹر شہناز کمرے کے دروازے کی طرف دوڑی مگر ایک طاقتور مرد کے مقابلے میں اس کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی فہیم بنگش نے اس کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈال کر اسے پکڑ لیا۔ وہ بے تحاشا چیختے ہوئے ہاتھ پیر چلانے لگی لیکن فہیم بنگش کی مضبوط گرفت



سے خود کو آزاد نہ کرا سکی۔ مرد فطرتاً عورت سے بہت زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور جب اس پر نفسانی خواہش کا غلبہ ہو تو اس کی طاقت دوگنی ہو جاتی ہے۔

''چیخو مت میری جان!'' وہ اسے اٹھا کر بستر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آج تجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم نے مجھے بہت تڑپایا ہے''۔

ڈاکٹر شہناز نے حلق کی پوری توانائی صرف کرتے ہوئے چیخنا شروع کر دیا مگر بارش اور بادلوں کی گھن گرج میں اس کی چیخیں دب کر رہ گئیں۔

''چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو''۔ وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ ''چھوڑ دو کتے ورنہ''۔

''ورنہ تم کیا کر لوگی میری بلبل؟'' اس نے ایک مکروہ قہقہہ لگاتے ہوئے ڈاکٹر شہناز کے منہ پر منہ رکھ دیا، مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

ڈاکٹر شہناز نے اتنی زور سے اس کے ہاتھ میں دانت گاڑے تھے کہ مرد ہو کر بھی وہ چیخنے پر مجبور ہو گیا۔ بوکھلا کر اس نے ڈاکٹر شہناز کو چھوڑ دیا اور لمحاتی طور پر اپنے زخمی ہاتھ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ڈاکٹر شہناز نے اس وقفے کو غنیمت جانا اور ایک بار پھر کمرے کے دروازے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ فہیم بنگش زخمی ہاتھ کو بھول کر اس کے پیچھے لپکا مگر اس دوران وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی، وہ بالکل اس حواس باختہ ہرنی کی طرح اندھا دھند دوڑ رہی تھی جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوتے ہیں۔

طویل برآمدہ عبور کر کے وہ جونہی لان میں پہنچی موسلا دھار بارش نے محض چند لمحوں میں اسے شرابور کر دیا مگر اس وقت اسے بارش کی پرواہ ہی کب تھی؟ ''شپ شپ'' کی آوازیں پیدا کرتے ہوئے وہ اندھا دھند دوڑی چلی جا رہی تھی، فہیم بنگش بھی کسی شکاری کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے تھا، زخمی ہاتھ نے اسے اور بھی مشتعل کر رکھا تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ ڈاکٹر شہناز کو تواتر کے ساتھ ننگی گالیاں دے رہا تھا مگر بارش کے شور اور بادلوں کی گرج چمک میں اس کی گالیاں ڈاکٹر شہناز کی سماعتوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

دفعتاً دوڑتے دوڑتے ڈاکٹر شہناز کا ایک پیر شلوار کے پائنچے میں الجھا اور وہ منہ کے بل گر پڑی، الجھنے والے پیر کی جوتی نکل کر دور جا پڑی جبکہ وہ کیچڑ آمیز پانی میں لت پت ہو گئی۔ اپنے عقب میں دیکھے بغیر وہ تیزی سے اٹھی اور دوبارہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب وہ ننگے پیر تھی دوسری جوتی اس نے خود ہی پاؤں سے نکال پھینکی تھی۔ گرنے کی وجہ سے ان کا درمیانی فاصلہ گھٹ گیا تھا مگر اب بھی وہ فہیم بنگش سے کافی آگے تھی۔ عزت جیسی انمول شے چھن جانے کے خوف نے اس کے پیروں میں بجلی بھر دی تھی، وہ اپنی پوری توانائی صرف کرتے ہوئے دوڑ رہی تھی۔

چند لمحوں کے اندر ہی وہ حویلی کے صدر دروازے تک پہنچ گئی۔ اگر اس وقت برساتی میں پہرے دار دروازے پر تعینات نہ ہوتا تو شاید وہ اب تک گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھول کر باہر جا چکی ہوتی۔ پہریدار اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو حیران رہ گیا۔ وہ کیچڑ میں لت پت تھی اس سے چلا ہی نہیں جا رہی تھی، لباس بھیگ کر اس کے بدن سے چپک چکا تھا اور وہ نہاں ہو کر بھی عیاں ہو رہی تھی لیکن اس وقت اسے ہوش ہی کہاں تھا؟

"پلیز...... خدا...... خدا کے لیے...... مم...... مجھے بچاؤ"۔ پہریدار کے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ "مم...... میں ڈاکٹر شہناز ہوں...... وہ...... وہ...... مم مجھے...... میری...... عزت"۔

شدت خوف سے وہ بات ہی نہیں کر پا رہی تھی، اس کی زبان بُری طرح لڑکھڑا رہی تھی اور خوفزدہ نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہی تھی جدھر سے فہیم بنگش کے آنے کا امکان تھا۔

"کیا...... ڈاکٹر شہناز؟" حیرت سے پہریدار کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابراہیم بنگش کی اسی حویلی میں موسیٰ خان کی قیدی کے ساتھ کوئی ایسا سلوک بھی کر سکتا ہے؟ کیونکہ ابراہیم بنگش نے ڈاکٹر شہناز کے متعلق حویلی کے تمام محافظوں کو سختی کے ساتھ تاکید کر رکھی تھی کہ اس سے بات کرنا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں۔ البتہ پہریداروں کو اس بات کا حکم تھا کہ وہ ڈاکٹر شہناز کو حویلی سے باہر کسی بھی قیمت پر نہ جانے دیں۔

"کون پڑا ہوا ہے تمہارے پیچھے؟" پہریدار نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے استفسار کیا۔

"مم...... میں نہیں جانتی"۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اس...... کا نام...... ف...... فہیم ہے اور...... اور اس نے میرے کمرے میں۔ داخل ہو کر...... مجھ پر مجرمانہ...... حملہ کیا ہے۔ پپ پلیز خدا کے لیے...... میری مدد کیجئے"۔ اتنا کہہ کر اس نے پہریدار کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

پہریدار لحہ بھر کے لیے کش مکش کا شکار ہو گیا۔ اس دوران فہیم بنگش بھی گرتا پڑتا وہاں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر شہناز پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "میں نے کہا تھا ناں کہ آج تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ چلو واپس کمرے میں ورنہ ... تماشا بنا دوں گا"۔

اتنا کہہ کر اس نے ڈاکٹر شہناز کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ پہریدار کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ ہماری کوٹھی کا نوکر ہے جانِ من!" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "تمہارا عاشق تو نہیں؟ تمہیں بچائے گا؟"



"نہیں خان جی!" پہریدار ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "بڑے خان جی نے ہمیں اس وقت کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ اسے معاف کر دیں، میں آپ......"

"یو باسٹرڈ!" وہ پہریدار کو بات پوری کرنے کا موقع دیے بغیر اس پر جھپٹتے ہوئے بولا۔ "تمہاری یہ جرأت کہ مالک کو آنکھیں دکھاؤ۔ حرام کے پلّے"۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے پہریدار کو گریبان سے پکڑ لیا اور پھر اسے بے دردی سے پیٹنے لگا۔ پہریدار جسمانی لحاظ سے اس سے طاقتور تھا مگر مالک کے آگے اسے دم مارنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ اپنے دفاع کا کام وہ ہاتھوں کی بجائے زبان سے لے رہا تھا۔

"خا...... خان جی...... خدا کے لیے میری بات تو سنیں"۔ وہ منت آمیز انداز میں بول رہا تھا۔ "میں بالکل بے قصور ہوں، بڑے خان جی نے ہمیں یہی حکم دیا ہے"۔

پہریدار خوشامدی انداز میں اس کی منتیں کر رہا تھا مگر فہیم بنگش اس وقت اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا اور بدستور اسے بے دردی کے ساتھ پیٹ رہا تھا۔ ڈاکٹر شہناز نے یہ موقع غنیمت جان کر آہستہ آہستہ مین گیٹ کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ گیٹ کی ذیلی کھڑکی کے نزدیک پہنچ کر اس نے کھڑکی کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ایسے ہی وقت گیٹ پر کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس کی روشنی پڑی اور ڈاکٹر شہناز کا آگے بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک گاڑی گیٹ کے عین سامنے پہنچ کر رک چکی تھی۔



ناصر خان اور خائستہ گل گھوڑے دوڑاتے ہوئے تیزی سے مغرب کی جانب روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کشادہ پتھریلے راستے پر پہنچ گئے جس پر زرولی کی جیپ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ راستہ چونکہ پتھریلا تھا اس لیے جلد ہی انہوں نے زرولی کو جا لیا۔ انہوں نے زرولی کا راستہ روکا اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔

"نیچے اترو جیپ سے"۔ ناصر خان نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے بارعب انداز میں کہا۔ "اور خبردار جو کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو اس ویرانے میں تمہاری لاش چیل کوؤں کی خوراک بن جائے گی"۔

"تم یہ اچھا نہیں کر رہے ہو ناصر خان"۔ زرولی بولا۔ "یہ جرأت تمہیں مہنگی پڑے گی، خان جی......"

"تیرے خان جی کی ایسی کی تیسی"۔ خائستہ گل نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "نیچے اترو ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا"۔

بیک وقت دو رائفلوں کی زد پر ہونے کی وجہ سے زرولی نے کوئی رسک لینا غیر مناسب کھڑکی کھول کر جیپ سے نیچے آ گیا۔

"کیا چاہتے ہو؟" نیچے اتر کر اس نے ناصر خان سے استفسار کیا۔

"دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو"۔ ناصر خان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "ہم کیا چاہتے ہیں ابھی معلوم ہو جائے گا"۔

چاروناچار زرولی نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور پریشان نگاہوں سے ناصر خان کی دیکھنے لگا۔

ناصر خان نے زرولی کے عقب میں موجود خائستہ گل کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک اشارہ کر دیا اور پھر زرولی کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے بولا۔ "مولانا نصیب اللہ کے ساتھ ہے تم لوگوں نے؟"

"کون مولانا نصیب اللہ، تمہارا دماغ تو......"

اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ معاً عقب سے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ خائستہ گل دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کے سر پر رائفل کے بٹ کی بھرپور ضرب لگائی تھی۔ زرولی کے ہلکی سی چیخ کی آواز برآمد ہوئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ اٹھے۔ دوسرے وہ کسی شرابی کی طرح جھولتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

"بہت احمق ہو تم"۔ ناصر خان، خائستہ گل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اتنی زور سے کی کیا ضرورت تھی؟ مر مرا گیا حرام زادہ تو گلے پڑ جائے گا"۔

"ایسے لوگ بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں، آسانی سے کہاں مرتے ہیں؟" خائستہ گل نے نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا اب دانت مت نکالو"۔ ناصر خان بولا۔ "رسی لاؤ اسے باندھ کر لے جانا پڑے گا"۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ نہ صرف زرولی کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ چکے تھے بلکہ نے اس کے منہ میں ایک کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا تاکہ ہوش میں آنے کے بعد شور نہ مچا سکے۔ اس دونوں نے اسے مل کر اٹھایا اور ناصر خان والے گھوڑے کی پشت پر اوندھے منہ ڈال دیا۔ نے گھوڑے پر سوار ہو کر بے ہوش زرولی کو سنبھالا اور پھر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ خائستہ گل تقلید کی تھی۔ جیپ کو انہوں نے چھیڑے بغیر اسی ویرانے میں چھوڑ دیا تھا۔ واپسی کے لیے وہ کشادہ اور سڑک نما راستہ چھوڑ کر قدرے دشوار گزار راستہ منتخب کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کارگزاری کسی کی نگاہوں میں آ جائے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔



سورج غروب ہونے کے بعد وہ گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے مگر اس وقت گاؤں کے اندر داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چنانچہ ناصر خان نے راستے سے ہٹ کر قدرے فاصلے پر موجود جھاڑیوں کے عقب میں گھوڑا روک دیا۔ خائستہ گل نے جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "اس وقت گاؤں میں داخل ہونا مناسب نہیں ہے۔ ہم کسی کی نگاہوں میں آ گئے تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد جب مکمل اندھیرا چھا جائے گا تو ہم گاؤں کا رخ کریں گے"۔

"ٹھیک ہے"۔ خائستہ گل تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تاریکی ہو جانے کا انتظار کر لیتے ہیں"۔

ناصر خان گھوڑے سے اترا اور پھر زرولی کو بھی اتار کر پتھریلی زمین پر ڈال دیا۔ زرولی اس وقت تک مکمل طور پر ہوش میں آ چکا تھا لیکن منہ میں کپڑا ٹھونسا ہونے کے باعث وہ بولنے سے قاصر تھا تاہم وہ ان دونوں کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ناصر خان اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یوں ٹکر ٹکر مت دیکھو مجھے معلوم ہے کہ پیاس سے تمہارا دم نکل رہا ہو گا۔ میں تمہارے منہ سے کپڑا نکال کر تجھے پانی دیتا ہوں مگر یہ یاد رہے اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو پانی کی جگہ میں تمہارے حلق میں گولی اتار دوں گا"۔

زرولی نے اثبات میں سر ہلا کر کوئی بھی غلط حرکت نہ کرنے کا اقرار کیا تو ناصر خان نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ زرولی گہرے گہرے سانس لینے لگا اور ناصر خان نے خائستہ گل کو پانی لانے کا اشارہ کر دیا۔ خائستہ گل فوراً گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھی پانی کی چھاگل اتار لایا۔ ناصر خان نے چھاگل کا ڈھکن کھول کر اسے زرولی کے منہ سے لگا دیا، وہ یوں بے تابی سے پانی پینے لگا جیسے صدیوں کا پیاسا ہو۔ جب وہ سیر ہو گیا تو ناصر خان نے چھاگل ہٹا دی۔

"بھوک لگی ہے؟" ناصر خان نے چھاگل ایک طرف رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"نہیں"۔ زرولی نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی"۔ اتنا کہنے کے بعد ناصر خان نے کپڑے کا وہ گولا اٹھا لیا جو تھوڑی دیر قبل اس نے زرولی کے منہ سے نکالا تھا۔

"میں شور نہیں کروں گا"۔ زرولی اسے کپڑے کا گولا اٹھاتے دیکھ کر فریادی انداز میں بولا۔ "تم یہ کپڑا میرے منہ میں مت ٹھونسو میرا دم گھٹنے لگتا ہے"۔

"تم پر اعتبار کرنا سانپ کو دودھ پلانے کے مترادف ہے"۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "اپنے مفاد کی خاطر تم کچھ بھی کر سکتے ہو"۔

"کوئی بھی قسم اٹھوالو میں شور نہیں کروں گا"۔ اس نے دوبارہ گزارش کی۔ "کپڑے کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے اور میرا سانس......"

معاً خائستہ گل نے اٹھ کر اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کر دی اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"خنزیر کے بچے!" خائستہ گل غصے سے گویا ہوا۔ "جب مجھ پر گولیاں چلائی تھیں تو اس وقت تمہیں کیوں تکلیف نہیں ہوئی تھی؟ ابھی تو ہم نے تمہارے منہ میں صرف کپڑا ٹھونسا ہے۔ اگر تم نے ہمارا کہنا نہ مانا تو تمہارے حلق میں گولیاں بھی اتارنے سے دریغ نہیں کریں گے"۔

"یہ مردانگی نہیں ہے خائستہ گل"۔ زرولی نے چلا کر کہا۔ "بندھے ہوئے آدمی کو تو ایک بچہ بھی ٹھوکر مار سکتا ہے"۔

"فکر مت کرو"۔ ناصر خان بولا۔ "ہم تمہارے ہاتھ پاؤں کھول کر بھی تمہیں قوت آزمائی کا موقع دیں گے"۔

"تو پھر کھول دو ناں!" وہ تاؤ دلانے والے انداز میں بولا۔ "میں بھی تو دیکھوں کہ خائستہ گل کتنا طاقتور ہے؟"

"کھول دے اس ماں کے......کو"۔ خائستہ گل غصے میں پاگل ہو کر اسے ایک ننگی گالی دیتے ہوئے ناصر خان سے بولا۔ "آج میں اس کی ایک ایک ہڈی توڑوں گا"۔

"پاگل مت بنو خائستہ گل؟" ناصر خان نے سخت انداز میں کہا۔ "ہم اس سے کشتی لڑنے کے لیے تو اسے اٹھا کر نہیں لائے؟ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو کہ اس کا زندہ رہنا ہی ہمارے لیے ضروری ہے"۔

"تو پھر اس کتے کے بچے کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو"۔ خائستہ گل نے جواب دیا۔ "ورنہ اب کی بار ٹھوکر اس کے منہ پر پڑے گی، ایک بھی دانت سلامت نہیں رہے گا"۔

زرولی نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر ناصر خان نے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کے بعد انہوں نے وہاں تھوڑی دیر مزید انتظار کیا اور جب رات کی تاریکی مکمل طور پر پھیل گئی تو زرولی کو دوبارہ گھوڑے پر لاد کر وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔



گاڑی کے گیٹ پر رکنے کے بعد کھڑکی کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی اور پھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فہیم بنگش ابھی تک پہریدار کی پٹائی میں مصروف تھا، بارش بدستور جاری تھی اور شہناز کش مکش کے عالم میں گیٹ کی کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ کھڑکی کے عین سامنے پہنچ کر رک گئی اور پھر کھڑکی پر دستک ہوئی۔ شہناز نے کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ ایک ثانیے کے بعد دوبارہ دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک بارعب آواز سنائی



"پہریدار! کہاں مر گئے ہو؟ جلدی سے دروازہ کھولو"۔

یہ موسیٰ خان کی آواز تھی جو ڈاکٹر شہناز کے لیے صورِ اسرافیل ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس کے دشمن کی آواز تھی جو عام حالات میں شاید وہ سننا بھی گوارہ نہ کرتی مگر اس وقت وہ آواز اسے کائنات کی دلکش ترین آواز لگی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے کنڈی ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ موسیٰ خان پہریدار کو گالیاں دیتا ہوا اندر داخل ہو گیا مگر اپنے سامنے کیچڑ اور پانی میں لت پت ڈاکٹر شہناز کو دیکھ کر وہ سکتے میں آ گیا۔

"تم......ڈاکٹر شہناز ہی ہو ناں؟" دوسرے ہی لمحے اس نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

ڈاکٹر شہناز کے ہونٹ لرزے، اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ اسی اثنا میں موسیٰ خان کی نگاہ پہریدار اور فہیم بنگش کی طرف اٹھ گئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" سوالیہ انداز میں کہتا ہوا وہ آگے بڑھا لیکن ڈاکٹر شہناز کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"موسیٰ خان!" وہ روتی ہوئی آواز میں بولی۔ "بہن یا بیٹی دشمن کی ہی کیوں نہ ہو قابل احترام ہوتی ہے۔ ارے تم کیسے مرد ہو کہ دشمن کی عزت کی حفاظت ہی نہ کر سکے۔ مجھے اغوا کرنے سے تو بہتر تھا کہ تم مجھے مار ڈالتے کم از کم آج میں یوں رسوا تو نہ ہوتی"۔

ڈاکٹر شہناز کی فریاد سن کر ایک لمحے کے لیے تو موسیٰ خان کو یوں محسوس ہوا جیسے سرِ بازار کسی نے اسے ننگا کر دیا ہو، دوسرے ہی لمحے اس کے اندر کا وحشی درندہ انگڑائی لے کر جاگ اٹھا، مٹھیاں بھینچ گئیں اور برستی ہوئی بارش میں اس کا پورا بدن کسی الاؤ کی طرح دہک اٹھا۔

"کس بدبخت نے تیری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی ہے؟" اس نے غضب ناک انداز میں سوال کیا۔ "کون ہے وہ بولو......نام بتاؤ مجھے اس کا؟"

"وہ......وہ جو پہریدار کو پیٹ رہا ہے"۔ ڈاکٹر شہناز نے روتے ہوئے بتایا۔ "فہیم بنگش......پہریدار میری ڈھال بننے کے جرم میں پٹ رہا ہے۔ اس نے میرے کمرے میں داخل ہو کر مجھ پر......"

موسیٰ خان اس کی پوری بات سنے بغیر اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ کر فہیم بنگش کے سر پر پہنچ گیا جو اس وقت نیچے گرے ہوئے پہریدار کو فٹ بال سمجھ کر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اس کے عقب میں پہنچ کر موسیٰ خان نے لات چلائی اور فہیم بنگش پہریدار کے اوپر سے گزرتا ہوا چند فٹ دور جا گرا، وہ کیچڑ آلود زمین پر منہ کے بل گرا تھا اس لیے اس کا تمام چہرہ کیچڑ میں لتھڑ گیا۔ منہ، ناک اور آنکھوں میں بھی کیچڑ گھس گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اچانک اس ٹوٹنے والی افتاد سے سنبھلتا،

موسیٰ خان نے زمین پر لیٹے ہوئے پہریدار کے اوپر سے جست لگائی اور فہیم بنگش کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ فہیم بنگش کی چیخ نکل جاتی مگر موسیٰ خان کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے سخت نوک والے لیدر کے جوتے پہن رکھے تھے جن کی چند ٹھوکروں نے فہیم بنگش کو ادھ مرا کر دیا تھا۔

''اُٹھ کر کھڑا ہو جا کتے کی اولاد''۔ موسیٰ خان نے اس کی پسلیوں پر ایک بھرپور ٹھوکر رسید کرتے ہوئے گرج کر کہا۔ ''تجھے ڈاکٹر شہناز کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیسے ہوئی دو ٹکے کے گھٹیا انسان! کیا تجھے معلوم نہیں تھا یہ موسیٰ خان کی مہمان ہے؟ بہت گرمی چڑھی ہے ناں تجھے؟ آج میں تیری ساری گرمی نکال دوں گا۔ میں تجھے اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا کہ تُو کسی لڑکی کے قریب جا سکے''۔

اتنا کہہ کر موسیٰ خان نے جھک کر اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور پھر اس کی ٹانگوں کے بیچ اس قدر زوردار ضرب لگائی کہ فہیم بنگش کی کربناک چیخ سے پوری حویلی گونج اٹھی۔ اس کے چلانے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے موسیٰ خان نے یکے بعد دیگرے چند ٹھوکریں اور لگا دیں۔ فہیم بنگش جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ موسیٰ خان نے اس کے جس نازک مقام پر ضربیں لگائی تھیں، اس سے انسان کی موت بے واقع ہو سکتی تھی مگر اس کی موسیٰ خان جیسے موت کے ہرکارے کو پرواہ ہی کب تھی؟

ٹھوکریں لگانے کے بعد موسیٰ خان نے ایک جھٹکے سے اس کی ٹانگیں اپنی طرف کھینچیں تو فہیم بنگش کا تڑپتا ہوا بدن ہوا میں اٹھتا چلا گیا۔ اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے موسیٰ خان نے اسے فضا میں گھمایا اور پھر ایک دم اس کی ٹانگیں چھوڑ دیں۔ فہیم بنگش خالی بوتل کی طرح اُڑتا ہوا دور جا گرا۔ چند لمحے تڑپنے کے بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

اس دوران فہیم بنگش سے مار کھانے والا پہریدار اپنے چند ساتھیوں کو بلا لایا تھا اور اب وہ سب مل کر موسیٰ خان کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ ڈاکٹر شہناز وہیں گیٹ کے ساتھ سمٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔ موسیٰ خان پہریداروں کو جھڑکتا ہوا دوبارہ فہیم بنگش کے سر پر پہنچ گیا۔

''خدا کے لیے جناب!'' پہریدار فریادی انداز میں اس کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔ ''چھوٹے خان کو چھوڑ دیں اسے بہت سزا مل چکی ہے۔ یہ مر گیا تو بڑے خان جی ہمیں زندہ دفنا دیں گے۔ آپ کو اللہ کا واسطہ جناب! اسے ہماری خاطر معاف......''

''چپ''۔ موسیٰ خان گرج کر بولا اور تمام پہریدار کسی برقی کھلونے کی طرح ساکت ہو گئے۔

''تم ایک درندے کی حمایت کر رہے ہو''۔ وہ غضب ناک انداز میں بولا۔ ''کیا یہ معافی کے قابل ہے، بولو...... جواب دو؟ ایک عزت دار لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے اس نے...... اسے تو موت سے بھی کڑی سزا ملنی چاہیے''۔



اتنا کہہ کر وہ جھکا، فہیم بنگش کا دایاں بازو پکڑا اور دوسرے ہی لمحے ''کڑاک'' کی آواز پیدا کرتے ہوئے فہیم بنگش کا بازو کندھے کے قریب سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا جسم زور سے چند بار پھڑک کر دوبارہ ساکت ہو گیا، شدید درد نے اسے چیخنے چلانے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

موسیٰ خان نے اس کے جسم کو ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے اس پر تھوک دیا اور پھر پہریداروں سے بولا۔

''اسے اٹھا کر کسی ہسپتال میں پھینک دو۔ میں اس کے بھائی کو فون پر اطلاع کر دیتا ہوں''۔

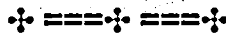
یہ کہہ کر وہ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈاکٹر شہناز کے قریب پہنچ گیا جو گیٹ سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''مس شہناز!'' وہ نرم انداز میں گویا ہوا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے شیطانی ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا ورنہ خدا کی قسم میں نے اس کے ٹکڑے کر دیے ہوتے۔ اب تم جاؤ اپنے کمرے میں جا کر لباس بدل لو، میں ابراہیم بنگش کو فون کرنے کے بعد وہیں پہنچتا ہوں''۔

''پپ...... پلیز......'' وہ فریادی انداز میں بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو...... مم...... میں یہاں نہیں رہ سکتی''۔

''تم جا کر لباس تو بدلو'' اس نے کہا۔ ''میں کچھ سوچتا ہوں...... شاباش جاؤ''۔

ڈاکٹر شہناز بلا چوں چرا کمرے کی طرف بڑھ گئی جبکہ موسیٰ خان گیٹ کھلوا کر باہر کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔



یہ اسی رات کا ذکر ہے امین خان کے حجرے میں زر ولی ایک چارپائی کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ ناصر خان نے کچھ اس طرح کس کر رسی باندھی تھی کہ زر ولی معمولی سی جنبش کرنے سے بھی قاصر تھا۔ مضبوط اور باریک رسی کئی جگہوں سے اسے کھال میں گھستی محسوس ہو رہی تھی۔ آنے والے لمحات کے متعلق سوچ کر ابھی سے اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، آج تک وہ بے گناہوں اور غریبوں پر تشدد کرتا آیا تھا، اسے کبھی کسی بے گناہ پر رتی برابر بھی رحم نہیں آیا تھا۔ اس نے کبھی کسی بے گناہ کی فریاد پر کان نہیں دھرے تھے۔

ناصر خان اور خائستہ گل چارپائی سے لگ کر کھڑے ہوئے تھے۔ خائستہ گل کے ہاتھ میں بانس کی ایک پتلی اور مضبوط سی چھڑی موجود تھی جو لیمپ کی روشنی میں چمک رہی تھی، غالباً چھڑی پر تیل لگایا گیا تھا تاکہ ضرب ٹھیک طرح سے پڑ سکے۔ وہ دونوں شدت سے امین خان کے منتظر تھے، جو تھوڑی دیر تک پہنچنے کا کہہ کر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ ناصر خان نے چند لمحے مزید انتظار کیا اور پھر خائستہ گل سے

بولا۔ ''دیکھو جا کر یہ خان جی کہاں رہ گیا ہے؟''

خائستہ گل اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا اور ناصر خان زرولی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''زرولی!'' وہ ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی ہم تم پر تشدد کرنے کے حق میں ہیں۔ میرا تمہیں برادرانہ مشورہ ہے کہ امین خان جو کچھ پوچھے وہ بتا دینا یہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا ورنہ امین خان اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے اور ہم اس کا حکم بجا لانے پر مجبور ہوں گے''۔

''مجھے تمہارے برادرانہ مشورے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''امین خان کا جو دل چاہے کرتا رہے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے''۔

''میں نے مشورہ دیا تھا''۔ ناصر خان نے بے نیازی سے کہا۔ ''اس پر عمل کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ تم اگر زندگی بھر کے لیے معذور بننے کے لیے تیار ہو تو امین خان تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کرے گا۔ ویسے بھی تم پر وہ ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ تمہاری چیخیں اس حجرے سے باہر نہیں جائیں گی''۔

''میرا نام زرولی ہے ناصر خان!'' وہ بولا۔ ''میں تم لوگوں سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ تم لوگوں سے جو بن پڑے کر لینا''۔

''ہم تجھے رحم کی بھیک نہیں دیں گے زرولی!'' ناصر خان نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آج کی رات تم پر بہت بھاری گزرے گی۔ کیا پتہ تم کل صبح کا سورج دیکھتے بھی ہو یا نہیں؟''

''میں کوئی بچہ نہیں ہوں''۔ اس نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''جو کھیل تم میرے ساتھ کھیلنا چاہتے ہو اس کے بارے میں، میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ تم مجھے نفسیاتی دباؤ میں لانا چاہتے ہو ناں؟ مگر یہ تمہاری بھول ہے۔ میں نے ڈرنا سیکھا ہی نہیں ہے۔ مجھ سے تم لوگوں کو کچھ بھی معلوم ہونے والا نہیں ہے۔ میری زبان کھلوانا ناممکن ہے، پتھر کبھی نہیں بولتے''۔

''جذبہ اگر صادق ہو تو کبھی کبھی پتھر بھی بول پڑتے ہیں''۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''تم تو ایک انسان ہو گوشت پوست کے بنے ہوئے۔ کیسے نہیں بولو گے؟''

''اب تک میری تلاش شروع ہو چکی ہو گی''۔ اس نے پٹڑی بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ میرے بجائے اپنے بارے میں سوچو، خان جی تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟''

''خان جی کے ستارے آج کل گردش میں ہیں''۔ ناصر خان استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''اس بہت جلد اس ملک کی زمین تنگ ہونا شروع ہو جائے گی۔ اب امین خان کا دور آنے والا ہے۔ حالات کروٹ بدل رہے ہیں اور تم جیسے لوگوں کا یہاں سے دانہ پانی اٹھنے والا ہے''۔



''ہاہاہا......'' وہ بے ساختہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''امین خان کا دور...... ہاہاہا...... سنو ناصر خان! ایک بہت مشہور کہاوت ہے شاید تم نے بھی سن رکھی ہو کہ ہر گدھا دیوار پھاندنے سے پہلے خود کو ہرن تصور کرتا ہے''۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور پھر ایک دم سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ مجھے لگتا ہے آج کل تمہارا امین خان بھی خود کو ہرن تصور کر رہا ہے''۔

''بجھنے سے پہلے چراغ ایک بار بھڑکتا ضرور ہے''۔ ناصر خان نے بغیر برا مانے کہا۔ ''اور مجھے بھی معلوم ہے کہ تم اس وقت کون سی کیفیت سے گزر رہے ہو؟ کوئی بات نہیں دل کھول کر ہنس لو کیونکہ ں کے بعد تم نے صرف رونا ہی ہے''۔

ایسے ہی وقت امین خان اور خائستہ گل ایک ساتھ اندر داخل ہوئے اور زرولی جو کچھ بولنے لگا تھا، انہیں دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''ہاں...... کچھ بتایا ہے اس نے؟'' اندر داخل ہوتے ہی امین خان نے ناصر خان سے سوالیہ ںداز میں پوچھا۔

''نہیں خان جی!'' ناصر خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بغیر ڈوز لیے ایسے لوگ کب بان کھولتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے تو پھر شروع ہو جاؤ''۔ امین خان ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جب تک اس کی بان کھل نہ جائے تب تک کارروائی نہیں روکنا''۔

امین خان کی اجازت پا کر ناصر خان زرولی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''بولو زرولی! تم لوگوں نے ولانا نصیب اللہ کو کہاں رکھا ہوا ہے؟'' ناصر خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے چھا۔ ''بتاؤ ورنہ بہت برا حشر کروں گا''۔

''مجھے نہیں پتہ''۔ اس نے ناگوار انداز میں جواب دیا۔

''خائستہ گل! شروع ہو جاؤ''۔ ناصر خان نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خان صاحب س کی کربناک چیخیں سننے کے منتظر ہیں''۔

خائستہ گل نہ جانے کب سے اس حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ہاتھ ں پکڑی ہوئی بانس کی چھڑی زرولی کے پاؤں کے تلووں پر برسانا شروع کر دی۔ خائستہ گل کا ہاتھ ق رفتاری سے چل رہا تھا، زرولی نے چیخیں ضبط کرنے کے لیے سختی سے دانت بھینچ لیے مگر ایک ہی لے میں درد کی شدت نے اسے چلانے پر مجبور کر دیا۔ چھڑی پاؤں کے تلوے پر پڑتی اور درد کی لہریں ماغ سے اٹھتیں۔ زرولی کی چیخیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئیں لیکن خائستہ گل کا ہاتھ بدستور برق رفتاری

سے چلتا رہا۔ سختی کے ساتھ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے زرولی صرف چیخ سکتا تھا جسم کو حرکت دینا اس کے بس سے باہر تھا۔

"بولو گے کہ نہیں؟" خائستہ گل نے ایک لمحے کے لیے ہاتھ روکتے ہوئے پوچھا۔

"نن...... نہیں"۔ اس نے کراہ کر جواب دیا۔

خائستہ گل نے ایک نظر ناصر خان کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "اس سے سوال مت کرو اپنی کارروائی جاری رکھو، اسے ایک سیکنڈ کے لیے بھی آرام نہیں ملنا چاہیے"۔

خائستہ گل نے اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے دوبارہ مشقِ ستم شروع کر دی اور زرولی ایک بار پھر خارش زدہ کتے کی طرح چلانے لگا۔ ناصر خان غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اذیت اور تکلیف کی وجہ سے سرخ سے سیاہ ہو چلا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے ناصر خان کچھ سوچتا رہا اور پھر جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا۔ دو تین کش لگانے کے بعد وہ آگے بڑھا اور جلتا ہوا سگریٹ زرولی کے رخسار پر رکھ دیا۔ ایک طرف چھڑی اور دوسری طرف جلتا ہوا سگریٹ، زرولی نے ایک کربناک چیخ ماری اور پھر ہذیان بکنا شروع کر دیا۔ وہ ناصر خان اور خائستہ گل کی ماں بہن کا رشتہ بعض ناپاک قسم کے جانوروں سے جوڑ رہا تھا مگر ناصر خان اور خائستہ گل نے اس کی بکواس پر توجہ دینے کی بجائے اپنی کارروائی جاری رکھی۔

"بتا دو فائدے میں رہو گے"۔ ناصر خان نے بجھا ہوا سگریٹ دوبارہ سلگاتے ہوئے کہا۔ "یہ ابھی ابتدا ہے انتہا تمہارا پاخانہ خطا کر دے گی"۔

"مار ڈالو مجھے، میں کچھ نہیں بتاؤں گا"۔ اس نے انتہائی اذیت کے عالم میں جواب دیا۔

"اتنی آسانی سے تجھے نہیں ماریں گے"۔ یہ کہہ کر ناصر خان نے اس کے دوسرے رخسار پر جلتا ہوا سگریٹ رکھ دیا۔

زرولی چلایا، ناصر خان نے اس کے سر کے لمبے بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"بتا دو ورنہ اب کی بار جلتا ہوا سگریٹ تمہاری آنکھ پر رکھ دوں گا۔ پھر بھی نہ بتایا تو دوسری آنکھ پر رکھوں گا، دنیا کا کوئی بھی ڈاکٹر تمہاری بینائی نہیں لوٹا سکے گا اور تم پھوٹی آنکھوں کے ساتھ کسی مسجد کے دروازے پر بیٹھ کر بھیک مانگا کرو گے"۔

"نہیں بتاؤں گا، کبھی نہیں بتاؤں گا"۔ اس نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مم...... مار دو مجھے"۔

"ماریں گے مگر سسکا سسکا کر"۔ اتنا کہہ کر ناصر خان نے اشارے سے خائستہ گل کو روک دیا۔

"اب بھی وقت ہے زرولی بتا دو؟" ناصر خان نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "ورنہ جو پروگرام میں



شروع کرنے والا ہوں اس کے متعلق تم سوچ بھی نہیں سکتے"۔

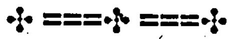
زرولی نے کوئی جواب نہ دیا تاہم وہ لگاتار کراہ رہا تھا۔ اس تشدد نے اس کی روح تک کو لرزا دیا تھا مگر وہ پھر بھی ضبط کر رہا تھا۔ اس ضبط کے مظاہرے کے پیچھے دراصل خان جی کا خوف پوشیدہ تھا۔ زرولی اچھی طرح جانتا تھا کہ زبان کھولنے کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ خان جی سے اسے رتی بھر رحم کی امید بھی نہیں تھی۔ خان جی نے آج تک اپنے کسی بھی کارندے پر رحم نہیں کیا تھا، وہ رحم کے لفظ سے واقف ہی نہیں تھا، اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر دھڑکتا تھا۔

"آخری بار پوچھ رہا ہوں زرولی!" ناصر خان دوبارہ مستفسر ہوا۔ "بتا دو مولانا صاحب کو کہاں رکھا گیا ہے؟ ورنہ اذیت ناک موت تمہارا مقدر بن جائے گی"۔

اب کی بار بھی زرولی خاموش رہا شاید وہ دل ہی دل میں نہ بولنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ناصر خان نے ایک طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی اور پھر اپنی جیب سے ایک تیز دھار چاقو نکال کر زرولی پر جھک گیا، دوسرے ہی لمحے زرولی کے منہ سے کربناک چیخیں برآمد ہونے لگیں، ناصر خان نے جھکتے ہی چاقو اس کے بازو میں گھونپ دیا تھا۔

ناصر خان نے اس کی چیخوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے چاقو باہر کھینچا تو زرولی کے بازو سے گرم گرم خون ابلنے لگا۔ پورا بازو اوپر سے لے کر نیچے تک خون میں تر ہو گیا، حجرے کے فرش پر بھی خون رسنے لگا تھا۔

"باورچی خانے سے پسی ہوئی مرچیں لے کر آؤ"۔ ناصر خان نے خائستہ گل کو حکم دیا اور دوبارہ زرولی پر جھک گیا مگر اس دوران وہ درد کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو چکا تھا۔



اُدھر حویلی میں خان جی زرولی کے ساتھیوں پر گرج رہا تھا۔ "تم دونوں ہی کتے کے بچے ہو"۔ اسمبلی میں بیٹھ کر مہذب زبان بولنے والا خان جی اپنے ملازموں سے بازاری انداز میں مخاطب تھا۔ "اپنے باپوں کے ہو ہی نہیں ورنہ تم کبھی بھی اس ماں کے یار کو اکیلا افغانستان کے بارڈر کی طرف نہ جانے دیتے۔ تم ساتھ کیوں نہیں گئے اس کے؟ ڈھونڈا کیوں نہیں اس کتیا کے بچے کو؟"

اتنا کہنے کے بعد خان جی صوفے سے اٹھ کر قالین پر ٹہلنے لگا۔ غصے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات بھی نظر آ رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گل شیر خان کے مقابل پہنچ گیا، گل شیر خان کی نگاہیں پہلے ہی قدموں میں بچھے ہوئے قالین پر گڑی ہوئی تھیں اور چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس کا پورا بدن جاڑے کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے قریب کھڑے ہوئے میر خان کی حالت اس سے بھی زیادہ پتلی تھی وہ بھی پیروں سے لے کر سر تک کانپ رہا تھا۔

خان جی کو عین اپنے سامنے پا کر گل شیر خان کی گردن کچھ اور جھک گئی۔ اب اس کی نگاہیں اپنے ہی قدموں سے لپٹی ہوئی تھیں۔

"سؤر کے بچے!" خان جی نے گرج کر کہا۔ "اپنے پیروں میں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ ادھر دیکھو"۔

اس نے ڈرتے ڈرتے گردن سیدھی کی مگر خان جی سے نگاہیں ملانے کی بجائے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"ہماری طرف دیکھو"۔ خان جی دوبارہ گرجا۔ "جدھر دیکھ رہے ہو ادھر تمہاری ماں کا مجرا نہیں ہو رہا"۔

"وہ...... وہ...... خا...... خان جی"۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں خان جی کی طرف دیکھتے ہوئے لب کشائی کی۔ "زر...... ولی نے ...... جی ...... ہماری کوئی بات ...... نن...... نہیں سنی تھی اور......"

معاً خان جی کا طمانچہ اس کے رخسار پر پڑا اور اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔

"نامردوں کی طرح بہانے کیوں بناتے ہو؟" خان جی نے کھولتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اپنی غلطی چھپانے کی بجائے تسلیم کرنا سیکھو۔ اسے صبح تک کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لاؤ ورنہ ہم تمہیں کاٹ کر کتوں کے آگے ڈال دیں گے"۔ اتنا کہہ کر اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "جہاں تم لوگوں کو جیپ کھڑی ہوئی ملی تھی کیا وہاں تم لوگوں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تھی۔ مثلاً زمین پر کوئی خون گرا ہوا پایا اور کوئی حیران کن چیز؟"

"نن...... نہیں خان جی"۔ گل شیر خان نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "وہ جگہ ہم نے اچھی طرح...... دیکھ لی تھی...... وہاں ایسا...... کچھ بھی نہیں ملا"۔

"جہاں جیپ کھڑی ہوئی تھی وہاں سے افغان بارڈر کتنے فاصلے پر تھا؟" خان جی نے دوبارہ سوال کیا۔

"قریب...... ہی تھا خان جی"۔ اس بار گل شیر خان نے قدرے سنبھل کر جواب دیا تھا۔

"وہاں تم لوگوں کو کسی دوسری گاڑی کے ٹائروں کے نشان ملے تھے؟" خان جی نے باقاعدہ تفتیشی انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"جج...... جی ہاں ملے تھے"۔

خان جی اس کا جواب سن کر پھر سوچوں میں ڈوب گیا۔ اس کا دماغ مشہور افغان اسمگلر داؤد کریمی کی طرف چلا گیا۔ چھ ماہ پہلے ہی تو اس کی داؤد کریمی سے اَن بن ہوئی تھی۔ وہ جس دھندے



تھے وہاں بے ایمانی نہیں چلتی تھی مگر داؤد کریمی نے اس سے بے ایمانی کی تھی، اس نے اسے دو نمبر یا انتہائی ناقص مال سپلائی کر دیا تھا حالانکہ قیمت اس نے اصلی اور کھرے مال کی وصول کی تھی۔ تب خان جی نے داؤد کریمی سے شکایت کرنے کی بجائے اس سے مال خریدنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ داؤد کریمی نے چند ایک بار فون پر اس سے معذرت بھی کی تھی اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر خان جی نے اسے صاف انکار کر دیا تھا۔ اب خان جی اس پہلو پر سوچ رہا تھا۔ داؤد کریمی اس کے اہم بندے کو انتقاماً اغوا کر سکتا تھا کیونکہ خان جی نے گزشتہ چھ ماہ سے اس کے ایک حریف اسمگلر سے مال خریدنا شروع کر دیا تھا۔ فیروز لالہ نامی وہ اسمگلر بروقت اور نہایت ایمانداری کے ساتھ مال سپلائی کیا کرتا تھا، ان چھ ماہ کے دوران اس نے ایک بار بھی خان جی کو شکایت کا موقع نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے خان جی نے آگے بڑھ کر کونے میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد دوسری طرف سے کسی نے ہیلو کیا تو خان جی نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔

"ہم فیروز لالہ سے بات کرنا چاہتے ہیں؟ وہ کہاں ہے؟"

"خان جی! توڑا انتظار کرو ام بلا کے لاتا اے"۔ اس نے خالص پشتون لہجے میں اردو بولنے کے بعد ریسیور ہولڈ پر رکھ دیا تھا۔

"ہیلو"۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد ریسیور سے فیروز لالہ کی بھاری آواز سنائی دی۔ "خان جی آج آپ کے آدمی مال لینے کے لیے نہیں پہنچے تھے۔ آپ اگر زحمت نہ فرماتے تو ذرا دیر کے بعد میں خود فون کرنے والا تھا"۔ وہ نہایت صاف لہجے میں اردو بول رہا تھا۔

"لالہ! ہم نے تین آدمی بھیجے تھے"۔ خان جی نے کہا۔ "کیا زرولی نامی شخص آپ کے پاس نہیں پہنچا تھا؟"

"خان جی! کیسی بات کرتے ہو؟" وہ بولا۔ "زرولی اگر میرے پاس پہنچا ہوتا تو میں آپ سے شکایت کیوں کرتا؟"

"اس کا مطلب ہے کہ داؤد کریمی ہاتھ دکھا گیا ہے"۔ خان جی نے کہا۔ "ہمیں لگتا ہے زرولی کو اس نے اغوا کر لیا ہے ورنہ وہ آپ کے پاس ضرور پہنچتا۔ داؤد کریمی کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی"۔

"خان جی! یہ محض آپ کا شک بھی تو ہو سکتا ہے"۔ فیروز لالہ بولا۔ "داؤد کریمی بھلا آپ کے آدمی کو کیوں اغوا کرے گا؟"

"اس کو چھوڑو لالہ"۔ وہ بولا۔ "آپ مہربانی فرما کر اپنے ذرائع سے معلوم کریں، ہو سکتا ہے

کہ ہمارا یہ شک سچ ہی ہو"۔

"وہ تو میں معلوم کر ہی لوں گا خان جی"۔ اس نے کہا۔ "لیکن مال کا کیا ہوگا؟ وہ تو کب کا پڑا ہے، پارٹی کو میں نے پے منٹ بھی کرنی ہے"۔

"مال اور رقم کی فکر نہ کریں لالہ"۔ خان جی نے کہا۔ "چند روز تک موسیٰ خان آپ کے پاس زر لے کر پہنچ جائے گا اور مال لے جائے گا۔ آپ بس کسی طرح میرے آدمی زرولی کا پتہ لگانے کی کوشش کریں، وہ میرا بہت اہم کارندہ ہے، یوں سمجھیں وہ میرا ایک بازو ہے"۔

"آپ پریشان نہ ہوں"۔ وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔ "میں صبح ہوتے ہی اپنے آدمی کو اس کام پر لگا دوں گا، اگر آپ کا آدمی داؤد کریمی کے پاس ہوا تو اسے چھڑانا لالہ کا کام ہے۔ کوئی فکر ہی نہ کریں یہ لالہ کا وعدہ ہے"۔

خان جی نے "شکریہ" کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد دوبارہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں بدستور سر جھکائے ہوئے اپنے پیروں کو گھور رہے تھے۔

خان جی نپے تلے ہوئے قدم اٹھاتا دوبارہ ان کے عین سامنے پہنچ گیا۔

"زرولی اگر نہ ملا تو ہم تم دونوں کا بہت برا حشر کریں گے"۔ وہ سرد انداز میں بولا۔ "تم دونوں نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے"۔

"خا...... خان جی!" زید خان نے پہلی بار ڈرتے ڈرتے لب کشائی کی۔ "م...... میں نے وہاں جیپ کے آس پاس گھوڑے کی لید دیکھی تھی اور جناب......"

"تو اٹھا کر لے آئی تھی ناں گدھے کے بچے! صبح ناشتے میں کھا لیتے"۔ خان جی نے بھڑک کر قطع کلامی کی۔ "یہ کون سی اہم بات ہے ہمیں بتانے والی؟ وہ راستہ ہے وہاں پر گھوڑوں گدھوں کی لید تو نظر آئے گی"۔

"وہ...... وہ جی...... وہ لید اغوا کاروں کے گھوڑوں کی بھی تو ہو سکتی ہے؟" زید خان نے دوبارہ سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیونکہ لید ایک ہی جگہ پر پڑی ہوئی تھی۔ وہاں شاید گھوڑ سوار رکا رہا ہوگا"۔

"تو کیا لید پر اغوا کاروں کے نام لکھے ہوں گے؟" خان جی نے گرج کر پوچھا۔ "کتے کے بچے! کیوں اوٹ پٹانگ بک رہے ہو، کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟"

"م...... میرا مطلب یہ نہیں تھا خان جی"۔ وہ سٹپٹا کر بولا۔ "م...... میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں"۔

"بکو"۔ خان جی نے اسے غضب ناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا بکنا چاہتے ہو؟"



"وہ جی اغوا کاروں کا تعلق امین خان سے بھی تو ہو سکتا ہے ناں؟" زید خان بولا۔ "ہو سکتا ہے خان جی انہوں نے مولوی کا سراغ لگانے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہو"۔

"اوہ......" خان جی نے ایک دم چونکتے ہوئے کہا۔ "اس طرف تو ہمارا خیال ہی نہیں گیا تھا۔ امین خان سے ایسی توقع رکھی جا سکتی ہے آج کل وہ بہت اونچی ہوا میں اُڑ رہا ہے، جمال خٹک نے دن میں سپنے دکھانے شروع کر دیے ہیں"۔

اتنا کہنے کے بعد وہ ایک ثانیے کے لیے رکا اور پھر گل شیر خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جاؤ گاڑی نکالو ہم ابھی فارم ہاؤس جانا چاہتے ہیں"۔

گل شیر خان بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور خان جی بے چینی کے انداز میں ٹہلنے لگا۔

٭===٭===٭

خائستہ گل پسی ہوئی مرچیں اٹھا کر لے آیا تھا مگر زرولی بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ ناصر خان نے مرچیں اس کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف پڑی ہوئی میز پر رکھ دیں اور خائستہ گل کو فوراً ٹھنڈا پانی لانے کے لیے کہہ دیا۔ امین خان بدستور کرسی پر خاموشی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ناصر خان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مجھے اس سے اس قدر ضبط کی توقع نہیں تھی مگر آپ فکر نہ کریں زبان تو اس کا باپ بھی کھولے گا"۔

"اس کی زبان جتنی جلدی کھل جائے ہمارے حق میں بہتر ہوگا"۔ امین خان بولا۔ "اب تک تو اس کے ساتھی حرکت میں آ چکے ہوں گے"۔

"پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے خان صاحب"۔ وہ لاپرواہی سے بولا۔ "اس کے ساتھی ایک دو روز تک اسے افغانستان کے بارڈر پر تلاش کرتے رہیں گے۔ تب تک ہم اپنا کام دکھا چکے ہوں گے"۔

اس دوران خائستہ گل ٹھنڈے پانی کا جگ بھر کے لے آیا تھا۔ ناصر خان نے اسے زرولی کے چہرے پر پانی ڈالنے کا کہتے ہوئے میز پر رکھا ہوا وہ شفاف پلاسٹک کا گول ڈبہ اٹھا لیا جس میں پسی مرچیں تھیں۔ اس نے ڈبے کا ڈھکن کھولا اور پھر ہوش میں آتے ہوئے زرولی کے قریب پہنچ گیا۔ خائستہ گل نے پانی کا پورا جگ ہی اس کے چہرے پر انڈیل دیا۔ پانی نے زرولی کے سر کے بال اور گریبان تک بھگو دیا تھا۔ ذرا دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا مگر خود پر جلاد کی صورت میں جھکے ہوئے ناصر خان کو دیکھ کر اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

"زرولی!" ناصر خان اسے بے رحم انداز میں پکارتے ہوئے بولا۔ "آنکھیں بند کر لینے سے زرولی نہیں جاتا۔ جب تک تم ہمیں مولانا صاحب کے بارے میں نہیں بتاؤ گے ہم تمہاری جان نہیں

چھوڑیں گے۔ خود پر ترس کھاؤ کیوں اپنی جوانی مٹانے پر تل گئے ہو؟''

زرولی چپ رہا، ناصر خان نے ایک لمحہ انتظار کیا اور پھر اس کے زخم پر مرچیں چھڑک دیں۔ کے ساتھ ساتھ نا قابل برداشت جلن نے زرولی کو دوبارہ چلانے پر مجبور کر دیا۔ ناصر خان نے مرچ والا ڈبہ خائستہ گل کو تھما کر چاقو نکالا اور جھک کر زرولی کے سر کے بال جکڑ لیے۔

''بولو''۔ وہ سرد لہجے میں غرایا۔ ''ورنہ پورے بدن پر ایسے ہی گھاؤ لگا کر ان کے اوپر مرچ چھڑکتا جاؤں گا''۔

زرولی بولنے کی بجائے بدستور چلانے میں مشغول رہا معاً امین خان کرسی سے اٹھا اور ناصر خان کے قریب جا کر بولا۔ ''لاؤ چاقو مجھے دو، یہ ایسے زبان نہیں کھولے گا''۔

ناصر خان نے چاقو اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ امین خان نے ایک نظر چاقو کی دھار پر ڈالی اور پھر اسے زرولی کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھے سوچنے کے لیے دو منٹ دیتا ہوں اس کے بعد بھی اگر تم نے زبان نہ کھولی تو میں تجھے ہیجڑہ بنا دوں گا۔ غور سے دیکھو اس چاقو کی دھار ایک ہی جھٹکے میں تجھے تالی بجانے والوں کی صف میں شامل کر دے گا''۔

اتنا کہنے کے بعد امین خان نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ جب ایک منٹ گزر گیا تو اس نے خائستہ گل کو حکم دیا۔ ''زرولی کی شلوار کا کمر بند پکڑ لو جونہی میں اشارہ کروں کھینچ کر کھول دینا''۔

''بے فکر رہیں خان جی''۔ خائستہ گل نے جھٹ سے جواب دیتے ہوئے زرولی کا کمر بند پکڑ لیا۔

امین خان بدستور گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا اس نے زرولی کی بدلتی ہوئی رنگت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ امین خان کے چہرے پر چھائی سنجیدگی دیکھ کر زرولی کے دل میں پہلی بار خوف پیدا ہوا تھا۔ امین خان کا انداز دیکھ کر لگتا تھا جو اس نے کہا ہے بلا تردد اس پر عمل کر ڈالے گا۔ ایک منٹ ہونے میں ابھی چند سیکنڈ باقی تھے کہ امین خان نے آگے بڑھ کر خائستہ گل کو اشارہ کر دیا۔ خائستہ گل نے ایک جھٹکے سے زرولی کا کمر بند کھینچ دیا مگر امین خان کے جھٹکنے سے پہلے زرولی چلایا۔

''نن...... نہیں...... خدا کے لیے یہ ظلم مت کرو...... مم...... میں سب کچھ بتاتا ہوں۔ مجھے چھوڑ دو...... خدا کے لیے چھوڑ دو''۔

امین خان نے دوبارہ خائستہ گل کو اشارہ کیا تو اس نے بلا تردد زرولی کا کمر بند باندھ دیا۔ اس کے بعد امین خان، کراہتے ہوئے زرولی سے مخاطب ہوا۔ ''اگر تم نے ہمیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی مزید نقصان پہنچائے بغیر یہاں سے جانے دیا جائے گا''۔

''خدا کی قسم میں سب کچھ سچ سچ بتاؤں گا''۔ زرولی نے جھٹ سے جواب دیا۔



''ٹھیک ہے''۔ امین خان نے کہا۔ ''اب بتاؤ مولانا نصیب اللہ کہاں ہے؟''

''خان جی کے شہر والے فارم ہاؤس میں ہے''۔ زرولی نے بتایا۔ ''ہم نے اسے خان جی کے کہنے پر اغوا کیا تھا''۔

اس کے بعد امین خان کے استفسار پر زرولی نے سارا واقعہ بلا کم و کاست بیان کر دیا۔

''ہم اس کی تصدیق کرنے کے بعد تجھے چھوڑ دیں گے''۔ امین خان نے ساری کہانی سننے کے بعد کہا۔ ''لیکن اگر یہ جھوٹ ہوا تو پھر ہم سے کسی رحم کی توقع مت رکھنا''۔

اتنا کہنے کے بعد امین خان نے ناصر خان اور خائستہ گل کو اس کی مرہم پٹی کرنے اور اسے کھانا وغیرہ کھلانے کا حکم سنا دیا۔

·:· ===·:· ===·:·

جمشید خان اپنے آفس میں بیٹھا ایک فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ دو روز قبل اس نے آصف نامی دہشت گرد کے بتائے گئے فون نمبر کے ذریعے ایک مکان ٹریس کر لیا تھا۔ مکان دو تین بار چیک کرنے کے باوجود انہیں خالی ملا تھا تاہم جمشید خان نے سول کپڑوں میں ایک پولیس اہلکار کی وہاں ڈیوٹی لگا دی تھی۔ وہ اہلکار نیا نیا پولیس میں بھرتی ہوا تھا اس لیے پولیس مین اسے زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے، وہ بے فکر انداز میں مکان کی نگرانی کر رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد جمشید خان نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور فون کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو ارباب بھائی بات کر رہا ہوں''۔ تیسری بیل پر ہی دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

''بابو بھائی! بادشاہ کہاں ہے؟'' جمشید خان نے بلاتمہید پوچھا۔

''اوہ...... صاحب جی آپ''۔ بابو بھائی فوراً مؤدب انداز اپناتے ہوئے بولا۔ ''بادشاہ صاحب جی ہال میں بیٹھا ہوا ہے، اس نے حسب معمول جوئے کی محفل جما رکھی ہے۔ کیا اس بات کرنی ہے؟''

''ہاں، بات تو کرنا تھی''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''اسے بلاؤ میں ہولڈ کرتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے صاحب جی! میں ابھی اسے بلاتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر بابو بھائی نے ریسیور پر رکھ دیا۔

''السلام علیکم سر!'' چند لمحوں کے بعد ریسیور سے بادشاہ کی آواز ابھری۔ ''کیسے یاد فرمایا''

''اس نئے روپ میں کسی نے تجھے پہچانا تو نہیں؟'' جمشید خان نے سوال کیا۔

''آپ کے سوا کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا جناب''۔ وہ بولا۔ ''یہ بات صرف ہم دو معلوم ہے، آپ بے فکر رہیں''۔

''او کے''۔ جمشید خان بولا۔ ''بنگش کا کوئی آدمی ٹکرایا کہ نہیں؟''



''ابھی تک تو نہیں ٹکرایا، بہر کیف میں پُر امید ہوں بہت جلد میری شہرت بنگش کے کانوں تک پہنچ جائے گی''۔ اس نے پُر امید انداز میں جواب دیا۔

''او کے کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ؟'' جمشید خان نے پوچھا۔

''نہیں بابو بھائی سب ضرورتیں بن کہے پوری کر دیتا ہے''۔ بادشاہ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا میں پھر بات کروں گا''۔ اتنا کہنے کے بعد جمشید خان نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ پورا دن جمشید خان نے آفس میں ہی گزار دیا تھا۔ شام ڈھلے جب وہ آفس سے باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ عین اسی وقت اے ایس آئی کامران تقریباً دوڑتا ہوا آفس میں داخل ہوا اور سلیوٹ مارنے کے بعد بولا۔ ''سر! ابھی ابھی مکان کی نگرانی کرنے والے کانسٹیبل نے اطلاع دی ہے کہ وہاں کچھ لوگ داخل ہو چکے ہیں''۔

''اوہ''۔ جمشید خان یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''فوراً موبائل پارٹی تیار کرو، ہم ابھی اس مکان پر چھاپہ ماریں گے''۔

''جو حکم سر''۔ اے ایس آئی الٹے قدموں تیزی سے باہر نکل گیا۔

پندرہ منٹ کے بعد پولیس موبائل تیزی سے مطلوبہ مکان کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ جمشید خان ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر موجود تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہی وہ اس علاقے میں پہنچ گئے اور پھر عین اس مکان کے سامنے پہنچ کر انہوں نے موبائل روک دی لیکن ابھی وہ گاڑی کے اندر ہی تھے کہ اچانک ان پر فائرنگ شروع ہو گئی اور یہ فائرنگ مکان کے اندر سے کی جا رہی تھی۔ پہلی گولی موبائل کے ڈرائیور کو لگی تھی۔ تمام پولیس اہلکار چھلانگیں لگاتے ہوئے تیزی سے نیچے اترے اور پھر پوزیشنیں سنبھال کر جوابی فائرنگ کرنے لگے۔

جمشید خان نے موبائل سے چھلانگ لگاتے ہی زخمی ڈرائیور کو بھی نیچے کھینچ لیا تھا اور پھر تقریباً اسے گھسیٹتا ہوا سامنے والے مکان کی دیوار کی آڑ میں چلا گیا۔ گولی ڈرائیور کی ران میں لگی تھی اور خون بے تحاشا بہہ رہا تھا۔

''ہمت کرو امیر جان!'' جمشید خان اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اس آڑ سے نہیں نکلنا، ہم ان لوگوں کو بچ کر نہیں جانے دیں گے''۔

زخمی ڈرائیور کو تسلی دینے کے بعد وہ دوڑتا ہوا دوبارہ موبائل کی آڑ میں پہنچ گیا، ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ تمام پولیس والے مختلف جگہوں پر پوزیشن لے کر مکان پر زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔ اردگرد کے سارے مکان تاریکی میں ڈوب چکے تھے، فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی

لوگوں نے لائٹس بجھادی تھیں۔

مکان سے آٹومیٹک رائفلوں سے فائرنگ کی جارہی تھی۔ ان کی موبائل کے پہنچتے ہی جس طرح فائر کھول دیا گیا تھا اس سے جمشید خان کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ پہلے سے ہوشیار تھے اور انہیں پولیس کی آمد کی توقع تھی۔ وہ کچھ دیر تک موبائل کی آڑ میں کھڑا رہا، پھر اس نے موبائل کی کھڑکی کھول کر ڈیش بورڈ کے خانے میں نصب وائرلیس کا ریسیور اٹھالیا وائرلیس آن تھا اور ایمرجنسی کنٹرول روم سے صدر تھانے کے لیے کوئی پیغام نشر کیا جارہا تھا۔

جمشید خان نے ریسیور اٹھاتے ہی وائرلیس کا ایک بٹن پریس کر دیا تھا وہ گاڑی کے باہر ہی جھک کر بیٹھ گیا اور ایمرجنسی کنٹرول روم کو اپنی لوکیشن بتا کر نفری طلب کرنے لگا۔ اسی وقت مکان سے چلائی جانے والی چند گولیاں ونڈ اسکرین پر لگیں، شیشہ چکنا چور ہوگیا اور کرچیاں جمشید خان کے اوپر گری تھیں۔ اس نے جلدی سے پیغام نشر کیا اور وائرلیس کا ریسیور لٹکتا چھوڑ کر چوکنے انداز میں دہشت گردوں والے مکان کا جائزہ لینے لگا۔ بائیں طرف ایک مکان کی صحن والی دیوار کی آڑ میں دو پولیس والے پوزیشن لیے فائرنگ کر رہے تھے۔ جمشید خان زگ زیگ انداز میں دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان میں ایک تو اے ایس آئی کامران تھا جبکہ دوسرا ہیڈ کانسٹیبل سیّد گل تھا۔

''سیّد گل''۔ جمشید خان نے ہیڈ کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اس مکان کی عقبی دیوار پر چڑھ کر مکان کی چھت پر پہنچنے کی کوشش کرو اور کامران تم بائیں طرف والے اس مکان کی چھت پر چلے جاؤ''۔ اس نے مطلوبہ مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''میں خود اس پڑوس والے مکان کی چھت پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہم چاروں اطراف سے انہیں گھیرنے کی کوشش کریں گے کسی کو بھی بچ کر نہیں جانا چاہیے۔ اگر کوئی فرار ہونے کی کوشش کرے تو بھون ڈالو اسے، کوئی بھی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے''۔

اس کے بعد اس نے دوسرے اہلکاروں کو چیخ کر فائرنگ جاری رکھنے کا حکم دیا اور پھر ہیڈ کانسٹیبل سیّد گل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ سیّد گل دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا جونہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا جمشید خان نے اے ایس آئی کامران کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

اے ایس آئی کامران کا ٹاسک خطرناک تھا، اسے سڑک پر سے گزر کر اس مکان تک پہنچنا تھا۔ وہ دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بھی بن سکتا تھا مگر وہ ایک بہادر آفیسر تھا ڈرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے پاس آٹومیٹک رائفل تھی ایک میگزین فٹ تھا، دوسرا فاضل میگزین اس کے ساتھ ہی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ دو اور فاضل میگزین اس کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے تھے۔

حکم ملنے کے بعد وہ فوراً حرکت میں آگیا اور دہشت گردوں کی جانب فائرنگ کرتے ہوئے



مطلوبہ مکان کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا جس کی چھت پر اسے پہنچنا تھا۔ اس کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی اور وہ بخیر وخوبی مطلوبہ مکان کی دیوار کی آڑ میں پہنچ گیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ وہاں رکا اور پھر دوڑتا ہوا مکان کی عقبی جانب پہنچ گیا۔

اب جمشید خان کی باری تھی، اسے دہشت گردوں والے مکان کے پڑوس والے مکان میں پہنچنا تھا اور پھر اس مکان کی چھت سے اسے دہشت گردوں والے مکان کی چھت تک پہنچنا تھا۔ یہ ٹاسک انتہائی خطرناک تھا لیکن جمشید خان ایسے خطروں سے کھیلنے کا عادی تھا۔ وہ گولیوں کی گونج کو موسیقی سمجھنے والا آفیسر تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے دائیں بائیں دیکھا، وہ جس مکان کی آڑ میں تھا اب اس کی چھت سے بھی فائرنگ شروع ہوگئی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل سیّد گل چھت پر پہنچ چکا ہے۔ اس نے گردن گھما کر بائیں طرف دیکھا تو اے ایس آئی کامران بھی مطلوبہ مکان کی چھت پر پہنچ کر فائرنگ شروع کر چکا تھا۔ اس نے چیخ کر تمام اہلکاروں کو فائرنگ جاری رکھنے کا حکم دیا اور پھر خود بھی فائرنگ کرتا اپنی کمین گاہ سے نکلا اور دوڑتا ہوا پڑوس والے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے دائیں بائیں سے سنسناتی ہوئی گولیاں گزر رہی تھیں مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ ابھی وہ گلی کے وسط میں ہی تھا کہ ایک گولی زناٹے کی آواز سے اس کے کان کے بالکل نزدیک سے گزر گئی، اس نے فوراً جست لگائی اور سانپ کی سی تیزی سے رینگتا ہوا مکان کی دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ ایک منٹ ستانے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ریوالور کو اس نے ہولسٹر میں اڑس دیا اور دونوں ہاتھ دیوار پر جما کر اوپر چڑھنے کے بعد فوراً دوسری جانب کود گیا۔

اس نے سنبھلتے ہوئے ریوالور دوبارہ ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اب وہ انتہائی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ مکان بالکل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، مکینوں نے خوف کی وجہ سے تمام لائٹس بجھا رکھی تھیں۔ جمشید خان مکان کے رہائشی حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ابھی وہ ایک کمرے کی کھڑکی سے چند قدم دور ہی تھا کہ معاً بچوں اور عورتوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا جیسے دہشت گردوں نے انہیں یرغمال بنا رکھا ہو۔ جمشید خان ایک ثانیے کے لیے رکا اور پھر دبے پاؤں کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ ریوالور کا دستہ مار کر اس نے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ اندر سے آنے والی چیخوں کی آواز کچھ اور تیز ہوگئی تھی۔

چیخوں کی آواز سنتے ہی جمشید خان ٹوٹے ہوئے شیشہ پر جھک کر اندر جھانکنے لگا مگر تاریکی میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا، تاہم چیخوں کی آوازیں برابر آرہی تھیں۔

''تمہیں چاروں طرف سے پولیس نے گھیر رکھا ہے''۔ ایک لمحہ توقف کے بعد وہ بارعب انداز میں بولا۔ ''ہتھیار پھینک کر خود کو پولیس کے حوالے کر دو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے''۔

''چلاؤ مت بے وقوفو! یہ پولیس والا ہے''۔ اندر کسی مرد کی آواز گونجی اور جمشید خان کو

صورتِ حال سمجھنے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہ لگی۔ دراصل کمرے میں پناہ گزین لوگوں نے اسے دہشت گردوں کا ساتھی سمجھ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔

''ڈرومت''۔ صورتِ حال واضح ہوتے ہی اس نے ٹوٹے ہوئے شیشے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔ ساتھ والے مکان میں دہشت گرد موجود ہیں، پولیس نے انہیں گھیر رکھا ہے، آپ مجھے مکان کی چھت پر جانے کا راستہ بتا دیں میں وہاں سے دہشت گردوں والے مکان کی چھت پر کود جاؤں گا۔ پلیز آپ لوگ ڈریئے نہیں، آپ کو کچھ بھی نہیں ہوگا''۔

عورتوں اور مردوں نے چیخنا چلانا بند کر دیا لیکن بچے بدستور اونچی آواز میں رو رہے تھے۔ ایک آدمی نے ہمت کر کے دروازہ کھول دیا۔ جمشید خان فوراً اندر داخل ہو گیا اور آدمی نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ ''اس طرف آیئے صاحب''۔ وہ آدمی بولا۔ ''خدا غارت کرے امن کے ان دشمنوں کو مجھے ان کے بڑے لڑکے پر کب کا شبہ تھا، شکل سے ہی آوارہ اور غنڈہ لگتا ہے، کام کاج کچھ کرتا نہیں مگر نئی نئی گاڑیوں میں گھومتا ہے۔ باپ کی بھی اتنی حیثیت نہیں ہے کسی سرکاری محکمے میں معمولی سا کلرک ہے۔ پھر بیٹے کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی؟''

''پلیز''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''مجھے اوپر جانے کا راستہ بتایئے، یہ باتیں بعد میں کر لینا''۔

''آیئے صاحب آیئے میں آپ کو اوپر پہنچنے کا راستہ بتاتا ہوں''۔

اتنا کہہ کر وہ شخص کمرے کے دوسرے دروازے سے نکل کر راہداری میں پہنچ گیا۔ راہداری کے اختتام پر پچھلی طرف نکلنے والا دروازہ تھا اور اس کے ساتھ ہی چھت پر جانے کے لیے زینے بنے ہوئے تھے۔

''شکریہ''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''آپ لوگ اس کمرے میں ہی محدود رہیے اور سب لوگوں کو کمرے کی کھڑکیوں سے ہٹا کر رکھیں''۔

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ راہداری میں بلب جل رہا تھا مگر اس کی روشنی باہر سے نہیں دیکھی جا سکتی تھی تاہم سیڑھیوں پر مدہم سی روشنی موجود تھی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر فولادی دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ جمشید خان نے احتیاط سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں باہر نکل کر چھت پر سینے کے بل رینگتا ہوا اس کے کنارے کی طرف بڑھنے لگا جو دہشت گردوں کے مکان سے ملحق تھا۔ چھت کے کنارے پر تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی منڈیر تھی۔ منڈیر کے نزدیک پہنچ کر وہ رک گیا۔ ابھی وہ اردگرد کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ معاً ایک ساتھ دو چیخیں سنائی دیں ایک چیخ دہشت گردوں والے مکان کی طرف سے آئی تھی جبکہ دوسری سامنے والے مکان سے۔ اس نے منڈیر سے سر نکال کر دیکھا تو اسے ہیڈ کانسٹیبل سید گل لڑکھڑاتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل



بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چند لمحے لڑکھڑانے کے بعد وہ چھت پر گر گیا۔ اسے گولی لگی تھی مگر جمشید خان اس وقت اس کے لیے کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا سوائے اسے زندگی کی دعا دینے کے۔

جمشید خان نے کھڑے ہو کر دوسری طرف دیکھا، دہشت گردوں والے مکان کی چھت لگ بھگ تین فٹ نیچے تھی۔ وہ اس چھت پر کودنے ہی والا تھا کہ مکان کے زینے سے دو آدمی بھاگتے ہوئے اوپر پہنچ گئے، دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک اگلے مکان کی چھت کی طرف دوڑا جبکہ دوسرا اسی مکان کی چھت پر بنے ہوئے ایک کمرے کی طرف بھاگا۔ جمشید خان نے مخالف سمت میں دوڑنے والے لے آدمی کا نشانہ لے کر ریوالور کا ٹرائیگر دبا دیا۔ یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے، ایک گولی ضائع گئی تھی جبکہ بقیہ دو گولیاں نشانے پر لگی تھیں۔ ایک دوڑتے ہوئے دہشت گرد کی کھوپڑی میں لگی تھی اور دوسری اس کی پشت میں وہ کربناک انداز میں چیختے ہوئے چھت پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کا دوسرا ساتھی کمرے میں گھس چکا تھا۔ یہ اسٹور نما کمرہ کار پورچ کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا، اس نے کمرے میں گھستے ہی کھڑکی سے گلی میں موجود پولیس والوں پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ جمشید خان نے ایک ثانیے کے لیے سوچا اور پھر بڑی احتیاط سے اس مکان کی چھت پر اتر گیا، اس کے کودنے سے ہلکی سی ''دھپ'' کی آواز پیدا ہوئی تھی مگر یہ آواز فائرنگ میں دب کر رہ گئی تھی۔ وہ دبے قدموں سے کمرے کی جانب بڑھنے لگا ابھی اس نے چند فٹ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک اسے زینے سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اس نے کوئی آڑ ڈھونڈنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھت پر مختلف جگہوں پر تقریباً پانچ پانچ فٹ اونچے ستون اٹھے ہوئے تھے جو غالباً دوسری منزل تعمیر کرنے کی غرض سے بنائے گئے تھے۔

جمشید خان نے بلا سوچے سمجھے جست لگائی اور ستون کے عقب میں لیٹ گیا۔ زینے سے آنے والا آدمی سامنے آ چکا تھا، اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ قدرے ہراساں انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک دم وہ پلٹا اور اس مکان کی چھت کی طرف دوڑ لگا دی جہاں سے جمشید خان آیا تھا، وہ یقیناً اس طرف سے فرار ہونا چاہتا تھا۔

''رک جاؤ''۔ جمشید خان نے چلا کر اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے ریوالور کی زد پر ہو، گولی مار دوں گا''۔

جمشید خان کی وارننگ سن کر وہ ایک دم رک گیا اور پھر پلٹ کر آواز کی سمت اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ چند گولیاں جمشید خان کے سامنے موجود ستون پر لگیں اور کئی اس کے اوپر اور دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ فائرنگ کرنے کے بعد وہ دوبارہ چھت کی طرف دوڑا، چھت تقریباً

تین فٹ اونچی تھی۔ دہشت گرد نے اچھل کر چھت پر چڑھنے کی کوشش کی، جمشید خان نے اسے فرار ہوتے دیکھ کر فائر کھول دیا۔ ایک گولی دہشت گرد کی ٹانگ پر لگی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی مگر وہ دوسری چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جمشید خان نے ستون کے عقب سے نکل کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ منڈیر پکڑ کر وہ دوسری چھت پر پہنچا اور لنگڑا کر بھاگتے ہوئے دہشت گرد پر فائرنگ شروع کر دی۔ ریوالور سے صرف دو گولیاں ہی نکلیں تھیں۔ تیسری مرتبہ ٹرائیگر دبانے سے صرف ''ٹرچ'' کی آواز ہی ابھری تھی ریوالور خالی ہو چکا تھا لیکن اس کی چلائی ہوئی دو گولیوں میں سے ایک گولی نے کام دکھا دیا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے دہشت گرد کے بازو میں لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا چھت پر ڈھیر ہوگیا، رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری تھی۔ جمشید خان بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ دہشت گرد زخمی ہونے کے باوجود زینے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمشید خان نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا، اس کی ہر ٹھوکر اسے خارش زدہ کتے کی طرح چلانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اسے چند زوردار ٹھوکریں مارنے کے بعد جمشید خان نے جھک کر اس کی رائفل اٹھالی اور رائفل کی نال اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے سرد انداز میں بولا۔ ''اب اگر تم نے اپنی جگہ سے معمولی سی بھی حرکت کی تو کھوپڑی میں روشندان بنا دوں گا''۔

دہشت گرد نے خوف زدہ ہو کر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔

چھت پر اسٹور نما کمرے میں چھپا ہوا دہشت گرد بدستور گلی میں موجود پولیس والوں پر فائرنگ کر رہا تھا پولیس اہلکار بھی مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ جمشید خان نے زخمی دہشت گرد کو ایک ٹھوکر لگا کر کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اسے گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے چھت کے اس کنارے تک لے گیا جہاں سے چھت پر موجود کمرے کی کھڑکی سے اس کا دوسرا ساتھی پولیس والوں پر فائرنگ کر رہا تھا۔

''سنو''۔ جمشید خان اسے چیخ کر وارننگ دیتے ہوئے بولا۔ ''فائرنگ بند کر کے باہر آجاؤ ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔ تمہارے دو ساتھی مارے جا چکے ہیں اور ایک نے ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دیا ہے''۔ اس نے ایک لمحہ انتظار کیا، اس دوران کمرے میں چھپے ہوئے دہشت گرد نے فائرنگ بند کر دی تھی۔ ''اب ہاتھ اٹھا کر کمرے سے باہر آجاؤ''۔ جمشید خان نے دوبارہ چلا کر کہا۔ ''تمہارے پاس صرف چند سیکنڈ کا وقت ہے، میں تین تک گنوں گا اس کے بعد جو ہوگا اس کے متعلق تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہوسکتا ہے ہم یہ کمرہ ہی اُڑا دیں''۔

اتنا کہنے کے بعد جمشید خان نے گنتی شروع کر دی۔ اس کے تین کہنے سے پہلے ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے کمرے سے باہر گیا۔ چھت کے وسط تک



پہنچ کر وہ رک گیا۔ دونوں ہاتھ اس نے بدستور اٹھائے رکھے۔

جمشید خان نے اپنے قدموں میں پڑے ہوئے زخمی دہشت گرد کو زوردار ٹھوکر لگاتے ہوئے آگے بڑھنے کے لیے کہا۔ زخمی دہشت گرد بڑی مشکل سے اٹھا، اس کے بازو اور ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ منڈیر کے قریب پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ کوشش کے باوجود دوسری چھت پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اس کی کوشش رائیگاں جاتی دیکھ کر جمشید خان نے اسے اٹھا کر بے دردی سے دوسری چھت پر لڑھکا دیا اور پھر خود بھی اچھل کر منڈیر کے دوسری جانب کود گیا۔

''انور!'' دوسری چھت پر پہنچتے ہی جمشید خان نے بلند آواز سے ایک کانسٹیبل کا نام پکارا۔ ''دو آدمیوں کو نیچے چھوڑ کر باقی سب لوگ اوپر آجاؤ''۔

ذرا دیر کے بعد چار کانسٹیبل دوڑتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ جمشید خان کے حکم پر انہوں نے دونوں دہشت گردوں کو باندھ کر ڈال دیا۔ جمشید خان نے ایک کانسٹیبل کو ان کی نگرانی پر مامور کیا اور باقی کو ساتھ لے کر کمرے میں گھس گیا۔ بتی جلانے کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ایک طرف ایک بیڈ بچھا ہوا تھا جس پر غیر ملکی ساخت کی ایک آٹومیٹک رائفل پڑی ہوئی تھی۔ لاتعداد خالی کارتوس بستر اور فرش پر بکھرے ہوئے تھے، کمرے کے ایک کونے میں لکڑی کی ایک الماری ایستادہ تھی، الماری سے قدرے ہٹ کر ایک ٹیبل اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ٹیبل پر چند کتابیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

جمشید خان نے آگے بڑھ کر الماری کھولنا چاہی مگر وہ مقفل تھی۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا تو اس نے رائفل کی ضربیں لگا کر تالا توڑ دیا۔ جمشید خان نے الماری کا پٹ کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ الماری کے ایک خانے میں آٹھ دستی بم، دس ریوالور، سولہ ٹی ٹی پستول رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے خانے میں تین جدید ترین وائرلیس سیٹ پڑے ہوئے تھے۔ سب سے نچلے خانے میں سات کلاشنکوف رائفلیں اور کئی میگزین رکھے ہوئے تھے۔

الماری کو چھوڑ کر جمشید خان نے بیڈ کے نیچے جھانکا تو اسے لکڑی کا بنا ہوا ایک مربع صندوق نظر آیا۔ اسے کھینچ کر بیڈ کے نیچے سے نکالا گیا۔ صندوق بھی مقفل تھا، رائفل کی ضربیں لگا کر تالا توڑا گیا۔ صندوق کے اندر دو عدد لائٹ مشین گنیں اور لاتعداد گولیاں موجود تھیں۔

''یہ تمام اسلحہ نکال کر بستر پر ڈھیر کر دو''۔ جمشید خان نے کمرے میں موجود کانسٹیبلوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نیچے جا رہا ہوں''۔

کمرے سے باہر نکل کر وہ بندھے ہوئے دہشت گردوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں اب دو اور کانسٹیبل بھی پہنچ چکے تھے۔

''ان دونوں کو نیچے لے آؤ''۔ اس نے دہشت گردوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کانسٹیبلوں کو حکم دیا اور خود زینے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد دونوں دہشت گردوں کو نیچے پہنچا دیا گیا۔ روشنی میں زخمی دہشت گرد کی شکل دیکھ کر جمشید خان چونک گیا۔ وہ اشرف نامی دہشت گرد کا وہی ساتھی تھی جو تہہ خانے سے جان بچا کر بھاگ نکلا تھا۔ جمشید خان اس سے کچھ پوچھنے کی بجائے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کے اندر تین کانسٹیبل موجود تھے۔ جنہوں نے تلاشی کے بہانے گھر کا سارا سامان الٹ پلٹ دیا تھا۔ الماریاں کھلی ہوئی تھیں اور کمرے کے فرش پر سامان بکھرا ہوا تھا۔ ایک کانسٹیبل کی پتلون کی جیب سے ہزار ہزار والے پرائز بانڈز کے بنڈل کا ایک کونا جھانک رہا تھا جبکہ دوسرا کانسٹیبل نوٹوں کی ایک گڈی جیب میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمشید خان کو اچانک ہی اپنے سامنے پا کر وہ تینوں بوکھلا اٹھے۔

''یہ...... یہ کیا رہے ہو تم لوگ؟'' جمشید خان نے انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

''سس...... سر جی...... یہ...... تو ہمارا حق بنتا ہے''۔ ایک کانسٹیبل نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

''تم لوگ لیٹرے ہو کہ محافظ؟'' جمشید خان نے غصے سے کہا۔ ''ایک سیکنڈ میں اپنی جیبیں خالی کر دو جو کچھ بھی ہے نکال کر اس ٹیبل پر رکھ دو''۔

''مائی باپ! آپ بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں''۔ دوسرا کانسٹیبل بولا۔ ''ہم نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ معرکہ سر کیا ہے، ہمارا بھی تو کچھ حق......''

''جیبیں خالی کرو''۔ جمشید خان نے غرا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ تینوں کو یہیں سے گھر بھجوا دوں گا''۔

تینوں کانسٹیبلوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بلاتردد اپنی اپنی جیب پرائز بانڈ اور کرنسی نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیئے۔

اس کارروائی کے بیس منٹ بعد پولیس کی دو موبائلز وہاں پہنچ گئیں۔ پولیس کے جوانوں ایک بڑے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ایک موبائل میں علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او تھا، اس نے لیٹ پہنچنے کی جو وجہ بیان کی تھی وہ خاصی دلچسپ تھی۔ یعنی ہم فائرنگ کی وجہ سے بروقت علاقے میں داخل نہ ہو سکے تھے۔

''مطلب پولیس کو صرف اس جگہ موجود ہونا چاہیے جہاں مکمل امن و سکون ہو؟'' جمشید خان نے استہزائیہ انداز میں سوال کیا اور ایس ایچ او کا سر ندامت سے جھک گیا۔

جمشید خان نے اسے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی تھی، اس دوران وہاں ڈی آئی جی، پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز پہنچ گئے۔ اس طرح ایس ایچ او کی جان چھوٹ گئی تھی، جمشید خان اب



آئی جی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

اس آپریشن کے دوران ہیڈ کانسٹیبل سید گل جان بحق اور دو کانسٹیبل زخمی ہو گئے تھے۔ دہشت گردوں کے دو ساتھی مارے گئے تھے۔ ایک زخمی ہوا تھا جبکہ چوتھے کو جوان سب کا سرغنہ تھا ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ سرغنے کا نام نذیر عرف جیرا کالیا تھا۔

✣ ===✣=== ✣

زرولی نے نامرد بننے کی بجائے امین خان اور اس کے ساتھیوں کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ مولانا نصیب اللہ کے اغوا کی پوری کہانی سنانے کے بعد زرولی نے رحم طلب انداز میں کہا۔ ''امین خان! خدا کی قسم میں نے تم لوگوں کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے، اب تو مجھے جانے دو''۔

''بالکل جانے دیں گے فکر نہ کرو''۔ امین خان اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال تم میرے چند سوالوں کے جوابات دے دو اس کے بعد ہم نہ صرف تمہارا علاج کریں گے بلکہ تمہیں عزت و احترام کے ساتھ یہاں سے رخصت بھی کر دیں گے''۔

''پوچھو''۔ زرولی نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

''خان جی کا فارم ہاؤس کہاں واقع ہے، پوری تفصیل کے ساتھ بتاؤ؟'' امین خان نے سوال کیا۔

''شہر سے تقریباً تیس کلومیٹر مشرق کی طرف جہاں خان جی کی جاگیر ہے۔ وہیں فارم ہاؤس بھی موجود ہے''۔ زرولی نے بلاتردد جواب دیا۔

''وہاں کتنے آدمی ہوتے ہیں؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''ویسے تو تین آدمی ہوتے ہیں''۔ زرولی بولا۔ ''مگر ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے''۔

''مولانا صاحب کو وہاں کس جگہ رکھا گیا ہے؟'' امین خان نے پوچھا۔

''وہیں ایک کمرے میں رکھ گیا ہے''۔ اس نے قدرے الجھے ہوئے انداز میں جواب دیا شاید اسے امین خان سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔

امین خان اس کا مطلب بھانپتے ہوئے بولا۔ ''یہ سوال میں نے اس لیے کیا ہے کہ خان جی جیسے لوگ تہہ خانے بنانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے فارم ہاؤس میں بھی کوئی تہہ خانہ موجود ہو جہاں مولانا صاحب کو رکھ گیا ہو؟''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے''۔ زرولی نے کہا۔ ''میں وہاں کبھی کبھار ہی جاتا رہتا ہوں البتہ وہاں موجود مستقل رہنے والے آدمیوں کو ضرور معلوم ہو گا''۔

''فارم ہاؤس پر کتے تو رکھے ہوئے ہوں گے خان جی نے؟'' امین خان نے سوال کیا۔

"ہاں"۔ زرولی بولا۔ "تین کتے وہاں ہر وقت موجود رہتے جو دن کے وقت بھی کھلے رہتے ہیں"۔

"بہت شکریہ زرولی"۔ امین خان نے کہا۔ "ہم تمہیں پرسوں صبح رہا کر دیں گے۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ دو دن ہم تمہیں ایک مہمان کی طرح رکھیں گے۔ یہاں تمہارے کھانے پینے، علاج اور آرام کا مکمل خیال رکھا جائے گا"۔

"تم نے تو کہا تھا کہ ان چند سوالات کے جواب حاصل کرنے کے بعد تم مجھے جانے دو گے"۔ وہ شکایتی انداز میں بولا۔ "مگر اب اپنے کہے سے مکر رہے ہو، کس لیے؟"

"دیکھو زرولی!" امین خان نے کہا۔ "میں اپنے وعدہ سے کبھی نہیں مکرتا۔ میں نے کہا ہے نا کہ پرسوں صبح ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ یہ ہم دونوں کے مفاد میں ہے، تمہارا علاج بھی ہو جائے گا اور تمہاری کہی گئی باتوں کی تصدیق بھی ہو جائے گی"۔

"کک...... کیسی تصدیق؟" زرولی نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔ "کیا تمہیں یہ شک ہے کہ میں نے جھوٹ بولا ہوگا؟"

"شک تو نہیں ہے مگر تصدیق کرنا ضروری ہے، ہو سکتا ہے اپنی جان بچانے کے لیے تم نے جھوٹ بولا ہو"۔ امین خان نے ذو معنی انداز میں جواب دیا۔

"خدا کی قسم امین خان!" زرولی فریادی انداز میں بولا۔ "میں نے ایک ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا، میرے اغوا سے قبل تک مولوی اسی فارم ہاؤس پر تھا، اب اگر اسے خان جی نے کسی اور مقام پر منتقل کر دیا ہو تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہوگا"۔

"تم فکر نہ کرو"۔ امین خان نے کہا۔ "میں سب کچھ معلوم کر لوں گا۔ مولانا صاحب بھلے ہمیں فارم ہاؤس پر نہ ملے مگر تیرے سچ جھوٹ کا پتا میں لگا ہی لوں گا"۔

دوسری رات امین خان کھلی چھت کی دو جیپوں میں اپنے آدمی لے کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ امین خان سمیت وہ کل دس آدمی تھے اور سب کے سب آتشیں اسلحے سے لیس تھے۔ مولانا نصیب اللہ کو چھڑانے کے لیے آج وہ ہر حد سے گزرنے کا تہیہ کر کے ہی نکلے تھے۔ اس مشن پر جانے سے پہلے امین خان نے پشاور میں موجود جمال خٹک سے تبادلہ خیال کر لیا تھا۔ جمال خٹک نے اس کی پوری بات سننے کے بعد اسے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی۔ رات بارہ بجے کے قریب وہ شہر پہنچ گئے۔ وہاں سڑک کے کنارے موجود ایک ہوٹل میں چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ آگے بڑھ گئے۔ خان جی کا فارم ہاؤس وہاں سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، ٹھیک نصف گھنٹے کے اندر وہ فارم ہاؤس تک پہنچ گئے، گاڑیاں انہوں نے فارم ہاؤس سے کافی فاصلے پر روک دی تھیں۔



دو آدمیوں کو امین خان نے گاڑیوں کی نگہبانی پر مامور کر دیا اور بقیہ آدمیوں کے ساتھ فارم ہاؤس کی طرف بڑھ گیا۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے ہر طرف اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ فارم ہاؤس کے ارد گرد دور دور تک آبادی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ سب اطمینان کے ساتھ چلتے ہوئے فارم ہاؤس کی چار دیواری تک پہنچ گئے۔ فارم ہاؤس مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہاں موجود پہریدار خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

گیٹ کے قریب پہنچتے ہی امین خان نے تمام آدمیوں کو رکنے کا حکم دیا اور پھر فارم ہاؤس کے اندر داخل ہونے کے لیے وہ سب مل کر لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ ناصر خان اور خائستہ گل ڈائریکٹ گیٹ سے اندر داخل ہو کر ایکشن کرنا چاہتے تھے مگر امین خان اس کے حق میں نہیں تھا، وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ فارم ہاؤس میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ جواز پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہمیں فارم ہاؤس کے اندر کا حال بالکل ہی معلوم نہیں ہے ہم نہیں جانتے کہ یہاں خان جی کے کتنے آدمی موجود ہیں اور ان کے پاس کس قسم کا اسلحہ ہے؟ ہم اگر یونہی اندھا دھند فارم ہاؤس کے اندر داخل ہو گئے تو بہت زیادہ خون خرابہ ہونے کا امکان ہے اور میں خون خرابے کے حق میں نہیں ہوں، ہم نے صرف مولانا صاحب کو آزاد کرانا ہے اس لیے فارم ہاؤس میں موجود لوگوں کو صرف بے ہوش یا زیادہ سے زیادہ زخمی کرنے پر اکتفا کرنا ہے"۔

"خان صاحب!" خائستہ گل بولا۔ "وہ اگر مرنے مارنے پر تل گئے تو ہم کیسے چپ رہیں گے، ویسے بھی مولانا صاحب کو اغوا کرتے وقت انہوں نے مجھے جان سے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ بروقت ناصر خان پہنچ گیا تھا ورنہ آج میری قبر پر گھاس بھی اُگ چکا ہوتا"۔

"احمقانہ باتیں مت کرو"۔ امین خان نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "ہم یہاں مولانا صاحب کو چھڑانے کے لیے آئے ہیں تمہارا بدلہ لینے کے لیے نہیں آئے۔ ویسے بھی تم زرولی سے جی بھر کر بدلہ لے چکے ہو، اب اور کیا چاہتے ہو؟"

"اسے دفعہ کرو خان صاحب!" ناصر خان بولا۔ "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے جو بھی فیصلہ کرنا ہے جلدی کیجئے"۔

"فیصلہ تو ہو گیا ہے"۔ امین خان نے کہا۔ "ہم چار آدمی گیٹ پھلانگ کر فارم ہاؤس میں داخل ہوں گے اور باقی چار آدمی فارم ہاؤس کی عقبی دیوار سے اندر داخل ہوں گے۔ اس سے پہلے کتوں کے لیے زہریلا گوشت اندر پھینک دیں گے"۔

''ٹھیک ہے جناب!'' ناصر خان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی زہریلا گوشت اندر پھینک دیتے ہیں کتے یہیں گیٹ کے آس پاس ہی ہوں گے''۔

اتنا کہنے کے بعد ناصر خان ایک آدمی کے ساتھ دبے قدموں گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس آدمی نے ہاتھ میں گوشت والا شاپنگ بیگ پکڑ رکھا تھا۔ گوشت میں ایک سریع الاثر زہر ملایا گیا تھا کوئی بھی جاندار اسے کھا کر صرف پانچ منٹ کے اندر ڈھیر ہو سکتا تھا۔ ناصر خان نے کچھ گوشت گیٹ کے اوپر سے اور کچھ دیواروں کے اوپر سے فارم ہاؤس کے اندر پھینک دیا۔ اس دوران امین خان نے چار آدمیوں کو فارم ہاؤس کی عقبی جانب بھیج دیا تھا، انہیں دس منٹ کے بعد دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہونے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔

گوشت پھینکنے کے بعد انہوں نے دس منٹ تک انتظار کیا اور پھر دبے قدموں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ گیٹ کے عین سامنے پہنچ کر امین خان سرگوشیانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''ناصر خان! پہلے تم اندر جاؤ گے ہمارا ایک ساتھ اندر داخل ہونا مناسب نہیں ہے۔ اندر اگر حالات سازگار ہوں تو منہ سے کوئل کی آواز نکال دینا یہ ہمارے لیے سگنل ہوگا''۔

''ٹھیک ہے جناب!'' اتنا کہنے کے بعد ناصر خان نے رائفل کندھے سے لٹکائی اور جنگلہ نما گیٹ کو تھام کر پیر پھنساتا ہوا دوسری طرف کود گیا۔ اس کے کودنے سے ہلکی سی ''دھپ'' کی آواز پیدا ہوئی مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ رائفل کندھے سے اتار کر اس نے دوبارہ ہاتھ میں پکڑ لی اور چوکنے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، گو کہ تاریکی گہری تھی مگر اتنی دیر تاریکی میں رہنے کے بعد اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ چند لمحے وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر دبے قدموں آگے بڑھ گیا۔ وہ فارم ہاؤس کی شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر رہا تھا، بیس گز آگے جا کر اسے دو کتے دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے نظر آ گئے۔ اس نے جھک کر کتوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دونوں زندگی کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں، گوشت کے چند ٹکڑے ابھی تک زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ غالباً سریع الاثر زہر نے کتوں کو مزید گوشت کھانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ تیسرا کتا اسے باوجود کوشش کے کہیں بھی نظر نہ آیا اور یہ بات تشویش ناک تھی۔ باہر اس کے ساتھی اس کی جانب سے سگنل کے منتظر تھے اور وہ فارم ہاؤس کے اندر کھڑا کشمکش کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے مزید انتظار کرنے کے بعد اس نے گیٹ کی طرف رخ بدلا اور منہ سے کوئل کی آواز نکالنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے عقب سے بالکل ہی نزدیک غراہٹ کی آواز ابھری، وہ ایک جھٹکے سے پلٹا مگر اس دوران ایک جسیم کتا اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔

=== ===



تھانے پہنچ کر جمشید خان نے دونوں دہشت گردوں کو الگ الگ سیل میں بند کرا دیا اور خود اے ایس آئی کامران کو ساتھ لے کر آفس میں داخل ہو گیا۔ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے کامران کو بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

''سر! رات کے گیارہ بجنے والے ہیں''۔ اے ایس آئی کامران کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ گھر نہیں جائیں گے؟''

''کامران! میرے گھر جانے سے زیادہ اہم یہاں موجود رہنا ہے''۔ وہ بولا۔ ''آئی جی صاحب آج ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ کل وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھی کسی کالی بھیڑ کے دباؤ میں آ سکتے ہیں میں ابراہیم بنگش کو اب کوئی مہلت دینے کے حق میں نہیں ہوں، اس پر ہاتھ ڈالنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ ہمارے پاس اس کے خلاف تمام ثبوت موجود ہیں اگر کچھ نہیں ہے تو وہ ہیں گواہ، آج کے آپریشن میں ہمارے ہاتھ جو دو دہشت گرد لگے ہیں میں انہیں بنگش کے خلاف گواہ کے طور پر میں کھڑا کرنا چاہتا ہوں''۔

''سر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں؟'' کامران نے جواب طلب انداز میں کہا۔

''بولو''۔ جمشید خان اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ایسی کون سی خاص بات ہے؟''

''سر! بنگش جیسے لوگوں کو اس ملک کا قانون سزا دینا تو در کنار چند روز پابند سلاسل بھی نہیں رکھ سکتا''۔ کامران بولا۔ ''ایسے لوگوں کے لیے Shoot on the spot کے آرڈرز پاس ہونے چاہئیں۔ ہم اپنے محکمے کے کئی لوگوں کی قربانی دے کر اسے قانونی کٹہرے تک لا سکتے ہیں مگر سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ گرفتار ہونے کے چند روز بعد ہی وہ دوبارہ آزاد گھوم رہا ہوگا''۔

''ہمارا کام اسے گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرنا ہے''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''اسے سزا دینا قانون کا کام ہے۔ میں تمہارے کہنے کا مطلب سمجھ رہا ہوں مگر مجبوری ہے''۔

''کیسی مجبوری سر؟'' اس نے احتجاج کیا۔ ''اگر آپ چاہیں تو اسے سیلف ڈیفنس کے''۔

''نو''۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے قطع کلامی کی۔ ''میں پروفیشنل بددیانتی کا سوچ بھی نہیں سکتا، ہاں اگر بوقتِ گرفتاری بنگش نے ایسے حالات پیدا کر دیے تو پھر شاید میں یہ نہی کر دوں۔ بہرکیف اس وقت تو ہمارے لیے یہ دونوں دہشت گرد اہم ہیں ان سے معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی اگلا قدم اٹھانے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے''۔

وہ دونوں تقریباً نصف گھنٹہ آفس میں بیٹھ کر تبادلہ خیالات کرتے رہے اس کے بعد اٹھ کر

زخمی دہشت گرد کے سیل میں پہنچ گئے۔ زخمی دہشت گرد فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی ٹانگ اور ب
سے خون رس رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے کرسی لا کر دہشت گرد کے نزدیک رکھ دی تھی۔ جمشید خان
ثانیے دہشت گرد کو گھورتا رہا، پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولا۔ ''کیا نام ہے تمہارا
کس کے لیے کام کرتے ہو؟''

''سلیم''۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کس کے لیے کام کرتے ہو؟'' جمشید خان نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

''اپنے لیے''۔ سلیم نے کراہ کر جواب دیا۔

جمشید خان نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم شاید یہ سوچ رہ
ہو کہ آج یا کل یہاں سے نکل جاؤ گے، مگر یہ تمہاری بھول ہے، تمہارے سرپرست و آقا چاہے
ہی بڑے کیوں نہ ہوں اب تجھے نہیں بچا سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ تم سچ بتا کر وعدہ معاف گواہ بن
قانون تمہارے ساتھ ضرور رعایت کرے گا''۔

''مجھے کسی رعایت کی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ ناگوار انداز میں بولا۔ ''اور جو سچ تھا وہ
نے بتا دیا ہے اب اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم بتاؤ گے سلیم''۔ جمشید خان نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''ہمیں زبان کھلوانے کے طر
تم لوگوں سے بہتر آتے ہیں۔ تم لوگوں نے تو قطرہ قطرہ کر کے پلاس سے میرے ناخن اکھاڑ
تھے ناں اور مجھے باندھ کر میرے جسم پر اچھل کود کی تھی مگر ہم آج قطرہ قطرہ کر کے تمہارے بدن
تمہاری روح کھینچیں گے۔ آج تمہیں درد کا صحیح مفہوم معلوم ہو جائے گا''۔

''مگر میری زبان پھر بھی نہیں کھلے گی''۔ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ''سانسوں کا رشتہ
سے ٹوٹتا ہے تو بے شک ٹوٹ جائے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے''۔

''یہ تو ابھی تھوڑی دیر کے بعد پتہ چلے گا کہ تیری زبان کھلتی ہے کہ نہیں؟'' جمشید خان
وارننگ کے انداز میں جواب دیا اور اے ایس آئی کے ساتھ سیل سے باہر نکل گیا۔

ذرا دیر کے بعد وہ دونوں دوسرے سیل میں موجود تھے جہاں نذیر عرف جیرے کالیا
گیا تھا۔ جیرا کالیا دیوار کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھا ہوا تھا، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بند
ہوئے تھے۔ ''میں جانتا ہوں''۔ جمشید خان اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔
رات نہیں تو کل تک تمہارا ناجائز باپ تمہارے وارثوں کا سہارا لے کر یہاں تک پہنچ جائے
تمہیں بے گناہ ثابت کرنے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے، اوپر سے ہمیں بر
کی دھمکیاں دی جائیں گی مگر میری ایک بات کان کھول کر سن لو، تمہیں اب دنیا کی کوئی طاقت



چھڑا کر نہیں لے جا سکتی، اس لیے بتا دو کہ تم یہ سب کچھ کس کے اشارے پر اور کب سے کر رہے ہے
اب تک کتنے بے گناہوں کی زندگی سے کھیل چلے ہو؟''

''مم...... میں......''

''مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' جمشید خان اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''یہی
نا کہ تم اس ملک کے ایک شریف اور نیک نام شہری ہو اور پولیس نے تمہیں جھوٹے الزام میں پکڑا
ہے؟''

وہ لمحہ بھر کے لیے اس گھورتا رہا مگر جیرا کالیا نے سختی سے جبڑے بھینچ رکھے تھے، اسے دیکھ کر
لگتا تھا جیسے وہ جمشید خان کی باتیں سن ہی نہ رہا ہو یا پھر بہرہ ہو چکا ہو۔

''بولو''۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد جمشید خان نے گرج کر پوچھا۔ ''تم لوگوں کی پشت
ن ہے اور کون تمہیں یہ جدید اسلحہ فراہم کرتا ہے؟ کون ہے وہ ملک و قوم کا دشمن جو معصوم لوگوں
خون سے ہولی کھیل رہا ہے؟ بولو جواب دو ورنہ کھال کھینچ ڈالوں گا''۔

جیرا کالیا خاموش رہا، جمشید خان چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا مگر جب اس نے
ن نہ کھولی تو جمشید خان کے ہاتھ پاؤں حرکت میں آ گئے۔ اس کا پہلا گھونسہ جیرے کالیا کے
ے پر پڑا تھا۔ اس کے بعد جمشید خان نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا، ہر ٹھوکر پر جیرے کالیا کی کراہ
جاتی تھی۔

''بولو''۔ وہ اس کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ جان نکال
رکھ دوں گا۔ جب تک تمہاری زبان نہیں کھلے گی تب تک میرے ہاتھ پاؤں چلتے رہیں گے''۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے دوبارہ اسے لاتوں مکوں پر رکھ لیا۔ جیرا کالیا سیل کے ننگے فرش پر
بال کی طرح اچھلتا پھر رہا تھا۔ اس کا پورا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا۔ جمشید خان کی ایک بھرپور ٹھوکر
اس کے تین دانت جڑ سے اکھڑ کر باہر آ پڑے تھے اور ناک کا بانسہ ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ بے
چلا رہا تھا مگر جمشید خان اس وقت کسی جلاد کا روپ دھار چکا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں برقی انداز
چل رہے تھے۔ جیرے کالیا کے بدن کا کوئی حصہ بھی اس کی ضرب سے محفوظ نہیں رہا تھا۔

جیرا کالیا بہت سخت جان مشہور تھا لیکن اس وقت وہ زیادہ مار برداشت نہ کر سکا اور زبان
لنے پر تیار ہو گیا۔ پھر اس نے جو انکشافات کیے وہ بڑے سنسنی خیز تھے۔ دہشت گردی کی
واردانوں میں وہ اب تک لگ بھگ دو سو بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا جن
رتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے۔ اسے جس ہستی کی پشت پناہی حاصل تھی اس کا نام جمشید
کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ جیرا کالیا بنگش کے لیے ہی کام کرتا تھا۔

اس سے ساری تفصیل معلوم کرنے کے بعد جمشید خان بولا۔ ''اگر تم بنگش کے خلاف عدالت میں اپنا بیان دینے کے لیے تیار ہو تو میں حکام بالا سے تمہاری سفارش کی درخواست کروں گا''۔

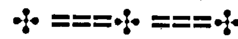
''میرے اہلِ خانہ کا کیا بنے گا جناب؟'' جیرے کالیا نے استفسار کیا۔ ''کیا بنگش انہیں زندہ رہنے دے گا؟''

''ہم انہیں تحفظ دیں گے''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''تم ان کے متعلق کوئی فکر نہ کرو، بنگش کے آدمی ان تک......''

''نہیں جناب!'' جیرے نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے قطع کلامی کی۔ ''قانون اگر کسی کو تحفظ دے سکتا تو آج اس ملک میں یہ سب نہ ہو رہا ہوتا، بیچ بازار بیک وقت بیسیوں لوگ مار دیے جاتے ہیں تو قانون کھڑا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔ اگر صرف میری زندگی کا سوال ہوتا تو بنگش کے خلاف عدالت میں ایک چھوڑ میں دس بیان دینے کے لیے تیار ہو جاتا مگر اپنی بیوی بچوں کو ایک بھیانک موت دینے کے لیے میں راضی نہیں ہوسکتا، چاہے تم لوگ مجھے جان سے ہی کیوں نہ مار ڈالو میں بنگش کے خلاف عدالت میں ایک لفظ بھی نہیں بولوں گا''۔

اس کا یہ حتمی جواب سن کر جمشید خان نے چند لمحوں کے لیے چپ سادھ لی شاید دل ہی دل میں وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ ذرا دیر کے بعد وہ گویا ہوا۔ ''جیرے! میں تمہارے بیوی بچوں کو اپنے گھر میں رکھ کر تحفظ دینے کے لیے تیار ہوں، وہ اگر مریں گے تو ان کے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی سلامت نہیں رہیں گے''۔

''جناب! کیا آپ زندگی بھر کے لیے ان کے تحفظ کی ضمانت دے سکتے ہیں؟'' جیرے نے سوال کیا اور جمشید خان اس سے مزید کچھ پوچھے بغیر اے ایس آئی کامران کے ساتھ سیل سے باہر نکل گیا۔



کتا فضا میں اُڑتا ہوا سیدھا ناصر خان کی طرف آ رہا تھا، ناصر خان نے اپنے دفاع میں پوری طاقت کے ساتھ رائفل کو گھما دیا جو اتفاقاً کتے کے جبڑے پر پڑ گئی، اس زوردار ضرب نے لمحہ بھر کے لیے کتے کو چکرا کر رکھ دیا، ناصر خان کے سنبھلنے کے لیے یہ وقفہ کافی تھا، اِدھر اس نے رائفل کو کتے کا نشانہ لے کر سیدھا کیا اور اُدھر امین خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ گیٹ پھلانگتا ہوا آ گیا، انہوں نے غالباً کتے کے غرانے کی آواز سن لی تھی اس لیے بغیر سگنل ملے اندر آ گئے تھے۔

ناصر خان نے رائفل کے ٹرائیگر پر انگلی رکھی اور ایک سیکنڈ میں اپنی طرف غرا کر بڑھتے ہوئے کتے پر فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور کتا اچھل کر چند قدم دور جا گرا گولی سیدھی اس کے



پیٹ میں لگی تھی۔ اس دوران امین خان اپنے ساتھیوں سمیت اس کے قریب پہنچ گیا۔ تفصیل بتانے کا وقت نہیں تھا کیونکہ گولی کی آواز نے فارم ہاؤس میں موجود پہریداروں کو جگا کر ہوشیار کر دیا تھا اور اب دور سے ان کی آوازیں آنے لگی تھیں وہ غالباً بھاگتے ہوئے گیٹ کی طرف ہی آ رہے تھے۔

امین خان کے اشارے، پر ناصر خان نے منہ سے کوئل کی آواز نکال کر عقب سے فارم ہاؤس میں داخل ہونے والے ساتھیوں کو ہوشیار رہنے کا سگنل دیا اور پھر وہ سب تیزی سے قدِ آدم پودوں کی ایک رو کے پیچھے چھپ گئے۔ پہریدار شور مچاتے ہوئے گیٹ کی جانب ہی آ رہے تھے۔ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا تاہم ان کی تعداد چار پانچ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوسکتی تھی۔

امین خان نے سرگوشی کے انداز میں اپنے ساتھیوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے صرف زخمی کر کے انہیں قابو کرنا ہے بلاوجہ کی خون ریزی سے اجتناب کرنا ہے''۔

''بے فکر رہیں خان صاحب''۔ ناصر خان نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم ان کی ٹانگوں کو نشانہ بنائیں گے، ہاں اگر کسی نے زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو اپنے دفاع میں ہم ان سے کوئی رعایت نہیں کریں گے''۔

اس دوران پہریدار گیٹ کے سامنے پہنچ چکے تھے، ان کی تعداد چار تھی۔ سب نے ہاتھوں میں رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ مردہ کتوں پر ابھی تک ان میں سے کسی کی نگاہ بھی نہیں پڑی تھی، وہ سب گیٹ کی طرف متوجہ تھے، پھر ان میں سے ایک نے منہ سے مخصوص سیٹی کی آواز نکالی، یہ سیٹی غالباً کتوں کو بلانے کا خاص سگنل تھا مگر سیٹی کا کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا۔ کتے زندہ ہوتے تو سیٹی کی آواز سن کر آتے۔

امین خان اپنے ساتھیوں سمیت پودوں کے عقب میں چھپا انہیں پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے دیکھ رہا تھا، معاً ان میں سے ایک کی نظر مردہ کتے پر پڑ گئی اور وہ متحیر انداز میں چلایا۔ ''ارے! یہ کتا تو مرا پڑا ہے، اِدھر آؤ دیکھو''۔

وہ چاروں مردہ کتے کے گرد جمع ہو گئے، امین خان اور اس کے ساتھیوں کے لیے انہیں زخمی کرنے کا یہ اچھا موقع تھا، اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے ایک پہریدار کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا، اس کی ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ تینوں پہریدار چلاتے ہوئے زمین پر گر گئے جبکہ ان کا چوتھا ساتھی محفوظ رہا تھا، وہ اِدھر اُدھر متوحش نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر اسے نادیدہ دشمن کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

''رائفل پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو''۔ امین خان نے بارعب انداز میں اسے حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی غلط حرکت کرنے کے بارے میں سوچنا بھی مت ورنہ سب بے موت مارے

جاؤ گے۔تم سب لوگ اس وقت میرے ساتھیوں کے نشانے پر ہو''۔

پہریدار نے ایک لمحے میں رائفل پھینک کر دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔امین خان تیزی سے اپنے ساتھیوں سمیت پودوں کے عقب سے نکلا اور تمام پہریداروں کو گھیرے میں لے لیا۔ان کے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر پہریداروں کی رائفلیں اٹھا لی تھیں۔اسی دوران امین خان کے وہ ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے جو عقب سے فارم ہاؤس میں داخل ہوئے تھے۔امین خان کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ ایک پہریدار کو زندہ پکڑ کر باندھ چکے ہیں۔وہ پہریدار کمروں کے عقب میں ڈیوٹی دے رہا تھا جبکہ اس کے یہ چار ساتھی کمروں کے سامنے برآمدے سے باہر سوئے ہوئے تھے۔

اس کے بعد کی کارروائی انہوں نے سرعت سے نمٹائی تھی تمام پہریداروں کو انہوں نے ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا تھا۔مولانا نصیب اللہ انہیں صحیح سلامت فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں مل گیا تھا تاہم وہ انہیں پہلے سے بڑی حد تک کمزور نظر آ رہا تھا مگر وہ وقت تفصیل میں جانے کا نہیں تھا، انہوں نے اسے کمرے سے باہر نکالا اور فارم ہاؤس کے صدر دروازے کی طرف روانہ ہو گئے۔ذرا دیر کے بعد وہ جیپوں میں سوار ہو کر واپس جا رہے تھے۔

جس وقت وہ شہر میں داخل ہوئے اس وقت صبح ہونے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔انہوں نے ایک ہوٹل کے سامنے جیپیں روکیں اور اتر کر ہوٹل کے ہال میں داخل ہو گئے۔ناشتے کا آرڈر دینے کے بعد امین خان مولانا نصیب اللہ سے باتوں میں مصروف ہو گیا، ان کی میز پر ناصر خان اور خائستہ گل بھی موجود تھے جبکہ ان کے باقی ساتھی ان سے الگ ایک دوسری میز کے گرد بیٹھے ناشتے کے منتظر تھے۔

مولانا نصیب اللہ نے اختصار کے ساتھ انہیں اپنے اغوا کے واقعات اور خان جی سے ملاقاتوں کے قصے سنا دیے تھے۔امین خان نے اس کی تمام باتیں نہایت ہی غور و خوض کے ساتھ سنی تھیں۔ناشتے کے بعد جب ویٹر نے انہیں گرما گرم چائے سرو کی تو اس وقت امین خان دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر چکا تھا چنانچہ چائے پینے کے دوران اس نے مولانا نصیب اللہ کو سمجھانا شروع کر دیا۔

''مولانا صاحب!'' وہ چائے کا ایک سپ لیتے ہوئے گویا ہوا۔''آپ کی زندگی ہم سب لوگوں کے لیے جتنی اہم ہے خان جی کے لیے اتنی ہی خطرناک ہے، وہ خاموش نہیں بیٹھے گا اور اب کی بار مکمل تیاری کے ساتھ ہم پر وار کرنے کی کوشش کرے گا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ عارضی طور پر آپ کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے جب حالات قدرے ٹھیک ہو جائیں تو آپ کو واپس لیا جائے گا''۔



''آپ مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہیں؟''مولانا نصیب اللہ نے قدرے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''پشاور''۔امین خان بولا۔''وہاں جمال خٹک کے ہاں آپ کی زندگی پوری طرح محفوظ ہو گی اور آپ کے آرام و سکون کا مکمل خیال رکھا جائے گا''۔

''میرے بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟''اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔''میرے بغیر کیا وہ پریشان نہیں ہوں گے اور ویسے بھی بزدلوں کی طرح رُوپوش ہو جانا مجھے سخت ناپسند ہے''۔

''آپ کے بیوی بچے میری ذمہ داری ہیں۔مولانا صاحب! آپ ان کے متعلق پریشان......''

''نہیں امین خان!''وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔''میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔خان جی اگر مجھے پر وار کر سکتا ہے تو پھر میرے بچوں کو بھی معاف نہیں کرے گا''۔

''گستاخی معاف مولانا صاحب!''امین خان نے کہا۔''آپ کی اسی بے جا ضد نے آپ کو پہلے بھی نقصان پہنچایا ہے۔ہم نے جو جنگ چھیڑ رکھی ہے وہ ہم سے ایسی چھوٹی موٹی قربانیاں تو طلب کرتی رہے گی۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری زندگی میں خان جی آپ کے بیوی بچوں کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔وہ میری لاش پر سے گزر کر ان تک پہنچے گا''۔

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں''۔وہ بولا۔''لیکن اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر جانا میرے لیے ناممکن ہے۔میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا''۔

''اگر آپ کے بیوی بچوں کو پشاور پہنچا دیا جائے تو پھر؟''امین خان نے سوال کیا۔

''مشکل ہے''۔اس نے کہا۔''وہاں اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے ساتھ میں کیسے گزارہ کروں گا؟ اور دوسرا میں یہاں اپنے علاقے میں رہ کر جمال خٹک کی پارٹی کے لیے جو کام کر سکتا ہوں وہ کام وہاں پشاور میں سرانجام نہیں دے سکتا''۔

''کام تو آپ نے اپنے علاقے میں رہ کر ہی کرنا ہے''۔امین خان اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔''میں آپ کو کوئی ہمیشہ کے لیے پشاور نہیں بھیج رہا، وہاں آپ نے ایک دو ماہ ہی گزارنا ہے۔آپ کو سیکھنے کا موقع بھی ملے گا اور جب آپ واپس آئیں گے تو یہاں بہتر طور پر سیاسی خدمات سرانجام دے سکیں گے، وہاں جمال خٹک اپنے ذرائع استعمال میں لا کر آپ کو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر بھی متعارف کرائے گا اور آپ ایک اہم سیاسی شخصیت کے طور پر ملکی سطح پر پہچانے جائیں گے۔مشہور ہونے کے بعد مجھے یقین ہے کہ خان جی آپ پر ہاتھ ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لے گا''۔

''امین خان! مجھے سیاستدان بننے کا کوئی شوق نہیں ہے''۔اس نے جواب دیا۔''میں آپ

لوگوں کا ساتھ صرف ایک اچھے مقصد کے حصول کے لیے دے رہا ہوں''۔

اس کا جواب سن کر امین خان اسے دیر تک سمجھاتا رہا کہ یہ سب کچھ اسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے ہی کیا جا رہا ہے۔ ناصر خان نے بھی کھل کر امین خان کی حمایت کی تھی، تب کہیں جا کر مولانا نصیب اللہ پشاور جانے کے لیے راضی ہوا تھا۔ امین خان نے اسے وہیں سے ناصر خان اور خائستہ گل کے ساتھ پشاور کی طرف روانہ کر دیا تھا۔

===

دوسرے دن جمشید خان آفس میں داخل ہوا تو اس کی آفس ٹیبل پر سلیم اور جیرے کالیا کی فائلیں رکھی ہوئی تھیں، یہ دونوں فائلیں تھانہ انچارج نے اس کی ہدایت پر راتوں رات ہی تیار کی تھیں۔ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے ایک فائل اٹھا کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ابھی مطالعہ کرتے ہوئے اسے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ باہر سے کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ جمشید خان نے اس آواز کا کوئی نوٹس نہ لیا اور بدستور فائل پڑھنے میں مصروف رہا۔ دو منٹ کے بعد ایک کانسٹیبل اندر داخل ہوا اور سیلوٹ کرنے کے بعد بولا۔ ''سر! راجہ اختر نواز ملنے کے لیے آیا ہے''۔

جمشید خان راجہ اختر نواز کو اچھی طرح جانتا تھا لہٰذا اس نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''اسے اندر بھیج دو''۔ کانسٹیبل الٹے قدموں باہر نکل گیا اور جمشید خان نے دوبارہ فائل پر سر جھکا دیا۔

کانسٹیبل کے باہر جاتے ہی راجہ اختر نواز اندر داخل ہوا۔ وہ سرخ و سفید رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی تھا اور بڑی بڑی مونچھوں تلے اس کا اوپری ہونٹ چھپ سا گیا تھا۔ وہ ایک نامی گرامی جاگیردار تھا اور اس کے علاوہ لمبا چوڑا کاروبار بھی کرتا تھا۔ کئی کمپنیوں میں اس نے اپنا سرمایہ لگا رکھا تھا۔ اس کا کاروبار پشاور سے کراچی تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ خود سیاست میں نہیں آیا تھا مگر سیاسی جماعتوں کو سپورٹ کرتا تھا۔ وہ ابن الوقت قسم کا آدمی تھا اور چڑھتے سورج کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے ہمیشہ صاحبِ اقتدار لوگوں کا ہی ساتھ دیا تھا۔ اس کے علاقے کے موجودہ ایم این اے اور ایم پی اے کی کامیابی بھی اسی کی مرہونِ منت تھی۔ وہ سیاست میں جتنا لگاتا تھا اس سے دوگنا وصول کیا کرتا تھا۔

راجہ اختر نواز آفس میں داخل ہوتے ہی بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ہٹا کٹا غنڈہ نما گن مین کلاشنکوف کندھے سے لٹکائے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جمشید خان نے ایک ناگوار سی نگاہ راجہ اختر نواز پر ڈالی اور پھر سیٹ سے اٹھ کر گن مین کے پاس پہنچ گیا۔

''یہ رائفل مجھے دے دو''۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور باہر برآمدے میں جا کر بنچ پر بیٹھ جاؤ''۔



گن مین نے جواب طلب انداز میں راجہ اختر نواز کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ گن مین نے کندھے سے کلاشنکوف اتار کر جمشید خان کے حوالے کر دی اور خود خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

جمشید خان واپس اپنی سیٹ پر پہنچا اور کلاشنکوف ٹیبل کے اوپر رکھتے ہوئے بولا۔ ''فرمایئے بڑے صاحب کس سلسلے میں اس آفس کو رونق بخشی ہے؟'' اس کے انداز میں طنز تھا جسے راجہ اختر نواز محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''ایس پی!'' وہ نخوت بھرے انداز میں اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔ ''تم بہت بڑے افسر بن گئے ہو۔ اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنے لگے ہو، بڑے بہادر ہو کالج میں پڑھنے والے بچوں کو گولیاں مار کر کہتے ہو دہشت گرد مارے ہیں۔ جس کو چاہو گرفتار کر کے بند کر دیتے ہو، آخر چاہتے کیا ہو تم؟''

''میں اپنا فرض نبھا رہا ہوں''۔ جمشید خان اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''تم بولو کیا چاہتے ہو، یہاں آنے کی زحمت کیسے فرمائی ہے؟ مجھے فون کر کے بلا لیا ہوتا میں سر کے بل چل کر پہنچ جاتا''۔

''تم نے دو لڑکوں کو پکڑ کر بے قصور بند کر رکھا ہے، ان کو چھوڑ دو، وہ کیا دہشت گردی کریں گے وہ تو کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ بچوں کے ساتھ کیوں پنگے بازی کرتے ہو؟ کرنا ہی ہے تو کوئی مردوں والا کام کرو''۔ اتنا کہہ کر اس نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار روپے والے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر جمشید خان کے سامنے رکھ دیں۔

''یہ رکھ لو اور بچوں کو چھوڑ دو''۔ وہ دوبارہ بولا۔ ''اگر کم ہیں تو بتا دو، تم جتنے مانگو گے میں......''

''تمہارے پاس اس رائفل کا لائسنس تو ہوگا؟'' جمشید خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بابا! ہمیں لائسنس کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ بے نیازی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہم کوئی کمی کمین تو نہیں ہیں کہ لائسنس بنانے کے چکر میں پڑیں، یہ تو ان لوگوں......''

''قانون تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے''۔ جمشید خان ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''جہاں صرف تیرا راج چلے گا؟ میں تجھے بتاتا ہوں کہ مردوں والے کام کیسے کیے جاتے ہیں؟''

اتنا کہنے کے بعد اس نے آفس کے باہر کھڑے ہوئے کانسٹیبل کو آواز دے کر اندر بلا لیا، پھر جمشید خان ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ناجائز اسلحہ، سرکاری کام میں مداخلت، پولیس افسر کو رشوت کی پیشکش، گرفتار شدہ دہشت گردوں کی سرپرستی اور انہیں رہا کرانے کی کوشش، یہ

تمام چارجز اس پر لگائے جائیں گے"۔

"ایس پی!" راجہ اختر نواز کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن جمشید خان نے اسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔

"گیٹ اپ"۔ جمشید خان گرج کر بولا۔ "تم جیسے حرامزادوں نے اس شہر کو دوزخ بنا رکھا ہے، اٹھ جاؤ کرسی سے ورنہ یہیں کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا"۔

"شا...... شاید...... تمہاری شامت آگئی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "مم...... میں تمہاری کھال کھنچوا دوں گا۔ تمہاری وردی......"

"تڑاخ"۔ جمشید خان کا زوردار طمانچہ اس کے چہرے پر پڑا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"فی الحال تو میں تمہاری کھال اتروا کر اس میں بھوسہ بھرواؤں گا"۔ جمشید خان نے گرج کر کہا، اس دوران تین کانسٹیبل بھی اندر آ چکے تھے۔

"اس کی اور اس کے گن مین کی جامہ تلاشی لے کر بند کر دو دونوں کو"۔ جمشید خان حکمیہ انداز میں بولا۔ "اور خبردار کسی کو بھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہوگی"۔

راجہ اختر نواز حلق پھاڑ کر اسے برے نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا مگر پولیس والے اسے دھکے لگاتے ہوئے باہر لے گئے۔ ذرا دیر کے بعد راجہ اختر نواز اپنے گن مین سمیت حوالات کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھا ہوا تھا اور جمشید خان آئی جی صاحب کو فون کر رہا تھا۔

•:• ===•:• ===•:•

وہ گزشتہ دس روز سے باقاعدگی کے ساتھ اس مسجد میں آ رہا تھا۔ وہ عشاء کی نماز اسی مسجد میں ادا کیا کرتا تھا اور نماز کے بعد ہونے والے درس میں بھی شرکت کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ خدا کے گھر میں کوئی کسی سے کچھ نہیں پوچھتا کیونکہ وہاں جو بھی آتا ہے عبادت کی غرض سے آتا ہے۔ دنیا کے جھمیلے اور فساد سے گھبرا کر دلی سکون حاصل کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس سے بھی کسی نے اس کا نام و پتہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی، سرخ و سفید رنگت، اجلا سفید لباس اور چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی، سر پر سفید دھاگوں کی بنی ہوئی ٹوپی، اس کے چہرے کی معصومیت میں اضافہ کر دیتے تھے۔ عام لوگ تو ایک طرف رہے کبھی مسجد کے باریش خطیب نے بھی اس سے کوئی استفسار نہیں کیا تھا، وہ نہایت ہی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا، اسی طرح بعد از نماز ہونے والا درس بھی پورے انہماک اور توجہ سے سنا کرتا تھا۔ تلاوت کلام پاک بھی باقاعدگی کے ساتھ کیا کرتا تھا۔



وہ مسجد بڑی خوبصورت تھی، وسیع صحن، سفید موزائیک کا فرش جس پر ایک ترتیب کے ساتھ جائے نماز کی طرح کے نشان بھی بنے ہوئے تھے۔ صحن سے آگے خوبصورت ہال تھا جس میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے اور ہال کے دروازے شیشے کے بنے ہوئے تھے۔ ہال کی چھت سے بڑے بڑے خوبصورت فانوس لگے ہوئے تھے۔ جن کی روشنی سے رات کے وقت ہال بقعہ نور بنا رہتا تھا۔

اس روز بھی حسبِ معمول عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے ہال میں تلاوت کلام پاک کا درس شروع تھا۔ اس درس میں لگ بھگ تیس پینتیس افراد شامل تھے جو ایک نیم دائرے کی شکل میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ سب کے سامنے رحل پر قرآنِ مجید کھلا ہوا رکھا تھا۔ اس دائرے کے وسط میں مسجد کا خطیب مولوی اسلام اللہ تشریف فرما تھا۔ وہ ایک ایک آیت پڑھتا اور پھر اس کی تفسیر بیان کرنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کا انداز بڑا ہی دل نشین تھا، ایک ایک لفظ دل و دماغ میں اترتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

وہ خوبرو نوجوان بھی اس درس میں شامل تھا۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر مختصر سی سیاہ داڑھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی رحل پر قرآنِ مجید کھلا ہوا رکھا تھا مگر آج وہ کچھ مضطرب سا نظر آ رہا تھا، درس کی طرف اس کا دھیان کم تھا، خطیب کی بیان کردہ تفسیر بالکل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار پلٹ کر مسجد کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ اس کے تاثرات سے واضح طور پر عیاں ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔

مسجد کے صحن میں بائیں جانب وضو کرنے کی جگہ تھی۔ جہاں چند آدمی بیٹھے وضو کرنے میں مصروف تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو باجماعت نماز سے رہ گئے تھے۔ درس میں شریک کسی بھی شخص نے اس نوجوان کی بے چینی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں دہشت گردوں نے مسجدوں کو ٹارگٹ بنا رکھا تھا اور آئے روز بے گناہ نمازیوں کو شہید کرنے کا شغل جاری تھا۔ اس نوجوان کی بے چینی کی وجہ بھی شاید یہی تھی۔ شاید وہ جان جانے کے خوف میں مبتلا تھا۔

ایسے ہی وقت سیاہ رنگ کی ایک کار مسجد کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ کار میں کل چار آدمی سوار تھے، ایک اسٹیرنگ کے سامنے، دوسرا اس کے ساتھ والی سیٹ پر اور دو آدمی عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کار کے رکتے ہی عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں شخص تیزی سے نیچے اترے اور مسجد میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے جسموں پر سیاہ چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت انہوں نے جوتے اتارنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ مسجد کے ہال میں داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی درس میں شریک وہ خوبرو نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا، دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک خوفناک پستول نکال

لیا تھا۔

''شوٹ......فائر''۔ وہ ان چادر پوشوں کی طرف دوڑتے ہوئے چیخا۔

دونوں چادر پوشوں نے چادریں اتار کر پھینک دیں۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔ دوسرے ہی لمحے مسجد کا ہال گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور انسانی چیخوں سے گونج اٹھا۔ وہ خوبرو نوجوان بھی پستول سے اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ اس کی پہلی گولی باریش خطیب کے سینے میں لگی تھی اور سرخ سرخ خون کے چھینٹے رحل پر کھلے ہوئے قرآن کو رنگین کرتے چلے گئے۔ ایک لمحہ قبل تک کا درس دینے والا المعلم اپنے ہی خون میں لت پت کھلے ہوئے قرآن مجید پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔

درس میں شریک لوگ اپنی اپنی جان بچانے کے لیے چلاتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے مگر چند سفاک انسانوں نے ان کے فرار کی راہیں مسدود کر دی تھیں۔ وہ گولیاں کھا کھا کر گرنے لگے۔ اللہ کے گھر کی دیواریں بے گناہوں کے خون سے رنگین ہونے لگیں۔ قرآن پاک کے کئی نسخے رحلوں سے اچھل کر قالین پر بکھرے ہوئے تھے۔

مسجد کا ہال گولیوں سے چھلنی ہو کر گرنے والوں کی چیخوں اور فائرنگ کی آواز سے گونج رہا تھا۔ وہ تینوں درندہ صفت انسان نہیں بلکہ بھیڑیئے فائرنگ کرتے ہوئے ہال سے باہر آ گئے۔ ان کا ایک ساتھی کار سے اتر کر کلاشنکوف سے ہوائی فائرنگ کر رہا تھا۔ وضو خانے میں وضو کرنے والے چاروں آدمی اٹھ کر ایک طرف دوڑے مگر سفاک قاتلوں نے انہیں بھی گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ وہ چاروں مسجد کے صحن میں مختلف جگہوں پر گرے اور مسجد کا فرش ان کے لہو سے رنگین ہوتا چلا گیا۔

تینوں سفاک درندے دوڑتے ہوئے مسجد سے باہر آ کر کار میں بیٹھ گئے، ہوائی فائرنگ کرنے والا بھی اپنی سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اب وہ رائفل کار کی کھڑکی سے نکال کر فائرنگ کر رہا تھا۔ کار کا انجن پہلے ہی سے اسٹارٹ تھا، ان کے بیٹھتے ہی کار ایک جھٹکے سے حرکت میں آ گئی اور تیزی سے دوڑتے ہوئی ایک گلی میں داخل ہو گئی۔

مسجد سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کی دوری پر ایک کھلا چوراہا تھا جہاں دو چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ تھے اور پان سگریٹ کے کیبن بھی تھے، تمام دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور چاروں طرف رونق ہی رونق نظر آ رہی تھی۔ ایک طرف پولیس کی ایک موبائل بھی کھڑی ہوئی تھی۔ شہر میں اگرچہ آئے دن دہشت گردی کی وارداتیں ہو رہی تھیں لیکن یہاں کے لوگ شاید اس لیے مطمئن تھے کہ چوک پر پولیس کی موبائل کھڑی تھی اور ان کے محافظ موجود تھے۔

اچانک ہونے والی فائرنگ کی آواز سنتے ہی چوک میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ خوفزدگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ گرنے لگے۔ چند پولیس والے پان سگریٹ



کے ایک کیبن کے سامنے کھڑے سگریٹ کے کش لگاتے ہوتے دھواں اڑا رہے تھے، وہ فائرنگ کی آواز سنتے ہی موبائل وین کی طرف دوڑ پڑے۔ دوسرے ہی لمحے موبائل وین حرکت میں آ گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ فائرنگ والی جگہ کی طرف جائیں گے اور دہشت گردوں کو گولیوں سے بھون دیں گے مگر پولیس موبائل تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی مخالف سمت میں نکل گئی۔ عوام کی عزت و جان کے محافظ اس طرح دُم دبا کر بھاگے تھے جیسے جہنم کی بلائیں ان کا تعاقب کر رہی ہوں۔

===

دن کے کوئی بارہ بجے کا عالم تھا بابو بھائی کے بار میں جوا اور شراب نوشی جاری تھی۔ وہاں کئی گرامی غنڈے اور جواری موجود تھے۔ ہال میں بابو بھائی کے مسلح آدمی چوکنے انداز میں گھوم رہے تھے۔ بادشاہ بھی ایک کونے میں بیٹھا جوئے کی محفل سجائے ہوئے تھا۔ اس کی میز پر تین شخص موجود تھے۔ وہ تینوں شکل وصورت سے چھٹے ہوئے غنڈے نظر آ رہے تھے۔ اب تک وہ جوئے کی چند بازیاں نمٹا چکے تھے جن میں سے دو انہوں نے اور دو بادشاہ نے جیتی تھیں۔ کھیلی جانے والی آخری بازی بادشاہ نے جیتی تھی اس لیے وہ پانچویں بازی کھیلنے کے پتے پھینٹ رہا تھا اور اس کے تینوں پارٹنر بڑے انہماک کے ساتھ اس کے متحرک ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔

معاً پتے پھینٹتے ہوئے بادشاہ کی نگاہ ہال کے بیرونی دروازے کی طرف اٹھ گئی، اس کے چہرے پر تحیر کے آثار نمودار ہوئے، دوسرے ہی لمحے اس نے تاش کی گڈی میز پر پھینکی اور تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دس بارہ روز قبل اس سے مار کھانے والا قبائلی رحمدل خان سات مسلح افراد کے ساتھ ہال میں داخل ہونے کے بعد اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ ہال میں گھومنے والے مسلح آدمیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو رحمدل خان بپھر گیا۔ ''جو بی امارا راستے میں آیا ام اس کو گولیوں سے بون ڈالے گا''۔ وہ غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''امارا دشمنی بادشاہ سے اے، ام اس کو ساتھ لے کر جائے گا''۔

''سوری دوستو!'' بادشاہ حالات کی نزاکت کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میں اس وقت یہ کھیل جاری نہیں رکھ سکتا۔ میری جان کے دشمن پوری تیاری کے ساتھ ہال میں داخل ہو چکے ہیں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی یہ محفل جمالیں گے''۔

''بڑے بھولے ہو مسٹر بادشاہ!'' ان میں سے ایک طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔ ''ہم رحمدل خان کے ہی تو آدمی ہیں''۔

اتنا کہتے ہی اس نے پستول نکال لیا جبکہ اس کے دونوں ساتھی پہلے ہی یہ کام کر چکے تھے۔ بادشاہ بیک وقت تین پستولوں کی زد پر تھا۔ اس صورتِ حال میں بہادری دکھانا حماقت ہی تھی

اور بادشاہ احمق نہیں تھا، اس لیے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم لوگ چاہتے کیا ہو؟'' بیٹھتے ہی اس نے فوراً سوال کیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا''۔ غنڈہ بولا۔ ''ہمیں جو حکم دیا گیا تھا ہم نے اس پر عمل کیا ہے۔ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ یہ صرف رحمدل خان جانتا ہے''۔

دوسری طرف ہال میں رحمدل خان اور بابو بھائی کے آدمیوں میں تُو تڑاخ شروع ہو چکی تھی۔

''اس بار سے کسی بھی آدمی کو اغوا نہیں کیا جا سکتا''۔ بابو بھائی کا آدمی بولا۔ ''اگر تم لوگوں نے بادشاہ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش تو ہال میں لاشیں گرنا شروع ہو جائیں۔ بادشاہ ارباب بھائی کا مہمان ہے وہ کسی بھی قیمت پر اسے اغوا نہیں ہونے دیں گے''۔

''ارباب بائی کا ایسی کی تیسی''۔ رحمدل خان پھنکارتے ہوئے بولا۔ ''ام بادشاہ کو لے کر ہی جائے گا، جو بی امارے راستے میں آیا ام اس کو مار ڈالے گا''۔

اسی دوران بابو بھائی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہال میں داخل ہوا، اسے کسی نے انٹرکام پر اس صورتِ حال کی اطلاع دے دی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ اپنے آدمیوں کے نزدیک پہنچ کر بارعب انداز میں مستفسر ہوا۔

''ارباب بھائی! یہ لوگ بادشاہ کو زبردستی اٹھا کر لے جانا چاہتے ہیں''۔ اس کے ایک آدمی نے جواب دیا۔

''کیوں بھئی...... کس لیے؟'' وہ رحمدل خان اور اس کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''تم لوگ بادشاہ کو کس مقصد کے لیے اغوا کرنا چاہتے ہو؟''

''اے بابو بھائی!'' رحمدل خان کے ساتھ کھڑا ہوا لمبا تڑنگا نوجوان بولا۔ ''اپنی اوقات میں رہو، ابراہیم بنگش کا نام سنا ہے تم نے کبھی؟ ہم اسی کے آدمی ہیں۔ تم نے اگر ہمارے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو نہ تم رہو گے اور نہ تمہارا یہ بار...... سڑکوں پر بھیک مانگتے ہوئے نظر آؤ گے''۔

نوجوان کی بات جونہی مکمل ہوئی بابو بھائی نے بجلی کی سی تیزی سے لات چلائی اور لمبا تڑنگا نوجوان اچھل کر دور جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے دونوں پارٹیوں نے رائفلیں سیدھی کرتے ہوئے فائرنگ شروع کر دی۔ ہال میں موجود جواری اور شرابی چیختے چلاتے ہوئے کونوں کھدروں کی طرف بھاگنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔ دو دو آدمی دونوں طرف سے گر چکے تھے جبکہ باقی لوگ ہال میں اِدھر اُدھر پھیل کر مورچہ بند ہو چکے تھے۔



بادشاہ بھی تین غنڈوں کو غچہ دے کر کاؤنٹر کے عقب میں جا چھپا تھا۔ دراصل جونہی ہال میں فائرنگ شروع ہوئی تھی تینوں غنڈے بادشاہ کو بھول کر اُدھر متوجہ ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور بھاگتا ہوا کاؤنٹر کے سامنے پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جست لگائی اور اُڑتا ہوا کاؤنٹر کے عقب میں جا گرا۔ اگر اسے ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو شاید عقب سے چلائی گئی گولیاں اسے چاٹ چکی ہوتیں۔

کاؤنٹر کے عقب میں پناہ لیتے ہی اس نے جیب سے پستول نکالا اور اس اندھادھند فائرنگ میں شامل ہو گیا۔ چند لمحے پہلے اسے گن پوائنٹ پر رکھنے والے تینوں غنڈے ہال میں موجود ایک بڑی ٹیبل گرا کر اس کی آڑ لے چکے تھے اور اب کاؤنٹر کی طرف اندھادھند فائرنگ کر رہے تھے۔ بادشاہ کی نگاہیں ان کی ٹیبل پر جمی ہوئی تھیں مگر تینوں غنڈے ٹیبل کی آڑ سے صرف ہاتھ نکال کر فائرنگ کر رہے تھے۔

بادشاہ نے چند گولیاں ٹیبل کے سنٹر میں داغ دیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ٹیبل کی موٹائی سے گولیاں پار نہ جا سکی تھیں۔ اب وہ ان میں سے کسی کے سر نکالنے کا منتظر تھا تاکہ اسے نشانہ بنا سکے۔

اسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک غنڈے نے سر نکال کر کاؤنٹر کی طرف دیکھا اور بادشاہ نے فوراً فائر کر دیا۔ گولی سیدھی اس کی پیشانی میں جا کر لگی تھی، وہ چلاتا ہوا دوبارہ ٹیبل کے عقب میں غائب ہو گیا اور بادشاہ کاؤنٹر کی آڑ لیتے ہوئے آہستہ آہستہ راہداری کی طرف کھلنے والے دروازے کی جانب کھسکنے لگا۔ معاً اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ تڑپ کر پیچھے پلٹا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ اس کے عقب میں کوئی اور نہیں بابو بھائی رینگتا ہوا آ رہا تھا۔

''بابو بھائی! تم ٹھیک تو ہو ناں؟'' اس کے کندھے سے رستا ہوا خون دیکھ کر بادشاہ نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔

''معمولی زخم ہے''۔ بابو بھائی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ''تم یہیں رکو، میں اپنے آفس میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں، صاحب تک اطلاع پہنچانا بہت ضروری ہے''۔

اتنا کہنے کے بعد بابو بھائی تیزی سے آگے کی طرف کھسکنے لگا اور بادشاہ عقب سے اسے سپورٹ دینے کے لیے دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہال میں بدستور وقفے وقفے سے فائرنگ جاری تھی۔

رحمدل خان کے چند آدمی ہال سے باہر نکل کر بھی مورچہ بند ہو چکے تھے، اس لیے ان کا پلہ

بھاری نظر آ رہا تھا جبکہ بابو بھائی کے آدمی ہال کے اندر محصور ہو کر رہ گئے تھے مگر پھر بھی وہ بڑی بے داری کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے۔

بابو بھائی دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا راہداری والے دروازے کے نزدیک پہنچ گیا مگر اب کاؤنٹر کی آڑ بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہاں سے دروازے کا فاصلہ آٹھ گز سے کچھ کم ہی تھا۔ بابو بھائی کو یہ فاصلہ بغیر آڑ کے طے کرنا تھا، اس میں اس کی جان جانے کا بھی خطرہ تھا۔ ہال میں اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی، کوئی اندھی گولی اس کی پشت میں اتر سکتی تھی لیکن خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بابو بھائی برق رفتاری سے کاؤنٹر کے عقب سے نکلا اور انجام کی پرواہ کیے بغیر دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔

ایسے ہی وقت اس کے عقب میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور بابو بھائی چلاتا ہوا دروازے کے اندر جا گرا۔ بادشاہ نے پلٹ کر راہداری والے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔ دروازے کے عین درمیان میں اسے تڑپتا ہوا بابو بھائی دکھائی دے رہا تھا۔

❋ ==== ❋ ==== ❋

بادشاہ کاؤنٹر کے سرے پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ رحمدل خان کے ساتھی ہال کے دروازے سے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کی چلائی گئی گولیاں کچھ کاؤنٹر سے ٹکرا رہی تھیں تو کچھ کاؤنٹر کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ بابو بھائی کے آدمیوں کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ ہال کے کس کونے میں اور کون سی آڑ کے پیچھے ہیں؟ تاہم ان کی جوابی فائرنگ کی آوازیں بادشاہ کو سنائی دے رہی تھیں۔ کاؤنٹر کے عقب سے جھانک کر دیکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا مگر یہ رسک لینے کے علاوہ بادشاہ کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ کاؤنٹر کے عقب میں پیٹ کے بل لیٹ گیا اور پھر کاؤنٹر کے کونے سے سر نکال کر ہال کا جائزہ لینے لگا مگر چند سیکنڈ کے اندر ہی اس کے سر کے نزدیک کاؤنٹر پر گولیاں آ کر لگیں تو اس نے فوراً سر دوبارہ اندر کر لیا۔ پلٹ کر اس نے چند قدم دور دروازے کی طرف دیکھا تو بابو بھائی کو غائب پایا۔ تاہم جس جگہ چند لمحے قبل بابو بھائی گرا ہوا تھا وہاں فرش پر خون نظر آ رہا تھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ بابو بھائی زندہ ہے اور اپنے آفس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے''۔ بادشاہ نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر دوبارہ ہال میں ہونے والی فائرنگ میں شریک ہو گیا۔

ہال سے باہر ہونے کی وجہ سے رحمدل خان اور اس کے ساتھیوں کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا۔ وہ محفوظ آڑ میں تھے اور با آسانی ہال کے اندر فائرنگ کر رہے تھے۔ بادشاہ نے کاؤنٹر کی آڑ سے ہال کے دروازے کی طرف فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وقتی طور پر وہ بابو بھائی کو بھول گیا تھا۔



ادھر بابو بھائی جسے بائیں ٹانگ میں گولی لگی تھی، وہ کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا اپنے آفس تک ...یں کامیاب ہو گیا تھا۔ آفس کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے دروازے کی چٹخنی چڑھا ...ور پھر ٹیبل پر پڑے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ملتے ہی اس نے ...نی کے عالم میں کہا۔ ''صاحب جی! میں بابو بھائی بات کر رہا ہوں میرے بار پر رحمدل خان نے ...ساتھیوں سمیت حملہ کر دیا ہے۔ اس وقت بھی فائرنگ شروع ہے۔ میں خود بھی زخمی ہوں بڑی ...ے اپنے آفس تک پہنچا ہوں۔ اب تک نہ جانے میرے کتنے آدمی مارے جا چکے ہوں ...

''بادشاہ کہاں ہے؟'' صاحب جی نے اس کی پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ ہال میں موجود ہے جناب''۔ بابو بھائی بولا۔ ''اس کی وجہ سے تو یہ سارا لفڑا ہوا ہے۔ ...خان شاید اس سے اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ وہ بادشاہ کو اغوا کرنے کے لیے آیا ...

''اغوا''۔ صاحب جی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ ''کس لیے...... یہ رحمدل خان کہاں ...نے والا ہے۔ اور کیا اس کا تعلق......''

''جناب! وہ کسی بنگش کا نام لے رہا تھا''۔ بابو بھائی اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بول ...رحمدل خان بتا رہا تھا کہ ہم لوگ بنگش کے آدمی ہیں اور ہر قیمت پر بادشاہ کو یہاں سے لے کر ...یں گے''۔

''بادشاہ کو معلوم ہے کہ رحمدل خان بنگش کا آدمی ہے؟'' صاحب جی نے سوال کیا۔

''ن...... نہیں جناب''۔ اس نے جواب دیا۔

''نان سینس! اسے بتاؤ جا کر''۔ صاحب جی نے گرج کر کہا۔ ''کہ رحمدل خان کون ہے اور ...سے اغوا کرنا چاہتے ہیں وہ لوگ؟''

''صا...... صاحب جی!'' وہ بوکھلا کر بولا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ بادشاہ میرا مہمان ہے ...کیسے دشمنوں کے حوالے کر دوں؟ یہ تو...... جناب میرے لیے نہایت ہی شرم......''

''الو کے پٹھے! جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو''۔ صاحب جی نے پہلے سے بھی زیادہ دھاڑتی ...ز میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''جلدی کرو جا کر بادشاہ کو بتاؤ کہ رحمدل خان ابراہیم ...ی ہے۔ جاؤ وقت ضائع مت کرو''۔

...بو بھائی نے جلدی سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور لنگڑاتے ہوئے باہر کی طرف بھاگا۔ ...ر پہنچ کر وہ دیوار کے ساتھ لگ کر آگے بڑھنے لگا، دروازے کے قریب پہنچتے ہی اس نے

کاؤنٹر کے پیچھے چھپے ہوئے بادشاہ کو آواز دی۔ ''بادشاہ میری بات سنو''۔ وہ چلا کر بولا مگر گولیوں کی گونج میں اس کی آواز بادشاہ کے کانوں تک نہ پہنچ سکی، بادشاہ کی اس کی طرف پشت تھی اور وہ ہال کے دروازے کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔

''بادشاہ! فائرنگ بند کر دو''۔ بابو بھائی پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں بولا۔ ''یہ بڑے صاحب کا حکم ہے۔ خود کو رحمدل خان کے حوالے کر دو''۔

اب کی بار وہ اتنی زور سے چلایا تھا کہ بادشاہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بابو بھائی، تم ٹھیک تو ہو ناں؟'' بادشاہ نے کاؤنٹر کے عقب میں جھکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں''۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''تمہارے لیے بڑے صاحب کا حکم ہے کہ خود کو رحمدل خان کے حوالے کر دو۔ میں دراصل تمہیں بتانا بھول گیا تھا کہ رحمدل خان ابراہیم بھٹی کا آدمی ہے اور اس کے حکم سے تمہیں اغوا کرنا چاہتا ہے''۔

''یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ تمہاری حماقت کی وجہ سے اتنا زیادہ خون خرابہ ہو گیا''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ دوبارہ اونچی آواز میں گویا ہوا۔ ''رحمدل خان! میں بادشاہ بول رہا ہوں، اپنے آدمیوں سے کہو فائرنگ بند کر دیں میں خود کو تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں''۔

رحمدل خان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا غالباً فائرنگ کی آوازوں میں اس کی بات رحمدل خان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ تب بادشاہ نے ایک بار پھر اپنی بات کو دہرایا تو چند لمحوں کے اندر رحمدل خان کے آدمیوں نے فائرنگ بند کر دی۔ بابو بھائی نے بھی چلا کر اپنے آدمیوں کو فائرنگ بند کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

فائرنگ کے بند ہوتے ہی ہال میں خاموشی چھا گئی۔ بادشاہ اور بابو بھائی بدستور کاؤنٹر کی آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے آدمیوں میں سے ابھی تک کوئی ایک بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر دبکے ہوئے تھے شاید کوئی بھی باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

''سامنے آؤ رحمدل خان''۔ بادشاہ چلا کر بولا۔ ''میں خود کو تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں''۔

''ام کوئی پاگل نہیں اے بادشاہ''۔ رحمدل خان کی آواز آئی۔ ''تم دو کے سے ام کو مارنا چاہتا اے''۔

''بادشاہ نے آج تک کبھی کسی پر دھوکے سے وار نہیں کیا''۔ وہ بولا۔ ''تم سامنے آؤ میں ہتھیار پھینک دیتا ہوں''۔

''نہیں ام سامنے نہیں آئے گا''۔ رحمدل خان نے کہا۔ ''تم دونوں ہاتھ اٹھا کر ہال کے



باہر آ جاؤ ورنہ ام دوبارہ فائرنگ شروع کر دے گا''۔

''نہیں رحمدل خان تم ایسا نہیں کرو گے''۔ بادشاہ بولا۔ ''لو میں ہتھیار پھینک کر ہاتھ کھڑے کر رہا ہوں۔ اب تم ہال کے اندر آ سکتے ہو''۔

بات ختم کرتے ہی بادشاہ نے پستول ہال کے دروازے کی طرف اچھال دیا جو عین دروازے کے درمیان میں گرا اور پھسلتا ہوا باہر چلا گیا۔

''ام کو معلوم اے تم بوہت چالاک آدمی اے''۔ رحمدل خان کی استہزائیہ آواز آئی۔ ''جب تک تم خود باہر نہیں آئے گا ام کو یقین نہیں آئے گا، تم دو کے سے ام کو مارنا چاہتی اے''۔

''او کے رحمدل خان''۔ بادشاہ چلا کر بولا۔ ''میں باہر آ رہا ہوں، اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میرا نام بادشاہ ہے، تم نقصان اٹھاؤ گے''۔

''ام پٹھان اے کوئی چالاکی نہیں کرے گا۔ تم باہر نکلو''۔ رحمدل خان نے جواب دیا۔

رحمدل خان کی بات سن کر بادشاہ نے ایک نظر بابو بھائی کی طرف دیکھا تو وہ منفی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے رحمدل خان کی بات کا اعتبار نہیں ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں وہ ایک نمبر کا حرامی ہے، تم نقصان اٹھاؤ گے مت جاؤ''۔

''نہیں بابو بھائی''۔ وہ حتمی انداز میں بولا۔ ''مجھے اس کی بات پر اعتبار کرنا پڑے گا، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے''۔

''یہ حماقت ہے بادشاہ؟'' بابو بھائی نے کہا۔ ''رحمدل خان اور اس کے ساتھی مسلح ہیں اور تم خالی ہاتھ ان کے سامنے جا رہے ہو پلیز......''

''فکر مت کرو بابو بھائی''۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''رحمدل خان مجھ پر گولی نہیں چلا سکتا وہ تو صرف ایک مہرہ ہے''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ کاؤنٹر کی آڑ سے باہر نکلا اور انجام کی پرواہ کیے بغیر ہال کے دروازے کی طرف روانہ ہو گیا۔

===

راجہ اختر نواز کو گرفتار کرنے پر آئی جی صاحب نے پہلے پہل تو جمشید خان کی نہ صرف تعریف کی بلکہ اس کا ساتھ دینے کی بھی حامی بھری تھی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے جمشید خان سے راجہ اختر نواز کی سفارشیں شروع کر دیں اور اسے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ جمشید خان نے جب اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے کچھ بھی سننے سے انکار کر دیا۔ راجہ اختر نواز کے خلاف جمشید خان کے تمام دلائل اس نے ایک لمحے میں رد کر دیے تھے۔

آج بھی صبح سویرے جمشید خان ابھی آفس میں پہنچا ہی تھا کہ آئی جی صاحب کا فون آ گیا۔

''جمشید خان!'' آئی جی صاحب نے بلا تمہید کہا۔''راجہ صاحب کو ابھی اور اسی وقت رہا کر دیں''۔

''کیسے رہا کر دوں سر؟'' جمشید خان بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔''وہ سینکڑوں بے گناہ لوگوں کے قتل میں ملوث ہے۔ وہ جیرا کالیا جیسے لوگوں کی سرپرستی کرتا ہے۔ اس نے میرے آفس میں آ کر نہ صرف مجھے دھمکایا بلکہ رشوت پیش کرنے کی بھی کوشش کی۔ وہ ابراہیم بنگش جیسے درندے کا ساتھی ہے جو پورے صوبہ میں خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔ ایسے لوگ تو سرِ عام پھانسی پر لٹکا دینے کے لائق ہوتے ہیں مگر آپ اسے رہا کر دینے کا حکم سنا رہے ہیں۔ کیوں سر کیوں؟''

''جمشید خان!'' آئی جی نے اونچی آواز میں کہا۔''آپ کی طرح میں بھی سرکاری ملازم ہوں، اوپر والوں کو جوابدہ ہوں۔ میں یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کر رہا ہوں مجھے جو حکم ملا ہے میں وہی کر رہا ہوں۔ آپ اسے فی الفور رہا کر دیں''۔

''سوری سر میں ایسا نہیں کر سکتا''۔ اس نے روکھا سا جواب دیا۔

''اس حکم عدولی کا انجام جانتے ہو؟'' وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔''اس کے علاوہ کہ ایم۔ این اے اور ایم پی اے وزیر داخلہ تک پہنچ گئے ہیں، میں ان کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ بہتر ہے آپ راجہ صاحب کو رہا کر دیں اور سارا کیس جیرا کالیا پر ڈال دیں، ویسے بھی راجہ صاحب براہ راست کسی دہشت گردی میں ملوث نہیں ہے''۔

''سر! یہ لوگ جو غریب اور مظلوم عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار کے منصب تک پہنچتے ہیں۔ وقت آنے پر غریب عوام کو بھول کیوں جاتے ہیں؟ ان کے مقابلے میں ظالموں اور چوروں ڈاکوؤں کا ساتھ کیوں دیتے ہیں؟ کیوں مظلوم عوام......''

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے''۔ آئی جی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔''میں اور آپ اس ملک کے سسٹم کو نہیں بدل سکتے ہاں جان سے ضرور جا سکتے ہیں''۔

''بدلنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں ناں سر''۔ وہ ایک عزم کے ساتھ بولا۔''آپ بے شک میرا ساتھ نہ دیں مگر میں اس سسٹم کے خلاف جہاد ضرور کروں گا''۔

''ہونہہ''۔ آئی جی استہزائیہ انداز میں بولا۔''کیا آپ اس سسٹم کا حصہ نہیں ہیں؟''

''مجھے اس سے انکار نہیں ہے سر''۔ اس نے کہا۔''میں بھی اسی ظالمانہ سسٹم کا حصہ ہوں مگر ظالموں اور درندوں کا ساتھ نہیں دے سکتا چاہے میری وردی کیوں نہ اتر جائے''۔

''میں آپ کو چوبیس گھنٹے کا ٹائم دیتا ہوں''۔ آئی جی حتمی انداز میں بولا۔''راجہ صاحب کو رہا کر دیں ورنہ نتائج کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے''۔



''مجھے نتائج کی پرواہ نہیں ہے سر''۔ اتنا کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور پھر بیل بجا کر اردلی کو طلب کر لیا۔

''کامران کو بلاؤ''۔ اردلی کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے حکم دیا اور اردلی الٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔

پانچ منٹ کے اندر اے ایس آئی کامران اس کے سامنے موجود تھا۔ جمشید خان کے چہرے پر طاری سنجیدگی دیکھ کر اسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی تاہم جمشید خان نے لب کشائی کرتے ہوئے اس کی یہ مشکل آسان کر دی۔

''کامران!'' وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے گویا ہوا۔''آئی جی صاحب چاہتے ہیں کہ ہم راجہ اختر نواز کو ابھی اور اسی وقت چھوڑ دیں مگر میں نے آئی جی صاحب کو صاف جواب دے دیا ہے۔ میں پولیس سروس سے استعفیٰ تو دے سکتا ہوں لیکن راجہ اختر نواز اور جیرے کالیا جیسے درندوں کو کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آئی جی صاحب نے مجھے برے نتائج کی وارننگ دی ہے مگر وہ میرے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے سوائے میرا ٹرانسفر کرانے کے''۔

''سر اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آئی جی صاحب پر اوپر سے دباؤ ہو گا''۔ اے ایس آئی کامران بولا۔''یہ راجہ اختر نواز بہت اونچی شے ہے اس کی پہنچ اسلام آباد تک ہے، موجودہ قومی اسمبلی میں بھی اس کا ایک ایم این اے موجود ہے جو غالباً آج کل کسی اہم وزارت کے مزے لوٹ رہا ہے''۔

''آئی جی صاحب پر وزارت داخلہ کی طرف سے دباؤ پڑ رہا ہے''۔ جمشید خان نے کہا۔''یہ لوگ الیکشن سے قبل ہر بار غربت مٹاؤ کا نعرہ لگاتے ہیں مگر اقتدار کی کرسی پر قبضہ کرتے ہی غریبوں کو مٹانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس ملک کے سسٹم میں غریبوں اور مظلوموں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے''۔

''تو اب راجہ اختر نواز کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے سر؟'' کامران نے سوال کیا۔

''کامران!'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔''ہم راجہ اختر نواز کو آج ہی میڈیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، اس کے خلاف ہمارے پاس تمام ثبوت موجود ہیں۔ اس ملک کے عوام روز روز کی دہشت گردی اور بم بلاسٹ سے عاجز آئے ہوئے ہیں، آئی جی تو کیا وزارت داخلہ بھی اسے رہا نہیں کرا سکے گی۔ اگر انہوں نے ایسا کوئی قدم اٹھایا یا تو میڈیا ان کا جینا دوبھر کر دے گا''۔

''بہت اچھا پلان ہے سر''۔ وہ پُرمسرت انداز میں بولا۔''آئی جی صاحب کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے''۔

"اوکے تو پھر ابھی میڈیا والوں کو بلانے کا انتظام کرو"۔ جمشید خان نے مطمئن انداز میں جواب دیا اور اے ایس آئی کامران اثبات میں سر ہلاتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

===

بادشاہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہال کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کے دونوں جانب سائیڈوں میں رحمدل خان اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ بادشاہ کو اپنے سامنے خالی ہاتھ پا کر رحمدل خان آگے بڑھا اور حکمیہ انداز میں بولا۔ "دونوں ہات اوپر اٹھالو ورنہ ام گولی چلا دے گا"۔ بادشاہ نے بلاتردد دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ رحمدل خان اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"اس کی جامہ تلاشی لو، بوہت چالاک آدمی اے، ام کو اس پر اعتبار نہیں اے"۔

"رحمدل خان! یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو"۔ بادشاہ اپنی اس توہین پر تلملا کر بولا۔ "شاید تم میرے تعاون کو میری کمزوری سمجھ رہے ہو؟"

"نہیں یہ بات نہیں اے"۔ رحمدل خان اپنی جمبو سائز مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "بلکہ ام کو تم پر اعتبار نہیں اے۔ ام تلاشی احتیاط کے واسطے لے رہا اے"۔

بادشاہ نے وقت ضائع کرنے کی بجائے تلاشی دینا ہی مناسب سمجھا۔ اس کی پتلون اور شرٹ کی جیبوں کی اچھی طرح تلاشی لی گئی مگر کچھ بھی برآمد نہ ہوا تب بادشاہ نے استہزائیہ انداز میں رحمدل خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بادشاہ کے اپنے اصول ہیں رحمدل خان! وہ پیٹھ پر وار کرتا ہے نہ جھوٹ بولتا ہے اور نہ ہی کبھی کھیل میں بے ایمانی کرتا ہے۔ اطمینان ہو گیا تمہارا؟"

"ام کو امارے باس نے نہ بولا ہوتا تو ابی تم کو گولی مار دیتا"۔ رحمدل خان بگڑے ہوئے انداز میں بولا۔ "ابی ہات اٹھا کر گاڑی کی طرف چلو، امارے پاس وقت نہیں اے"۔

بادشاہ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور گن پوائنٹ پر ان کے آگے آگے ہو لیا۔ بار کے احاطے سے باہر ایک کھلی جگہ پر ان کی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک گاڑی کی عقبی کھڑکی کھول کر انہوں نے بادشاہ کو اندر دھکیل دیا، دو آدمی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور پھر رحمدل خان کے حکم پر دونوں گاڑیاں حرکت میں آ گئیں۔ رحمدل خان بادشاہ والی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ نے ابھی تک رحمدل خان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑیاں جونہی شہر کی حدود سے باہر نکلیں تو بادشاہ چپ نہ رہ سکا۔

"تم لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟" اس نے اپنی دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص سے سوال کیا۔

"تمہیں سوال و جواب کرنے کی اجازت نہیں ہے"۔ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔



"چپ چاپ بیٹھے رہو، تھوڑی دیر کے بعد سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا"۔

"بولنے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی کیا ضرورت ہے؟" بادشاہ نے بھڑک کر کہا۔ "میں اپنی مرضی سے بولوں گا اور اپنی مرضی سے چپ رہوں گا۔ تم کرائے کے غنڈے مجھے کیا خاموش کراؤ گے؟"

"اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو"۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے رحمدل خان نے گردن موڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "اور اس کی کسی بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں اے"۔

بادشاہ نے اس کے اس حکم پر اعتراض کرنے کی کوشش کی تو رحمدل خان بولا۔ "یہ بنگش صیب کا حکم اے۔ تم اعتراض کرے گا تو ام کو گولی مارنے کا آرڈر بی اے"۔

"ٹھیک ہے"۔ بادشاہ نے چاروناچار رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی قسمت تیرا ساتھ دے رہی ہے لیکن میں یہ بے عزتی بھولوں گا نہیں۔ مجھے جب بھی موقع ملا میں یہ قرض سود سمیت اتار دوں گا"۔

رحمدل خان نے بادشاہ کی دھمکی کا جواب دینے کی بجائے اپنے ساتھیوں کو پٹی باندھنے کا حکم دے دیا۔ بادشاہ کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں نے چند لمحوں کے اندر نہ صرف اس کی آنکھوں پر سیاہ رنگ کی پٹی باندھ دی بلکہ ایک مضبوط ڈوری سے اس کے دونوں ہاتھ بھی اس کی پشت پر سختی سے باندھ دیے۔ اب بادشاہ کی آنکھیں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھیں، وہ محض اندازے لگا سکتا تھا کہ گاڑی کس طرف کو جا رہی ہے؟ سفر اس کی توقع سے بھی طویل ثابت ہو رہا تھا گاہے گاہے وہ اکتا کر رحمدل خان سے کوئی نہ کوئی سوال کر دیتا تھا مگر جواب کی بجائے اسے رحمدل خان کی ڈانٹ سننے کو ملتی تھی۔ اسے رحمدل خان پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا، وہ بمشکل ضبط کیے ہوئے تھا لیکن ابراہیم بنگش کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ رحمدل خان اور ان کے ساتھیوں کے منہ نہ لگے۔

راستے میں ایک بار گاڑی روک کر بادشاہ کو چائے بھی پلائی گئی تھی مگر اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی اتارنے کی زحمت گوارہ نہیں کی گئی تھی۔

سہ پہر کے وقت گاڑی جب ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہچکولے کھاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی تو بادشاہ چپ نہ رہ سکا۔ "ہم منزل تک کب پہنچیں گے؟" اس نے استفسار کیا۔

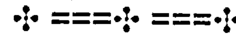
رحمدل خان اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو بادشاہ نے دوبارہ براہِ راست رحمدل خان سے پوچھا۔ "رحمدل خان! ہم کب تک پہنچیں گے بنگش کے پاس؟"

"پہنچ جائیں گے"۔ وہ غصے سے بولا۔ "زیادہ شور نہیں کرو ام کو برا لگتا ہے"۔

اس کی بکواس سن کر ایک بار تو بادشاہ کا دل چاہا کہ انجام کی پرواہ کیے بغیر اس پر ٹوٹ پڑے مگر اس کا مقصد بہت اہم تھا۔ اپنی توہین کا بدلہ تو وہ کبھی بھی موقع ملنے پر رحمدل خان سے لے سکتا تھا۔ بس یہی سوچ کر وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

ایک گھنٹے کے لگ بھگ گاڑیاں اس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چلتی رہیں اس کے بعد نہ صرف گاڑیوں کی رفتار بڑھ گئی بلکہ بادشاہ کے جسم کو جھٹکے لگنا بھی بند ہو گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ بادشاہ دوبارہ ان سے کوئی سوال کرتا گاڑی رک چکی تھی۔ ذرا سی دیر میں بادشاہ کو گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی اور پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

چند لمحوں کے بعد ایک بار پھر گاڑی رک گئی اور پھر اس کا انجن بھی آف ہو گیا۔ بادشاہ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ منزل پر پہنچ چکا ہے، تھوڑی دیر کے بعد اس کے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی جب ایک آدمی نے اسے بازو سے کھینچتے ہوئے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ وہ بلا چوں چرا نیچے اتر گیا۔ انہوں نے اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور یونہی اسے بازو سے پکڑے آگے بڑھ گئے۔



بادشاہ کی آنکھوں سے جب پٹی کھولی گئی تو اس نے خود کو ایک ڈرائنگ روم نما کمرے میں پایا۔ یہ ڈرائنگ روم نہ صرف جدید طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا بلکہ اس کی آرائش بھی جدید سے جدید تر تھی۔ دیواروں پر دیدہ زیب پینٹنگز سجی ہوئی تھیں۔ خوبصورت صوفہ سیٹ ایک ترتیب سے لگے ہوئے تھے جن کے سامنے اعلیٰ ترین سنگی میز سجے ہوئے تھے۔ ایک میز پر دو ٹیلی فون سیٹ بھی موجود تھے۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ کونے میں ٹرالی پر ٹیلی ویژن سیٹ بھی پڑا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں بادشاہ کے ساتھ صرف رحمدل خان ہی موجود تھا اس کے دیگر ساتھی وہاں نہیں تھے۔ چند لمحے پہلے رحمدل خان نے ہی اس کی آنکھوں سے پٹی اتاری تھی۔

''بیٹھو''۔ بادشاہ کو حیرت زدہ دیکھ کر رحمدل خان ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غیر متوقع طور پر نرم انداز میں بولا۔ ''ابی بنگش صیب تشریف لاتے ہیں''۔

''کیا میرے ہاتھ یونہی پشت پر بندھے رہیں گے''۔ اس نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں نہتا ہوں پھر مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اب بھی تم خطرہ محسوس کرتے ہو؟''

''ام خطرہ محسوس نہیں کرتا''۔ رحمدل خان بولا۔ ''یہ بنگش صیب کا حکم اے کہ تم پر اعتبار بالکل نہ کیا جائے کیونکہ تم بوہت خطرنک آدمی اے''۔



''کیا تم مجھے خطرناک نہیں سمجھتے ہو؟'' بادشاہ نے سوال کیا۔

''یہ احمق اگر تمہیں جانتا تو کبھی بھی تم سے لڑنے کی حماقت نہ کرتا مسٹر جہانداد''۔ اچانک بادشاہ کو اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی اور وہ غیر ارادی طور پر پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگا۔

''زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر جہانداد عرف بادشاہ''۔ آنے والا جو کہ ابراہیم بنگش تھا مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بہروپ تو خوب بدلا ہے مگر ابراہیم بنگش کی آنکھوں کو دھوکا دینا ناممکن ہے البتہ اس بہروپ سے رحمدل خان جیسے احمقوں کو آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے''۔

ابراہیم بنگش کی بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ دشمن کی کچھار میں گھستے ہی پہلے ہی قدم پر اس کی اصلیت کھل چکی تھی۔ اب خود کو پوشیدہ رکھنا سعی لاحاصل تھی چنانچہ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کس مقصد کے لیے اغوا کیا گیا ہے؟ میری تمہاری تو کوئی دشمنی نہیں ہے''۔

''دشمنی ہے''۔ بنگش ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اگر تم چاہو تو آج اس دشمنی کو دوستی میں بدلا جا سکتا ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟''

''تمہاری دوستی بغیر مطلب کے تو نہیں ہو سکتی''۔ جہانداد نے کہا۔ ''مجھے معلوم تو ہونا چاہیے کہ تم کیوں اور کس لیے مجھ سے دوستی کرنے کے خواہش مند ہو؟''

''بدلہ جہانداد بدلہ''۔ اتنا کہہ کر وہ رحمدل خان کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''اس کے ہاتھ کھول دو، یہاں یہ کوئی بھی غیر ضروری حرکت نہیں کر سکتا''۔

رحمدل خان نے آگے بڑھ کر جہانداد کے ہاتھ کھول دیے۔ جہانداد نے لمحہ بھر کے لیے دونوں کلائیوں کو مسل کر سہلایا اور پھر بنگش سے بولا۔ ''کیسا بدلہ...... میں سمجھا نہیں''۔

''تم بیٹھو''۔ بنگش صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں''۔

جہانداد آگے بڑھ کر اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا تب بنگش بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جس فیلڈ میں کام کر رہا ہوں اس میں دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست بنتے دیر نہیں لگتی۔ کل تک تیرا بدترین دشمن میرا بہترین دوست تھا لیکن آج وہ میرا بھی بدترین دشمن ہے''۔

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' جہانداد نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''موسیٰ خان کی''۔ اس نے جواب دیا۔

''موسیٰ خان''۔ جہانداد متحیر ہو کر بولا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو تمہارا بہت ہی خاص آدمی

تھا، میں نے تو یہ تک سنا تھا کہ اسے خان جی نے یہاں تمہاری مدد کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ بہرحال
کے ساتھ تمہاری دشمنی...... بات کچھ جی کو نہیں لگ رہی“۔

”تم ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہو“۔ بنگش نے کہا۔ ”مگر یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ خان آج میرا بدترین دشمن ہے۔ میں اسے اس طرح تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں جس طرح میری ہی حویلی میں اس نے میرے چھوٹے بھائی کو تڑپایا ہے۔ میں جب بھی اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھتا ہوں تو میرا رواں رواں انتقام انتقام پکارنا شروع کر دیتا ہے۔ اس درندے نے بلاوجہ میرے چھوٹے بھائی پر ایسا ظلم توڑا ہے جس کی مثال نہیں ملے گی۔ اس کا کوئی بھی قصور نہیں تھا وہ بے چارہ تو یہاں مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ انہی دنوں اس حویلی میں موسیٰ خان ایک لڑکی کو اغوا کر لایا تھا۔ غالباً لڑکی کا نام شہناز تھا۔ ایک دن موسیٰ خان اس لڑکی کو زدوکوب کر رہا تھا کہ اچانک وہاں پر میرا چھوٹا بھائی فہیم پہنچ گیا۔ فہیم نے اسے ایک کمزور لڑکی پر ہاتھ اٹھانے سے منع کیا تو موسیٰ خان ہتھے سے ہی اکھڑ گیا اور مار مار کر میرے بھائی کو ادھ مرا کر دیا۔ میں اگر اپنے بھائی کو بروقت ہسپتال نہ لے جاتا تو شاید وہ آج زندہ بھی نہ ہوتا۔ اب بھی اس کی زندگی مُردوں سے بدتر ہے“۔

اتنا کہنے کے بعد وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا اور دوبارہ ٹوٹی ہوئی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں شاید میری بات پر یقین نہیں آئے گا، اس لیے میں نے فہیم کو ابھی تک یہیں رکھا ہوا ہے، اسے گھر نہیں بھجوایا۔ تم اسے دیکھو گے تو تمہیں میری بات پر یقین آ جائے گا“۔

”تم خود بھی تو موسیٰ خان سے بدلہ لے سکتے ہو“۔ جہاندار نے الجھ کر کہا۔ ”پھر مجھے اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ہاں میں ایسا کر سکتا ہوں“۔ وہ بولا۔ ”مگر میں خان جی سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتا۔ موسیٰ خان اس کا بہت ہی اہم آدمی ہے اور خان جی کے ساتھ میرا کروڑوں کا بزنس چل رہا ہے، میں نہیں چاہتا کہ موسیٰ خان کے قتل میں میرا یا میرے کسی آدمی کا نام آئے اور میں محل سے فٹ پاتھ پر آ جاؤں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بھی موسیٰ خان کے خون کے پیاسے ہو، اسے ٹھکانے لگانے کے لیے میں تمہیں پوری سپورٹ دوں گا اور اس کے علاوہ منہ مانگی رقم بھی دوں گا“۔

”تمہاری پیش کش تو اچھی ہے مگر......“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”مگر کیا......؟“ بنگش نے استفسار کیا۔

”میں انکار کر دوں یہ کام کرنے سے تو تم کیا کرو گے؟“ اس نے جواب دیا۔

”تمہیں خان جی کے پاس روانہ کر دیا جائے گا“۔ وہ بولا۔ ”اور وہ بھی لاش کی صورت



تھا“۔

”تم بیوقوف ہو یا مجھے احمق سمجھتے ہو؟“ جہانداد نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنی جان بچانے کے لیے میں ابھی تمہیں ہاں کر سکتا ہوں مگر یہاں سے باہر جانے کے بعد......“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بنگش نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر جہانداد! ہاں کرنے کے بعد تم انکار نہیں کر سکو گے، مجھے معلوم ہے کہ خان جی کے پاس تمہاری فیملی موجود ہے اور تم یہ بھی بخوبی جانتے ہو کہ خان جی سے میرے کیسے تعلقات ہیں؟“

”نہیں تیرا خان جی نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکا تو تم کیسے کر سکتے ہو؟“ اس نے طنزانداز میں کہا۔ ”میں زندگی میں صرف ایک ہی بار بلیک میل ہوا تھا اور اب مجھے......“

”میں تمہیں بلیک میل نہیں کر رہا“۔ بنگش نے دوبارہ قطع کلامی کی۔ ”بلکہ وارننگ دے رہا ہوں، تمہیں میرا کام ہر صورت میں کرنا پڑے گا اس کے علاوہ تمہارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے“۔

بنگش کے تیور دیکھ کر جہانداد سوچ میں پڑ گیا، بنگش غور سے اس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ جہانداد کے دل و دماغ میں ایک جنگ چھڑ چکی ہے اور وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا ہے، چنانچہ بنگش اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بولا۔ ”خوب سوچ لو جہانداد مگر اتنا یاد رہے میرے بھائی فہیم پر یہ ظلم شہناز سے ہمدردی کرنے کے صلے میں توڑا گیا ہے اور شہناز تو تیری بہت ہی اپنی ہے۔ کیا تم اسے اغوا کرنے والے درندے کو معاف کر دو گے؟ نہ جانے وہ حرام زادہ اب تک اس معصوم اور بے بس لڑکی کے ساتھ کیا کیا......“

”نہیں“۔ جہانداد نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ”وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر ڈاکٹر شہناز کو کچھ ہو گیا تو میں موسیٰ خان کے گھر کا ایک ایک بچہ مار ڈالوں گا“۔

”ماں کے سوا موسیٰ خان کا اوپر نیچے کوئی بھی نہیں ہے“۔ بنگش بولا۔ ”تم نے اگر مارنا ہی ہے تو موسیٰ خان کو مارو اس کی بوڑھی اور بیوہ ماں کو مار کر تجھے کیا ملے گا؟“

”مرے گا وہ بھی مرے گا“۔ جہانداد نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ”تم نہ بھی کہتے تب بھی اس نے ایک روز میرے ہی ہاتھوں سے جہنم واصل ہونا ہے“۔

”نہیں“۔ بنگش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے بہت جلد تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، تم نے یہ کام فوراً کرنا ہے“۔

”جس دن وہ مجھے مل گیا میں اسی دن اسے جہنم رسید کر دوں گا“۔ اس نے جواب دیا۔

”وہ اسی شہر میں ہے ڈھونڈ و اسے“۔ بنگش بولا۔ ”کسی مارکیٹ میں کسی سڑک پر کہیں تو نظر

آئے گا''۔

''تمہیں یقین نہیں آئے گا شاید''۔ جہانداد نے کہا۔ ''میں اسے کب سے ڈھونڈتا پھر ہوں مگر وہ تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکا ہے''۔

''او کے مجھے تم پر یقین ہے''۔ بنگش بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تم وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتے''۔

اس کے بعد جہانداد کو جس طرح وہاں لایا گیا تھا اسی طرح واپس روانہ کر دیا گیا۔

===

پرنٹ میڈیا کے بہت سے صحافیوں نے ایس پی جمشید خان اور اے ایس آئی کامران کو گھیر رکھا تھا۔ ان کے سامنے دہشت گردوں سے برآمد کیا ہوا تمام اسلحہ رکھا ہوا تھا۔ ان صحافیوں کے ساتھی کیمرہ مین حوالات میں دہشت گردوں اور راجہ اختر نواز کی تصویریں لے رہے تھے۔ ایس پی جمشید خان نے صحافیوں کو اسلحہ دکھانے کے بعد تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''آپ تمام لوگوں نے ملاحظہ فرما لیا ہوگا کہ یہ کتنا خطرناک اسلحہ ہے، اس میں سے آدھے سے زیادہ اسلحہ ہمارے پڑوسی ملک کا بنا ہوا ہے جو ہمارا ازلی دشمن ہے۔ جب سے یہ پاک وطن معرضِ وجود میں آیا ہے تب سے ہمارے اس بزدل اور عیار پڑوسی بلکہ دشمن کی نگاہوں میں خار بن کر کھٹک رہا ہے۔ یہ بزدل ہماری صفوں میں اتحاد دیکھ ہی نہیں سکتے، انہیں ہماری ترقی اور عروج کبھی ہضم ہو ہی نہیں سکتا، کبھی اپنی مکاری سے کام لے کر ہمارے ملک میں لسانی فسادات برپا کر دیتے ہیں تو کبھی فرقہ بندی کو بنیاد بنا کر ہمیں آپس میں لڑا دیتے ہیں...... اور ہماری بدنصیبی دیکھو کہ ہم راجہ اختر نواز جیسے غداروں کو اپنی صفوں میں پال رہے ہیں بلکہ ایسے لوگ یہاں قوم کے رہنما بنے ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں نے جیرا کالیا اور سلیم کو دیکھ ہی لیا ہوگا، ان کے پیچھے راجہ اختر نواز جیسے لوگ ہیں جو انہیں وطن دشمنوں سے اسلحہ لے کر دیتے ہیں اور پھر جیرا کالیا اور سلیم جیسے کئی درندے یہاں دن رات بے گناہوں اور معصوموں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔ عام مقامات تو ایک طرف رہے اب تو ان کی درندگی سے مسجدیں، سکول اور دینی درس گاہیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ ہم نے اپنے کئی ایماندار ساتھیوں کی قربانی دے کر جیرا کالیا اور سلیم جیسے درندے کو گرفتار کیا ہے۔ گرفتاری کے دوسرے ہی روز راجہ اختر نواز ان کا سرپرست بن کر آ گیا اور انہیں چھوڑنے کے لیے میرے سامنے حرام کی کمائی کا ڈھیر رکھ دیا۔ میں نے انکار کیا تو مجھے بُرے بُرے نتائج کی دھمکیاں دینے لگا تب میں نے انجام کی پرواہ کر ہوئے اسے بھی جیرا کالیا اور سلیم کے ساتھ حوالات میں بند کر دیا۔ اس کا ردِعمل جانتے ہو کیا ہوا''

اتنا کہنے کے بعد وہ جواب طلب نگاہوں سے صحافیوں کی طرف دیکھنے لگا۔



''پلیز سر بتائیں؟'' کئی صحافیوں نے بیک وقت اپنی اپنی نوٹ بک سے نگاہیں اٹھا کر کہا۔ ''یہ ردِعمل سرکاری سطح پر ہوا ہے یا غیر سرکاری؟''

''میں اگر ان لوگوں کے نام ظاہر کر دوں تو کیا آپ لوگ انہیں منظرِ عام پر لانے کی جرأت کر سکیں گے؟'' جمشید خان نے ڈرامائی انداز میں استفسار کیا۔

''کیوں نہیں سر! میڈیا آزاد ہے''۔ بیک وقت کئی آوازیں سنائی دیں۔ ''ہم انہیں عوام کے سامنے ضرور بے نقاب کریں گے۔ ملک سے غداری کرنے والے کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہوتے۔ آپ بتائیں سر! ہم ضرور چھاپیں گے''۔

''مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی جی صاحب کی طرف سے حکم ملا ہے کہ میں راجہ اختر نواز کو عزت واحترام کے ساتھ یہاں سے رخصت کر دوں''۔ جمشید خان نے بتایا۔ ''اور آئی جی صاحب کو موجودہ اسمبلی کے ایک ایم این اے کی طرف سے راجہ اختر نواز کو چھوڑنے کی سفارش کی گئی ہے۔ وہ ایم این اے وزارتِ داخلہ کا بہت چہیتا ہے''۔

''کیا واقعی؟...... اس ایم این اے کا نام کیا ہے؟...... آئی جی صاحب بھی کیا بک گئے ہیں؟''

ایسے اور اس سے ملتے جلتے کئی سوالات ایک ساتھ کیے گئے۔ وہاں ایک دم شور وغل شروع ہو گیا۔

''پلیز شور نہیں''۔ جمشید خان نے استدعا کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معطل نہ کیا گیا تو یہاں سے ٹرانسفر ضرور کر دیا جائے گا۔ میں نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے آپ لوگوں تک یہ حقائق پہنچا دیئے ہیں اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان حقائق کو عوام تک پہنچائیں۔ مجھے اپنی معطلی یا ٹرانسفر کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے، میں تو صرف ملک وقوم کے ان دشمنوں کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس ملک کے بھولے بھالے عوام جان سکیں کہ جو لوگ ان کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں تک پہنچتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟''

''ہم حقائق لکھیں گے سر! ملک وقوم کے ان دشمنوں کو ضرور بے نقاب کریں گے اور راجہ اختر نواز کو بھی اس کے کالے کرتوتوں سمیت ضرور چھاپیں گے۔ کل کے اخبارات ان کے سیاہ کارناموں سے بھرے ہوں گے''۔

اس کے بعد جمشید خان نے صحافیوں کے سوالات کے جوابات دیے اور پھر انہیں رخصت کر دیا گیا۔

دوسرے دن کے تمام اخبارات میں راجہ اختر نواز، اس کے حمایتی ایم این اے اور آئی جی

سمیت چند دیگر اعلیٰ افسران کے خلاف سرخیوں کے ساتھ خبریں شائع کی گئی تھیں۔ ان خبروں کے شائع ہوتے ہی حزب اختلاف کے لیڈروں میں ہلچل مچ گئی راجہ اختر نواز کے حمایتی ایم این اے اور ایم پی اے کے خلاف بیان بازی شروع ہوگئی۔ آئی جی اور راجہ اختر نواز کے حمایتی ایم این اے کو اپنی اپنی پڑ گئی اور وہ راجہ اختر نواز کو بھول کر اخباری نمائندوں کے سامنے اپنی اپنی صفائی دینے لگے۔ وقتی طور پر ایس پی جمشید خان کے سر سے خطرہ ٹل چکا تھا اب وہ راجہ اختر نواز کے خلاف اپنی مرضی کی کارروائی کرسکتا تھا۔

===·:·===

جہانداد کو جہاں سے اٹھایا گیا تھا اسی روز اسے وہیں چھوڑ دیا گیا۔ جب رحمل خان اور اس کے ساتھیوں نے اسے بابو بھائی کے بار کے سامنے اتارا تھا تو اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے تاہم انہوں نے جانے سے پہلے اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی تھی۔ وہ نیلی کوٹھی جاکر بھی ناکام ہی رہا تھا اس کا یہ بہروپ اس کے کسی کام نہیں آیا تھا، الٹا بنگش ہی اس کے گلے پڑ گیا تھا۔ اب ماں اور بہن کی سلامتی کے لیے اسے بنگش کے حکم پر چلنا ہی تھا۔ موسیٰ خان کو تو اس نے یوں بھی معاف نہیں کرنا تھا وہ اس کے بھائیوں جیسے دوست سونو کا قاتل تھا مگر غصہ اسے بنگش کی وارننگ پر آ رہا تھا وہ اسے یوں حکم دے رہا تھا جیسے وہ کوئی اس کا ادنیٰ ملازم ہو۔

''موسیٰ خان یہ سب تیرا کیا دھرا ہے؟'' بار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے وہ خود کلامی کے انداز میں بولا ''میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ ڈاکٹر شہناز کا اغوا تجھے عنقریب مہنگا پڑنے والا ہے''۔

ہال کے دروازے پر بابو بھائی کے ایک آدمی نے اس کے ہاتھ کھول دیے تھے۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بابو بھائی کے متعلق استفسار کیا تو وہ آدمی بولا ''جناب! وہ اپنے کمرے میں ہے۔ ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے سے منع کر دیا ہے اس کی زخمی ٹانگ کی مرہم پٹی کر دی گئی ہے۔ اب وہ بہتر ہے مگر آپ کی وجہ سے پریشان ہے''۔

''ٹھیک ہے میں اس کے پاس جا رہا ہوں''۔ اتنا کہتے ہوئے جہانداد آگے بڑھ گیا۔

ذرا دیر کے بعد وہ بابو بھائی کے کمرے میں موجود تھا اور بابو بھائی کے استفسار پر اسے اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ اس کی پوری کہانی سننے کے بعد بابو بھائی بولا ''اس کا مطلب ہے کہ آپ کے متعلق میرا اندازہ ٹھیک تھا، آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آتے تھے اور نہ ہی آپ کا نام بادشاہ ہے؟ چلو کوئی بات نہیں یہ آپ کا اور بڑے صاحب کا معاملہ ہے۔ ہم دخل اندازی کیسے کر سکتے ہیں؟''

''بابو بھائی!'' جہانداد بولا ''میں آپ کا ہمیشہ ممنون رہوں گا آپ نے میرا بہت خیال رکھا، میں یہاں جتنے دن بھی رہا آپ نے میری بڑی خدمت کی ہے''۔



''بڑے صاحب کی دریا دلی سے ہی میرا کاروبار چل رہا ہے''۔ بابو بھائی نے کہا۔ ''اور آپ بڑے صاحب کے ہی آدمی ہیں آپ کی خدمت کرنا اور خیال رکھنا میرا فرض تھا۔ میں کچھ بھی کرتا ہوں بڑے صاحب کے احسانوں کا بدلہ نہیں اتار سکتا''۔

''تمہاری ٹانگ کا کیا حال ہے؟'' جہانداد نے سوال کیا۔ ''پولیس موبائل یہاں پہنچی تھی کہ نہیں؟''

''بس اوپر والے نے کرم کیا ہے، ٹانگ کی ہڈی محفوظ رہی ہے''۔ وہ بولا۔ ''اور پولیس بھی آپ کے جانے کے بعد پہنچ گئی تھی۔ وہ لاشیں بھی اٹھا کر لے گئے ہیں اور میرے تین آدمی بھی گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ میں نے فون پر بڑے صاحب سے بات کر لی ہے وہ سب سنبھال لیں گے''۔

''ٹھیک ہے بابو بھائی''۔ اس نے کہا۔ ''ابھی میں یہاں سے جاؤں گا کیونکہ اب میرے بہروپ کا اور یہاں رہنے کا کوئی مقصد نہیں رہا''۔

''کوئی بات نہیں''۔ بابو بھائی بولا۔ ''میں ابھی تمہاری واپسی کا انتظام کر دیتا ہوں''۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے ساتھ رکھے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کسی سے حکمیہ انداز میں کہا ''حبیب خان کو فوراً میرے پاس بھیجو اور چائے کے ساتھ کھانے کے لیے بھی کچھ بھجوا دو''۔

پانچ منٹ کے بعد حبیب خان نامی نوجوان بابو بھائی کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''حبیب خان!'' بابو بھائی اس سے مخاطب ہوا ''صاحب کا سامان گاڑی میں رکھوا دو اور یہ جہاں کہیں انہیں چھوڑ دینا۔ جاؤ شاباش صاحب ابھی تھوڑی دیر کے بعد پہنچ جائیں گے''۔

حبیب خان۔ ''یس سر''۔ کہتا ہوا الٹے قدموں باہر نکل گیا اور بابو بھائی جہانداد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''آپ کی موٹر سائیکل بھی پہنچا دی جائے گی فکر نہ کریں''۔

اسی لمحے بابو بھائی کا ایک ملازم چائے کے لوازمات لے کر پہنچ گیا اور وہ دونوں باتوں کا سلسلہ روک کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

===·:·===

راجہ اختر نواز کی گرفتاری کی خبریں خان جی تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ راجہ اختر نواز خان جی اور بنگش کے لیے کام کرتا تھا اس لیے اس کی گرفتاری نے خان جی کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ راجہ نواز کا زندہ رہنا اب خان جی کے لیے حد سے زیادہ خطرناک تھا، وہ عدالت میں خان جی اور بنگش کے خلاف زبان کھول سکتا تھا۔ چنانچہ خان جی نے فوراً بذریعہ فون بنگش سے بات کی اور اس سے موسیٰ خان کے متعلق دریافت کیا مگر بنگش نے موسیٰ خان کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”خان جی! مجھے اس کے متعلق کافی دنوں سے کچھ بھی معلوم نہیں ہے وہ چند دن میرے ہاں کوٹھی میں مقیم ضرور رہا ہے مگر اب اس کا کوئی پتا نہیں ہے“۔

”اسے ڈھونڈو“۔ خان جی نے حکمیہ انداز میں کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ راجہ نواز گرفتار ہو چکا ہے اور کل پرسوں تک اسے جمشید خان عدالت میں بھی پیش کرنے والا ہے۔ اسے عدالت میں پہنچنے سے پہلے ختم کرنا ضروری ہے ورنہ ہم دونوں بھی پھنس جائیں گے“۔

”خان جی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟“ بنگش قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں پہلے دو بار گرفتار ہو چکا ہوں اور اس ملک کے لولے لنگڑے قانون......“

”پہلے کی بات اور تھی“۔ اس نے قطع کلامی کی۔ ”تمہارے خلاف کوئی ٹھوس شہادت نہیں تھی مگر اب راجہ اختر نواز عدالت میں تمہارا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے گا“۔

”وہ ایسا نہیں کر سکتا خان جی“۔ بنگش بولا۔ ”اسے اپنی فیملی کی زندگی بہت عزیز ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ہم اس کے گھر کا کوئی ایک فرد بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے“۔

”میں تم سے زیادہ جانتا ہوں“۔ خان جی نے بھڑک کر کہا۔ ”موسیٰ خان کو تلاش کرکے پیغام پہنچا دو کہ راجہ اختر نواز کو عدالت تک نہیں پہنچنا چاہئے“۔

بنگش لمحہ بھر کے لیے چپ رہا اب وہ خان جی کو کیسے بتاتا کہ وہ موسیٰ خان کے خون کا پیاسا ہو چکا ہے اور اس کے قتل کے احکامات بھی صادر کر چکا ہے۔

”تم چپ کیوں ہو؟“ خان جی نے چلا کر پوچھا۔



”جی خان جی!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ بے فکر رہیں راجہ اختر نواز عدالت تک نہیں پہنچ پائے گا۔ موسیٰ خان نہ بھی ملا تو میرے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہے“۔

خان جی نے مطمئن ہو کر رابطہ منقطع کر دیا مگر اس کا یہ اطمینان دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ دراصل خان جی کو موسیٰ خان کے علاوہ کسی پر اعتماد ہی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر پریشان ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں تھا۔ زرولی کی گمشدگی اور پھر مولانا نصیب اللہ کا اس کی قید سے نکل جانا یہ دونوں عوامل اس کی پریشانی کا باعث بن چکے تھے۔ اس نے زرولی کو تلاش کرانے کی بہت کوشش کی مگر زرولی کو نہ ملنا تھا، نہ ملا۔

مغرب کے بعد وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ایک تفریحی پروگرام دیکھ رہا تھا مگر اسے لطف نہیں آ رہا تھا۔ اسی دوران ٹی وی پر خبروں کا وقت ہو گیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند ابتدائی خبروں کے بعد جب نیوز کاسٹر نے راجہ اختر نواز کے متعلق خبر پڑھی تو بے اختیار اس کا دل دھڑک اٹھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔

”دہشت گردی میں ملوث مشہور ملزم راجہ اختر نواز کو کل عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ اہم انکشافات ہونے کا امکان ہے“۔

اس سے آگے وہ سن ہی نہ سکا کہ نیوز کاسٹر کیا کہہ رہا ہے، وہ بے چینی کے عالم میں اٹھا اور آگے بڑھ کر فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ چند نمبر ٹرائی کرنے کے بعد آخر کار اسے ایک نمبر پر موسیٰ خان مل گیا، علیک سلیک کیے بغیر وہ موسیٰ خان پر پھٹ پڑا۔ ”تمہیں کچھ احساس ہے کہ نہیں؟ یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم وہاں موج مستی کرتے پھر رہے ہو؟“

”حکم خان جی!“ حسب معمول وہ فرمانبرداری سے بولا۔ ”کس نے آپ کو پریشان کرنے کی ہمت کی ہے؟“

”کوئی ایک پریشانی ہو تو بتاؤں؟“ خان جی بدستور غصے میں بول رہے تھے۔ ”یہاں تو پے در پے پریشانیاں نازل ہو رہی ہیں“۔

”خان جی! موسیٰ خان کے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“۔ اس نے کہا۔ ”آپ حکم کریں مجھے کرنا کیا ہے؟“

”تم آج کل اخبار یا ٹی وی وغیرہ شاید نہیں دیکھ رہے ہو ورنہ مجھ سے یوں حیرت زدہ ہو کر نہ پوچھتے؟“ خان جی نے جواب دیا۔

”خان جی! آپ تو جانتے ہیں کہ میں اخبارات اور ٹی وی سے دور ہی رہتا ہوں“۔ وہ بولا۔ ”اس لیے میں مجھے کیا پتا کہ آپ کی پریشانی کا باعث کیا ہے؟“

''تم بنگش کے پاس نہیں گئے تھے کیا؟'' خان جی نے اچانک موضوع سے ہٹ کر سوال کر دیا۔

''گیا تھا خان جی مگر وہاں اس کے چھوٹے بھائی نے کچھ گڑ بڑ کر دی تھی۔ چنانچہ میں وہاں سے نکل آیا اور اب یہاں......''

''کیسی گڑ بڑ؟'' خان جی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے پوری بات بتاؤ؟''

''چھوڑیں خان جی'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔ ''اس میں آپ کی دلچسپی کی کوئی بھی بات نہیں ہے، ایسے فضول سا معاملہ ہے''۔

''میں نے کیا کہا ہے؟'' خان جی نے دوبارہ قطع کلامی کرتے ہوئے غصے سے پوچھا۔ ''جیسا بھی معاملہ ہے مجھے بتاؤ؟''

خان جی کے استفسار پر موسیٰ خان نے اسے نیلی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات تفصیل کے ساتھ سنا دے۔ اس نے رتی بھر بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تھا۔

''اوہ'' تفصیل سننے کے بعد خان جی نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''بنگش نے مجھ سے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا، حالانکہ یہ کوئی اتنا عام واقعہ نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھ سے یہ بات مخفی کیوں رکھی؟''

''ہوسکتا ہے خان جی! بنگش نے اس معاملے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی ہو'' موسیٰ خان نے جواب دیا''۔

''ٹھیک ہے اس سے میں بعد میں بات کرلوں گا''۔ خان جی نے کہا۔ ''فی الحال میں تمہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں''۔

''حکم کریں خان جی'' وہ بولا۔ ''غلام بجالانے کے لیے تیار ہے''۔

''موسیٰ خان!'' خان جی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''ایس پی جمشید خان نے راجہ اختر نواز کو گرفتار کرلیا ہے بلکہ اسے دہشت گردی کرنے کے جرم میں بھی ملوث کرلیا ہے۔ کل ایس پی اسے عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ راجہ اختر نواز زندہ عدالت تک نہ پہنچ پائے''۔

''فکر نہ کریں خان جی! ایسا ہی ہوگا''۔ اس نے پُرعزم انداز میں جواب دیا۔

''موسیٰ خان!'' خان جی نے کہا۔ ''میں جب تک راجہ اختر نواز کی موت کی خبر نہ سن لوں گا تب تک میری پریشانی دور نہیں ہوگی''۔

''میں نے کہا ہے ناں خان جی'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''کل عدالت پہنچنے سے پہلے ہی راجہ اختر نواز کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا جائے گا''۔



''ٹھیک ہے میں اس خوشخبری کا منتظر رہوں گا''۔ یہ کہہ کر خان جی نے رابطہ منقطع کر دیا تاہم ی خان ریسیور ہاتھ میں لیے لمحہ بھر کے لیے حیرت زدہ کھڑا رہا، خان جی کو اس قدر پریشان اس پہلی بار پایا تھا۔ خان جی جو گفتگو کرتے وقت اپنے لیے ''ہم'' کا صیغہ استعمال کیا کرتا تھا آج عام شخص کی طرح خود کو ''میں...... میں'' کہہ رہا تھا۔

''مطلب خان جی کی پریشانی واقعی بڑی ہے''۔ موسیٰ خان نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

===·===·

راجہ اختر نواز پکڑے جانے والے دہشت گردوں سلیم اور جیرا کالیا کو چھڑانے کے لیے آیا اور اس نے اس مقصد کے لیے ایس پی جمشید خان کو نہ صرف رشوت پیش کی تھی بلکہ پولیس اسٹیشن اندر پولیس کے ایک اعلیٰ آفیسر کو بُرے نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ اس کا واضح اور صاف ب یہی تھا کہ ان دہشت گردوں کو راجہ اختر نواز ہی کی سرپرستی حاصل ہے اور اسلحہ بھی انہیں وہی م کرتا ہے۔ بہت اوپر کی سطح کے بعض حکام اسے بچانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے مگر میڈیا ھل کر ایسے عناصر کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ ایس پی جمشید خان کو خراجِ تحسین پیش کر رہا ۔ چنانچہ جمشید خان راجہ اختر نواز کے گرد پھیلائے جال کو مزید تنگ کرتا جا رہا تھا۔ آئی جی کی ت بھی ایک بار پھر اسے حاصل ہو چکی تھی۔ میڈیا اور آئی جی اس کے ساتھ نہ ہوتے تو شاید کے محکمے سے اب تک اس کی چھٹی ہو چکی ہوتی۔

دورانِ تفتیش دہشت گرد سلیم اور جیرے کالیا نے یہ سنسنی خیز انکشافات کیے تھے کہ وہ لوگ ت گردی اور ڈکیتی کی یہ کارروائیاں راجہ اختر نواز کی شہ پر کرتے رہے تھے، راجہ اختر نواز گو کہ بھی سامنے نہیں آتا لیکن اس کے احکامات بذریعہ فون ملا کرتے تھے اور اسلحہ بھی اس کے آدمی ایا کرتے تھے۔

ساری بات جمشید خان کی سمجھ میں آگئی تھی کہ ڈکیتی، قتل و غارت اور دہشت گردی کی ان وائیوں کے ذریعے شہر میں خوف و ہراس کیوں پھیلایا جا رہا تھا مگر وہ کسی کے سامنے اس کا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ سیاست سے بری دنیا میں اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنا قائم رکھنے کے لیے ان دنوں بے گناہ عوام کا جس طرح خون بہایا جا رہا تھا اس کی مثال لانا تھا۔ گو کہ دنیا کے اکثر ممالک میں یہی کچھ ہوتا رہتا ہے اور ہر جگہ قربانی کا بکرا عوام ہی بنتے انوں میں سے کبھی کوئی نہیں مارا گیا لیکن ایس پی جمشید خان نے طے کر لیا تھا کہ وہ راجہ اختر اس خاص بندے کو انجام تک پہنچا کر ہی دم لے گا جس کے ہاتھ کئی بے گناہوں کے خون

سے رنگے ہوئے تھے اور اس کا شمار پھر بھی معزز ترین ہستیوں میں ہوتا تھا۔ ایسے لوگ تو سرِ عام پھانسی پر لٹکا دینے کے قابل ہوتے ہیں لیکن جمشید خان ایسا نہیں کر سکتا تھا قانون کا محافظ ہو کر وہ قانون کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا۔

سلیم اور جیرا کالیا ریمانڈ پر تھے۔ ان کے بیانات میں ہر اس جرم کی تفصیل شامل تھی جو انہوں نے ارتکاب کیا تھا۔ ہر واردات کی تاریخ، وقت اور مقام کا حوالہ بھی موجود تھا۔ انہوں نے اعتراف بھی کیا تھا کہ دہشت گردی اور قتل و غارت گری کی یہ تمام کارروائیاں انہوں نے راجہ اختر نواز کے کہنے پر سرانجام دی تھیں اور یہ کہ ان سے برآمد ہونے والا اسلحہ بھی انہیں راجہ اختر نواز نے فراہم کیا تھا۔ راجہ اختر نواز کا ریمانڈ ابھی تک نہیں لے گیا تھا تاہم دو دنوں کے بعد اسے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ جمشید خان پُر امید تھا کہ اس بار ابراہیم بنگش کی گردن بُری طرح پھنسنے والی ہے۔ اسے یقین تھا کہ راجہ اختر نواز کا اعلیٰ بنگش ہی ہوگا جو خود تو کبھی منظرِ عام پر نہیں آتا لیکن ہر جرم کے پیچھے اس کا ہاتھ ہوتا ہے۔ دو دن کے بعد راجہ اختر نواز سمیت دونوں ملزمان کو عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔ جمشید خان نے کیس تیار کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے راجہ اختر نواز کے خلاف ٹھوس ثبوت اکٹھے کر لیے تھے۔ اب اس کے لیے سزا سے بچنا نہ صرف مشکل تھا بلکہ ناممکن تھا۔

ملزمان کی پیشی کے روز جمشید خان صبح نو بجے ہی عدالت میں پہنچ گیا تھا۔ ملزمان کو ساڑھے دس بجے عدالت میں لایا جانے والا تھا۔ جمشید خان اس وقت اے ایس آئی کامران کے ساتھ عدالت کے احاطے میں موجود تھا اور شدت سے ملزمان کی آمد کا منتظر تھا۔ اے ایس آئی کامران سے گفتگو کرتے ہوئے وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ معاً فائرنگ کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ اے ایس آئی کامران بھی اس کے ساتھ اٹھ کر باہر کی طرف دوڑا۔

فائرنگ ایک تسلسل کے ساتھ ہو رہی تھی۔ عدالت کے احاطے میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بدحواسی میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اسٹامپ فروش، اوتھ کمشنرز اور وکیلوں نے اپنی اپنی جو میزیں لگا رکھی تھیں وہ الٹ الٹ کر گر رہی تھیں۔ لوگ جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ ایسے ہی وقت جمشید خان نے ان لوگوں کو دیکھ لیا جو فائرنگ کر رہے تھے اور ان کو بھی جن پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔

حملہ آوروں کی تعداد تین تھی اور انہوں نے چہروں پر نقاب لگا رکھے تھے۔ ان کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں اور ان کا نشانہ وہ ملزمان تھے جنہیں پولیس عدالت میں پیش کرنے کے لیے لا رہی تھی۔ قیدیوں کی تعداد پانچ تھی اور ان کے ساتھ چار پولیس اہلکار تھے۔ اس وقت جو منظر جمشید کی نگاہوں کے سامنے تھا وہ بہت ہی خوفناک تھا۔



تین قیدی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ ایک پولیس والا بھی ان کے ساتھ حدودِ سود و زیاں سے گزر چکا تھا۔ جبکہ دوسرا پولیس اہلکار زخمی ہوا تھا اور باقی دو پولیس والے پوزیشنز لے کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جمشید خان نے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور ایک دیوار کی آڑ لے کر حملہ آوروں پر فائرنگ شروع کر دی۔ اے ایس آئی کامران بھی اس کے ساتھ فائرنگ میں شامل ہو گیا۔

حملہ آوروں نے جب اپنے مقابلے میں تازہ دم پولیس والے دیکھے تو وہ دفاعی فائرنگ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ ان کے عقب میں تین چار فٹ اونچی باؤنڈری وال تھی۔ باؤنڈری وال کے قریب پہنچ کر ان میں سے ایک نے باقی دو کو کور دیا اور وہ دونوں باؤنڈری وال کود گئے۔ دوسری جانب پہنچتے ہی انہوں نے دوبارہ پلٹ کر فائرنگ شروع کر دی اور اپنے تیسرے ساتھی کو چلا کر دیوار پھاندنے کے لیے کہہ دیا۔ تیسرا حملہ آور پلٹ کر دیوار کی طرف بھاگا مگر اسے دیوار پھاندنے کی مہلت نہ مل سکی۔ جمشید خان اچانک ہی انجام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دیوار کی آڑ سے نکلا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگنے والے حملہ آور پر گولیاں برسا رہا تھا۔ اس کی چلائی گئی گولیوں میں سے دو گولیاں حملہ آور کی پشت میں لگ چکی تھیں۔

حملہ آور چلاتا ہوا باؤنڈری وال کے پاس ڈھیر ہو گیا جبکہ اس کے دونوں ساتھی چند قدم دور کھڑی ہوئی کار کی طرف بھاگ اٹھے۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا اور ڈرائیور اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے تیار بیٹھا تھا۔ ان دونوں کے بیٹھتے ہی کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ وہ دونوں کھڑکیوں سے رائفلیں نکال کر ہوائی فائرنگ کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کار تیز رفتاری سے ایک طرف مڑ گئی۔ کسی نے بھی کار کا تعاقب نہیں کیا تھا۔

جمشید خان دوڑتا ہوا گرنے والے حملہ آور کے سر پر پہنچ گیا۔ حملہ آور اس وقت زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ جمشید خان نے چلا کر اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر موت نے حملہ آور کو زبان کھولنے کی مہلت نہ دی۔ وہاں سے اٹھ کر جمشید خان بھاگتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں تین قیدیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر تین قیدیوں کے چہرے دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ راجہ اختر نواز، سلیم اور جیرا کالیا تھے۔ ان کے جسم بری طرح چھلنی تھے اور ان کے جسموں سے بہنے والا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ باقی قیدیوں میں سے صرف دو زخمی ہوئے تھے اور ایک پولیس اہلکار بھی چھلنی ہو گیا تھا۔

وہاں قیامت کا منظر تھا۔ جو لوگ جانیں بچانے کے لیے دوڑ کر کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے وہ اب واپس آ رہے تھے لیکن ان میں سے بہت سے لوگ وہاں رکے بغیر عدالت کے

احاطے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جمشید خان کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ حملہ راجہ اختر نواز، سلیم اور جیرے کالیا کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا ہے تاکہ وہ عدالت میں کوئی بیان نہ دے سکیں۔ حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔

ساری بازی پلٹ گئی تھی۔ جمشید خان اپنا کیس عدالت میں پیش نہیں کر سکتا تھا۔ عدالت کے احاطے میں پیش آنے والے دہشت گردی کے اس واقعے کے بعد کیس کو از سر نو تیار کرنے کی ضرورت تھی۔



اس دن موسیٰ خان ڈاکٹر شہناز کو اس کے کمرے میں بند کر کے صبح آٹھ بجے ہی نکل گیا تھا۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے کھانا اور چائے وافر مقدار میں ڈاکٹر شہناز کو فراہم کر دی تھی۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے مگر موسیٰ خان ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ ڈاکٹر شہناز کو وسوسوں اور خوف نے گھیر لیا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں وہ اکیلی تھی اور وہ بھی قیدی بن کر، اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ان دنوں تو ویسے بھی شہر میں جنگل کا قانون نافذ تھا۔ عوام کی نہ جانیں محفوظ تھیں اور نہ ہی عزتیں اور مال۔ اخبار کے ذریعے ڈاکٹر شہناز تک دہشت گردی کی یہ خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ موسیٰ خان باقاعدگی کے ساتھ اس کے لیے اخبار منگوایا کرتا تھا۔

موسیٰ خان کی عدم موجودگی میں لحہ بہ لحہ اس کا خوف بڑھتا گیا گو کہ موسیٰ خان بھی اس کا دشمن تھا مگر اس کی موجودگی میں اسے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ موسیٰ خان جو کچھ بھی تھا اس سے قطع نظر اس نے ڈاکٹر شہناز کی طرف کبھی میلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ فہیم بنگش والے واقعے کے بعد تو ڈاکٹر شہناز اس کی قیدی ہوتے ہوئے بھی اسے احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ بے شک وہ دشمن تھا مگر تھا غیرت والا۔

ڈاکٹر شہناز جس کمرے میں قید تھی وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی سوائے کسی ہتھیار کے۔ اٹیچ باتھ روم، صاف ستھرا بیڈ، کپڑوں کی ایک الماری، میز کرسی حتیٰ کہ بجلی جانے کی صورت میں وہاں لیمپ اور دیا سلائی تک موجود تھے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا ڈاکٹر شہناز کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور وہ دشمن کی واپسی کا انتظار کیے جا رہی تھی۔ اسی انتظار میں رات کے گیارہ بج گئے۔ اب خوف اور پریشانی کے ساتھ ساتھ نیند بھی اس پر حملہ آور ہو گئی۔ کرسی سے اٹھ کر وہ بیڈ پر پہنچ گئی اور نیم دراز ہو کر نیند سے لڑنے کی کوشش کرنے لگی مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ بستر پر لیٹ کر اس نے نیند کو خود پر حاوی ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ایسے میں نیند سے جیتنا ناممکن



سو وہ بھی ہار کر نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

رات کا نہ جانے کون سا وقت تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا ... لائٹ حسب معمول جا چکی تھی۔ ابھی وہ لیمپ روشن کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی سماعتوں سے "کھٹکے" کی آواز ٹکرائی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ شل ہو کر رہ گئی مگر پھر اس کا ... موسیٰ خان کی طرف چلا گیا۔ کھٹکے کی یہ آواز اس کے کمرے کے دروازے پر ہو رہی تھی۔

"کھٹ کھٹ" کی ہلکی سی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ "شاید موسیٰ خان تالا کھول رہا ہو ...۔"

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر قدرے مطمئن ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھی مگر جب چند لمحوں بعد بھی "کھٹ کھٹ" کی یہ آوازیں بند نہ ہوئیں تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"تالا کھولنے میں اتنی دیر تو نہیں لگتی شاید یہ کوئی چور"۔ اس سے آگے وہ نہ سوچ سکی، اس کا ... کانپنے لگا۔ کھٹ کھٹ کی آوازوں کے ساتھ اب کمرے کے دروازے سے معمولی سی روشنی بھی ... پڑنے لگی تھی۔ باہر جو کوئی بھی تھا غالباً اس نے ٹارچ جلا رکھی تھی اور بغیر چابی کے تالے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

خوف نے ڈاکٹر شہناز کو پوری طرح جکڑ رکھا تھا اور اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ ... سے اُٹھ سکتی۔ معاً تالے پر قوت آزما شخص کے ہاتھوں سے کوئی چیز ایک دھماکے کے ساتھ فرش ... اور ڈاکٹر شہناز کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ غیر ارادی طور پر آواز روکنے کے لیے اس ... سختی کے ساتھ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے تھے۔

"کھٹ کھٹ"۔ کی آواز ایک لمحے کے لیے بند ہو گئی۔ شاید اس شخص کے ہاتھوں سے کوئی ... نیچے گرا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے آواز دوبارہ آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر شہناز نے منہ سے ہاتھ ... اور لرزتی کانپتی ہوئی بیڈ سے نیچے اتر گئی۔ دبے پاؤں چلتے ہوئے وہ چند قدم دور رکھے ... ٹیبل تک پہنچ گئی۔ ٹیبل پر لیمپ اور دیا سلائی موجود تھی۔ اس نے احتیاط کے ساتھ ہاتھوں ... ٹٹول کر دیا سلائی اٹھائی اور لیمپ جلانے کی بجائے اندازے سے چلتی ہوئی باتھ روم کے ... پر پہنچ گئی۔ باہر سے تالے کو کھولنے کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں۔

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ انتہائی احتیاط ... کام لیتے ہوئے اس نے ہینڈل کو اندر کی طرف دبایا تو دروازہ معمولی سی آواز پیدا کرتے ہوئے ... کھلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ باتھ روم کے اندر تھی، دروازے کو احتیاط کے ساتھ بھیڑ کر اس نے ... چٹخنی چڑھا دی تھی۔ باہر سے تالا کھولے جانے کی آوازیں اسے باتھ روم کے اندر بھی سنائی

دے رہی تھیں، اب ان آوازوں میں ''ٹھک ٹھکا ٹھک'' کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔ شاید تالے کے ساتھ برسرپیکار شخص تنگ آ کر اسے توڑنے میں لگ گیا تھا۔

ڈاکٹر شہناز نے بھی اب اپنے خوف پر قدرے قابو پا لیا تھا۔ اس لیے اس کا دماغ تیزی سے پیش آئند حالات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ تالا توڑنے والا شخص چور تھا یا ڈکیت پر اتنا اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اکیلا ہے اور اکیلے آدمی سے ہمت اور ذہانت سے کام لے کر نمٹا جا سکتا تھا، چور پر قابو پا کر وہ یہاں سے فرار بھی ہو سکتی تھی۔ معاً ایک خیال برق کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں آیا اور اس کے پورے بدن میں سنسنی کی ایک لہر سرایت کر گئی۔ کمرے میں اس کی موجودگی کے تمام ثبوت موجود تھے۔ بیڈ، کھانے پینے کی چیزیں، لیمپ حتیٰ کہ خوف اور جلد بازی کے عالم میں وہ اپنی جوتی بھی وہیں بیڈ کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ چور یا ڈکیت اتنا احمق تو نہیں ہو گا کہ کمرے میں اس کی موجودگی کا اندازہ نہ لگا سکے، اسے ایک لمحے میں پتا چل جائے گا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے، اس کے بعد اسے باتھ روم تک پہنچنے میں دیر نہیں لگنی تھی۔

اس خوفناک خیال نے لمحہ بھر کے لیے اس کو شل کر دیا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو کر رہ گئی تھی مگر پھر وہ جلد ہی سنبھل گئی، باہر سے تالا توڑنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی، کسی بھی لمحے تالا ٹوٹ سکتا تھا۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا، اسے جو کچھ بھی کرنا تھا فی الفور کرنا تھا۔ چور کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل ہی اسے اپنی حفاظت کا انتظام کرنا تھا ورنہ چور سے کچھ بھی بعید نہیں تھا عزت کے ساتھ ساتھ اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ عزت جانے کے خیال نے اس کے رگ وپے میں ایک جوش سا بھر دیا۔ ماچس اس کے ہاتھ میں تھی اس نے فوراً ایک تیلی نکال کر جلائی اور اس کی روشنی میں باتھ روم کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اسے باتھ روم کے ایک کونے میں اپنے مطلب کی چیز نظر آ گئی۔ یہ فرش صاف کرنے والا لکڑی کا ایک مضبوط برش تھا۔ اس نے جھک کر برش اٹھایا اور دوسری تیلی جلا کر دبے پاؤں باتھ روم سے باہر نکل آئی، باتھ روم کا دروازہ اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بلی کی طرح محتاط انداز میں چلتی وہ کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ باہر سے بدستور تالا توڑنے کی آواز آ رہی تھی۔ تالے پر قوت آزما شخص اب پورے جوش خروش کے ساتھ ضربیں لگا رہا تھا۔ ڈاکٹر شہناز دروازے کی سائیڈ میں کھڑی ہو گئی، لکڑی کا برش اس نے مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے اور وہ دل ہی دل میں لائیٹ نہ آنے کی دعا کر رہی تھی کیونکہ روشنی دیکھ کر چور ہوشیار ہو سکتا تھا۔

چند لمحوں کے بعد آوازیں آنی ایک دم بند ہو گئیں۔ ڈاکٹر شہناز کے تنے ہوئے اعصاب کچھ مزید تن گئے اور برش کو اس نے سر سے بلند کر لیا۔ خوف کی جگہ اب اس کے رگ وپے میں جنون



سرایت کر چکا تھا اور وہ اندر داخل ہونے والے شخص پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی۔ معاً دروازہ معمولی سی آواز پیدا کرتے ہوئے آہستہ آہستہ کھلنے لگا، وہ جو کوئی بھی تھا بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ڈاکٹر شہناز بالکل بے حس وحرکت کھڑی ہوئی تھی، اس نے سانسیں تک روک رکھی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازے کے دونوں پٹ مکمل کھل گئے۔ ڈاکٹر شہناز کی گرفت برش پر مضبوط ہو گئی اور دل کی دھڑکن معمول سے کچھ بڑھ گئی۔

چور نے اندر داخل ہونے کی بجائے کمرے میں ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ یہ روشنی دیکھ کر ڈاکٹر شہناز چونکی ضرور تھی مگر اس نے کوئی بھی ایسی ویسی حرکت نہیں کی تھی۔ غالباً اس کے لیے وہ پہلے ہی سے تیار تھی۔ روشنی کے بعد ڈاکٹر شہناز کو قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی اور پھر اسے آگے بڑھتا ہوا ایک سیاہ پوش نظر آ گیا۔ وہ کمرے کے سامان پر ٹارچ کی روشنی پھینکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

ڈاکٹر شہناز بلی کی طرح دبے پاؤں چلتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچی اور چشم زدن میں پوری طاقت کے ساتھ لکڑی کا برش اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ وہ اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ ٹارچ اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر پڑی اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کراہتے ہوئے پیچھے پلٹا مگر اس دوران ڈاکٹر شہناز اس کی کھوپڑی پر ایک اور وار کر چکی تھی۔ چور لہراتا ہوا فرش پر گر گیا اور ڈاکٹر شہناز نے تیسری بار برش کو سر سے بلند کر لیا۔ اچانک پورا کمرا روشنی میں نہا گیا، لائیٹ آ چکی تھی۔ روشنی میں ڈاکٹر شہناز نے مضروب چور کا جائزہ لیا تو وہ اسے ہوش وخرد سے بیگانہ نظر آیا۔ مضبوط برش کی دو ضربوں نے اسے لڑھکا دیا تھا۔ اس کی کھوپڑی کی عقبی جانب سے نکلنے والا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔

ڈاکٹر شہناز نے جھک کر اس کی نبض چیک کی اور پھر مطمئن انداز میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ برش بدستور اس کے ہاتھ میں تھا تاہم اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ چور دو گھنٹوں سے قبل کسی طرح بھی ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے ناطے اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ برش سے لگائی گئی یہ ضربیں چور کے لیے جان لیوا ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔

چور کو اس کے حال پر چھوڑ کر وہ آگے بڑھی اور ٹیبل پر پڑے ہوئے جگ سے پانی کا ایک گلاس بھر کر ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ آدھا گلاس اس نے مزید پانی کا پیا اور عجلت میں جوتی پہن کر کمرے کے دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بے ہوش پڑے ہوئے چور کے پاس پہنچ گئی۔ جھک کر اس نے چور کی جیبوں کی تلاشی لی تو اسے اپنے مطلب کی دونوں چیزیں مل گئیں۔ یہ ایک پرس تھا جس میں تھوڑی سے نقدی اور چور کا قومی شناختی کارڈ موجود تھا اور دوسری چیز ایک لوڈ ریوالور تھا۔ پرس سے کارڈ نکال کر اس

نے دوبارہ چور کی جیب میں ڈال دیا اور پرس اور ریوالور لے کر آگے بڑھ گئی۔

تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ کوٹھی کے مین گیٹ تک پہنچ گئی۔ جنگلا نما فولادی دروازہ بند تھا غالباً موسیٰ خان اسے باہر سے تالا لگا کر گیا تھا۔ چور دروازہ پھلانگ کر کوٹھی کے اندر داخل ہوا تھا اب ڈاکٹر شہناز کو بھی دروازہ پھلانگ کر یہاں سے نکلنا تھا۔ اب وہ کھڑی دروازہ پھلانگنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ معاً اس کی سماعتوں سے کسی گاڑی کے چلنے کی آواز ٹکرائی یہ آواز تیزی سے نزدیک آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ گاڑی لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ گیٹ پر گاڑی کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی پڑنے لگی۔

ڈاکٹر شہناز ایک دم گھبرا کر دائیں ہاتھ موجود قد آدم پودوں کے عقب میں جا چھپی۔ اس کی نگاہیں کوٹھی کے مین گیٹ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ گاڑی کی متحرک روشنی تیزی سے نزدیک آتی جا رہی تھی اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ڈاکٹر شہناز کے پورے بدن میں سنسنی کی ایک تیز لہر سرایت کر گئی شاید اس کی چند لمحوں کی یہ آزادی ایک بار پھر چھننے لگی تھی

===

راجہ اختر نواز، سلیم اور جیرا کالیا کے قتل نے ایس پی جمشید خان کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا تھا وہ نہ صرف بے حد پریشان تھا بلکہ شدید طیش کے عالم میں بھی تھا۔ اس وقت اس کے آفس میں جہانداد اور اے ایس آئی کامران موجود تھے اور موضوع گفتگو راجہ اختر نواز، سلیم اور جیرے کالیا کا قتل تھا۔ جمشید خان بہت زیادہ غصے میں تھا۔

''عملے میں ضرور کوئی کالی بھیڑ موجود ہے''۔ جمشید خان کہہ رہا تھا۔ ''ورنہ قاتلوں کو کہیں سے الہام تو نہیں ہوا تھا کہ وہ پولیس وین اس کے مطلوبہ آدمیوں کو لے جا رہی ہے؟''

''سر''۔ اے ایس آئی کامران نے کچھ کہنے کے لیے لب کشائی کی مگر جمشید خان نے اسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ''ٹریس کرو اس نمک حرام کو''۔ وہ بولا۔ ''جس نے ہمارے سارے کیے کرائے پر ایک لمحے میں پانی پھیر دیا ہے''۔

''میں کچھ عرض کروں جناب؟'' جہانداد نے گزارشانہ انداز میں پوچھا۔

''بولو''۔ جمشید خان نے اس کی طرف رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اس کالی بھیڑ کو ڈھونڈ کر بھی ہمیں کچھ حاصل نہ ہو گا''۔ جہانداد بولا۔ ''آپ اگر اس دہشت گردی کو ختم کرنا چاہتے ہی ہیں تو پھر بنگش اور خان جی کو ڈھونڈ کر ان کا اِن کاؤنٹر کرنا پڑے گا۔ ان چھوٹے چھوٹے معمولی مہروں کو پکڑ کر دہشت گردی کے اس مضبوط نیٹ ورک کو توڑنا ناممکن ہے''۔



''بنگش کی حد تک تو ایسا کیا جا سکتا ہے مگر خان جی کی پارٹی آج کل اقتدار میں ہے اور وہ خود بھی صوبائی اسمبلی کا ایک معزز رکن ہے۔ اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہو گا''۔ جمشید خان نے جواب دیا۔

''پھر ہماری یہ جنگ بے مقصد ہے''۔ جہانداد نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔ ''ہم خواہ مخواہ اپنے ساتھیوں کو مروا رہے ہیں۔ آپ اگر بُرا نہ منائیں تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں خود بھی اب اس جنگ سے عاجز آ چکا ہوں۔ اب تک ہم نے ان دہشت گردوں کے خلاف جتنی بھی کارروائیاں کی ہیں وہ سب سعی لاحاصل تھیں۔ ہم آج بھی وہیں ہیں جہاں سے ہم نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ سچ پوچھیں تو میں اگر آپ کی جگہ ہوتا تو ہاتھ لگنے والے ہر غنڈے ہر دہشت گرد کو بیچ سڑک کے گولیوں سے بھون ڈالتا''۔

''یہ سب کچھ قصے کہانیوں اور فلموں میں تو ممکن ہو سکتا ہے مگر عملی زندگی میں ایسا ہونا ناممکن ہے''۔ وہ بولا۔ ''اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے یہ نام نہاد رہبران قوم ہمارے پاؤں کی وہ زنجیر ہیں جسے ہم کوشش کے باوجود نہیں توڑ سکتے۔ ان کے کرتوتوں کی سزا عام پبلک کو بھگتنا پڑ رہی ہے۔ میں اگر قانون ہاتھ میں لے بھی لوں تو کیا ہو گا؟''

''سر! کسی ایک درندے کو تو سیلف ڈیفنس میں جہنم رسید کیا جا سکتا ہے ناں؟'' اے ایس آئی کامران نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''آپ اجازت دیں گے تو میں خود بھی یہ کام کر گزروں گا، زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا ناں کہ میری نوکری چلی جائے گی؟ چلی جائے کوئی پرواہ نہیں، کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن ہو گا''۔

''ٹھیک ہے''۔ جمشید خان رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن بنگش جس بل میں چھپا ہوا ہے اس کا پتا کون لگائے گا؟ نیلی کوٹھی کون ڈھونڈے گا؟''

''نیلی کوٹھی تک پہنچنے کے لیے رحمدل خان کو تلاش کرنا پڑے گا''۔ جہانداد بولا۔ ''یہ کام میں اپنے ذمے لیتا ہوں اور''۔

''تم بھول رہے ہو کہ تم بنگش سے تعاون کرنے کا وعدہ کر چکے ہو''۔ جمشید خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے بنگش کے حکم کے مطابق موسیٰ خان کو ٹھکانے نہ لگایا تو تمہاری ماں اور بہن کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ کیا تم ان دونوں کی زندگی داؤ پر لگا سکتے ہو؟''

''سر! ہم کوشش کریں تو اس سے پہلے بنگش تک پہنچ سکتے ہیں''۔ جہانداد بولا۔ ''اور جہاں تک میری ماں اور بہن کا تعلق ہے تو میرا نہیں خیال کہ خان جی انہیں با آسانی بنگش کے حوالے کر

"پھر بھی یہ رسک تو ہو گا ناں؟" جمشید خان نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ ہماری اس جنگ میں تمہاری ماں بہن کو کوئی نقصان پہنچے"۔

"زندگی نام ہی رسک کا ہے سر"۔ وہ بولا۔ "اور ویسے بھی زندگی اور موت کا تو ایک دن متعین ہے"۔

"ٹھیک ہے جہانداد"۔ اس نے کہا۔ "تمہارا جذبہ قابلِ ستائش ہے۔ آج سے میں ایک نئے جذبے کے ساتھ اس جنگ کا آغاز کرتا ہوں۔ جو دہشت گرد بھی ہاتھ لگے گا وہیں اسے جہنم رسید کر دیا جائے گا"۔

"ہم اس جنگ میں مرتے دم تک آپ کا ساتھ دیں گے سر"۔ دونوں ایک عزم کے ساتھ یک زبان ہو کر بولے۔ اس کے بعد وہ تینوں ایک نیا لائحہ عمل تیار کرنے میں لگ گئے۔

===•===•===

گاڑی کے رکتے ہی کھڑکی کھلنے اور بند ہونے کی آواز ڈاکٹر شہناز کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ کچھ مزید پودوں کی آڑ میں سمٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھلی اور موسیٰ خان اندر داخل ہو گیا۔ اس نے گیٹ کا تالا کھولا اور گیٹ کو مکمل وا کرنے کے بعد دوبارہ باہر نکل کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن پہلے سے ہی اسٹارٹ تھا چنانچہ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور گیٹ کو کراس کرتی ہوئی پورچ کی جانب روانہ ہو گئی۔

ڈاکٹر شہناز کے لیے فرار ہونے کا یہ بہترین موقع تھا، گیٹ مکمل طور پر کھلا ہوا تھا۔ ریوالور اور پرس کو اس نے ایک رومال میں لپیٹ کر شاپنگ بیگ میں ڈال رکھا تھا۔ گاڑی کی جونہی اس کی جانب پشت ہوئی وہ تیزی سے پودوں کی آڑ سے نکلی اور بھاگتی ہوئی گیٹ کراس کر گئی۔ باہر اسٹریٹ لائیٹ کی روشنی میں وہ دائیں جانب بڑھ گئی، کشادہ گلی دور دور تک سنسان پڑی ہوئی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی مگر آزادی ملنے کی خوشی میں وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ابھی تک راستے میں اسے کوئی ذی روح نہیں ٹکرایا تھا تاہم کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اس کے پاس ریوالور موجود تھا۔ یہ علاقہ اس کے لیے مکمل طور پر انجان تھا۔ کالونی نما اس علاقے میں گلیاں ضرورت سے زیادہ کشادہ تھیں۔ ایک دو جگہ پر چھوٹے چھوٹے پارک بھی نظر آئے تھے، ایک پارک کے گیٹ پر بڑا سا سائن بورڈ بھی موجود تھا جس پر جلی حروف میں "چلڈرن پارک اعظم کالونی" لکھا ہوا تھا۔

وہ پارک اور کالونی کا نام ذہن میں محفوظ کرتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہ ایک کشادہ سڑک پر پہنچ گئی۔ سڑک کے کنارے کنارے چلتی ہوئی وہ ایک چوک پر



پہنچی۔ چوک پر کافی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ ایک ریسٹورنٹ بھی موجود تھا، سگریٹ پان کے کھوکے بھی۔ تین چار ٹیکسیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر شہناز اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ٹیکسی کے پاس پہنچ گئی۔ ٹیکسی کی کھڑکیاں بند تھیں اور شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ ڈرائیور فرنٹ سیٹ پر ٹیک لگائے خوابیدگی کے عالم میں نظر آ رہا تھا۔

وہ کھڑکی پر جھکی اور شیشہ بجا کر ڈرائیور کو متوجہ کرنے لگی۔ شیشے پر ٹھک ٹھک کی آواز سن کر ڈرائیور نے چندھیائی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر لاتعلق سا ہو کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

"اے میں تم سے مخاطب ہوں"۔ ڈاکٹر شہناز دوبارہ شیشہ بجاتے ہوئے بولی۔ "چلنا ہے کیا؟ کرایے کے علاوہ اچھی خاصی ٹپ بھی ملے گی"۔

اس بار ڈرائیور نے قدرے آنکھیں وا کرتے ہوئے ڈاکٹر شہناز کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی کا شیشہ نیچے سرکانے کے بعد بولا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

ڈرائیور غالباً نشے میں تھا اس لیے وہ ڈاکٹر شہناز کی صنف کا اندازہ لگانے میں چوک گیا۔

"پلیز مجھے گھر تک پہنچا دیجیے"۔ اس نے استدعا کی۔ "کرایے کے علاوہ میں تمہیں اچھی خاصی ٹپ بھی دوں گی"۔

ڈرائیور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک جمائی لیتے ہوئے بولا۔ "اوہ...... تم لڑکی ہو...... کیا گھر سے بھاگ کر آئی ہو؟ کدھر جانا ہے تمہیں؟"

ڈاکٹر شہناز نے دل ہی دل میں اسے ایک موٹی سی گالی دی اور پھر دوبارہ گزارشانہ انداز میں کہا۔

"مجھے اپنے گھر جانا ہے، کیا تم لے چلو گے؟"

"تم اکیلی ہو کیا؟" ڈرائیور نے قدرے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

"ہاں"۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"پھر تو تمہیں کوئی بھی ٹیکسی ڈرائیور نہیں لے جائے گا"۔ ڈرائیور بولا۔ "آج کل بہت لفڑا چل رہا ہے۔ گاڑیاں چھیننے کی وارداتیں ہو رہی ہیں، میں غریب آدمی ہوں میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور آمدنی کا واحد ذریعہ یہی ٹیکسی ہے۔ یہ چھن گئی تو مجھے بھیک مانگ کر گزارہ کرنا پڑے گا"۔

"تو پھر گھر جا کر آرام کرو"۔ وہ بھڑک کر بولی۔ "یہاں اُلو کی طرح کیوں جاگ رہے ہو؟"

"میم صاحب! رات کے وقت ہم صرف جان پہچان کے لوگوں کو لے جاتے ہیں، تمہارے

پاس شناختی کارڈ ہے کیا؟'' ڈرائیور نے اس کی بات کا برا منائے بغیر استفسار کیا۔

''نہیں''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کارڈ تو نہیں ہے مگر میں ایک ڈاکٹر ہوں اور مجھے''

''سوری میم صاحب''۔ ڈرائیور بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ایسی صورتِ حال میں تمہیں ٹیکسی میں بٹھا کر میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔ مجھے معلوم ہے تمہارے ساتھی کسی ویران سڑک پر گھات لگائے بیٹھے ہوں گے''۔

''تم مجھے ذہنی مریض لگتے ہو''۔ اس نے تپ کر کہا۔ ''کیا میں تمہیں ڈاکوؤں کی ساتھی لگتی ہوں''۔

''کسی کی پیشانی پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کون ہے؟'' ڈرائیور نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اکثر ڈاکو آج کل وارداتوں میں تم جیسی لڑکیوں کو ہی استعمال کرتے ہیں''۔

''ذہنی مریض ہونے کے ساتھ ساتھ تم جاہل بھی ہو''۔ ڈاکٹر شہناز نے چلا کر کہا۔ ''تمہیں کسی خاتون سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے''۔

''دماغ خراب نہیں کرو میم صاحب''۔ ڈرائیور بھی غصے میں آ کر اونچی آواز میں بولا۔ ''میری مرضی ہے میں نہیں جاتا، زبردستی ہے کیا؟''

''کیا بات ہے میم صاحب؟'' ان کے جھگڑنے کی آوازیں سن کر ایک اور ٹیکسی ڈرائیور قریب پہنچ کر ڈاکٹر شہناز سے مخاطب ہوا۔ ''کدھر جانا ہے آپ کو؟''

''صدر سول لائنز بلاک نمبر 24''۔ ڈاکٹر شہناز نے جھٹ سے جواب دیا۔

''کرایہ دوگنا ہوگا''۔ نوجوان ڈرائیور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ رات کا وقت''۔

''دوگنا ملے گا''۔ ڈاکٹر شہناز نے اسے بات پوری کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

''آیئے''۔ ڈرائیور قریب کھڑی ہوئی ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور ڈاکٹر شہناز نے اس کی تقلید کی۔

''تشریف رکھیں''۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کی عقبی کھڑکی کھولتے ہوئے ڈاکٹر شہناز کو مؤدب انداز میں مخاطب کیا۔

وہ بغیر کچھ بولے ٹیکسی کی عقبی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے بیک مرر کو درست کیا ایک بھرپور نگاہ ڈاکٹر شہناز کے چہرے پر ڈالی اور ٹیکسی کو اسٹارٹ کرنے کے بعد آگے بڑھا دیا۔ ڈاکٹر شہناز سمٹ کر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور شاپنگ بیگ کو اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر گود میں رکھا ہوا تھا۔ ٹیکسی جونہی ایک کھلی شاہراہ پر پہنچی اس نے غیر محسوس انداز میں شاپنگ بیگ سے ریوالو نکال کر



اپنی گود میں رکھ لیا۔

ٹیکسی کی اندرونی لائیٹ جل رہی تھی اس لیے ڈرائیور گاہے گاہے بیک مرر پر نظر ڈال کر ڈاکٹر شہناز کے چہرے پر ایک ترسی ہوئی نگاہ ڈال لیتا تھا۔ اس کی اس چوری کو ڈاکٹر شہناز نے فوراً پکڑ لیا تھا تاہم وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ وہ اگر ڈرائیور سے کچھ کہتی تو ڈرائیور وہیں اُسے ویران سڑک پر اتار کر چلتا بنتا چنانچہ وہ مجبوراً زہر کے یہ گھونٹ پیے جا رہی تھی۔

''میڈم آپ کرتی کیا ہیں؟'' اچانک ڈرائیور نے اس سے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

''میں ڈاکٹر ہوں''۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''سب یہی کہتی ہیں''۔ ڈرائیور نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''میں بیس سال کی عمر سے ٹیکسی چلا رہا ہوں کسی بھی انسان کو ایک پل میں پہچان لیتا ہوں۔ آپ اس وقت جس مقصد کے لیے اپنے گھر سے نکلی ہیں مجھے وہ بھی معلوم ہے''۔

''تم یہ کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو بھئی؟'' اس نے قدرے ناگوار انداز میں سوال کیا۔

ٹیکسی اس وقت ایک پارک کے قریب سے گزر رہی تھی، ڈرائیور نے پارک کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر اچانک ٹیکسی روک دی۔

''یہ...... یہ تم نے گاڑی کیوں روک دی؟'' ڈاکٹر شہناز نے چلا کر پوچھا۔ ''کک...... کیا چاہتے ہو؟''

ڈرائیور نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر چہرے پر ایک مکروہ سی ہنسی سجاتے ہوئے بولا۔

''میرے پرس میں اس وقت اچھی خاصی رقم موجود ہے میڈم اگر آپ تعاون کریں تو یہ رقم کل آپ کی نذر کر سکتا ہوں''۔

''کس سلسلے میں تعاون؟'' اس نے الجھن آمیز انداز میں سوال کیا، شاید وہ ابھی تک ڈرائیور کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی ورنہ ایسا سوال نہ کرتی۔

''میڈم اب اتنی انجان بھی نہ بنیں''۔ ڈرائیور نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے پانچ پانچ سو کے پانچ چھ نوٹ برآمد کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا تو ہر رات کا یہی کام ہے، اگر مجھ سے تعاون کر لیں گی تو فائدے میں رہیں گی۔ آیئے پارک کے کسی گوشے میں جا کر ایک آدھ گھنٹے کے لیے انجوائے کرتے ہیں پھر میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا''۔

''وہاٹ نان سینس!'' بات سمجھ میں آتے ہی وہ حلق کے بل چلائی۔ ''تم نے مجھ سمجھ کیا رکھا ہے، کیا ہر اکیلی لڑکی دو نمبر ہوتی ہے؟ کسی کو مجبوری میں گھر سے نکلنا پڑ جائے تو کیا وہ عصمت فروش

کہلائے گی؟''

''میڈم! زیادہ پارسا بننے کی کوشش مت کرو''۔ وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔ ''ورنہ میں اپنا مطلب زبردستی بھی حاصل کرسکتا ہوں، تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ شرافت سے میرا کہنا مان لو''۔

پانی سر سے گزرتے دیکھ کر ڈاکٹر شہناز نے گود میں پڑے ہوئے ریوالور کو رومال سے نکالا اور ایک جھٹکے سے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے بولی۔ ''گاڑی چلاؤ حرام زادے ورنہ گولی چل جائے گی۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا تھا؟''

''مم......مم...... میڈم''۔ ریوالور دیکھتے ہی ڈرائیور کے غبارے سے ایک پل میں ہوا خارج ہوگئی اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں ڈاکٹر شہناز کی منتیں کرنے لگا۔ ''مم...... میں...... مذاق کر رہا تھا۔ آپ تو سنجیدہ ہوگئیں...... پپ...... پلیز یہ ریوالور ہٹالیں گولی چل جائے گی''۔

اسے گھگھیاتے دیکھ کر ڈاکٹر شہناز کچھ اور بھی نڈر ہوگئی۔ ''اب تک کتنی لڑکیوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاچکے ہو؟'' اس نے تحکمانہ انداز میں سوال کیا۔

''قسم...... لے لیں میڈم! میں ایسا آدمی نہیں ہوں''۔ ڈرائیور نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''سچ سچ بتاؤ ورنہ گولی ماردوں گی''۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''خدا...... خدا...... کی قسم میڈم...... مم...... میں......''

''بتاتے ہو یا چلاؤں گولی؟'' ڈاکٹر شہناز نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''بولو...... اب تک کتنی لڑکیوں کی بے بسی سے کھیل چکے ہو؟ شاباش جلدی کرو''۔

''صرف...... دو میڈم''۔ وہ بے چارگی سے بولا۔ ''مم...... مگر وہ معصوم نہیں تھیں بلکہ ان کا دھندا یہی تھا''۔

''بکواس کرتے ہو تم''۔ وہ بھڑک کر بولی۔ ''کیا ان کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا کہ وہ معصوم نہیں ہیں؟ اس وقت اگر میرے پاس ریوالور نہ ہوتا تو شاید تم اب تک مجھے بھی''۔ اچانک ان کی ٹیکسی پر کسی گاڑی کی تیز روشنی پڑی اور ڈاکٹر شہناز کی بات ادھوری رہ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے پولیس کی ایک موبائل وین ٹیکسی کے عین سامنے پہنچ کر رک گئی۔

موبائل وین کے رکتے ہی چند مسلح اہلکار چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے اترے اور انہوں نے ٹیکسی کو گھیر لیا۔

===·:·===·:·



موسیٰ خان نے گاڑی پورچ میں روکی انجن آف کیا اور ایک شاپنگ بیگ تھام کر نیچے اترا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ بیرونی گیٹ تک پہنچا اور اسے اندازے سے تالا لگانے کے بعد کوٹھی کے رہائشی کمروں کی طرف بڑھ گیا۔ ایک طویل کاریڈور سے گزرتا ہوا وہ ایک کمرے کے سامنے پہنچا، جیب سے چابی نکالی، تالا کھولا اور کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ لائیٹ جلانے کے بعد اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپنگ بیگ صوفے پر رکھ دیا اور خود ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی وہ مؤدب انداز میں بولا۔ ''خان جی! حکم کی تعمیل ہوگئی ہے''۔

''ہم اب تک تمہارے فون کے انتظار میں ہی جاگ رہے تھے''۔ دوسری طرف سے خان جی کی پُرمسرت آواز سنائی دی۔ ''ہمیں تفصیل سے بتاؤ کیسے کیا ہے کام؟''

''خان جی! قیدیوں کو عدالت لے جانے والی پولیس وین پر ہم نے عدالت کے قریب ہی دھاوا بول دیا تھا''۔ وہ تفصیل بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''راجہ اختر نواز کو تو میں نے اپنے ہاتھ سے برابرسٹ مارا تھا، اس کے ساتھ دو اور قیدی اور ایک پولیس والا بھی مارا گیا ہے۔ وہ دو قیدی بھی راجہ اختر نواز ہی کے آدمی تھے، ایک کا نام سلیم اور دوسرے کا جیرا کالیا تھا''۔

''گڈ''۔ خان جی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ان کے مرنے کی اچھی طرح تصدیق کرلی ہے ناں؟ کہیں یہ نہ ہو کہ کل خبر آئے راجہ اختر نواز ہسپتال میں زیرِ علاج ہے''۔

''بے فکر ہو جائیں خان جی''۔ وہ پُراعتماد انداز میں بولا۔ ''راجہ صاحب کا تو اب تک پوسٹ مارٹم بھی ہو چکا ہوگا''۔

''آج ہم تم سے بہت خوش ہیں موسیٰ خان''۔ وہ بولا۔ ''مگر اب ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی ہے''۔

''حکم کریں خان جی''۔ اس نے کہا۔ ''یہ غلام حاضر ہے''۔

''ہم تجھے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں موسیٰ خان''۔ وہ بولا۔ ''غلام تو ہمارے بے شمار ہیں جو ہمارا ہر حکم بجالاتے ہیں مگر وہ تمہاری طرح بہادر نہیں ہیں۔ جو تم کرسکتے ہو وہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔ اسی لیے تو ہم ہمیشہ تم پر فخر کرتے ہیں''۔

''خان جی میری جان بھی قربان ہے آپ پر''۔ اس نے نثار ہو جانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ حکم تو کریں؟''

''موسیٰ خان! مولوی نصیب اللہ ہماری قید سے فرار ہو کر جمال خٹک کے پاس پشاور پہنچ چکا ہے۔ تم اگر ٹی وی دیکھتے یا اخبار پڑھتے تو تجھے معلوم ہوتا کہ وہ آج کل جمال خٹک کی پارٹی کا اہم رکن بن چکا ہے اور پارٹی کے حق میں تقریریں کرتا پھر رہا ہے، ہمیں اور ہماری پارٹی کو سرِ عام بدنام کر رہا

ہے، اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو آنے والا الیکشن ہماری سیاست کا جنازہ نکال دے گا"۔ وہ ایک ثانیے کے لیے رکا اور دوبارہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہم اس کی وجہ سے آج کل بہت پریشان رہتے ہیں موسیٰ خان! مولوی کی جرأت بہت بڑھ چکی ہے۔ وہ ہمارے علاقے میں بھی سیاسی جلسے منعقد کرانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ اس سے پہلے ہی اس کا قصہ تمام کرنا پڑے گا"۔

"خان جی!" پوری تفصیل سننے کے بعد وہ قدرے توقف سے بولا۔ "مولوی کو وہیں اپنے علاقے میں آسانی سے ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں میں بہت جلد فارغ ہو کر واپس آ رہا ہوں"۔

"نہیں موسیٰ خان!" وہ بولا۔ "مولوی کو وہیں پشاور میں ختم کرنا پڑے گا۔ یہاں اگر ہم نے اسے مار دیا تو وہ ہیرو بن جائے گا اور اس کی ہلاکت کا سارا الزام ہم پر آئے گا"۔

"ٹھیک ہے خان جی!" اس نے بلاتردد رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہو جائے گا۔ میں کل صبح ہی سے اس کے پیچھے پڑ جاؤں گا اور مناسب موقع ملتے ہی اسے ٹھکانے لگا دوں گا"۔

"اسے بہت سخت سکیورٹی میں رکھا جاتا ہے"۔ خان جی بولا۔ "انتہائی احتیاط سے کام لینا ہم تجھے کھونا نہیں چاہتے"۔

"آپ فکر ہی نہ کریں خان جی!" اس نے پُرعزم انداز میں کہا۔ "موسیٰ خان کے لیے سکیورٹی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جمال خٹک اسے پاتال میں کیوں نہ جا چھپائے وہ مجھ سے نہیں بچ سکتا"۔

"ویری گڈ موسیٰ خان!" خان جی نے خوش ہو کر کہا۔ "تیری اسی دلیری کے تو ہم گرویدہ ہیں"۔

"آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے خان جی ورنہ میں کس قابل ہوں؟" وہ انکساری سے بولا۔ "آپ نے مجھے پال پوس کر اس مقام"۔

اچانک کمرے کے باہر کاریڈور میں کسی کے قدموں کی چاپ ابھری اور موسیٰ خان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے فوراً ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور جیب سے ریوالور نکال کر دبے پاؤں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس کی نگاہ ایک سیاہ پوش پر پڑی جو کسی شرابی کی طرح جھومتے ہوئے کاریڈور کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا بنا ہوا ایک تھیلا بھی موجود تھا۔ موسیٰ خان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"اے رکو ورنہ گولی مار دوں گا"۔ اس کے عقب میں پہنچ کر موسیٰ خان نے غراتی ہوئی آواز



کہا۔ "کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

سیاہ پوش نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو موسیٰ خان ریوالور تھامے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس نئی مصیبت کو نازل ہوتے دیکھ کر وہ محض خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ہی رہ گیا۔

"کون ہو تم اور یہاں کیسے گھسے ہو؟" موسیٰ خان نے ریوالور اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بولو ورنہ کھوپڑی میں روشندان بنا دوں گا"۔

"صا... صا... صاحب... مم... میں... میں... وہ جی..." اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر خوف کی شدت سے بات پوری نہ کر سکا۔

"اس تھیلے میں کیا ہے؟" موسیٰ خان نے دوسرا سوال کیا۔

"بج... جی... بج... بج... بجلی ٹھیک کرنے کا... سس... سامان ہے"۔ اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔

"ادھر لاؤ"۔ موسیٰ خان نے اس کے ہاتھ سے تھیلا جھپٹ کر کاریڈور کے فرش پر الٹ دیا۔

"اوہ"۔ تھیلے سے برآمد ہونے والے سامان کو دیکھ کر موسیٰ خان قدرے حیرت سے بولا۔ "تو تم چور ہو؟"

"نن... نہیں جی"۔ اس نے لرز کر کہا۔ "پپ... پلیز... مجھے جانے دیں۔ مم... میں آپ کے ہاتھ... جوڑتا ہوں"۔

"اندر چلو"۔ موسیٰ خان نے گرج کر کہا۔

"مم... میں... زخمی ہوں صاحب!" وہ فریادی انداز میں بولا۔ "خدا کے لیے مجھے جانے دیں... مم... میں..." اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی موسیٰ خان نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے اسے بیٹھنے کا حکم دیا اور سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتا دو ورنہ اس کوٹھی میں ایک برقی بھٹی بھی لگی ہوئی ہے۔ میں تجھے اٹھا کر زندہ ہی بھٹی میں جھونک دوں گا"۔

موسیٰ خان کے تیور دیکھ کر وہ بے چارگی کے عالم میں بولا۔ "صاحب! میں ایک معمولی سا چور ہوں، اس کوٹھی کو خالی پا کر میں کچھ چرانے کی غرض سے اندر داخل ہوا تھا مگر یہاں ایک مصیبت پڑ گئی اور مجھے زخمی کر دیا"۔

"کون سی مصیبت؟" موسیٰ خان نے قدرے الجھ کر سوال کیا۔

"صاحب جی! میں نے اس کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد ایک کمرہ منتخب کیا اور اس کے تالے پر قسمت آزمائی شروع کر دی مگر تالا کسی طرح نہیں کھل رہا تھا، مجبوراً میں نے تالا توڑا اور

ٹارچ جلا کر کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ ابھی میں کمرے کے وسط میں ہی تھا کہ عقب سے میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی، ٹارچ میرے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے فرش پر گر پڑی اور میں بوکھلا کر پیچھے پلٹا لیکن اسی دوران حملہ آور میری کھوپڑی پر دوسرا وار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں لہراتا ہوا گر گیا تھا۔ جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور وہاں میرے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں گرتا پڑتا اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ باقی کی کہانی آپ کو معلوم ہے"۔ وہ پوری تفصیل بیان کرنے کے بعد رحم طلب نگاہوں سے موسیٰ خان کی جانب دیکھنے لگا۔

"اٹھو"۔ موسیٰ خان نے اسے حکم دیا۔

"خدا کی قسم صاحب!" وہ گڑگڑا کر بولا۔ "میں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے مجھے برتی میں نہ ڈالیں میرے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو جائیں گے......مم...... میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں مجھے معاف کر دیں"۔

موسیٰ خان سچ جھوٹ کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ چور سچ کہہ رہا ہے وہ پھر بھی اسے اٹھا کر ڈاکٹر شہناز والے کمرے میں لے گیا۔ چور کے کہنے کے مطابق واقعی کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ فرش پر موسیٰ خان کو وہ برش بھی نظر آ گیا جسے ڈاکٹر شہناز نے بطور ہتھیار استعمال کیا تھا۔ اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ڈاکٹر شہناز واقعی وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" موسیٰ خان نے دوبارہ سوال وجواب کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

"اسلم...... جناب"۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس؟" موسیٰ خان نے دوسرا سوال پولیس والوں کے انداز میں کیا۔ اسلم نامی چور نے جیب میں ہاتھ ڈال کر شناختی کارڈ نکالا اور موسیٰ خان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

موسیٰ خان نے کارڈ کے مندرجات پر ایک نظر ڈالی اور پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "میرا دل تو نہیں چاہتا کہ تمہیں زندہ چھوڑ دوں مگر کیا کروں مجبوری ہے۔ میں معمولی لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ تم نے مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ کارڈ لو اور دو منٹ کے اندر اس کوٹھی سے باہر نکل جاؤ ورنہ زندگی میں پہلی بار میں کسی معمولی انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ بیٹھوں گا"۔

چور نے تیزی سے موسیٰ خان کے ہاتھ سے کارڈ جھپٹا اور آناً فاناً کمرے سے باہر نکل گیا۔

===



پولیس موبائل کا انچارج ایک موٹی توند والا حوالدار تھا جو گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر براجمان ... کھڑکی کھول کر وہ نیچے اترا، توند سے نیچے ڈھلکے ہوئے بیلٹ کو درست کرنے کی ناکام کوشش کی ... پھر شانِ بے نیازی سے چلتا ہوا ٹیکسی کی کھڑکی تک پہنچ گیا۔ اندر ڈاکٹر شہناز اور ٹیکسی ڈرائیور ... ہوئے بیٹھے تھے۔

حوالدار نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے ان دونوں پر ایک ایک نگاہ ڈال اور پھر ڈاکٹر شہناز سے ... طب ہو کر بولا۔ "باہر آؤ گاڑی سے؟"

"کیوں...... کس لیے؟" ڈاکٹر شہناز نے بغیر مرعوب ہوئے سوال کیا۔

"بلے بھئی بلے"۔ حوالدار بھونڈے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "حسن کی سرکار قنون ... بڑی لگا رہی ہے۔ واہ بھئی واہ داد دینا پڑے گی، کرنا پیشہ اور آنکھیں دکھانا ایک باوردی افسر کو"۔

"مائنڈ یور لنگویج حوالدار؟" ڈاکٹر شہناز سخت لہجے میں بولی۔ "میرا نام ڈاکٹر شہناز ہے اور ... کرائم برانچ کے ایس پی جمشید خان کی گیسٹ ہوں۔ ان تک اگر"۔

"جھوٹ بول رہی ہے جناب"۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چلا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ... وارداتوں کی ساتھی ہے اور مجھ سے ابھی تھوڑی دیر پہلے گاڑی چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ... ریوالور بھی موجود ہے"۔

"اوہ...... یہ بات ہے" حوالدار باچھیں چوڑی کرتے ہوئے بولا۔ "ان کار چوروں کی ... مجھے کب کی تلاش تھی۔ چلو نیچے اترو حسن کی سرکار! آج سے تم سرکاری مہمان ہو، ہمیں بھی کچھ سیوا ... موقع ملے گا"۔

"تم بہت غلط کر رہے ہو حوالدار"۔ وہ بولی۔ "پچھتاؤ گے۔ ایسا مت کرو، مجرم یہ ڈرائیور ہے ... اکیلی خواتین کے ساتھ زیادتیاں کرنا اس کا مشغلہ ہے۔ مجھے بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ دھمکا رہا ... وہ تو میں نے اپنی حفاظت کے لیے اپنے پاس ریوالور رکھا ہوا تھا ورنہ یہ اپنے مذموم مقصد میں ... کامیاب ہو چکا تھا"۔

ڈاکٹر شہناز کے بااعتماد انداز نے چند لمحوں کے لیے حوالدار کو شش وپنج میں مبتلا کر دیا تاہم وہ ... کچھ سوچ کر بولا۔ "چلو دونوں پولیس وین میں بیٹھ جاؤ، تھانے چل کر سچ جھوٹ کا فیصلہ ہو جائے ..."۔

"سر جی! بہت چالاک لڑکی ہے"۔ ٹیکسی ڈرائیور خوشامدی انداز میں بولا۔ "آپ کو چکر ... رہی ہے۔ آپ ذرا تنہائی میں میری بات تو سنیں میں آپ کو یقین دلا دوں گا"۔

"سر جی! بندہ ذہین لگتا ہے بات سن لیں"۔ ایک کانسٹیبل ٹیکسی ڈرائیور کی تائید میں بولا۔

"دو چار منٹ دے دیں اسے دعا کرے گا بے چارہ"۔

"اچھا...... تم کہتے ہو تو سن لیتے ہیں"۔ اتنا کہنے کے بعد حوالدار ٹیکسی ڈرائیور سے بولا۔

"آجاؤ کیا کہتے ہو؟"

ٹیکسی ڈرائیور جلدی سے نیچے اترا اور کہنے لگا۔ "ادھر سائیڈ میں آجائیے سرجی"۔

"اوئے لڑکی کا خیال رکھنا"۔ حوالدار اپنے ماتحتوں کو حکم دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ڈاکٹر شہناز کی نگاہیں ٹیکسی ڈرائیور اور حوالدار پر لگی ہوئی تھیں مگر وہ دونوں دور جا کر تاریکی میں تحلیل ہو گئے۔ ڈاکٹر شہناز کا کبھی اس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا اور نہ ہی وہ اپنی ایماندار پولیس کے طریقہ کار سے واقف تھا۔

حوالدار اور ٹیکسی ڈرائیور کی واپسی چند منٹوں کے بعد ہوئی۔ حوالدار کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ دیکھ کر وہ چونکے بنا نہ رہ سکی۔ تاہم اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ قانون کا وہ محافظ اپنا من پسند راتب تناول فرما کر واپس آیا ہے۔

"چلو جی لڑکی کو پولیس وین میں بٹھاؤ"۔ حوالدار نے ماتحتوں کو حکم دیا۔

"تم بہت بُرا کر رہے ہو؟" ڈاکٹر شہناز دھمکی آمیز انداز میں بولی۔ "ٹیکسی ڈرائیور کو مت چھوڑو ورنہ بہت پچھتاؤ گے"۔

"تمہیں بھی چھوڑ دیں گے سوہنیو!" حوالدار نے اوباشانہ انداز میں کہا۔ "بس آج کی رات میزبانی کا موقع دے دو، صبح تمہیں آزاد کر دیں گے"۔

"میری میزبانی تمہاری پیٹی اتروا دے گی"۔ ڈاکٹر شہناز بولی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تجھے یہ پٹی ٹیکسی ڈرائیور نے پڑھائی ہے لیکن تمہاری طرح وہ بھی مجھے نہیں جانتا"۔

"اوئے منہ کیا تک رہے ہو؟" ڈاکٹر شہناز کی بات پوری ہونے سے قبل ہی حوالدار چلا کر ماتحتوں سے بولا۔ "اس سے ریوالور لو اور گاڑی میں بٹھاؤ"۔

اس کے بعد ڈاکٹر شہناز چیختی چلاتی رہی لیکن پولیس والوں نے اسے گاڑی میں ڈالا اور خوش گپیاں لگاتے ہوئے واپس تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو انہوں نے وہیں سے رخصت کر دیا تھا۔

✤ ==== ✤ ==== ✤

رحمل خان پر موت کا خوف طاری تھا اور وہ یوں بھاگ رہا تھا جیسے جہنم کی خونخوار بلائیں اس کے تعاقب میں ہوں، اس کے چاروں جانب اندھیرا اور ویرانہ تھا، یہی تاریکی اسے اب تک بچائے ہوئے تھی۔ اگر فضا میں معمولی سی بھی روشنی ہوتی تو اس کا بدن اب تک چھلنی ہو چکا ہوتا۔ دو



دھیرے کا فائدے اٹھاتے ہوئے جان توڑ کوشش سے کانٹے دار جھاڑیوں میں دوڑ رہا تھا۔ کئی مرتبہ وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر گرا تھا، منہ سے کف جاری تھی۔ پھیپھڑوں میں اب برداشت کی قوت نہیں رہی تھی مگر وہ رک نہیں سکتا تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رکنے کا مطلب صریحاً موت ہے۔ جو دو آدمی اس کا تعاقب کر رہے تھے وہ کسی درندے سے بھی بڑھ کر خونخوار تھے۔ یہ دو آدمی جانداد اور اے ایس آئی کامران تھے۔

رحمل خان کے دائیں بائیں ویرانہ تھا اور پیچھے موت کے فرشتے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ آگے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر قدرے بلندی پر بنے ہوئے روشن اپارٹمنٹس کی خوابیدہ سی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اگر وہ کوشش کر کے کسی طرح اس رہائشی پراجیکٹ تک پہنچ جاتا تو اس کی جان بچ سکتی تھی مگر ڈیڑھ میل کا یہ راستہ اس کے لیے ہزاروں میل سے بھی زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں بری طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔ اب تک تو وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر دوڑتا آ رہا تھا مگر اب قوتِ ارادی بھی جواب دینے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ چند گز سے زیادہ فاصلہ طے نہیں کر پائے گا۔

اچانک اس کا پاؤں جھاڑیوں میں الجھا، قدم لڑکھڑائے اور وہ ایک کھڈ کی ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا بالآخر ایک قدِ آدم جھاڑی میں الجھ کر رہ گیا۔ پتھریلی زمین پر لڑھکنے کے باعث اس کے جسم پر چوٹیں بھی آئی تھیں مگر یہ معمولی تکلیف اذیت ناک موت کے تصور سے بہت کم اور قابل برداشت تھی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ کھڈ تقریباً پندرہ بیس فٹ گہرا تھا، ایک طرف بارش کے پانی کی وجہ سے زمین میں کٹاؤ سا بن گیا تھا جو دور تک چلا جا رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف اونچی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور اوپر نیلگوں آسمان پر بہت دور ستارے ٹمٹماتے ہوئے نظر آ رہے تھے، اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ تحت الثریٰ میں پہنچ چکا ہو۔

دفعتاً ویرانے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر اسے اپنے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا، وہ موت کے جن فرشتوں سے بچ کر یہاں تک پہنچا تھا وہ دونوں اب اس کے سر پر آن پہنچے تھے۔ اس کے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی، اس نے بے بسی کے عالم میں چاروں طرف دیکھا۔ اگر وہ اس کھڈ سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرے تو چند گز سے زیادہ فاصلہ طے نہیں کر سکے گا اور اس کا بدن گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا تاہم اس کھڈ کے اندر اس کے لیے امید کی موہوم سی کرن موجود تھی۔ وہ کانٹوں کی پرواہ کیے بغیر گھنی جھاڑیوں کے اندر گھس گیا، چہرے پر ہاتھ رکھ کر وہ صرف آنکھیں بچانے کی کوشش کر رہا تھا باقی جسم کی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کانٹوں کے زخم مندمل ہونے میں دیر نہیں لگتی لیکن گولیوں کے گھاؤ قبر کی تاریکی میں پہنچا دیتے ہیں۔

بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز رک گئی۔ وہ چند لمحے بے حس و حرکت بیٹھا رہا پھر جھاڑی کی شاخوں سے جھانک کر اوپر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے کھڈ کے کنارے پر دو انسانی ہیولے نظر آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف دکھائی دے رہی تھی جبکہ دوسرے کے پاس ریوالور موجود تھا۔ ان دونوں نے آپس میں کوئی سرگوشی کی تھی مگر ان کی آواز رحمدل خان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ویرانہ فائرنگ کی آواز سے گونجنے لگا۔ کلاشنکوف بردار جو کہ اس کے اندازے کے مطابق جہانداد تھا۔ کھڈ کی جھاڑیوں میں اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ کئی گولیاں اس کے دائیں بائیں پتھریلی زمین کو چاٹ رہی تھیں۔ جو کہ اس کی طرح لرز اٹھی۔ گولیاں اس کے چاروں طرف بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ ایک گولی بالکل اس کے سر کے اوپر سے جھاڑی کی ایک شاخ توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے اپنی جگہ پر دبکا رہا۔ پھر دفعتاً اسے یوں لگا جیسے بائیں پنڈلی میں انگارے بھر گئے ہوں، ایک گولی پنڈلی کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی، اگر اس نے منہ پر ہاتھ نہ رکھے ہوتے تو حلق سے نکلنے والی کربناک چیخ کو روکنا اس کے لیے ناممکن تھا اور پھر موت کے وہ فرشتے اس کی کمین گاہ سے آگاہ ہو کر اس کا پورا بدن گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

چند سیکنڈ کے بعد فائرنگ کی آواز بند ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد اسے اوپر سے ایک آواز سنائی دی۔

"مجھے لگتا ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ کہیں آگے جا چکا ہے"۔

آواز اس کے لیے اجنبی تھی غالباً جہانداد کا ساتھی بولا تھا۔

"میں نے اسے اپنی آنکھوں سے یہاں گرتے ہوئے دیکھا تھا"۔ دوسری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ یہ جہانداد تھا اس کی آواز وہ بآسانی پہچان سکتا تھا۔

"ہو سکتا ہے وہ اس کھڈ کے اندر ہی اندر آگے جا چکا ہو یا وہ کہیں جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا ہو۔ اب اسے تلاش کرنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس رہائشی پراجیکٹ کی طرف نکلنے کی کوشش کرے گا۔ آؤ آگے چلتے ہیں"۔ جہانداد کا ساتھی بولا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

رحمدل خان اب بھی منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی معمولی سی آواز انہیں دوبارہ اس کی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ پنڈلی سے بدستور خون بہہ رہا تھا مگر فی الحال اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ یہ تکلیف اذیت ناک سہی لیکن ایک بھیانک موت کے مقابلے میں قابل برداشت تھی۔



فضا پر ایک بار پھر سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ دس منٹ کے بعد وہ انتہائی محتاط انداز میں جھاڑیوں سے نکلا اور خود کو گھسیٹتے ہوئے زمین کے اس ندی نما کٹاؤ میں آگے بڑھنے لگا۔ یہ کٹاؤ کافی دور تک جا رہا تھا۔ تقریباً ساٹھ ستر گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کھڈ سے باہر آ گیا۔ پنڈلی سے لگاتار خون بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے وہ نقاہت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ہاتھوں، چہرے اور جسم کے کئی دیگر حصوں سے بھی خراشوں کے باعث خون رس رہا تھا۔

کھڈ سے باہر نکلنے کے بعد اس نے کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا، اب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ ستاروں کی مدھم سی روشنی اس کے لیے کافی تھی۔ دور دور تک ویرانہ ہی ویرانہ تھا کسی کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان دونوں کی باتوں سے وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ دونوں اس کی تلاش میں رہائشی پراجیکٹ کی طرف نکل گئے ہوں گے۔

چند منٹ پہلے اس کا اپنا ارادہ بھی یہی تھا مگر اب وہ ایسا کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ وہ قدرے بائیں طرف ہٹ کر چلنے لگا، اس طرف تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک ڈاک بنگلا موجود تھا۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ پر بیٹھ گیا۔ گھائل پنڈلی سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور اس کی نقاہت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر بہتے ہوئے اس خون کو نہ روکا گیا تو اس کے لیے خطرات بڑھ جائیں گے۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے اپنی قمیص اتاری اور ایک آستین پھاڑ کر اسے پٹی کی شکل دینے لگا۔

بچ جانے والے کپڑے کی اس نے گدی سی بنا کر زخم پر رکھ دی اور پھر اس کے اوپر کس کر پٹی باندھ دی۔

مزید چند لمحے ستانے کے بعد وہ اٹھا اور دوبارہ ڈاک بنگلے کی طرف بڑھنے لگا جو اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔

تاریک عمارت کا ہیولہ اب واضح طور پر نظر آنے لگا تھا۔ وہ محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ ڈاک بنگلے کی عمارت اگرچہ برسوں سے خالی پڑی ہوئی تھی مگر وہاں کسی چوکیدار کی موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ جہانداد اور اس کا ساتھی وہاں پہلے سے موجود ہوتے۔ اس کی تلاش میں ان لوگوں کے اس طرف جانے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ڈاک بنگلے کی عمارت کے قریب پہنچ کر وہ کچھ اور محتاط ہو گیا اس نے کلائی پر بندھی ہوئی الیکٹرانک واچ کا بٹن دبا کر ٹائم دیکھا تو رات کا ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ گویا اسے موت کے ان فرشتوں سے جان بچاتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ٹائم ہو چکا تھا۔ عمارت کے پاس پہنچ کر وہ لمحہ

بھر کے لیے ٹھہر گیا۔ عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عقبی جانب ایک چھوٹا سا دروازہ دیکھ کر وہ اس جانب چل پڑا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے انتہائی محتاط انداز میں اسے اندر کی طرف دھکیلا، خوش قسمتی سے دروازہ لاک نہیں تھا اور بغیر آواز پیدا کرتے ہوئے کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا اور ایک پُر اسرار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اندر اسے کیا پیش آنے والا ہے؟ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ سیڑھیاں محسوس کر کے وہ رک گیا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر ریلنگ کے سہارے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک کشادہ راہداری تھی۔ وہ دیوار کے سہارے راہداری میں آگے بڑھنے لگا۔ چند گز آگے جانے کے اس کا ہاتھ ایک دروازے کو چھونے لگا۔ یہ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آہستہ سے دروازے کو دھکیلتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا جس کی ایک محرابی کھڑکی رہائشی پراجیکٹ کے اپارٹمنٹس کے جانب کھلتی تھی۔ کھڑکی سے رہائشی پراجیکٹ کی خوابیدہ سی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

وہ کمرے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور پھر جھک کر زخمی پنڈلی کو ٹٹولنے لگا۔ زخم پر بندھی ہوئی پٹی ڈھیلی پڑ چکی تھی اور زخم سے بہنے والا خون پٹی کو بھگو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پر چپچپاہٹ سی آ گئی تھی۔ سختی سے پٹی باندھنے کے باوجود خون رکا نہیں تھا تاہم اتنا ضرور ہوا تھا کہ خون کا بہاؤ قدرے کم ہو گیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا اور اس کا جوڑ جوڑ فریاد کناں تھا۔ پورے بدن میں ناقابلِ برداشت درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

دفعتاً قدموں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ یہ آواز عمارت کے نچلے حصے سے آ رہی تھی۔ اس نے کان آواز پر لگا دیے۔ وہ دو آدمیوں کے قدموں کی چاپ تھی۔ دوسرے ہی لمحے ایک آدمی کی آواز سن کر وہ تھرا گیا۔ یہ آواز جہانداد کی تھی جو اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

''وہ اسی عمارت میں کہیں موجود ہے۔ تھوڑی دیر قبل میں نے خود اسے عقبی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے''۔

رحمدل خان خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ موت کے دونوں فرشتے لمحوں میں اس کے سر پر پہنچنے والے تھے۔

''تمہیں کہیں وہم تو نہیں ہوا؟'' جہانداد کے ساتھی کی آواز سنائی دی۔ ''ممکن ہے دروازہ ڈاک بنگلے کے چوکیدار نے کھولا ہو اور جسے تم نے دیکھا تھا شاید وہ بھی چوکیدار ہو؟''

''یہاں کا چوکیدار بڑا لاپروا آدمی ہے، اسے صرف اپنی تنخواہ سے غرض ہے۔ رات کے وقت وہ کبھی یہاں نہیں رکتا بلکہ اوپر رہائشی پراجیکٹ میں جا کر اپنے دوستوں کے ساتھ چرس کے



سگریٹ پھونکتا رہتا ہے۔ کبھی کبھار وہ جوئے کی محفل بھی سجا لیتے ہیں''۔ جہانداد نے اپنے ساتھی کو پُر اعتماد انداز میں بتایا۔

''ارے! یہ دیکھو فرش پر جمی ہوئی گرد پر قدموں کے نشان کے ساتھ ساتھ تازہ خون کے دھبے''۔ جہانداد کے ساتھی کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''یہ...... یہ تو اوپر سیڑھیوں کی طرف جا رہے ہیں''۔ جہانداد نے پُر جوش انداز میں کہا۔

رحمدل خان کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ ایک بھیانک موت اس کا مقدر بن چکی ہے۔ وہ دونوں اب کسی بھی لمحے اُوپر پہنچنے والے تھے۔

===

''تم یہیں رکو''۔ جہانداد اپنے ساتھی سے بولا۔ ''میں ان قدموں کے تعاقب میں اوپری منزل کی طرف جا کر چیک کرتا ہوں اور ہاں یہ ٹارچ بجھا دو، اگر کوئی اس طرف متوجہ ہو گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی''۔

قدموں کی آواز اب زینے پر سنائی دے رہی تھی۔ رحمدل خان دیوار کے ساتھ ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر وہ دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اب اندر داخل ہونے والے کسی بھی شخص پر وہ دھوکے سے حملہ کر سکتا تھا۔ اس نے جیب سے ایک تار نکال لیا، یہ موٹر بائیک کا کلچ وائر تھا جس کی لمبائی تقریباً دو فٹ تھی۔ تار کے دونوں سروں پر گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے دونوں سرے مضبوطی سے ہاتھوں پر لپیٹ لیے اور قدموں کی آواز پر کان لگا دیے۔

قدموں کی چاپ اب راہداری میں پہنچ چکی تھی اور پھر یہ آواز عین اسی کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ رحمدل خان کو معلوم تھا کہ وہ جہانداد ہے۔ وہ اس کی تیزی اور پھرتی سے بھی آگاہ تھا۔ بابو بھائی کے بارے میں ہونے والی فائیٹ کو وہ ابھی تک بھولا نہیں تھا۔ جہانداد بے شک ڈیل ڈول میں اس سے کم تھا مگر اس کے جسم میں چیتے کی سی پھرتی تھی۔ لڑائی بھڑائی کے فن میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔ رحمدل خان اسے دھوکے میں چھاپ لینا چاہتا تھا۔

اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ فرش اور دروازے کے درمیان خلا میں اسے ہلکی سی روشنی دکھائی دینے لگی۔ غالباً جہانداد کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی۔ رحمدل خان کے اعصاب تن گئے اور وہ جہانداد پر جھپٹنے کے لیے پوری طرح مستعد ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی فوراً غائب ہو گئی، چند سیکنڈ کے بعد دروازہ آہستگی سے کھلا۔ رحمدل خان ہوشیار ہو گیا، کھلے دروازہ میں سب سے پہلے کلاشنکوف کی نال دکھائی دی اور اس کے فوراً بعد جہانداد کا سر اندر داخل ہوا وہ انتہائی

احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ گو کہ اسے یہ یقین تھا کہ رحمدل خان خالی ہاتھ ہے مگر وہ پھر بھی کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

انہیں اگر رحمدل خان کو زندہ گرفتار نہ کرنا ہوتا تو اب تک وہ کلاشنکوف کا میگزین خالی کر چ ہوتا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد جہانداد نے دوبارہ پنسل ٹارچ روشن کر دی۔ وہ رحمدل تلاش میں کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹارچ کو گھمانے لگا، کمرے کا سامنے وا حصہ خالی پڑا ہوا تھا۔ اس نے ٹارچ کو ذرا بلند کیا، اب روشنی ایک کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑ رہی تھی ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے قدم آگے بڑھائے، غالباً وہ کھڑکی کی طرف جانا چاہتا تھا م دروازے کے پیچھے چھپے رحمدل خان نے اسے آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے تار کے دونو سروں پر گرفت مضبوط کی اور دوسرے ہی لمحے اچھل کر آہنی تار جہانداد کی گردن میں ڈال کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کلاشنکوف اور ٹارچ جہانداد کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ایک دھماکے سے فرش گئیں۔

برق رفتاری سے اس نے دونوں ہاتھ گردن کے گرد لپٹی ہوئی تار کی طرف بڑھائے م باریک تار کو پکڑنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ رحمدل خان پوری طاقت کے ساتھ تار کے دونوں سروں کھینچ رہا تھا۔ جہانداد کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ باریک تار گردن میں کھبتا جا رہا تھا اور اس آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگی تھیں مگر اس نے اس عالم میں بھی اپنے حواس بحال رکھے ہو تھے اور اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ رحمدل خان آہنی تار کو پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا وہ جہاندا کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ بازی مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں تھی، تار کے دونوں سروں اس کی گرفت مضبوط تھی اور وہ زور لگا کر تار کے حلقے کو مزید تنگ کرتا جا رہا تھا۔

معاً جہانداد نے تڑپ کو پوری طاقت کے ساتھ اسے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ رحمدل خان ک پشت کمرے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ ایک لمحے کے لیے تار پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی، اس موقع غنیمت جانتے ہوئے جہانداد نے دائیں کہنی زور سے اس کے پیٹ میں رسید کر دی۔ گرفت کچھ مزید کمزور ہو گئی۔ جہانداد نے یکے بعد دیگرے اس کے پیٹ میں کہنی کی ضربیں لگانا شروع کر دیں۔

پیٹ میں پڑنے والی ضربوں سے بوکھلا کر رحمدل خان نے غیر ارادی طور پر آہنی تار کو چھوڑ دیا۔ گردن آزاد ہوتے ہی جہانداد کے بدن میں برقی رو دوڑ گئی۔ وہ مشینی انداز میں پیچھے پلٹا او اپنے سر کی بھرپور ٹکر رحمدل خان کے چہرے پر رسید کر دی۔ رحمدل خان جو پیٹ میں پڑنے وال ضربوں کو سہلا رہا تھا اس اچانک چہرے پر پڑنے والی ٹکر نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک ہلا کر



ھ دیا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ وہ چلانے پر مجبور ہو گیا۔

جہانداد اس کے چلانے کو نظر انداز کرتے ہوئے بھوکے درندے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ یک وقت ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس کے سر کی ٹکر سے رحمدل خان کی ناک کا بانسہ پہلے ہی ٹوٹ ا تھا۔ رہی سہی کسر جہانداد کے مکوں اور لاتوں نے پوری کر دی تھی۔ چند منٹوں میں جہانداد نے ے دھنک کر رکھ دیا تھا۔

یونہی مار کھاتے کھاتے رحمدل خان کمرے کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ جہانداد کا ایک ایک ونسا اور لات اسے چیخنے پر مجبور کر رہے تھے مگر جہانداد پر تو شاید وحشت سوار ہو چکی تھی۔ یوں لگتا یسے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہو۔

اٹھک پٹخ کی یہ آوازیں سن کر اے ایس آئی کامران زینے کی طرف بھاگا اور تیزی سے ڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپری منزل پر پہنچ گیا۔ کشادہ راہداری دور تک سنسان پڑی ہوئی تھی۔ وہ ے بغیر آگے بھاگتا چلا گیا۔ ذرا دیر کے بعد اسے دائیں ہاتھ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا مل گیا۔ رے کے سامنے رک کر اس نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے جہانداد کو آواز دی۔

''جہانداد! تم کہاں......''

ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ کوئی دروازے سے ٹکراتا ہوا باہر راہداری میں آ گرا۔ ے ایس آئی کامران اچھل کر پیچھے ہو گیا۔ راہداری میں گرنے والا شخص ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا ہ کوئی دروازے سے جست لگاتا ہوا اس کے اوپر آ گرا اور پھر نیچے پڑے ہوئے شخص کی چیخیں نکل ئیں۔

گو کہ راہداری میں اندھیرا تھا مگر رہائشی پراجیکٹ کے اپارٹمنٹس کی طرف سے آنے والی م روشنی نے اس اندھیرے کو قدرے کم کر دیا تھا۔ راہداری میں گرنے والے دونوں شخصوں کو ران نے با آسانی پہچان لیا تھا۔ ویسے بھی جہانداد کے نیچے پڑا ہوا رحمدل خان اپنے ڈیل ڈول ہجہ سے صاف پہچانا جا سکتا تھا۔

جہانداد نے اس کے چہرے پر دو تین مکے رسید کیے اور پھر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبانا ع کر دیا۔ دم گھٹنے کی وجہ سے رحمدل خان نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ مگر وہ خود کو ا نہ کرا سکا۔ جہانداد کے ہاتھوں نے کسی شکنجے کی طرح اس کی گردن کو جکڑا ہوا تھا۔ وہ شاید اسے ن سے مارنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

کامران چپ چاپ کھڑا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ جہانداد کی وحشت اور ارادے سے لاعلم معاً اسے رحمدل خان کی خرخراتی ہوئی آواز سنائی دی تو اسے خطرے کا احساس ہوا۔ دوسرے ہی

لمحے وہ چلا کر بولا۔ ''جہانداد چھوڑ دو اسے...... پلیز یہ مر رہا ہے''۔

''مر جانے دو اسے''۔ جہانداد نے غراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''یہ بھی تو مجھے مارنا ہی چاہتا تھا''۔

''یہ کیا پاگل پن ہے؟'' کامران نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑ دو اسے، یہ مر جائے گا۔ ہم نے اسے زندہ پکڑ کر لے جانا ہے''۔

''نہیں چھوڑوں گا''۔ جہانداد نے چلا کر کہا اور رحمدل خان کی گردن پر مزید زور ڈالنے لگا۔

دم گھٹنے کی وجہ سے رحمدل خان ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح تڑپنے لگا۔ کامران کے لیے یہ صورتِ حال خاصی پریشان کن تھی۔ اسے جہانداد جیسے سلجھے ہوئے انسان سے اس حماقت کی توقع نہیں تھی تاہم وہ وقت سوچنے اور پریشان ہونے کا نہیں تھا بلکہ رحمدل کی جان بچانے کا تھا۔ چنانچہ اس نے زور لگا کر جہانداد کو کھینچنا شروع کر دیا۔ جہانداد تھکا ہوا تھا جبکہ کامران تازہ دم تھا اس لیے وہ اسے کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم جہانداد کے ہاتھ چھٹتے چھٹتے رحمدل خان کے گریبان پر پڑ گئے۔ ''جھرر'' کی آواز کے ساتھ رحمدل کی قمیص دامن تک پھٹتی چلی گئی۔

بڑی مشکل سے کامران نے جہانداد کا غصہ ٹھنڈا کیا ورنہ وہ رحمدل خان کو زندہ چھوڑنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

''آج نہ جانے کون سی نیکی کام آ گئی''۔ غصہ ٹھنڈا ہوتے ہی جہانداد اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ اس حرام زادے نے مجھے جان سے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی''۔

''مگر یہ تو خالی ہاتھ تھا؟'' کامران نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''پھر کیسے اس نے''۔

''خالی ہاتھ کہاں تھا؟'' جہانداد نے جھنجھلا کر قطع کلامی کی۔ ''اس کے پاس آہنی تار تھا جو دھوکے سے اس نے میری گردن میں ڈال دیا تھا۔ میں اگر ہمت چھوڑ دیتا تو اس وقت تمہیں یہاں میری لاش ہی ملتی۔ دل تو چاہتا ہے کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں مگر مجبوری ہے''۔

''سوری جہانداد!'' وہ نادم انداز میں بولا۔ ''مجھے اوپر پہنچنے میں دیر لگ گئی ورنہ تجھے اس قدر تکلیف نہ اٹھانا پڑتی''۔

''کوئی بات نہیں''۔ جہانداد نے کہا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے، غلطی میری اپنی تھی۔ میں اگر اندھا دھند کمرے میں داخل نہ ہوتا تو مجھے کبھی ایسی صورتِ حال پیش نہ آتی''۔

اسی دوران فرش پر پڑا ہوا رحمدل خان کراہنے لگا اور وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔



تھانے پہنچتے ہی پولیس والوں نے ڈاکٹر شہناز کو لاک اَپ میں بند کر دیا۔ ریوالور وغیرہ اس



پہلے ہی لے چکے تھے۔ ڈاکٹر شہناز برابر موٹی توند والے حوالدار کو بُرے نتائج کی دھمکیاں دے رہی تھی مگر وہ اس کی دھمکی کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ ڈاکٹر شہناز جب کسی طرح خاموش نہ ہوئی تو حوالدار نے ہتھے سے اکھڑ کر اسے ننگی اور فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔

''کرنا دھندا اور ''تڑیاں'' قانون کو لگانا''۔ حوالدار نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں کسی ایس پی جمشید خان کا نام سن کر ڈر جاؤں گا؟ مجھے تو لگتا ہے کہ اس نام کا کوئی ایس پی ہے بھی نہیں۔ آج رات میں تمہارے سارے کس بل نکال دوں گا''۔

''ایس پی سے میری بات کرا دو حوالدار''۔ وہ بولی۔ ''اب بھی تمہارے پاس وقت ہے، بعد میں پچھتانے سے کچھ بھی نہیں ہوگا''۔

''بکواس مت کرو فاحشہ عورت!'' حوالدار چلا کر بولا۔ ''تیرا یار ایس پی اب تجھے نہیں بچا سکتا۔ میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد تجھے ڈرائنگ روم کی سیر کراؤں گا، پتا چل جائے گا کہ تُو کسی ایس پی کی لگتی ہے یا پھر شہر کے کسی شاہی محلے کی پیداوار ہے؟''

اتنا کہنے کے بعد حوالدار لاک اپ کے سامنے ٹہلتے ہوئے کانسٹیبل سے مخاطب ہو گیا۔ ''خیال رکھنا اوئے اس کا''۔

وہ پولیس والوں کے روایتی انداز میں گویا ہوا۔ ''بہت چالو لگتی ہے یہ...... خبردار اس سے کوئی بات نہ کرنا، میں ذرا لباس تبدیل کر کے ابھی واپس آتا ہوں، پھر اکیلے میں اس کی رنگین داستان سنوں گا''۔

''فکر ہی نہ کرو سر جی!'' کانسٹیبل نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس کی کیا مجال کہ یہ مجھ سے کوئی سوال کرنے کی جرأت کرے؟ میرا نام کانسٹیبل ہیبت خان ہے ہیبت خان''۔

حوالدار توند پر بیلٹ کو درست کرتے ہوئے تھانے کے رہائشی بارک کی طرف بڑھ گیا اور ڈاکٹر شہناز بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ کانسٹیبل ہیبت خان چند لمحے تو ڈاکٹر شہناز کو گھورتا رہا پھر لاک اپ کے سامنے ٹہلنا شروع کر دیا۔ گاہے گاہے وہ ایک بھرپور نگاہ ڈاکٹر شہناز کے سراپے پر بھی ڈال لیتا تھا۔ ڈاکٹر شہناز چپ چاپ سر جھکائے سوچوں میں غرق تھی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اپنی گرفتاری کی اطلاع ایس پی جمشید خان تک پہنچانا تھی۔ حوالدار کے تیور وہ دیکھ چکی تھی اور اس کے شیطانی خیالات سے بھی وہ آگاہ ہو چکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھوں لٹنے سے تو وہ بچ گئی تھی مگر یہ قانون کے یہ نام نہاد رکھوالے اسے چھوڑتے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے۔

سوچتے سوچتے اچانک اس کی نظر گلے میں پڑی ہوئی سونے کی چین پر پڑی تو اس کی

آنکھیں چمک اٹھیں۔سونے کی اس چین سے وہ کانسٹیبل ہیبت خان کا ایمان خریدنے کی کوشش کر سکتی تھی۔اسے معلوم تھا کہ اکثر پولیس والے بکنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ویسے بھی ہیبت خان تو ایک عام سا کانسٹیبل تھا،اس محکمے میں تو بڑے بڑے آفیسر تک بک جاتے ہیں۔

''ہیبت خان!'' اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے مدھم آواز میں کانسٹیبل کو پکارا۔''پلیز میری ایک بات تو سن لو''۔وہ کچھ اس طرح لجاجت سے بولی کہ ہیبت خان حوالدار کے دیے ہوئے حکم کو نظرانداز کرتے ہوئے فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''کیا بات ہے؟'' لاک اَپ کے سامنے پہنچ کر اس نے استفسار کیا۔

''پلیز میرا ایک کام کردو، میں تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر انعام دوں گی''۔منت آمیز انداز میں کہتے ہوئے اس نے گلے سے سونے کی چین اتار کر ہیبت خان کے سامنے لہرائی۔

''یہ چین سونے کی ہے''۔وہ بولی۔''پورے دو تولے کی ہے۔تم اگر میرا ایک کام کردو تو میں یہ چین تمہیں انعام میں دے دوں گی''۔

''کام کیا ہے؟'' ہیبت خان نے سونے کی چین کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔''کام اگر خطرے والا ہوا تو میں نہیں کروں گا''۔

''بہت آسان کام ہے''۔وہ بولی۔''میں تمہیں ایک فون نمبر دیتی ہوں تم نے اس نمبر پر اطلاع دینی ہے کہ ڈاکٹر شہناز اس وقت تھانے میں ہے،بس اتنا سا کام ہے''۔

''بہت مشکل ہے''۔وہ بولا۔''اگر حوالدار جانو کو پتا چل گیا تو وہ مجھ سے بہت بری طرح پیش آئے گا''۔

''اوہ''۔ڈاکٹر شہناز نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔''تو اس موٹی توند والے حوالدار کا نام جانو ہے؟''

''جان محمد عرف جانو''۔ہیبت خان نے بتایا۔''ایک نمبر کا حرامی ہے۔نچلے عملے کے لیے ہر وقت عذاب بنا رہتا ہے۔دراصل تھانہ انچارج اس کا رشتہ دار ہے اس لیے یہ پھنے خانی دکھاتا رہتا ہے''۔

''تم نے اگر میرا یہ کام کردیا تو یہ موٹی توند والا جانو یہاں سے سیدھا جیل جائے گا''۔وہ بولی۔''اور میں ایس پی صاحب سے تمہاری ترقی کی بھی بات کروں گی۔ہوسکتا ہے کل تم اس تھانے میں حوالدار بنے کسی کرسی پر بیٹھے ہو''۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔مگر کام بہت مشکل ہے''۔وہ بولا۔''فون کے پاس سنتری موجود ہوگا۔سنتری کی موجودگی میں، میں بات نہیں کرسکوں گا۔وہ حوالدار کو بتا دے گا''۔



''تم ایک سنہری موقع ضائع کررہے ہو ہیبت خان''۔ڈاکٹر شہناز نے اسے ترغیب دیتے ہوئے کہا۔''سنتری کو کسی بہانے سے دائیں بائیں بھیج دینا،ایک منٹ بھی تو نہیں لگے گا بات کرنے میں۔کوئی بھی فون اٹھائے بس تھانے کا نام بتا کر اطلاع دے دینا''۔

آخر کار ڈاکٹر شہناز کے لجاجت بھرے انداز،سونے کی چین اور متوقع ترقی کے لالچ نے ہیبت خان کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور کردیا۔

''ٹھیک ہے میم صاحب!'' وہ رضامند ہوتے ہوئے بولا۔''میں کوشش کرتا ہوں اگر موقع ملا تو ضرور فون کردوں گا''۔اتنا کہنے کے بعد اس نے ڈاکٹر شہناز سے فون نمبر پوچھا اور تھانے کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

•:• ===•:• ===•:•

حوالدار جانو تقریباً نصف گھنٹے کے بعد واپس آیا تھا۔اس دوران کانسٹیبل ہیبت خان فون کرکے واپس آچکا تھا۔خوش قسمتی سے کال ایس پی جمشید خان نے ہی ریسیو کی تھی لیکن ہیبت خان نے تھانے اور ڈاکٹر شہناز کا نام بتانے کے بعد فوراً ریسیور رکھ دیا تھا۔دراصل وہ حوالدار جانو سے بہت زیادہ ڈرتا تھا اس لیے ایک جملہ بول کر فوراً واپس آگیا تھا۔ڈاکٹر شہناز نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے سونے کی چین اس کے حوالے کردی تھی۔

''ہاں سوہنیو! کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ناں؟'' حوالدار جانو نے لاک اَپ کے سامنے پہنچتے ہوئے ڈاکٹر شہناز سے بھونڈے انداز میں استفسار کیا۔وہ اس وقت سول کپڑوں میں ملبوس تھا اور ڈاکٹر شہناز کو یوں ندیدے پن سے دیکھ رہا تھا جیسے اس سے قبل اس نے کوئی لڑکی نہ دیکھی ہو۔

''تم بہت بُرا کررہے ہو حوالدار''۔وہ بولی۔''نہ صرف میرے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ بھی بُرا کررہے ہو۔ایک دو ٹکے کے ٹیکسی ڈرائیور کی باتوں میں آکر تم نے بہت بڑی مصیبت مول لے لی ہے''۔

''تجھے فلمی ڈائیلاگ بولنے کا بہت شوق ہے''۔حوالدار ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔''چل تیرا یہ شوق بھی ڈرائنگ روم میں لے جاکر پورا کردیتا ہوں''۔

اتنا کہہ کر وہ کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔''اوئے ہیبت خان! چل تالا کھول لاک اَپ کا، برسوں کے بعد ایسا شباب دیکھا ہے،اب نیند کس کافر کو آئے گی''۔

ہیبت خان نے ''یس سر'' کہتے ہوئے بلا تردد تالا کھول دیا اور حوالدار جانو ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

''چل باہر نکل''۔وہ بولا۔''میں نے قانونی کارروائی پوری کرنی ہے''۔

"نہیں نکلتی"۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تم کیا کرلو گے؟"

"اوے چھمک چھلو! میں بہت کچھ کرسکتا ہوں"۔ وہ اوباشانہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "چلو ورنہ یہیں تفتیش شروع کردوں گا"۔

"نہیں نکلوں گی"۔ ڈاکٹر شہناز نے ضدی انداز میں کہا۔ "تم نے اگر مجھے ہاتھ بھی لگایا تو میں چیخنا شروع کردوں گی"۔

"ضرور چیخنا چھمک چھلو! مگر یہاں نہیں، ڈرائنگ روم میں"۔ اتنا کہہ کر وہ بھوکے گدھ کی طرح ڈاکٹر شہناز پر جھپٹا مگر وہ تیزی سے ایک طرف ہوگئی اور حوالدار جانو اپنی ہی جھونک میں سیل کی دیوار سے جاٹکرایا۔

"تیری تو"۔ وہ ایک فحش گالی دیتے ہوئے پلٹا اور دوبارہ ڈاکٹر شہناز پر جست لگادی۔

ڈاکٹر شہناز اس ردِعمل کے لیے پہلے سے ہی تیار تھی چنانچہ ایک بار پھر اس نے کود کر جان بچالی۔ سیل کے دروازے پر اگر رائفل لیے کانسٹیبل ہیبت خان کھڑا نہ ہوتا تو وہ اب تک دوڑ کر باہر نکل چکی ہوتی۔ اس بار حوالدار جانو نے خود کو دیوار سے ٹکرانے سے بچالیا تھا تاہم غصے اور جھنجلاہٹ کے مارے وہ پاگل ہوچکا تھا۔ ڈاکٹر شہناز کو بے تحاشا گالیاں دیتے ہوئے وہ سیل کے دروازے کی طرف بڑھا اور پھر کانسٹیبل ہیبت خان سے چلا کر بولا۔ "دروازہ باہر سے بند کردو اور یہاں سے دفع ہوجاؤ"۔

کانسٹیبل ہیبت خان نے فوراً اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے سیل کا دروازہ باہر سے بند کردیا اور خود سنتری کے پاس چلا گیا۔

صورتِ حال ڈاکٹر شہناز کے لیے حد سے زیادہ خطرناک ہوگئی تھی۔ وہ کمزور سی لڑکی ایک موٹے تازے ڈھائی من کے حوالدار سے اپنی عزت نہیں بچاسکتی تھی چنانچہ اس نے زور زور سے چلانا شروع کردیا مگر حوالدار جانو اس کے چلانے کو نظر انداز کرتے ہوئے خطرناک انداز میں اس کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے چہرے پر وہ ازلی شیطانی مسکراہٹ طاری تھی جس کا سامنا بنتِ آدم صدیوں سے کرتی آرہی ہے۔

حوالدار جانو کسی خونخوار گدھ کے پروں کی طرح دونوں بازو پھیلا کر پوری حکمت عملی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس بار وہ ڈاکٹر شہناز کو نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی مگر کب تک بچتی؟ آخر کار سیل کے ایک کونے میں وہ محصور ہوگئی۔

حوالدار جانو نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور پھر ڈاکٹر شہناز کو بازوؤں میں دبوچ لیا۔ اس نے تڑپ کر حوالدار جانو کی گرفت سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے مگر خود کو آزاد نہ کرسکی۔



"حرام زادے، کتے، کمینے! چھوڑ دے مجھے"۔ وہ حلق کے بل چلا کر بولی۔ "چھوڑ دے ...

"ورنہ کیا میری بلبل؟" وہ شیطانی انداز میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "کیا تم مجھے کھا جاؤ گی؟"

جونہی اس کی بات مکمل ہوئی ڈاکٹر شہناز نے اس کے بازو میں دانت گاڑ دیے۔ حوالدار جانو کے منہ سے ایک درد میں ڈوبی ہوئی "ہائے" نکلی اور دوسرے ہی لمحے اس نے بے قابو ہو کر ڈاکٹر شہناز پر تھپڑوں کی بارش کردی۔

"رنڈی کہیں کی......" وہ بے تحاشا گالیاں بک رہا تھا اور اس کے منہ سے کف اُڑ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی عورت اس سے اس طرح پیش آرہی تھی، اس لیے وہ آپے سے باہر ہوگیا تھا۔

ڈاکٹر شہناز چند تھپڑ کھا کر ہی سیل کے پختہ فرش پر گر پڑی تھی۔ حوالدار جانو نے اسے پاؤں سے ایک ٹھوکر لگائی اور پھر اپنے بازو کی طرف متوجہ ہوگیا، جس پر نہ صرف ڈاکٹر شہناز کے دانتوں کے نشان ثبت تھے بلکہ ان نشانوں سے معمولی سا خون بھی رِس رہا تھا۔ رِستا ہوا خون دیکھ کر اس پر دوبارہ جنون سوار ہوگیا۔ گالیاں بکتے ہوئے اس نے جھک کر ڈاکٹر شہناز کو سر کے بالوں سے پکڑا اور ایک جھٹکے سے کھڑا کردیا۔ ذلت، بے عزتی اور درد کی شدت نے ڈاکٹر شہناز کو رونے پر مجبور کر دیا۔ تھپڑوں سے اس کا نرم و نازک چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ریشمی بال بکھرے ہوئے تھے۔ گالوں پر حوالدار جانو کے تھپڑوں کے نشان کسی مہر کی طرح ثبت ہوگئے تھے۔

"تعاون نہ کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا تم نے"۔ حوالدار جانو کسی خونخوار درندے کی طرح غراتے ہوئے بولا اور پھر اس کا سر سیل کی پختہ دیوار سے ٹکرادیا۔

ڈاکٹر شہناز کے منہ سے ایک دل دوز چیخ برآمد ہوئی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح "دھپ" کی آواز سے دوبارہ زمین بوس ہوگئی۔ حوالدار جانو نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر گھٹنوں کے بل فرش پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر شہناز کی مدافعت اب بالکل دم توڑ چکی تھی اور اس پر نیم بے ہوشی کا عالم طاری تھا۔ حوالدار جانو چند لمحے غور سے اس کے سراپے کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اپنا ایک ہاتھ اس کے گریبان کی طرف بڑھادیا۔

ایسے ہی وقت لاک اپ کے سامنے کسی کے قدموں کی چاپ ابھری اور اس کا آگے بڑھتا ہاتھ رک گیا۔ پلٹ کر اس نے لاک اپ کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں سنتری کو موجود پایا۔ سنتری کے چہرے پر حواس باختگی کے اثرات دیکھ کر اس نے کاٹ کھانے والے انداز میں استفسار کیا۔ "کیوں آئے ہو یہاں اور یہ تمہاری شکل کو کیا ہوا ہے، کیا ماں مرگئی ہے تمہاری؟"

''سر! آپ کے لیے بڑے صاحب کا فون ہے''۔ سنتری بولا۔ ''انہوں نے فوراً آپ کو طلب کیا ہے''۔

''کیوں؟'' وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''رات کے اس وقت بڑے صاحب کے پیٹ میں کیا مروڑ اٹھنے لگے ہیں۔ کس لیے مجھے طلب کر رہے ہیں؟ جاؤ انہیں کہہ دو میں اس وقت تھانے میں نہیں ہوں''۔

''سر! وہ بہت غصے میں لگ رہے ہیں''۔ سنتری نے کہا۔ ''اگر آپ نے فون نہ سنا تو وہ خود یہاں پہنچ جائیں گے''۔

سنتری کی اس بات نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا اور اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ مزید کوئی سوال کیے بغیر وہ تیزی کے ساتھ سیل سے باہر نکلا اور عجلت میں چلتے ہوئے تھانے کے آفس میں پہنچ گیا۔ سامنے ہی ایک ٹیبل پر فون ہولڈ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا دیا۔ ''ہیلو سر! میں حوالدار جانو''۔

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دوسری جانب سے تھانہ انچارج انسپکٹر شاہ نواز حلق کے بل دھاڑا۔

''کتے کے بچے! یہ کسے پکڑ لائے ہو؟'' تھانہ انچارج گرج کر بولا۔ ''جانتے ہو وہ کون ہے؟ ایک معزز ڈاکٹر اور کرائم برانچ کے ایس پی جمشید خان کی رشتہ دار ہے۔ اب تجھے کون بچائے گا؟ بولو...... جواب دو؟ جمشید خان تو تیری کھال اتروا دے گا''۔

''س...... سس...... سوری سر!'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''خدا...... کی قسم...... مم...... مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی بڑی شخصیت ہیں ورنہ میں انہیں عزت و احترام کے ساتھ ایس پی صاحب کے بنگلے پر چھوڑ آتا۔ مم...... مجھے...... معاف کر دیں سر! مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے''۔

''تم حرام زادے ہو اور ہمیشہ حرام زادے ہی رہو گے''۔ انسپکٹر شاہ نواز بدستور غصے میں بول رہا تھا۔ ''میرے معاف کرنے سے تمہاری جان نہیں بچ سکتی۔ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو کسی طرح ڈاکٹر شہناز کو راضی کر لو۔ ایس پی جمشید خان ابھی وہاں پہنچنے والے ہیں، اس کے پہنچنے سے قبل جو کچھ کر سکتے ہو کر لو ورنہ نوکری تو جائے گی ہی، تمہیں دس پندرہ سال جیل بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو مگر ایس پی جمشید خان بہت اصولی اور بے رحم شخص ہیں۔ مجرم اس کا بھائی کیوں نہ ہو وہ کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے۔ اس جیسا کڑک آفیسر میں نے آج تک نہیں دیکھا''۔

''س...... سس...... سر پلیز''۔ وہ گھگھیاتے ہوئے بولا۔ ''آپ...... ہی کچھ...... مم...... میں ایس پی صاحب کا سامنا۔ کیسے کروں گا؟'' وہ تقریباً رونے پر آ گیا تھا۔



''سؤر کے بچے!'' انسپکٹر شاہ نواز گرج کر بولا۔ ''تجھے کس ماں کے خصم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر شہناز پر ہاتھ ڈالو؟ اب خود بھگتو میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ایس پی جمشید خان ایسے سر پھرے آفیسر ہیں کہ آئی جی صاحب تک کو خاطر میں نہیں لاتے، پھر میں کیا چیز ہوں؟''

''پپ...... پلیز...... سر!'' وہ روتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ ''مم...... مجھے کسی طرح بچائیں''۔

''ڈاکٹر شہناز کہاں ہے؟ میری اس سے بات کراؤ''۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے حکم دیا۔

''وہ...... وہ تو سر! لاک اپ میں ہے''۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''گدھے کے بچے! اسے فوراً آزاد کرو''۔ انسپکٹر بولا۔ ''اور میری اس سے ابھی بات کراؤ، میں اسے راضی کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں شاید وہ مان جائے''۔

''مم...... مم...... میں...... وہ سر......''۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش مگر اس کی ہمت جواب دے گئی۔

''کیا کیا ہے تم نے ڈاکٹر شہناز کے ساتھ؟'' انسپکٹر شاہ نواز اس قدر زور سے دھاڑا کہ حوالدار جانو کے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔ اس کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہو گئی تھی اور سارا بدن کانپ رہا تھا۔

''سؤر کے بچے! سانپ کیوں سونگھ گیا ہے بولو۔ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟'' انسپکٹر نے دوبارہ گرج کر استفسار کیا۔

''مم...... میں سر...... وہ...... وہ مجھے دھمکیاں دے رہی تھی...... تو...... تو مجبوراً...... مجھے ہاتھ اٹھانا''۔

''شٹ یور ماؤتھ حرام زادے!'' انسپکٹر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلایا۔ ''میں پہنچ رہا ہوں تھانے۔ تم نے قانون کو ہاتھ میں لینے کی جرأت کیسے کی؟''

حوالدار جانو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور پھر وہیں ایک کرسی پر نڈھال انداز میں گر گیا۔ وہ یوں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا جیسے ایک کلومیٹر کی ریس میں دوڑ کر آیا ہو۔ انسپکٹر شاہ نواز کی باتوں نے اس کا خون خشک کر دیا تھا۔ اسے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک معزز لیڈی ڈاکٹر پر مجرمانہ حملہ کر کے اس نے خود ہی مصیبت کو دعوت دے ڈالی تھی۔

''سر جی!'' اچانک کانسٹیبل ہیبت خان اس سے مخاطب ہوا۔ ''اس ڈاکٹر کا کیا کرنا ہے جی،

وہ تو ابھی تک لاک اَپ میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہم سب کی وردیاں اتر جائیں گی‘‘۔

’’اپنی وردی تو سمجھو اتر گئی ہیبت خان!‘‘ اس نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ ’’تم جا کر سنبھالو اسے، مجھ میں تو اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے‘‘۔

’’سر جی! معافی شافی مانگ لو اس سے‘‘۔ وہ مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ ’’کڑیوں کا دل تو بہت نرم ہوتا ہے، ہو سکتا ہے وہ آپ کو معاف کر دے‘‘۔

’’ہاں سر جی ہیبت خان ٹھیک کہتا ہے‘‘۔ سنتری بھی اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ’’آپ جا کر اس سے معذرت کر لیں، اللہ رحم کرے گا‘‘۔

’’ٹھیک ہے جیسے تم لوگوں کی مرضی‘‘۔ حوالدار جانو بمشکل کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ’’منت سماجت کر لیتا ہوں اس کی، آگے اللہ مالک ہے‘‘۔

’’سر جی پہلے میں جا کر اسے سنبھالتا ہوں‘‘۔ اچانک کسی خیال کے تحت ہیبت خان نے کہا۔ ’’آپ تھوڑی دیر کے بعد آ جانا‘‘۔

’’اچھا جاؤ‘‘۔ اس نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔



رحمدل خان اس وقت ٹارچر روم میں ایک فولادی کرسی پر بندھی ہوئی حالت میں موجود تھا۔ کرسی کے فولادی پائے پختہ فرش میں گڑے ہوئے تھے۔ یہ فولادی کرسی ان مجرموں کے لیے مخصوص تھی جو نہایت ہی سخت جان ہوتے تھے۔ ٹارچر روم کی سیاہ دیواروں پر کئی ایسے آلات ٹنگے ہوئے تھے جو مجرموں کی زبان کھلوانے کے لیے ایذا رسانی کے کام آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ آلات تو بہت ہی خوفناک شکل کے تھے۔ ایسے آلات رحمدل خان اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا تاہم اس کے چہرے پر کسی قسم کے خوف کے تاثرات موجود نہیں تھے۔

جہاندادا اور اے ایس آئی کامران بھی ٹارچر روم میں موجود تھے۔ غالباً انہیں جمشید خان کا ہی انتظار تھا جو چند لمحوں کے بعد پہنچنے والا تھا۔ وہ دونوں آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور رحمدل خان انہیں کینہ توز نگاہوں سے گھور رہا تھا، اس کا بس چلتا تو وہ ان دونوں کو کچا ہی چبا ڈالتا اس کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے سے لپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے لیکن جہاندادا اور کامران اس پر توجہ دیئے بغیر بدستور سرگوشیوں میں لگے رہے۔

چند لمحوں کے بعد ٹارچر روم کا دروازہ کھلا اور ایس پی جمشید خان پُر وقار انداز میں چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔

جہاندادا اور کامران سے چند باتیں پوچھنے کے بعد وہ رحمدل خان کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسے دیکھ کر برے برے منہ بنا رہا تھا۔

’’رحمدل خان!‘‘ وہ اس کے سامنے پہنچ کر نرم انداز میں بولا۔ ’’ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی ہم تمہاری جان لینا چاہتے ہیں۔ تم نے اگر ہم سے تعاون کیا تو ہم تمہیں ایک دو دن کے بعد آزاد کر دیں گے‘‘۔

’’ایس پی صیب!‘‘ رحمدل خان اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔ ’’آپ ام سے کیسا تعاون چاہتا اے؟‘‘

’’ہمیں نیلی کوٹھی کا پتہ چاہئے‘‘۔ جمشید خان نے کہا۔ ’’بتا دو گے تو یہاں سے زندہ سلامت

چھوٹ جاؤ گے ورنہ کسی کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی''۔

''ام کو مالوم نہیں اے، آپ کسی اور سے پوچھو''۔ اس نے ناگوار انداز میں جواب دیا۔ ''ام کی نیلی کوٹی نہیں گیا''۔

''میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''کیا تم وہاں جہانداد کو اغوا کر کے نہیں لے گئے تھے؟''

''ام جدر جہانداد کو لے گیا تا وہ نیلی کوٹی نہیں تا، کوئی اور جگہ تا''۔ رحمدل خان نے جواب دیا۔

''مطلب تمہیں اپنی زندگی سے کوئی پیار نہیں ہے؟'' جمشید خان بولا۔ ''اور تم بنگش کے حصے کی موت مرنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے تیری یہ خواہش پوری کر دیتے ہیں''۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے جہانداد اور اے ایس آئی کامران کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی زبان کھلواؤ۔ میں تمہیں نصف گھنٹے کا ٹائم دیتا ہوں۔ ٹھیک نصف گھنٹے کے بعد میں یہاں قدم رکھوں گا۔ کوئی بھی طریقہ اپناؤ جتنا چاہو تشدد کرو اجازت ہے۔ بس اتنا خیال رہے کہ یہ جان سے نہ گزر جائے''۔

''بے فکر رہیں سر! اس کا تو ایک ایک عضو بولے گا''۔ کامران نے مستعدی سے جواب دیا اور جمشید خان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

''ہاں بھئی رحمدل خان! کیا ارادے ہیں؟'' جمشید خان کے باہر نکلتے ہی کامران نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔ ''زبان کھولو گے یا معذور بننا پسند کرو گے؟ میں فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں''۔

''ام کو کچھ مالوم نہیں اے''۔ رحمدل خان نے غصے سے جواب دیا۔ ''تم جو کچ کر سکتا اے کرو، ام رحم کی بیک نہیں مانگے گا''۔

''بھیک بھکاری مانگتے ہیں رحمدل خان''۔ جہانداد ہاتھ میں پکڑا پلاس اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ ''تم اتنے بڑے آدمی ہو کر بھیک مانگتے ہوئے اچھے نہیں لگو گے''۔

''توم کو تو ام کبی ماپھ نہیں کرے گا''۔ اس نے پھنکار کر کہا۔ ''ام اگر بچ گیا تو توم کو نہیں چوڑے گا''۔

''وقت ضائع نہ کرو جہانداد!'' کامران بولا۔ ''کارروائی شروع کرو، یہ باتوں کا نہیں لاتوں کا بھوت ہے''۔

''او کے''۔ جہانداد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لو، پہلے اس کے ناخنوں پر نیل پالش لگاتے ہیں بعد میں اس کی آنکھوں کا آپریشن کریں گے''۔



کامران نے فوراً رحمدل خان کا دایاں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور جہانداد پلاس کے ذریعے [illegible]ن کے ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن اکھاڑنے لگا۔ جونہی جہانداد نے ناخن کو پلاس کے شکنجے میں لے کر جھٹکا دیا، رحمدل خان کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ اگر فرش میں گڑی ہوئی کرسی پر موجود نہ ہوتا تو اب تک کرسی سمیت فرش پر گر چکا تھا۔

جہانداد اس کی چیخوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہا۔ پلاس کے تیسرے جھٹکے پر رحمدل خان کا ناخن اکھڑ گیا اور انگوٹھا خون اگلنے لگا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلا رہا تھا مگر وہاں اس کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔

''تم کیسے رحمدل ہو یار، خود پر ہی رحم نہیں کرنا چاہتے''۔ اے ایس آئی کامران نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''چلو نیلی کوٹھی کا ایڈریس بتا دو ہم تجھ پر رحم کر دیں گے''۔

''کبی نہیں ...... بتائے گا''۔ اس نے اذیت کے عالم میں جواب دیا۔ ''چاہے توم ...... ام کو مار ڈالو''۔

''شہادت کی انگلی''۔ کامران نے جہانداد کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ رحمدل ہو کر بھی بڑا بے رحم ہے''۔

جہانداد نے دوبارہ اس کا خون آلود ہاتھ پکڑا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''اب بھی وقت ہے نیلی کوٹھی کا پتہ بتا دو ورنہ قطرہ قطرہ کر کے یونہی مرتے رہو گے''۔

رحمدل خان نے جواب دینے کی بجائے دانت بھینچ لیے اور جہانداد نے اس کی انگلی کا ناخن [illegible]ں کے شکنجے میں لے لیا۔ پہلے جھٹکے کے ساتھ ہی ٹارچر روم رحمدل خان کی چیخوں سے گونج اٹھا [illegible]ن جہانداد نے اس کا ناخن اکھاڑ کر ہی اس کا ہاتھ چھوڑا۔ رحمدل خان کا پورا وجود لرز رہا تھا مگر آہنی [illegible]ی پر مضبوطی سے بندھا ہونے کی وجہ سے وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا سرخ و سفید توانا چہرہ بگڑ [illegible]ر سیاہ ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی تکلیف کے عالم میں تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے ایک [illegible]ئے میں اس کی روح کھینچ لی ہو۔ اس کی انگلی اور انگوٹھے سے ٹپکنے والا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔ [illegible]ا چند لمحوں کی اذیت نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کندھے سے لے کر ہاتھ کی انگلیوں تک اس کا پورا [illegible]یوں درد کر رہا تھا جیسے کسی برقی مشین نے کچل ڈالا ہو۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' جہانداد نے اس کی آنکھوں کے سامنے خون آلود پلاس لہراتے ہوئے بے رحمی سے پوچھا۔

''نی ...... نہیں ...... بتائے گا''۔ اس نے بمشکل جواب دیا۔

''شہادت کی انگلی کے ساتھ والی انگلی''۔ اے ایس آئی کامران نے یوں پکارا جیسے کسی

پرائمری سکول کا ٹیچر طلباء کی حاضری لگا رہا ہو۔

''نہیں!'' جہانداد نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ واقعی بہت بے رحم شخص ہے ہم اس کی تمام انگلیوں کے ناخن بھی اکھاڑ دیں تو یہ پھر بھی زبان نہیں کھولے گا۔ اب کی بار کچھ نیا کرنا پڑے گا''۔

''نیا کیا؟'' کامران نے چونک کر استفسار کیا۔

''کچھ خاص''۔ جہانداد سوچنے والے انداز میں بولا۔ ''اذیت کا کوئی ایسا طریقہ جو اس کی بند زبان کھول دے اور یہ فر فر بولنے لگے۔ مجھے سوچنے دے''۔

''تم ٹائم ضائع کر رہے ہو جہانداد!'' کامران نے کہا۔ ''جو کچھ کرنا ہے جلدی سے کر دو، ابھی تھوڑی دیر کے بعد ایس پی صاحب پہنچ جائیں گے''۔

''پلیز ایک منٹ''۔ جہانداد نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''بس ابھی سوچ کر بتاتا ہوں''۔

گو کہ رحمدل خان انتہائی اذیت سے گزر رہا تھا مگر ان دونوں کی باتیں وہ سن رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے اذیت پہنچانے کا اور اس پر تشدد کرنے کا کوئی نیا طریقہ سوچ رہے ہیں۔

''ہاں یہ طریقہ ٹھیک رہے گا''۔ چند لمحوں کے بعد جہانداد آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔ ''ایک دم پرفیکٹ طریقہ ہے ایذا رسانی کا جدید اسٹائل''۔

''کون سا طریقہ سوچا ہے، کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے؟'' کامران مستفسر ہوا۔

''تم ذرا اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ، ابھی دیکھ لوگے؟'' جہانداد نے جواب دیا۔

''نہیں پہلے مجھے بتاؤ'' وہ اصرار کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا پتہ وہ طریقہ نامعقول ہو؟''

''بالکل معقول طریقہ ہے''۔ جہانداد نے کہا۔ ''اور تمہیں پسند بھی ضرور آئے گا۔ دراصل میں پلاس کے ذریعے اس کی ناک اکھاڑنا چاہتا ہوں تاکہ یہ ساری زندگی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے، یوں کب تک اس کا ایک ایک ناخن اکھاڑتے رہیں گے؟''

''ارے واہ کیا طریقہ سوچا ہے''۔ کامران پُرمسرت انداز میں کہا۔ ''اب دیر مت کرو بس شروع ہو جاؤ، ہمارے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ جہانداد اسے ہدایات دیتے ہوئے بولا۔ ''تم اس کے عقب میں کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے اس کا سر مضبوطی سے تھام لو تاکہ یہ ہلنے نہ پائے۔ میں اس کی ناک جڑ سے اکھاڑنا چاہتا ہوں''۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے؟'' وہ عقب میں جا کر رحمدل خان کا سر پکڑتے ہوئے بولا۔ ''لو پکڑ



اب شروع ہو جاؤ''۔

جہانداد نے پلاس کو سیدھا کیا اور ایک بے رحم سی نظر رحمدل خان کے چہرے پر ڈالی تو اس کی آنکھوں میں اسے بے تحاشا خوف نظر آیا، ایک ایسا خوف جو اس وقت کسی انسان کی آنکھوں میں نظر آتا ہے جب وہ یقینی موت سے دوچار ہوتا ہے۔ جہانداد کا نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہو رہا تھا۔ رحمدل خان کی رنگت تیزی سے اُڑنے لگی تھی۔

جہانداد پلاس کو نہایت سُست روی سے آگے بڑھا رہا تھا، اسے معلوم ہو چکا تھا کہ رحمدل خان کے اعصاب جواب دینے والے ہیں۔ جونہی اس نے پلاس کو رحمدل خان کی ناک سے ٹکرایا، وہ چلا اٹھا۔

''ام بتاتا اے، سب کچھ بتاتا اے۔ خدا کے لیے امارا ناک نہیں کاٹو''۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ام برباد ہو جائے گا۔ یہ ظلم نہیں کرو''۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کی انگلیوں کی مرہم پٹی کر رہے تھے اور وہ انہیں نیلی کوٹھی سمیت بنگش کے ٹھکانوں کے متعلق معلومات دے رہا تھا۔ جب جمشید خان دوبارہ ٹارچر روم میں داخل ہوا تو رحمدل خان تقریباً آدھا بیان دے چکا تھا۔

·:·===·:·===·:·

کانسٹیبل ہیبت خان بھاگتا ہوا لاک اپ میں داخل ہوا اور نڈھال پڑی ہوئی ڈاکٹر شہناز کے نزدیک پہنچ کر بیٹھ گیا۔ وہ سسکیوں میں رو رہی تھی۔ ہیبت خان کی موجودگی پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر خوشامدی انداز میں بولا۔ ''میم صاحب! مجھے معاف کر دیں، میں اپنی غلطی پر بے حد شرمندہ ہوں، مجھے آپ سے سونے کی یہ چین نہیں لینا چاہیے تھی۔ آپ یہ رکھ لیں۔ ابھی تھانے کا انچارج شاہ نواز صاحب پہنچنے والا ہے انہیں ایس پی صاحب نے بھیجا ہے''۔

ایس پی صاحب کا سنتے ہی ڈاکٹر شہناز اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''میں ایس پی صاحب سے فون پر بات کرنا چاہتی ہوں''۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے وہاں لے چلو''۔

''شوق سے بات کریں میم صاحب''۔ ہیبت خان بدستور خوشامدی انداز مین بول رہا تھا۔ ''مگر پلیز اپنی یہ امانت واپس لے لیں ورنہ شاہ نواز صاحب میری کھال اتار دیں گے''۔

''یہ امانت نہیں انعام ہے ہیبت خان''۔ وہ سنبھلتے ہوئی بولی۔ ''تم اگر میرا فون کرنے والا کام نہ کرتے تو آج میں زندہ درگور ہو جاتی۔ رکھ لو اب یہ تمہارا ہے''۔

''نہیں میم صاحب! مجھ پر رحم کرو میں یہ نہیں رکھ سکتا''۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔

''ہیبت خان! بے فکر رہو میں اس چین کے متعلق کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی''۔ وہ اس کی

پریشانی بھانپتے ہوئے بولی۔ ''اسے رشوت مت سمجھو، میں نے تجھے اپنی خوشی سے دی ہے''۔

''ٹھیک ہے میم صاحب''۔ وہ چین کو دوبارہ جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی خوشی اگر یہی ہے تو میں رکھ لیتا ہوں مگر خدا کے لیے بتانا کسی کو نہیں ورنہ میری نوکری چلی جائے گی''۔

''نہیں بتاؤں گی''۔ اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور لاک اپ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ آفس میں داخل ہوئی تو کرسی پر بیٹھا ہوا حوالدار جانو میکانکی انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر شہناز نے اس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر جمشید خان کا نمبر ملانے لگی۔ تیسری بیل پر رابطہ قائم ہو گیا مگر فون ایس پی جمشید خان کی ماں نے اٹھایا تھا۔

''کیسی ہو بیٹی؟'' ڈاکٹر شہناز کی آواز سنتے ہی اس نے پُرمسرت انداز میں استفسار کیا۔ ''ہم تو تیری طرف سے نااُمید ہو چکے تھے''۔

''بس آنٹی! ابھی کچھ زندگی باقی تھی جو بچ گئی ہوں۔ دراصل میں نے جمشید خان صاحب کا پتہ کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ کیا ان سے میری بات ہو سکتی ہے؟''

''وہ تو تیری طرف گئے ہیں۔ کیا ابھی تک نہیں پہنچے؟'' جمشید خان کی ماں مسز سلطانہ خان نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں آنٹی! ابھی تک نہیں پہنچے''۔ اس نے مایوس انداز میں جواب دیا۔ ''میں یہاں مصیبت میں پھنسی ہوئی ہوں۔ کوئی بھی میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس تھانے میں قانون کے محافظوں کی جگہ مجرم بیٹھے ہوں''۔

''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ مسز سلطانہ خان نے کہا۔ ''تم حوصلہ رکھو وہ بس پہنچنے ہی والے ہوں گے''۔

''کیسے..... کیسے حوصلہ رکھوں آنٹی؟'' تسلی آمیز الفاظ سنتے ہی اس کی آواز بھرا گئی۔ ''یہاں میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے''۔ بات ختم کرتے ہی اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

''پلیز..... پلیز بیٹی! یوں ہمت نہیں ہارتے''۔ وہ پُرشفقت انداز میں بولی۔ ''جس نے بھی تیرے ساتھ زیادتی کی ہے وہ بچ نہیں سکے گا۔ تم بس اپنے آپ کو سنبھالو، سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

ایسے ہی وقت تھانے کی عمارت میں ایک گاڑی داخل ہوئی اور ڈاکٹر شہناز نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''تشریف رکھیں میم صاحب''۔ کانسٹیبل ہیبت خان ڈاکٹر شہناز سے ملتمس ہوا۔ ''معلوم ہوتا



ہے صاحب پہنچ گئے ہیں''۔

''شکریہ''۔ کہتے ہوئے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا لباس مسلا ہوا تھا اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بالوں کو سنوارنے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ صدمے کی جس کیفیت سے گزر رہی تھی اس کیفیت میں لباس اور حلیے کی پرواہ کرنا ناممکن تھا۔

اس کے سامنے ٹیبل کے دوسری جانب حوالدار جانو قتل کے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور رنگت سرسوں کے پھولوں کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ اپنے زخمی بازو کو بھول کر وہ گاہے گاہے ڈاکٹر شہناز کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا مگر ڈاکٹر شہناز اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ آفس کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

چند لمحوں کے بعد دروازے سے تھانہ انچارج انسپکٹر شاہ نواز نمودار ہوا اور ڈاکٹر شہناز پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد حوالدار جانو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند لمحے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورنے کے بعد وہ سخت لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ کا یہ حال تم نے بنایا ہے ناں؟''

حوالدار جانو نے کوئی جواب نہ دیا البتہ اس کا سر کچھ مزید جھک گیا تھا۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں سوٴر کے بچے؟'' انسپکٹر نے گرج کر دوبارہ پوچھا۔ ''جواب دو، کیوں کیا ہے تم نے ایسا؟''

''وہ..... وہ سر جی! دراصل..... ڈاکٹر صاحبہ نے مجھے گالیاں''۔

''شٹ اَپ!'' انسپکٹر حلق کے بل دھاڑا اور حوالدار جانو کی بات ادھوری رہ گئی۔ ''نکلو یہاں سے اور ہیڈ محرر والے کمرے میں جا کر بیٹھ جاؤ، تمہاری سزا ایس پی جمشید خان تجویز کریں گے''۔

حوالدار جانو تیزی سے باہر نکل گیا اور انسپکٹر شاہ نواز دوبارہ ڈاکٹر شہناز کی طرف متوجہ ہو کر معذرت کرنے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! جو کچھ ہوا میں اس پر نہ صرف شرمندہ ہوں بلکہ آپ سے بے حد معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس معاملے کو یہیں دبانا پسند فرمائیں گی''۔

''نہیں انسپکٹر صاحب!'' وہ ایک عزم کے ساتھ بولی۔ ''میں اس معاملے کو عدالت تک لے جاؤں گی، جب تک اس حوالدار کو جیل نہیں ہو جاتی ہے مجھے چین نہیں آئے گا۔ اس نے میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے، نہ صرف یہ کہ مجھ پر لاک اَپ کے اندر مجرمانہ حملہ کیا ہے بلکہ مجھے جان سے مارنے کی کوشش بھی کی ہے''۔

''اسے معطل بھی تو کیا جا سکتا ہے''۔ انسپکٹر بولا۔ ''عدالت میں جانے سے تو آپ کی بھی بدنامی ہوگی۔ میں نے آپ کی بھلائی کی خاطر یہ مشورہ دیا ہے''۔

''آپ کے مشورے کا شکریہ انسپکٹر صاحب!'' وہ بولی۔ ''مگر میں اسے عدالت تک ضرور

لے جاؤں گی۔ مجھے اپنی بدنامی کا کوئی خوف نہیں ہے، میں جانتی ہوں کہ میں کون ہوں؟ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟ یہ میرا نہیں ان کا مسئلہ ہے“۔

”ڈاکٹر صاحبہ! میں آپ کے احساسات سمجھتا ہوں“۔ انسپکٹر نے کہا۔ ”مگر آپ اس پہلو پر بھی تو“۔

اسی دوران ڈیوٹی پر تعینات ایک کانسٹیبل نے انہیں ایس پی جمشید خان کے پہنچنے کی اطلاع دی اور انسپکٹر شاہ نواز بات ادھوری چھوڑ کر عجلت میں اٹھ کر آفس سے باہر نکل گیا۔

جب وہ دوبارہ آفس میں داخل ہوا تو ایس پی جمشید خان اس کے ہمراہ تھا۔ جمشید خان کو دیکھ کر ایک بار پھر ڈاکٹر شہناز کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔

”ایس پی صاحب!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے قانون سے تعاون کرنے کا بہت اچھا صلہ مل رہا ہے، پہلے قانون کے دشمنوں کی قید میں تھی، وہاں سے کسی طرح رہائی نصیب ہوئی تو قانون کے رکھوالوں کے ہتھے چڑھ گئی، یہ کیسا انصاف ہے سر! میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا؟“

جمشید خان کے پاس اُس کے چبھتے ہوئے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا تاہم وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر شہناز! تمہارے ساتھ پورا انصاف ہوگا یہ میرا وعدہ ہے مگر پہلے میں پورے واقعات سننا چاہوں گا“۔

ڈاکٹر شہناز نے بھیگی ہوئی پلکیں دوپٹے کے پلو سے صاف کیں اور پھر پورے واقعات جمشید خان کے گوش گزار کر دیے۔

اپنے ہی محکمے کے ایک اہلکار کی بے غیرتی کا قصہ سن کر جمشید خان کا پارہ یکدم چڑھ گیا۔

”کہاں ہے وہ حرام زادہ حوالدار جانو؟“ اس نے غصے سے کھولتی آواز میں تھانہ انچارج سے سوال کیا۔ ”ایسے لوگوں کو تو جیل میں ہونا چاہیے، پولیس کے محکمے میں کیا کر رہے ہیں؟“

”پلیز سر! کول ڈاؤن“۔ انسپکٹر شاہ نواز گزارشانہ انداز میں بولا۔ ”وہ یہیں ہے اور اسے قرار واقعی سزا ملے گی“۔

”بلاؤ اسے“۔ جمشید خان نے حکم دیا۔

”یس سر“۔ کہتے ہوئے انسپکٹر شاہ نواز نے کانسٹیبل ہیبت خان کو اشارے سے حوالدار جانو کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد حوالدار جانو مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا آفس میں داخل ہوا اور ایس پی جمشید خان کے سامنے کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ جمشید خان چند لمحے اسے قہر آلود



نظروں سے گھورتا رہا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔ ”مجھے اگر اپنے عہدے کا خیال نہ ہوتا تو میں اسی وقت قانون ہاتھ میں لے کر تجھے گولیوں سے بھون ڈالتا مگر یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ میں خود قانون کا محافظ ہوں“۔

”یس...... سر! مم...... مم...... مجھ سے...... اَن...... جانے...... میں...... بھ...... بھول“۔

”شٹ یور ماؤتھ“۔ جمشید خان گرجا اور حوالدار جانو کسی چابی والے کھلونے کی طرح ساکت ہو گیا۔ اس کا پورا وجود یوں کانپ رہا تھا جیسے جاڑے کا مریض۔

”ہیڈ محرر کو بلا کر اس کے خلاف ایف آئی آر درج کراؤ“۔ جمشید خان انسپکٹر شاہ نواز کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”اس پر ایک معزز لیڈی ڈاکٹر کو بلا جواز گرفتار کرنے اور لاک اپ میں اس کی عزت پر مجرمانہ حملہ کرنے کی دفعات لگاؤ“۔

”یس سر! ابھی ایف آئی آر درج کرا دیتے ہیں“۔ اتنا کہنے کے بعد انسپکٹر شاہ نواز نے ایک بار پھر کانسٹیبل ہیبت خان کو ہیڈ محرر کے کمرے کی طرف دوڑا دیا۔

”صبح تک تمہاری معطلی کے احکامات پہنچ جائیں گے“۔ جمشید خان ایک بار پھر حوالدار جانو سے مخاطب ہوا۔ ”اور بہت جلد تم جیل کی ہوا کھا رہے ہو گے“۔

جس وقت جمشید خان ڈاکٹر شہناز کو ساتھ لے کر تھانے سے باہر نکل رہا تھا، اس وقت صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

✤ ===✤ ===✤

ابراہیم بنگش نیلی کوٹھی کے اس کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جسے نیلی کوٹھی کے مکین ”سٹنگ روم“ کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کے ساتھ چند انڈین مہمان بھی موجود تھے اور وہ سب اس وقت شغلِ مے نوشی میں مصروف تھے۔ بنگش بات بات پر بے ساختہ قہقہے لگا رہا تھا۔ چاروں مہمان بھی مسرور نظر آ رہے تھے، اب معلوم نہیں یہ شراب کا نشہ تھا یا بنگش کی میزبانی کا سرور بہرکیف وہ چاروں بھی بنگش کے بے ساختہ قہقہوں میں برابر کا ساتھ دے رہے تھے۔

”یار کھرانہ! تمہارے ملک کی ایک بات مجھے بے حد پسند ہے“۔ بنگش اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک مہمان کے کندھے پر چپت لگاتے ہوئے بولا۔ ”وہاں لال پری با آسانی دستیاب ہو جاتی ہے“۔

”بنگش صاحب!“ کھرانہ بولا۔ ”وہ تمہارا بھی تو ملک تھا مگر تم لوگوں نے خود ہی اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اب لال اور سفید پریوں کے لیے ترسنا تو پڑے گا۔ سچ پوچھو تو ہمیں دیش ٹوٹنے کا بھی دکھ ہے اور ہم اب بھی اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھ رہے ہیں“۔

کھرانہ کا پورا نام جگدیش کھرانہ تھا اور وہ اسلحے کا بہت بڑا اسمگلر تھا۔ دوسرے مہمان کا نام راجندر ناتھ تھا اور وہ منشیات کا نامی گرامی بیوپاری تھا۔ سرحد کے دونوں جانب وہ ایک عرصے سے بارڈر سکیورٹی فورسز کو مطلوب تھا مگر وہ بہت کایاں شخص تھا، ہر بار سکیورٹی فورسز کو چکمہ دے کر نکل جاتا تھا۔ باقی دونوں مہمان کھرانہ اور راجندر کے معاون کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام گنپت رائے تھا اور دوسرے کا رام چند سہائے تھا۔

''سفید پریوں کی بھی خوب کہی''۔ بنگش کھرانہ کی بات پر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''کبھی موقع ملا تو کسی پری کی مہمان نوازی کا لطف ضرور اٹھائیں گے''۔

''میں ہمیشہ ان فلمی پریوں کو سفید پریاں کہتا ہوں''۔ کھرانہ بوتل اٹھا کر خالی گلاس بھرتے ہوئے بولا۔

''کبھی تشریف لاؤ ناں؟ جس کا نام لو گے حاضر کر دی جائے گی۔ تمہارے دیش کی فلمی پریاں تو کسی کام کی نہیں ہوتیں، سنا ہے سب اس بازار سے انڈسٹری میں لائی جاتی ہیں، جس بازار میں ہر پیسے والا منہ اٹھا کر پہنچ جاتا ہے''۔

کھرانہ کی بات سن کر اس کے تینوں ساتھیوں نے بیک وقت ایک قہقہہ لگایا تاہم بنگش کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

''تم سے باتوں میں جیتنا بہت مشکل ہے کھرانہ''۔ بنگش بولا۔ ''اور میں تو ایک سیدھا سادہ سا پٹھان ہوں، میرے جیتنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

''صرف باتوں میں نہیں دوست! بلکہ تم، ہم سے کسی چیز میں نہیں جیت سکتے''۔ کھرانہ نے ذومعنی انداز میں جواب دیا مگر بنگش اس کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ البتہ کھرانہ کے تینوں ساتھی شراب کے گھونٹ لیتے ہوئے ہنسے جا رہے تھے۔

ایسے ہی وقت کوٹھی کے احاطے میں ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا اور ان کی ہنسی کو یکدم بریک لگ گیا۔ اب ان چاروں کی آنکھوں سے ایک نادیدہ خوف جھانک رہا تھا اور شراب کے گلاس ان کے ہاتھوں میں لرزنے لگے تھے۔ سب سے بری حالت ذومعنی باتیں کرنے والے کھرانہ کی تھی۔

دھماکا اتنا شدید تھا کہ چند سیکنڈ کے لیے زمین بھی کانپ اٹھی تھی۔ بنگش کے چاروں مہمانوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بنگش خود بھی متوحش انداز میں سٹنگ روم کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیلی کوٹھی کے احاطے میں دھماکا اس کی سوچ سے بھی بعید تھا کیونکہ یہ اس کا وہ واحد ٹھکانہ تھا جو برسوں سے اس کے دشمنوں اور قانون کی نگاہوں سے اوجھل چلا آرہا تھا۔

''ب..... ب..... بنگش!'' جگدیش کھرانہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ..... دھماکا



...تھا؟''

''گھبراؤ مت کھرانہ!'' بنگش تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''کوٹھی میں میرے بہت سے جاں ...موجود ہیں۔ تم لوگوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی''۔

راجندر ناتھ بولا۔ ''شاید کوٹھی کے اندر تمہارا کوئی دشمن گھس آیا ہے یا پھر پولیس''۔

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تاہم کھرانہ کی نسبت اس کی حالت کچھ بہتر نظر آ رہی تھی۔

''نہیں پولیس یہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکتی''۔ بنگش پُر اعتماد نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے ...''تم اطمینان رکھو میں پٹھان ہوں اور پٹھان اپنے مہمان کی آن کے لیے جان دے دیتے ...

''اگر تمہاری جان جانے کے بعد بھی ہماری جان چلی گئی تو پھر کیا ہوگا؟'' کھرانہ نے تشویش ...انداز میں پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر قبل تو تم بڑی ڈینگیں مار رہے تھے''۔ بنگش بولا۔ ''کہ ہم لوگ تم سے ہر چیز ...پیچھے ہیں اور کسی چیز میں تم سے نہیں جیت سکتے۔ کیا خوفزدہ ہونے میں بھی تم لوگ ہم سے آگے ...

''م..... میں خوفزدہ..... تو نہیں ہوں''۔ وہ بدستور خوفزدہ انداز میں بول رہا تھا۔ ''مم میں تو ...ہی اپنے خیال کا اظہار کر رہا تھا''۔

''اوکے''۔ بنگش نے آگے بڑھ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی معلوم کر ...تا ہوں کہ یہ دھماکا کیسا تھا؟''

بنگش نے ابھی ریسیور کان سے لگایا تھا کہ معاً کوٹھی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ ...فائرنگ تھی، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دو گروپ آپس میں لڑ پڑے ہوں۔ بنگش ریسیور کان سے ...ہوئے کھڑا تھا۔ مگر دوسری طرف بیل جانے کے باوجود کوئی بھی ریسیور نہیں اٹھا رہا تھا۔ ...کے عالم میں اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور پھر کھرانہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف ...گیا۔ کھرانہ جو چند لمحے قبل کافی حد تک سنبھال چکا تھا اب دوبارہ اس کے چہرے پر ہوائیاں ...تھیں۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا شراب کا گلاس اس نے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی ...اور خوف کے عالم میں بنگش کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فائرنگ بغیر وقفے کے نہ صرف جاری ...لمحہ بہ لمحہ اس میں تیزی آتی جا رہی تھی۔

...ڑھتی ہوئی فائرنگ کے ساتھ ساتھ کھرانہ اور اس کے ساتھیوں کی حالت بھی پتلی سے پتلی ...رہی تھی۔ وہ چاروں آنکھیں پھاڑے کبھی بنگش کی طرف تو کبھی سٹنگ روم کے دروازے کی

طرف دیکھنے لگتے تھے۔ بنگش خود بھی پریشان تھا مگر وہ کسی حد تک خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ چاروں نہ صرف یہ کہ اس کے مہمان تھے بلکہ ان کے ساتھ اس کے کاروباری مراسم بھی تھے۔

''اب...... اب کیا ہوگا...... بنگش؟'' کھرانہ نے بمشکل استفسار کیا۔ خوف سے نہ صرف اس کی آواز بلکہ بدن بھی کانپ رہا تھا۔ فائرنگ کی آوازیں سن کر کھرانہ کے تینوں ساتھی بھی لرز رہے تھے۔

''میں نے کہا ناں کہ تم لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا''۔ بنگش نے جواب دیا مگر اس کی آواز اعتماد سے خالی تھی جسے ان چاروں نے واضح طور پر محسوس کرلیا تھا۔

''کک...... کیسے کچھ نہیں ہوگا؟'' کھرانہ نے دوبارہ سوال کیا۔ ''ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ فائرنگ کرنے والے کون لوگ ہیں۔ تیرے دشمن ہیں یا پھر پولیس ہے؟''

''تمہاری طرح میں بھی لاعلم ہوں''۔ بنگش نے کہا۔ ''تمہارے سامنے ہی میں نے انٹرکام پر بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بات نہیں ہوسکی۔ ایسی صورتِ حال میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''مطلب یہ پولیس کا ریڈ بھی ہوسکتا ہے؟'' راجندر ناتھ نے لب کشائی کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں پولیس کو میرے اس ٹھکانے کا علم نہیں ہے''۔ بنگش قطعی انداز میں بولا۔ ''تاہم میرے کسی دشمن کی کارروائی ہوسکتی ہے''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ لمحہ بھر کے لیے متوقف ہوکر دوبارہ بولا۔ ''او کے میں خود جا کر پتا کرتا ہوں کہ فائرنگ کیوں ہورہی ہے۔ تم لوگ اس کمرے سے باہر قدم نہ رکھنا''۔

''نہیں''۔ کھرانہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم ہمیں یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتے حملہ آور اگر یہاں گھس آئے تو ہم کیا کریں گے؟''

''تم چار آدمی ہو یہاں''۔ بنگش نے کہا۔ ''اکیلا تو میں جارہا ہوں''۔

''تم کچھ بھی کہو میں تمہیں نہیں جانے دوں گا''۔ کھرانہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جیسے تم لوگوں کی مرضی''۔ بنگش پلٹ کر دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی تم لوگوں کے ساتھ انتظار کرتا ہوں، پتا چل ہی جائے گا کہ حملہ آور کون لوگ ہیں؟''

''تم دوبارہ انٹرکام پر کوشش کرو ہوسکتا ہے اس بار رابطہ قائم ہوجائے''۔ راجندر مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ ''ڈیوٹی روم میں کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہوگا''۔

''او کے''۔ کہہ کر بنگش نے دوبارہ انٹرکام کا ریسیور اٹھالیا مگر رابطہ قائم نہ ہوسکا۔

''ڈیوٹی روم میں کوئی بھی نہیں ہے''۔ وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا اور ریسیور کو دوبارہ



کریڈل پر رکھ دیا۔

اس دوران فائرنگ میں شدت آگئی اور ساتھ ساتھ لوگوں کی چیخ و پکار کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ یہ آوازیں سن کر بنگش پریشانی اور اضطراب کے عالم میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چیخوں کے ساتھ گاہے گاہے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ بنگش کی پریشانی نے خوف کا روپ دھارنا شروع کردیا، اب اسے مہمانوں سے زیادہ اپنی جان کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ کھرانہ اور اس کے ساتھی بدستور بنگش کی طرف متوجہ تھے۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات دیکھ کر کھرانہ چپ نہ رہ سکا۔ ''تم...... تم...... اتنے خوفزدہ کیوں ہورہے ہو؟'' اس نے اٹکتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''ایسی...... کک...... کیا...... بات ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے''۔ وہ بولا۔ ''فکر نہ کرو تم لوگ یہاں محفوظ ہو''۔

''کیسے محفوظ ہیں؟'' راجندر نے چلا کر پوچھا۔ ''تم شاید ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟ پلیز بتاؤ، بات کیا ہے۔ یہ فائرنگ کرنے والے کون لوگ ہیں؟''

''باہر مجھے تم لوگ جانے نہیں دیتے ہو''۔ بنگش ایک دم بھڑک کر بولا۔ ''ایسی صورتِ حال میں......''

اچانک انٹرکام کی بیل بج اٹھی اور بنگش نے بات ادھوری چھوڑ کر ریسیور اٹھالیا۔ ''ہیلو''۔ ریسیور کان سے لگائے ہی اس نے بے تابی سے کہا۔ ''کوٹھی میں کون لوگ گھس......''

''جج...... جناب''۔ کسی نے انتہائی اذیت کے عالم میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مم...... میں...... آفتاب...... بول رہا ہوں...... مم...... مجھے...... پہلو میں...... گولی لگی ہے...... مم...... میں بڑی...... مشکل سے...... یہاں تک پہنچا...... ہوں''۔

''حملہ آور کون لوگ ہیں؟'' بنگش نے سوال کیا۔

''پپ...... پولیس...... فورس کے جوان...... ہیں جناب! ایس...... ایس...... پی جمشید ...... بھی''۔

معاً ریسیور سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی اور دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔ بنگش ریسیور کان سے لگاتے آفتاب، آفتاب''۔ پکارتا رہا مگر سے کوئی جواب نہ ملا، جھنجھلا کر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

''کک...... کیا ہوا ہے؟'' کھرانہ نے فوراً سوال کیا۔ ''یہ...... آفتاب کون ہے؟''

''کوٹھی پر پولیس فورس نے ریڈ کر دیا ہے''۔ بنگش بولا۔ ''میرے آدمی مقابلہ کر رہے ہیں ......''

"ہمیں یہاں سے نکالو"۔ راجندر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "ہم کسی قیمت پر بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگنا چاہتے"۔

"ہاں راجندر ٹھیک کہہ رہا ہے"۔ کھرانہ تائیدی انداز میں بولا۔ "ہمیں کسی محفوظ راستے سے باہر نکال دو"۔

"اگر محفوظ راستے پر بھی پولیس فورس کے آدمی موجود ہوئے تو تب کیا ہوگا؟" بنگش نے سوال کیا اور وہ چاروں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

"کچھ بھی کرو ہم تمہارے مہمان ہیں"۔ کھرانہ بولا۔ "ہم یہاں مرنے یا گرفتار ہونے کے لیے نہیں آئے۔ کسی بڑی شخصیت سے بات کرو جو پولیس فورس کو نکیل ڈال سکے۔ تمہارے ہاں کی اسمبلیوں میں تو تقریباً سبھی بکاؤ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، پیسے کی چنتا مت کرو جتنا بھی مانگے گا ہم دیں گے اور وہ بھی امریکی ڈالرز کی شکل میں"۔

"پیسے کی بات مت کرو کھرانہ!" انتہائی پریشانی کے عالم میں بھی بنگش بگڑے ہوئے انداز میں بولا۔ "میرے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے مگر اس وقت ہمارے لیے کسی بڑی اور بااثر شخصیت سے بات کرنا ناممکن ہے۔ میں ایس پی جمشید خان کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ انتہائی سرپھرا آدمی ہے، اس وقت وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی بات بھی نہیں سنے گا۔ ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا"۔

"کک......کیا سوچنا پڑے گا؟" کھرانہ نے سوال کیا۔

"ہمیں گرفتاری دے دینی چاہیے"۔ بنگش بولا۔ "ایس پی جمشید خان ہمیں ایک دن بھی حوالات میں نہیں......"

"اِٹ از امپوسیبل"۔ گرفتاری کا نام سنتے ہی کھرانہ حتمی انداز میں بولا۔ "ہم غیر قانونی طور پر اس دیش میں داخل ہوئے ہیں اگر ہم گرفتار ہو گئے تو شاید یہاں سے تو کسی نہ کسی طرح چھوٹ جائیں گے لیکن اپنے دیش کے حکام ہمیں مرتے دم تک نہیں چھوڑیں گے"۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" بنگش نے الجھ کر پوچھا۔ "پولیس فورس سے مقابلہ کرنا تو حماقت ہی ہوگی۔ ایس پی جمشید خان بے شک پولیس والا ہے مگر کسی غنڈے سے کم نہیں ہے، اب تک نہ جانے وہ میرے کتنے آدمیوں کو ہلاک کر چکا ہوگا؟ تم لوگ فائرنگ کی آواز سن رہے ہو ناں؟ اس کمرے تک پہنچتے ہوئے اسے دیر نہیں لگے گی"۔

"بنگش! ہم گرفتاری نہیں دے سکتے"۔ راجندر بولا۔ "کھرانہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم بس ہمیں کسی خفیہ راستے سے باہر نکال دو۔ ہمارے لیے صرف اس کوٹھی سے نکلنا مشکل ہے، بارڈر پار کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے"۔



"مجھے حرام کی موت مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے"۔ بنگش نے قطعی انداز میں جواب دیا اور وہ اروں پریشانی کے عالم میں اس کی شکل دیکھنے لگے شاید انہیں بنگش سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

ایسے ہی وقت فائرنگ کی آواز لمحہ بھر کے لیے رک گئی اور پھر میگافون پر کسی کی بارعب آواز نائی دی۔

"بنگش خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ اگر تم نے فرار ہونے کی کوشش کی تو بے موت مارے جاؤ گے۔ تمہارے بیشتر ساتھی مارے جا چکے ہیں اور باقیوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ہم تمہیں ں منٹ کا ٹائم دیتے ہیں، اگر دس منٹ کے اندر تم نے خود کو قانون کے حوالے نہ کیا تو انجام کے خود مہ دار ہو گئے"۔

"سن لیا ناں تم نے؟" اعلان کے ختم ہوتے ہی بنگش بولا۔ "اب کیا کہتے ہو؟"

"اب......اب کچھ سوچنا پڑے گا"۔ راجندر ناتھ ذومعنی انداز میں گویا ہوا اور پھر اچانک یوالور نکال کر بنگش پر تان لیا۔

·:· ===·:· ===·:·

الیکشن سر پر آتے ہی خان جی نے موسیٰ خان کو پشاور سے واپس بلا لیا تھا اور اب وہ حتمی یاریوں میں مصروف تھے۔ خان جی مولوی نصیب اللہ اور امین خان کی وجہ سے بے حد پریشان تھا۔ صوصاً مولوی نصیب اللہ تو اس کے لیے سانپ کے منہ میں چھپکلی کے مترادف ثابت ہوا تھا۔ نہ وہ ے نگل سکتا تھا اور نہ اگل۔ ہر دو صورتوں میں اس کا سیاسی مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا۔ پہلے تو موسیٰ خان کے ذریعے اس نے مولوی نصیب اللہ کو راستے سے ہٹانے کی کوششیں کی تھیں مگر جب مولوی نصیب للہ نے انتخابی مہم کے دوران سرعام جلسہ گاہوں میں ڈائس پر کھڑے ہو کر اپنی متوقع موت کا ذمہ دار ے ٹھہرایا تو اس نے اسے راستے سے ہٹانے والا ارادہ ترک کر دیا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے وں نے نہ صرف اس بات کو خصوصی کوریج دی تھی بلکہ وہ خان جی کے پاس مولوی نصیب اللہ کے بیان کی تصدیق یا تردید کے لیے بھی جا پہنچے تھے۔

بڑی مشکل سے خان جی نے اس بیان کو سیاسی ڈرامہ قرار دے کر جان چھڑائی تھی مگر وہ میڈیا ہی کیا جو آسانی سے کسی کا پیچھا چھوڑ دے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی خبر اس موضوع پر لگ ہی جایا کرتی تھی۔ خان جی کی تردید کو میڈیا کے کسی بھی نمائندے نے خاص اہمیت نہیں دی تھی۔

مولوی نصیب اللہ کے اس بیان کو سچ ثابت کرنے کے لیے ایک روز جمال خٹک اور امین خان نے پلان بنا کر جلسہ گاہ میں دورانِ خطاب مولوی نصیب اللہ پر سچ مچ فائرنگ کروا دی۔ اس

فائرنگ میں کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا تھا تاہم مولوی صاحب اور پارٹی کے تین جیالے معمولی سے زخمی ضرور ہو گئے تھے۔ جلسہ گاہ میں بھگدڑ مچ جانے سے کچھ عام لوگ بھی زخمی ہوئے تھے۔

جمال خٹک کے اس ڈرامے نے خان جی کی رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اب چاہتے ہوئے بھی مولوی صاحب کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا البتہ وہ جیسے تیسے اپنی سیاسی مہم چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ موسیٰ خان، زرولی اور اپنے دیگر آدمیوں کے ذریعے وہ درپردہ علاقے کے لوگوں کو پیسے کے بل بوتے پر خریدنے کی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ بھیڑیا ہوتے ہوئے بھی اس نے وقتی طور پر بھیڑ کا روپ دھار رکھا تھا۔ موسیٰ خان اور اپنے دوسرے غنڈہ عناصر کو اس نے کسی بھی موقع پر لڑنے جھگڑنے سے منع کر رکھا تھا اور اس بات کا وہ سختی سے نوٹس لیا کرتا تھا۔

موسیٰ خان جیسے شخص کے لیے یہ حکم بجا لانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا لیکن اپنے آقا کی حکم عدولی کرنا بھی اسے کسی طرح گوارہ نہیں تھا، تاہم وہ اکثر خان جی سے شکایت کرتا رہتا تھا کہ اسے فری ہینڈ دیا جائے تاکہ وہ مخالفین سے اپنی مرضی کے مطابق نمٹ سکے۔ خان جی ہر بار اسے ٹھنڈے دل سے سمجھا دیا کرتا تھا اور موسیٰ خان بھی وقتی طور پر چپ سادھ لیا کرتا تھا مگر جب مولوی نصیب اللہ اپنی پارٹی کی انتخابی مہم چلانے کے لیے خان جی کے علاقے تک پہنچ گیا اور جلسے پر جلسہ منعقد کرنے لگا تو موسیٰ خان بھڑک اٹھا۔

ایک روز وہ صبح سویرے خان جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور دوٹوک انداز میں بولا۔ ''خان جی! بس اب میری برداشت جواب دے چکی ہے۔ اب بھی اگر میں چپ رہا تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ آپ مجھے اجازت دیں میں اس مولوی کو آخرت کے سفر پر روانہ کرنا چاہتا ہوں، اس کی ہمت بہت بڑھ چکی ہے''۔

''موسیٰ خان! ہوا کیا ہے؟'' خان جی نے مشوش انداز میں پوچھا۔

''مولوی ہمارے گاؤں تک پہنچ چکا ہے''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''آج وہ یہاں جلسہ منعقد کریں گے۔ مولوی ڈائس پر کھڑے ہو کر آپ پر کیچڑ اچھالے گا۔ خان جی! یہ میری برداشت سے باہر ہے، میری آنکھوں کے سامنے کوئی آپ کی شان میں گستاخی کرے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے کہ مولوی یہاں جلسہ منعقد کرے گا؟'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔

''زرولی نے بتایا ہے''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''امین خان کی حویلی کے سامنے ایک کھلے میدان میں قناتیں لگا کر جلسہ گاہ کو ترتیب دیا جا چکا ہے۔ مولوی اور اس کے ساتھی اس وقت امین خان کے



ے میں موجود ہیں''۔

''جلسہ کس ٹائم شروع ہوگا؟'' اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''ابھی تو امین خان کے آدمی گاؤں میں اعلان کرتے پھر رہے ہیں''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''ب لوگ اکٹھے ہو جائیں گے تو وہ جلسے کی کارروائی شروع کر دیں گے''۔

اس کا جواب سن کر خان جی چند لمحوں کے لیے سوچوں میں مستغرق ہو گیا اور موسیٰ خان بیتابی کے عالم میں اس کے تاثرات نوٹ کرنے لگا۔ خان جی کا سر صوفے کی پشت سے ٹکا ہوا تھا اور اس نے دونوں آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

''موسیٰ خان!'' تھوڑی دیر کے بعد خان جی گویا ہوا۔ ''ہمیں طاقت سے نہیں عقل کے زور سے یہ جنگ جیتنا ہوگی۔ تم ایسا کرو زرولی، گل شیر خان اور زید خان سے کہو کہ وہ پورے گاؤں میں گھوم پھر کر یہ اعلان کر دیں کہ آج خان جی گاؤں کے لوگوں میں کپڑے اور چاول تقسیم کریں گے۔ ہمیں اس جلسے کو ناکام بنانا ہے''۔

''خان جی! ان لوگوں پر پیسہ برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ حقارت آمیز انداز میں بولا۔ ''ووٹ نہیں دیں گے تو ایک ایک کو کاٹ ڈالوں گا۔ آپ حکم دے کر تو دیکھیں؟''

''احمقانہ باتیں مت کرو موسیٰ خان!'' خان جی نے بھڑک کر کہا۔ ''زمانہ بدل چکا ہے۔ اب یوں دھاندلی سے ہم لوگوں کی حمایت حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہ الیکشن جیتنے کے لیے تجوریوں کا منہ کھولنا پڑے گا۔ کامیاب ہونے کے بعد ہم لگائی گئی رقم کا دس گنا حاصل کر لیں گے۔ جاؤ اب وقت ضائع مت کرو''۔

''ٹھیک ہے خان جی''۔ وہ بادل نخواستہ بولا۔ ''میں زرولی اور اس کے ساتھیوں کو اس کام پر لگا دیتا ہوں مگر مجھے کام بنتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یہاں کے لوگ پیار اور شرافت کی زبان سمجھنا تو دور کبھی سننا بھی گوارہ نہیں کرتے''۔

''وقت کا یہی تقاضا ہے موسیٰ خان!'' خان جی نے کہا۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو، کل یہی لوگ ہمارے رحم و کرم پر ہوں گے اور ہم ویسے ہی ان کو جوتی کی نوک پر رکھیں گے''۔

''بہت بہتر خان جی''۔ موسیٰ خان نے اتنا کہا اور سلام کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

•:• ===•:• ===•:•

''کیا مطلب؟'' بنگش نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ''تم..... مجھے مارنا چاہتے ہو..... مجھے؟ ابراہیم بنگش کو؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ کیا سمجھتے ہو خود کو؟''

''چل اٹھ''۔ راجندر ریوالور سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور ہمیں خفیہ راستے کی طرف

لے چل ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا''۔

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' بنگش نے غصے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔ ''میں نے کہا ہے ناں کہ ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے، ہر راستے پر پولیس فورس کے آدمی موجود ہیں گے۔ کیوں سب کو مروانا چاہتے ہو؟''

''تم اٹھتے ہو یا چلاؤں گولی؟'' راجندر نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو جلدی کرو ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے''۔

''اگر میں نہ اٹھنا چاہوں تو تم کیا کر لو گے؟'' بنگش نے تمسخر اڑانے والے انداز میں پوچھا۔ ''تم نہ صرف اس وقت میری دھرتی پر موجود ہو بلکہ میرے ہی گھر......''

''تم سالے! تمہاری یہ جرأت''۔ راجندر نے چلا کر کہا اور پھر ریوالور اس کی پیشانی پر رکھ دیا، بنگش کو اس نے بات پوری کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے راجندر؟'' صورتِ حال کو بگڑتے دیکھ کر کھرانہ مداخلت کرتے ہوئے راجندر پر چڑھ دوڑا۔ ''اس معاملے کو پیار و محبت اور مشاورت سے بھی تو طے کیا جا سکتا ہے ناں؟ چلو ریوالور ہٹاؤ، میں خود بنگش صاحب سے بات کرتا ہوں''۔

''تم چپ رہو کھرانہ''۔ راجندر اس کی طرف گردن موڑتے ہوئے چلایا۔ ''یہ ہمارا آپس کا معاملہ''۔

ابھی اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ اچانک ایک دھماکا ہوا اور راجندر کے منہ سے ایک کریہہ چیخ نکل گئی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے بنگش کے قدموں میں گرنے ہی والا تھا کہ بنگش نے اسے زوردار ٹھوکر لگا کر دور پھینک دیا۔ کھرانہ اور اس کے ساتھی خوفزدہ انداز میں فرش پر تڑپتے ہوئے راجندر کو دیکھ رہے تھے۔

''مجھے...... مجھے مارنے چلا تھا حرام زادہ''۔ بنگش ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا اور پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور کھرانہ اور اس کے ساتھیوں پر تان لیا۔ ''اور کس کو خفیہ راستے سے نکلنے کی خواہش ہے؟'' اس نے زہریلے انداز میں سوال کیا۔ ''کون ہے جو راجندر کی طرف اپنے بھگوان سے ملنے کا خواہش مند ہے؟''

''یہ...... یہ......تم نے اچھا نہیں......کیا بنگش''۔ کھرانہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''راجندر کو مار کر تم......''

''خاموش''۔ بنگش نے گرج کر قطع کلامی کی۔ ''میں نے اپنے دفاع میں اسے گولی ماری



میں اگر پہل نہ کرتا تو اس وقت اس کی جگہ میں فرش پر پڑا ہوتا لاش کی صورت میں''۔

راجندر چند لمحے تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ بنگش نے جھک کر اپنے قدموں میں پڑا ہوا ریوالور اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ یہ وہ ریوالور تھا جو چند لمحے قبل راجندر کے ہاتھوں میں تھا۔

''پپ...... پلیز بنگش! میں تمہاری بنتی کرتا ہوں''۔ کھرانہ نے رو دینے والے انداز میں کہا، بات کو اپنی مخالفت میں دیکھ کر ہندو نے اپنی ازلی مکاری سے کام لینا شروع کر دیا تھا، وہی مکاری جو اسے کمزور کے سامنے شیر اور طاقتور کے سامنے لومڑی بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔

''پپ...... پلیز...... ہمیں کسی خفیہ راستے سے نکال دو''۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''ورنہ یہاں کی پولیس ہمارا ان کاؤنٹر کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گی''۔

''اتنے ہی بزدل تھے تو بارڈر پار نہیں کرنا تھا''۔ بنگش نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''وہیں کوئی ہوئے وغیرہ کا ڈھابہ کھول لینا تھا، ان دھندوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''پلیز بنگش!'' اس نے دوبارہ التجا کی۔ ''یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے، میں ہاتھ جوڑ کر بنتی کرتا ہوں کہ......''

اسی دوران دوبارہ میگافون پر گونجدار آواز سنائی دی اور کھرانہ کی بات نامکمل رہ گئی۔

''بنگش! دس منٹ ہونے والے ہیں''۔ کوئی وارننگ کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''حرام موت مرنا نہیں چاہتے ہو تو باہر آ جاؤ ورنہ ہم تجھے گولیوں سے بھون ڈالیں گے''۔

''چلو''۔ وارننگ سن کر بنگش ان سے حکمیہ انداز میں بولا۔ ''میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا''۔

''بب...... بنگش...... پلیز''۔

''منہ بند رکھو حرام زادے!'' بنگش نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ''ہمارے پاس گرفتاری دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ چلو باہر نکلو ورنہ یہیں تمہارا اِن کاؤنٹر کر ڈالوں گا''۔

حکم حاکم مرگ مفاجات کے تحت کھرانہ اور اس کے ساتھی دروازے کی طرف چل پڑے۔ بنگش انہیں نشانے پر رکھے پیچھے پیچھے تھا۔ دروازہ کھول کر وہ ایک طویل راہداری میں پہنچ گئے جس کے دونوں جانب پہلو بہ پہلو کمرے بنے ہوئے تھے۔ کھرانہ کے دونوں ساتھی مرے مرے قدم اٹھا رہے تھے تاہم کھرانہ کی اپنی حالت نہایت دگرگوں تھی اور اس کی دونوں ٹانگیں خوف کی شدت سے بری طرح کانپ رہی تھیں۔

راہداری کے اختتام پر ایک کاریڈور واقع تھا اور کاریڈور کے سامنے تقریباً دو کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا پائیں باغ تھا جس میں مختلف اقسام کے پھول اور پھلدار درخت موجود تھے۔ کھرانہ اور اس کے ساتھی جیسے تیسے کاریڈور تک تو پہنچ گئے مگر وہاں پہنچ کر جب ان تینوں نے بنگش

کے چند ساتھیوں کی چھلنی لاشیں دیکھیں تو ان کی حالت غیر ہوگئی۔ پائیں باغ میں کچھ پولیس والے بھی موجود تھے جنہیں دیکھ کر کھرانہ ایک دم بوکھلا گیا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ بنگش نے چلا کر اسے رکنے کے لیے کہا مگر وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے سیدھا کاریڈور میں دوڑتا چلا گیا۔ معاً تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی اور بھاگتے ہوئے کھرانہ کے جسم میں ایک ساتھ کئی گولیاں پیوست ہوگئیں۔ وہ چلاتا ہوا برآمدے کے ایک ستون سے ٹکرایا اور پھر پختہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

پولیس فورس کے جوانوں کی اس فائرنگ نے کھرانہ کے دونوں ساتھیوں کو ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ پولیس فورس کے جوان کاریڈور میں پہنچتے بنگش بھی الٹے قدموں واپس راہداری میں بھاگ کھڑا ہوا، ریوالور اس نے بدستور ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ یہ طویل راہداری آگے جا کر کوٹھی کے عقبی جانب گھوم جاتی تھی۔ بنگش دوڑتے ہوئے موڑ گھوم گیا۔ راہداری کا یہ حصہ بھی سنسان پڑا ہوا تھا۔ اسے نہ کوئی پولیس والا اور نہ ہی اپنا آدمی نظر آیا۔ راہداری عبور کرنے کے بعد وہ کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ چند لمحے رک کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا، جب اسے کوئی غیر معمولی حرکت نظر نہ آئی تو وہ عقبی دیوار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ عقبی دیوار کی جڑ میں ایک سرنگ نما گزرگاہ موجود تھی جس کا دہانہ جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس سرنگ نما گزرگاہ کا اختتام کوٹھی سے دو فرلانگ دور ویران اور سنگلاخ پہاڑی چٹانوں میں ہوتا تھا۔

وہ ہانپتا ہوا سرنگ کے دہانے تک پہنچا اور پھر تیزی سے جھاڑیوں اور پودوں کو ہٹاتا ہوا سرنگ کے اندر داخل ہوگیا اندر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا مگر وہ جھکے جھکے انداز میں تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ تھوڑا دیر کے بعد وہ سرنگ کے بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ دروازہ پتھر کی ایک چٹان کو کاٹ کر کچھ ایسے انداز میں بنایا گیا تھا کہ باہر سے یہ بالکل کھردری سنگی چٹان معلوم ہوتا تھا البتہ اندر سے اسے کاٹ کر ہموار کر دیا گیا تھا۔ دائیں جانب دیوار میں ایک فولادی چرخی لگی ہوئی تھی۔ بنگش نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور جیب میں رکھا اور پھر فولادی چرخی کو پکڑ کر گھمانے لگا۔

سنگی چٹان معمولی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ دائیں جانب سرکنے لگی۔ جب چٹان مکمل طور پر ہٹ گئی تو بنگش نے دوبارہ ریوالور نکال لیا اور محتاط انداز میں چلتے ہوئے باہر آگیا۔

ابھی وہ اردگرد کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ معاً ایک چٹان کی آڑ سے پولیس فورس کے چند جوان نمودار ہوئے اور اسے ہینڈز اپ کرا دیا گیا۔ وہ خوف اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں پولیس والوں کی طرف دیکھ رہا تھا جن کی نگاہوں میں اس کے لیے تمسخر تھا۔



''خوش آمدید بنگش!'' اچانک اسے اپنی دائیں جانب سے ایس پی جمشید خان کی آواز سنائی دی اور وہ بوکھلا کر ایس پی کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے معلوم تھا بنگش!'' جمشید خان بولا۔ ''تم اسی راستے سے فرار ہونے کی کوشش کرو گے۔ اسی لیے تمہارے استقبال کے لیے میں خود بہ نفس نفیس یہاں موجود ہوں''۔

''اوہ......'' پہلے جھٹکے سے سنبھلتے ہی بنگش خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ایس پی جمشید خان۔ کرائم برانچ کا مایہ ناز آفیسر...... تمہاری ذہانت اور بہادری کی داد دینا پڑے گی مگر افسوس کہ تمہاری یہ ساری محنت اکارت جائے گی۔ تمہارا قانون مجھے ایک رات کے لیے بھی حوالات میں نہیں رکھ سکتا۔ ایسا تم کئی بار کر چکے ہو لیکن میرا بال بھی بیکا نہیں ہوا''۔

''اب نہ بال رہے گا اور نہ تم''۔ جمشید خان نے لبوں پر ذومعنی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''اس بار میں نے تمہیں حوالات کی بجائے کہیں اور بھیجنے کا انتظام کر رکھا ہے''۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' بنگش نے استہزائیہ انداز میں استفسار کیا۔ ''کیا تم مجھے اپنی قید میں رکھنے کے خواب دیکھ رہے ہو۔ کیا تم نے مجھے سڑک چھاپ غنڈہ سمجھ رکھا ہے؟''

''میں یہ بیوقوفی بھی نہیں کروں گا بنگش''۔ وہ بدستور ذومعنی انداز میں بولا۔ ''بلکہ میں کوئی اور پروگرام ترتیب دے کر آیا ہوں، تم سنو گے تو تمہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آئے گا''۔

''تم...... تم...... کیا کرنا چاہتے ہو؟'' اس بار بنگش نے متوحش انداز میں پوچھا۔

''ابھی تو میں نے تجھے کچھ بتایا ہی نہیں اور تمہاری زبان لڑکھڑانے لگی ہے''۔ جمشید خان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم تو خود کو کسی اور ہی جہاں کی مخلوق سمجھتے تھے، بڑے سورما بنے پھرتے تھے''۔

''کک...... کیا...... تم...... مجھے......؟'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جمشید خان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی کھلی آنکھوں سے موت کا خوف جھلک رہا تھا۔

''تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو بنگش!'' جمشید خان بولا۔ ''تمہارا چالان آخری عدالت میں بھیجا جائے گا۔ اس عدالت میں جہاں مجرم کا جرم دیکھا جاتا ہے حیثیت نہیں۔ جہاں ساری سفارشیں بیکار ہو جاتی ہیں چاہے سفارش کرنے والا کسی ملک کا حکمران ہی کیوں نہ ہو''۔

''نن...... نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے''۔ بنگش نے وحشت زدہ انداز میں کہا۔ ''تم نے اگر ایسا کر دیا تو...... تو تمہارے ساتھ بھی بہت برا ہوگا''۔

''میرے ساتھ جو بھی ہوگا وہ بعد کی بات ہے''۔ وہ بولا۔ ''بہرکیف تم وہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے''۔

''مم...... میرے ساتھ ڈیل کر لو''۔ بنگش نے فریادی انداز میں کہا۔ ''میں تجھے نوٹوں میں

تول دوں گا۔ بدلے میں تم مجھے گرفتار کر کے عدالت میں پیش کر دو"۔

"مجھے حرام کھانے کا شوق ہوتا تو یوں جان ہتھیلی پر لیے نہ گھوم رہا ہوتا"۔ اتنا کہنے کے بعد جمشید خان نے اسے ریوالور کے نشانے پر رکھ لیا۔

"پپ...... پپ...... پلیز"۔ بنگش نے گڑگڑا کر کہا۔ "مم...... مجھے...... مت مارو...... میں یہ ملک ہی چھوڑ دوں گا ہمیشہ کے لیے"۔

"ہونہہ...... یہ ملک"۔ وہ لبوں پر طنز سجاتے ہوئے بولا۔ "اسے ملک کب رہنے دیا ہے تم جیسی کالی بھیڑوں نے؟ جب سے یہ معرضِ وجود میں آیا ہے تب سے اسے تم جیسے لوگ دونوں ہاتھوں سے لوٹتے آ رہے ہیں اور جب وہ یہاں اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو یوں اسے چھوڑ دینے کی بات کرتے ہیں جیسے لباس تبدیل کرنے کی بات کر رہے ہوں اور بدقسمتی تو یہ ہے کہ ایسے غدار اور ننگِ ملک وملت لوگ عوام کی سادگی اور جہالت سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کے اونچے ایوانوں تک پہنچ کر ملک وقوم کی تقدیر کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ نہیں بنگش نہیں تمہیں زندہ چھوڑ کر میں اس ملک کے کروڑوں عوام کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتا"۔

"مم...... میں...... اپنا سب کچھ...... تمام دولت اور پراپرٹی تمہارے نام منتقل کر دوں گا...... مم...... مگر پلیز...... مجھے مت مارو"۔ بنگش نے گڑگڑا کر جواب دیا۔

"تم غلط سوچ رہے ہو بنگش"۔ وہ بولا۔ "میں بکاؤ نہیں ہوں۔ اوکے گڈ بائی"۔

اتنا کہہ کر وہ نپے تلے انداز میں بنگش کی طرف بڑھنے لگا۔

"نن...... نہیں"۔ بنگش حلق کے بل چلایا۔ "تم مجھے نہیں مار سکتے۔ نہیں مار سکتے۔ پلیز رک جاؤ پلیز"۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر ایک دم رک گیا۔ بنگش کا پھینکا ہوا ریوالور اس کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور جھک کر بنگش کا پھینکا ہوا ریوالور اٹھا لیا۔

"میں تیرا سیلف ڈیفنس میں ان کاؤنٹر کروں گا بنگش"۔ اتنا کہہ کر اس نے بنگش والا ریوالور سیدھا کیا اور پھر چشم زدن میں اپنے بائیں بازو پر گولی داغ دی۔ ایک دھماکے کے ساتھ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔

"مم...... مم...... میں"۔ بنگش نے گھگھیا کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر جمشید خان نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا اور چلا کر پولیس فورس کے جوانوں کو حکم دیا۔ "فائر......"

ایک ساتھ چار پانچ رائفلوں نے شعلے اگلے اور بنگش کے بدن میں کئی سوراخ ہو گئے۔ وہ



بنگش زمین پر گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔

===

زرولی اور اس کے ساتھیوں نے گاؤں کی گلی گلی میں گھوم کر اعلان کر دیا مگر گاؤں کے لوگوں نے اس اعلان کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا۔ سوائے چند لوگوں کے کوئی بھی کپڑا اور چاول لینے کے لیے خان کی حویلی میں نہ پہنچا۔ یہ صورتِ حال خان جی کے لیے نہ صرف تشویشناک بلکہ باعثِ سبکی بھی تھی۔ حویلی کے صحن میں چاولوں کی کئی بوریاں اور نئے کپڑے کے متعدد تھان رکھے ہوئے تھے۔ خان جی ایک کرسی پر بیٹھا زرولی اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو ان چند لوگوں میں کپڑا اور چاول تقسیم کر رہے تھے جو اعلان سن کر حویلی پہنچے تھے۔ تھوڑی دیر میں ان لوگوں کو فارغ کر دیا گیا۔ اب زرولی اور اس کے ساتھ کسی نئے آنے والے سائل کے منتظر تھے اور خان جی بے چینی کے عالم میں کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔

ایسے ہی وقت موسیٰ خان عجلت میں چلتا ہوا حویلی کے اندر سے نمودار ہوا اور خان جی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔

"خان جی؟" وہ بلاتمہید بولا۔ "ایک اور بری خبر موصول ہوئی ہے۔ بنگش اور اس کے کئی ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں۔ نیلی کوٹھی سے پولیس نے بہت سا غیر ملکی اسلحہ اور منوں کے حساب سے منشیات برآمد کر لی ہے۔ دو انڈین اسمگلر زندہ اور دو مردہ حالت میں پولیس کو نیلی کوٹھی سے ملے ہیں"۔

"موسیٰ خان!" خان جی ایک سرد آہ خارج کرتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے بدقسمتی نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ بنگش ہمارا دایاں ہاتھ تھا۔ اب نہ جانے کیا ہو گا؟"

"خان جی! ہاتھ میں بندوق ہو تو بدقسمتی انسان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی"۔ موسیٰ خان نے کہا۔ "بنگش مرا ہے ناں...... موسیٰ خان تو ابھی زندہ ہے ناں؟ آپ حکم دے کر تو دیکھیں میں آپ کے دشمنوں کا نام ونشان مٹا دوں گا"۔

"موسیٰ خان!" وہ بولا۔ "آج کل ہمیں لوگوں کی ہمدردی اور حمایت کی ضرورت ہے۔ لوگوں کے دل جیت کر ہی الیکشن جیتا جا سکتا ہے۔ بندوق دکھا کر ہم لوگوں سے ووٹ حاصل نہیں کر سکتے۔ تم ہر بات کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہو جب کہ موجودہ حالات طاقت کی بجائے مصالحت کے متقاضی ہیں"۔

"خان جی! میں سب سمجھتا ہوں مگر"۔ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"مگر کیا؟" خان نے استفسار کیا۔

"آپ چاہیں تو مولوی کے جلسے کو ناکام بنانے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیسے؟" خان جی نے پوچھا۔

"وہ میرا کام ہے خان جی کہ کیسے جلسے کو ناکام بنانا ہے۔ آپ بس اجازت دے دیں"۔ اس نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "میں زرولی اور دوسرے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر جاتا ہوں اور منٹوں میں......"

"خون خرابا کرنا چاہتے ہو؟" خان جی نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہم خالی ہاتھ جائیں گے خان جی"۔ وہ بولا۔ "گولی چلائے بغیر بھی اس جلسے کو ناکام بنایا جا سکتا ہے"۔

"گولی بے شک نہ چلے لیکن مار پیٹ تو کرو گے ناں؟" خان جی نے کہا۔ "نہیں ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس طرح تو ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی"۔

"خان جی!" وہ اصرار کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارا مقصد جلسے کو ناکام بنانا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جلسے میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کا سارا الزام ہم پر آئے گا مگر مخالف پارٹی کا بھی کچھ کم نقصان نہیں ہوگا"۔

"ان کا بھلا کیا نقصان ہوگا؟" خان جی نے استفسار کیا۔

"وہ علاقے کے لوگوں کے سامنے اپنا منشور بیان نہیں کر سکیں گے۔ انہیں سبز باغ نہیں دکھا سکیں گے۔ ان ترقیاتی منصوبوں کا نام نہیں لے سکیں گے جو ہمیشہ کاغذوں سے شروع ہو کر کاغذوں میں ہی پایۂ تکمیل تک پہنچتے رہتے ہیں"۔ موسیٰ خان نے تفصیل بتاتے ہوئے جواب دیا۔

"اور جو ہماری بدنامی ہوگی"۔ خان جی بولا۔ "اس کے متعلق کیا سوچا ہے تم نے؟"

"آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا خان جی! کہ آپ الیکشن جیتنے کے لیے تجوریوں کے منہ کھول دیں گے"۔ وہ بولا۔ "ہم آج رات سے ہی لوگوں کو خریدنے کا کام شروع کر دیں گے"۔

"اوکے موسیٰ خان"۔ وہ رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "جو مناسب سمجھتے ہو کرو، بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ الیکشن سے پہلے کوئی خون خرابا نہیں ہونا چاہیے"۔

"ایسا ہی ہوگا خان جی"۔ اس نے پُرمسرت انداز میں جواب دیا اور پھر زرولی اور اس کے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا جو فارغ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔

===

جلسہ گاہ کھچا کھچ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک چبوترے پر آٹھ دس کرسیاں، تین صوفہ سیٹ اور ڈائس بورڈ سجا ہوا تھا۔ چبوترے سے نیچے گاؤں کے لوگ ترتیب میں لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے



جلسہ شروع ہونے کے منتظر تھے۔ جلسے کی کارروائی ابھی تک شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے لوگ ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول تھے۔ موسیٰ خان اور اس کے ساتھی درمیانی رو میں کرسیوں پر براجمان تھے۔ موسیٰ خان سرگوشیوں میں ان سے باتیں کر رہا تھا اور وہ سب تائیدی انداز میں سر ہلا رہے تھے۔ زرولی کی جیب میں غلیل موجود تھی۔ اسی غلیل کے ذریعے وہ جلسہ گاہ میں ہنگامہ برپا کرنا چاہتے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد مولوی نصیب اللہ، امین خان اور اس کے ساتھیوں کی معیت میں جلسہ گاہ داخل ہوا اور لوگوں نے اس کے حق میں نعرے لگانا شروع کر دیے۔ جلسہ گاہ جمال خٹک، امین خان اور مولوی نصیب اللہ "زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی۔ لوگ غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر موسیٰ خان اور اس کے ساتھی چہروں پر نفرت سجائے دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ جلسہ گاہ میں موجود تمام لوگوں کو گولیوں سے بھون ڈالتے۔

جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے کیا گیا۔ اس کے بعد امین خان نے لوگوں سے مختصر سا خطاب کیا اور پھر مولوی نصیب اللہ کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔ بے تحاشا تالیوں کی گونج میں وہ اسٹیج پر پہنچا اور ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کے نعروں کا جواب دینے لگا۔ چند لمحوں کے بعد جب جلسہ گاہ میں خاموشی چھا گئی تو وہ باقاعدہ تقریر کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔ "سب سے پہلے میں معزز حاضرین کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں اور یہاں موجود تمام لوگوں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ باقاعدہ تقریر کا آغاز کرنے سے پیش تر میں حاضرین پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا کبھی کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رہا ہے اور نہ ہی میں اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار بن سکتا ہوں۔ میں اگر شہر شہر اور گاؤں گاؤں گھوم رہا ہوں تو صرف آپ جیسے لوگوں کے مفاد اور فلاح و بہبود کے لیے آپ کو آپ کا جائز حق دلانے کے لیے......آپ کے دیرینہ مسائل حل کرنے کے لیے میں گزشتہ تین ماہ سے شب و روز اپنا آرام و سکون قربان کرتے ہوئے شہر شہر گھوم رہا ہوں۔ پارٹی لیڈر سے میں نے زبانی کلامی نہیں بلکہ حلفیہ معاہدہ لیا ہے۔ پکا اقرار نامہ لکھوایا ہے۔ جانتے ہو کس لیے؟" ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے جواب طلب انداز میں حاضرین کی طرف دیکھا اور پھر ڈائس بورڈ پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "محض آپ لوگوں کے لیے آپ کے علاقے کی ترقی کے لیے۔ ہسپتال، سکولز اور ان جیسی دیگر سہولیات کا مطالبہ کیا ہے میں نے"۔

حاضرین نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے دوبارہ تالیاں بجانا اور "مولوی نصیب اللہ زندہ باد" کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔

''مجھے آپ کے نعروں اور تالیوں کی ضرورت نہیں ہے میرے بھائیو!'' وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہوں ایک بے مایہ سا انسان ہوں۔ یہ سہولتیں آپ لوگ اپنے ووٹ کی طاقت سے حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ کب تک ان نام نہاد سیاسی بازی گروں کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلتے رہیں گے جو ہمیشہ آپ کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار کی کرسیوں تک تو پہنچ جاتے ہیں مگر وزارت ملتے ہی آپ لوگوں کو برے سپنے کی طرح فراموش کر دیتے ہیں۔ ووٹ آپ لوگوں کے پاس ایک امانت ہے اور یہ امانت کسی محبِ وطن اور ایماندار شخص کو سونپنا آپ کی قومی ذمہ داری ہے۔ ووٹ اسے سونپئے جو کل کسی مشکل وقت میں آپ کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو سکے۔ آپ لوگوں کے دکھ درد بانٹ سکے، آپ کے مسائل حل کرنے کے لیے اپنی نیند اور آرام وسکون کی قربانی دے سکے۔ جاگو میرے بھائیو جاگو۔ آپ عوام ہیں اور عوام ہی طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ کب تک غفلت کی نیند سوتے رہو گے؟ آج قسمت کے گھوڑے کی باگ آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے...... کل اگر یہ باگ آپ کی غفلت کی وجہ سے کسی بے ایمان اور لٹیرے کے ہاتھوں میں آ گئی تو آپ کے مقدر کی تیرگی کبھی نہیں چھٹ سکے گی۔ آپ یونہی اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ جاگو کہ یہ وقت لوٹ کر پھر نہیں آئے گا۔ اپنے ووٹ کی طاقت سے اپنا مقدر بدل دو۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں، مجھے کسی ناموری اور شہرت کی ضرورت نہیں ہے''۔

''مولوی صاحب زندہ باد''۔ ایک جوشیلے نوجوان نے اٹھ کر نعرہ لگایا تو بہت سے لوگ اس کی تائید کرتے ہوئے نعرے لگانے لگے۔

ایسے ہی وقت جب تمام لوگ اسٹیج کی طرف متوجہ تھے اور مولوی صاحب ہاتھوں کے اشارے سے انہیں خاموش کرانے کی کوشش کر رہے تھے، موسیٰ خان نے زرولی کو مخصوص اشارہ کر دیا۔ زرولی نے لوگوں کی نگاہیں بچاتے ہوئے جیب سے غلیل نکالی اور اس کے چلے میں غلیلہ چڑھا کر مولوی صاحب کا نشانہ لے کر داغ دیا۔ غلیلہ سیدھا جا کر مولوی صاحب کے دائیں کندھے پر لگا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی کراہ نکلی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جھک کر وہ غلیلہ اٹھا لیا۔

''براہِ مہربانی آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں اور شور نہ کریں''۔ وہ تقریر جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پہلے ہی آپ لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ مجھے زندہ باد کے نعروں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ''۔

''ووٹوں کی ضرورت ہے''۔ زرولی نے چلا کر قطع کلامی کی۔ غلیل وہ پہلے ہی جیب میں رکھ چکا تھا۔

''جذباتی تقریر کر کے لوگوں کو بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو''۔ زرولی کی تائید میں موسیٰ



خان نے اُٹھ کر کہا۔

''جس جمال خٹک کے لیے تم ان سادہ دل لوگوں کو ورغلا رہے ہو، وہ یہاں سے بہت دور ور شہر میں رہتا ہے۔ وہ بھلا اس علاقے کی ترقی کے لیے کیا کر سکتا ہے؟''

''یہ غلیلہ تم لوگوں نے مارا ہے ناں؟'' مولوی صاحب نے اسے خاطر میں نہ لاتے استفسار کیا۔

''موسیٰ خان! ایسے ہتھ کنڈوں سے تمہارا خان جی معصوم لوگوں کی ہمدردیاں حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اب جاگ چکے ہیں سچ جھوٹے کی پہچان ہو چکی ہے انہیں۔ ہار اب تیرے خان جی کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ کوئی بھی غلط حرکت کرنے سے قبل یہ سوچ لینا کہ یہاں وڈیو کیمرے لگے ہوئے ہیں اور جلسے کی باقاعدہ وڈیو فلم بن رہی ہے''۔

لوگ پلٹ پلٹ کر موسیٰ خان اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ لوگوں کی آنکھوں میں ان کے لیے تعجب کی بجائے نفرت نظر آ رہی تھی۔

''مارو ان فسادیوں کو''۔ ایک جوشیلا نوجوان چلا کر بولا۔ ''یہ دشمن ہیں مولوی صاحب کے''۔

''ہاں...... ہاں...... مارو انہیں''۔ کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں اور پھر لوگ موسیٰ خان اور اس کے ساتھیوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بھرے ہوئے لوگوں نے لمحوں میں مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔

بڑی مشکل سے امین خان نے اس کی گلوخلاصی کرائی اور وہ چاروں گرتے پڑتے جلسہ گاہ سے نکل گئے۔ اس کے بعد جلسے کی کارروائی پھر سے شروع کر دی گئی۔

•:• ===•:• ===•:•

ابراہیم بنگش کے ان کاؤنٹر پر وقتی طور پر جو ہنگامہ کھڑا ہوا تھا وہ نیلی کوٹھی سے برآمد ہونے والے ملکی و غیر ملکی اسلحے، منشیات کے ذخیرے اور انڈین اسمگلروں کے گرفتار ہونے کی وجہ سے چند دنوں میں ہی دب گیا تھا۔ آئی جی صاحب نے اپنے طور پر ایس پی جمشید خان کی کھنچائی کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے خلاف باقاعدہ کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ بڑی واضح تھی ایک تو جمشید خان نے سیلف ڈیفنس کو جواز بنا لیا اور دوسرا خان جی کے سیاسی حریف جمال خٹک نے بھی بھرپور انداز میں اس کی حمایت کی تھی۔

جمال خٹک نے ایس پی جمشید خان کے اس کام کو نہ صرف سراہا تھا بلکہ آئندہ کے لیے اسے ہر ممکن امداد کی پیشکش بھی کی تھی۔ ''ایس پی صاحب!'' جمال خٹک نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ کو کسی سے بھی دبنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں، میرے ہوتے

ہوئے کوئی اوپر والا چاہے وہ آپ کے محکمے سے ہو یا صوبائی اسمبلی کا کوئی رکن ہو آپ سے جواب طلب نہیں کر سکتا۔ بنگش جیسے دیگر ملک دشمنوں کا خاتمہ کرنے کے لیے میں ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہوں''۔

''خنک صاحب!'' وہ بغیر لگی لپٹی کے بولا۔''میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور آپ کے جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں مگر آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بنگش صرف ایک مہرہ تھا گو کہ اس شہر میں اس کی دہشت کے ڈنکے بجتے رہے ہیں، وہ برسوں اس شہر میں من مانی کرتا رہا، کئی بار اس نے خون کی ہولی بھی کھیلی لیکن کیا وہ اکیلا یہ سب کچھ کر سکتا تھا؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس کی پشت پر کون تھا؟''

''اچھی طرح جانتا ہوں ایس پی صاحب!'' اس نے کہا۔''سردار فراست علی خان کو کون نہیں جانتا؟ اب بھی وہ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی یہ بادشاہت عن قریب اختتام پذیر ہونے والی ہے، بس الیکشن ہو لینے دیجیے پھر دیکھنا وہ کیسے قانون کے شکنجے میں پھنستا ہے؟ میں ابھی تک اپنے بڑے بھائی افضال خنک کے قتل کو بھولا نہیں ہوں''۔

''جناب! آپ جیسے محب وطن لیڈر کو ذاتی دشمنی سے بالاتر ہو کر سوچنا چاہیے''۔ جمشید خان بولا۔''اس نے سینکڑوں بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ وہ اس ملک کی سلامتی اور ترقی کا دشمن ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ بنگش کی نیلی کوٹھی سے نہ صرف انڈین اسلحہ برآمد ہوا ہے بلکہ چار انڈین اسمگلر بھی ہمارے ہاتھ لگے ہیں جن میں سے دو مردہ حالت میں ملے ہیں''۔

''ڈونٹ وری''۔ اس نے کہا۔''میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ انڈین سمگلروں پر یہیں کی عدالت میں مقدمہ چلا جائے''۔

''ہمارے حکام شاید ایسا نہ ہونے دیں''۔ جمشید خان نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔''ان کے دماغ میں ہمہ وقت انڈیا سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کا سودا سمایا رہتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ رُوئے زمین پر وہ ہمارا بدترین دشمن ہے۔ اس نے آج تک دل سے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ وہاں کی جیلوں میں ہمارے کتنے ہی بدقسمت قیدی غیر انسانی تشدد کا نشانہ بن کر آئے دن جان سے گزرتے رہتے ہیں''۔

''ہم حکمرانوں کی سرشت تبدیل نہیں کر سکتے''۔ وہ بولا۔''تاہم اپنی پوری کوشش کریں گے اور بہ غرض محال اگر ہم انڈین قیدیوں پر یہاں مقدمہ نہ بھی چلا سکے تب بھی ان کے بدلے انڈیا سے اپنے دو قیدی تو رہا کرا ہی لیں گے''۔



''ٹھیک ہے خنک صاحب! آپ اگر میرے ساتھ ہیں تو میں اس شہر سے جرم کا نام و نشان تک مٹا دوں گا''۔ جمشید خان نے پُرعزم انداز میں کہا اور جمال خنک پھر ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

•:•===•:•===•:•

صفیہ رحمان مہینوں سے جمشید خان کی کوٹھی میں گھر کے فرد کی طرح رہ رہی تھی۔ بیگم سلطانہ خان دل ہی دل میں اسے اپنی بہو تسلیم کر چکی تھی مگر جمشید خان کسی طرح شادی کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر شہناز بھی کچھ عرصے سے وہیں مقیم تھی چنانچہ جمشید خان کی گونگی بہن میمونہ اور صفیہ رحمان سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ صفیہ رحمان اور ڈاکٹر شہناز ایک دوسرے پر اپنے دل کا حال عیاں کر چکی تھیں مگر دونوں کے محبوب غالباً لطیف جذبات سے عاری تھے اس لیے اظہار محبت کرنے میں تردد سے کام لے رہے تھے۔

صفیہ رحمان تو ویسے بھی جمشید خان کے احسانوں تلے دبی ہوئی تھی کیوں کہ جمشید خان کی کوششوں سے نہ صرف اسے اپنے ماں باپ کی تمام پراپرٹی واپس مل گئی تھی بلکہ ان کے قاتلوں کو بھی قرار واقعی سزا مل چکی تھی۔ اس کے چچا شوکت حسین نے بڑی پلاننگ سے اپنے بھائی اور بھابی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اپنے ریکارڈ شدہ اقبالی بیان میں شوکت حسین نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے ان کی گاڑی کے بریک فیل کر دیے تھے، ایکسیڈنٹ ہوا نہیں تھا بلکہ کرایا گیا تھا۔ اس جرم میں شوکت حسین اور اس کے بیٹے آصف کو دس دس سال کی قید با مشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔

شوکت حسین کے اقبالی بیان سے یہ بات بھی واضح ہوئی تھی کہ آصف زرینہ کی ناجائز اولاد تھا، وہ زرینہ کے دیرینہ آشنا دلبر خان کا بیٹا تھا۔ بیٹے اور شوہر کے جیل چلے جانے کے بعد زرینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ صفیہ رحمان کے خونی رشتہ داروں میں اب صرف اس کا چچا شوکت حسین ہی باقی رہ گیا تھا مگر وہ بھی لمبے عرصے کے لیے جیل میں تھا۔ ویسے وہ آزاد بھی ہوتا تو صفیہ رحمان اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہ ہوتی۔ ماں باپ کے قاتل سے بھلا وہ کیسے رشتہ قائم رکھ سکتی تھی؟

صفیہ رحمان نے اپنا سب کچھ ہی مسز سلطانہ خان کو سمجھ رکھا تھا، اس گھر میں اسے بیٹی کا ہی پیار ملتا تھا اور اس گھر کی بہو بننا اس کی خوش قسمتی تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ جمشید خان چالیس سال کا ہونے کے باوجود فی الحال شادی کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اگر بات یہیں تک محدود رہتی تو صفیہ بخوشی وہاں رہ سکتی مگر جمشید خان تو اب اس سے کترانے لگا تھا۔ ڈاکٹر شہناز سے اپنی دوستی کی یہ اداسی نہ دیکھی گئی

اور اس نے جمشید خان کو راہِ راست پر لانے کے لیے ایک پلان تیار کر لیا اور موقع ملتے ہی صفیہ رحمان کے گوش گزار کر دیا۔

''نہیں شہناز!'' اس کا پلان سن کر صفیہ رحمان نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ڈرامہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ اس سے بات مزید بگڑ جانے کا خطرہ ہے''۔

''دیکھو صفیہ!'' ڈاکٹر شہناز سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''اگر جمشید خان واقعی تم سے پیار کرتا ہے تو مطمئن رہو بات بالکل نہیں بگڑے گی بلکہ بنے گی۔ کیا تجھے مجھ پر یقین نہیں ہے؟''

''مجھے تم پر یقین ہے'' اس نے کہا۔ ''البتہ اپنی بدقسمتی سے ڈر لگتا ہے۔ تم جانتی ہو میں اپنی جان سے جانا گوارہ کر سکتی ہوں لیکن جمشید کی نگاہوں سے گرنا مجھے گوارہ نہیں ہے''۔

''میری بہن! تم مرد کی فطرت سے واقف نہیں ہو'' شہناز بولی۔ ''اس (مرد) میں عورت سے کہیں زیادہ جیلسی ہوتی ہے۔ میں تجھے گارنٹی دیتی ہوں تم چند دنوں کے لیے یہ ڈرامہ پلے کر کے تو دیکھو جمشید خان شادی کرنے میں ایک دن کی تاخیر کرنا بھی گوارہ نہیں کرے گا''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن سلطانہ آنٹی کیا کہے گی؟'' اس نے نئے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں اس سے نگاہیں ملا پاؤں گی؟ وہ کب سے مجھے بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی ہے، اسے جب یہ بات معلوم ہو گی تو اسے کتنا صدمہ پہنچے گا، وہ کیا سوچے گی میرے بارے میں؟''

''اگر ایسا کچھ ہوا تو بے فکر رہو میں تمام الزام اپنے سر لے لوں گی'' وہ بولی۔ ''تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی میں وعدہ کرتی ہوں سب سنبھال لوں گی۔ کہو تو جہانداد کو بھی اس ڈرامے میں شامل کر لیتے ہیں''۔

''نہیں نہیں اسے رہنے دو'' صفیہ بوکھلا کر بولی اور ڈاکٹر شہناز کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اسی روز شام سے تھوڑی دیر قبل ایک خوبرو نوجوان جو موٹر بائیک پر سوار تھا، جمشید خان کی کوٹھی کے سامنے پہنچا اور موٹر بائیک سے اتر کر ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔

===

جلسہ گاہ میں اپنے ساتھیوں سمیت مار کھانے کے بعد موسیٰ خان بپھرا ہوا تھا اور اپنی اس بے عزتی کا بدلہ فی الفور لینے پر تلا ہوا تھا۔ جبکہ خان جی اس بات کے حق میں نہیں تھا اور موسیٰ خان کو صبر سے کام لینے کی تلقین کر رہا تھا۔

''دیکھو موسیٰ خان!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''تمہاری بے عزتی ہماری بھی بے عزتی ہے مگر بدلہ لینے کے لیے یہ وقت ناموزوں ہے۔ تم جانتے ہو کہ چند روز کے بعد الیکشن ہونے والے ہیں۔ ہم بہت مصروف ہیں۔ اس دوران اگر تم نے کوئی خون خرابہ کر دیا تو ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے''۔



''خان جی! میں آپ کا غلام ہوں'' موسیٰ خان بولا۔ ''آج تک آپ نے جو کہا میں نے کیا لیکن اب صبر کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ زندگی میں پہلی بار میری اس قدر بے عزتی ہوئی ہے۔ میں نے اگر جوابی قدم نہ اٹھایا تو زندہ درگور ہو جاؤں گا۔ اتنی بے عزتی کے بعد مجھے تو اب سانس لینا بھی دوبھر لگتا ہے۔ پلیز آپ مجھے اجازت دے دیں''۔

''نہیں موسیٰ خان!'' اس نے کہا۔ ''ناممکن ہے ہم تجھے الیکشن سے پہلے کسی انتقامی کارروائی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ الیکشن کے بعد ہم خود تمہارا ساتھ دیں گے''۔

''خان جی! یہ دیکھو'' موسیٰ خان اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اگر آپ زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو اجازت دینا ہی پڑے گی''۔

''موسیٰ خان! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو'' خان جی نے چلا کر کہا۔ ''ہمارا سیاسی کیریئر داؤ پر لگا ہے اور تمہیں اپنی بے عزتی کی پڑی ہوئی ہے۔ کیا تمہاری عزت ہمارے سیاسی مستقبل سے زیادہ اہم ہے؟''

''ہاں خان جی! زیادہ اہم ہے'' اس نے جواب دیا۔

''کیا بک رہے ہو؟'' خان جی حلق کے بل دھاڑا۔ ''تم ہوش میں تو ہو؟ تمہاری عزت ہماری عزت سے اہم کب سے ہو گئی ہے؟ تم...... تم گندی نالی کے کیڑے تھے۔ ہم نے تجھے پال کر اس قابل بنایا، تجھے تعلیم دلائی، کیا اس لیے کہ تم ہمیں ہی آنکھیں دکھانے لگو؟ تمہارا حرامی باپ تو تم ماں بیٹے کو مرنے کے لیے یہاں چھوڑ گیا تھا، اس وقت اگر ہم تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہیں آسرا نہ دیتے تو آج تم ماں بیٹا کہاں ہوتے۔ جانتے ہو ہمارا سماج لاوارث جوان عورتوں کو کہاں پہنچا دیتا ہے؟ نہیں معلوم تو ہم بتا دیتے ہیں کہ آج تمہاری ماں کہاں ہوتی، وہ......''

''پلیز...... پلیز خان جی!'' موسیٰ خان نے التجائیہ انداز میں قطع کلامی کی۔ ''آپ...... آپ ...ہا نہ کہیں، میں آپ کا غلام ہوں۔ نمک کھایا ہے میں نے آپ کا۔ آپ مائی باپ ہیں میرے۔ پلیز میری ماں کے بارے میں آپ کوئی بات نہ کریں۔ میں...... میں آپ کے......''

''کیوں نہ کروں؟'' خان جی نے زہریلے انداز میں اس کی بات کاٹی۔ ''تمہاری ماں کون نیک پروین تھی۔ شادی سے قبل تمہارے باپ کے علاوہ بھی کئی لوگوں سے اس کا یارانہ تھا۔ جوانی میں لوگ اسے مردخور عورت کہتے تھے اور......''

''بس خان جی! خدا کے لیے'' موسیٰ خان چلایا۔ ''اس غلام کو غلام ہی رہنے دیں۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں آپ کے سامنے۔ پلیز گڑے مُردے مت اکھاڑیئے سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے''۔

''تم حرامی ہو حرامی موسیٰ خان!'' خان جی بدستور اسی انداز میں بولا۔''ہم اگر بیچ میں پڑ کر فوراً تمہاری ماں کی شادی نہ کرواتے تو اس نے بن بیاہی ماں بن جانا تھا، اور لوگ آج تجھے موسیٰ خان نہیں بلکہ......''

''بس فراست علی خان بس''۔ موسیٰ خان نے چیختے ہوئے کہا۔''اب اگر تم نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں تجھے کاٹ ڈالوں گا''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ جنونی انداز میں آگے بڑھا۔

''وہیں رک جاؤ حرام کے پلے!'' خان جی نے اچانک ریوالور نکال کر اس پر تانتے ہوئے کہا۔''تم......فراست علی خان کے ٹکڑے کرو گے؟ تمہاری یہ جرأت......گندی نالی کے حقیر کیڑے! آج میں تجھے بتاؤں گا کہ ٹکڑے کیسے کیسے جاتے ہیں؟''

اتنا کہنے کے بعد خان جی نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔

---



ایک دھماکا ہوا اور گولی موسیٰ خان کے بائیں کندھے میں پیوست ہوگئی۔ دوسرا فائر ہونے سے قبل ہی اس نے جست لگائی اور صوفے کے پیچھے غائب ہوگیا۔ خان جی نے طیش کے عالم میں دو گولیاں صوفے پر داغ دیں جو صوفے کی دبیز تہہ میں غائب ہوگئیں۔

''باہر نکل کر سامنے آ گندی نالی کے حقیر کیڑے!'' غصے کے مارے اس کے منہ سے کف اُڑ رہی تھی اور وہ موسیٰ خان کو ایسی ایسی گندی گالیاں دے رہا تھا جو اس سے قبل موسیٰ خان نے نہیں سنی تھیں۔

''ہمیں معلوم ہوتا کہ تم یوں نمک حرام نکلو گے تو ہم بچپن میں ہی تیرا گلا کاٹ کر تیری ماں کو کسی کوٹھے پر بٹھا دیتے''۔

وہ گالیاں دیتا ہوا محتاط انداز میں اس صوفے کی طرف بڑھنے لگا جس کے عقب میں موسیٰ خان چھپا ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ موسیٰ خان صوفے کی آڑ میں آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار اسے خالی ہاتھ ہونے کا افسوس ہو رہا تھا لیکن یہ وقت افسوس کی بجائے عمل کا تھا۔ اس کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اب تک وہ نہایت درندگی کے ساتھ دوسروں کو موت کے گھاٹ اتارتا آیا تھا، آج اپنی باری آئی تھی تو اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

خان جی کو معلوم تھا کہ موسیٰ خان خالی ہاتھ ہے لیکن پھر بھی وہ انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا، ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موسیٰ خان لومڑی سے زیادہ عیار اور بھیڑیے سے کہیں بڑھ کر خونخوار ہے۔ اس نے خود اس کی تربیت کی تھی اس لیے اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

صوفے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا اور پھر قدرے آگے کی طرف جھک کر صوفے کے عقب میں جھانکنے لگا۔ صوفے کے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا، موسیٰ خان تیزی سے کرالنگ کرتا ہوا دوسرے صوفے کے عقب میں جا چھپا تھا۔ کمرے میں نیم دائرے کے انداز میں

صوفے بچھے ہوئے تھے اور فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا اس لیے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی پوزیشن سے آگاہ نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم جیسا وہ کمرہ ضرورت سے زیادہ کشادہ تھا مگر اس میں دروازہ صرف ایک ہی تھا جو کاریڈور میں کھلتا تھا۔ صوفے کمرے کے وسط میں بچھے ہوئے تھے اس لیے کمرے کا دروازہ وہاں سے آٹھ دس قدموں کے فاصلے پر واقع تھا۔ موسیٰ خان کی نگاہیں کمرے کے نیم وا دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ جان کا رسک لے کر وہ یہ فاصلہ طے کر سکتا تھا مگر خان جی کی پوزیشن سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ کشمکش کا شکار تھا۔ اندھا دھند دروازے کی طرف دوڑ کر وہ اپنی جان گنوانے کے حق میں نہیں تھا۔

''گیدڑ کی اولاد! کہاں چھپ گیا ہے؟'' خان جی نے چلا کر کہا۔ ''سامنے آ تیری ماں کی......''

اس نے نہایت ہی گندی گالی دی تھی۔ موسیٰ خان خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ خان جی گالیاں بکتا ہوا دوسرے صوفے کی جانب بڑھا، اس دوران موسیٰ خان کرالنگ کرتا ہوا صوفوں کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ اب کمرے کا دروازہ اس سے چند قدم دور رہ گیا تھا۔ ایک سیکنڈ میں اس نے فیصلہ کیا اور پھر صوفے کے عقب سے نکل کر دروازے کی طرف بھاگا لیکن شاید آج قسمت اس سے مذاق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دروازے سے ایک قدم دور ہی تھا کہ معاً دروازے میں زرولی نمودار ہوا ایک دھماکے سے وہ دونوں ٹکرائے اور زرولی کے منہ سے چیخ کی آواز نکل گئی۔ خان جی نے پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا اور پھر ریوالور سیدھا کرتے ہوئے زرولی سے مخاطب ہوا۔ ''زرولی! اسے پکڑ لو یہ نمک حرام ہے''۔

موسیٰ خان زرولی کے اوپر پڑا ہوا تھا اور ان دونوں کے آدھے دھڑ کمرے کے اندر اور آدھے باہر کاریڈور میں تھے۔ پھر اس سے قبل کہ زرولی معاملے کی تہہ تک پہنچتا موسیٰ خان نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے زرولی کو اٹھا کر کمرے کے اندر اچھال دیا۔ خان جی جو نہایت ہی غیظ و غضب کے عالم میں آگے بڑھ رہا تھا، زرولی کے اڑتے ہوئے بدن سے ٹکرایا اور ایک کراہ کے ساتھ پشت کے بل قالین پر گر پڑا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ اس دوران موسیٰ خان دوڑتا ہوا دور نکل گیا۔

خان جی زرولی کو گالیاں دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور ریوالور اٹھا کر باہر کی طرف لپکا۔ برآمدہ خالی پڑا ہوا تھا اور موسیٰ خان غائب تھا۔

''بھاگ گیا کتیا کا بچہ''۔ وہ واپس کمرے میں گھستے ہوئے بولا۔ ''جاؤ گل شیر خان اور زیبا



خان کو ساتھ لے کر اسے تلاش کرو۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا''۔

''خا...... خان جی...... اس نے...... کیا کیا ہے؟'' زرولی نے متحیر انداز میں اٹک اٹک کر سوال کیا۔

''تیری ماں کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اس نے''۔ خان جی نے گرج کر کہا اور پھر زرولی کے رخسار پر ایک طمانچہ جڑتے ہوئے بولا۔ ''جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔ وہ حرام زادہ اگر نکل گیا تو میں تم سب کو زمین میں زندہ گاڑ کر کتے چھوڑ دوں گا''۔ غصے کے عالم میں خان جی ہمیشہ ''ہم'' کا صیغہ بھول کر خود کو ''میں'' پکارنے لگتے تھے۔

''اچھا...... اچھا خان جی......'' زرولی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا کر کہا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔



جمشید خان نے ناشتہ کرتے ہوئے وال کلاک پر نگاہ ڈالی تو دس بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ اس نے جلدی جلدی ناشتہ ختم کیا اور پھر آفس کے لیے نکل پڑا۔ آج وہ معمول سے ہٹ کر پورا ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا اس لیے ناشتہ اسے اکیلے کرنا پڑا تھا۔ باقی کے لوگ کب کے ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ گاڑی کی ''کی رِنگ'' کو وہ انگلی میں گھماتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر نکلا اور کاریڈور میں تیز تیز چلتے ہوئے پورچ کی جانب بڑھنے لگا۔ پورچ کاریڈور کے آخری سرے پر واقع تھا۔ چلتے چلتے اچانک اس کی نگاہ گارڈن کی طرف اٹھی اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ گارڈن میں ڈاکٹر شہناز اور صفیہ رحمان کے ساتھ کوئی اجنبی نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ جس سے وہ دونوں یوں گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں جیسے وہ اس گھر کا کوئی فرد ہو۔

ایک لحہ برآمدے میں رکنے کے بعد وہ گارڈن کی طرف بڑھ گیا۔

''آئیے آئیے سر!'' جمشید خان کو دیکھتے ہی ڈاکٹر شہناز مسکرا کر بولی۔ ''ان سے ملئے۔ یہ میرے کزن صفدر صاحب ہیں۔ کل شام ہی کراچی سے تشریف لائے ہیں۔ آپ شاید گزشتہ رات دیر گئے گھر پہنچے تھے اس لیے ان کی ملاقات آپ سے نہ ہو سکی''۔

جمشید خان نے گرم جوشی سے صفدر کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''صفدر صاحب مجھے افسوس ہے کہ میں گزشتہ رات آپ کو کمپنی نہ دے سکا''۔

''کوئی بات نہیں ہے جمشید صاحب!'' صفدر مسکراہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''مجھے صفیہ جی اور شہناز نے بہت اچھی کمپنی دی ہے۔ خاص کر صفیہ جی تو بہت دلچسپ باتیں کرتی ہیں، وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا''۔ صفدر کا جواب سن کر اس نے چونک کر صفیہ کی طرف دیکھا مگر وہ صفدر

کی طرف متوجہ تھی اس نے جمشید خان کی موجودگی کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔

''بالکل صفدر صاحب!'' وہ زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ''صفیہ جی لاجواب ہیں، کسی کو بھی پہلی ملاقات میں گرویدہ بنا لینے کا ہنر جانتی ہیں یہ''۔

''ارے یہی تو میں بھی کہنا چاہتا تھا''۔ صفدر نے ایک بھرپور نگاہ صفیہ کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کہ صفیہ جی بہت ہی متاثر کن شخصیت کی مالک ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ان سے برسوں کی آشنائی ہو۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ صفیہ جی اس گھر کی ایک فرد ہیں''۔

''تم بھول رہے ہو صفدر بھائی!'' ڈاکٹر شہناز مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ صفیہ اس گھر میں تمہاری طرح صرف ایک مہمان ہیں...... دراصل''۔

''اوہ...... آئی سی......'' صفدر نے حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شہناز کی بات کاٹی۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ شاید صفیہ جی جمشید صاحب کی کوئی کزن وغیرہ ہوں گی اور...... اور...... وہ کیا کہتے ہیں؟ ان کی آپس میں کوئی...... کوئی''۔

''اوہ...... نو...... صفدر بھائی!'' ڈاکٹر شہناز نے کھلکھلا کر قطع کلامی کی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم غلط سوچ رہے ہو، صفیہ کی نسبت وغیرہ ابھی کہیں بھی طے نہیں ہوئی ہے۔ دراصل اس کے ماں باپ ایک حادثے میں چل بسے ہیں اور سر پر کسی بڑے کا ہاتھ نہ ہونے کی وجہ سے سلطانہ آنٹی اسے اپنے گھر لے آئیں''۔

''صفیہ جی ویری سیڈ''۔ صفدر نے اس قدر دکھی آواز میں کہا کہ جمشید خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے تاثرات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔

''او کے بھئی! میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں''۔ صفیہ کے کچھ بولنے سے ہی قبل ہی جمشید خان اجازت طلب انداز میں بولا۔ ''صفدر صاحب! مجھے وقت ملا تو میں آپ کو کمپنی ضرور دوں گا مگر اس وقت تو میرا جانا نہایت ہی ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ ویسے بھی صفیہ جی جیسے میزبان کے ہوتے ہوئے شاید آپ کو کسی کی میزبانی کی ضرورت نہ پڑے''۔

''Don,t Worry جمشید صاحب! آپ بے فکر ہو کر اپنی ڈیوٹی انجام دیں، میں ہفتہ دس دن یہاں ٹھہرنے کے لیے آیا ہوں''۔ صفدر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ...... ہاں صفیہ جی کھانا بھی بہت اچھی بناتی ہیں''۔ جمشید خان نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پورچ کی طرف چل پڑا۔

''Thank you so much صفدر بھائی!'' اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر شہناز



کھلکھلا کر کہا۔ ''کمال کی اداکاری کرتے ہو تم۔ کیا آگ بھڑکائی ہے تم نے جمشید خان کے سینے میں؟ اب آئے گا مزا...... دیکھتے ہیں صاحب جی کیسے لائن پہ نہیں آتے؟''

''شہناز! تم اچھا نہیں کر رہی ہو''۔ صفیہ نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''ان کے بہت احسان ہیں ہم پر...... وہ کیا سوچیں گے میرے بارے میں۔ میں اکیلے میں کیسے ان کا سامنا کروں گی؟''

''ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں، تم دونوں کے بھلے ہی کے لیے کر رہے ہیں''۔ شہناز بولی۔ ''تم دیکھنا اب کیسے وہ خود ہی سلطانہ آنٹی سے بات کرتے ہیں۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات نہ ہوئی تو ہیرا چور کی وہ میری''۔

''ہمارا یہ ڈرامہ اسے مجھ سے متنفر بھی کر سکتا ہے''۔ اس نے کسی خدشے کے تحت کہا۔ ''اور میں ان کی نفرت برداشت نہیں کر سکتی''۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا''۔ شہناز بولی۔ ''تم فکر نہ کرو میں اور صفدر بھائی سب سنبھال لیں گے''۔

اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر شہناز کا ڈائریکٹ کیا ہوا یہ ڈرامہ چند دن جاری رکھا اور اس دوران جمشید خان انگاروں پر لوٹتا رہا لیکن اس نے اپنے احساسات و جذبات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔

پھر ایک روز شام سے تھوڑی دیر قبل جب صفیہ رحمان ٹی وی لاؤنج میں اکیلے بیٹھ کر موسیقی کے ایک پروگرام سے محظوظ ہو رہی تھی، اچانک کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور جمشید خان دندناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر دحشت برس رہی تھی اور آنکھیں مسلسل جاگنے کی وجہ سے متورم نظر آ رہی تھیں۔

صفیہ نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر دوبارہ ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اگرچہ اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا مگر اس نے چہرے سے احساسات کا تاثر ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ جم کر صوفے پر بیٹھی رہی۔ جمشید خان ایک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے اپنے لیے بے اعتنائی نظر آ رہی تھی، مکمل بیگانگی۔ صفیہ رحمان یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے جمشید خان اس کے لیے ایک اجنبی ہو، جیسے وہ گھر کی بجائے کسی پارک کے سنگی بنچ پر بیٹھی ہو۔

وہ چند لمحے خاموشی کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''صفیہ! میں نے کبھی تم پر اپنا حق نہیں جتایا۔ تم بااختیار ہو اپنی مرضی کی مالک ہو۔ تمہیں اگر صفدر اچھا لگتا ہے تو تم اس کی لائف پارٹنر بن سکتی ہو۔ میں بخوشی اس کی اجازت دینے کے لیے تیار ہوں'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

صفیہ بدستور لاتعلق سی بن کر ٹی وی دیکھتی رہی، اس نے جمشید خان کی بات کو کوئی اہمیت ہی

نہیں دی تھی۔

''شاید تمہیں میرا یہاں آنا برا لگا ہے؟'' ایک لمحہ توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''تمہاری خاموشی اس بات کا اظہار ہے کہ میں اب تک جھوٹے خواب دیکھتا آیا ہوں۔ میں تمہاری منزل نہیں راستہ تھا اور راستوں میں گھڑی دو گھڑی کے لیے بیٹھ کر ستایا تو جاسکتا ہے مگر عمر نہیں گزاری جاسکتی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟''

بات کا اختتام اس نے سوالیہ انداز میں کیا تھا لیکن صفیہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ چند لمحے جواب طلب انداز میں اس کی شکل دیکھتا رہا پھر شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ''اوکے...... چلتا ہوں، مجھے تمہیں ڈسٹرب کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میری کسی بات سے تمہیں اگر دکھ پہنچا ہو تو مجھے معاف کردینا''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ آگے بڑھا، چند قدم چلا۔ رکا اور پلٹ کر ایک زخمی سی نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے چلنے کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے توقع ہو کہ صفیہ اسے عقب سے پکارے گی۔ وہ امید و ناامیدی کی کیفیت میں آگے بڑھ رہا تھا۔

صفیہ نے ٹی وی سے نگاہیں ہٹا کر ایک نظر اس کی پشت پر ڈالی۔ اس کے ہونٹ بولنے کے انداز میں لرزے اور پھر بدقت تمام اس کے منہ سے آواز نکلی''۔ جم...... شید!'' اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں، دوسرے ہی لمحے وہ ٹی وی کا ریموٹ پھینک کر سسکیوں میں رونے لگی۔

جمشید خان اس کی آواز سن کر واپس پلٹا اور پھر حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں چلتا ہوا اس کے سامنے پہنچ گیا۔ روتے ہوئے اس کا جسم آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ جمشید خان چند لمحے اس کے سامنے ٹھہرا رہا اور پھر نادم انداز میں بولا۔ ''آئی ایم سوری صفیہ! مجھے شاید تم سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی، میں......''

''نن...... نہیں''۔ وہ روتے روتے بولی اور جمشید خان کی بات ادھوری رہ گئی۔

''سوری تو مجھے بولنا چاہیے''۔ ایک لمحہ توقف کے بعد وہ بولی۔ ''آ...... آپ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مجھے یہ ڈرامہ مجبوری کے عالم میں رچانا پڑا۔ دراصل مجھے ڈاکٹر شہناز نے''۔

''پلیز تمہیں صفائی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''میں سب سمجھ گیا ہوں، اصل میں سارا قصور میرا ہے، میں اگر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا تو شاید ایسی نوبت ہی پیش نہ آتی۔ چلو جو کچھ ہوا اسے بھول جاتے ہیں''۔

''آپ نے مجھے معاف تو کردیا ہے ناں؟'' اس نے استفسار کیا۔



''جب تم نے کچھ کیا ہی نہیں تو معافی کس بات کی؟ مجھے شرمندہ تو نہ کریں''۔ جمشید خان نے جواب دیا۔

''شکریہ''۔ اس نے ممنون انداز میں کہا۔

''شکریے کو رہنے دو''۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں آج ہی امی سے بات کرتا ہوں۔ اب اس کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے ورنہ ایسا ڈرامہ کسی دن حقیقت میں بھی بدل سکتا ہے''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ باہر نکل گیا اور صفیہ رحمان کے چہرے پر حیا کا رنگ پھیلتا چلا گیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد ان دونوں کی شادی کی تیاریاں شروع تھیں۔

✣ === ✣ === ✣

موسیٰ خان وہاں سے جان بچا کر اپنے گھر پہنچا اور اپنی ماں کو سارا قصہ سنانے کے بعد بولا۔

''اب تم لوگوں کے لیے یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ خان جی جیسے کمینے اور کینہ پرور شخص سے کچھ بھی بعید نہیں ہے مگر میرا نام بھی موسیٰ خان ہے۔ تم لوگوں کو کسی محفوظ مقام پر چھوڑنے کے بعد میں اس سے نمٹ لوں گا''۔

''تمہارے کرتوتوں کا ایک دن یہی انجام ہونا تھا''۔ ماں بولی۔ ''خان جی کا کہنا مان کر تم ہمیشہ بے گناہوں پر ظلم ڈھاتے رہے ہو۔ مظلوم کی آہ لگتے دیر نہیں لگتی''۔

''یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے ماں''۔ اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''مجھے سکینہ اور اس کی ماں کو خان جی کی رسائی سے دور کسی محفوظ مقام پر پہنچانا ہے۔ خان جی پاگل ہو چکے ہیں، الیکشن میں ہار جانے کے خوف نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرلی ہے''۔

''کہاں لے جاؤ گے انہیں؟'' ماں نے سوال کیا۔

''کہیں بھی کسی محفوظ مقام پر، جو خان جی کی پہنچ سے دور ہو''۔ اس نے جواب دیا۔

''تم انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے''۔ وہ بولی۔ ''ان کا قصور کیا ہے؟''

''ان دونوں کو بلا کر لے آؤ ماں''۔ اس نے عجلت آمیز انداز میں کہا۔ ''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ دیر ہوگئی تو بہت برا ہوگا''۔

''اچھا جاتی ہوں''۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

چند منٹ کے بعد دونوں ماں بیٹی موسیٰ خان کے سامنے موجود تھیں۔ موسیٰ خان کے کندھے پر بندھی پٹی دیکھ کر ماں بیٹی نے آنکھوں ہی آنکھوں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور پھر جواب طلب انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

موسیٰ خان چند لمحے سوچنے کے انداز میں سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر سر اٹھاتے ہوئے نادم انداز

میں بولا۔ ”میں تم دونوں ماں بیٹی سے شرمندہ ہوں لیکن معافی نہیں مانگوں گا کہ یہ میری فطرت کے خلاف ہے، بہرکیف آج سے تم ماں بیٹی آزاد ہو، جہاں کہو گی میں چھوڑ آؤں گا“۔

دونوں ماں بیٹی نے چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر الجھن آمیز نگاہوں سے موسیٰ خان کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

”تمہارے ذہنوں میں بہت سے سوالات مچل رہے ہوں گے مگر میرے پاس وقت کی کمی ہے۔ تاہم تمہارے اطمینان کے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ سولجر زندہ ہے۔ اب بتاؤ کہ تم دونوں کو کہاں چھوڑنا ہے؟“ بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”یہ...... یہ سولجر کون ہے؟“ خدیجہ نے سوال کیا۔ ”مم...... میں تو جہانداد کے بارے میں“۔

”اوہ......“ موسیٰ خان نے قطع کلامی کی۔ ”سولجر جہانداد ہی تو ہے“۔

”وہ...... وہ کہاں ہے؟“ اب کی بار سکینہ نے سوال کیا۔

”ہمیں اس کے پاس لے چلئے“۔ خدیجہ بولی۔ ”وہاں گاؤں میں ہمارا کون ہے۔ ملک مراد جیسے سنگدل دشمن کے علاوہ؟ اگر ہم پر کچھ“۔

”نہیں“۔ موسیٰ خان نے انکار گردن ہلاتے ہوئے قطع کلامی کی۔ ”میں پشاور نہیں جا سکتا۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تم لوگوں کی خاطر ملک مراد کی طبیعت درست کر سکتا ہوں۔ وہ تمہاری چوکھٹ پر ماتھا نہ رگڑے تو میرا نام موسیٰ خان نہیں“۔

”نہیں“۔ خدیجہ بولی۔ ”تمہیں مفت کی دشمنی مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں بس ہمارے گاؤں تک پہنچا دو، تمہاری مہربانی ہوگی“۔

”دشمنی“۔ وہ معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”موسیٰ خان کے لیے دشمنی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بے شمار دشمن ہیں میرے، شمار کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ ایسے بے شمار دشمنوں میں اگر ایک دشمن کا اضافہ ہو جائے تو کیا فرق پڑے گا؟“

”ہاں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا“۔ سکینہ بولی۔ ”لیکن ہمیں ضرور پڑے گا۔ تم ساری زندگی تو ہمارے ساتھ نہیں گزار سکتے ناں؟ تمہارے جانے کے بعد ملک مراد کے پالتو غنڈے اور نادر خان کیا ہمیں چین سے رہنے دیں گے؟“

”یہ نادر خان کون ہے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”علاقے کا تھانیدار ہے“۔ وہ بولی۔ ”کھاتا سرکار کا ہے اور دُم ملک مراد کے اشارے پر ہلاتا ہے۔ ہماری بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ نادر خان ہی کا ہے۔ میرے باپ نے حوالات کے



اندر اس کی وجہ سے خودکشی کر لی تھی اور نادر خان نے اس کے قتل کے الزام میں میرے چچا کو گرفتار کر لیا تھا“۔

”نہیں ہم وہاں نہیں جائیں گے“۔ خدیجہ نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جب تک جہانداد نہیں مل جاتا ہم یہیں رہیں گے“۔

”ابھی چند منٹ پہلے تو تم کہہ رہی تھیں کہ تم گاؤں جانا چاہتی ہو، پھر یہ انکار کس لیے؟“ اس نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

”بلا سوچے سمجھے کہہ دیا تھا“۔ وہ بولی۔ ”اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، وہاں جانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے“۔

”یہاں اس سے دگنا خطرہ ہے تم لوگوں کو“۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ”ملک مراد گاؤں کا ایک عام زمین دار ہے جب کہ خان جی ایک غنڈہ سیاستدان ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں پر کوئی آنچ آئے“۔

”تم خود ہی تو ہمیں اٹھا کر لائے تھے موسیٰ خان“۔ خدیجہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”اب ہم سے ہمدردی کیوں؟“

”یہ ہمدردی اس گناہ کا کفارہ ہے“۔ وہ بولا۔ ”میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اب سے چند گھنٹے قبل تک میں خان جی کا غلام تھا، مجھے اپنے فیصلے کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا لیکن اب میں آزاد ہوں، اپنے فیصلے خود کر سکتا ہوں اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تم ماں بیٹی کا ساتھ دوں گا، ... اس زیادتی کا ازالہ کروں گا جو میں نے تم لوگوں کو اغوا کر کے کی ہے“۔

”میں نے کہا ہے ناں کہ ہم وہاں نہیں جائیں گے“۔ وہ بولی۔ ”پھر تم اصرار کیوں کرتے ہو؟ بس یہیں ٹھیک ہیں۔ خان جی اگر ہمیں مارنا چاہتا ہے تو بے شک مار ڈالے۔ ویسے بھی ہماری زندگی موت سے بدتر گزر رہی ہے، مزید جی کر کیا کریں گے؟“

”تیرے ساتھ جوان بیٹی ہے اور خان جی کے پاس ایسے غنڈوں کی کمی نہیں ہے جو ہاتھ آئی ...کو درندوں کی طرح بھنبھوڑ ڈالتے ہیں۔ وہ پہلے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنائیں گے اور بعد ...“

”جن کے بھائی زندہ ہوں انہیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے؟“ سکینہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”کاش تمہارا بھائی آج یہاں ہوتا“۔ وہ مایوس انداز میں بولا۔ ”تو مجھے یوں پریشان نہ ہونا ...“

''میں...... میں تیری بات کر رہی ہوں کیا تم میرے بھائی نہیں ہو؟'' اس نے پُر امید انداز میں پوچھا۔

موسیٰ خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر نادم انداز میں بولا۔ ''سکینہ! میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اپنا بھائی سمجھا مگر خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی شریف زادی کا بھائی کہلا سکوں تیرے جیسی بہن کا بھائی صرف سولجر جیسا انسان ہی ہو سکتا ہے۔ بھلے وہ میرا دشمن سہی مگر میں اس کی سچائی اور بہادری کا معترف ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کے ہاتھ مرنا پڑے گا''۔

''میں ایسا نہیں ہونے دوں گی بھائی''۔ سکینہ نے پُر عزم انداز میں کہا۔ ''میں...... میں جہانداد بھائی کو سمجھاؤں گی کہ اس کا دشمن موسیٰ نہیں بلکہ خان جی ہے''۔

''یہ میری غیرت کو گوارہ نہیں ہے سکینہ!'' اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ ''دشمن سے رحم کی بھیک مانگ کر جان بچانے والے بزدل ہوتے ہیں''۔

''میں جہانداد سے کہوں گی کہ تم نے میری عزت بچائی تھی اور''۔

''نہیں''۔ موسیٰ خان نے قطع کلامی کی۔ ''تم اسے ایسا کچھ بھی نہیں کہو گی۔ ورنہ وہ سمجھے گا کہ موسیٰ خان بزدل ہے اور میں مر تو سکتا ہوں مگر مجھے بزدل کہلانا پسند نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے نہیں بتاؤں گی''۔ وہ بولی۔ ''مگر شمروز خان سے میری عزت بچا کر تم نے مجھ پر جو احسان کیا تھا وہ میں زندگی بھر یاد رکھوں گی''۔

''وہ احسان نہیں تھا سکینہ! میری ڈیوٹی تھی''۔ وہ بولا۔ ''تیری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی میں نے یہی کرنا تھا''۔

''تم باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو بیٹے''۔ موسیٰ خان کی ماں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''جو بھی فیصلہ کرنا ہے جلدی کرو، خان جی کے غنڈے یہاں پہنچ گئے تو بہت برا ہو گا''۔

''میں ان پر زبردستی نہیں کر سکتا ماں''۔ وہ بے چارگی سے بولا۔ ''اور نہ ہی انہیں مصیبت کے اس عالم میں تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ ہی انہیں سمجھائیں کہ ان کے لیے یہاں رہنا کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے؟''

''خدیجہ بہن! یہ ٹھیک کہتا ہے''۔ موسیٰ خان کی ماں نے کہا۔ ''خان جی انسان کی شکل میں ایک بھیڑیا ہے، یہاں تم دونوں کی جان کو سخت خطرہ ہے۔ میرے اور میرے بیٹے کے علاوہ یہاں کوئی تمہارا ہمدرد نہیں ہے، وہاں گاؤں میں تو تم لوگوں کے رشتہ دار ہوں گے، جان پہچان والے لوگ ہوں گے''۔



''ٹھیک ہے''۔ خدیجہ نیم رضامندی سے بولی۔ ''اگر تمہاری بھی یہی خواہش ہے تو ہم جانے کے لیے تیار ہیں لیکن اگر کچھ روز جہانداد کا انتظار کر لیتے تو شاید بہتر ہوتا''۔

''اس کی تم فکر نہ کرو''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''اماں اسے ساری بات سمجھا دے گی، تم بس چلنے کی تیاری کرو میں ابھی تھوڑی دیر تک واپس آتا ہوں''۔

اتنا کہنے کے بعد وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور خدیجہ بیٹی کے ساتھ مل کر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ موسیٰ خان کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہوئی، اس وقت عصر کے سائے تقریباً ڈھلنے لگے تھے۔ موسیٰ خان کی ماں باورچی خانے میں گھسی رات کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔

''ہم ابھی تھوڑی دیر کے بعد یہاں سے نکلیں گے''۔ اس نے خدیجہ اور سکینہ سے کہا اور پھر ماں کے پاس باورچی خانے میں پہنچ گیا جو اس وقت توے پر روٹی ڈال رہی تھی۔

''کس وقت نکلو گے؟'' اس نے توے پر روٹی پلٹتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اجازت لینے کے لیے آیا ہوں''۔ وہ بولا۔ ''وہ دونوں تیار ہیں بس ابھی تھوڑی دیر میں نکل جائیں گے''۔

''کھانا بس تیار ہے''۔ وہ بولی۔ ''کھا کر نکل جانا۔ تم ان کے پاس جا کر بیٹھو، میں ابھی کھانا لاتی ہوں''۔

''ماں! دراصل میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔

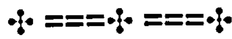
''ہاں بولو، کیا بات ہے؟'' ماں نے استفسار کیا۔

''خان جی کے غنڈے میری تلاش میں یہاں ضرور پہنچیں گے اور مجھے یہاں نہ پا کر شاید وہ آپ سے بدتمیزی......''

''تم میری فکر نہ کرو بیٹے''۔ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''چند روز کے بعد الیکشن ہیں اور ان سے پہلے خان جی ایسا خطرہ مول نہیں لے گا اور پھر تم کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہے ہو؟''

''مجھے وہاں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں''۔ وہ بولا۔ ''اس لیے آپ بھی اگر ساتھ چلی......''

''مجھے کچھ نہیں ہو گا، تم بے فکر ہو کر جاؤ''۔ اس نے بات کاٹتے ہوئے حتمی انداز میں کہا اور موسیٰ خان باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔



جمشید خان کی شادی کی تقریب سے فارغ ہوتے ہی جہانداد نے واپسی کا ارادہ باندھ لیا مگر جمشید خان اور اس کے گھر والے جہانداد کے اس فیصلے کے خلاف تھے۔ وہ اسے یوں بے سروسامانی کے عالم میں رخصت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جہانداد کے بار بار کے اصرار کو دیکھتے ہوئے جمشید خان

نے کہا۔ ''تم الیکشن ہو جانے تک ٹھہر نہیں سکتے؟ کچھ ہی روز کی تو بات ہے، اس کے بعد میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا اور جمال خٹک کی سپورٹ بھی ہمارے ساتھ ہوگی۔ ہم تمہارے دشمنوں سے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے نمٹ سکیں گے''۔

''جمال خٹک کو کیا پڑی ہے کہ وہ میری مدد کرے گا''۔ جہانداد بولا۔ ''یہ میری اپنی جنگ ہے، میں خود اپنے دشمنوں سے نمٹ لوں گا''۔

''تم اکیلے کچھ بھی نہیں کر سکو گے سوائے اپنی جان گنوانے کے''۔ جمشید خان نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم دشمنوں کی گولی کا نشانہ بن جاؤ، تمہارے مجھ پر بہت احسان ہیں اور میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ میرے دوست! جہاں اتنا عرصہ انتظار کیا ہے وہاں چند دن اور سہی۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟''

''آپ پر اعتماد نہ ہوتا تو میں کب کا یہاں سے جا چکا ہوتا۔ دراصل اب یہاں میرا کوئی کام نہیں رہا اس لیے میں جانا چاہتا ہوں''۔ اس نے جواب دیا۔

''ابھی ایک کام باقی ہے بیٹے''۔ مسز سلطانہ خان بولی۔ ''جمشید خان کی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو اور میں تمہارے سر پر سہرا سجانا چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر شہناز سے اچھی جیون ساتھی تمہیں دنیا میں کہیں نہیں ملے گی''۔

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ماں جی''۔ وہ بولا۔ ''مگر ایسی صورتِ حال میں اپنے سر پر سہرا سجانا میرے لیے ناممکن ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میری ماں اور بہن کس حال میں ہیں''۔

''بھائی شادی نہ سہی منگنی تو ہو سکتی ہے ناں؟'' صفیہ رحمان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھیے آپ لوگ''۔

''ہماری نئی نویلی بیگم کی خواہش پوری کر دو یار!'' جمشید خان نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ''منگنی کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، شادی تم لوگ اپنے گاؤں میں جا کر کر لینا''۔

''ٹھیک ہے''۔ جہانداد بولا۔ ''مگر میری ایک شرط ہے؟''

''شرط...... کیسی شرط؟'' جمشید خان نے چونک کر پوچھا۔

''منگنی کرنے کے بعد میں فوراً یہاں سے نکل جاؤں گا، آپ لوگوں میں سے کوئی بھی مجھے روکنے کی کوشش نہیں کرے گا''۔ اس نے جواب دیا۔

''تمہیں آخر جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟'' مسز سلطانہ نے پوچھا۔ ''کیا ہم لوگوں سے جی اکتا گیا ہے؟''



''نہیں ماں جی''۔ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں بھلا کبھی آپ لوگوں سے اکتا سکتا ہوں؟ اس گھر میں مجھے کیا نہیں ملا؟ ماں کا پیار، بھائی اور بہن کی محبت...... میں تو خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں، اگر میرے پیروں میں مجبوریوں کی بیڑی نہ ہوتی تو میں کبھی بھی یہاں سے نہ جاتا''۔

''دیکھو جہانداد!'' جمشید خان بولا۔ ''الیکشن ہونے میں صرف چند روز ہی رہ گئے ہیں اور جمال خٹک کی جیت یقینی ہے نہ صرف جیت یقینی بلکہ اسے کوئی اہم وزارت بھی ضرور ملے گی۔ دراصل میں یہ چاہتا ہوں کہ تم جب یہاں سے جاؤ تو تمہاری جیب میں ایک صوبائی وزیر کا حکم نامہ ہو، یہ حکم نامہ پولیس اور انتظامیہ کے اعلیٰ حکام کے نام ہوگا اور وہ لوگ ملک مراد کے خلاف تم سے تعاون کریں گے۔ تمہیں نہ صرف اپنی زمین واپس مل جائے گی بلکہ تمہارے خلاف درج کرائی گئی کوئی بھی جھوٹی ایف آئی آر غیر مؤثر ہو جائے گی''۔

''اور اگر خان جی جیت گیا تو پھر کیا ہوگا؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ناممکن''۔ جمشید خان پُرجوش انداز میں بولا۔ ''ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس ملک میں ہمیشہ برسرِاقتدار رہنے والی پارٹی ہارتی آئی ہے۔ تم جانتے ہو کہ خان جی کے پاس جس پارٹی کا ٹکٹ ہے وہ اقتدار کے مزے جی بھر کر لوٹ چکی ہے۔ اب حزبِ اختلاف والوں کی باری ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ بولا۔ ''اگر آپ اتنے ہی پُریقین ہیں تو میں ٹھہر جاتا ہوں مگر جمال خٹک کو جب یہ معلوم ہوگا کہ میں خان جی کے لیے کچھ ایسے کام بھی کر چکا ہوں جو......''

''پلیز جہانداد!'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں گڑے مردے اکھاڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو، میں جانوں اور جمال خٹک''۔

دوسرے روز شام کے وقت جمشید خان کی کوٹھی میں ڈاکٹر شہناز اور جہانداد کی منگنی کی تقریب ہو رہی تھی جس میں جمال خٹک بھی خصوصی طور پر مدعو تھا۔

-:-===-:-===-:-

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد موسیٰ خان نے ان ماں بیٹی کو ساتھ لیا اور گھر سے روانہ ہو گیا۔ اس وقت شام کا ملگجا سا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ موسیٰ خان کے کندھے سے روسی ساخت کی کلاشنکوف لٹک رہی تھی جس کا میگزین گولیوں سے بھرا ہوا تھا، اس کے علاوہ اس کے پاس ایک ریوالور، ایک خنجر اور چار دستی بم بھی موجود تھے۔ گاؤں کی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے وہ اس چٹان تک پہنچ گئے جس کے عقب میں موسیٰ خان کا دوست جیپ لیے ہوئے موجود تھا۔ موسیٰ خان نے جاتے ہی ماں بیٹی کو جیپ میں بٹھایا اور پھر دوست سے بغل گیر ہو گیا۔

"میری ماں کا خیال رکھنا نورخان!" وہ اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "مجھے خان جی پر ذرا سا بھی اعتبار نہیں ہے۔ میں نے بیس سال اس کی غلامی کی ہے مگر صلے میں کچھ بھی نہیں پایا۔ وہ ایک زہریلا ناگ ہے جو موقع ملنے پر کسی کو بھی ڈس لیتا ہے۔"

"تم بے فکر رہو دوست!" نورخان بولا۔ "تمہاری ماں میری بھی ماں ہے، میری لاش پر سے گزرے بغیر خان جی کا کوئی آدمی اس تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

"تمہیں اپنی جان پر کھیلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" موسیٰ خان نے کہا۔ "جب خطرہ حد سے بڑھنے لگے تو تم میری ماں کو امین خان تک پہنچا دینا، وہ بے شک میرا دشمن ہے مگر ایک شریف انسان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری ماں کو ضرور پناہ دے گا اور اس کی حفاظت بھی کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "مگر تم کب تک واپس آؤ گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" اس نے کہا۔ "میری واپسی وہاں کے حالات پر منحصر ہے، میں ان ماں بیٹی کی حفاظت کا مکمل بندوبست کر کے ہی واپس لوٹوں گا۔ دراصل گاؤں کا ایک زمین دار ان کا دیرینہ دشمن ہے اور وہ شخص میرے لیے قطعی اجنبی ہے، پہلے میں اسے پیار سے سمجھاؤں گا کہ ان ماں بیٹی کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے، وہ مان گیا تو ٹھیک ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ ایسے مسئلے میں کس طرح سلجھانے کا عادی ہوں؟ نہ مانا تو اُڑا دوں گا حرام زادے کو۔"

"ذرا بچ بچا کر میرے دوست!" وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔ "جہاں تم جا رہے ہو وہ علاقہ غیر نہیں ہے اس لیے ذرا خیال رکھنا۔ وہاں پھنس گئے تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہوگا۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تم میری فکر نہ کرو، میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم بس میری ماں کا خیال رکھنا، ہو سکتا ہے کہ میں وہاں سے زندہ نہ لوٹ سکوں۔ اس صورتِ حال میں میری ماں کا واحد آسرا تم ہی ہو گے، اسے زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔"

"موسیٰ خان!" وہ ایک دم تڑپ کر بولا۔ "یہ...... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو میرے دوست! تم تو سو سال جیو گے، ابھی سے مرنے کی باتیں کیوں کرنے لگے ہو؟"

"موت کا نام سن کر ڈر گئے ہو ناں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"تو اور کیا قہقہے لگاؤں؟" نورخان نے ناراض انداز میں جواب دیا۔

"آہ...... موت۔" وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "بڑے بڑے بہادروں اور جی داروں کے کلیجے شق کر دیتی ہے مگر موسیٰ خان کا وعدہ ہے کہ وہ موت کا مسکرا کر استقبال کرے گا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قہقہے لگائے گا۔"

"مت کرو ایسی باتیں دوست!" وہ ملتجی ہوا۔ "میرے دل کو کچھ ہو جائے گا۔"



"مذاق کر رہا تھا یار۔" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اچھا خدا حافظ۔" اتنا کہہ کر وہ دوبارہ اس سے بغل گیر ہو گیا۔

"خدا حافظ میرے دوست!" نورخان نے اسے بھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا۔"

"فکر نہ کرو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" موسیٰ خان نے اس سے الگ ہوتے ہوئے جواب دیا اور پھر چند قدم دور کھڑی ہوئی جیپ کی فرنٹ سیٹ پر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

اگنیشن میں چابی گھما کر اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔ نورخان کی طرف الوداعی ہاتھ ہلایا اور پھر جیپ آگے بڑھا دی۔ وہ دونوں ماں بیٹی جیپ کی پچھلی سیٹ پر ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ نورخان سے موسیٰ خان کی ساری گفتگو انہوں نے سن لی تھی۔ اس لیے جب جیپ قدرے دور نکل گئی تو سکینہ خاموش نہ رہ سکی۔

"بھائی! تم اپنے دوست سے مرنے کی باتیں کیوں کر رہے تھے؟" اس نے شکایتی انداز میں پوچھا۔

"میری زندگی موت سے لڑتے ہوئے گزر رہی ہے۔" وہ بولا۔ "اب تک موت ہارتی چلی آ رہی ہے لیکن ایسا ہمیشہ کے لیے تو نہیں ہو سکتا ناں؟ کیا پتہ کب موت کا وار چل جائے اس لیے میں نے اپنے دوست سے جھوٹ بولنا نامناسب خیال کرتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔"

"ہمارے گاؤں میں تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "بلکہ وہاں کا کوئی بھی شخص تمہیں نہیں جانتا، تم بس ہمیں چھوڑ کر واپس ہو جانا۔ ہمارے لیے کسی سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم سے زیادہ تم پر تمہاری ماں کا حق ہے۔"

"موسیٰ خان کو کبھی کسی لڑکی نے بھائی کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔" اس نے کہا۔ "تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے یہ مرتبہ دیا اس لیے آج سے تیرے دشمن میرے دشمن ہیں۔ بھائی کہہ کر غیروں جیسی باتیں مت کرو، مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا بھائی۔" وہ بولی۔ "بلکہ میں تو یہی کہنا چاہتی تھی کہ تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔ تم اپنی ماں کا واحد سہارا ہو، خدا نہ کرے اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو وہ بے چاری جیتے جی مر جائے گی۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں میری بہن!" اس نے کہا۔ "لیکن اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں جس راستے کا مسافر ہوں وہ صرف آگے بڑھتا ہے، پیچھے مڑ کر دیکھنے والے کو موت اچک لیتی ہے۔"

''تم کس راستے کی بات کر رہے ہو؟'' اس نے پریشانی کے عالم میں استفسار کیا۔

''تم نہیں سمجھو گی سکینہ!'' وہ بولا۔ ''اس لیے تمام خدشات دل سے نکال کر خوش رہنے کی کوشش کرو۔ میں چاہوں بھی تو تجھے اپنی داستان نہیں سنا سکتا''۔

''کیوں بھائی؟'' اس نے سوال کیا۔

''سنانے کے لائق نہیں ہے''۔ وہ بولا۔ ''تمہیں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا''۔

''میں اگر پھر بھی سننا چاہوں تو؟'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔

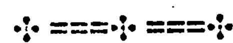
''نہیں سکینہ نہیں''۔ اس قطعیت سے کہا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے اس لیے اصرار مت کرو۔ میں مجبور ہوں''۔

''ٹھیک ہے بھائی جیسے تیری مرضی''۔ وہ بولی۔ ''نہیں سناتے تو نہ سنائیں، میں کون سا تیری سگی بہن......''

''سکینہ!'' خدیجہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''بیٹی! اسے تنگ مت کرو، اس نے بہت احسان کیے ہیں ہم پر''۔

''میں اپنی کہانی سنا کر تمہارا مان نہیں توڑنا چاہتا سکینہ''۔ وہ بولا۔ ''اگر تم پھر بھی سننے پر بضد ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی نے اگر کبھی مہلت دی تو تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں لیکن ابھی نہیں''۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ پختہ سڑک پر پہنچ گئے مگر اچانک انہیں رکنا پڑ گیا، سڑک کے عین درمیان میں ایک ہیوی جیپ ان کا راستہ بلاک کیے ہوئے کھڑی تھی۔



موسیٰ خان نے جیپ قدرے فاصلے پر روک دی تھی اور ایسا اس نے احتیاطاً کیا تھا۔ اس کی چھٹی حس پکار پکار کر کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک کے بیچ کھڑی ہوئی جیپ چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جیپ کے اردگرد اسے کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک عام سی سڑک تھی جیسی گاؤں دیہات میں ہوتی ہیں، وہاں سے رات تو رات دن کے وقت بھی شاذ ہی کوئی گاڑی گزرا کرتی تھی۔ آگے چل کر یہ سڑک شہر کو جانے والی بڑی سڑک سے مل جاتی تھی۔

سکینہ اور اس کی ماں صورت حال بھانپتے ہی پریشان نظر آ رہی تھیں۔ موسیٰ خان نے جیپ کی اندرونی بتی بجھا دی اور پھر ان سے تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میرے جیتے جی تم دونوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا، یہ میرا وعدہ ہے''۔



اتنا کہہ کر وہ جیپ سے نیچے اتر گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اسے جیپ کے اردگرد کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آ رہی تھی تاہم وہ جیپ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی وہ بلاشبہ خان جی کی ہی جیپ تھی اور اس کا راستہ روکنے کے لیے ہی وہاں کھڑی کی گئی تھی۔ راستہ روکنے والوں میں کون کون تھا؟ اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔

چند لمحے وہ اپنی جیپ کے قریب کھڑا رہا مگر جب کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو وہ چلا کر بولا۔ ''زرولی! مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ آس پاس کہیں موجود ہو۔ میں دوست سمجھ کر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا راستہ چھوڑ دو ورنہ ہم دونوں کے لیے بہت برا ہوگا''۔

چند سیکنڈ اس نے ردعمل کا انتظار کیا مگر اسے مایوسی ہی ہوئی۔ راستہ بلاک کرنے والوں کی طرف سے اسے کوئی جواب نہ ملا۔ شاید سامنے نہ آنا ان کے منصوبے کا کوئی حصہ تھا۔

''میرا وقت ضائع نہ کرو زرولی''۔ وہ دوبارہ بلند آواز سے بولا۔ ''ہم دونوں آج تک ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں مجھے دشمن بننے پر مجبور نہ کرو، پچھتاؤ گے''۔

اس بار بھی اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس کے اندر کا خونخوار موسیٰ خان جاگ پڑا۔ کندھے سے کلاشنکوف اتار کر اس نے ہاتھ میں پکڑی اور تیزی سے سڑک کے کنارے موجود جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس کی جیب میں تین دستی بم موجود تھے، چلتے ہی چلتے اس نے جیب سے ایک بم نکالا اور دانتوں سے اس کی پن کھینچ کر اسے مٹھی میں دبا لیا۔ چند سیکنڈ میں وہ سڑک کے درمیان کھڑی ہوئی جیپ تک پہنچ گیا۔

''زرولی!'' وہ جھاڑیوں سے جیپ کی طرف جھانکتے ہوئے چلایا۔ ''سامنے آؤ ورنہ چلانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی، میں......''

معاً اسے اپنی جیپ کی طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ سکینہ اور اس کی ماں بے تحاشا چیخ رہی تھیں۔ وہ جست لگا کر سڑک کے بیچ میں پہنچ گیا، اپنی جیپ کی طرف اس نے دیکھنے کی کوشش کی مگر ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اچانک ایک خیال برق کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اور اس نے دوبارہ سڑک کے کنارے موجود جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ اسے اپنے عقب میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی گئی۔ چھلانگ لگانے والا فیصلہ اس نے بروقت کیا تھا۔ اگر اس کو ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔

جھاڑیوں میں گرتے ہی وہ تیزی سے اٹھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا بم زرولی کی جیپ پر پھینک دیا۔ ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا اور جیپ سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے، اردگرد کا علاقہ روشنی میں

نہا گیا لیکن وہ روشنی دیکھنے کے لیے رکا نہیں۔ جھاڑیوں کی آڑ میں بھاگتا ہوا وہ اپنی جیپ کے مقابل پہنچ گیا۔ اس دوران جیب سے دوسرا دستی بم نکال کر وہ ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ بم دھماکے کی آواز سن کر اور اپنی جیپ سے آگ کے شعلے اٹھتے دیکھ کر زرولی اور اس کے ساتھی وقتی طور پر سہم چکے تھے مگر وہ لوگ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔

جیپ کے مقابل پہنچتے ہی وہ جھاڑیوں میں سینے کے بل لیٹتے ہوئے چلایا۔ ''زرولی! اپنے ہتھیار سڑک کے درمیان پھینک کر میری جیپ سے دور چلے جاؤ ورنہ اس جیپ کا بھی وہی حشر کروں گا جو تمہاری جیپ کا کیا ہے''۔

''نہیں''۔ زرولی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے ہمارے ساتھ ساتھ یہ دونوں بھی ماری جائیں گی۔ اس لڑکی سے کہو کہ گاڑی کی چابی میرے حوالے کر دے ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا''۔

''بے شک ماری جائیں''۔ وہ زرولی کے مطالبے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''میری کون سی ماں بہن لگتی ہیں؟ میں پانچ تک گنوں گا، اگر گنتی ختم ہونے سے پہلے تم لوگ ہتھیار پھینک کر نہ بھاگے تو انجام کے خود ذمہ دار ہو گے''۔ اتنا کہنے کے فوراً بعد اس نے گنتی شروع کر دی۔ ''ایک...... دو...... تین...... چار''۔

''رکو''۔ اس کے پانچ کہنے سے پہلے ہی زرولی چلایا۔ ''ہم ہتھیار پھینک کر جانے کے لیے تیار ہیں لیکن......''

''لیکن ویکن کو چھوڑو''۔ اس نے وارننگ کے انداز میں کہا۔ ''میں دستی بم کی پن نکال چکا ہوں فوراً ہتھیار پھینک کر دوڑ لگا دو ورنہ ایک سیکنڈ میں تم لوگ بوٹیوں میں تقسیم ہو جاؤ گے''۔

اس کی وارننگ سن کر زرولی اور اس کے ساتھیوں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اپنے اپنے ہتھیار پھینکے اور پھر بھاگتے ہوئے جیپ سے دور چلے گئے۔

زرولی اور اس کے ساتھیوں کے بھاگتے ہی وہ تیزی سے جھاڑیوں سے باہر نکلا اور اپنی جیپ کے عقب میں پہنچ گیا۔ زرولی کی جیپ سے ہلکے ہلکے شعلے اب بھی اٹھ رہے تھے مگر جیپ کے عقب میں وہ روشنی سے محفوظ تھا۔

''سکینہ!'' اس نے آہستہ سے پکارا۔ ''تم لوگ ٹھیک تو ہو ناں؟''

''ہاں ٹھیک ہیں''۔ سکینہ نے ناگوار انداز میں جواب دیا۔

وہ اس کی ناراضی کی وجہ سمجھتا تھا مگر یہ صفائی دینے کا وقت نہیں تھا۔ زرولی اور اس کے ساتھی دوبارہ کوئی چال چل سکتے تھے۔ خطرہ ابھی پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔



''گاڑی کی چابی کہاں ہے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''میری جوتی کے اندر ہے''۔

''اوہ...... بہت خوب''۔ وہ ستائشی انداز میں بولا۔ ''ماں کو لے کر باہر آ جاؤ اور چابی مجھے دے کر جیپ کے سامنے پڑے ہوئے ہتھیار اٹھا کر جھاڑیوں میں پھینک دو''۔

کوئی جواب دیے بغیر سکینہ ماں کے ساتھ جیپ سے نیچے اتری۔ چابی موسیٰ خان کے حوالے کی اور پھر جیپ کے سامنے سڑک پر پڑے ہوئے ہتھیار اٹھا کر جھاڑیوں میں پھینک دیئے۔ اس دوران موسیٰ خان جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ جونہی وہ دونوں ہتھیار پھینک کر فارغ ہوئیں موسیٰ خان نے انہیں فوراً جیپ میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ دونوں دوبارہ جیپ میں بیٹھ گئیں تو موسیٰ خان نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے ریورس گیئر لگا دیا۔

تقریباً دو فرلانگ کا راستہ ریورس میں طے کرنے کے بعد اس نے جیپ کچے راستے پر اتار دی۔ سکینہ اور اس کی ماں بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک میل کا فاصلہ کچے میں طے کرنے کے بعد اس نے جیپ کو دوبارہ پختہ سڑک پر چڑھا دیا اور طاقتور جیپ فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خطرے کی حدود سے نکل چکے تھے۔

''تم شاید مجھ سے ناراض ہو؟'' خطرے کی حدود سے نکلتے ہی موسیٰ خان نے سکینہ سے سوال کیا۔ ''لیکن کیوں ناراض ہو؟ یہ مجھے معلوم نہیں ہے''۔

''اچھی طرح معلوم ہے''۔ وہ بولی۔ ''ایسے بنو مت، میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں''۔

''بھئی میں تو تجھے بہن بنا کر پچھتا رہا ہوں''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہو؟ کیوں ماں جی! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' آخری الفاظ اس نے خدیجہ سے کہے تھے۔

''یہ ایسی ہی ہے بیٹے''۔ خدیجہ بولی۔ ''جہانداد سے بھی ایسے ہی روٹھتی رہتی تھی''۔

''یہ تو بہت بری بات ہے بھئی''۔ وہ بولا۔ ''بلا جواز ناراض ہونا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے''۔

''تم نے ان کے ساتھ ہمیں بھی مارنے کی بات کیوں کی تھی؟'' سکینہ جواب طلب انداز میں بولی۔ ''اور یہ کیوں کہا تھا کہ میری کون سی ماں بہن لگتی ہیں؟''

''اوہ...... تو یہ بات ہے؟'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''بھئی میں اگر انہیں یہ دھمکی نہ دیتا تو وہ کبھی بھی تم دونوں کو نہ چھوڑتے۔ ایسا تو میں نے محض انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے کہا تھا''۔

''فرض کیا وہ تیری دھمکی سے نہ ڈرتے تو تم کیا کرتے؟'' سکینہ نے سوال کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا"۔ وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔ "تم یہ بتاؤ کہ گاڑی کی چابی تم نے کس طرح چھپالی تھی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی"۔ وہ بھی اسی کے انداز میں بولی اور موسیٰ خان کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

سکینہ ایک عام سی لڑکی تھی جیسی ہزاروں دیہاتی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ موسیٰ خان کا نہ کوئی بھائی تھا اور نہ بہن، اس کی زندگی قتل و غارت گری میں گزری تھی۔ سوائے ماں کے پیار کے اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن پہلے تک سکینہ محض اس کے ایک دشمن کی بہن تھی مگر آج وہی سکینہ اسے رگ جان سے بھی زیادہ عزیز محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کی حفاظت کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

"سکینہ؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "ہم دونوں کے درمیان کوئی بھی خونی رشتہ موجود نہیں ہے لیکن تمہاری چند گھڑیوں کی رفاقت نے مجھے ایک مقدس رشتے میں باندھ دیا ہے۔ میں نے کسی سے اس قدر گھل مل کر باتیں نہیں کی ہیں جتنی آج تم سے کر رہا ہوں، میرے ہونٹ مسکرانا نہیں جانتے تھے، میں نفرت اور دشمنی کو زندگی سمجھا کرتا تھا مگر آج معلوم ہوا کہ اب سے پہلے میں تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا"۔ اتنا کہنے کے بعد وہ چپ ہو گیا۔

چند لمحوں تک گاڑی میں خاموشی طاری رہی اس کے بعد سکینہ بولی۔ "کیا ناراض ہو بھائی؟"

"نہیں" وہ بولا۔ "میں دراصل اپنے کیے پر پچھتا رہا ہوں، میں نے تم ماں بیٹی کو بلاوجہ ایک ظالم اور جابر شخص کی خوشی کے لیے اتنا عرصہ قیدی بنا کر رکھا ہے۔ کاش...... کاش میں"۔

"نہیں بھائی"۔ سکینہ جلدی سے قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ "تمہیں ہمارے لیے اپنی انا قربان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کسی سے معافی مانگنا تمہارے لیے بے حد دشوار کام ہے۔ میں نے تجھے سچے دل سے بھائی کہہ کر پکارا تھا اور بھائی بہنوں سے معافی طلب نہیں کیا کرتے"۔

"شکریہ سکینہ!" اس نے احسان مندانہ انداز میں جواب دیا۔

دوسرے دن شام کے وقت وہ فتح پور گاؤں میں پہنچ گئے۔

ملک مراد اپنی حویلی کے ایک پختہ کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے سورج کی ابتدائی کرنیں اس کے فالج زدہ جسم پر پڑ رہی تھیں اور مکھیاں اس کے چہرے پر بھنبھنا رہی تھیں، اس کے منہ سے ٹپکنے والی رال ٹھوڑی سے رینگتی ہوئی اس کی گردن تک پہنچ چکی تھی مگر وہ یہ رال صاف کرنے سے قاصر تھا۔ اس کا اوپری دھڑ تقریباً مفلوج ہو چکا تھا۔ تقریباً چار ماہ پہلے اسے فالج کا



ابتدائی جھٹکا لگا تھا جب اس نے اپنے دونوں جوان بیٹوں کی ہلاکت کی خبر سنی تھی۔ دونوں بھائی شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر شہر کی ایک مصروف شاہراہ پر اندھا دھند گاڑی چلا رہے تھے کہ اچانک ہی ایک آئل ٹینکر نے انہیں سامنے سے ٹکر مار دی تھی۔ وہ دونوں موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے، ان کی لاشیں تک مسخ ہو چکی تھیں۔ آئل ٹینکر کا ڈرائیور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ملک مراد نے جن بیٹوں کے لیے گاؤں کے کمزوروں پر ظلم و ستم توڑ کر اتنی بڑی جائیداد اکٹھی کی تھی وہ اسے داغ مفارقت دے کر کبھی واپس نہ لوٹنے کے لیے جا چکے تھے۔ فالج کے ابتدائی جھٹکے نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ بہتیرا علاج کرانے کے باوجود وہ بستر سے لگ کر رہ گیا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والوں میں صرف اس کی بیٹی ثریا ہی تھی جو دن رات اس کی خدمت کرتی رہتی تھی۔

اس کی بیوی نے بھی ایک ماہ تک اس کی دل و جان سے دیکھ بھال کی تھی مگر پھر رفتہ رفتہ وہ اس کام سے اُکتا گئی، اب صرف ثریا ہی تھی جو شب و روز اس کی غلاظت صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کھانے پینے اور بروقت دوائی دینے کا خیال رکھا کرتی تھی۔ وہ باپ کے جرائم سے واقف تھی، اسے معلوم تھا کہ اس کے باپ کے ہاتھ کئی بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور وہ مکافات کے عمل کا شکار ہو چکا ہے۔ قدرت نے اس کی دراز رسی کھینچ ڈالی ہے، اب اس کی کوششیں باپ کو نہیں بچا سکتیں۔ مگر وہ بیٹی تھی، باپ جیسا بھی تھا اس کے لیے واجب الاحترام تھا۔ ہر بیٹی کی طرح وہ بھی اپنے باپ سے محبت کرتی تھی۔

ذرا دیر کے بعد ثریا ناشتے کا ٹرے تھامے کمرے کے اندر داخل ہوئی اور ملک مراد کو تکیے کے سہارے بٹھا کر اس کا چہرہ صاف کرنے لگی۔ اسے دو تین بار کلی کرائی اور پھر چمچ سے اسے دلیہ کھلانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کمرے کی صفائی کی، ناشتے والے برتن اٹھا کر کچن میں رکھے اور پھر باپ کے بستر کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ ملک مراد نے چند لمحے تشکر آمیز نگاہوں سے بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا، وہ روزانہ اسی طرح خاموش آنسوؤں سے رویا کرتا تھا۔ ثریا اس کے درد سے آگاہ تھی مگر اس کے لیے کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

"ابا!" باپ کو آنسو بہاتے دیکھ کر وہ پریشانی کے عالم میں بولی۔ "میرے پاس آپ کے دکھ کا کوئی علاج نہیں ہے، میں جانتی ہوں کہ یہ پچھتاوے کے آنسو ہیں مگر اب یہ آنسو کسی کام کے نہیں رہے۔ جس جاگیر کے لیے آپ عمر بھر بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتے رہے اس کا اب کوئی والی وارث نہیں رہا۔ صغرا پھپھو، افضل بھائی، زینب قاسم چچا اور جہانداد...... کوئی بھی نہیں بچا۔ میں کس

سے معافی طلب کروں آپ کے گناہوں کی؟''

ملک مراد نے حسبِ معمول بولنے کی کوشش کی مگر چند بے ربط سی آوازیں نکال کر خاموش ہو گیا۔

''میں آپ کی نگاہوں کے اشارے سمجھ سکتی ہوں ابا''۔ وہ بولی۔ ''مگر جہانداد کے گھر کو اسی طرح تالا لگا ہوا ہے قاسم چچا کے مرنے کے بعد وہ تمام لوگ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئے ہیں؟''

ملک مراد نے دوبارہ ''اوں......آں......'' کی تو وہ بولی۔ ''آپ فکر نہ کریں ان کی زمین کے کاغذات میں نے اپنے پاس سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ جس دن بھی جہانداد واپس آیا اُسی دن اس کے حوالے کر دوں گی''۔

اسی دوران گھر میں کام کرنے والی ایک جوان نوکرانی کمرے کے اندر داخل ہوئی اور ثریا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بی بی جی! کوئی شخص ملک صاحب سے ملنے کے لیے آیا ہوا ہے؟''

''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پتہ نہیں بی بی جی کوئی اجنبی معلوم ہوتا ہے''۔ نوکرانی نے بتایا۔ ''اس نے لباس بھی افسروں والا پہنا ہوا ہے''۔ افسروں والے لباس سے مراد غالباً پینٹ شرٹ تھا۔

''افسروں والا لباس؟'' س نے چونک کر استفسار کیا مگر پھر فوراً بولی۔ ''اچھا اسے مہمان خانے میں بٹھاؤ میں ابھی آتی ہوں''۔

نوکرانی ''جی اچھا''۔ کہتے ہوئے رخصت ہو گئی اور ثریا باپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ابا! میں ابھی واپس آتی ہوں، کوئی ملاقاتی آیا ہے''۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنا حلیہ درست کیا، اپنے بدن کو ایک بڑی سے چادر میں ڈھانپا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

چند لمحوں کے بعد وہ مہمان خانے کے اندر داخل ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے متحیر رہ گئی۔ اس کے سامنے ایک نوجوان شخص پینٹ شرٹ میں ملبوس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''جی......کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' ثریا نے بلاتردد سوال کیا۔

''ملک مراد سے''۔ وہ بولا۔ ''میرا نام موسیٰ خان ہے اور مجھے جہانداد نے یہاں بھیجا ہے''۔

''جہانداد خود کہاں ہے؟'' ثریا نے جلدی سے استفسار کیا۔

''وہ پشاور میں ہے''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''البتہ اس کی بہن اور ماں کو میں ساتھ لے کر آیا ہوں''۔

''اوہ......'' وہ قدرے خوش ہو کر بولی۔ ''انہیں ساتھ لے کر آنا تھا ناں؟''

''ساتھ لے کر''۔ موسیٰ خان استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''تم جانتی ہو محترمہ کہ وہ یہاں نہیں



آسکتیں اور وجہ تمہیں معلوم ہے''۔

''ہاں''۔ وہ بولی۔ ''وجہ مجھے معلوم ہے مگر اب ان کے لیے اس حویلی میں کوئی خطرہ موجود نہیں ہے۔ اب یہاں دو مجبور عورتیں اور ایک زندہ لاش رہتی ہے جو کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی''۔

''میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔

''میرے ساتھ آؤ''۔ وہ مہمان خانے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتی ہوں''۔

چند لمحوں کے بعد موسیٰ خان ملک مراد کے بستر کے قریب کھڑا ہوا تھا اور ثریا اسے باپ کی داستانِ حیات سنا رہی تھی۔ پوری کہانی سننے کے بعد اس نے ثریا سے اظہارِ افسوس کیا اور پھر اس وعدے کے ساتھ رخصت ہو گیا کہ وہ آج ہی سکینہ اور اس کے ماں کو ساتھ لے کر حویلی پہنچ جائے گا۔

اس کے بعد اسی روز سکینہ اور اس کی ماں نے ملک مراد کی زندہ لاش سے ملاقات کی اور ثریا سے ہمدردی جتا کر اپنی جائیداد کے کاغذات لے کر واپس آ گئیں۔ اب انہیں حاکم چچا کو رہا کرانا تھا جو نہ جانے کب سے اس ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا تھا جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ آخر کار موسیٰ خان کی کوششوں سے حاکم علی بھی جیل سے رہا ہو گیا۔

===

اس وقت آدھی رات کا عمل تھا جب ایس ایچ او نادر خان کے کوارٹر پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ نیند میں ڈوبا ہوا تھا مگر متواتر ہونے والی دستک سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ خود کلامی کے انداز میں وہ گالیاں بکتا ہوا اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اسی دوران ایک زوردار دستک ہوئی اور نادر خان نے دستک دینے والے کو ایک فحش گالی دیتے ہوئے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

''ماں کے خصم! رات کو بھی آرام نہیں کرنے دیتے''۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے مغلظات بکنا شروع کر دیں۔ ''کیا ہے؟ کون مر گیا ہے رات کے اس وقت......مجھے نیند سے......''

معاً اس کے جبڑے پر کسی مضبوط ہاتھ کا ایک گھونسا پڑا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ گھونسا اتنا زوردار تھا کہ وہ پشت کے بل کمرے کے پختہ فرش پر گر پڑا۔

''اب اگر تمہاری آواز نکلی تو گردن مروڑ کر رکھ دوں گا''۔ اس کی سماعتوں سے ایک سرد آواز ٹکرائی اور کسی نے جھک کر اسے گردن سے دبوچتے ہوئے کھڑا کر دیا۔ آواز نادر خان کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ اس نے تو بے خیالی میں تھانے کے عملے کا کوئی آدمی سمجھتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا ورنہ دروازہ کھولنے سے پہلے وہ سو مرتبہ سوچتا۔

''کک......کون......ہو......تم؟'' بمشکل ہکلا کر اس نے سوال کیا۔

''سوال مت کرو نادر خان''۔ اس نے دوسرا گھونسا اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری موت ہوں میرا نام موسیٰ خان ہے۔ اب اگر تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا''۔

یکے بعد دیگرے دو گھونسے کھا کر اور موسیٰ خان کے تیور دیکھ کر نادر خان نے دم سادھ لینے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ موسیٰ خان نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے، منہ پر ٹیپ چپکائی اور اسے کندھے پر ڈال کر رات کے اندھیرے میں کوارٹر سے باہر نکل گیا۔ مختلف گلیوں میں سے گزرتا ہوا وہ گاؤں سے باہر نالے کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا، جہاں حاکم علی جیپ لیے اس کا منتظر تھا۔

موسیٰ خان نے جاتے ہی اسے جیپ کی عقبی سیٹ پر پٹخا اور پھر جیپ اسٹارٹ کرنے کے بعد وہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔

''کاش میں سکینہ کو اس کا انجام دکھا سکتا''۔ موسیٰ خان ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے حاکم علی سے بولا۔ ''میں سکینہ سے اس کے ظلم اور کمینگی کی پوری کہانی سن چکا ہوں''۔

''اسی کا تو سارا کیا دھرا ہے''۔ حاکم علی نے حقارت سے کہا۔ ''یہ اگر ملک مراد کا ساتھ نہ دیتا تو آج سکینہ کا باپ اور میرا بھائی زندہ ہوتا۔ قاسم بھائی نے حوالات کے اندر دم توڑا تھا۔ اس کتے نے اس پر بے تحاشا تشدد کیا تھا اور سکینہ کو تھانے لے جا کر اس کی عزت لوٹنے کی......''

''بس''۔ موسیٰ خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہانی میں پہلے ہی سن چکا ہوں۔ کل تک یہ مرحوم ہو چکا ہوگا''۔

ان کی باتیں سن کر عقبی سیٹ پر پڑے ہوئے نادر خان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ چیخ چیخ کر ان سے رحم کی درخواست کرنا چاہتا تھا مگر منہ پر لگی ہوئی ٹیپ نے اس کی قوتِ گویائی سلب کر رکھی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی جیپ گاؤں سے آٹھ دس کلومیٹر دور ایک ویرانے میں جا کر رک گئی۔ انہوں نے بندھے ہوئے نادر خان کو باہر نکالا اور پھر اسے ٹھوکریں مارتے ہوئے جیپ سے دور لے گئے۔ ان کی ہر ٹھوکر پر نادر خان کی کراہ نکل جاتی تھی لیکن وہ چیخ نہیں سکتا تھا۔ موسیٰ خان نے مضبوط ٹیپ کی دوہری تہہ اس کے منہ پر لگائی تھی۔ ان دونوں نے مل کر اسے اتنا مارا کہ آخر کار درد اور تکلیف کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد موسیٰ خان نے اس کے منہ سے ٹیپ اتاری اور اس کی ناک بند کر کے اسے ہوش میں لانے کی کوشش شروع کر دی۔ چند لمحوں کے بعد ہی نادر خان ہوش میں آ کر چلانے لگا۔

''خدا کے لیے......مم......مجھے......معاف کر دو......مم......مت مارو......مجھے''۔ وہ گڑگڑا



کر رحم کی بھیک مانگنے لگا۔

''چلاؤ مت کتے''۔ موسیٰ خان اس کے چہرے پر پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر لگاتے ہوئے حقارت سے بولا۔ ''سکینہ اور اس کے باپ نے بھی تم سے اسی طرح رحم کی بھیک مانگی ہوگی''۔

''وہ......وہ سب......ملک مراد نے کیا تھا''۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''مم......میں بے قصور ہوں''۔

''ملک مراد کی قسمت اچھی ہے''۔ موسیٰ خان نے کہا۔ ''وہ اگر بسترِ مرگ پر نہ ہوتا تو میں اسے بہت اذیت ناک موت مارتا''۔ اتنا کہہ کر اس نے دوبارہ اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

نادر خان کی تکلیف دہ چیخیں دور دور تک جا رہی تھیں مگر اس ویرانے میں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ جو کمزوروں پر ظلم کرتے ہوئے قہقہے لگایا کرتا تھا آج اپنے سے بھی بڑے ظالم کے ہاتھ چڑھ گیا تھا۔

موسیٰ خان رحم کے لفظ سے ناآشنا تھا۔ وہ جتنا چلاتا، موسیٰ خان اس سے کہیں زیادہ اسے بے دردی سے ٹھوکریں لگانے لگتا تھا۔ یونہی چلاتے چلاتے نادر خان دوبارہ بے ہوش ہو گیا، تب موسیٰ خان نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر ایک مخصوص جھٹکا دیا تو نادر خان بے ہوشی ہی کی حالت میں زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا۔

''خس کم جہاں پاک''۔ اس کی گردن توڑنے کے بعد موسیٰ خان اٹھتے ہوئے بولا۔ ''صبح تک جنگلی درندے اس کی لاش کا حلیہ بگاڑ چکے ہوں گے''۔

''کیوں نہ اس کی لاش کسی گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دیں؟'' حاکم علی نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''کسی کو بھی اس کی لاش نہیں ملے گی''۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''جنگلی جانور پھر بھی لاش نکال لیں گے۔ مفت کی محنت کیوں کریں؟'' اس کے بعد انہوں نے نادر خان کے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے اور واپس جیپ کی طرف چل پڑے۔

نادر خان کی لاش تین روز کے بعد ایک چرواہے نے دریافت کی تھی لیکن پولیس کوشش کے باوجود یہ معلوم نہ کر سکی کہ اسے کس نے اور کیوں قتل کیا ہے؟ تاہم یہ خبر سن کر سکینہ نے اکیلے میں موسیٰ خان سے پوچھنے کی کوشش ضرور کی تھی مگر وہ بات کو ٹال گیا تھا۔

===  ===

انتخابات ہوئے تو جمال خٹک توقع سے بھی زیادہ ووٹ لے کر جیت گیا۔ خان جی کو بری طرح شکست ہوئی تھی ان کی پارٹی کے بیشتر امیدوار ہار گئے تھے۔ نئی حکومت بننے سے قبل ہی خان

جی براستہ افغانستان لندن کی طرف پرواز کر گیا۔

جب نئی حکومت بنی تو جمال خٹک کے حصے میں ایک اہم صوبائی وزارت آ گئی۔ وعدے کے مطابق اس نے جہانداد کو نہ صرف محکمۂ پولیس میں اہم ملازمت کی پیش کش کی تھی بلکہ اسے چند اہم سرکاری خطوط بھی دے دیے تھے جو محکمۂ پولیس اور بندوبست کے اعلیٰ عہدیداروں کے نام تھے۔ ان خطوط میں جمال خٹک کی طرف سے پولیس اور بندوبست کے اعلیٰ آفیسرز کو جہانداد سے ہر ممکن تعاون کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

نئی حکومت بننے کے کچھ روز بعد ہی جمشید خان نے جہانداد اور ڈاکٹر شہناز کو بے شمار تحائف دے کر رخصت کر دیا تھا۔ اس کے پاس وہی جیپ تھی جو اسے خان جی نے دی تھی۔ دونوں بے حد خوش تھے اور ڈاکٹر شہناز کرید کرید کر جہانداد سے سکینہ اور ماں جی کے متعلق سوالات کر رہی تھی۔

''تم مجھے گاؤں میں چھوڑنے کی بجائے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟'' ڈاکٹر شہناز نے سوال کیا۔

''میں تمہیں اپنے ساتھ دشمنی کی آگ میں نہیں جھونکنا چاہتا''۔ وہ بولا۔ ''سکینہ اور ماں جی جس علاقے میں ہیں وہاں میرے بے شمار دشمن ہیں۔ خدا جانے وہاں کے حالات کیسے ہوں گے؟ اور پھر وہاں جا کر میں نے ایک قرض بھی چکانا ہے، ان حالات میں، میں تجھے کیسے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟''

''قرض...... کیسا قرض؟'' شہناز نے چونک کر استفسار کیا۔

''کیا تمہیں موسیٰ خان یاد ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں یاد ہے''۔ شہناز نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن خوشی کے اس موقع پر اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''موسیٰ خان میرے دوست سونو کا قاتل ہے''۔ وہ بولا۔ ''میں نے سونو کی لاش پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ اس کے قاتل کو اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا''۔

''نہیں جہانداد! ماضی کو بھول جاؤ''۔ اس نے کہا۔ ''میں تجھے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ وعدہ کرو کہ آئندہ تم کسی انسان کو جان سے مارنے کی بات نہیں کرو گے؟''

''وہ انسان نہیں جانور ہے''۔ جہانداد نے جواب دیا۔

''کچھ بھی ہو تم کسی انسان کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگو گے''۔ وہ بولی۔ ''میں تجھے اب کبھی ہتھیار نہیں اٹھانے دوں گی بلکہ اب تم میرے ساتھ مل کر کام کیا کرو گے''۔

''کیسا کام؟'' جہانداد نے متحیر انداز میں پوچھا۔



''میں وہاں گاؤں میں ایک چھوٹا سا ہسپتال کھولوں گی اور ہم دونوں مل کر دکھی انسانیت کی خدمت کیا کریں گے''۔ اس نے جواب دیا۔

''بے شک کھول لینا''۔ وہ بولا۔ ''لیکن میں تمہاری مدد کیسے کر سکتا ہوں، میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں''۔

''میں تجھے ڈاکٹر بنا دوں گی''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بس تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو، باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گی''۔

''او کے بھئی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا ساتھ دوں گا۔ اب خوش؟'' اس نے جواب دیا اور ڈاکٹر شہناز نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تیسرے روز صبح کے کوئی دس بجے کے قریب جہانداد کی جیپ فتح پور گاؤں میں ملک مراد کی حویلی کے سامنے سے گزرنے لگی تو اس نے اچانک جیپ روک دی اور شہناز سے بولا۔ ''شہناز! یہ اس فرعون صفت شخص کی حویلی ہے، جس کا نام ملک مراد ہے۔ کاش میں اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کر سکتا''۔

''پلیز جہانداد!'' وہ ملتجی ہوئی۔ ''اس سے اب قانون نمٹ لے گا۔ تم چلو میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتی ہوں''۔

''گھر بھی دیکھ لیں گے''۔ وہ بولا۔ ''آؤ پہلے دشمن کو تو دیکھ لیں''۔ اتنا کہہ کر وہ جیپ سے نیچے اتر کر حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور شہناز نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے جانے پر مجبور ہو گئی۔

حویلی کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور جہانداد بلا تردد اندر داخل ہو گیا مگر چند قدم آگے بڑھ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ یہ منظر اس کے تصور سے ہی باہر تھا، بلاشبہ وہ موسیٰ خان ہی تھا جو کسی نوجوان لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر باہر آ رہا تھا۔

حیرت کے پہلے جھٹکے سے سنبھلتے ہی نفرت کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور اسے کوئی ان دیکھی قوت دھکیلتے ہوئے موسیٰ خان کے سامنے لے گئی۔

''مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا موسیٰ خان!'' وہ زہریلے انداز میں بولا۔ ''تجھے تو میں آسمان پر ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور تُو یہاں مل گیا''۔

''غلط''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''تمہیں ڈھونڈتے ہوئے ہمیشہ میں ہی تم تک پہنچتا ہوں سولجر! دیکھ لو اب کی بار میں تجھے ڈھونڈتا ہوا تیرے گاؤں تک آ گیا ہوں''۔

''یہاں تجھے تیری موت کھینچ کر لائی ہے''۔ وہ نفرت سے بولا۔ ''آج تم میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکتے''۔

''موت کس کی آئی ہے، یہ تو وقت ہی بتائے گا''۔ موسیٰ خان بولا۔ ''لیکن یہاں لڑنا مناسب نہیں ہے۔ تم چاہو تو ہم کہیں باہر جا کر اپنا اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں''۔

''بزدلی کی باتیں مت کرو موسیٰ خان!'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''میں تجھے یہاں سے بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا''۔

''بزدلی اور موسیٰ خان''۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ ''ارے میں نے تو آج تک کسی بزدل کو اپنی دشمنی کے قابل بھی نہیں سمجھا''۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل آ گئے اور ثریا نے اپنی نوکرانی کو سکینہ کی طرف دوڑا دیا۔

جہانداد کی پنڈلی کے ساتھ خنجر بندھا ہوا تھا لیکن موسیٰ خان بظاہر خالی ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ دونوں لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے کو نگاہوں ہی نگاہوں میں تولتے رہے اور پھر بیک وقت ایک دوسرے پر چھلانگ لگا دی۔ دونوں کے جسم زور سے فضا میں ٹکرائے اور پھر دونوں پشت کے بل زمین پر گر پڑے۔ موسیٰ خان قدرے بھاری جسم کا تھا اس لیے جہانداد نے اٹھنے میں قدرے پھرتی دکھاتے ہوئے دوبارہ اس پر چھلانگ لگا دی مگر وہ اس سے غافل نہیں تھا، اس نے اتنی تیزی سے کروٹ بدلی تھی کہ جہانداد اپنے ہی زور میں زمین سے جا ٹکرایا۔

موسیٰ خان نے لیٹے لیٹے ایک زوردار لات اس کے پہلو میں رسید کر دی۔ جہانداد کے منہ سے ایک ہلکی سی کراہ نکل گئی تاہم وہ جست لگا کر موسیٰ خان کے دوسرے وار سے دور نکل گیا۔

ایک بار پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ ڈاکٹر شہناز ان سے چند قدم دور کھڑی چلا چلا کر انہیں لڑنے سے منع کر رہی تھی لیکن وہ دونوں اس کے چیخنے کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ اب کی بار موسیٰ خان نے اچھل کر جہانداد کو فلائنگ کک رسید کرنے کی کوشش کی تھی، جہانداد نے خود کو بچانے کے لیے برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی لات پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا تو موسیٰ خان سر کے بل زمین سے جا ٹکرایا، اس کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی تھی۔

اس کے گرتے ہی جہانداد نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا لیکن چند ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بہت مشکل ہے سولجر!'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے طنزیہ انداز میں



بولا۔ ''موسیٰ خان سے جیتنا ناممکن ہے۔ تم کچھ بھی کر لو مجھے شکست نہیں دے سکتے۔ اپنے یار سونو کی طرح آج تم بھی میرے ہاتھ سے مرو گے''۔

اس کے ان طنزیہ الفاظ نے جہانداد کے پورے وجود میں نفرت کی ایک ان دیکھی آگ بھڑکا دی تھی۔ چشم زدن میں وہ پارے کی طرح اچھلا اور موسیٰ خان کو ساتھ لیتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ اس کے بعد ان دونوں کے ہاتھ اور پاؤں مشینی انداز میں چلنے لگے۔ کبھی جہانداد تو کبھی موسیٰ خان کا پلہ بھاری نظر آنے لگتا تھا۔ دونوں نے مار مار کر ایک دوسرے کا چہرہ لہولہان کر دیا تھا۔ ان سے دور کھڑی ڈاکٹر شہناز بری طرح چلا رہی تھی مگر اس کی آوازیں شاید ان کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔ وہ دونوں تو زندگی اور موت کے جنگ لڑنے میں مصروف تھے۔ لحہ بہ لحہ موسیٰ خان کی مدافعت دم توڑتی جا رہی تھی لیکن وہ ہار ماننے کے لیے جیتے جی تیار نہیں تھا۔

اس وقت موسیٰ خان جہانداد کے نیچے تھا جب اچانک سکینہ اور اس کی ماں دوڑتی ہوئی حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔ اس دوران جہانداد پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا خنجر نکال چکا تھا۔ جونہی اس نے ایک جھٹکے سے خنجر کو فضا میں بلند کیا، اس کی سماعتوں سے سکینہ کی چیختی ہوئی آواز ٹکرائی۔ ''رک جاؤ بھائی خدا کے لیے رک جاؤ''۔

اپنے عقب میں بہن کی آواز سن کر جہانداد خنجر کو دور پھینکتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''سس...... سکینہ!'' وہ غم اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں چلایا۔ ''تم اور ماں...... زندہ ہو؟''

''ہاں...... بھائی! زندہ ہیں''۔ وہ روتی ہوئی آواز میں بولی اور پھر دوڑ کر بھائی سے لپٹ گئی۔ ملن کی اس گھڑی وہ موسیٰ خان کو بالکل بھول چکے تھے جب اچانک انہیں اپنے عقب میں موسیٰ خان کی ایک بلند کراہ سنائی دی۔

موسیٰ خان کی کراہ سنتے ہی سکینہ دوڑ کر اس تک پہنچ گئی مگر اس وقت تک موسیٰ خان زندگی کے آخر سانس لے رہا تھا۔ اس نے جہانداد کا پھینکا ہوا خنجر اپنے سینے میں اتار دیا تھا۔

''یہ...... یہ...... تم نے کیا کر دیا بھائی''۔ اتنا کہہ کر سکینہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

''وہ...... وہی...... جو...... م...... مجھے...... ک...... کرنا چاہیے تھا''۔ موسیٰ خان بہ دقت تمام اٹکتے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ہا...... ہار کر...... جج...... جینا...... بھی...... کوئی جینا ہوتا ہے''۔

''تم نے بتایا کیوں نہیں جہانداد کو''۔ اس نے روتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کہ تم ہمارے محسن ہو، تم نے بہت کچھ کیا ہے ہمارے لیے''۔

''نن...... نہیں...... میری بہن...... یہ میرے...... اصولوں...... کے خلاف...... ہے''۔ اس نے بمشکل جواب دیا اور پھر جہانداد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ...... لو...... سو...... سولجر...... تم

آج بھی...... ہار گئے ہو...... سکینہ...... تیرے لیے نہیں...... مم...... میرے لیے رو...... رہی ہے‘‘۔

اس دوران ثریا بھاگ کر پانی لے آئی تھی مگر موسیٰ خان جانبر نہ ہو سکا۔ چند مزید باتیں کرنے کے بعد اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

اس واقعہ کے چند سال بعد جہانداد دو پیارے سے بیٹوں کا باپ بن چکا تھا۔ سکینہ بیاہ کر پیا دیس سدھار چکی تھی جبکہ ڈاکٹر شہناز ایک چھوٹا سا ہسپتال کھول کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنے لگی تھی۔ خاص کر غریبوں کا وہ بالکل مفت علاج کیا کرتی تھی۔ موسیٰ خان کو وہیں گاؤں میں ہی دفن کیا گیا تھا اور جہانداد جمعرات کے روز باقاعدگی کے ساتھ اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ وہیں قبرستان میں اکثر اسے ثریا بھی ٹکرا جایا کرتی تھی جو کبھی باپ کی قبر پر تو کبھی موسیٰ خان کی قبر پر بیٹھی ہوئی نظر آیا کرتی تھی، شاید موسیٰ خان جاتے جاتے اس کی کوئی آرزو ساتھ لے گیا تھا۔

(ختم شد)